تفسیر
فصل الخطاب

مصنف

سید العلماء الحاج علامہ السید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

تفسیر فصل الخطاب

جلد دوم

مصنف

سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب-----۔۔----تفسیر فصل الخطاب

جلد-----------۔۔دوم

مصنف---------۔۔سید العلما علامہ سید علی نقی النقوی ؒ لکھنوی

پروف ریڈنگ-----۔۔مولانا عابد عسکری

کمپوزنگ-----------(قائم گرافکس۔جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔کراچی)

ترتیبِ نو---------۔۔۔مجاہد حسین حر

نیٹ سیٹنگ---------۔۔۔قلب علی سیال

سال اشاعت-----۔۔۔--2011

ناشر-----------۔۔مصباح القرآن ٹرسٹ

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر

۲۴۔الفضل مارکیٹ۔اردو بازار۔لاہور

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ.

قارئین کرام! تفسیر فصل الخطاب کی دوسری جلد پیش خدمت ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی اب ہم میں نہیں رہے۔ میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ کو تفسیر کے چند خصوصی نسخے لے کر سرکار ممدوح کی خدمت میں حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ بہت دکھ ہوا اور تشویش بھی بہر حال میں نے اپنا وہ نام کہلا بھجوایا جس نام سے آپ مجھے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آدمی واپس آیا، اس نے بیٹھک کھول دی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، تھوڑی دیر میں مولانا برآمد ہوئے، کافی دیر گفتگو ہوئی اور پھر خورد و نوش کا سلسلہ بھی چلا۔ میں نے تفسیر کے دو نسخے پیش کیے، تیسرے پر تبرک کے طور پر ان سے دستخط کروالئے اور ساتھ لے آیا۔ مولانا نے تفسیر کو تھوڑی دیر دیکھا اور فرمایا: ''دیر آید درست آید''۔ کسے خبر تھی کہ یہ مولانا سے آخری ملاقات ہے اور پھر کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوگا۔

سید العلماء ۳۰، ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء رحلت فرما گئے اور عین عید الفطر کے دن مدفون ہوئے۔ خداوند عالم ان کو جوار معصومین میں جگہ عطا فرمائے۔

آہ! وہ شمع جو ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء لکھنؤ میں روشن ہوئی تھی، گل ہوگئی۔

افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ہم میں روحانی طور پر موجود اور ہمارے دل و دماغ پر محیط ہیں۔ آج بھی ان کے علمی نکات ہم کو یاد آتے ہیں اور دین و دیانت اور اخلاق و شرافت سے ہماری محبت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اب ایسی صلح کل ہستیاں کہاں ہیں جو علم و عمل کے میدان میں اسلامی تعلیمات و اقدار کی امین ہوں اور دنیا کی مشکلات میں ہمارے مژدہ فتح مبین ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے تھوڑے دنوں بعد ہی ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور نے جو تفسیر نمونہ کے ناشر ہیں خواہش ظاہر کی کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کی ان کو اجازت دے دی جائے۔ مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن نتیجہ خیز نہ ہو سکی۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے آخری دنوں میں میری بیرون ملک سے واپسی پر پھر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت مصباح القرآن ٹرسٹ کی طرف سے اور پیشکش ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کی طرف سے ہو۔ چنانچہ ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے دوسری جلد کا کتابت شدہ مسودہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تاکہ اشاعت کا کام مصباح القرآن ٹرسٹ کے اہتمام و انصرام کے تحت انجام پا سکے اور تفسیر فصل الخطاب کی جلدیں بہ سرعت شائع ہوتی رہیں۔ الحمد للہ کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اب نئے سرے سے مکمل تفسیر کی کمپوزنگ کروائی ہے اور قارئین کی سہولت کیلئے اشاعتِ ھذا میں تین جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب کو مکمل شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفسیر کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے، امید ہے کہ قارئین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور تعاون فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سید علی اکبر رضوی

صدر ادارہ ترویج علوم اسلامیہ

کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عرضِ ناشر

سرکار سید العلماء علامہ علی نقوی النقوی اعلی اللہ مقامہ کے خطیبانہ ومؤلفانہ فیوض وبرکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ آپ کی تقریر وتحریر میں بیان وزبان کی سادگی اور مفاہیم ومطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک وہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اورشیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اورادب واحترام نصیب ہوا کہ باید وشاید!

سید العلماء کے آثار علمی میں ''شہید انسانیت'' سمیت دسیوں باعظمت کتابیں، آپ کے کئی ایک مجموعہ ہائے تقاریر اور مختلف دینی موضوعات پر کم وبیش پانچ سو رسالے موجود ہیں۔ تاہم آج سے ۲۵ برس قبل جب آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن منظر عام پر آیا تو آپ کے تجر علمی تحقیقی صلاحیت اور ذمہ دارقلم کی رعایت سے اپنے بیگانے ہر ایک کی نظریں آپ کی تفسیر قرآن کی طرف لگ گئیں۔

اس سلسلے میں خاص وعام کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تفسیر آئندہ جلد کی تلاش میں پاکستان کے لوگ ہندوستان جاتے اور وہاں کے لوگ پاکستان آتے ، نیز دیگر ممالک میں مقیم مسلمان اس کے لئے ہندو پاک کے کتب خانوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ آخر کار ان ہزاروں منتظر اور متلاشی نگاہوں کی تسکین کا سامان یوں ہوا کہ سید العلماء کے ایک نہایت ہی مخلص قدر شناس غلام محمد بٹ نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی مدت میں ثمر بگ (مقبوضہ کشمیر) سے آپ کی تفسیر قرآن ''فصل الخطاب'' کی سات جلدیں شائع کر کے اس اہم فرض کی تکمیل کا اعزاز حاصل کرلیا۔

اس اثناء میں مذکورہ تفسیر کی پاکستان میں اشاعت کی ضرورت کا احساس فرماتے ہوئے سید العلماء نے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی کے صدر سید علی اکبر رضوی کو بھی اس کی اشاعت کے حقوق مرحمت فرمادیئے۔ چنانچہ اس ادارے نے تفسیر فصل الخطاب کی جلد اول شائع کردی لیکن بوجوہ یہ سلسلہ کچھ آگے نہ بڑھ سکا لہٰذا سید علی اکبر رضوی نے مصباح القرآن ٹرسٹ کی شاندار تفسیری وعلمی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت اس تفسیر کی اشاعت کا عظیم کام اس ٹرسٹ کے حوالے کردیا۔ بنابریں مصباح القرآن ٹرسٹ نے تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جلد اول جوکہ کراچی کے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے شائع کی تھی، کے ختم ہونے پر مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کی اصلاح وتزئین میں مقدور بھر کوشش کی گئی، اس کے باوجود ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی تجاویز وآراء سے مستفید فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آخر میں دردمندانہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ تفسیر ہذا کی ترویج میں ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرما کر قرآن وعترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہیں۔

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

ضرورت تفسیر

قرآن مجید جب خود نور، ہدایت، بصیرت، آسان، واضح اور اَحسن (و بہترین) تفسیر ہے تو پھر تفسیر کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات قرآن میں ہے:

وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَ اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا۔(فرقان--۳۳)

اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان (وتفسیر) لے آئیں گے

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ.(دخان--۵۸)

درحقیقت ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں۔

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ.(قمر--۱۷)

''اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے''۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ.(زمر--۲۸)

''عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں''۔

قرآن مجید نے نہ فقط اس سوال کا جواب دیا ہے بلکہ یہ بھی بتادیا ہے کہ مفسر قرآن کون ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ.(نحل--۴۴)

''اے رسول! ہم نے قرآن کو آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اُن تمام احکام وغیرہ کو بیان کریں (اور ان کی توضیح وتشریح کریں) جو ان کی طرف بھیجے گئے ہیں شاید وہ غور وفکر سے کام لیں''۔

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا. (فاطر--۳۲)

''پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا''۔

مذکورہ آیات میں واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے مفسر کی ضرورت ہے اور مفسر قرآن سب سے پہلے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے ان کے بعد وہ مفسر قرآن ہیں جو وارث قرآن، وارث علم قرآن اور وارث علم پیغمبرؐ ہیں یعنی اہل بیت وعترت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ خود پیغمبرؐ نے بھی فرمایا:

''اِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ-------- کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتۡرَتِیۡ اَہۡلَ بَیۡتِیۡ------''

میں آپ لوگوں کے پاس دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن مجید) اور دوسری اپنی عترت (یعنی اہلبیت)۔

اہل بیت وعترت پیغمبرؐ کے بعد تفسیر قرآن کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حقیقی وارث اور "اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ" کے مصداق ہیں۔

انہی علماء میں سے ایک حضرت آیۃ اللہ علامہ السید علی نقی النقوی المعروف "علامہ نقن" ہیں۔ جنہوں نے تفسیر فصل الخطاب لکھ کر احسن طریقہ سے فریضۂ الٰہی انجام دیا۔

تفسیر فصل الخطاب سے قرآن مجید کا ترجمہ وحاشیہ مرتب کرتے وقت جس حد تک میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے تو تفسیر کی مختلف اقسام (مثلاً تفسیر رُوائی، تفسیر عرفانی اور تفسیر اجتہادی) میں سے فصل الخطاب کو تفسیر اجتہادی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس تفسیر میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا ہے جو ایک جامع اور اجتہادی تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تفسیر اگرچہ سابقہ کتابت کے مطابق چند مرتبہ مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب خداوند عالم نے خادمین ادارہ مصباح القرآن لاہور مخصوصاً جناب محترم شیخ محمد امین صاحب کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ وہ اسے کمپوز کروا کر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ کمپوز اور اصلاح کا کام جناب محترم مجاہد حسین حر صاحب کے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی لیکن اتنے بڑے کام میں نواقص اور غلطیوں کا باقی رہنا فطری امر ہے۔ قارئین محترم سے گزارش ہے کہ نواقص کے سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں تاکہ بعد والے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم بانیٔ ادارہ مصباح القرآن حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مرحوم علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی قدس سرہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے قائم کردہ تمام ادارات کو ترقی وکمال عطا کرے مصباح القرآن و دیگر ادارات کی تأسیس میں ان کے معاون خاص محترم جناب سیٹھ نوازش صاحب دام عزہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر عطا کرے۔

علامہ مرحوم کے قائم کردہ تمام اداروں کے سرپرست اعلیٰ اور ان کے روحانی جانشین حضرت آیۃ اللہ حافظ ریاض حسین نقوی النجفی دامت برکاتہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر بابرکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم ودائم رکھے۔

تمام معاونین وخادمین ادارہ مصباح القرآن مخصوصاً جناب محترم محمد امین صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

سید فیاض حسین نقوی

جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مارچ ۲۰۱۱ء

تفسیر فصل الخطاب

چند تاثرات

ڈاکٹر محسن نقوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاہِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اَذۡھَبَ اللّٰہُ عَنۡھُمُ الرِّجۡسَ وَطَھَّرَھُمۡ تَطۡھِیۡرًا.

ہماری خوش نصیبی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے فردِ وحید و عالم جلیل سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی (۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء۔ ۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء) کی تفسیر فصل الخطاب کی طبع نو کے موقع پر اس کے بارے میں کچھ خیالات کے اظہار کا موقع ہمیں فراہم ہوا۔

ایک پوتے کے لئے اپنے جدّ (سیّد العلماءؒ ہمارے والد کے چچا تھے) کی کسی کتاب پر لکھنا وہ بھی ''سید العلماءؒ'' جیسی علمی شخصیت کی کتاب، اُس پر مستزاد ''تفسیر القرآن'' جیسا وسیع و دقیق موضوع اِس بے بضاعت کے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن توفیق اِلٰہی (عزّوجل) اور ولی العصر، صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام اور اُن کے اجدادِ کرام، صلوٰۃ اللہ علیہم کی ہدایت کے توسل سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتداء سید العلماءؒ کے اجداد میں سید علی نقویؒ (۱۲۰۰ھ/ ۱۲۵۹ھ بمطابق ۱۷۸۵ء۔۔ ۱۸۴۳ھ) ابن سید دلدار علی غفرانمآبؒ کے حصّے میں آئی۔ آپ کا ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے پہلے قرار پاتا ہے۔ اس ترجمے کی زبان قدیم لیکن سلیس اور با محاورہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی لائبریری، ناظم آباد میں موجود ہے۔

یوں تو علمائے شیعہ نے قرآنِ مجید کے بہت سے ترجمے اور حواشی قلم بند کئے جن میں مولانا فرمان علی (۱۸۵۳ء--۱۹۱۶ء) اور مولانا مقبول احمد اعلی اللہ مقامھما (۱۸۷۰ء--۱۸۸۶ء) کے تراجم و حواشی کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں مولانا عمار علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء--۱۹۷۵ء) کی تفسیر ''عمدۃ البیان'' (۳ جلدیں) ایک متوسط حجم کی تفسیر شمار کی جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا امداد حسین کاظمیؒ (۱۹۰۱ء--۱۹۷۵ء) کا ترجمہ و حاشیہ تفسیر متقین ہماری نظر میں فرمان علیؒ اور مقبول احمدؒ کے تراجم وحواشی پر بوجوہ فوقیت رکھتا ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کے بعد علامہ حسین بخش جاڑا صاحب کی تفسیر ''انوار النجف'' تفسیر کے شائقین کا مرکز رہی، اسی طرح علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کا ترجمہ و حاشیہ بھی اس بناء پر بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ترجمہ انتہائی رواں اور حواشی عام قاری کے لئے سہل ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (دام ظلہ الوارف) کی زیر نگرانی تیار ہونے والی ''تفسیر نمونہ'' کا ترجمہ انتہائی دیانت وعرق ریزی سے کیا گیا اور اس نے خاص حد تک ایک ایسی تفسیر کی کمی پوری کردی جو طلباء، کالج و یونیورسٹی کے پروفیسروں اور علماء کے لئے ''حوالے'' کا کام دے اور وہ اس کے ذریعے اپنی ''قرآن فہمی'' میں اضافہ کرسکیں۔ فجزاءہم اللہ احسن الجزاء۔ جس دوران تفسیر نمونہ کی جلدیں طبع ہوکر آرہی تھیں اُسی دوران سید العلماءؒ کی تفسیر ''فصل الخطاب'' پہلے سات جلدوں میں کشمیر سے چھپی، پھر ایک جلد ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ سے اور بعدازاں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کا پورا سیٹ اچھے انداز میں طبع کیا۔

قرآن مجید کے طالب علم کی حیثیت سے عالم اسلام میں مختلف مکاتب فکر وفقہ کی تفاسیر شائع ہونے کے ساتھ زیر مطالعہ رہتی ہیں تو اپنے مکتب فکر کی اردو تفاسیر وحواشی بھی ہمیشہ زیر نظر رہتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کچھ کم نہیں جن میں سے بعض کا ذکر ماقبل ہم کر چکے۔

سید العلماءؒ کی تفسیر کی خاص بات جس نے ہمیں متاثر کیا وہ اس کا ''تفسیری ترجمہ'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سید العلماءؒ کی ساری محنت وژرف نگاہی آیات کے ترجمے میں مضمر ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سید العلماءؒ کسی بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے صرف عربی زبان، نحو وبلاغت، معانی وبدائع کو مدّنظر نہیں رکھتے بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث اور اُن کو مدّنظر رکھ کر لکھی جانے والی تفاسیر مثلاً شیخ طوسیؒ کی التبیان، محسن فیض الکاشانی کی الصافی، تفسیر قمی علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان وغیرہ میں پیش کئے گئے مطالب کو اردو ترجمے میں سمو دیتے ہیں اور تائیداً متعلقہ تفسیر کی متعلقہ عبارت کو مختصراً نقل کردیتے ہیں۔ تفسیری مواد اس ترجمے ہی کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لئے ترجمے میں لفظ پر لفظ نہیں رکھا ہے

بلکہ اُسے اُردو محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر بعض مقامات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۹ کے ایک جزء:

وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ

اس کا ترجمہ سید العلماءؒ نے یہ کیا ہے: اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ و غضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں۔ اس کے بعد حاشیے میں پہلے مولانا فرمان علیؒ کا ترجمہ دیا ہے "تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹتے ہیں"۔ پھر ان ہی کا حاشیہ نقل کیا ہے: اس "الانامل" کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے ہیں اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

بعد ازاں سید العلماءؒ وضاحت کرتے ہیں: مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے" (فصل الخطاب، ج ۳، ص ۳۷)

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصّے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تفسیر نمونہ کے اردو ترجمے میں ہے: جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ و غضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ (ج ۳ ص ۶۴) سید العلماء کا ترجمہ عربی سے قریب اور اردو محاورے کے مطابق ہے۔

(۲) سورۂ آلِ عمران ہی کی آیت ۱۵۴ کے پہلے جزء میں فرمایا:

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِنْكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ ...

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: "اس کے بعد خدا نے ایک گروہ پر پُرسکون نیند طاری کردی اور ایک کو نیند بھی نہ آئی کہ اسے صرف اپنی جان کی فکر تھی"

اس ترجمے میں ایک تو "غم" کا ذکر نہیں ہے، دوسرے تا کہ "اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ" میں جو عمومیت ہے وہ مفقود ہے۔ تیسرے قرآن مجید کے الفاظ "وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ..." کا ترجمہ مبہم ہے "اور ایک کو----" یہاں مفرد کا گمان ہوتا ہے اگر "گروہ" کا اضافہ ہوتا اور "ایک" کی بجائے "دوسرے" ہوتا تو قرآنی الفاظ کی رعایت بھی ہوتی اور مطلب واضح ہوتا۔

سید العلماءؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: پھر اُس نے رنج و غم کے بعد تم پر سکون و اطمینان اُتارا نیند کی صورت سے جو تم

میں سے ایک گروہ پر طاری ہورہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔(ج ۳ ص ۷۴)

اس کی تائید میں انہوں نے علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

(۳) سورۂ نساء کی آیت ۹۱ کا ایک جزء ہے:

كُلَّمَا رُدُّوٓا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا.

علامہ جوادیؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: یہ جب بھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔

الفاظِ قرآن میں ''بلائے جاتے ہیں'' کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔

شیخ الہند محمود الحسن دیو بندی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

"اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا" کے بنیادی معنی: "يعنى وقعوا فيها" (التبیان للطوسیؒ) یعنی ''پڑ جانا'' واقع ہو جانا اس کو تائیداً نقل کر کے سید العلماءؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: اور جب فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جُٹ جائیں گے۔(فصل الخطاب ج ۳ ص ۲۶۹) ''جُٹ جانا'' اُردو محاورہ ہے جس میں تن دہی سے کسی کام میں دلچسپی سے لگے رہنے کا مفہوم ہے اور یہی "اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا" کا درست ترجمہ ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

درج بالا سطور سے سید العلماءؒ کی تفسیر فصل الخطاب کی چند خصوصیات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔الفاظِ قرآنی کی بالالتزام رعایت

۲۔لفظی ترجمے کی بجائے محاوراتی ترجمہ اور لکھنوی اردو محاورے کی مطابقت

۳۔ترجمے میں عقلی و منطقی اظہار اور ربط کا لحاظ

۴۔طوالت سے گریز

۵۔مستند تفاسیر کے طویل اقتباسات سے گریز

۶۔تفاسیر کے مختصر اقتباسات سے استشہاد

۷۔احادیث کے طویل مندرجات کی بجائے محض متعلقہ حصّے کا اقتباس و اشارہ

۸۔تاریخی واقعات کی طرف اشارہ اور تفصیل سے اجتناب

۹۔تفسیر میں نہ اتنی طوالت کہ قاری پر بار ہو جائے اور نہ ایسا اطناب کہ وہ حاشئے میں شمار ہو۔

۱۰۔وہ مضامین جن کی ادائیگی عوام میں خلافِ ادب سمجھی جاتی ہے اُس کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال جن سے وہ دائرۂ ادب وستر سے باہر بھی نہ نکلیں اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔مثلاً سورۂ نساء کی آیت ٦ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں ۱۵ برس اور لڑکی میں ۹ برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں''۔(ج ۳،ص: ۱۴۴)

۱۱۔فقہی آیاتِ احکام کی وضاحت میں فقہی مسائل کو اپنی پوری فقہی مہارت سے بیان فرمایا ہے مگر اس کو بہت قابلِ فہم انداز میں تحریر فرمایا تا کہ مسائل سمجھ میں آسکیں۔مثلاً سورۂ نساء کی آیات اِرث۔

قابل مبارک باد ہیں مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئولین و منتظمین جو قرآنِ مجید کی خدمت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علومِ اہل بیت علیہم السلام کو بھی نشر کر رہے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ اِن سے فرمان خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: قرآن و اہل بیتؑ جب تک اِن سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے'' پر عمل بھی کروا رہا ہے اور ثقلین کی خدمت بھی۔

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشذہ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں ''ثقلین'' کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

خادم الثقلین

ڈاکٹر محسن نقوی

۲٦ مارچ ۲۰۱۱ء کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے

✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻ ✻

فہرست کتاب

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ	21
سورہ انعام کے خاص موضوعات	22
انبیاء اور تمام معصومین واقعی بشر ہوتے ہیں، نہ کہ فقط بصورت بشر	26
رئیسوں کے ذہنیت کے مقابلہ میں غریبوں کی دل جوئی	43
خالق کے علم کی ہمہ گیری	46
جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد کون؟ آذر یا تارخ؟	52
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال اجرام سماویہ کی الوہیت کی نفی اور الٰہ حق کا اثبات	54
قمری حساب کا اعتبار	61
نفی رویت	63
رواداری کی تعلیم اور معبودان باطل کے سبّ وشتم سے ممانعت	66
عدل الٰہی	69
اکثریت معیار حق نہیں	70
رسالت بر بنائے بلندی اوصاف	73
تکلیف بلا بیان قبیح ہے	76
مشرکین کی تاریک ذہنیت اور افسوس ناک بدعت	81
اولاد کشی کی مذمّت	81
مشرکین کے بدعات اور ان کی مذمت	87
اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے	89
کچھ اہم محرّمات شرع کی فہرست	91
فرقہ بندی کی مذمت	94
کافر وگناہ گار کا وجود انسان کے فاعل مختار ہونے کا ثبوت ہے	95
اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے	95
انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض وغایت	96
سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ	97
سورۂ اعراف کے خاص خاص مضامین	97
اعمال کا وزن	101
جناب آدم وحوا علیہما السلام سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو	106
لباس بہشت کا جناب آدم اور حوا علیہما السلام کے جسم سے جدا ہونا	106
اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں	108
شراب کی حرمت	112
کافروں کا بہشت میں جانا غیر ممکن	116
بہشت میں قلبی کدورتیں دور ہو جائیں گی مگر کون سی؟	116
اہل بہشت اور اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو	118
اعراف کا ذکر	119
فساد پھیلانے سے ممانعت	124
پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ	125
جناب نوح علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ	126
جناب ہود علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام	127
جناب صالح علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام	130
جناب لوط علیہ السلام کی تعلیم، قوم لوط کی بدکاری اور اس کا انجام	131
جناب شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ	132
قوم شعیب کا رویہ اور انجام	134
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ، اور فرعون کا انجام	140
بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں	146
تیس راتوں کا وعدہ اور مزید دس کا اضافہ۔ بداء کا کھلا ہوا نمونہ	150

عنوان	صفحہ نمبر
دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام	152
گوسالہ پرستی	156
جناب موسیٰ علیہ السلام کا جناب ہارون علیہ السلام پر بظاہر عتاب	157
"النبی" اس کے اوصاف اور توریت و انجیل میں اس کا تذکرہ	162
رسالت محمدی کی ہمہ گیری	163
اسباط بنی اسرائیل کی تعداد	164
اہل سبت کا ذرا تفصیلی تذکرہ	165
اہل سبت کا عذاب الٰہی سے مسخ ہو جانا	167
عہد اَلَست اور عالم ذر	170
ایک عالم بے عمل کا حال	174
قیامت کے وقت کا علم کسی کو نہیں	179
قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم	187
سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ	189
سورۂ انفال کے خاص خاص مضامین	189
انفال کے متعلق حکم خداوندی	190
جنگ بدر کا پس منظر	192
فرشتوں کا جنگ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا	195
میدان جنگ سے فرار کا باعث دوزخی ہونا	196
گمراہ اور پست کردار انسان جانوروں سے بدتر	198
سرزمین مکہ میں مہاجروں کا عالم پریشانی	200
حفاظت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خداوند عالم کی تدبیریں	202
وجودِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانع نزولِ عذاب	204
بموقع حج مشرکین کے لغویات	205
خمس کا صریح حکم	208
جنگ بدر کے کچھ کیفیات	209
میدان جنگ میں برقرار رہنے کی تاکید	212
تنازع باہمی کے خراب نتائج	212
خدا کی نعمتوں میں تبدیلی خود اپنے نفوس کی تبدیلی کا نتیجہ	215

عنوان	صفحہ نمبر
جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم	218
مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم	219
بندگان الٰہی کے مددگار ہونے کا ثبوت	220
وہابیت شکن قرآنی صراحت	221
ایک اور دس کے مقابلہ کا حکم	221
مسلمانوں میں کمزوری کا ثبوت	222
قیدیوں کے بارے میں الٰہی منشا کا اعلان	223
سُوْرَةُ الْبَرَآءَةِ	228
سورۂ براءت کے خاص خاص مضامین	229
اس سورہ کے آغاز کی خصوصیت	230
مشرکین سے معاہدۂ سابق کی منسوخی اور ان سے قطعی تبرا یعنی ترک موالات کا اعلان	231
پناہ کے طلبگار مشرکوں کو پناہ دینے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا حکم	233
مساجد الٰہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت	236
جنگ حنین کا تذکرہ اور باوجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار	239
آخر میں دین اسلام کے غالب آنے کا اعلان	244
اکتناز کی مذمت اور اس کی سزا	244
مہینوں کی تعداد بارہ اور چار محترم جن میں جنگ وجدل حرام ہے	245
نسی یعنی مہینوں کی تبدیلی کی شدید مذمت	246
شب ہجرت کا مختصر حال	248
جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے نمونے	253
مستحقین زکوٰۃ کا بیان	257
کفار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کا حکم	263
کھلے ہوئے منافقین کی نمازِ جنازہ سے ممانعت	268
صحرائی عربوں کی مذمّت	272
اسلام میں سبقت رکھنے والوں کی تعریف	273
مسجد ضرار کا ذکر	276
مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت	278

عنوان	صفحہ نمبر
جناب ابراہیمؑ کے استغفار کا پس منظر	279
تکلیف بلا بیاں کا صحیح نہ ہونا	280
صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم	282
تحصیل علم دین کے لئے سفر کا حکم وجوب کفائی	283
اوصاف پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	287
سُوْرَۃُ یُوْنُسَ	288
سورۂ یونس، خاص مضامین	288
اسلام میں ماہ وسال کے قمری حساب کا اعتبار	291
اہل بہشت کا سلام۔سلامٌ علیکم	292
قبل بعثت رسول کی خاموشی سے آپ کے پیغام کے الٰہی ہونے کا ثبوت	295
قرآنی رواداری کی نمایاں مثال	295
حجیت ظن کی بحث میں ارشاد الٰہی اور اس کا انعقاد	303
بغیر ثبوت شرعی کسی چیز کو حرام سمجھنا اللہ پر بہتان ہے اور کفران نعمت بھی ہے	310
نظام حکمت الٰہی جبر کا متقاضی نہیں	322
سُوْرَۃُ ھُوْدٍ	324
سورۂ ہود کے خاص خاص موضوعات	324
دس سوروں کا جواب لانے کا مطالبہ	329
ذکر رسالت مآبؐ وولایت مآبؑ	331
طوفان نوح علیہ السلام کی غرقابی اور اس کا پس منظر	338
طوفان نوح کی غرقابی اور اس کا پس منظر	340
کوہ جُودی	340
عمل صالح کے بغیر کسی پیغمبر کی فرزندی بھی کارگر نہیں	341
قبیلۂ عاد اور جناب ہود علیہ السلام کا حال	343
قبیلۂ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال	346
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ولادت اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری	348
قوم لوط پر نزولِ عذاب	351
جناب شعیبؑ اور ان کی قوم کا حال	352
اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ	359
سُوْرَۃُ یُوْسُفَ	363
سورۂ یوسف کے خاص خاص موضوعات	363
جناب یوسف علیہ السلام کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گفتگو	365
برادران یوسفؑ کا منصوبہ اور یوسفؑ کے ساتھ بدسلوکیاں	365
تذکرہ عزیز مصر و زلیخا	369
واقعۂ یوسفؑ و زلیخا	370
چاک دامانی دلیل پاک دامانی	373
جناب یوسفؑ قید خانہ میں	375
بادشاہ مصر کا خواب اور یوسفؑ کی رہائی کا سامان	379
رہائی سے مقدّم بے گناہی کا ثبوت	381
حضرت یوسف علیہ السلام کرسی اقتدار پر	383
بھائیوں کی پہلی دفعہ حاضری اور جناب یوسف علیہ السلام کی فرمائش	384
بھائیوں کی دوسری دفعہ حاضری اور یوسفؑ کی اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس رکھ لینے کے لئے ترکیب	388
جناب یعقوب علیہ السلام کو اس کی اطلاع اور ان کا تاثّر	391
جناب یعقوبؑ کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت	392
بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اور ان کی توبہ وانابت	393
جناب یوسف علیہ السلام کی خوشبو اور پیرہن کا جناب یعقوب علیہ السلام تک پہنچنا اور بینائی کا پلٹنا	395
بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہونا اور سب کا یوسفؑ کے سامنے سربسجود ہونا	396
سُوْرَۃُ الرَّعْدِ	401
سورۂ رعد کے خاص خاص مضامین	401
کسی قوم میں تبدیلی نہیں ہوتی بغیر اپنے نفوس کی تبدیلی کے	405
کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز	407
بقائے اصلح	408
بُرائی کا مقابلہ بھلائی سے (عدم تشدّد)	410
یاد خدا سببِ اطمینانِ دل	411

عنوان	صفحہ نمبر
معجزہ کا حکم الٰہی پر انحصار	414
محو و اثبات بداء	415
رسولؐ کی حقانیت کے دو گواہ، کتاب اور عالم کتاب	418
سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ	418
سورۂ ابراہیم کے خاص خاص مضامین	419
رسول صلى الله عليه وسلم کو ہدایت کے لئے واقف زباں ہونے کی ضرورت	420
ایام الٰہی اور اوران کی یاد کی اہمیت	421
کفر کے ساتھ اعمال خیر رائگاں	424
اچھے اور بُرے کلموں کی مثال	426
حضرت ابراہیمؑ کی مناجات	430
حضرت ابراہیمؑ کی اواخر عمر میں اپنے والدین کیلئے دعائے مغفرت	431
قیامت میں آسمان وزمین کی تبدیلی	434
سُوْرَةُ الْحِجْرِ	434
سورۂ حجر کے خاص خاص مضامین	434
قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ	437
فرشتوں کو سجدۂ آدمؑ کا حکم اور شیطان کی سرتابی	441
قیامت تک سلسلۂ معصومین علیہ السلام کی بقاء کی ضمانت	442
دوزخ کے سات دروازے	443
اہل بہشت کے دلوں سے کینہ وعداوت کا دور ہونا	443
فرشتوں کا حضرت ابراہیمؑ کے یہاں آنا اور ولادت اسحٰقؑ کی بشارت	445
قوم لوط پر عذاب کے لئے اُنہی فرشتوں کا جانا	446
اصحاب ایکہ کا معذّب ہونا	447
اصحاب حجر کا تذکرہ	448
سبعہ مثانی اور قرآن	449
اعلانیہ تبلیغ کلام کا ابتدائی حکم	451
رسولؐ کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کا انجام	451
سُوْرَةُ النَّحْلِ	452
سورۂ نحل کے خاص خاص مضامین	452
اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ جنہیں گمراہ کیا ہے	458
ملائکہ اور اہل بہشت کے الفاظ سلام	460
ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متّحد ہونا	461
اہل ذکر سے سوال کا حکم	463
آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود	465
لڑکیوں کی ولادت پر رنجیدہ ہونا اہل جاہلیّت کا طریقہ	466
شہد کی مکھی کا ذکر	469
خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت	470
ہر امّت کا ایک گواہ اور ہمارے رسولؐ ان گواہوں کے گواہ	476
وہ آیت جو تمام اچھائیوں اور برائیوں کے احکام پر حاوی ہے	477
نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمّہ دار	480
تلاوت قرآن کے موقع پر اعوذ باللہ کہنے کا حکم	481
ضرورت کے وقت تقیّہ کا صریح حکم	483
حضرت ابراہیمؑ ایک عبادت گزار اُمت، اتباع ملّت ابراہیمؑ کا حکم	487
دعوت وتبلیغ کے لئے حکیمانہ انداز کی ہدایت، ضبط وتحمّل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید	489
سُوْرَةُ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ	491
سورۂ بنی اسرائیل کے خاص خاص مضامین	491
معراج پیغمبر اسلامؐ	492
بنی اسرائیل کی دو مرتبہ خراب کاری اور اس کی پاداش	495
نامۂ اعمال	497
ہلاکت اقوام کا عام نظام	498
حقوق والدین	501
فضول خرچی کی مذمّت	503
خرچ میں میانہ روی کی ضرورت	504
قانون قصاص	506
ناپ تول میں انصاف کا حکم	507
منکرین معاد کی رد	512

عنوان	صفحہ نمبر
مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم	513
شجرۂ ملعونہ	515
ہر دور کے لئے ایک امام کا وجود	520
اوقاتِ نماز	523
تمام انس و جن مل کر بھی قرآن کا جواب نہیں لا سکتے	529
پیغمبروں کی بشریّت	531
جناب موسیٰؑ کے معجزات	534
گریہ کی تعریف	536
جہر و اخفاء کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم	537
سُوْرَةُ الْكَهْفِ	538
سورۂ کہف کے خاص خاص مضامین	538
واقعۂ اصحاب کہف کا آغاز	540
اصحاب کہف کا غار میں داخل ہونا اور اس کا پس منظر	541
غار میں ان کے محلّ قیام کی خاص خصوصیّت	543
سگ اصحاب کہف کا ذکر	544
صدیوں کی نیند کے بعد ان کی بیداری	545
لوگوں کا ان کے محلّ قیام پر مطلع اور باہمی اختلاف کے بعد وہاں مسجد بنانے کا فیصلہ	546
تعداد میں اختلاف اور حقیقت کی طرف اشارہ	546
انشاء اللہ کہنے کا حکم	547
ایک مالدار اور ایک غریب دو ۲ ساتھیوں کی پیہم گفتگو	551
مال اور اولاد زندگی کی رونق لیکن آل کی اُمید اعمال سے	553
شیطان کا جنّات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود	555
حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد	560
حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد	561
حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی ابتدائی گفتگو	562
آغاز سفر اور خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینا	563
جنہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا ان کے یہاں کی دیوار کی بلا معاوضہ تعمیر	564
جناب خضر علیہ السلام کی طرف سے حقیقتوں کا اظہار	565
قصۂ ذوالقرنین کی ابتداء	566
یاجوج و ماجوج کا ذکر	570
کلمات الٰہی کی وسعت بے نہایت	573
حضرت محمدؐ کا مقام بشریت	574
سُوْرَةُ مَرْيَمَ	574
سورۂ مریم کے خاص خاص مضامین	574
جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور میراث انبیاء کا ثبوت	575
ولادت جناب یحییٰ علیہ السلام کی بشارت	577
جناب یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف	578
تذکرہ جناب مریمؑ اور ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی حال	580
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابن اللہ ہونے کی رد	582
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو	584
جناب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر	587
جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا تذکرہ	587
جناب ادریس علیہ السلام اور ان کی رفعت جسمانی	588
باغہائے بہشت کی اوصاف	589
اثبات معاد	592
دوزخ کی طرف سے عمومی گزر	592
ثبوت شفاعت	595
خالق کے لئے تصور اولاد کے جرم کی اہمیت	596
ایک خاص جماعت کی محبت کے فرض قرار دیئے جانے کا پیشگی اعلان	596
سُوْرَةُ طٰهٰ	598
سورۂ طٰہٰ کے خاص مضامین	598
جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تفصیلی بیان ---- آگ لینے کو جانا اور پیغمبری پانا	601

عنوان	صفحہ نمبر
عصا اور ید بیضاء	602
جناب موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور ہارون کو اپنا وزیر اور شریک کار بنانے کی التجا	602
جناب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور مدین جانا اور مراجعت	604
فرعون سے گفتگو میں نرمی اور رواداری برتنے کا حکم	605
جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو	606
ساحروں کے مقابلہ کا اہتمام	607
معجزہ کا عقلی معیار	608
ساحروں کی فرعون سے گفتگو	609
فرعون اور اس کی فوج کا غرق دریا ہونا	611
سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام	612
ثبوت شفاعت	615
جناب آدم علیہ السلام کا ترک اولیٰ	617
اوقات نماز کی طرف اشارہ	620
سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ	623
سورۂ انبیاء کے خاص مضامین	623
اہل ذکر سے سوال کا حکم	626
افعال الٰہی عبث نہیں، حق و باطل کے تصادم کا عام انجام	627
فرشتوں کے اوصاف	628
توحید کی مشہور دلیل اور "برہان تمانع"	628
توحید الٰہی تمام پیغمبروں کا متفقہ پیغام	630
معصومین علیہم السلام کی توصیف	631
ہر ذی حیات کی خلقت یا بقاء پانی سے، آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کی طرف اشارہ	632
ہر متنفس کے لئے موت کا مزہ چکھنا ضروری ہے	633
قیامت میں میزان اعمال	636
حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی اور اس کے پہلے اور بعد قوم سے گفتگو	637
خلیل خدا کا آگ میں پھینکا جانا اور آگ کا سرد ہو جانا	640
زراعت سے متعلق جناب داؤد و سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ	641
جناب داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی	642
جناب سلیمان علیہ السلام کا دوش ہوا پر پرواز کرنا	643
جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور ان کا صبر	643
حضرت یونس علیہ السلام کی شکم ماہی کے اندر تسبیح	645
جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت	645
یاجوج اور ماجوج کا ذکر	647
انجام کار میں نیکوکاروں کا مکمل اقتدار	650
خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحمۃ اللعالمین ہونا	651
سُوْرَةُ الْحَجِّ	654
سورۂ حج کے خاص مضامین	654
قیامت کا زلزلہ	655
ادوارِ انسانی کی تبدیلیوں سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی	656
اختلافِ عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں	660
کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے سر بسجود	661
کعبہ پر سب کا برابر سے حق	663
سب سے پہلے ندائے حج اور اس کی تاثیر کے لئے اللہ کی ضمانت	664
اللہ کی حرمتوں کی عزت	665
شعائرِ الٰہیہ کی تعظیم کا حکم	666
حیواناتِ قربانی مجملہ شعائر اللہ	667
اصل چیز قربانی کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اصل خوشنودیِ خدا کی فکر	668
دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت	669
اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر	671
پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی	673
مختلف طریقے عبادت کے اللہ کی طرف سے آتے رہے نہ کہ مختلف معبود	679
مکھی کی مثال سے انسان کی عاجزی کا ثبوت	681
انبیاء کا انتخاب نوعِ انسان سے نہ کسی دوسری نوع سے	682
دین میں عسر و حرج کی نفی اور "مسلم" نام کی ابتداء	683

عنوان	صفحہ نمبر
سُوۡرَۃُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ	684
سورۂ مومن کے خاص خاص موضوعات	684
نجات کے حق دار اور اہل ایمان کے اوصاف	685
خلق انسانی پر خالق کی نوازش	687
کشتیٔ نوح	690
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جنابِ مریم سلام اللہ علیہا قدرت خدا کی ایک نشانی	693
حق انسانی آراء اور خواہشات کا تابع نہیں ہوسکتا	697
اثباتِ توحید میں برہانِ تمانع کی زیادہ واضح تقریر	701
برائی کے مقابلہ میں بھلائی کرنے کی تعلیم	703
سُوۡرَۃُ النُّوۡرِ	706
سورۂ نور کے خاص خاص مضامین	707
جنسی گناہ (زنا) کی حدِ شرعی	708
ثبوت زنا کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت، عدم ثبوت پر الزام	
لگانے والوں پر حد شرعی کا اجراء	709
لعان کی صورت اور اُس کی ترکیب	710
واقعہ ''افک'' اور اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمّت	711
ایسی خبر کو سُن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی سرزنش	712
گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت اور اسلام کا حکم	718
اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت	719
خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت	720
نکاح کی ترغیب	721
غلام وکنیز کے مکاتبہ کا حکم	722
آیۂ نور	724
عبادت الٰہی کے اوقات کا لحاظ رکھنے کے ساتھ تجارت کی تعریف	725
کافروں کے اعمال خیر وخیرات کا بے کار ہونا	726
ہر جاندار کی خلقت پانی سے	728
صاحبِ ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ	732
گھر کے خاص افراد یہاں تک کہ بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ	734
ضعیف العمر عورتوں کے لئے برقع چھوڑنے کی اجازت کے باوجود	
پردہ داری کی تاکید	735
صاحبان ایمان کی شان	737
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے امتیازی طور پر تعظیم واحترام کا حکم	738
سُوۡرَۃُ الۡفُرۡقَانِ	738
سورۂ فرقان کے خاص خاص مضامین	739
تعلیماتِ پیغمبر خداؐ اور قرآن کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں	740
آتش دوزخ کی کیفیت کا تفصیلی بیان	742
فرشتوں کا عام لوگوں کے سامنے آنا قیامت سے وابستہ	745
وہ فلاں شخص جو قیامت تک گمراہی کا ذمہ دار ہے	746
پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ الٰہی میں شکایت	747
قرآن مجید کے بتدریج اتارے جانے کی حکمت	748
پست کردار انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا	752
پانی کا ذریعہ طہارت ہونا	753
میٹھے اور کھارے پانی کے سنگم میں قدرتِ الٰہی کا ظہور	755
نسبتی رشتہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ بھی تقاضائے فطرت	755
اجرِ رسالت جو طلب ہو اللہ کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے	756
اللہ کے بندوں کی شان	759

****

تفسیر فصل الخطاب

جلد دوم

سورہ	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ	23
سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ	191
سُوْرَۃُ یُوْنُسَ	288
سُوْرَۃُ یُوْسُفَ	363
سُوْرَۃُ اِبْرَاھِیْمَ	418
سُوْرَۃُ النَّحْلِ	452
سُوْرَۃُ الْکَھْفِ	538
سُوْرَۃُ طٰهٰ	598
سُوْرَۃُ الْحَجِّ	654
سُوْرَۃُ النُّوْرِ	706

سورہ	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ	99
سُوْرَۃُ الْبَرَآءَۃِ	230
سُوْرَۃُ ھُوْدٍ	324
سُوْرَۃُ الرَّعْدِ	401
سُوْرَۃُ الْحِجْرِ	434
سُوْرَۃُ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ	491
سُوْرَۃُ مَرْیَمِ	574
سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَآءِ	623
سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ	684
سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ	738

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ

مکیّہ......۱۶۵......آیات

''انعام'' کے معنی چوپایہ جانوروں ہی کے ہیں چونکہ اس سورہ میں حلال وحرام جانوروں کا نمایاں طور پر ذکر ہے، اس لئے اس سورہ کا یہ نام ہوا۔

اس سورہ کو عام طور پر مکیّہ یعنی مکۂ معظّمہ کا انزال شدہ قرار دیا گیا ہے، حالانکہ زیادہ تر تصور یہ ہے کہ فروعِ دین یعنی احکام حلال وحرام کی آیتیں مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی ہیں، اس کے لئے ایک قول یہ ہے کہ وہ پورا مکہ کا نازل شدہ ہے مگر چند خاص آیتیں اس کی مدینہ میں اتری ہیں۔ [۱]

اس کے خلاف ایک حدیث میں ہے کہ سورۂ انعام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پورا ایک ہی دفعہ میں اترا ہے۔ [۲]

اس صورت میں اس کی آیتوں کو مکی اور مدنی کا مجموعہ اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے، جب یہ مانا جائے جو کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ترتیب قرآن کے وقت اس میں کچھ آیتیں ایسی مل گئیں جو دراصل اس سورہ کا جزء نہ تھیں مگر یہاں یہ اس لئے قابل قبول نہیں معلوم ہوتا کہ نام ہی اس سورہ کا انعام انہی آیات کی بنا پر ہے جو حلال وحرام جانوروں کے احکام کو بتاتی ہیں لہٰذا یہ تصور زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ تمام فروعی احکام میں غذا کی حلّت وحرمت ایسا اہم امر ہے کہ تمام احکام شرعی میں سب سے پہلے یعنی مکہ معظّمہ ہی میں اس کے احکام نازل کر دیئے گئے۔

اور حقیقت میں بحیثیت کلیہ یہ تصور ہی کہ احکام شرعیہ کا اجراء یا شریعت کا نفاذ بس مدینہ کی ہجرت کے بعد ہوا ہے، بے بنیاد امر معلوم ہوتا ہے جب کہ عبادات میں نماز اور معاملات واحکام میں قواعد ازواج وغیرہ ایسے نظام زندگی کے ضروریات سے متعلق احکام یقیناً مکہ معظّمہ میں بھی جاری تھے اور لفظ ''شریعت'' بھی قرآن میں اسی دور میں اتر چکا ہے۔

جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ (سورۃ جاثیة)

ہم نے آپ کو دینی حیثیت سے ایک شریعت کا پابند بنایا ہے تو آپ اس کی پیروی کیجئے اور جاہلوں کے دل بخواہ خیالات پر عمل نہ کیجئے۔

یہ مکی سورہ ہے لہٰذا یہ سمجھنا کہ شریعت ہجرت مدینہ کے بعد آئی ہے، درست نہیں ہے۔

سورۂ انعام کے خاص خاص مضامین

ا----خالق کے علم کی ہمہ گیری

---

[۱] ۔عن ابن عباس غیر ست اٰیات : وما قدر اللہ حق قدرہ الیٰ اٰخر ثلٰث اٰیات: قل تعالوا اتل ماحرم ربکم الیٰ اٰخر ثلٰث اٰیٰت فانھن نزلن بالمدینة وفی روایة اُخریٰ عنہ غیر ثلٰث اٰیات: قل تعالوا اتل الی اخر الثلث (مجمع البیان)

[۲] ۔روی عن انس بن مالك انه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه واله مانزل علیٰ سورہ من القراٰن جملة غیر سورۃ الانعام وروی عن ابن ابی عبداللہ علیه السلام انه قال ان الانعام نزلت جملة (تبیان)

۲-----حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال

۳-----اجرامِ سماویہ کی الوہیت کی نفی اور اللہ حق کا اثبات

۴-----نفی رویت

۵-----رواداری کی تعلیم اور معبودانِ باطل کو سب وشتم سے ممانعت

۶-----عدلِ الٰہی

۷-----اولاد کشی کی مذمت

۸-----اموال ایتام کی حرمت

۹-----فرقہ بندی کی مذمت

۱۰-----انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض وغایت-----وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان ہے"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّہِمْ یَعْدِلُوْنَ ①

"سب تعریف اللہ کے لئے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور اجالے کو قرار دیا، پھر بھی وہ جو کافر ہیں، اپنے پروردگار کا برابر دار دوسروں کو قرار دیتے ہیں۔"

ظلمت کو بطور جمع ظلمات اور نور کو بصیغۂ مفرد لایا گیا ہے، یہ ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ دنیا میں باطل زیادہ اور حق کم ہے [ا] پھر آسمان اور زمین کے لئے خلق اور ظلمات ونور کے لئے جَعَلَ کا لفظ صرف کیا گیا ہے۔اس میں اگرچہ صرف تفنن فی التعبیر بھی ہوسکتا ہے جو شانِ فصاحت کے منافی نہیں ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ دونوں میں یہ فرق سمجھا جائے کہ آسمان اور زمین تو بلا شبہ دونوں وجودی چیزیں ہیں لہٰذا خلق بمعنی عطائے وجود دونوں سے یکساں طور پر متعلق ہے لیکن نور اور ظلمت میں نور وجودی چیز ہے اور ظلمت عدمی چیز ہے۔اس لئے جَعَلَ کا لفظ صرف کیا گیا ہے یعنی ایسا نظام مقرر کیا ہے جس کے ماتحت کبھی روشنی ہوتی ہے اور کبھی تاریکی۔اس سے ظلمت کا مستقل طور پر متعلق ایجاد وتخلیق ہونا لازم نہیں آتا۔

ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ②

"وہ وہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔پھر ایک مدت طے کی اور ایک اور مقررہ مدت ہے، اس کے یہاں، پھر

[ا] ۔جمعھا دونہ لکثرۃ اسبابھا (جلالین) راہ صحیح ایک ہے اور اس کے سوا سب راہ غلط ہیں وہ بہت ہیں (موضح القرآن)

بھی تم شک کرتے ہو۔‘‘ ’’مٹی سے پیدا کیا۔‘‘

یہ آغاز نسل انسانی کا ذکر ہے جب ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے [۱] اور اکثر جگہ جو کہا گیا ہے کہ پانی سے پیدا کیا، وہ ہر ہر آدمی کے لحاظ سے ہے جبکہ سلسلہ نسل انسانی کا آگے بڑھ چکا ہے چنانچہ اس آیت میں کہ: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۞۱۲ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۞۱۳ ان دونوں باتوں کو جمع کر دیا گیا ہے یعنی کہا گیا ہے کہ ’’ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا...... پھر (یہ نظام مقرر کیا کہ) اسے نطفہ کی صورت میں ایک محل خاص (شکم مادر) میں رکھا‘‘۔ (سورۂ مومنون)

’’ایک مدت مقرر کی‘‘ ...... یہ ہر آدمی کی عمر ہے جس کے بعد دنیا سے اٹھا لیا جائے گا اور ’’ایک اور مقررہ مدت‘‘ یہ تمام نوع انسانی کے دورِ بقاء کی مدت ہے جس کے بعد قیامت آئے گی۔ [۲]

پہلی عمر اور اس کا انجام ہر شخص کے مشاہدہ میں ہے۔ اس سے دوسری مدت اور اس کے انجام کا بھی یقین کرنا چاہیے مگر انسان اس غیب کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس میں شک کرتا ہے اسی پر سرزنش کی گئی ہے کہ:

ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ’’پھر بھی تم شک کرتے ہو۔‘‘

ایک دوسری تفسیر ہمارے یہاں کی یہ ہے جس کے متعلق معصومؑ سے بھی روایت وارد ہوئی ہے کہ پہلی مدت جسے کہا گیا ہے کہ قَضٰٓى اَجَلًا ’’اس نے ایک مدت طے کر دی ہے‘‘ یہ فیصلہ شدہ مدت وہ لوح محفوظ والی ہے جس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں اور بعد میں جو کہا گیا ہے: وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ’’اور ایک نامزد مدت اس کے یہاں ہے‘‘ یہ ’’لوح محو و اثبات‘‘ والی مدت ہے جس میں مختلف اسباب سے تغیر و تبدل ہوتا ہے جسے اصطلاح مذہب میں بداء کہتے ہیں۔ [۳] ....

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۞۳

’’اور وہ اللہ ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی۔ وہ تمہارے ظاہر اور پوشیدہ ’’ہر امر کو جانتا ہے اور جانتا ہے اسے جو تم کرتے ہو‘‘۔

’’آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی‘‘ یعنی لامکان ہے۔ کسی خاص محل میں محدود نہیں ہے۔ [۴]

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۞۴ فَقَدْ كَذَّبُوْا

---

[۱] ۔ خلقکم من طین بخلق ابیکم ادم منہ (جلالین) فلما کان اصلتا من طین جاز ان یقول: خلقکم من طین (تبیان)

[۲] ۔ یعنی بالاجلین اجل الحیوٰۃ الی الموت واجل الموت الی البعث وقیام الساعۃ (مجمع البیان)

[۳] ۔ عن ابی عبداللہ قال: الاجل المقضی ھو المحتوم الذی قضاہ اللہ وحتم والمسمی ھو الذی فیہ البدا یقدم مایشاء ویؤخر مایشآء والمحتوم الذی لیس فیہ تقدیم ولا تاخیر (علی بن ابراھیم)

[۴] ۔ ان جعلت فی السمٰوٰت خبرا بعد خبر فیکون التقدیر ھو اللہ وھی فی السمٰوٰت وفی الارض یعنی انہ فی کل مکان (مجمع البیان) وفی الاٰیۃ دلالۃ علٰی فساد قول من قال انہ تعالٰی فی مکان دون مکان (تبیان)

بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝۵

''اوران کے پاس کوئی نشانی ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس حق کو بھی جھٹلا دیا[1] جب وہ ان کے پاس آیا۔ اب انہیں بہت جلدی ان باتوں کی جن کا مذاق وہ اڑاتے تھے، خبریں سامنے آئیں گی''۔

یعنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد خوب معلوم ہوجائے گا کہ عذاب الٰہی کیسا ہوتا ہے۔[2]

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۝۶

''کیا انہوں نے دیکھا کہ کتنے دوروں کے افراد کو[3] ان کے پہلے ہم نے ہلاک کردیا جنہیں ہم نے زمین میں اقتدار دیا تھا جو تمہیں نہیں دیا ہے اور جن پر ہم نے آسمان سے موسلا دھار بارش رحمت کی تھی اور ہم نے نہریں بنائی تھیں جو ان کے پیروں کے نیچے سے بہتی تھیں۔ پھر ان کے گناہوں کی بدولت انہیں ہم نے ہلاک کردیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری نسلیں پیدا کیں''۔

یہ گزشتہ امتوں کے انجام کی طرف نظروں کو موڑ کر خود انہیں اپنے انجام کے متعلق اندیشہ ناک ہونے کی تحریک ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝۷

''اور اگر ہم آپ پر لکھی ہوئی تحریر اتارتے اور یہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو''۔

نہ ماننے کے لئے لاکھ بہانے ہوتے ہیں چنانچہ کافروں کا ایک بہانہ رسول ﷺ کی حقانیت کو تسلیم نہ کرنے کا تھا کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ اسے رسول ﷺ زبانی سناتے ہیں اور پھر اسے تحریر کیا جاتا ہے۔ اگر خدا کی کتاب ہے تو آسمان ہی سے تحریری صورت میں کیوں نہیں اترتی؟! مگر یہ سب باتیں صرف عناد کے طور پر نہ ماننے کے لئے تھیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر یہ صورت بھی ہوتی اور لکھی لکھائی شکل میں کتاب اترتی، تب بھی کافر لوگ اسے جادو کہہ کر انکار کرتے اور ایمان پھر بھی اختیار نہ کرتے۔

---

[1]۔ ای بالحق الذی اتی بہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من القراٰن وسائر امور الدین (مجمع البیان)

[2]۔ سوف یأتیھم خبر العذاب الذی ینزل بھم عقوبۃ علیٰ کفرھم (تبیان)

[3]۔ قال الزجاج عندی ان القرن اھل کل مدۃ کان فیھا نبی او کان فیہ طبقۃ من اھل العلم قلت السنون او کثرت (تبیان)

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸

''اور انہوں نے کہا کہ ان پر فرشتہ کیوں نہیں اترتا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس فیصلہ ہی ہوتا، پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی۔''

رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر فرشتے اترتے ہی تھے مگر کافروں کا مطلب یہ تھا کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے فرشتہ کو اترتے دیکھیں کہ وہ اتر کر ہمارے سامنے ان کی سچائی کی گواہی دے [1] اب جیسا کہ گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا، سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ جب فرمائشی معجزے دکھا دیئے جاتے ہیں تو پھر انکار کرنے پر فوراً عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے، اس لئے کہا گیا ہے کہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی فرمائش کے مطابق اگر فرشتے اترتے تو پھر عذاب خدا سے ان کی مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ [2]

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹

''اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے تو بھی اسے انسان کی شکل میں قرار دیتے اور انہیں پھر بھی ایسے ہی شبہے کرنے کا موقع دیتے جیسے شبہے وہ اب کر رہے ہیں [3]۔''

مشرکین کا ایک بہانہ عدم قبول کا یہ تھا کہ آخر ہم اپنے ایسے آدمیوں کو کیوں مانیں؟! خدا کو پیغمبر بھیجنا تھا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ فرشتہ کا بھیجنا سنت الٰہیہ اور حکمت ربانی کے خلاف ہے فرشتہ بھی ہوتا تو ظاہری صورت میں وہ انسان ہی ہوتا کیونکہ بغیر اس کے وہ نمونۂ عمل پیش نہیں ہوسکتا جس کی پیروی مطلوب الٰہی ہے تو اس وقت بھی یہ ایسی ہی گمراہی کی باتیں کہتے جیسی اس وقت کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ اس وقت وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہی نہ کہ یہ انسان کیوں ہے؟ چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا کیوں ہے؟ تو جب وہ ملک ہوتے ہوئے بھی شکل انسانی میں ہوتا تو بھی یہ لوگ ایسی ہی گمراہی کی باتیں کرتے تو ان کی ان باتوں کے سدباب کے لئے ہم ان مفید حکمت کے تقاضوں کو نظر انداز تھوڑی کر دیں گے جو رسول کے ہم جنس ہونے ہی سے وابستہ ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی گمراہی کے ہم سبب ہوں گے بلکہ یہ کہ ان کی گمراہی کا جو اُن کی غلط ذہنیت کا نتیجہ ہے، ہم اپنے طرز عمل کو بدل کر سدباب نہیں کریں گے۔

پھر یہ بھی پہلو بعض علماء نے پیش کیا ہے کہ قرآن نے اس شبہ و گمراہی میں مبتلا کرنے کو ان کے ملک قرار دینے کے ساتھ وابستہ کیا ہے کہ اگر ملک بناتے تو ایسا ہوتا اور جب ملک بنایا ہی نہیں تو اس گمراہ کرنے کا وقوع بھی نہیں ہوا۔ [4]

---

[1] ملك يصدقه (جلالين) نشاهده (مجمع البيان)

[2] معنى لقضى الامر اى اتم هلاكهم (تبيان)

[3] هر آئينه مشتبهه مى كرديم بر ايشاں انچه الحال اشتباه مى كنند (شاه ولى الله) كانوا يلبسون على ضعفتهم فى امر النبى ﷺ فيقولون انما هذا بشر مثلكم (مجمع البيان) البتہ شبہ ڈالتے ہم اوپر ان کے جو شبہ کرتے ہیں یہ (شاہ رفیع الدین)

[4] لم يخبر انه ليس عليهم وانما قال لو جعلناه ملكا للبست ولم يجعله ملكا فاذا ماليس (تبيان)

مگر جو مفہوم پہلے بیان ہو چکا، وہ حقیقت حال کی مطابقت کے اعتبار سے بھی اور دوسرے مقامات پر جو قرآنی تعبیرات ہیں، ان کی موافقت کے لحاظ سے بھی زیادہ مناسب ہے۔

انبیاء اور تمام معصومینؑ واقعی بشر ہوتے ہیں، نہ کہ فقط بصورت بشر

بے شک اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انبیاء اور تمام معصومینؑ حقیقت میں بشر اور انسان ہی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں ملک یا کسی دوسری نوع کے افراد ہوں اور صورۃً انسان ہوں کیونکہ اسے قرآن نے ''فرض غیر واقع'' کے طور پر بیان فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہے نہیں۔ نہ ایسا ہے کہ وہ ملک ہوں اور بہ شکل بشر بھیجے گئے ہوں اور نہ کوئی دوسری جنس۔ اس لئے کہ جو حکمتِ الٰہیہ ملک کو رسول بنانے سے سدراہ ہے، وہی کسی دوسری جنس سے بھی سدراہ ہے یعنی وہ حکمت اس کی متقاضی ہے کہ رسول کو عامۂ خلائق کا ہم جنس ہونا چاہیے جو صرف صفاتِ شخصی میں ان پر امتیاز رکھتا ہو جو ایک رہنما کے شایانِ شان ہے۔

نوع یا جنس میں الگ ہوتا تو مقصد رسالت و رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۟﴿۱۰﴾

''اور آپ کے پہلے بہت پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تو جنھوں نے ان کا مذاق اڑایا تھا، انہیں اسی عذاب نے آ کر گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ [۱]

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

''کہیے کہ روئے زمین پر چلو پھرو۔ پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا''؟!

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

''کہیے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے ذمہ رحمت کرنا عائد کر لیا ہے [۲] وہ تم سب کو یقیناً روز قیامت تک جس میں کوئی شک نہیں، اکھٹا کرتا رہے گا جنھوں نے خود اپنا نقصان کیا تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اسی کا ہے جو رات اور دن میں سکونت پذیر ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا

---

[۱] ۔ ای نزل بھم العذاب (علی بن ابراھیم)

[۲] ۔ کتب قضیٰ (جلالین)

جاننے والا۔"

"اکٹھا کرتا رہے گا" یعنی ابھی تم پر عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ مہلت اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو آنے کا موقع دیتا ہے تا کہ جب بھی آنکھیں کھل جائیں، وہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں، یہ کتنی بڑی خدا کی مہربانی ہے جو تمام افراد انسانی کے شامل حال ہے[1] پہلی آیت میں مَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اللہ کے اقتدار کی ہمہ گیری اجزائے ظرف مکان کے اعتبار سے بتائی گئی تھی اور دوسری میں لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ کہہ کر اس ہمہ گیری کو اجزائے ظرف زمان کے اعتبار سے بتایا گیا ہے۔[2]

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ⑭

"کہیے کہ کیا کسی دوسرے کو میں سرپرست بناؤں اللہ کے سوا جو آسمانوں کا اور زمین کا وجود میں لانے والا ہے اور وہ روزی دیتا ہے، اسے کوئی روزی نہیں پہنچاتا۔ کہیے کہ میں مامور ہوں اس پر کہ اول درجہ کا مسلم رہوں اور (یہ حکم ہے مجھے کہ)[3] تمہیں مشرکوں میں سے نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ بھی ایک انداز گفتگو ہوتا ہے کہ جس غلطی پر دوسروں کو متنبہ کرنا ہے، اسے انسان خود اپنے اوپر رکھ کر کہہ دے۔ یہ اور اس کے بعد کی آیت دونوں اسی انداز کی حامل ہیں۔

اول من اسلم کا ترجمہ جو ہم نے کیا "اول درجہ کا مسلم رہوں" اس کی نظیر پہلے ہی پارہ میں آچکی ہے لیکن اکثر دوسرے لوگ اس اوّلیت کو باعتبار زمانہ قرار دیتے ہیں تو انہیں قید لگانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ "سب سے پہلا مسلمان اس امت میں"۔[4]

اور بعض لوگ اسے خلقت نوری میں اوّلیت پر منطبق کرتے ہیں کہ جب یہ اول مخلوق ہیں تو اول مسلم اور اول مومن بھی یہی ہیں۔ آدم اور دیگر بنی آدم سب ان کے بعد ہیں۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑮ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ⑯

"کہیے کہ میں ڈرتا ہوں، اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے۔ وہ

---

[1] ۔ای کتب علیٰ نفسه الایستاصلکم ولا یعجل عقوبتکم بل یعذرو ینذرو یجمع اٰخرکم الی اولکم قرنا بعد قرن الی یوم القیامة (تبیان)

[2] ۔ انما ذکر اللیل والنهار هنا وذکر السمٰوٰت والارض فیما قیل لان الاول یجمع المکان والثانی یجمع الزمان وهما ظرفان لکل موجود (مجمع البیان)

[3] ۔وقیل لی لا تکونن من المشرکین (جلالین) ای امرت بالایمان ونهیت عن الشرك (مجمع البیان)

[4] ۔یعنی من هذا الامة (تبیان)

(عذاب) اس دن جس سے الگ رہا، اس پر اس (خالق) نے بڑا رحم کیا ہے[1] اور یہ نمایاں کامیابی ہے“

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۷ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۱۸

”اور اگر اللہ تمہیں کسی سختی سے دوچار کرے تو اس کا دور کرنے والا اس کے کوئی نہیں اور اگر کوئی بھلائی تم تک پہنچائے تو بھی وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، اور وہ اپنے بندوں سے بالا دست قابو رکھنے والا ہے اور وہ صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا باخبر۔“

یعنی وہ اپنی بالا دستی اور قدرت سے اندھا دھند کام نہیں لیتا[2] بلکہ بمقتضائے حکمت ضبط و تحمل سے کام لیتا ہے اور باخبر ہونے کے بعد نظام عالم کے تمام مفادات کو سامنے رکھ کر جب محل ہوتا ہے، تب سزا دیتا ہے اور ظالمین کو مہلت دیتا ہے بلکہ خوب دنیوی نعمتوں سے نوازتا ہے اور پھر جب وقت آتا ہے، تب اپنے عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ۫ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۫ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۱۹

”کہیے کہ گواہی میں سب سے بڑھ کر کون چیز ہے؟[3] کہہ دیجئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف اس قرآن کی وحی بھیجی گئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں اور جس تک وہ پہنچے، متنبہ کروں۔ کیا تم اس بات کے گواہ ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا ہیں؟ کہیے کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دیتا کیونکہ وہ تو بس ایک خدا ہے اور میں اس سے کہ جو تم شرک کرتے ہو، بے تعلق ہوں۔“

”سب سے بڑھ کے کون چیز ہے“ کہ جواب میں ”اللہ“ کہنا اس کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ ذات الٰہی پر شے کا اطلاق درست ہے[4]

”تمہیں اور جس تک وہ پہنچے“ اس سے آپ کی رسالت کی ہمہ گیری زمان و مکان کے اعتبار سے ثابت ہوتی ہے یعنی اس کا دائرہ نہ کسی جغرافیائی احاطہ میں محدود ہے اور نہ اس کے حدود سے کوئی زمانہ خارج ہے۔[5]

---

[1] فقد رحمه الله (مجمع البيان)

[2] معناه انه مع قدرته عليهم لا يفعل الا ما تقتضيه (تبيان)

[3] چه چیز معتبر تر است در باب شهادت (شاه ولی الله)

[4] فی الاية دلالة على من قال لا يوصف تعالى بانه شئ (تبيان)

[5] ای لا خوف به من بلغه القران الى يوم القيمة (مجمع البيان)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

''جنہیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ انہیں اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ جنہوں نے اپنے کو خسارے میں ڈالا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

اس مضمون کی آیت پہلے دوسرے پارہ میں آچکی ہے وار یہ آیت بھی اس کا ثبوت ہے کہ اس سورہ کو تمام وکمال مکیّہ سمجھنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ مکہ میں اہل کتاب سے کوئی سابقہ نہ تھا تا کہ ان کے تذکرہ کا محل ہوتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے بلا شبہ جو ظالم ہوں، وہ کسی طرح کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے۔''

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور یہ ایک روادارانہ انداز تبلیغ ہے کہ کھل کر مخاطبین کو نہیں کہا جاتا کہ تم ظالم ہو بلکہ اس طرح گفتگو کر کے خود انہیں غور کرانے یا ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یاد رکھو کہ اگر میں غلط دعوائے رسالت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف منسوب کر کے غلط کلام پیش کرتا ہوں تو بلا شبہ مجھ سے زیادہ ظالم کوئی نہیں اور اگر میں ٹھیک کہتا ہوں مگر تم یا کوئی اس کی تکذیب کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اور بہر حال جو ظالم ہوں، وہ کبھی فلاح یعنی دین و دنیا کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وہ حکیمانہ اندازِ کلام ہے جسے مختلف الخیال جماعتوں کے سامنے اس دور میں اختیار کیا جاتا ہے تو سطحی نظر والے اپنی جماعت کے آدمی چیخ اٹھتے ہیں کہ اس میں عقائد و مسلمات کو مشکوک بنا دیا گیا ہے مگر قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے اور وہی روح تبلیغ اور حکیمانہ تخاطب کی جان ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ دونوں باتیں مشرکین ہی پر منطبق ہیں کہ وہی اللہ پر افتراء کرنے والے تھے کہ اس کا شریک قرار دیتے تھے یا اس کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے[1] اور وہی آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والے تھے مگر ہمارے خیال میں اس صورت میں درمیان میں ''اَوْ'' نہ ہوتا جس کے معنی ''یا'' کے ہیں بلکہ ''وَ'' ہوتا جس کے معنی ''اور'' کے ہوتے۔ اس لئے کہ اگر افتراء سے یہ مراد ہے تو وہ افتراء اور تکذیب تو ان میں مجتمعاً تھی نہ کہ ان میں سے کوئی ایک بات۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا

---

[1] ۔ معناہ ومن اکفر ممن اختلق علی اللہ کذبا فاشرک بہ الالٰهتہ (مجمع البیان)

يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾

''اور جس دن ہم ان سب کو میدانِ حشر میں لائیں گے، پھر ان سے جنہوں نے شرک اختیار کیا تھا، کہیں گے کہ کہاں ہیں تمہارے وہ شریک [۱] جن کا تم گمان باطل کرتے تھے؟ پھر کوئی ترکیب ان کے پاس نہ ہوگی سوا اس کے کہ وہ کہیں کہ قسم ہمارے پروردگار اللہ کی، ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو! کس طرح یہ خود اپنے اوپر جھوٹ باندھنے لگے اور جو کچھ یہ جھوٹ باندھا کرتے، وہ ان سے غائب ہو گیا۔''

لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ ا ہم نے جو ترجمہ کیا ہے ''کوئی ترکیب ان کے پاس نہ ہوگی'' یہ اکثر تفسیروں کے مطابق ہے۔[۲] اس کے علاوہ ایک دوسری تفسیر کے مطابق یہ معنی ہیں کہ ''اب ان کے پاس کوئی جھوٹ بولنے کو نہیں رہ جائے گا، سوا اس کے کہ وہ یہ کہیں یعنی بس مکر جائیں کہ ہم کبھی مشرک تھے ہی نہیں۔ [۳]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٥﴾

''اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو آپ کی بات غور سے سنتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اسے سمجھتے نہیں اور ان کے کانوں میں بھاری پن [۴] اور اگر وہ ہر ہر طرح کا معجزہ دیکھ لیں [۵] جب بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ جب آپ کے پاس بحث کرتے ہوئے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ نہیں ہیں مگر اگلے لوگوں کی داستانیں''۔ [۶]

غور سے سننا کبھی طلب حق کے لئے ہوتا ہے اور کبھی اس لئے کہ اس میں نکتہ چینی کی کوشش کی جائے ایسا آدمی سنتا تو بڑے غور سے ہے مگر اس سے فائدہ کچھ نہیں اٹھاتا، اس لئے کہ اس کی نیت بخیر نہیں۔ یہی ان کی نفسیاتی کیفیت وہ ہے جسے دلوں پر پردہ اور کانوں میں بھاری پن سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ ان کی بدنیتی کا ایک لازمی نتیجہ ہے جس سے اللہ کی توفیقات خیر ان سے سلب ہو جاتی ہیں، اس لئے اس کی پوری ذمہ داری خود ان پر ہوتے ہوئے، اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ہم نے ایسا کیا۔

---

[۱]۔ انما اضاف الشرکاؤ الیهم لانهم اتخذوها لانفسهم (مجمع البیان)

[۲]۔ فتنتهم۔ ای معذرتهم (جلالین) بنا شد عذر ایشاں (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ فتنتهم ای کذبهم (علی بن ابراهیم)

[۴]۔ در گوش ایشان گرانی (شاہ ولی اللہ) وقرا صمما (جلالین)

[۵]۔ کل علامة ومعجزة تدلهم علی نبوة النبی ﷺ (تبیان)

[۶]۔ قصهائے پیشنیان (شاہ ولی اللہ) کہانیاں پہلوں کی (رفیع الدین) اساطیر اکاذیب (جلالین)

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُّهْلِكُوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور وہ ان کی طرف سے روکتے ہیں اور خود ان سے دور رہتے ہیں اور وہ نہیں ہلاکت میں ڈالتے مگر خود اپنے کو اور انہیں شعور نہیں ہے۔''

سلسلۂ آیات سے بآسانی جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ انہی کا ذکر ہے جن کے تاریک کردار کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے اور اس طرح ''ان کی طرف سے روکتے ہیں'' کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آنے اور ان کی بات ماننے سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں مگر اس میں ذرا سی خلش ذہن کو یہ محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں کو روکنے کے بعد خود ان کے دور رہنے کا ذکر جیسے افادیت کا حامل نہیں ہے۔

ایک تفسیر جس کے متعلق گمان قوی یہ ہے کہ روایت پر مبنی ہے، یہ ہے کہ یہ کچھ بنی ہاشم کے کردار کا بیان ہے جو حمیت خاندانی یا جناب ابوطالبؑ کے اثر سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان کی دشمنوں سے حفاظت کرتے تھے جس کو کہا گیا ہے کہ ان کی طرف سے روکتے ہیں یعنی ان کی ایذا رسانی سے مخالفین کو باز رکھتے ہیں مگر خود ان پر ایمان نہیں لاتے [1] ایسے افراد کے کردار کا ذکر جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں بھی ملتا ہے جو نہج البلاغہ میں موجود ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اور کاش تم دیکھو جب وہ آتش دوزخ پر کھڑے کئے جائیں گے تو وہ کہیں گے کاش ہم پلٹا دیئے جاتے اور پھر اپنے پروردگار کی نشانیوں کو نہ جھٹلاتے اور ایمان لانے والوں میں ہوتے، بلکہ ظاہر ہو گیا ان کے لئے، وہ جو چھپاتے تھے پہلے [2] اور اگر یہ پلٹائے جائیں گے تو پھر وہی کریں گے۔ جس سے انہیں ممانعت ہوئی ہو اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''یعنی دوزخ کے کنارے پہنچ کر حکم ہو گا کہ ٹھہراؤ تو کافروں کو توقع پڑے گی کہ شاید ہم کو پھر دنیا میں بھیجیں تو اب کی بار کفر نہ کریں اور ایمان لاویں۔ سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس واسطے ان کو نہیں ٹھہرایا بلکہ اس تدبیر سے ان کے منہ سے اقرار کرا دیا کہ ہم نے کفر کیا تھا'' (موضح القرآن)

علامہ طبرسیؒ کا خیال ہے کہ ''وقفوا'' کے یہ معنی ہیں ہی نہیں کہ وہ کھڑے کئے جائیں گے بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ داخل جہنم کئے جائیں

---

[1] قال بنو ہاشم کانوا ینصرون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ویمنعون قریشا عنہ وینأون عنہ ای ...لا یؤمنون (علی بن ابراھیم)

[2] ظھرت فضیحتھم فی الاخرۃ وتھتکت استارھم (مجمع البیان)

گے اور اس طرح وہ اپنے مشاہدہ واحساس کے ساتھ اس کی حقیقت سے واقف بنا دیئے جائیں گے۔[1]

تمنا اگرچہ بذات خود سچ اور جھوٹ سے متصف نہیں ہوسکتی مگر اس تمنا میں بطور اظہار واقعہ ایک خبر بھی مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم دنیا میں دوبارہ جائیں تو پھر آیات الٰہی کو نہ جھٹلائیں گے اور ہم مومنین میں سے ہوں گے، آخر میں انہیں جھوٹا اسی خبر کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

وَقَالُوۡۤا اِنۡ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِيۡنَ ﴿۲۹﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے مگر ہماری یہی دنیوی زندگی اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

اگر اس آیت کو مستقل طور پر دیکھا جائے تو یہ ترجمہ ہوگا جو ہم نے کیا ہے اور یہ عام دہریوں کا نقطۂ نظر ہے جو ہر دور میں منکرین خدا اور منکرین آخرت کا رہا ہے اور زبان سے اعلان نہ بھی ہو تو ان کا عمل اسی کا ترجمان رہتا ہے۔ اور اگر یہ آیت مقام تنزیل میں گزشتہ آیت سے متصل ہو جو یہاں پر انداز کلام کو دیکھتے ہوئے بعید نہیں ہے تو یہ عطف ہوگا، اس کے قبل کی آیت کے الفاظ: لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ پر اور اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اور وہ یہی کہیں گے'' یعنی اگر دنیا میں دوبارہ جائیں گے تو وہ کریں گے جس سے انہیں ممانعت ہوئی تھی اور یہ کہیں گے جو اب تک کہتے آئے تھے کہ بس جو کچھ ہے، یہی دنیا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔

وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ وُقِفُوۡا عَلٰى رَبِّهِمۡ‌ ؕ قَالَ اَلَيۡسَ هٰذَا بِالۡحَـقِّ‌ ؕ قَالُوۡا بَلٰى وَرَبِّنَا‌ ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ﴿۳۰﴾

''اور کاش دیکھو[2] وہ موقع جب وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے پروردگار کے سامنے۔ وہ کہے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، قسم ہمارے پروردگار کی۔ کہے گا تو چکھو اس عذاب کو اس سبب سے کہ تم کفر کرتے رہے تھے۔''

علامہ طبرسیؒ جنہوں نے گزشتہ آیت میں وُقِفُوۡا عَلَى النَّارِ کے معنی میں اس مفہوم کو ترجیح دی تھی کہ وہ آگ کی حقیقت پر اب اس میں داخل ہو کر واقف ہوں گے، انہوں نے یہاں تو حتم وجزم کے ساتھ یہی معنی قرار دیئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی عظمت سے واقف ہوں گے اور اب انہیں اس کی معرفت حاصل ہوگی اور کہا ہے کہ یہاں اس کے سوا کچھ بن ہی نہیں سکتا[3]

مگر جب کہ قرآن میں روز قیامت کے بارے میں دوسری جگہ صاف ہے:

يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ؕ﴿۶﴾

جس دن تمام لوگ کائنات کے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔ (سورۂ مطففین)

تو یہاں بھی یہی معنی کیوں مراد نہیں ہو سکتے؟ اس لئے کہ ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے پروردگار کے سامنے''۔

---

[1] ۔الاجود ان یکون معناہ ادخلوھا فعرفوا مقدار عذابھا (مجمع البیان)

[2] ۔ کاش کہ دیکھے تو (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔لیس یصح فی ھٰذہ الاٰیۃ الّا وجھا واحد...وھو ان للعنی عرفوا ربھم ضرورۃ (مجمع البیان)

اگر چہ ''بارگاہ'' کہا جائے ''درگاہ'' کہا جائے یا ''سامنے'' کہا جائے۔ یہ سب الفاظ مجازی ہی طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے کھڑے ہونے کے معنی اس کی طرف کے فیصلہ کے انتظار میں ٹھہرنے کے ہیں۔ نہ یہ کہ جسمانی طور پر اس کے منہ کے سامنے کھڑے ہوں گے [1] جو کہ اس ذات کی بہ نسبت جو جسم وجسمانیات سے بری ہے، غیر ممکن ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَ هُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

''گھاٹا اٹھایا ہے انہوں نے کہ جو اللہ کی بارگاہ میں حاضری کو جھوٹ بتاتے رہے یہاں تک کہ جب اچانک ان پر قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے کہ واحسرتا! ہم نے اس کے بارے میں کوتاہی کی اور وہ اٹھا رہے ہیں اپنے بوجھوں کو اپنی پشت پر۔ کیا برا بوجھ ہے جو وہ اٹھا رہے ہیں۔''

''اس کے بارے میں کوتاہی کی'' یعنی ایمان لانے اور ان اعمال کے انجام دینے میں جو آج کے دن کام آتے۔ [2]

وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اور نہیں ہے دنیوی زندگی مگر کھیل تماشہ اور بے شک آخرت والا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیز گار ہوں، تو کیا عقل سے تم کام نہیں لو گے؟!''

''دنیوی زندگی'' یعنی لذائذ دنیا اور وہ کام جو صرف دنیا کی خاطر کئے جاتے ہیں مثل کھیل تماشے کے ہیں جو وقتی تفریح کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن ان کا کوئی حاصل نہیں ہوتا لیکن آخرت کی خاطر جو کام کئے جائیں، وہ دائمی زندگی میں انسان کے کام آئیں گے۔ [3]

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

''ہمیں معلوم ہے کہ جو وہ کہتے ہیں، وہ آپ کو یقیناً رنج پہنچتا ہے تو وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ وہ ظالم اللہ کی

---

[1] ۔ یحتمل ان یکون معنی اذ وقفوا علیٰ ربھم، حبسوا ینتظر بھم ما یأمر... وقد ظن قوم من المشتبھة... انھم یشاھدونه وھذا فاسد (تبیان)

[2] ۔ تحسروا علیٰ تفریطھم فی الایمان والتاھب لھا بالاعمال الصالحة (تبیان)

[3] ۔ ای ما یمتع به فی الدنیا۔ بمنزلة اللعب واللھو الذین لا عاقبة لھما فی المنفعة... فاما الاعمال الصالحات فھی من اعمال الاخرة ولیس بلھو ولا بلعب (تبیان)

آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔"

بلند نفوس کے لئے سنگ وخدنگ اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے جتنی جاہل اشخاص کی لفظی بدتمیزیاں۔ یہ مصیبت پیغام حق کے اعلان کے بعد سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے انتہائی سوہان روح کا باعث تھی۔ اس پر خالق نے بطور تسلی ودل جوئی یہ آیات اتاری ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کو جو صدمہ ان کی باتوں سے پہنچتا ہے، وہ فطری طور پر بالکل صحیح ہے مگر حقیقت میں وہ شخصاً آپ کو جھوٹا تھوڑی بناتے ہیں۔ یہ بات تو خدا تک پہنچتی ہے، وہ تو خدا کی نشانیوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں، اس لئے ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیجئے اور آپ رنج نہ کیجئے۔

لَا يُكَذِّبُوْنَكَ کے ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ وہ ذاتی حیثیت سے اپنے صمیم قلب سے تو آپ کو سچا سمجھتے ہیں [۱] مگر انہیں پیغام الٰہی کا قبول کرنا منظور نہیں ہے، اس لئے وہ انکار کرتے ہیں۔ علامہ طبرسیؒ نے اس جملہ کے پانچ مفاہیم درج کئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ہمارے بیان کردہ دوسرے مفہوم کو درج کیا ہے اور کہا ہے:

هو قول اكثر المفسرين: وہ زیادہ تر مفسرین کا قول ہے۔

اور سب سے آخر میں پہلے معنی کو جو ہم نے درج کئے ہیں مگر ہماری نظر میں اسی کو ترجیح ہے، اس لئے ہم نے اسی کو مقدم کیا ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾

"اور بہت سے پیغمبروں کو اس کے پہلے جھٹلایا گیا تو انہوں نے اس پر جو انہیں جھٹلایا گیا اور ایذائیں پہنچائی گئیں صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس آئی اور اللہ کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں اور آپ کو کچھ نہ کچھ پیغمبروں کی خبریں پہنچ ہی چکی ہیں" [۲]

یہ دوسرا رخ ہے تسلی کا یہ نئی بات تھوڑی ہے۔ آپ کے پہلے ہمیشہ یہی ہوتا رہا اور تمام پیغمبروں کو اس طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑا اور سنت الٰہیہ یہی رہی ہے کہ وہ پہلے ظالموں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع دیتا ہے اور اپنے انبیاء سے صبر وتحمل کے ساتھ اس سب کو برداشت کراتا ہے، پھر آخر میں ان کی مدد کرتا ہے یہی اب بھی ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے۔ [۳]

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا

---

[۱] لا يكذبونك في السر لعلمهم بانك صادق (جلالين)

[۲] المنى انه اجره عليه واله السلام ببعض اخبارهم على حسب ماعلم من المصالح (مجمع البيان)

[۳] لا احد يقدر على تكذيب خبر الله على الحقيقة ولا على اخلاف وعده (تبيان)

تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور اگر آپ پر ان کی روگردانی بڑی شاق ہے تو اگر کوئی سرنگ زمین میں نکال سکیے، یا کوئی سیڑھی لگا سکیے آسمان میں تو کوئی خاص معجزہ ان کے سامنے لا یئے اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں سیدھے راستے پر اکٹھا کر دیتا تو ہرگز آپ جاہلوں میں سے نہ ہو جایئے''۔

یہ ایک انداز بلاغت ہے کہ کبھی محبت کی باتیں ترش روئی کے انداز میں اور سخت لب ولہجہ میں ہوتی ہیں لیکن ان میں مضمر ہوتی ہے شفقت ومحبت۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا بڑا غم ہوتا تھا کہ یہ لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور اپنی بداعمالیوں سے مستحق دوزخ بن رہے ہیں۔اس کے لئے آپ بڑے ہی سوچ میں رہتے تھے اور ایک خاص کرب اور اذیت محسوس فرماتے تھے۔اس کے لئے خالق نے کبھی یوں تلخ انداز اختیار کیا ہے جس میں کوٹ کوٹ کر محبت بھری ہوئی ہے کہ:۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ (سورۃ کھف)

کیا آپ اپنی جان دے دیجئے گا اس رنج میں کہ یہ لوگ اس قرآن پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔

اسی طرح کا تلخ لب ولہجہ اختیار کر کے یہاں کہا جا رہا ہے کہ ہمیں جتنے معجزات بھیجنا تھے، وہ ہم نے بھیج دیئے اور یہ پھر بھی ایمان نہیں لائے تو اب کیا کیا جائے۔اس کے بعد بھی آپ کو پریشانی ہے تو اگر آپ سے ہو سکے تو آپ زمین میں سرنگ نکال کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ پیش کیجئے ایسا کہ وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔

پھر جیسے نرم لہجہ اختیار کر کے فلسفہ سمجھایا جانے لگا کہ خالق کا اصول ہی یہ نہیں ہے کہ وہ جبر سے کام لے۔نہیں تو وہ چاہتا تو کیا ممکن بھی تھا کہ کوئی گمراہ رہ جائے۔[۱]

آخر میں پھر جیسے لہجہ سخت ہو گیا کہ آپ خود سمجھدار ہیں۔ان حقیقتوں سے بے خبر نہیں ہیں لہٰذا اس طرح کی باتیں کبھی نہ کیجئے جو بے خبری کا نتیجہ قرار پا سکتی ہیں۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۭ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

''قبول بس وہی کرتے ہیں کہ جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں انہیں تو اللہ جلائے گا، پھر وہ اس کی طرف پلٹ کر جائیں گے''۔

یہ چوتھا انداز ہے تسلی کا[۲]

مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ کرنا ہے، ان کا کام اس تبلیغ کو توجہ سے سننا اور اس سے اثر لینا ہے لیکن اگر سننے والے غور سے سنیں ہی

---

[۱] ۔انما لم یفعل ما یلجئهم الی الایمان لان دنیا فی التکلیف ویسقط استحقاق الثواب الذی هو الغرض بالتکلیف (تبیان)

[۲] ۔ثم بین سبحانه الوجه الذی لا جله لا یجتمع هؤلاء الکفار علی الایمان (مجمع البیان)

نہیں اور ان میں اتنی زندگی ہی نہ ہو کہ وہ سن سکیں تو مردوں کو جلانا آپ کا کام تھوڑی ہے۔ وہ تو اللہ کا کام ہے۔ مردوں کو تو وہ قیامت میں جلائے گا اور وہاں ان کو سزا دے گا۔

اس میں غور سے نہ سننے والوں کو فائدہ اٹھانے کی صلاحیت مفقود ہونے میں مردوں سے تشبیہ دی ہے [1] ورنہ اگر مردہ ہی ہوتے تو ان پر نہ سننے کا جرم ہی کہاں عائد ہوتا!!

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں اترتا؟ کہہ دیجئے کہ یقیناً اللہ تو کسی بھی معجزہ کے اتارنے پر قادر ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔''

معجزات تو برابر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں پر نمایاں ہوتے ہی رہتے تھے مگر کفار ہٹ دھرمی سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے اور دیکھے ہوئے معجزات کو اَن دیکھا بنا کے یہی رٹ لگاتے تھے کہ آخر کوئی معجزہ یہ کیوں نہیں لاتے۔ [2]

اس کا تذکرہ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور حسب موقع اس کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہاں یہ جواب دیا گیا ہے کہ خدا کی قدرت تو ہر معجزہ پیش کر سکتی ہے مگر اس کا فعل حکمت ومصلحت کی بنا پر ہوتا ہے۔ تمہاری نادانی اور جہالت کے مطالبوں کا وہ پابند نہیں ہو سکتا۔ آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''وہ جانتے نہیں'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنی جہالت سے ایسی باتیں کہتے ہیں۔ اگر وہ علم کا جوہر رکھتے ہوتے تو اس طرح کی جاہلانہ باتیں نہ کہتے۔ اور ایک تفسیر میں اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ اگر ان کے فرمائشی معجزات آجائیں تو پھر نہ ماننے پر عذاب الٰہی میں دیر نہیں ہوگی۔ [3]

جیسا کہ قرآن میں دوسرے مقام پر یہ مضمون صاف طور پر موجود ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں نہیں اور نہ کوئی پرندہ ہے جو اپنے دونوں پروں سے اڑتا ہے مگر تمہارے ہی ایسے مختلف اقسام [4] ہم نے تحریر میں کوئی چیز اٹھا نہیں رکھی ہے۔ پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔''

---

[1]۔ بمنزله الموتی فکما ان الموتی لا یستجیبون لمن یدعوهم الی الحق والایمان فکذٰلك هٰؤلاء الکفار

[2]۔ هلا انزل علیه اٰیة یعنی الایة التی سألوها واقترحوا ان یأتیهم بها من جنس ما شآءوا (تبیان)

[3]۔ لا یعلمون ان الایة اذا جائت ولم یؤمنوا بها یهلکوا (علی بن ابراهیم)

[4]۔ اصناف مصنفة تعرف باسمائها (مجمع البیان)

بظاہر یہ مراد ہے کہ خالق کا نظام تقدیر تمام کائنات پر حاوی ہے[1] اور تم کیا اس سے نکلو گے۔ کوئی مخلوق اس سے نہیں نکل سکتی۔ نوشتۂ تقدیر[2] میں کوئی چیز نظر انداز نہیں ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے کتاب کے معنی قرآن لئے ہیں[3] مگر شروع آیت کے مضمون سے اس کا کچھ لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

''اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ بہرے اور گونگے ہیں تاریکیوں میں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے[4] اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔''

یہ چاہنا اس کا اور اس کا بلاوجہ نہیں ہوتا بلکہ انسان کے ذاتی کردار کی سزا یا جزا میں ہوتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

اللہ گمراہی میں انہیں چھوڑتا ہے جو ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (سورۂ ابراہیم۔ ۲۷)

اور دوسری جگہ:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

اور جو ہدایت حاصل کرتے ہیں، وہ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ (سورۂ محمد۔ ۱۷)

پھر ایک جگہ:

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ

جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے درپے ہیں، انہیں اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کی راہوں پر لگا دیتا ہے۔ (مائدہ:۱۶)

اگر یہ نہ ہوتا تو بلا وجہ تفریق عدالت الٰہی کے خلاف ہوتی۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت تم پر آ جائے تو کیا اللہ کے سوا کسی کو پکارو گے تو

---

[1] ۔امم امثالکم فی تقدیر خلقها ورزقها واحوالها (جلالین)

[2] ۔کتاب یعنی لوح محفوظ (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔وهو قول اكثر المفسرين (مجمع البيان)

[4] ۔يخذله بان يمنعه الطافه (مجمع البيان)

اگر سچے ہو، بلکہ اسی کو پکارو گے تو اگر وہ چاہے گا تو جس کے لئے تم نے اسے پکارا ہے، اس آفت کو دور کردے گا اور تم انہیں جن کو شریک کرتے ہو، بھول جاؤ گے۔"

یوں تو "رأیت" واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے جس میں فاعل مفرد ہے اور ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ مفعول اس کا کُمۡ کے لفظ کے ساتھ لایا گیا ہے جو جمع مذکر حاضر کی ضمیر ہے، اس لئے یہ ترجمہ ہو سکتا ہے کہ "کیا تم میں سے ہر ایک نے اپنی جماعت کو دیکھا ہے مگر نحوی قواعد کے لحاظ سے محاورہ میں اس کا ترجمہ وہی ہوتا ہے جو "اَرَئیتم" کے لفظ کا ہوا کرتا ہے یعنی کیا تم نے دیکھا ہے یا غور کیا ہے[1]؟

اس کے لئے جناب شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے تبیان میں اور علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع البیان میں کافی بسیط مگر پیچیدہ قسم کی بحث کی ہے جو اردو داں طبقہ کے لئے بہت غیر عام فہم چیز ہے۔ بہر حال نتیجہ تمام بحثوں کا یہ ہوتا ہے کہ یہ بس ایک محاورہ ہے جو اہل زبان بولتے ہیں۔ اس میں یہ بیچ میں جو ضمیر ہوتی ہے۔(ك۔ كما۔ كم) اس کے کوئی خاص معنی الگ سے نہیں ہوتے[2]

مطلب یہی ہوتا ہے کہ کیا تم نے دیکھا وہ جس کا بیان اس کے بعد ہے؟!

ہاں! بعض مترجمین ایسے ملتے ہیں جو رأیتکم لفظ میں فاعل اور مفعول دونوں کے معنی کہتے ہیں۔[3] مگر میرے خیال میں وہ اہل زبان کے محاورات سے غفلت کے ساتھ صرف عام قواعد نحوی کے ماتحت لفظ پر نظر کرنے کا نتیجہ ہے۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ﴿۴۲﴾ فَلَوۡلَاۤ اِذۡ جَآءَهُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَلٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۴۳﴾

"اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفوں میں گرفتار کیا، شاید کہ وہ تضرع و زاری کریں تو آخر یوں انہوں نے جب ہماری طرف سے سختی آئی، تضرع و زاری نہ کی بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے آراستہ کر کے پیش کیا ان کی نگاہوں میں ان کاموں کو جو وہ کرتے تھے۔"

قرآن مجید میں جو دو لفظ ہیں: الباسآء والضرآء ان میں مفہوم کے لحاظ سے کیا فرق ہے اس کے تعین میں اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے بأسآء کے معنی تنگدستی کے اور ضرّاء کے معنی بیماری کے لئے ہیں[4] اور بعض نے کچھ اور[5] اس لئے ہم نے ترجمہ میں ان سب کا ماحصل

---

[1] آیا دیدید (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔الصحیح الذی علیها النحویون ان الکاف لا موضع لها والمعنی ارأیت زیدا ما حاله والکاف زیادة فی بیان الخطاب (تبیان)

[3] ۔کیا دیکھا تم نے اپنے تئیں (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔یرید به الفقر والبئوس والاسقام والاوجاع (مجمع البیان) تنگی معیشت و بیماری (شاہ ولی اللہ) ساتھ فقر کے اور مرض کے (رفیع الدین)

[5] ۔قال قوم البأسآء والجوع والضّرّاء النقص فی اموال والانفس والبأساء من الباس والخوف والضرّا من الضر وقد یکون البأسآء من البئوس (تبیان)

''طرح طرح کی تکلیفوں'' کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اکثر انسانی فطرت مصیبت کے وقت پر اللہ کو یاد دلاتی ہے جیسا کہ جناب امید لکھنوی نے فرمایا ہے:

گر پڑھی بھی کبھی ہم نے تو نماز حاجت

اپنے مطلب کے لئے یادِ خدا بھی آئی

اور اس لئے اکثر افراد کے لئے یہ تکالیف دینا اصلاح نفس کا باعث بن جانے کی بنا پر خالق کی طرف سے ایک لطف خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خالق نے ان افراد کے بارے میں اس ذریعہ کو بھی آزمالیا، اپنے علم کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانے کے لئے کہ یہ ایسے ''کج فطرت'' ہیں کہ یہ ذریعہ بھی اصلاح کا ان میں ناکام ہوتا ہے۔ اس کج فطرتی کو ''قساوت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان کے دل ایسے سخت تھے کہ اس یاد الٰہی کے محرک ہونے والے ذریعہ سے بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ ان تمام تکالیف میں بھی ان کے لہو ولعب اور ناجائز تفریحات کے مشغلے جو شیطانی کام ہیں، جاری رہے جس کا مشاہدہ اس تہذیب جدید میں بھی اکثر ملکوں میں ہوتا ہے کہ سخت بھونچالوں اور تباہیوں میں بھی سینما گھروں کی رونق میں فرق نہیں آتا۔

فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖ فَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ اَبۡوَابَ كُلِّ شَىۡءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۵﴾

''تو جب انہوں نے بھلا دیا ان باتوں کو جن کے متعلق انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان پر ہر چیز کے دروازے ہم نے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ خوب خوش ہو لئے اس سے جو انہیں ملا تھا تو ہم نے اچانک انہیں گرفت میں لے لیا تو وہ ایک دم بے آس ہو گئے [1] تو ظالموں کی اصل نسل قطع ہو گئی [2] اور شکر ہے اللہ کا جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

''ہر چیز کے دروازے کھول دیئے'' یعنی دولت اور دنیوی عیش و آرام کے سامانوں کی بہتات کر دی۔[3] اس سے معلوم ہوا کہ یہ دنیوی کامرانیاں اکثر انسانوں پر عتاب الٰہی کی علامت ہوتی ہیں۔ اسی لئے حضرت امیر علیہ السلام سے وارد ہوا ہے:۔

یا بن ادم اذا رأیت ربك یتابع علیك نعمه فاحذره (مجمع البیان)

اے آدم زاد! جب تو اپنے پروردگار کو دیکھ کہ وہ مسلسل نعمتیں دے رہا ہے تو اس سے خوف کر۔

آخر میں اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ کا فقرہ ان کی انتہائی بداعمالی کا اظہار ہے کہ ان کا وجود صفحۂ حیات پر ایک بہت بڑا دھبہ تھا اور خلق

---

[1] ۔ آئسون من کل خیر (جلالین) شدند نا امید شوندہ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ فلم یبق لهم عقب ولا نسل (مجمع البیان)

[3] ۔ ای کل نعمة و برکة من السمآء والارض (مجمع)

خدا کے لئے ایک وبال تھا جو ہٹا دیا گیا تو یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہوا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

''کہیے کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے سوا کون خدا ہے جو یہ سب تمہیں دے دے؟! دیکھئے کس طرح ہم طرح طرح سے حقیقتیں واضح کرتے ہیں ،پھر بھی وہ روگردانی کرتے ہیں۔''

یہاں دلوں پر مہر لگانے سے مراد شعور کی طاقت کا سلب کرنا ہے۔[1]

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے اچانک یا ظاہر بظاہر تو کیا سوا ظالم جماعت کے کوئی تباہ و برباد ہوگا۔''

''اچانک'' کے معنی میں مضمر ہے بے خبری مثلاً رات کو عذاب آ گیا، جب وہ سو رہے تھے کہ عذاب کے پیشگی آثار کو بھی نہ دیکھ سکے......اس لئے اس کے مقابل میں کہا گیا ''ظاہر بظاہر'' یعنی اس طرح کہ آنکھوں سے اس عذاب کی آمد کا مشاہدہ کریں۔[2]

قرآن مجید کا انداز رواداری دیکھئے کہ بہت سخت بات بھی کہتا ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ جو ممکن نرمی ہو، وہ پیدا کردی جاتی ہے۔ یہاں شرط و جزاء دونوں پر غور کیجئے۔''اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے اچانک یا ظاہر بظاہر''......کھلی ہوئی جزاء اس شرط کے بعد کے مضمون کے لحاظ سے یہ ہے کہ ''کیا تمہارے سوا اس سے کوئی تباہ و برباد ہوگا؟'' مگر تباہی و بربادی کے محل پر صاف صاف مخاطب جماعت کو نہ لا کر قرآن نے جیسے بات ان سے علیحدہ کر کے کہہ دی کہ ''کیا سوا ظالم جماعت کے کوئی اور تباہ و برباد ہوگا؟'' مطلب وہی ہے مگر ذرا سے انداز کے بدلنے سے کلام کی تلخی میں کتنی کمی ہوگئی؟ اسے وہ کیا سمجھیں جنہیں رواداری کی قدر و قیمت معلوم نہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر تو جو ایمان لایا اور ٹھیک اعمال کرتا رہا تو نہ

---

[1] ۔طبع علیٰ قلوبکم فلا تعرفون شیئا (جلالین) بان سلب ما فیہا من العقول التی بہا یتئہا لکم ان تؤمنوا بربکم (تبیان)

[2] ۔المغاجاۃ وھو ان یاتیھم العذاب وھم غافلون غیر متوقعین لذلك اوجھرۃ ای وھم مشاھدون له ومعاینیون نزوله (تبیان)

ان پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ انہیں افسوس ہوگا[1] اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، انہیں عذاب ہوگا[2] اس لئے کہ وہ فسق و فجور کرتے رہے"۔

اولیائے الٰہی سے خوف وحزن کی نفی قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہوئی ہے جس کے تحت میں باختلاف الفاظ ہر جگہ لکھا گیا ہے کہ دنیا میں خاصانِ خدا کو بلاشبہ خوف اور حزن سے سابقہ پڑا کرتا ہے، اس لئے جس خوف کی نفی ہوئی ہے وہ "اندیشۂ انجام" ہے جو ضمیر کی بے اطمینانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس حزن کی نفی ہے، وہ اپنے کردار پر افسوس ہے جو پشیمانی کا مرادف ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں باایمان نیک کردار افراد کے یہاں کبھی نہیں ہوتیں اور اسی کے نتیجہ میں ان کے یہاں وہ ثبات قدم اور استقلال نظر آتا ہے کہ آندھیاں اور زلزلے ان میں جنبش پیدا نہیں کرتے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"کہہ دیجئے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں (بذات خود) غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں نہیں پیروی کرتا مگر اس کی جو میری طرف وحی ہو۔ کہیے کہ کیا برابر ہے اندھا اور آنکھوں والا؟! کیوں غور وفکر سے کام نہیں لیتے ہو"۔

رسول کو جو کچھ اقتدار رہتا ہے، وہ منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو کچھ علم غیب ہوتا ہے، وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے[3] اور جو غیب کی باتیں ایسی ہوں جنہیں اللہ نے اپنے سے مخصوص قرار دیا ہے تو ان کا علم غیر اللہ کو نہیں ہوسکتا[4]۔

ذاتاً پیغمبر کے قبضہ میں کچھ نہیں اور نہ بذات خود علم غیب ہے۔ اسی کی نفی ہوئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں معاذ اللہ، اللہ کا مدمقابل نہیں ہوں کہ بغیر اس کی مرضی کے کوئی معجزہ دکھا سکوں۔[5]

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾

"اور ڈراؤ اس کے ذریعہ سے[6] ان کو جو اندیشہ رکھتے ہیں اس کا کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔ نہ

---

[1]۔ کما یحزن اهل النار (مجمع البیان)

[2]۔ یصیبهم العذاب (مجمع البیان)

[3]۔ انما اعلم قدر ما یعلمنی الله تعالیٰ (مجمع البیان)

[4]۔ لا اعلم الغیب الذی یختص بعلم الله تعالیٰ (تبیان)

[5]۔ انی لا ادعی الربوبیة مواناً ادعی النبوة (مجمع)

[6]۔ ای بالقرآن... وقیل بالله (مجمع البیان)

ہوگا ان کا اس کے سوا کوئی سرپرست اور نہ سفارشی۔ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں''۔

''جو آخرت کا اندیشہ رکھتے ہیں'' ان کا اندیشہ انجام بخیر ہونے کی وجہ سے نتیجتاً امید ثابت ہوگا، اس لئے ہماری قدیم تفسیر میں یخافون کے معنی آئے ہیں: یرجون یعنی امید رکھتے ہیں [1] ورنہ فعلی حیثیت سے خوف، رجاء کے مقابل کی چیز ہے اور مومن کی شان یہ ہے کہ وہ خوف اور امید دونوں جوہروں کا حامل ہو جیسا کہ حدیث میں ہے:۔ الایمان نصفان نصف خوف و نصف رجاء۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

''اور انہیں پاس سے دھتکار یئے نہیں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں کہ اس کی رضا کے طلب گار ہیں۔ آپ پر ان کے حساب کتاب کی کچھ ذمہ داری نہیں ہے، نہ آپ کے حساب کتاب کی ذمہ داری کچھ ان پر ہے، جو آپ انہیں دھتکار دیں تو ہو جائیں گے ظالموں میں سے''۔

رئیسوں کے ذہنیت کے مقابلہ میں غریبوں کی دل جوئی

طبقۂ رؤسا کی ایک ذہنیت یہ ہے کہ غریبوں کے پاس بیٹھنا اٹھنا یا ان کے حلقہ میں رہنا اپنے لئے کسرِشان اور باعثِ عار سمجھتے ہیں چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے خطاب کر کے قرآن مجید میں ان کا کہنا درج ہے کہ:

اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ:

کیا ہم آپ پر ایمان لائیں حالانکہ آپ کے پیرو ہوئے ہیں بہت کم درجہ کے لوگ۔ (شعراء:۱۱۱)

اس طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض رؤسائے عرب کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ غریب مسلمانوں کو اپنے پاس بیٹھنے نہ دیا کریں [2] اس کے جواب میں یہ آیت اتری۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود معاذ اللہ ایسا کرنا چاہتے تھے [3] بلکہ اس قسم کے سخت الفاظ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قسم کے کام سے روکنا ان لوگوں کی زبان بند کرنے کے لئے تھا جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کا کردار اختیار کرنے کے متقاضی تھے۔ اس کے لئے کبھی اسے یوں صرف ممانعت کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور کبھی اس طرح کہ:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ:

اگر آپ دنیا کے بہت سے آدمیوں کی خواہشوں پر چلنے لگے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے۔ (انعام:۱۱۶)

---

[1]۔ یخافون ای یرجون (علی بن ابراھیم)

[2]۔ سبب نزول ھٰذہ الاٰیۃ ماروٰاہ ابن مسعود وغیرہ ان ملائن قریش و قال الظرامن الکفار منھم عینیۃ بن حصین قالوا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم لو نھیت ھٰؤلاء عنك لا فاك اشراف قومك واسلموا (تبیان)

[3]۔ کما قال تعالٰی: لئن اشرکت لیحبطن عملك وان کان الشرك مأمو نامنه (تبیان)

اور بعض جگہ تمثیلی انداز میں اس قسم کے کردار کی تصویر کشی کر کے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جیسے سورۂ عبس میں ہے جس کی تشریح اپنے محل پر آئے گی چنانچہ وہاں بھی یہ تصور غلط ہے کہ معاذ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کردار ظہور میں آیا تھا۔ ایسا ہر گز نہیں تھا۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے کچھ لوگوں کی آزمائش کی ہے کچھ کے ذریعہ سے تاکہ وہ کہیں کہ کیا یہ وہ ہیں جن کو ہم میں سے اللہ نے اپنے احسان سے نوازا ہے؟ کیا اللہ شکر گزاروں کا بہترین جاننے والا نہیں ہے؟!''

رئیسوں کا یہ مطالبہ کہ غریبوں کو اپنے پاس سے نکال دیجئے، یہ بھی ایک طرح کے حسد کا نتیجہ ہے یعنی وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان غریبوں نے جو رتبہ حاصل کر لیا ہے وہ ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اسی کو کہا جا رہا ہے کہ اس جذبۂ حسد ہی کی وجہ سے مختلف اشخاص میں ایک، دوسرے کے لئے ذریعۂ آزمائش بن جاتا ہے[1]۔

وہ بطور رشک یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام ان غریبوں کے شامل حال کیوں ہوا ہے؟ یہ ان کا کہنا اللہ کا کوئی مطلوبہ مقصد نہیں ہے مگر چونکہ اس امتحان کے نتیجہ میں ہوتا یہی ہے، اس لئے کہا گیا کہ ہم اس طرح آزمائش کرتے ہیں تاکہ وہ یوں کہیں۔[2]

اس کا جواب آخر کے جملہ سے دیا گیا ہے کہ اسے کیا کیا جائے کہ ان غریبوں نے ہی بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت کی قدر کی اور شکر گزار ثابت ہوئے اور تم رئیسوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی، ناشکرے ثابت ہوئے تو کیا اللہ شکر گزاروں کو کوئی صلہ نہ دے اور اب تم ناشکروں کی خاطر سے انہیں نظر انداز کر دے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرح اس کی تشریح یوں ہوئی ہے کہ دولت اور غربت کوئی معیار بلند و پستی نہیں ہے۔ یہ دونوں امتحان کے طریقے ہیں۔ مالداروں کا امتحان غریبوں کے ذریعہ سے ہے کہ وہ ان کے ساتھ کیسی ہمدردی کرتے ہیں اور غریبوں کا امتحان مالداروں کے ذریعہ سے ہے کہ وہ کس طرح ان سے بے نیازی اختیار کرتے ہیں۔ پھر یہ انہی غریبوں میں سے کچھ افراد کا کردار ہے (جو امتحان میں ناکام ہیں) کہ وہ مالداروں پر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی نعمتیں سب انہی سے مخصوص ہو گئی ہیں؟![3]

وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢ ابِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

---

[1] ۔ابتلینا ھٰذا الرّؤساء من قریش بالموالی (مجمع البیان)

[2] ۔ فلیس المراد باللام لام الغرض... لکن اللام لام العاقبۃ (تبیان)

[3] ۔ یقولوا ای الفقراء اھؤلاء الاغنیآء من اللہ علیھم من بیننا (علی بن ابراھیم)

’’اور جب آپ کے پاس آئیں وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہیں تو کہیے سلامٌ علیکم [1] تمہارے پروردگار نے اپنے ذمہ رحمت کو عائد کر لیا [2] کہ جو تم میں سے کوئی برائی ناواقفیت سے کرے، پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور ٹھیک اعمال کرے تو وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان‘‘۔

قرآن نے صاف طریقۂ سلام سکھایا ہے: سلامٌ علیکم......

اس صورت میں کتنی بڑی جہالت ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ سلامٌ علیکم کہنے سے گریز کرتا ہے اور وہ السلام علیکم کا پابند ہو گیا ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن، یہ دونوں ہی طریقے صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

’’اور اسی طرح ہم اپنی باتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور تا کہ مجرموں کا راستہ صاف طور پر سمجھ میں آ جائے‘‘ [3]

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

’’کہہ دیجئے کہ مجھے اس سے ممانعت ہوئی ہے کہ میں عبادت کروں ان کی جنہیں تم اللہ کے سوا خدا کہہ کے پکارتے ہو [4] کہیے کہ میں تمہارے دل بخواہ خیالات کی پیروی نہیں کروں گا۔ اس صورت میں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور منزل تک پہنچنے والوں میں نہیں ہوں گا‘‘۔

’’اھوآء‘‘ یعنی ’’دل بخواہ خیالات‘‘ کے لفظ نے ان کی ہم رنگی سے انکار کی وجہ ظاہر کر دی کہ تمہاری یہ عبادتیں اپنی صحت کی کوئی سند نہیں رکھتیں [5] ان کا ’’اھواء‘‘ یعنی ’’ایجاد بندہ‘‘ کی حیثیت رکھنا ہی خود ان کے بطلان کی دلیل ہے۔

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

---

[1] بگو سلام علیکم (شاہ ولی اللہ)

[2] یعنی اوجب الرحمة لمن تاب والدلیل علیٰ ذلك قوله: انه من عمل منكم سوء بجهالة (علی بن ابراهیم)

[3] ای لیظهر طریق من عاند بعد البیان... لیجانبوها ویسلکو غیرها (مجمع البیان)

[4] الاوثان التی تعبدونها من دون الله وتدعونها الهة (تبیان)

[5] ای انما عبدتموها علیٰ طریق الهویٰ لا علیٰ طریق البینة والبرهان (مجمع البیان)

''کہہ دیجئے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل پر قائم ہوں [1] اور تم نے اسے جھٹلایا ہے۔ میرے پاس وہ نہیں ہے جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو۔ فیصلہ کا اختیار نہیں ہے مگر اللہ کو۔ وہ حق باتیں بیان کرتا ہے اور بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دیجئے کہ اگر میرے قبضہ میں ہوتا وہ جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو تو فیصلہ ہو چکتا میرے اور تمہارے درمیان اور اللہ ظالموں کا بہترین جاننے والا ہے۔''

''جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو''۔ یعنی عذاب الٰہی جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وہ آپ سے عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں۔ (عنکبوت: ۵۴)

یہ ''جلدی کرنا'' ان کا واقعی عذاب کی خبروں کو صحیح سمجھ کر تھوڑی ہوتا تھا بلکہ چونکہ وہ منکر تھے اور اسے بے اصل سمجھتے تھے، اس لئے کہتے تھے کہ اگر ہمارے اعمال جیسا کہ تم کہتے ہو، عذاب ہی کے مستوجب ہیں تو تم ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کر دیتے؟! اس کا جواب رسول ﷺ کی زبانی یہاں اس انداز میں دیا جا رہا ہے۔

اس جواب میں جو الفاظ صرف کئے گئے ہیں، وہ عام انسانی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جلد باز اور اپنے مخالف کے خلاف مشتعل ہونے والا اور جذبۂ انتقام سے کام لینے والا ہوتا ہے تو اگر معاملہ اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ ایک دم اپنے مخالفین کو تہس نہس کر دے مگر یہ اللہ ہے جو حکیم ہونے کی بنا پر حلیم ہے اور وہ اپنے بندوں کو طویل مہلتیں دیتا رہتا ہے تاکہ اصلاح کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے اور حجت تمام ہو۔

اب جو بندے بھی مرضی الٰہی کے انتہائی پابند ہیں، وہ خالق کے اس حلم کی بنا پر خود بھی تحمل سے کام لیتے ہیں جیسا کہ ہمارے رسول ﷺ اپنے مخالفوں کے لئے بددعا کے بجائے، خود بارگاہ الٰہی میں ان کی طرف سے معذرت فرماتے تھے کہ رَبِّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ اللہ کی ربوبیت کے زیر سایہ اس کی عبودیت کا حق ادا کرنا تھا اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ یہ قول کہ ''اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو کب کا فیصلہ ہو جاتا۔'' یہ آپ کے مخصوص درجۂ عبودیت سے قطع نظر کرتے ہوئے عام فطرت بشری کا اظہار ہی ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

''اور اس کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی جنہیں سوا اس کے کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے اسے کہ جو خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور نہ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں اور نہ تر اور نہ خشک مگر یہ کہ وہ ایک روشن نوشتہ میں موجود ہے''۔

خالق کے علم کی ہمہ گیری

[1] ۔ علیٰ مرتین من معرفة اللہ وصحة نبوته لا متبع للهوىٰ (تبیان)

یہ خداوند عالم کی وسعت علم کا بیان ہے اور اسی سیاق میں: ''وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ'' مبین کا جملہ ہے جس کا نمایاں مفہوم علم الٰہی ہے جو لوح محفوظ میں ثبت مانا جاتا ہے [۱]

جناب شیخ طوسیؒ نے ان دونوں کا الگ الگ بطور دو احتمالوں کے ذکر کیا ہے [۲]

مگر عام طور سے یہ فقرہ مستقل آیت کے طور پر اس مضمون کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ ابھی تک اس کا ماخذ میرے علم میں نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾

''اور وہ وہ ہے جو رات کے وقت تمہاری روح کو لے لیتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے [۳] اسے جانتا ہے۔ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری ہو [۴] پھر اسی کی طرف تمہارا پلٹنا ہوگا۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے۔''

پہلے آچکا ہے کہ تَوَفّٰی کے معنی موت کے نہیں ہیں چنانچہ یہاں یہ لفظ رات کی نیند کے لئے صرف ہوا ہے کہ اس میں بھی ایک طرح سے انسان کی روح کو اس عالم سے اٹھالیا جاتا ہے۔ [۵]

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

''اور وہ اپنے بندوں پر پورا قابو رکھتا ہے اور تم پر نگہبانوں کو بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کو رات کا ہنگام آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر وہ پلٹائے جاتے ہیں اللہ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے بلاشبہ اس کے لئے فیصلہ کرتا ہے اور وہ تیز ترین حساب

---

[۱] ۔ فی کتب مبین ھو اللوح المحفوظ (جلالین) ای فی اللوح المحفوظ (مجمع البیان)

[۲] ۔ یحتمل امرین: احدھما ان یکون معناہ فی علم اللہ ...وثانیھا ... ان یکون اللہ تعالیٰ اثبت ذٰلك فی کتاب قبل ان یخلق (تبیان)

[۳] ۔ کسبتم یقال فلان جارحۃ اھلہ ای کاسیبھم (تبیان)

[۴] ۔ ای لتستوفوا اٰجالکم (مجمع البیان) ھو الموت (علی بن ابراھیم)

[۵] ۔ یقبض ارواحکم عند النوم (جلالین) قبض روح شمامی کند بشب (شاہ ولی اللہ)

کرنے والا ہے"۔

نگہبانوں سے مراد کاتبانِ اعمال ہیں[1] اور ایک تفسیر کے مطابق یہ لفظ عام ہے۔اس میں وہ فرشتے بھی داخل ہیں جو آفات وبلّیات سے خود انسان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ بھی جو اس کے اعمال کو قلم بند کر کے محفوظ کرتے ہیں۔[2]

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (63) قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (64)

"کہیے کہ کون تمہیں چھٹکارا دیتا ہے بیابان اور دریا کے اندھیروں سے[3] کہ تم اسے پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، اگر اس سے ہمیں وہ چھٹکارا دیدے تو ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے کہیے کہ اللہ تمہیں ان سے اور ہر طرح کی تکلیف سے چھٹکارا دیا ہی کرتا ہے۔ پھر بھی تم شرک اختیار کرتے ہو"۔

"اندھیروں" سے چھٹکارا دینے کے معنی ہیں "سخت اور ہولناک تکالیف" سے نجات دینا جو عرب کے عام محاورہ کے مطابق ہے[4]

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (65)

"کہیے وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے یا تمہارے پیروں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں کر کے دست وگریبان کردے اور تم میں سے بعض کو بعض کی سختی کا مزہ چکھائے۔ دیکھئے ہم کس طرح حقیقتوں کو طرح طرح سے پیش کرتے ہیں، شاید کہ وہ سمجھیں"۔

"اوپر سے یا نیچے سے" اس سے بظاہر تو وہ عذاب مراد ہیں جو آسمان کی طرف سے آتے ہیں[5] یا جو زمین کی طرف سے آتے ہیں[6] اور یہ بلاشبہ وہ حوادث ہیں جو اللہ کی طرف سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔لیکن ایک تفسیر اس کی یہ ہوئی ہے "اوپر سے عذاب" سے مراد کسی حاکم جابر

---

[1]۔ يعني يرسل عليكم ملائكة يحفظون۔ اعمالكم ويحصونها عليكم ويكتبونها (تبيان) ملائكة تحصي اعمالكم (جلالين)

[2]۔ يعني الملائكة الذين يحفظونكم ويحفظون اعمالكم (علی بن ابراهيم)

[3]۔ ظلمات البرّ والبحر اهوالهما في اسفاركم (جلالين)

[4]۔ يقول العرب لليوم الذی يلقی فيه الشدّة يوم مظلم (تبيان)

[5]۔ كالحجارة والصيحة (جلالين)

[6]۔ كالخسف (جلالين)

کے ہاتھوں پہنچنے والے مظالم اور نیچے سے عذاب کے معنی ہیں کمینے افراد کے ہاتھوں پہنچنے والی تکالیف[1]

اس صورت میں یہ اور نیز اس کے بعد جو ہے یعنی مختلف گروہوں کو دست و گریبان کرنا جیسا فرقہ وارانہ فسادات میں ہوتا ہے[2] یہ براہ راست اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اشخاص بطور خود یہ امور انجام دیتے ہیں اور خداوند عالم اپنی قوت قاہرہ سے ان کے ارادوں میں سد راہ نہیں ہوتا اور نہ اپنی توفیق خاص سے وہ ایسا سامان کرتا ہے کہ وہ اس سے باز آجائیں بلکہ انہیں یہ سب باتیں کرنے دیتا ہے[3] جو کبھی اولیائے الٰہی کے لئے بطور امتحان ہوتا ہے اور کبھی یہ اس قوم کے لئے ایک عذاب کی صورت سے ہوتا ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۞٦٦ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۞٦٧

"اور آپ کی قوم نے اس کو جھٹلایا حالانکہ وہ حق ہے۔ کہہ دیجئے کہ میں تمہارا ٹھیکے دار نہیں ہوں[4] ہر چیز کی ایک مقررہ میعاد ہے اور عنقریب تمہیں معلوم ہوگا۔"

"میں تمہارا ٹھیکے دار نہیں ہوں"......اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا کام تو بس تبلیغ کر دینا ہے۔ اب تم مانتے ہو یا نہیں مانتے ہو، اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

"ہر چیز کی ایک مقررہ میعاد ہے" یعنی عذاب کی جو خبر تم کو دی گئی ہے وہ ابھی پوری نہیں ہوئی تو یہ نہ سمجھو کہ بات ٹل گئی۔ نہیں جو کہا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی اس کا وقت جو حکمتِ الٰہیہ کے تقاضا سے مقرر ہوا ہے، آیا نہیں۔[5]

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۞٦٨

"اور جب دیکھو ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں کے بارے میں نکتہ چینی میں مصروف ہیں تو ان سے بے توجہی اختیار کرو جب تک کہ وہ کسی اور بات چیت میں مصروف نہ ہو جائیں، اور اگر کبھی شیطان بھلاوے میں ڈال دے تو یاد آنے کے بعد پھر ظالم جماعت کے ساتھ نہ بیٹھو۔"

اس آیت میں تخاطب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ماننا ضروری نہیں اکثر جگہ اس قسم کے واحد کے جو صیغے ہیں، ان میں مخاطب غیر معین مراد ہوتا

---

[1] من فوقكم قال السلطان الجابرُ ممن تحت ارجلكم قال السفلة ومن لا خير فيه (علی بن ابراهيم)

[2] ای يخلطكم فرقا مختلفی الاهواء وقيل عُنِی به يضرب بعضكم ببعض وهو المروی عن ابی عبدالله علیه السلام (مجمع البيان)

[3] بان يكلمهم الی انفسهم ولا يلطف لهم (تبيان)

[4] الوكيل علی الشئ هو القائم بحفظه والذی يدفع الضرر عنه (مجمع البيان)

[5] وقته الذی يعلمون فيه صحة ما وعدهم به وحقيقة اما فی الدنيا واما فی الأخرة (تبيان)

ہے یعنی کوئی بھی ہو، اس کو یہی کرنا چاہیے۔
ایسی صحبتوں میں جہاں حقائق دینی کا مذاق اڑایا جارہا ہو حتی الامکان شریک نہیں ہونا چا۔
آخری فقرہ کا مطلب ظاہر الفاظ سے وہی نکلتا ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے کہ ایک دفعہ بھولے سے ایسا ہو جائے [۱] تو پھر یاد آنے کے بعد دوبارہ ایسا نہ کرو اور اس مجمع میں شریک نہ ہو لیکن اس کا دوسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ:
''اگر خطرہ ہو کہ باتوں میں مشغول ہو کر سرکنا بھول جائے تو سوائے نصیحت کے وقت ان میں بیٹھنا موقوف کرے۔''......(موضح القرآن)
میں سمجھتا ہوں کہ یہ ''اَمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ'' ''اگر شیطان تمہیں بھلا دے'' کا مطلب نہیں۔اس کے لئے تو یہ لفظ چاہیے تھے کہ: ان خفت ان ينسيك الشيطان ''اگر تمہیں ڈر ہو کہ شیطان تمہیں بھلا دے گا''۔مگر قرآن کے الفاظ یہ نہیں ہیں۔
جو لفظ قرآن مجید میں ہیں، ان کا مطلب وہی ہوتا ہے جو ہم نے درج کیا ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۝۶۹

''اور جو پرہیز گاری اختیار کرتے ہیں، ان پر ان کا حساب کتاب کچھ نہیں ہے مگر نصیحت کرنا ہے، شاید کہ وہ بھی پرہیز گاری اختیار کریں''۔
مطلب یہ ہے کہ کفار اپنے اعمال کے خود جوابدہ ہیں۔مسلمانوں پر ان کی ذمہ داری کچھ نہیں ہے [۲] ہاں نصیحت کرنا فرض ہے۔عمل کریں یا نہ کریں یہ ان کا کام ہے۔
ایک روایت میں وارد ہوا ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے کہ جب سابق آیت نازل ہوئی کہ مشرکین جب اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا مسلمانوں پر نکتہ چینی میں مصروف ہوں تو ان کے پاس نہ بیٹھو اور ان کی باتیں سننے سے پرہیز کرو تو مسلمانوں نے کہا کہ وہ تو ہر وقت ہی ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں تو اب ہم مسجد الحرام جا کر کعبہ کا طواف ہی ترک کر دیں تو اس کے جواب میں یہ کہا جارہا ہے کہ نہیں تم اپنے کام سے اپنی عبادت کے لئے وہاں گئے ہو تو وہ جو باتیں کرتے رہیں، اس کی ذمہ داری تم پر تھوڑی ہو گی مگر خاص طور پر ان باتوں سے دلچسپی نہ لو اور موقع ہو تو سمجھا دو کہ اس قسم کی باتیں اچھی نہیں ہیں۔ [۳]

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ

---

[۱]۔ای انساك الشيطان ذٰلك (تبيان)
[۲]۔نیست بر کسانیکه پرهیزگاری کردند از حساب کافران چیزی (شاه ولی الله)
[۳]۔قال ابو جعفر علیہ السلام لمّا نزلت: فلا تقعد بعد الذكرى مع القوم الظالمين، قال المسلمون كيف نصنع۔ فلا ندخل المسجد الحرام لانطوف بالبيت الحرام فانزل الله: وما على الذين يتقون (تبيان)

تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''اور چھوڑو انہیں کہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنالیا اور دھوکے فریب میں مبتلا کر رکھا انہیں دنیوی زندگی نے [1] اور ان کو اس کے ذریعہ سے [2] نصیحت کرتے رہو تا کہ بے بسی کے ساتھ مبتلائے ہلاکت نہ ہوا [3] کوئی اپنے افعال سے درحالیکہ نہ ہوگا اس کے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مالک اور نہ سفارشی اور اگر ہر طرح کا معاوضہ دینا چاہے تو بھی وہ اس سے نہیں لیا جائے گا۔ یہ ہے عالم ان لوگوں کا جو بے بسی کے ساتھ ہلاک ہوئے ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے کہ ان کے لئے کھولتا ہوا گرم پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے۔''

''تا کہ بے بسی کے ساتھ مبتلائے ہلاکت نہ ہو''۔ یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تبلیغ ہوتے رہنے کا مقصد یہ ہے کہ خلق خدا کی طرف سے پیش خدا یہ حجت پیش نہ ہو سکے کہ ہم بے بس تھے [4] ہمیں تعلیمات الٰہیہ کا علم ہی نہ تھا ہم کو کسی نے ہدایت نہیں کی یعنی جاہل قاصر تھے جو معذور ہوا کرتا ہے۔ اس لئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کو متنبہ کرتے رہیں تا کہ اب جو مخالفت کرے، وہ جان بوجھ کر یا اگر کوئی تساہل سے کام لے کر ان کی آواز کو سنے ہی نہ تو جاہل مقصر ہو جو معذور نہیں ہے جس کا بعد میں ذکر ہے کہ یہ بے بسی کے ساتھ ہلاک ہونے کے مستحق ہی ہیں اپنی بدکرداری اور کفر پر اصرار اور عناد کی وجہ سے۔

تو پہلی جگہ جو ''بے بسی'' کا ذکر تھا، وہ مخالفت میں بے بسی تھی لاعلمی کی وجہ سے اور دوسری جگہ سزا اٹھانے میں بے بسی ہے، اس معنی سے جس کی تفصیل درج ہوئی ہے کہ نہ مددگار رہے، نہ سفارشی، نہ کوئی رشوت چل سکتی ہے اور نہ مال و دولت کام آ سکتا ہے۔ یہ بے بسی وہ ہے جو اپنے اعمال کا خمیازہ ہے، اس لئے وہ انسان کو قابل رحم نہیں قرار دیتی۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۗ وَهُوَ الَّذِىْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾

---

[1] ۔ یعنی بہ اغتروا بحیوتھم (مجمع البیان)

[2] ۔ ای عظ بالقراٰن وقیل بیوم الدین وقیل بالحساب (مجمع)

[3] ۔ لکی لا تبسل ... ای تدفع الی الھلکۃ علیٰ وجہ الغفلۃ وتسلم لعملھا غیر قادرۃ علی التخلص (تبیان)

[4] ۔ المبسل المستسلم الذی یعلم انہ لا یقدر علی التخلص (مجمع البیان)

''کہیے کہ کیا ہم خدا کہہ کے پکاریں اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور اپنے پچھلے پیروں پلٹیں [1] بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں صحیح راستے پر لگا دیا، اس آدمی کی طرح جسے بھوت پریت زمین میں حیران و سرگردان پھرائیں درآنحالیکہ اس کے کچھ ساتھی ایسے ہوں جو اسے ٹھیک راستے کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آ ؤ۔ کہہ دیجئے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے اور ہم اس پر مامور ہیں کہ اللہ کے سامنے سر جھکائیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور یہ کہ [2] نماز ادا کرتے رہو اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہو اور وہی وہ ہے جس کی طرف تم سمٹ کر جاؤ گے''۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۬ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝٧٣

''اور وہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا بالکل صحیح [3] اور جس دن وہ کہے گا ''ہو جا'' تو وہ سب (پھر) ہو جائے گا۔ اس کی بات درست ہے اور اس کا اقتدار ہو گا جس دن صور پھونکا جائے گا، وہ ان دیکھی اور دیکھی سب باتوں کا جاننے والا ہے اور وہ صحیح کام کرنے والا ہے بڑا باخبر''۔

اصطلاح قرآنی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جو باتیں نظام عادت کے مطابق تدریجی طور پر وقوع میں آتی ہیں انہیں ''خلق'' کہا جاتا ہے اور جو باتیں قدرت الٰہی کے مظاہرہ کے طور پر ایک دم ہوتی ہیں، انہیں ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' کے تحت میں لایا جاتا ہے یعنی خالق نے کہا ''ہو جا'' وہ ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بس اشارۂ قدرت سے وقوع میں آتی ہے۔ اس میں تدریجی اسباب والا نظام کارفرما نہیں ہے۔

ابتداء میں آفرینش اشیاء کی عموماً نظام اسباب کے ساتھ ہوئی ہے اس لئے یہ کہا گیا کہ آسمانوں اور زمین کو خلق کیا اور قیامت میں سب کو زندہ کرنا دوبارہ، یہ نظام امر کے ماتحت ہوگا۔ یعنی صرف اشارۂ قدرت سے۔ اس لئے اسے یوں کہا جا رہا ہے کہ وہ دن جب وہ کہے گا، ہو جا اور سب کچھ ہو جائے گا۔ [4]

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّىْۤ اَرٰٮكَ وَقَوْمَكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٧٤

''اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہ کیا تم کچھ بتوں کو خدا بناتے ہو؟ میں تمہیں اور تمہاری قوم والوں کو

---

[1] ۔ ان رجع عن ديننا الذى هو خير الاديان (مجمع البيان)

[2] ۔ هٰذه الاٰية موصولة بالتى قبلها اى امرنا لنسلم لرب العلمين وقيل لنا اقيموا الصلوٰة (تبيان)

[3] ۔ خلقها حق وصوابا لا باطل وخطاء (مجمع البيان)

[4] ۔ يوم يقول للشئ كن فيكون هو يوم القيٰمة (جلالين)

کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں''۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد کون؟ آذر یا تارخ؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل باپ کا نام تارخ تھا اور وہ موحّد تھے مگر ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بچپن میں انتقال ہو گیا، اس لئے ان کے ایک خاندانی عزیز[1] آذر نے ان کی پرورش کی تھی جس کو پرورش کی بنا پر وہ باپ کہہ کر پکارتے تھے۔

قرآن میں جتنی باتیں ''باپ'' کہہ کر درج کی گئی ہیں، وہ سب اسی آذر سے متعلق ہیں، تارخ سے نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تھے۔ اہل سنت جو کہ انبیاء ومرسلین کے آباؤاجداد کے لئے موحّد ہونا ضروری نہیں سمجھتے وہ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ ابراہیمؑ کے باپ تارخ تھے مگر وہ خواہ مخواہ ان کی شخصیت کو آذر کے ساتھ مدغم کر کے کہتے ہیں کہ انہی تارخ کو آذر بھی کہا جاتا ہے[2]

حالانکہ یہ خیال غلط ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

فرقہ حقہ امامیہ کا اجماع اس پر ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤاجداد میں سے کوئی ایک فرد بھی کافر ومشرک نہیں تھا[3]

اسی لئے جناب ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو جو حقیقتاً ان کے والد ہوں، ہم کافر ومشرک ماننے سے قاصر ہیں، جب کہ قرآن مجید میں باپ کہہ کے جو نام درج ہے، وہ بالاجماع جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد بزرگوار کا نام نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٨﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٧٩﴾

''اور اسی طرح ہم دکھا رہے تھے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی قلم وسلطنت[4] اور یہ اس لئے کہ وہ یقین رکھنے

---

[1] کان جدّہ لامّہ او عمّہ (تبیان)

[2] ادر ھو لقبہ و اسمہ تارخ (جلالین)

[3] وقد ثبت ان اجماعھا حجۃ لدخول المعصوم فیھا (تبیان)

[4] ملك آسمانہا و زمین (شاہ ولی اللہ) عجائبات آسمانوں اور زمین کے (رفیع الدین)

والوں میں سے ہوں تو جب رات کی تاریکی ان پر چھائی، انہوں نے ایک تارا دیکھا کہا "یہ میرا پروردگار ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا پھر جب چاند کو چمکتے دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا اگر میرا پروردگار مجھے سیدھے راستے پر نہ رکھے تو میں گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا اے میری قوم والو! یقیناً میں بری ہوں اس سے جو تم شرک کرتے ہو۔ میں یقیناً اپنا رخ موڑے ہوئے ہوں، اس کی طرف جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے، باقی سب طرف سے ہٹ کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔"

عام مفسرین نے اس سب کو ایک واقعہ کی صورت میں فرض کیا ہے کہ یوں ہوا اور یوں کہا اور یہ ہوا اور یہ کہا اور اس لئے اہل سنت کے یہاں یہ حدیث بھی آ گئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام معاذ اللہ تین جھوٹ بولے، حالانکہ صورت حال پر غور کیجئے جو قرآن سے ظاہر ہے: رات ہوئی، ستارہ دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے، یہ کن سے کہا جا سکتا ہے؟ ان سے جو ستارہ پرست ہوں۔

جب وہ غروب کر گیا۔ یہ غروب اسی وقت تھوڑی ہوتا ہے۔ کوئی ستارہ نصف شب کو غروب ہوتا ہے۔ کوئی صبح کو غروب ہوتا ہے تو وہ مجمع جس کے سامنے ھٰذا ربی کہا تھا، کیا بیٹھا رہا جواب غروب کے وقت ان سے کہا: لَآ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پھر جب چاند نکلا، ظاہر ہے کہ اب یہ اس رات کی بات نہیں ہے۔ اب یہ چاند کے طلوع کی بات دوسری رات کی ہو گی۔ اب یہاں ماہتاب پرست سامنے ہیں، ان سے کہہ رہے ہیں کہ یہ میرا پروردگار ہے جب اس نے غروب کیا۔ وہ کیا اسی وقت غروب ہو گیا؟ ظاہر ہے کہ وہ آخر شب تک کسی وقت میں غروب ہو گا تو اب ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میرا پروردگار میری ہدایت نہ کرے تو میں گمراہوں میں سے ہوں۔

اب جب سورج نکلا۔ یہ صبح کو نکلے گا۔ اب مجمع اس وقت آفتاب پرستوں کا ہے تو کہا یہ میرا رب ہے یہ سب میں بڑا ہے۔ جب یہ ڈوبا تو اب فقط ان سے نہیں کہا کہ میں ایسے ڈوبنے والے کو دوست نہیں رکھتا بلکہ اب ستارہ پرستوں، مہتاب پرستوں اور آفتاب پرستوں، سب ہی کو مخاطب کر کے ان سب کے معبودوں کی نفی کی کہ اے قوم! میں اس پروردگار کی طرف رخ کئے ہوں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال اجرام ساویہ کی الوہیت کی نفی اور الٰہ حق کا اثبات

تو اگر یہ کوئی ایک واقعہ ہو تو ماننا چاہیے کہ یہ ایک کوئی بڑی کانفرنس ہوئی جس میں ستارہ پرست بھی جمع ہوئے ہوں، ماہتاب پرست بھی جمع ہوئے ہوں اور آفتاب پرست بھی اور یہ کانفرنس اول شب سے شروع ہوئی اور تمام مجمع بندھا ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے بیٹھا رہا، جس کے نتیجہ میں وہ ستارہ کے غروب کے وقت وہ جملہ فرمائیں اور پھر بھی ابھی یہ کانفرنس اکھٹا رہی اس انتظار میں کہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا کہتے ہیں اور ایک دن گزر کر دوسری رات آ گئی اور اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہتاب پرستوں سے کہا ھٰذا ربی اور پھر سکوت چھا گیا اور کانفرس اب اس کے انجام کو دیکھنے کے لئے بیٹھی رہی اور پھر اس کے غروب کے وقت انہوں نے اس کی رد کو مکمل کیا اور اب بھی کانفرنس صبح کے انتظار میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کو دیکھا اور پکار کر ذرا زور سے اس کی ربوبیت کا اعلان کیا لیکن کانفرنس اب بھی جمی رہی اور اب اس کے غروب کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سب کے مزعومات کی مشترکہ طور پر رد کر کے ان کے تمام مشرکانہ نظریات کے بطلان کا اعلان کرتے ہوئے توحید کامل کے ثبوت پر یہ کانفرنس برخواست کی۔

کیا ایسی کسی کانفرنس کا ہونا عقل میں آنے کی بات ہے؟

پھر آخر اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے عقل سے کام کیوں نہیں لیا جاتا تاکہ سمجھ میں آئے کہ یہ کسی خاص ایک موقع کی بات کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک انداز ہے اس کے بیان کا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس کس طرح معبودانِ باطل کی مدت العمر نفی کرتے رہے اور کس کس طرح انہوں نے توحیدِ حقیقی کو ثابت کیا اور اس ذیل میں جو اقوال درج ہوئے ہیں ان میں کا کوئی قول، ضروری نہیں ہے کہ انہی الفاظ میں زبان سے نکلا ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کبھی انہوں نے ستارہ پرستوں کے قول کو سامنے رکھ کر یوں رد کی اور کبھی مہتاب پرستوں کے قول کو ہدف نگاہ بنا کر اس طرح ابطال کیا اور پھر آفتاب پرستوں کا اس طرح جس کے نتیجہ میں توحید حق منزل ثبوت کو پہنچ گئی۔

رہ گیا سچ اور جھوٹ کا سوال تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کلام جو کسی بات کی خبر دینے کی غرض سے یعنی حکایت واقع کے قصد سے کیا گیا ہو، اس میں سچ اور جھوٹ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ جو مخاطب کا قول رد کرنے کے لئے ہی بطور مفروضہ زبان پر جاری کیا گیا ہو، اس کو جھوٹ کہنا ہرگز درست نہیں ہے۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾

”اور ان سے بحث کی ان کی قوم والوں نے۔ انہوں نے کہا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہو حالانکہ اس نے خود مجھے راستہ دکھایا ہے اور میں ان چیزوں سے جنہیں تم اس کا شریک کرتے ہو نہیں ڈرتا، سوا اس کے کہ میرا پروردگار کوئی بات چاہے۔ میرا پروردگار ہر شے پر اپنے علم کے ساتھ حاوی ہے تو کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے؟!“ معلوم ہوتا ہے بحث میں ان لوگوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ تم ہمارے بتوں کو برا کہتے ہو، دیکھنا تمہارے لئے کیا ہوتا ہے [1]؟!

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تمہارے معبودانِ باطل سے میں نہیں ڈرتا کچھ ہونا ہے تو وہ میرے خدا ہی کے حکم سے ہوگا۔ معبودانِ باطل کچھ نہیں کر سکتے۔

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

”اور میں بھلا ان سے جنہیں تم شریک کرتے ہو کس طرح ڈروں گا، جبکہ تم نہیں ڈرتے اس سے کہ تم نے اللہ کے

[1] خوّفوه من ترك عبادة آلهتهم (مجمع البيان)

ساتھ ایسی چیزوں کوشریک کیا ہے جن کے متعلق اس نے تمہارے پاس کوئی دلیل [1] نہیں بھیجی ہے تو دونوں فریق میں سے کون مطمئن رہنے کا زیادہ حق دار ہے؟ (اسے سمجھو) اگر تم علم وشعور رکھتے ہو، وہ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کی ملاوٹ نہیں کی۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے امن ہے اور یہ صحیح راستے پر قائم ہیں۔"

"ایمان میں ظلم کی ملاوٹ نہیں کی۔" اس کی تشریح اہل تفسیر نے یہ کی ہے کہ شرک اختیار نہیں کیا اس لئے کہ قرآن میں شرک کو کہا گیا ہے ظلم عظیم" "بہت بڑا ظلم" [2] مگر جہاں تک میری نظر قرآن مجید کی اصطلاح پر ہے "شرک" کو داخل ایمان کسی درجہ پر بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے الذین امنوا کے بعد "و" کے ساتھ جو اضافہ کیا گیا ہے اس سے مراد عملی برائیاں لینا چاہئیں جنہیں گناہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اصطلاح بھی قرآن سے ثابت ہے کہ ہر گناہ داخل ظلم ہے۔ اگر وہ غیر ظلم نہیں بھی ہے تو اپنے او پر تو ظلم ہے ہی لہٰذا استحقاق امن کی منزل پر امنوا کے ساتھ (وَلَمْ يَلْبِسُوٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ) کی وہی حیثیت ہے جیسی دوسری جگہ بشارتوں کے موقع پر امنوا کے ساتھ (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) کا اضافہ جو تقریباً ہر جگہ قرآن میں موجود ہے۔

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

"اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی تھی ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلندی عطا کرتے ہیں۔ یقیناً تمہارا پروردگار صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔"

یہ اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے جو پہلے ستارے اور چاند اور سورج کی الوہیت کی نفی کر کے توحید الٰہی کے ثبوت میں گزر چکا ہے [3] اور اس کے لئے یہ ضرورت نہیں ہے کہ یہ کسی ایک دفعہ کے واقعہ میں بحث ہوئی ہو اور استدلال کیا گیا ہو بلکہ پوری عمر میں مختلف معبودان باطل کے مقابلہ میں ان کا طریقۂ استدلال یہ تھا جسے خالق اپنی تعلیم خاص کا نتیجہ بتا رہا ہے۔ [4]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ تمام استدلال کے طریقوں کی طرف مجموعی طور پر اشارہ ہو جن میں سے ایک وہ ستاروں اور چاند وغیرہ کے حالات سے استدلال بھی ہے۔

اب خالق تو فرما رہا ہے کہ یہ ہماری طرف کی دلیل تھی جو ہم نے ابراہیمؑ کو عطا کی اور اسے وہ ان کی خاص بلندی کا ثبوت قرار دے رہا ہے کہ جسے چاہتے ہیں ہم مرتبوں میں بلندیاں دیتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی نام نہاد حدیث کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام معاذ اللہ تین دفعہ جھوٹ بولے تو یہ حدیث دیوار پر پھینکنے کے قابل ہوئی یا نہیں؟

---

[1] سلطانا ای حجۃ لان السلطان ھو الحجۃ فی اکثر القراٰن (تبیان)

[2] الظلم المذکور فی الاٰیۃ ھو الشرک عند اکثر المفسرین (تبیان) نیا میختند ایمان خود را بشرک (شاہ ولی اللہ)

[3] حجّتنا التی احتج بھا ابرٰھیم علیٰ وحدانیۃ اللہ من افول الکوکب وما بعدہٗ (جلالین)

[4] الحجج التی ذکرھا ابرٰھیم لقومہ اعطاھا ایاہ بمعنی انہ ھداہ لرما (تبیان)

وَ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ ‌ؕ كُلًّا هَدَيۡنَا ‌ۚ وَنُوۡحًا هَدَيۡنَا مِنۡ قَبۡلُ‌ وَمِنۡ
ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡسُفَ وَمُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ‌ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى
الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝٨٤ وَزَكَرِيَّا وَيَحۡيٰى وَعِيۡسٰى وَاِلۡيَاسَ‌ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝٨٥
وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَيُوۡنُسَ وَلُوۡطًا‌ ؕ وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝٨٦ وَمِنۡ
اٰبَآٮِٕهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ وَاِخۡوَانِهِمۡ‌ ۚ وَاجۡتَبَيۡنٰهُمۡ وَهَدَيۡنٰهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ۝٨٧ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ‌ ؕ وَلَوۡ اَشۡرَكُوۡا
لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝٨٨

''اورہم نے عطا کئے انہیں اسحٰقؑ اور یعقوبؑ، ہر ایک کو ہم نے راستہ دکھایا اور نوحؑ کو اس کے پہلے ہم نے راستہ دکھایا اور ان کی اولاد میں سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اور اسی طرح ہم صلہ دیتے ہیں حسن عمل رکھنے والوں کو اور زکریا اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاس کو، ہر ایک نیک افراد میں سے تھا اور اسمٰعیلؑ اور یسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو اور ہر ایک کو ہم نے تمام جہانوں سے زیادہ عطا کیا اور ان کے باپ داداؤں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی اور انہیں ہم نے منتخب کیا اور سیدھے راستے پر لگایا۔ یہ اللہ کی خاص ہدایت ہے جس کے ذریعہ سے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے نوازتا ہے اور اگر وہ شرک اختیار کرتے تو اکارت جاتے، وہ سب کارنامے جو انہوں نے انجام دیئے تھے۔''

اس آیت میں ذریت نوح علیہ السلام میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کو درج کیا گیا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ نواسے بھی ذرّیت میں داخل ہوتے ہیں اور اس لئے حضرات حسنین علیہما السلام کو اولاد و ذریت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنا عام اصول قرآنی کے مطابق بھی درست ہے۔[1]

اُولٰٓٮِٕكَ الَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ‌ ۚ فَاِنۡ يَّكۡفُرۡ بِهَا هٰٓؤُلَاۤءِ فَقَدۡ
وَكَّلۡنَا بِهَا قَوۡمًا لَّيۡسُوۡا بِهَا بِكٰفِرِيۡنَ‏ ۝٨٩ اُولٰٓٮِٕكَ الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ‌ فَبِهُدٰٮهُمُ
اقۡتَدِهۡ‌ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسۡــَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا‌ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡعٰلَمِيۡنَ ۝٩٠

''یہ وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب حکمت[2] اور نبوت عطا کی ہے۔ اب اگر یہ لوگ[3] اس کے ساتھ کفر اختیار کرتے

[1] ۔یفید۔ان الذریۃ تتناول اولاد البنت (جلالین) فی الأیۃ دلالۃ علیٰ ان الحسن والحسین من ولد رسول اللہ ﷺ (تبیان)
[2] ۔الحکم معناہ الحکم بین الناس وقیل الحکم (مجمع البیان)
[3] ۔کافر شوند بآیات قرآن ایں کافران (شاہ ولی اللہ)

ہیں تو ہم نے اسے حوالہ کیا ہے ایسے لوگوں کے جو اس کے ساتھ کفر نہیں کریں گے [۱] یہ وہ ہیں جنہیں اللہ نے راستے پر لگایا ہے تو ان ہی کی ہدایت کی پیروی کیجئے۔ کہہ دیجئے کہ میں اس پر [۲] کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ وہ نہیں ہے مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے۔"

"وہ نہیں ہے" یعنی قرآن......مگر زیادہ قریب باعتبار لفظ "اجر" ہے جب کہ دوسری آیت میں ایک اجر کا سوال ہوا بھی ہے: قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى (شوریٰ۔ ۲۳) تو یہ ھُوَ کی ضمیر بھی اجر ہی کی طرف کیوں عائد نہ ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ اجر جو میں نے طلب کیا ہے، وہ کوئی میرے فائدہ کی چیز نہیں ہے۔ وہ تو خلائق کی ہدایت کا ایک سامان ہے اور تمہاری ہی بہتری کے لئے ہے جیسا کہ تیسری آیت میں ہے:۔ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَكُمۡ (سباء۔ ۴۷) "میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے، وہ تو تمہارے ہی نفع کے لئے ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ ؕ قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى نُوۡرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا ۚ وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾

"اور انہوں نے اللہ کو اس کی واقعی شان کے ساتھ نہیں سمجھا [۳] جب انہوں نے کہا کہ نہیں اتارا اللہ نے کسی انسان پر کچھ بھی۔ کہیے کہ کس نے اتاری تھی وہ کتاب جسے موسیٰ لے کر آئے تھے روشنی اور ہدایت کا ذریعہ بنا کر لوگوں کے لئے جسے تم متفرق کاغذوں کی شکل میں رکھتے ہو [۴] جنہیں لوگوں کے سامنے لاتے ہو اور بہت سا حصہ چھپا دیتے ہو اور تمہیں اب وہ علم دیا گیا جو تمہیں نہیں معلوم تھا [۵] اور نہ تمہارے باپ داداؤں کو۔ کہیے کہ اللہ نے (وہ کتاب اتاری تھی) پھر چھوڑ دیجئے انہیں کہ وہ اپنی نکتہ چینیوں میں کھیل کود مچائے رہیں۔"

یعنی خود ہی وہ اس کی سزا پائیں گے۔ [۶]

---

[۱] ۔مقرر ساختیم برای ایمان بآنہا گروھی را کہ ھر گز کافر نشوند (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔علیہ ای علی القراٰن (جلالین)

[۳] ۔لم یبلغوا من عظمة اللہ ان یصفوہ بصفاتہ (علی بن ابراھیم) ای ماعرفوہ حق معرفتہ وما وصفوہ بما ھو اھل ان یوصف بہ (تبیان)

[۴] ۔ای یکتبو نہ فی دفاتر مقطعة (جلالین) ورق ورق ظاہر کرتے ہو اس کو (شاہ رفیع الدین)

[۵] ۔علمتم ایھا الیھود فی القراٰن (جلالین)

[۶] ۔لیس علی اباحة ترك الدعآء والانذار بل علی ضرب من الوعید والتھدید (تبیان)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

''اور یہ وہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے تصدیق کرنے والی اس کی جو اس کے پہلے ہے اور اس لئے کہ آپ متنبہ کریں مکہ میں اور اس کے اردگرد جتنے ہیں، سب کو۔ اور جو روز آخرت کو مانتے ہوں، وہ سب اسے مانتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔''

چونکہ مکہ معظّمہ تقریباً وسط معمورہ میں تھا، اس لئے اس کے اردگرد کا احاطہ تمام دنیا کو حاوی ہے جس میں کسی ملک کی قید نہیں ہے۔ [۱]

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور کون ظالم ہوگا زیادہ اس سے کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا کہے کہ میری طرف وحی اتری ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ اتری ہو اور جو کہے کہ ویسا ہی عنقریب میں اتار دوں گا جیسا اللہ نے اتارا ہے اور کاش دیکھو تم وہ موقع کہ جب ظالم لوگ مرگ کے سکرات میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے کہ نکالو اپنی روحوں کو آج تمہیں ذلت کا عذاب اس سزا میں ہے کہ تم اللہ کی نسبت غلط باتیں کہتے تھے اور تم اس کی آیتوں کے مقابلہ میں تکبر سے کام لیتے تھے۔''

آیت کس کے بارے میں وارد ہوئی ہے؟ اس سے اختلاف ہے۔ وہ قول جسے معصومؑ سے وارد شدہ روایت کی تائید حاصل ہے ایک یہ ہے کہ وہ مسلیمہ کذاب کے بارے میں ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور کچھ تک بندی کر کے اسے بخیال خود قرآن کے جواب کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ [۲]

اور دوسرا قول جس کے بارے میں بھی حدیث وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ وہ عثمان خلیفۂ ثالث کے دودھ شریک بھائی عبداللہ ابن سعد بن ابی سرح کے بارے میں اتری ہے جو خوش نویسی کی بنا پر کتابت وحی کے لئے مامور کیا گیا تھا تو وہ تیزی کر کے جو آیت حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بولتے تھے، اس کا آخری جملہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بولنے سے پہلے اپنے ذوق کے لحاظ سے لکھ دیتا تھا۔ کبھی ایسا ہوا کہ وہ ٹھیک نکلا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے

[۱]۔ ومن حولها اهل الارض کلهم عن ابن عباس (مجمع البیان)

[۲]۔ الاوّل هو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (تبیان)

نہیں بدلا۔ بس اسے شیطان نے اس کی گمراہی کا ذریعہ بنا دیا اور وہ کہنے لگا کہ قرآن کی آیتوں کو میں اپنے ذوق کی بنا پر تیار کر سکتا ہوں۔ یہ آیت اس کے بارے میں آئی ہے۔ [1]

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

''اور تم ہمارے پاس تن تنہا آئے ہو [2] جیسے کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا [3] وہ سب تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم نے خیال کیا تھا کہ وہ تمہارے بارے میں (ہمارے ساتھ) شریک [4] تمہارے باہمی تعلقات قطع ہو گئے [5] اور جو کچھ تمہارا زعم باطل تھا، غائب ہو چکا ہے۔''

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾

''یقیناً اللہ شگافتہ کرنے والا ہے دانوں اور گٹھلیوں کا۔ وہ نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کا زندہ سے۔ یہ ہے اللہ تو کدھر بھٹکتے پھرتے ہو [6]''۔

دانے اور گٹھلی کے شگافتہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے اندر جو درخت پنہاں ہے، خواہ کھیتی کی قسم سے یا باغ سے، وہ اس میں سے اپنی قدرت سے برآمد کرتا ہے۔ [7]

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ

---

[1]۔ عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ (علی بن ابراھیم)

[2]۔ وحدانا لا مال لکم ولا اثاث ولا رقیق ولا شئ مما کان اللہ خولکم (تبیان)

[3]۔ ماملکنا کم فی الدنیا (مجمع البیان)

[4]۔ معناہ زعمتم انھم شرکاؤنا فیکم (مجمع البیان)

[5]۔ تقطع بینکم یعنی المودۃ (علی بن ابراھیم)

[6]۔ فکیف تطرفون عن الایمان بعد قیام البرھان (جلالین)

[7]۔ فلق الحب یعنی شقہ من کل ما ینبت من النبات فاخرج منہ النور علی اختلافھا والنوی من کل ما یغرس مما لہ نواۃ فاخرج منہ الشجر (تبیان)

تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَالَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ
ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾

''وہ سفیدۂ سحری کا نمایاں کرنے والا ہے اوراس نے رات کو آرام کا وقت اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا ہے[1] یہ زبردست واقف کار کا مقرر کردہ نظام ہے اوراس نے تمہارے لئے ستاروں کو قرار دیا ہے تاکہ تم ان سے راستہ حاصل کرو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں۔ ہم نے کھول کھول کر باتیں بیان کردی ہیں ان کے لئے جو جاننے والے ہوں۔''

قمری حساب کا اعتبار

سورج کے طلوع وغروب سے دن اور رات کی تشکیل ہوتی ہے جن سے ہفتے بنتے ہیں،ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال اور چاند کے بصورت ہلال طالع ہونے اور پھر آخر میں غائب ہوکر دوبارہ نکلنے سے مہینوں کی تشکیل ہوتی ہے جن کے اجتماع سے سال بنتے ہیں لہٰذا دونوں ہی کو حساب میں داخل قرار دیا ہے اور اگر مہینوں اور تاریخوں میں بھی شمسی حساب معتبر ہوتا تو چاند کا حساب کے مقصد میں کوئی دخل ہی نہ ہوتا۔

قرآن کا محل حساب میں قمر کو اہمیت دینا اس کی دلیل ہے کہ اسلام میں قمری تاریخیں معتبر ہیں اور سوا استثنائی صورتوں کے شمسی تاریخوں کا اعتبار نہیں ہے۔

ستاروں کی رہنمائی کے فائدہ کو بیان کرنے میں جاننے والوں کی قید اس لئے ہے کہ ستاروں کی رہنمائی سے عوام فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ وہی لوگ جو ستاروں کی علامتوں کا علم رکھتے ہوں۔[2]

وَهُوَالَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَالَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ
نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ
مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٩٩﴾

---

[1]۔ اشارہ سبحانه بذلك الى ما في حسابهما من مصالح العباد في معاملاتهم وتواريخهم واوقات عباداتهم (مجمع البيان)

[2]۔ انما اضاف الى الذين يعلمون وان كانت أيات لغيرهم لانهم المنتضحون بها (تبيان)

"اور وہ وہ ہے جس نے تم سب کو ایک تنفس سے [1] پیدا کیا ہے پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ اور سونپنے کے مقام پر رکھا۔ ہم نے تفصیل کے ساتھ باتیں بیان کی ہیں ان کے لئے جو سمجھنا چاہیں، اور وہ وہ ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا تو اس سے ہم نے نکالے ہر طرح کے نباتات تو اس سے باہر نکالی ہری ہری کھیتی [2] جس سے ہم نکالتے ہیں تہہ بہ تہہ [3] دانے اور کھجور کے درختوں سے جن کی شاخوں میں سے کچھ گچھے زمین کی طرف جھکے ہوتے ہیں اور باغ انگور اور زیتون اور انار کے جو ملتے جلتے ہوئے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے۔ دیکھو ان کے پھلوں کو جب وہ میوہ دار ہوں اور ان کی رسیدگی کو۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔"

"ٹھہرنے کی جگہ اور سونپنے کے مقام" کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں جنہیں علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں درج کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی معصوم کی طرف استناد نہیں رکھتا۔ ان میں سے جو ذہن میں آنے والا قریبی مفہوم ہے وہ ہے کہ مُسْتَقَرٌّ سے مراد صلب پدر اور مُسْتَوْدَعٌ سے شکم مادر مراد ہے یا اس کے برعکس۔ [4]

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿100﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿101﴾

"اور انہوں نے نظروں سے پوشیدہ مخلوق کو اللہ کا شریک بنایا ہے حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور انہوں نے اس کے لئے جہالت سے لڑکے اور لڑکیاں تصنیف کی ہیں۔ پاک ہے وہ اور بلند ہے اس سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ موجد ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے لئے اولاد کہاں سے ہوگی۔ حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے ہی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔"

یہاں بہت سے مذاہب باطلہ کے مزعومات کو سمیٹ کر ایک ساتھ انہیں یاد دلایا ہے کہ "انہوں نے اس کے لئے لڑکے اور لڑکیاں تصنیف کی ہیں" جیسے یہود و نصاریٰ نے عزیر اور مسیح کو اس کا بیٹا قرار دیا اور مشرکین نے فرشتوں کو بیٹیاں قرار دیا۔

اب چونکہ جنات جس قوم کا نام ہے، ان کے متعلق کسی ایسی جماعت کا پتہ نہیں چلتا جس نے ان کا اللہ سے رشتہ قرار دیا ہو جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صافات۔ ۱۵۸)، یا انہیں شریک خدا قرار دیا ہو جیسا کہ یہاں کہا جا رہا ہے، اس لئے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں جن سے لغوی معنیٰ "آنکھ سے پوشیدہ" ہونے کی بنا پر فرشتے مراد ہیں [5] اور اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ "نظروں سے

---

[1] ۔ای من ادم (مجمع البیان)
[2] ۔رطبا من الزرع (تبیان)
[3] ۔یکی بر دیگری پیوسته (شاہ ولی اللہ) ایک پر ایک چڑھا ہوا (شاہ رفیع الدین)
[4] ۔فمستقر منکم فی الرحم ومستودع منکم فی الصلب (جلالین)
[5] ۔وصفهم بالجن لخفائهم عن الابصار (تبیان)

پوشیدہ مخلوق" کے ساتھ کیا ہے مگر ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ کا جنات کے بارے میں اسی طرح کا عقیدہ ہو جو غالباً ہمارے یہاں کی حدیث میں موجود ہے۔[1]

اس کے بعد چونکہ ان مذاہب باطلہ میں سے جن کی رد مقصود ہے، کسی نے اللہ کے لئے بیوی کا ہونا تجویز نہیں کیا ہے، اس لئے بیوی کے نہ ہونے کو اولاد نہ ہونے کی دلیل میں پیش کیا گیا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

"یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، کوئی خدا نہیں سوا اس کے، وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے تو اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے۔ اسے نگاہیں پا نہیں سکتیں اور وہ سب نگاہوں پر حاوی ہے اور وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے، بڑا خبر رکھنے والا۔"

نفی رویت

یہ آیت صاف نفی رویت کی دلیل ہے۔ خالق کی شانِ جلال و کمال بیان ہو رہی ہے کہ نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں۔ اس میں دنیا اور آخرت کی کوئی قید نہیں ہے مگر کیا کیا جائے تقلید آباء کو کہ شاہ ولی اللہ صاحب حاشیہ یا تفسیر میں نہیں بلکہ اصل ترجمہ میں یہ لفظ بڑھا دیتے ہیں کہ:

"در نمی یابند او را چشمہا یعنی در دنیا"

آخر جلال و کمال رب میں دنیا کی خصوصیت کیا ہے؟ کیا قیامت میں وہ خدا خدا نہیں رہے گا جو اس کا کمال ختم ہو جائے گا اور جلال ذات میں فرق آ جائے گا۔

ان کے ایک صاحبزادۂ بلند اقبال جناب شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ میں خیر تصرف نہیں کیا۔ یہ لکھ دیا کہ: "نہیں پاتیں اس کو نظریں" مگر دوسرے صاحبزادۂ عالی شان شاہ عبدالقادر نے حاشیہ میں تحریر فرما دیا۔

"یعنی آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے مگر جو وہ آپ کو دکھا دے اس واسطے کہ وہ لطیف ہے۔" (موضح القرآن)

مگر ذرا بیان قرآن کا انداز دیکھئے۔ وہاں انسان کے نقص کا ذکر نہیں ہو رہا ہے کہ "یہ ہو تم جو اتنے ناقص ہو کر اپنے زیر قدم نہیں دیکھ سکتے اور تمہاری نگاہیں خدا کو نہیں پا سکتیں۔" اگر یہ انداز ہوتا یعنی موضوع کلام انسان کا نقص ہوتا تو آپ یہ معنی فرماتے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے مگر وہاں تو یوں ارشاد ہو رہا ہے کہ "یہ ہے تمہارا پروردگار جو واحد حقیقی ہے۔ جو ہر شے کا خالق ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں" تو یہ ہماری نگاہوں کا ذکر نہیں بلکہ خالق کے کمال و رفعت کا تذکرہ ہے۔ اس لئے اس کے کمالِ رفعت میں دنیا اور آخرت کی تریق غلط ہے۔

[1] قال وکانوا یعبدون الجن (علی بن ابراھیم)

اوراب اس استثناء کی بھی گنجائش نہیں کہ ''مگر جو وہ آپ کو دکھا دے''...... یہ ''مگر'' اول تو قرآن میں کہاں ہے جو ''لطیف'' کے لفظ کا تعلق اس سے قرار دیا جائے پھر کیا جو اس کی شان بیان ہوئی ہے کہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ''کوئی اس کے سوا خدا نہیں'' اس میں یہ گنجائش ہے کہ ''مگر جو وہ کسی کو اپنے ساتھ خدا بنا دے کیونکہ وہ لطیف ہے۔'' ظاہر ہے کہ اس میں اس استثناء کی گنجائش نہیں تو پھر اس لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ میں شان الٰہی کا ایک پہلو ہے، اس ''مگر'' کی گنجائش اور لطیف کے اس سے تعلق کی معقولیت کیا ہے؟!

ان لوگوں نے اس معنی کے قرار دینے کے لئے ہی ''لطیف'' کے معنی ''مہربان'' کے قرار دیئے ہیں [۱] حالانکہ لطیف کے اس معنی کا کلام سابق کے کسی جز سے ربط نہیں قائم ہوتا بلکہ اس لطیف کے معنی ہیں ''مادہ کی کثافتوں سے بری'' اور یہ کہ لا تدرکه الابصار کی ایک طرح سے دلیل ہے یعنی نگاہیں اس کو اس لئے نہیں پا سکتیں کہ وہ جسمانیت سے بری ہیں اور دوسرا جز الخبیر دوسرے فقرہ یدرك الابصار کی دلیل ہے کہ وہ نگاہوں پر حاوی ہے اس لئے کہ وہ باخبر ہے۔ لطف یہ ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ میں ''لطیف'' کے معنی مہربان کے نہیں لئے ہیں بلکہ هُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ کا ترجمہ کیا ہے ''وہ ہے باریک، دیکھنے والا۔''

یہ ''باریک'' کا لفظ انتہائی کوتاہی تعبیر کے ساتھ وہی مادیت وجسمانیت سے بری ہونے کے مفہوم کا حامل ہو سکتا ہے۔ اس کا مہربانی سے یقیناً کوئی تعلق نہیں مگر دوسرے بھائی صاحب بلا وجہ یہ کہنے لگے کہ ''مگر وہ آپ کو دکھا دے اس واسطے کہ لطیف ہے'' یہ ہوتے ہیں سخن پروری یا روایت پرستی کے کرشمے۔

قَدۡ جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ عَمِیَ فَعَلَيۡهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِحَفِيۡظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ وَلِيَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

''آئی ہیں تمہارے پاس بصیرتیں [۲] تمہارے پروردگار کی جانب سے تو جو نظر کرے گا، وہ اپنا فائدہ کرے گا اور جو اندھا بنا رہے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا پہریدار نہیں ہوں۔ اور اسی طرح ہم طرح طرح سے حقیقتیں بیان کرتے ہیں [۳] اور اس لئے کہ وہ کہیں کہ آپ نے خوب پڑھا ہے اور تا کہ اسے صاف صاف ہم بیان کر دیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔''

''لِيَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ'' کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے کہ ''وہ کہیں کہ آپ نے خوب پڑھا ہے'' یعنی ان کا ضمیر اس کی گواہی دے دے یا کبھی زبان سے بھی اس کا اقرار کر لیں، یہی سیاق وسباق دونوں کا تقاضا ہے کیونکہ اتمام حجت ہونے کا ذکر ہو رہا ہے مگر دوسرے مفسرین نے اس بیچ کے ٹکڑے کو سابق اور لاحق سے علیحدہ کر کے اس لام کو ویسا لام قرار دیا ہے جیسے جناب موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

---

[۱] ۔اوست مہربان، آگاہ (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔بینات ودلالات (مجمع البیان)

[۳] ۔لیقولوا ای الکفار فی عاقبة الامر درست ذکرت اهل الکتاب (جلالین)

"فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا" (قصص۔۸) فرعون والوں نے انہیں دریا سے نکال لیا تاکہ وہ ان کے لئے دشمنِ جان ثابت ہوں" یعنی نتیجہ اس کا ان کے لئے یہ ہوا، نہ یہ کہ ان کا مقصد یہ تھا۔ اسی طرح یہاں یہ معنی ہیں کہ ہم نے ہی قرآن اتارا اور بصیرتیں ان کے سامنے پیش کیں، تاکہ وہ یہ کہیں کہ آپ نے یہ سبق یہودیوں سے حاصل کئے ہیں اور ان سے یہ علوم آپ کو ملے ہیں یعنی ایمان پھر بھی اس پر نہ لائیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔[1]

میرے نزدیک یہ مفہوم قرآن کے قبل اور بعد کے فقروں کی بنا پر جن میں اسی طرح لام موجود ہے اور وہ لام غایت ومقصد ہی کے لئے ہے، ناقابل قبول ہے۔

بعض مترجمین نے اس لام کو غرض وغایت ہی کا قرار دیتے ہوئے ایک عجیب طرح کے حذف واضمار کا تصور کر کے ترجمہ کیا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ ایسا نہ ہو وہ یہ کہیں کہ آپ نے اس کو پڑھا ہے۔[2]

ظاہر ہے کہ یہ "ایسا نہ ہو" بالکل ایجاد بندہ ہے جس کا قرآن میں کوئی نشان نہیں ہے۔

اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾

"پیروی کیجئے اس کی جو آپ کی طرف وحی اتری ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور مشرکین سے بے اعتنائی اختیار کیجئے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور آپ کو ہم نے ان پر پہریدار مقرر نہیں کیا ہے اور نہ آپ ان کے ٹھیکے دار ہیں۔"

یہ وہی تسلی کی قسم کی آیت ہے یعنی مشرکین کے افعال کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ اپنا فرض انجام دیتے رہیے۔ پھر اس سے مطلب نہ رکھئے کہ وہ مانتے ہیں یا نہیں۔ خدا کو جبر سے کام لینا تو ہے نہیں، ورنہ ایک بھی مشرک نہ ہوتا[3]

پھر اگر وہ شرک اختیار کرتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ ان کے پہریدار نہیں ہیں کہ زبردستی انہیں شرک سے روکنا آپ کے لئے ضروری ہو اور نہ آپ ان کے ٹھیکے دار ہیں کہ ان کے افعال کی ذمہ داری آپ پر عائد ہو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا

---

[1] ۔ هٰذه اللام تستميها اهل اللغة لام الصيرورة (مجمع البيان)
[2] ۔ برای احتراز آنکه گویند که خواندهٔ (شاه ولی الله)
[3] ۔ لو شآء الله ان یکونوا علیٰ غیر الشرك فسر اما اشرکوا (تبیان)

يَعْمَلُوْنَ﴿۱۰۸﴾

''اور جن کی یہ اللہ کے سوا دہائی دیتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو کہ وہ جہالت کی بنا پر تجاوز کر کے اللہ کو گالیاں دیں۔ یوں ہی ہم نے ہر قوم کے کردار کو سنوارا ہے۔ پھر ان کے پروردگار کی طرف ان کا رجوع ہوگا تو وہ انہیں جو کچھ کرتے تھے، اس کے متعلق بتائے گا۔''

رواداری کی تعلیم اور معبودان باطل کے سبّ وشتم سے ممانعت

خالق کریم نے معبودان باطل کی نسبت جس حکیمانہ رویہ کی دعوت دی ہے یہ بات تمام پیشوایانِ باطل کے لئے ہے۔

وہ لاکھ برا کہنے کے قابل ہوں مگر اعلانیہ انہیں برا کہو گے تو وہ جسارت و گستاخی کر کے تمہارے پیشوایانِ حق کے خلاف بدگوئی سے کام لیں گے اور اس ''ناصبیت'' و ''خارجیت'' کے مظاہرہ کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔

بے شک دلائل کے ذریعہ سے کسی کی کمزوریوں کا سنجیدہ اور مہذب انداز میں ظاہر کرنا اور چیز ہے اور برا کہنا یا گالیاں دینا دوسری چیز ہے۔ اس میں کسی حق کا اثبات نہیں ہوتا، صرف فریق مخالف کا دل دکھ جاتا ہے۔ اس لئے کد میں وہ بھی ہمارے معبود یا پیشوا کے خلاف سب وشتم پر اتر آتا ہے لیکن پہلی صورت میں یہ خطرہ یوں نہیں ہے کہ ہم تو استدلال کے ذریعہ سے ان کا ابطال کر رہے ہیں لیکن مخالف حق کے پاس اس طرح کے دلائل ہو ہی نہیں سکتے، اس لئے مجبوراً اگر وہ قبول نہ بھی کرے تو اسے خاموشی کے سوا چارۂ کار نہ ہوگا۔

''یونہی ہم نے ہر قوم کے کردار کو سنوارا ہے''......یعنی ہم ہمیشہ صحیح سیرت و کردار ہی کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ اس کی پیروی نہ کریں۔[۱]

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم جو کچھ وہ کر رہی ہے اس میں مگن ہے اور وہ اسی کو اچھا سمجھ رہے ہیں اور اب ہم نے بھی انہیں ایسا ہی چھوڑ رکھا ہے کہ ان کے اعمال ان کی نظر میں درست نظر آتے ہیں۔

یہ اللہ کا یوں چھوڑ دینا، ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ ان کی بداعمالی کا سبب ہے، اس لئے ان سے اس کا محاسبہ ہوگا جس کا آخر آیت میں ذکر ہے۔[۲]

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴿۱۱۰﴾

---

[۱] ۔المراد بہ فی الآیۃ تزئین اعمال الطاعۃ (مجمع البیان)

[۲] ۔زینا لکل امۃ عملھم یعنی بعد اختیار ھم ودخولھم فیہ والدلیل علیٰ ان ذٰلک نفعلھم للتقدم قولہ: ثم الیٰ ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون (علی بن ابراھیم)

’’اورانہوں نے تمام ممکن صورتوں کے ساتھ اللہ کی قسم کھائی کہ اگر کوئی معجزہ ان کے پاس آئے گا تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے، کہیے کہ معجزے تو بس اللہ کے قبضہ میں ہیں اور تم لوگوں کو کیا خبر ہے کہ وہ جب آئے گا تو وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو تہہ وبالا کر دیں گے جیسا کہ انہوں نے پہلی بار اس پر ایمان اختیار نہیں کیا اور انہیں چھوڑ دیں گے ان کی سرکشی میں کہ وہ اندھے بنے پھرتے رہیں گے۔‘‘

اس فقرہ سے کہ ’’جیسا کہ انہوں نے پہلی بار ایمان اختیار نہیں کیا‘‘[1] ظاہر ہے کہ معجزات جو اتمام حجت کے لئے کافی ہوں، آ چکے تھے۔ اس کے بعد ان کا ی کہنا کہ کوئی معجزہ آئے تو ہم ایمان لائیں گے، دھاندلی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے کہا گیا کہ ’’معجزے بس خدا کے پاس ہیں‘‘ یعنی ایسے معجزے جنہیں تم مان لو، میرے بس میں قطعاً نہیں ہیں۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾

’’اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتارتے اور ان سے مُردے باتیں کرتے اور ان کے سامنے تمام چیزوں کو گروہ در گروہ روزِ محشر کی صورت سے لا کر کھڑا کر دیتے[2] تب بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے، سوا اس کے کہ اللہ طے کر لیتا لیکن ان میں زیادہ تر جہالت سے کام لیتے ہیں۔‘‘

’’اللہ طے کر لیتا‘‘ یعنی جبری طور پر[3] اسے منظور ہوتا کہ وہ اپنی قوت قاہرہ سے انہیں ایمان کے راستے پر لگا دے جو اس کی حکمت کامل اور انسان کے امتیازی جوہر یعنی اس کے فاعل مختار ہونے کے خلاف ہے۔ اس صورت میں تو خدا کی قدرت کے مقابلہ میں انسان کی قوت ختم ہی ہو جاتی اس لئے یہ سب ایمان لے آتے جو ایمانِ اضطراری ہوتا، ورنہ جہاں تک ان کا اختیار ہے، یہ اتنے معجزات ...... جتنے بھی کسی کے تصور میں آ سکیں مثلاً فرشتے براہ راست ان کے پاس اترتے۔

مُردے ان سے باتیں کرتے۔ تمام عالم کی اشیاء محشور ہو کر ان کے سامنے اکٹھا ہو جاتیں، یہ سب ہو جاتا، پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے۔ اس لئے کہ سوتا ہوا ہو تو کسی آواز پر جاگ جائے گا اور جو جاگ رہا ہو مگر اٹھنا نہ چاہتا ہو اسے کون سی آواز ہو گی جو بیدار کرے؟!

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ

---

[1]۔ كما لم يؤمنوا بما انزل من الاٰيات اول مرة عن ابن عباس ومجاهد (مجمع البيان)

[2]۔ قبلا بضمتين جمع قبيل اى فرجا فوجا (جلالين)

[3]۔ اى يجبرهم على الايمان (على بن ابراهيم)

وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اوراسی طرح ہم نے قرار دیا ہر نبی کے لئے دشمن آدمی اور جنات میں کے شیطانوں کو جن میں سے ایک دوسرے کی طرف بناوٹی باتوں کا فریب دہی کے لئے القا کرتا رہتا ہے اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لہٰذا چھوڑ یئے انہیں اور اسے جو افترا پردازی کرتے رہتے ہیں اور اس لئے کہ مائل ہوں اس کی طرف دل ان کے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس لئے کہ وہ اسے پسند کریں جس کا یہ ارتکاب کرتے ہیں۔''

''دشمن قرار دیئے'' یعنی نبی نے حکم خدا سے اعلان نبوت کیا اور پیغام حق پہنچایا تو یہ لوگ اپنی ''کفر دوستی'' اور ''باطل پرستی'' کی وجہ سے ان کے دشمن ہو گئے۔

یہ دشمنی ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے لیکن چونکہ اس کے ظہور میں آنے کے اسباب خدا کی طرف سے پیدا ہوئے۔ نہ وہ نبی بناتا، نہ ان سے اعلان حق کراتا، نہ یہ لوگ ان کے دشمن ہوتے، اس لئے ان کو دشمن بنانے کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی۔

پھر اس کے بعد جو مضمون ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جو ایک دوسرے کو بناوٹی باتوں کا القاء کرتے رہتے ہیں، وہ فریب دہی کے لئے [۱] اور اس لئے ہے [۲] کہ ایمان سے بے بہرہ افراد ان کی طرف متوجہ ہوں اور پسند کریں اور وہ بھی ایسا ہی کرنے لگیں۔

درمیان میں جو یہ فقرہ ہے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے'' یہ جملۂ معترضہ کی حیثیت سے ہے جس کے وہی معنی ہیں جو اس کے قبل کی آیت میں تھے یعنی اپنی قوت قاہرہ سے وہ انہیں روکنا چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے مگر جبر کو صرف کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ [۳]

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''تو کیا اللہ کے علاوہ کسی کو میں فیصلہ کے لئے تلاش کروں اور وہی تو وہ ہے جس نے تمہاری جانب کتاب اتاری ہے تفصیلی بیانات کی حامل اور جنہیں ہم نے کتاب دی تھی، وہ جانتے ہیں کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اتری ہوئی ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔''

چونکہ کتب سابقہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علامات تفصیل کے ساتھ مذکور تھے اس لئے جا بجا قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوب پہچانتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کہا جا رہا ہے کہ وہ اس کتاب یعنی قرآن کو بھی جانتے ہیں پورے طور پر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جانتے سب ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ مانتے بھی ہیں اور وہ وہ ہیں کہ جو ایمان لے آئے اور کچھ جانتے ہیں مگر مانتے نہیں ہیں۔

---

[۱] تا فریب دہندہ (شاہ ولی اللہ)

[۲] العامل فی قولہ ''لتصغیٰ'' قولہ ''یوحی'' (مجمع البیان)

[۳] ذٰلک ینافی التکلیف ولو حال بینہم وبینہ لما فعلوہ (تبیان)

اسی کا نام کفر جحودی ہوتا ہے کہ آدمی جان بوجھ کر انکار کرے۔

اب قرآن مجید میں چونکہ یہاں ماننے کا نہیں، بس جاننے کا ذکر ہے لہٰذا کوئی ضرورت نہیں کہ اسے اہل کتاب کے ان خاص افراد سے متعلق قرار دیا جائے جو مسلمان ہو گئے تھے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔[1]

ہاں اس خصوصیت کی قید لگانے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ ان میں کے علماء اور اپنی کتابوں سے واقف افراد کا ذکر ہے۔ نہ کہ عوام الناس[2] کا جنہیں خود اپنے یہاں کی کوئی خبر نہیں ہے۔ صرف نام کے لئے وہ اپنے کو ان فرقوں سے متعلق قرار دیتے ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝١١٥

”اور آپ کے پروردگار کی بات پوری ہے سچائی اور عدالت میں اور اس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

عدل الٰہی

قرآن میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ثبوت عدل اور نفی ظلم پر طرح طرح زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کس واسطے مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس کے صفات سے عدل کو خارج کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں علم کلام کی اصطلاح میں عدلیہ مسلمانوں کا صرف ایک فرقہ رہ گیا ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن تمام امت اسلامیہ کو عدلیہ ہونا چاہئے۔

عدل چونکہ مقابل ”ظلم“ ہے اور ”ظلم“ ہر قسم کی بے راہ روی اور غیر مستحسن ہر کام پر حاوی ہے۔ اس لئے عدل ہر حیثیت سے اس کے افعال کے خیر اور مستحسن ہونے کا نام ہے۔ اس ترجمہ ”انصاف“ کے ساتھ کرنا[3] اس کے مفہوم کو محدود بنا دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ جو عدل کے قائل نہیں اور حسن و قبح عقلی کا تصور نہیں رکھتے وہ عدل و حکمت کی پوری قدروں کا اندازہ کہاں کر سکتے ہیں؟!

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝١١٦

”اور اس زمین کے رہنے والوں کی اکثریت کا اگر تم کہنا مانو تو تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی اور نہیں وہ باتیں کرتے مگر اٹکل پچو۔“

اکثریت معیار حق نہیں

---

[1] ۔یعنی بھم مؤمنی اھل الکتاب (مجمع البیان)

[2] ۔لا یجوز ان یکون علیٰ عمومہ لان کثیرا من اھل الکتاب بل اکثرھم جھال لا یعرفون (تبیان)

[3] ۔تمام است سخن پروردگار تو در راستی و انصاف (شاہ ولی اللہ) پوری ہوئی بات رب تیرے کی راستی میں اور انصاف میں (شاہ رفیع الدین)

اس میں صاف اس اصول کا اعلان ہے کہ اکثریت معیار حق نہیں ہے[1] بلکہ اکثریت تو زیادہ تر عوام کی ہوتی ہے جن کے خیالات کسی ٹھوس دلیل پر نہیں بلکہ توہمات اور بے بنیاد گمانوں پر مبنی ہوتے ہیں تو ان کی پیروی معیار حق کیوں کر ہوسکتی ہے؟

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

''یقیناً تمہارا پروردگار خوب جاننے والا ہے ان کا[2] جو اس کے راستے سے بھٹکتے ہیں اور وہ بہترین جاننے والا ہے ان کا جو سیدھے راستے پر برقرار رہتے ہیں۔''

اس لئے کہ دوسرے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کی خبر نہیں، اور حال سے واقف ہیں، مستقبل پر نظر نہیں۔[3]

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''تو کھاؤ تم اس سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو، اور تمہیں حق نہیں ہے کہ تم نہ کھاؤ اس سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے حالانکہ اس نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تمہارے لئے ان چیزوں کو جو اس نے تم پر حرام کی ہیں سوا اس کے جس کی تمہیں اضطراری طور پر مجبوری ہو اور یقیناً بہت سے لوگ اپنے بے بنیاد خیالات سے نادانستہ گمراہ کرتے ہیں، بلاشبہ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے انہیں جو ظلم و تعدی سے کام لیتے ہیں''۔

''جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو'' اس سے مراد ہے ذبیحہ یعنی جسے بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا گیا ہو۔[4]

اگر فقط پہلے والی آیت ہوتی کہ ''کھاؤ تم اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو'' تو ہم یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس سے مقصود میتہ کے کھانے کی ممانعت ہے یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اسے نہ کھاؤ، جیسا کہ بعض ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے[5] مگر اس کے بعد کی آیت نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ اجازت اس ممانعت کے مقابلہ میں جو میتہ کے بارے میں ہے، نہیں ہے بلکہ یہ اجازت کا اعلان ان چیزوں کے بالمقابل ہے جنہیں یہود اور مشرکین نے بلاوجہ حرام سمجھ رکھا تھا یا جسے اب کوئی بغیر کسی معیار شرعی کے کسی رسم و رواج کے ماتحت ممنوع الاکل قرار دے دے۔ ان کے بالمقابل یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ پابندیاں غلط ہیں، بس ایک پابندی ہے اور وہ یہ کہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کیا گیا ہو اگر ایسا ہے تو بلا توقف اس کا کھانا

[1] فی ھذا دلالۃ علیٰ انہ لا عبرۃ فی دین اللہ ومعرفۃ الحق بالقلۃ والکثرۃ (مجمع البیان)
[2] اعلم ای عالم (جلالین)
[3] لان غیرہ لا یعلم جمیع الاشیاء وما یعلم الا بعلمہ من جمیع جوھھا (تبیان)
[4] الذکر ھو قول بسم اللہ (مجمع البیان)
[5] جس ذبیحہ پر (وقت ذبح) خدا کا نام لیا گیا ہو، اسی کو کھاؤ (مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

درست ہے، اس سے پرہیز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وَذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَيُجۡزَوۡنَ بِمَا كَانُوۡا يَقۡتَرِفُوۡنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور گناہ کو چاہے علانیہ ہو اور چاہے خفیہ [1] (بہرصورت ترک کرو، بلاشبہ وہ جو گناہ کرتے ہیں) انہیں سزا ملے گی اس کی جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔''

وَلَا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا لَمۡ يُذۡكَرِ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ وَاِنَّهٗ لَفِسۡقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ لَيُوۡحُوۡنَ اِلٰٓى اَوۡلِيٰٓـئِهِمۡ لِيُجَادِلُوۡكُمۡ ۚ وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾

''اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اسے نہ کھاؤ اور یقیناً وہ بہت بڑا گناہ ہے اور بلاشبہ شیطان ہیں جو اپنے حوالی موالی کو القاء کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ۔''

پہلے تو اس پر تنبیہ تھی کہ بعض اقسام کے ذبیحہ سے جو غلط توہمات کی بنا پر پرہیز کرتے ہو، یہ غلط ہے بلکہ جس چیز کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا، اسے تمہیں حلال سمجھنا چاہیے اور اب اس دوسرے رخ پر تنبیہ ہے کہ مردار سے یعنی جسے بسم اللہ کہہ کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس سے پرہیز ضروری ہے، یہ حرام ہے اور اس کا کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ اگر ان کا کہنا مانو گے تو مشرک ہو جاؤ گے، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اس گناہ میں ان کی دعوت کو قبول کر لو گے اور ان کے کہنے سے اکل حرام پر آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر رفتہ رفتہ ان کے کہنے سے مبتلائے شرک بھی ہو جاؤ گے۔

اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ بلکہ اسی کو زیادہ قوت ہے کہ حکم الٰہی کے خلاف ان شیاطین کی اطاعت کرنا خود ایک قسم کا شرک ہے۔ [2]

اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ بنایا اور اس کے لئے ایک روشنی قرار دی جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، اس کی طرح ہے جس کی حالت تاریکیوں میں یہ ہے [3] کہ وہ ان سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح کافروں کی نظر میں آراستہ ہوئے ہیں وہ اعمال جو وہ کرتے ہیں۔

''مردہ تھا اور اسے زندہ بنایا'' اس سے مراد یہ ہے کہ کافر تھا، اسے ہم نے ایمان کی طرف ہدایت کی اور جہالت میں تھا ہم نے علم عطا

---

[1]۔ الاثم قيل الاهل وقيل كل معصية (جلالين) الاصح القول الاهل (كل اثم) لانه يعم الجحيم (مجمع البيان)

[2]۔ انكم اذا المشركون (تبيان) یعنی شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اس کا مطیع ہووے (موضح القرآن)

[3]۔ مانند کسی باشد کہ صفتش این است کہ در تاریکیہا است (شاہ ولی اللہ)

کیا۔[1] ''روشنی جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے''ایک مسلمان کا وہ طرز حیات ہے جو دین اسلامی کی تعلیمات کی بنا پر اس کی ہر نقل وحرکت سے نمودار ہوتا ہے جس سے دوسرے دیکھنے والوں کو اگر وہ آنکھوں سے کام لیں اپنے کردار کی پستی کا احساس ہوگا اور وہ اس طرز زندگی سے متاثر ہوکر صحیح راستے کی طرف آجائیں گے۔

''اس طرح آراستہ ہوئے''یعنی جیسے اہل ایمان کو ہدایت کا راستہ بھلا معلوم ہوا، وہ اس پر چل کھڑے ہوئے ویسے ہی کافروں کو اپنی جہالت سے ان کی بداعمالیاں بھلی معلوم ہوئیں[2] اور یہ اپنے اپنے حسن اختیار وسوء اختیار کا کرشمہ ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا فِىۡ كُلِّ قَرۡيَةٍ اَكٰبِرَ مُجۡرِمِيۡهَا لِيَمۡكُرُوۡا فِيۡهَا‌ ؕ وَمَا يَمۡكُرُوۡنَ اِلَّا بِاَنۡفُسِهِمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں کچھ بڑے بڑے مجرم قرار دیئے ہیں کہ وہ اس میں طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں اور وہ منصوبے نہیں بناتے مگر خود اپنی ہی تخریب کے لیکن انہیں شعور نہیں ہے''۔

وہ پیدا تو ان منصوبہ سازیوں کے لئے نہیں کئے گئے تھے مگر چونکہ نتیجتاً انہوں نے پیدا ہونے کے بعد یہی وطیرہ اختیار کیا، اس لئے ان کی پیدائش پر مرتب شدہ نتیجہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم نے یہ مجرم قرار دیئے ہیں کہ جو طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں۔[3]

وَاِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ‌ ؔ‌ۘ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ‌ ؕ سَيُصِيۡبُ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور جب ان کے پاس کوئی معجزہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جب تک ہمیں نہ ملیں ویسی ہی چیزیں جیسی اللہ کے پیغمبروں کو ملتی ہیں، اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کا منصب کہاں رکھے[4] ان مجرموں کو عنقریب ذلت ہوگی اللہ کے یہاں اور سخت سزا ان تخریبی کاروائیوں کی وجہ سے جو وہ کرتے رہتے تھے''۔

مطلب یہ ہے کہ وہ کفار کہتے تھے کہ اللہ ہم ہی کو رسول کیوں نہیں بناتا اور وہ سب چیزیں نہیں عطا کردیتا جو پیغمبروں کو ملی ہیں۔[5] اس کا جواب خالق نے یہ دیا ہے کہ پیغمبری ہر ایک کو تھوڑی ملتی ہے۔ وہ کچھ خاص اوصاف سے وابستہ ہے اور خدا ہی ان اوصاف کو جانتا ہے کہ وہ کس میں پائے جاتے ہیں۔

---

[1] کان میتا بالکفر فصار حیا بالاسلام (تبیان) تشبہ سبحانہ الکفر بالامراد ۃ والایمان بالحیوۃ (مجمع البیان)
[2] کما زین للمؤمنین الایمان (جلالین)
[3] لام العاقبۃ کما فی قولہ سبحانہ: لیکون لھم عدوا وحزنا (مجمع البیان)
[4] خدا داناتر است بمحل نہادن پیغمبری خود (شاہ ولی اللہ) اللہ خوب جانتا ہے کہ کس جگہ رکھے پیغمبری اپنی کو (شاہ رفیع الدین)
[5] من یعلم انہ یقوم باعباء الرسالۃ (تبیان)

رسالت بر بنائے بلندی اوصاف

اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبروں کی رفعت رسالت کے نتیجہ میں نہیں ہے چونکہ رسالت کا منصب خالق نے عطا کر دیا، اس لئے وہ بلند ہو گئے بلکہ رسالت ان کو رفعت اوصاف وکردار کی بنا پر ملتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ خالق کا علم محیط ہے اور وہ تجربہ اور مشاہدہ کا محتاج نہیں ہے، اس لئے عطائے منصب ان کو بحیثیت زمانہ مقدم ہے اور عالم خارج میں ان اوصاف کا ظہور موخر ہے جیسا کہ عیسٰی علیہ السلام کے لئے قرآن کی آیت ان کا یہ اعلان گہوارہ میں بتا رہی ہے کہ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ''مجھے اس نے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے: كُنْتُ نَبِيًّا وَ اٰدمُ بَيْنَ الْمَآءِ وَالطِّيْنِ ''میں اس وقت بھی نبی تھا، جب آدمؑ آب وگل کے درمیان تھا'' یعنی ابھی مفرد عناصر کی منزل تھی اور ترکیب جسمانی کے ساتھ پتلا بھی تیار نہ ہوا تھا۔ روح پھونکے جانے کا کیا ذکر ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

''تو جسے اللہ سیدھے راستے پر لگانا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگی کے ساتھ بالکل بند [۱] کر دیتا ہے جیسے کہ وہ آسمان میں اونچا ہو رہا ہے [۲] اس طرح اللہ نجاست کا حکم لگا دیتا ہے ان پر جو ایمان نہیں لاتے۔''

یہ اللہ کا چاہنا انسان کے کسی کردار ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لئے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ اس طرح نجاست کو پائے نام کر دیتا ہے ان کے جو ایمان نہیں لاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایمان نہ لانا اللہ کے عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا یہ عمل جو ہے، وہ ان کے عمداً ایمان سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ [۳]

لہٰذا اس کے بالمقابل جو ''شرح صدر'' (سینہ کو کشادہ کرنا) ہے وہ بھی انسان کے ارادۂ توجہ والتفات کا نتیجہ ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، انہیں ہم اپنے راستوں پر لگا دیتے ہیں۔''

اسی کو یہاں کہا گیا ہے کہ جسے وہ راستے پر لگانا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو کشادہ کرتا ہے۔ ''سینہ کشادہ کرنا'' حقائق کو اس کے ذہن نشین کرنا اور اسے مزید بصیرت عطا کرنا ہے۔ [۴]

---

[۱] ۔ فالحرج الذی لا مدخل فیه والضیق ما یکون له الدخل الضیق (علی بن ابراهیم)

[۲] ۔ گویا بالا می رود در آسمان (شاہ ولی اللہ)

[۳] ۔ عقوبة له علی ترك الایمان من غیر ان یکون سبحانه مافعاله من الایمان وسالبا ایاه القدرة علیه (مجمع البیان)

[۴] ۔ یعنی بفهماندش حقیقت اسلام و محاسن آن (شاہ ولی اللہ) بأن یثبته علیه ویقوی داعیه علی التمسك به وینهل عن قلبه وساوس الشیطان (مجمع)

اور جو اپنے اختیار سے اعراض و انحراف کرتا ہے، اللہ کی طرف سے بھی اس سے بے توجہی اختیار کر لی جاتی ہے اور اس کے ذہن کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے جس کے بعد وہ تعصب اور عناد کی بنا پر رہی سہی اپنے عقل و شعور کی طاقت سے بھی کام لینے کے لائق نہیں رہتا۔[۱]

''اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے'' یعنی اس پر حق کا قبول کرنا بہت ہی شاق و ناگوار ہوتا ہے۔[۲]

اس کی تشبیہ دی گئی ہے اس شخص سے جو بہت اونچائی پر چڑھے تو معلوم ہوتا ہے کہ سینہ میں دم گھٹا جا رہا ہے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسۡتَقِيۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّذَّكَّرُوۡنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَهُوَ وَلِيُّهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور یہ تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نشانیاں تفصیل سے پیش کر دی ہیں، ان لوگوں کے لئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور وہ ان کا سرپرست ہے[۳] ان اعمال کے صلہ میں جو وہ انجام دیتے تھے۔''

وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا ۚ يٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ قَدِ اسۡتَكۡثَرۡتُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ ۚ وَقَالَ اَوۡلِيٰٓؤُهُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ وَّبَلَغۡنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِىۡۤ اَجَّلۡتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثۡوٰٮكُمۡ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّىۡ بَعۡضَ الظّٰلِمِيۡنَ بَعۡضًۢا بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾

''اور جس دن وہ ان سب کو محشر میں اکٹھا کرے گا، اے گروہ جنات تم نے بہت آدمیوں پر قبضہ کیا[۴] اور ان کے حوالی موالی نے جو آدمیوں میں سے تھے کہا اے پروردگار! ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا اور عمر کو بسر کیا جو تو نے ہمارے لئے مقرر کی تھی۔ اس نے کہا کہ اب تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے جس میں تم سب ہمیشہ رہو گے، سوا اس کے جسے اللہ چاہے۔ یقیناً تمہارا پروردگار صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔ اور اس طرح ہم ظالموں کو آپس میں ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں[۵] ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔''

گروہ جنات سے مراد شیاطین ہیں[۶] جو انسانوں کو بہکاتے ہیں اور خالق کا کلام ان سے جس کا ذکر ہے یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی آواز

---

[۱] یعنی ھر چند کہ میخواھند حقیقت اسلام و محاسن آں بفھمند نمی توانند (شاولی اللہ)
[۲] معناہ انہ ثیقل علیہ ما یدعی الیہ من الایمان (تبیان)
[۳] او کارساز ایشاں است (شاہ ولی اللہ) اور وہ دوست ہے ان کا (رفیع الدین)
[۴] ای قد استکثر تم من اضللتموہ من الانس (تبیان) تابع خود بسیار گرفتید از مردمان (شاہ والی اللہ)
[۵] مسلط می کنیم بعض ستمگاراں را بر بعضی (شاہ ولی اللہ)
[۶] یعنی اے شیاطین (شاہ ولی اللہ)

خلق ہو جسے وہ سنیں اور یوں بھی کہ فرشتے ان سے تخاطب کریں اور فرشتوں کے تخاطب کو اللہ نے اپنا کلام کہا ہو۔ [1]

دوزخ میں ہمیشہ قیام کے اعلان کے ساتھ ”سوا اس کے جسے اللہ چاہے“ ان گنہگاروں کے لحاظ سے ہوسکتا ہے جن کا گناہ کفر کے درجہ تک نہ پہنچا ہو۔

یہ کہ ”ظالموں کو ہم آپس ہی میں ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں“ اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو پہلے لکھا گیا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی سرپرستی سے انہیں خارج کر دیتے ہیں ان کے اعمال کی سزا میں۔ [2]

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾

”اے گروہ جن و انسان! کیا تمہاری طرف پیغمبر تم ہی میں کے نہیں آئے جو تمہارے سامنے میری آیتیں بیان کرتے تھے اور تمہیں اس دن کے درپیش ہونے سے ڈراتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہم بے شک اپنے خلاف گواہ ہیں اور انہیں دنیوی زندگی نے فریب میں مبتلا کر دیا تھا اور اب انہوں نے اپنے خلاف گواہی دی ہے کہ بیشک وہ کافر تھے۔“

انسان اور جنات کو ایک قبیلہ قرار دے کر خطاب کیا گیا اس اعتبار سے کہ دونوں اس جوہر اختیار کے حامل ہیں جو تکالیف الٰہیہ کی ذمہ داری عائد ہونے کے لئے ضروری ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ”میں نے جنات اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

رُسُلٌ مِّنْكُمْ کے خطاب کو اس مخلوط قبیلہ یعنی جن و انس کے مجموعہ سے بھی متعلق کیا جا سکتا ہے [3] اس صورت میں یہ ضروری نہ ہوگا کہ جنات کے رسول از قسم جنات ہی ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ پیغمبر از قسم جنات بھی مانے جائیں۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی رسول جو افضل المرسلین ہے، وہ انسانوں میں سے ہو اور ان سب کا حاکم اور اس پورے سلسلہ کا خاتم ہو۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿١٣١﴾

”بات یہ ہے کہ تمہارا پروردگار یہ کرنے کا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم و ستم کی بنا پر [4] ختم کر دے اس عالم میں کہ اس

---

[1]۔ قال تعالیٰ لهم علىٰ لسان الملئكة (جلالين)

[2]۔ الغرض بذلك اعلامهم انه ليس لهم يوم القيمة ولی يدفع عنهم شيئا من العذاب (تبيان)

[3]۔ منكم ای من مجموعكم الصادق بالانس والجن (جلالين) لتغليب احدهما على الاخرىٰ كما يغلب المذكر على المؤنث وكما وصل يخرج منهما اللؤلؤ والمرجان بعد قوله : مرج البحرين يلتقيان وانما يخرج اللؤلؤ من الملح دون الغدب۔ وهٰذا قول اكثر المفسرين (تبيان) وهو الاقوىٰ (تبيان)

[4]۔ بظلم يكون منهم (مجمع البيان) بظلم منها (جلالين) بجزائے ظلم (شاہ ولی اللہ)

کے رہنے والے بے خبر ہوں۔"

"بے خبر" ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان تک احکام الٰہیہ کے پہنچانے کا خالق کی طرف سے انتظام ہی نہ ہوا ہو۔[1]
اس صورت میں یہ نہیں ہوسکتا کہ انہیں ان کی غلطیوں کی سزا دی جائے جو خلاف عدل ہوگا، ظلم قرار پائے گا، اور خدا ہر برائی سے پاک اور بری ہے۔

تکلیف بلا بیان قبیح ہے

یہ جماعت عدلیہ کا وہ اصول "عدل" ہے جو قرآن مجید کی بے شمار آیتوں کے ساتھ ساتھ اس آیت سے بھی ثابت ہے۔
اسی کو اصولِ فقہ میں ان الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں کہ "تکلیف بلا بیان قبیح ہے" جس پر اصول عملیہ میں سے "اصل براءۃ" کی بنیاد ہے۔
اور علم کلام میں اسی سے اس کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ خالق پیغمبر مقرر کرے جو خلق خدا کو صحیح راستہ بتا کر حجت تمام کرے جس کا ذکر اس کے قبل کی آیت میں ہے۔[2]

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اور ہر ایک کے لئے مرتبے ہیں اس اعتبار سے کہ جو انہوں نے اعمال کئے ہیں اور تمہارا پروردگار بے خبر نہیں اس سے کہ جو وہ کرتے تھے۔"

یاد رہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ مراتب اخرویہ کو اعمال سے وابستہ کیا ہے[3] جن کی صحت ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔
ایمان بلا عمل کا تصور قرآن کی روشنی میں ممکن ہی نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

"اور تمہارا پروردگار بے نیاز ہے، رحمت والا۔ اگر چاہے، تم لوگوں کو لے جائے[4] اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جسے چاہے دیدے جیسا کہ تم لوگوں کو اس نے پیدا کیا کچھ اور لوگوں کی نسل سے۔"

یعنی اس کا تمہیں خلق کرنا اور اس دنیا میں برقرار رکھنا صرف اس کی رحمت ہے، ورنہ اسے تمہاری ضرورت نہیں ہے اور نہ تمہاری

---

[1] ۔ غافلون لم یرسل الیھم رسول یبین لھم (جلالین)

[2] ۔ این ارسال رسل بسبب آنست یعنی قبل از بعثت رسل عقوبت نہ نمی آید(شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ ای مراتب فی عملہ علیٰ حسب ما یستحقہ فیجازی علیہ۔(مجمع البیان) فالاعظم من العقاب للاعظم من المعاصی والاعلم من للثواب الاعظم من الاطاعات (تبیان)

[4] ۔ اگر خواہد دور کند شمارا (شاہ ولی اللہ)

نافرمانیوں اور سرتابیوں سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔[1]

اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾

"یقیناً جو وعدہ وعید تم سے ہوتا ہے، وہ ضرور آنے والا ہے اور تم قدرت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔"

عربی زبان میں وعدؔ اچھی بات کے وعدہ کے لئے آتا ہے اور وعید کسی برے نتیجہ سے دھمکانے کے لئے آتا ہے۔ توعدون کا لفظ عربی قاعدہ کے لحاظ سے دونوں سے ہوسکتا ہے، وعد سے بھی اور وعید سے بھی۔

عموماً اس کا ترجمہ "وعدہ" کے لفظ سے کیا گیا ہے[2] لیکن بعض مفسرین نے اسے وعید سے ماخوذ لیا ہے[3] اور آخر کا فقرہ "وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ" جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے جس کو ہم نے ترجمہ میں اس طرح ادا کیا ہے کہ "تم قدرت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے"۔ یہ دوسرے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے یعنی جس عذاب آخرت اور پاداش اعمال سے تمہیں ڈرایا جاتا ہے، تم اسے روک نہیں سکتے اس لئے کہ تمہارے امکان میں یہ نہیں ہے کہ تم اللہ کی قدرت کا مقابلہ کر کے اسے عاجز و مجبور بنا سکو۔

ہم نے ایسا ترجمہ کیا ہے جو دونوں پر منطبق ہوسکتا ہے اور دوسرے مفسرین بھی ایسے ہیں جنہوں نے اس لفظ کو ثواب و عذاب دونوں پر حاوی قرار دیا ہے۔[4]

قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ تَکُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

"کہہ دیجئے کہ اے میری قوم والو! تم اپنی حد پر اپنے کام کئے جاؤ[5] میں اپنا کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ انجام میں اس عالم کی بہتری کس کے لئے ہے[6] جو ظالم ہیں وہ بلاشبہ دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے۔"

"اپنے کام کئے جاؤ"...... یہ کوئی حکم یا واقعی مطالبہ نہیں ہے بلکہ تہدید کا ایک طریقہ ہے کہ جو کرنا ہو کرلو۔ میرا اس سے کوئی نقصان نہیں ہے تمہیں بعد میں پتہ چلے گا کہ انجام کیا ہوتا ہے۔[7]

وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الۡحَرۡثِ وَالۡاَنۡعَامِ نَصِیۡبًا فَقَالُوۡا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعۡمِهِمۡ

---

[1]۔ الغنی عن خلقه وعبادتهم ولکنه تعالیٰ ابقاکم رحمة لکم۔ (جلالین) لا ینفعه طاعتهم ولا نصیره معصیتهم (مجمع البیان)

[2]۔ آنچه وعده کرده می شود شمارا (شاہ ولی اللہ) جو کچھ وعدہ دیئے جاتے ہو تم (شاہ رفیع الدین) جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (فرمان علی صاحب)

[3]۔ ان ماتوعدون من الساعة والعذاب (جلالین) ان الذی اوعد الخلق به من عقابه علیٰ معاصیه والکفر به واقع (تبیان)

[4]۔ من القیامة والحساب والجنة والنار والثواب والعقاب وتفاوت اهل الجنة فی الدرجات وتفاوت اهل النار فی الدرجات (مجمع البیان)

[5]۔ اعملوا علیٰ قدر منزلتکم او تمکنکم من الدنیا (تبیان) وقیل علیٰ طریقتکم وقیل علیٰ حالتکم (مجمع البیان)

[6]۔ ای العاقبة المحمودة فی الدار الاٰخرة (جلالین)

[7]۔ وان کان ضیعة ضیعة الامر فالمراد به التهدید (تبیان)

وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''اورانہوں نے ان چیزوں سے کہ جو اس نے پیدا کی ہیں،کھیت اور چوپائے،ایک حصہ اللہ کا رکھا ہے[۱] تو اپنے خیال ناقص کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا[۲] تو جو ان کے والے شریکوں کا ہے،وہ اللہ کی طرف نہیں جا سکتا اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جائے گا۔کیا برا ہے وہ حکم جو وہ لگاتے ہیں۔''

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:''کافر اپنی کھیتی میں سے اور مواشی کے بچوں میں سے اللہ کے نیاز کا نکالتے اور بتوں کے بھی نیاز کا۔ پھر اگر جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا،بتوں کی طرف بدل دیا اور بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے،اس سے زیادہ ڈرتے۔''(موضح القرآن) ان کی اس تفریق کی بنیاد یہ تھی کہ وہ کہتے تھے اللہ تو بے نیاز ہے اسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ہمارے یہ بت بیچارے ضرورت مند ہیں[۳] لہٰذا بعض صورتوں میں اللہ کا حصہ ان کی طرف چلا جائے تو کوئی حرج نہیں اگرچہ اللہ کی بے نیازی کا تصور بجائے خود ایک صحیح بات ہے مگر چونکہ ان کے اس رویہ سے اہمیت بتوں کی زیادہ نمایاں ہوتی ہے،اس لئے قرآن مجید نے ان کے اس عمل کو ان کی باطل پرستی کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

''اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کی جان لینے کو نظروں میں سجا دیا ہے کہ انہیں تباہ کریں اور تا کہ ان کے مذہب کو ان پر مشتبہ کریں[۴] اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لہٰذا چھوڑ یئے انہیں اور اسے کہ جو وہ جھوٹ باندھا کرتے ہیں۔''

''اسی طرح''یعنی جیسے انہوں نے قربانیوں میں بٹوارا کیا ہے کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ان کے شریکوں یعنی بتوں کا اور اسے ان بتوں نے یعنی ان کی محبت نے ان کی آنکھوں میں آراستہ و پیراستہ بنا کر پیش کیا ہے،ویسے ہی اولاد کی جان لینے کو ان کی نظروں میں سجا دیا ہے۔[۵]

اس جان لینے سے مراد بظاہر وہ دختر کشی کی رسم ہے جو عرب میں رائج تھی۔[۶]

اور ہوسکتا ہے کہ بتوں پر بچوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسم بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

---

[۱] ۔ ھٰھنا حذف یدل الکلام علیہ وھو: جعلوا للاوثان منہ نصیبا (مجمع البیان)

[۲] ۔ انما جعلوا الاوثان شرکائھم لانھم جعلوا لھا نصیبا من اموالھم (مجمع) برای شرکائی کہ ما مقرر کردہ ایم (شاہ ولی اللہ)

[۳] ۔ یقولون ان اللہ غنی والاصنام احوج (مجمع البیان)

[۴] ۔ تا مختلط کنند بر ایشان دین را (شاہ ولی اللہ) ملادیویں او پر ان کے دین ان کا (شاہ رفیع الدین)

[۵] ۔ کذٰلک کما زین لھم ماذکر (جلالین)

[۶] ۔ زینوا لھم قتل البنات (مجمع البیان)

اگر "شرکاء" سے بت مراد لئے جائیں جیسا کہ اس کے پہلے لکھا گیا ہے تو ان کی طرف اس فعل کے سجنے کی نسبت اسی معنی سے ہوگی کہ ان بتوں کی محبت انہیں اس پر آمادہ کرتی تھی اور یہ اس دوسرے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے ان دونوں باتوں کو سمو دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ان میں سے کسی کے یہاں جب لڑکی پیدا ہوتی تو لوگ اس کو ملامت کرتے تھے اور وہ ننگ و عار کے مارے اسے مار ڈالتا تھا یا زندہ درگور کر دیتا یا پجاریوں کے بہکانے سے بتوں کے آگے بھینٹ چڑھا دیتا اور اپنے خیال میں اسے بہت اچھا کام سمجھتا۔"

ایک احتمال یہ ہے کہ "شرکاء" سے شیاطین مراد ہوں، اس لئے کہ گمراہ افراد جب خدا کی اطاعت کے بجائے شیطان کا کہنا مانتے ہیں تو گویا وہ بھی ایک صنم ہے جس کی وہ عبادت کر رہے ہیں اور اس نے ایسی ایسی غلط کاریوں کو ان کی نظر میں سجا کر مستحسن قرار دے دیا ہے [1]

ایک تفسیر یہ ہے کہ شرکاء سے مراد ان کے وہ آباؤ اجداد ہیں جن کی وہ اندھا دھند پیروی کر رہے ہیں۔ [2]

"اور اگر وہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے" اس طرح کے جملے قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور ہر جگہ مطلب ایک ہی ہے کہ اگر خالق جبری طاقت کو اپنی بروئے کار لاتا [3] تو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر جبر کرنا اس کی حکمت کے تقاضا کے خلاف ہے۔

وَقَالُوۡا هٰذِهٖۤ اَنۡعَامٌ وَّحَرۡثٌ حِجۡرٌ ‌ۖ لَّا يَطۡعَمُهَاۤ اِلَّا مَنۡ نَّشَآءُ بِزَعۡمِهِمۡ وَاَنۡعَامٌ حُرِّمَتۡ ظُهُوۡرُهَا وَاَنۡعَامٌ لَّا يَذۡكُرُوۡنَ اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهَا افۡتِرَآءً عَلَيۡهِ‌ ؕ سَيَجۡزِيۡهِمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝١٣٨

"اور ان کا کہنا ہے اپنی خام خیالی سے کہ یہ چوپائے اور کھیت اچھوتے ہیں [4] کہ انہیں نہیں کھا سکتا مگر وہ جسے ہم چاہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پشت پر سواری کو ممنوع قرار دیا ہے [5] اور کچھ چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے اس پر غلط تہمت لگاتے ہوئے، وہ انہیں عنقریب اس کی جو وہ غلط تہمت لگاتے ہیں، سزا دے گا۔"

یہ سب ان بدعتوں کی فہرست ہے جو ان مشرکین نے ایجاد کر رکھی تھیں۔

یہ چوپائے اور کھیت "یعنی جنہیں انہوں نے اپنے بتوں پر چڑھا دیا ہے [6]

ان کے کھانے کے لئے انہوں نے دل بخواہ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں مثلاً وہ کھائیں گے جو بتوں کے خاص خدمت گزار ہیں۔ وہ بھی،

---

[1] یعنی الشیاطین الذین زینوا لهم قتل البنات (مجمع البیان)

[2] قال یعنی اسلافهم (علی بن ابراهیم)

[3] لوشآء ان یضطرهم الی ترکه (تبیان)

[4] حجر حرام (جلالین) یہ جانور ہیں اور کھیتی ہے اچھوتی (شاہ رفیع الدین)

[5] حرام کردہ شدہ است سواری بر پشت آنہا (شاہ ولی اللہ)

[6] الانعام والزرع الذین جعلوهما لآلهتهم واوثانهم (تبیان)

مرد، عورتیں نہیں۔[1]

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

''اوران کا کہنا ہے کہ جوان چوپایوں کے اندر ہے وہ ہمارے افراد ذکور سے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر مردار ہوتو وہ سب اس میں حصہ دار ہیں بہت جلد وہ انہیں ان کے اس حکم لگانے کی سزا دے گا۔ یقیناً وہ صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

اس کی تشریح شاہ صاحب کے لفظوں میں پڑھئے:

''ایک یہ مسئلہ بھی بنایا تھا کہ جانور ذبح کیا۔ اس کے پیٹ میں سے بچہ نکلا۔ اگر زندہ نکلا تو مرد کھائیں اور عورتیں نہ کھائیں اور مردہ نکلے تو سب کھاویں'' (موضح القرآن)

مشرکین کی تاریک ذہنیت اور افسوس ناک بدعت

ان کے اس مزعومہ کی ردکی جارہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوغذا حلال ہے، وہ سب کے لئے اور جوحرام ہے وہ بھی سب کے لئے۔ اس میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ تصوران ہی چوپایوں سے متعلق تھا جن کا کھانا وہ حرام سمجھتے تھے جیسے بحیرہ اور سائبہ۔[2]

''چوپایوں اندر'' کے معنی ایک روایت کے مطابق دودھ کے ہیں[3] اور دوسری روایت کے مطابق پیٹ کے بچے مراد ہیں۔ بعد کے جملہ سے کہ ''اگر مردار ہو'' اس دوسرے مفہوم کو تقویت پہنچتی ہے کیونکہ یہاں سب ہی کے نزدیک پیٹ کے بچے مراد ہیں۔[4]

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

''بلاشبہ گھاٹے میں ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کی جان لی نادانستہ حماقت سے اور حرام سمجھ لیا اسے جو اللہ نے انہیں عطا کیا تھا اللہ پر غلط باتیں منڈھ کر۔ بے شک وہ گمراہ ہوئے اور انہوں نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا''[5]

---

[1] لا یحلون ذٰلك الا لمن قام بخدمة اصنامهم من الرجال دون النسآء (مجمع البیان)
[2] هٰذه الانعام الحرّما وهی العائب والبحائر (جلالین)
[3] یعنی البان البحائر والسیب (مجمع البیان)
[4] معناوان کان حنین الانعام میتة (تبیان)
[5] قتلوا اولادهم بالوأد (جلالین)

اولاد کشی کی مذمّت

بچوں کی جان لینے سے مراد وہی ’’دختر کشی‘‘ کی رسم ہے جسے جاہل عربوں نے قائم کر رکھی تھی[۱] اور چونکہ اس کا محرک ان کے خیال میں ایک بڑا مستحسن جذبہ یعنی شرافت اور حفظِ ناموس کا خیال رکھا، اس لئے خالق نے ان کے اس فعل کو ’’شعوری‘‘ اور ’’ارادی‘‘ گناہ قرار نہیں دیا بلکہ اس کا سبب ’’حماقت‘‘ اور ’’بے علمی‘‘ کو قرار دیا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ ’’حرام سمجھ لیا اسے جو اللہ نے انہیں عطا کیا تھا‘‘...... یہ گزشتہ بات کا تتمہ بھی ہوسکتا ہے یعنی یہ اولاد اللہ نے عطا کی تھی اور یہ اس کی نعمت تھی مگر وہ اپنی جہالت سے اپنے کو اس سے محروم کر لیتے ہیں۔[۲]

اور بہت ممکن ہے کہ اس سے مراد وہی بحیرہ اور سائبہ ایسی غذائیں ہوں جنہیں انہوں نے حرام قرار دے لیا تھا[۳] جس کا تذکرہ اس کے قبل کی آیتوں میں تھا۔

میرے خیال میں اس ذکر کے بعد یہ فقرہ کہ اِفۡتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ ’’اللہ پر غلط بات منڈھ کر‘‘ یہ اسی دوسرے احتمال کو تقویت دیتا ہے۔ اس لئے لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا ان کے ایک ذاتی تصور پر مبنی تھا کہ وہ اسے لڑکیوں کی عصمت وعفت کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اسے مستقبل کی آبرو ریزی سے حفاظت کا سامان کہتے تھے۔ وہ ’’سَفَهًۢا بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‘‘ یعنی بے شعوری اور لاعلمی کا نتیجہ تو ہے مگر اِفۡتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ نہیں ہے کیونکہ وہ اسے کسی حکم الٰہی پر مبنی قرار نہیں دیتے تھے مگر ہاں جانوروں کو جو انہوں نے حرام کیا تھا تو اسے ایسا سمجھ رکھا تھا اور کہتے تھے کہ ان کا کھانا اللہ کی طرف سے ممنوع ہے۔ حالانکہ کسی کتاب سماوی میں اللہ کا کوئی حکم ایسا موجود نہ تھا تو یہ ان کا کہنا بلاشبہ اِفۡتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ کی حیثیت رکھتا تھا۔

وَهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّغَيۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّالنَّخۡلَ وَالزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ‌ؕ كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ‌ۖ وَلَا تُسۡرِفُوۡا‌ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۞ (۱۴۱)

’’اور وہ وہی ہے جس نے پیدا کئے گھنے باغ، وہ بھی جو ایسی بیلوں کے ہیں جو (بانسوں وغیرہ کی مدد سے، اونچی کی جاتی ہیں اور وہ بھی جو اونچی نہیں کی جاتیں[۴] اور کھجور کے درخت اور طرح طرح کی کھیتی اور زیتون اور انار، جو ملتے جلتے ہوئے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے ہیں[۵] جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھلوں میں سے کھاؤ اور اس کے

---

[۱]۔ حرّموا مارزقهم الله مما ذكر (جلالین)

[۲]۔ حرّموا مارزقهم الله مما ذكر (جلالین)

[۳]۔ یعنی الانعام والحرث الذين يزعمون انها حجر (مجمع البیان)

[۴]۔ مرفوعات بالدعائم وغيره معروشات ...یعنی ماخرج من قبل نفسه من انواع الاشجار (مجمع البیان) بوستانهای برداشته شده برپا یها دبوستانهائی غیر برداشته شده برپایها (شاہ ولی اللہ)

[۵]۔ متشابها در قهما وغيره متشابه مطعمها (جلالین)

کاٹنے کے وقت جو اس میں کا واجب الادا حق ہے وہ ادا کردو[1] اور حد سے آگے نہ بڑھو، یقیناً وہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا''۔

''واجب الادا حق'' سے مراد حق مساکین ہے جو زکوٰۃ کے وجوب سے پہلے کوئی تعین نہ رکھتا تھا اور اس فریضہ کے بطور قانون نافذ ہونے کے بعد اس کی مقدار مقرر ہوگئی ہے کہ وہ دسواں یا بیسواں حصہ ہے جس کی تفصیل کتب فقہیہ میں درج ہے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''حد سے آگے نہ بڑھو'' یہ حد سے بڑھنا حق مساکین کے نکالنے میں بھی ہوسکتا ہے کہ انسان سب لٹا دے اور گھر والوں کے لئے کچھ رکھے ہی نہ اور اپنے صرف میں لانے سے بھی متعلق ہوسکتا ہے کہ انسان فضول خرچیوں میں اڑا دے اور حقوق مساکین دے ہی نہیں اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے بھی متعلق ہوسکتا ہے کہ حقوق مالیہ کے وصول کرنے میں ان کے ساتھ سختی کرنے میں حد سے قدم آگے نہ بڑھاؤ۔[2]

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٤٢﴾

''اور چوپایوں میں سے بار برداری والے اور زمین پر بچھے ہوئے کھاؤ اس سے جو اللہ نے تمہیں روشی عطا کی ہے اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے''۔

یہ گزشتہ آیات ہی کے سلسلہ سے ہے یعنی اللہ نے ایسے ایسے باغ پیدا کئے تمہاری غذا کے لئے اور یہ جانور بھی پیدا کئے تمہارے فائدہ کے لئے۔

''زمین پر بچے ہوئے'' سے ایک مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ قابل ذبح ہیں کہ انہیں تم زمین پر لٹا کر ذبح کرتے ہو۔[3]

اور یہ بھی سمجھا گیا ہے کہ اس سے نیچے قد والے جانور مراد ہیں جیسے بکری، بھیڑ وغیرہ جو اپنے قد و قامت کی پستی کی وجہ سے زمین سے لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔[4]

اور یہ بھی مفہوم لیا گیا ہے کہ چوپایوں سے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی پشت بار برداری کے کام آتی ہے اور ان کے اون اور بالوں سے بچھانے والی چادریں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔[5]

آخر میں پھر مشرکین کی ان پابندیوں کے خلاف تنبیہ ہے جو انہوں نے ان جانوروں میں عائد کر رکھی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سب خدا

---

[1] بدھید زکوٰۃ اورا (شاہ ولی اللہ)۔

[2] الخطاب للجميع بان لايسرف رب المال فی الاعطآء والامام فی الاخذ واصرف ذٰلك الی غير مصارفه وهٰذا اعم قائدة (مجمع البيان)

[3] بر زمین غلطانند بجهت ذبح (شاہ ولی اللہ)۔

[4] زمین کو لگے ہوئے (شاہ رفیع الدین) كالابل الصغار والغنم سميت فرشا لانها كالفرش للارض لدنوها منها (جلالین)۔

[5] منهاما يتخذ من ادبارها واصوافها ما يفرش ويبسط عن ابی علی الجبائی (مجمع البيان)

نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے تو جو اللہ نے رزق تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے کھاؤ اور بلا وجہ اپنے اوپر پابندیاں عائد کر کے کفرانِ نعمت کے مرتکب نہ ہو کہ یہ بھی شیطان کی ایک کارستانی ہے جس سے وہ تمہارے لئے دنیا اور آخرت میں محرومی کا سامان کرتا ہے تو ان بلا وجہ کی پابندیوں کو اپنے لئے قبول کرنا شیطان کے قدم بقدم چلنا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو صوفیا کی بعض ریاضتوں میں جو ترکِ حیوانات وغیرہ کی تعلیم ہے، وہ اس قرآنی ارشاد کی رو سے مستحسن سمجھی نہیں جاسکتی۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

''آٹھ قسمیں: دو بھیڑ کی جنس سے اور دو بکری کی جنس سے۔ کہو کہ کیا اس نے دونوں قسم کے نروں کو حرام کیا یا دونوں قسم کی ماداؤں کو یا جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہو؟ مجھے کسی علم کی بنیاد پر بتاؤ اگر تم سچے ہو اور دو اونٹ کی جنس سے اور دو گائے بیل کی جنس سے۔ کہو کہ (ان میں) کیا اس نے دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں ماداؤں کو یا جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہو؟ کیا تم موجود تھے جب اللہ نے تمہیں یہ ہدایت کی تو کون ظالم ہوگا اس سے بڑھ کر کہ جو اللہ پر جھوٹی باتیں منڈھے تاکہ لوگوں کو بغیر کسی علم کے گمراہ کرے! بلا شبہ اللہ ظالم جماعت کے لئے منزل مقصود تک پہنچنے کا سامان نہیں کرتا''۔

یہ بھی اَنْشَاَ (پیدا کیا) کے تحت میں ہے جس کا سلسلہ قبل کی آیتوں سے چل رہا ہے [۱] اور یہ تمام رد و قدح انہی مشرکین کے مقابلہ میں ہے جنہوں نے ان جانوروں میں خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔

چونکہ جوڑے میں ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے، اس لئے بھیڑ بکری وغیرہ کی تمام اقسام کے جوڑوں کو ثمانیۃ ازواج کے لفظ سے تعبیر کیا جو افراد کے لحاظ سے آٹھ ہیں لیکن ہمارے محاورہ کے اعتبار سے جوڑوں کی تعداد چار ہوگی۔ [۲]

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ

---

[۱]۔ تقدیرہ: وانشا حمولۃ وفرشا ثمانیۃ ازواج (تبیان)

[۲]۔ معناہ ثمانیۃ افراد...وقیل معناہ ثمانیۃ اصناف (مجمع البیان)

دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

''کہیے کہ میں نہیں پاتا اس میں کہ جس کی میری طرف وحی اتاری گئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی شے جس کا کھانا حرام ہو، سوا اس کے کہ مردار ہو یا بہا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ وہ بہت گندی چیز ہے یا غلط ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کوئی نام لیا گیا ہو۔ اب جو اضطراری حالت میں مبتلا ہو اور نہ باغی ہو، نہ حد سے تجاوز کرنے والا تو یقیناً تمہارا پروردگار بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے''۔

چونکہ زیر بحث چرندہ جانوروں کے اقسام تھے، اس لئے اس نوع میں جو حرام چیزیں ہیں، ان کا ذکر ہوا ہے۔ اس لئے طیور یا دریا کے جانوروں میں جو چیزیں حرام ہیں یا چوپایوں میں جو درندہ قسم کے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ [1]

بہر حال اس صورت میں یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ان چیزوں کی حرمت قرآن سے نہیں، سنت سے ثابت ہے [2] جس کے بغیر تنہا قرآن ماخذ احکام شرعیہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

''خون'' کے ساتھ ''بہا ہوا'' کی قید اس حکم شرعی پر منطبق ہوتی ہے کہ خونِ متعارف بہنے کے بعد ذبیحہ میں جو خون اجزائے گوشت میں پیوست رہ جائے، وہ خون طاہر و حلال ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

''اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی، ان پر ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن دار جانور [3] اور گائے بیل اور بھیڑ میں سے حرام کر دیا ان پر چربی کو سوا اس کے کہ جو ان کی پشت پر ہو یا آنتوں میں یا جو ہڈی سے ملی ہوئی ہو۔ یہ انہیں سزا دی ہم نے ان کی بغاوت کی اور یقیناً ہم سچے ہیں''۔

جماعت یہود کے لئے یہ سخت قسم کے احکام منجانب اللہ تھے ان کی سابقہ بداعمالیوں کی سزا میں جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

---

[1] ۔ انما ھٰذہ الآیة رد علیٰ ما احلت العرب او حرمت (علی بن ابراھیم) مراد حصر اضافی است به نسبت بھیتمه الانعام ...سگ و شیر و باز وغیر آن اگرچه حرام است از بھیمة الانعام نیست (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ یلحق بما ذکر بالسنة کل ذی ناب من السباع و مخلب من الطیر (جلالین) قیل ان ما عداہ حرم فیما بعد بالمدینة والسورة مکیة (تبیان)

[3] ۔ ھو مالم یفرق بین اصابعه کالابل والنعام (جلالین) یعنی مثل شتر و شتر مرغ (شاہ ولی اللہ) یعنی اونٹ ان پر حرام تھا (موضح القرآن)

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ (سورۂ نساء)

اس بغی کی تشریح ہماری قدیم تفسیر میں یہ آئی ہے کہ رؤسائے یہود نے ان چیزوں کو ان کے مرغوب ہونے کی وجہ سے غریبوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا تو اللہ نے اس کی سزا یہ دی کہ ان پر بھی ان چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔[۱]

اب یہ کہنے ہی سے کہ یہ چیزیں یہود پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے بطور سزا حرام کی گئی تھیں ظاہر ہو جاتا ہے کہ اب شرع محمدی میں یہ چیزیں حلال ہیں کیونکہ ان میں ذاتاً کوئی خرابی نہیں ہے۔[۲]

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

"اب اگر یہ آپ کو جھٹلائیں گے تو کہہ دیجئے کہ تمہارا پروردگار بڑی وسیع رحمت والا ہے۔ہاں اس کا عذاب مجرموں کی جماعت سے ہٹایا نہیں جاسکتا"۔

ہمارے جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ تکذیب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرنے والوں کے لئے بس آخری ہی جملہ آنا چاہیے اور وہ بھی یوں کہ اس کا عذاب ان کم بختوں سے ہٹایا نہیں جاسکتا مگر یہ قرآن کی رواداری نہیں تو کیا ہے کہ اتنے سخت مجرموں کے تذکرہ کے بعد بھی خالق کی وسعت رحمت کو یاد دلایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تکذیب کرنے والوں کے لئے بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام رحمت سے مایوس کرنا نہیں ہے۔جب بھی ان کے ضمیر میں عرفان حق کی تڑپ پیدا ہو جائے اور وہ تکذیب کے راستے سے ہٹ جائیں تو اللہ کی رحمت ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے موجود ہے۔ ہاں (اگر آخر دم تک اپنی مجرمانہ روش پر قائم رہیں تو ان کے لئے آخر والا جملہ ہے جس کو ضمیر عائد کر کے براہ راست ان سے متعلق کرنے کے بجائے ایک عام اصول کے طور پر ارشاد ہوا کہ "اس کا عذاب مجرموں سے ہٹایا نہیں جاسکتا یعنی جو آخر دم تک مجرمانہ روش پر قائم رہیں، ان کے لئے عذاب کے سوا دوسرا انجام کیا ہوسکتا ہے؟!

ہم ان دونوں فقروں کا باہمی تعلق ایسا ہی محسوس کرتے ہیں لیکن دوسرے مفسرین میں کوئی یہ مطلب کہتا ہے کہ اس کی رحمت کے عام ہونے کے باوجود اس کا عذاب مجرموں سے نہیں ہٹ سکتا[۳] اور کوئی یہ کہتا ہے کہ اب تک تم عذاب سے اس کی وسعت رحمت کی وجہ سے بچے رہے مگر یہ نہ سمجھو کہ تم اس کے عذاب سے تا آخر بچے ہی رہو گے۔[۴]

---

[۱]۔كان ملوك بنى اسرائيل يمنعون فقراءهم من اكل لحم الطير والشحوم فحرم الله ذٰلك عليهم ببغيهم علىٰ فقرائهم (على بن ابراهيم)

[۲]۔هٰذه الاشيآء وان كان الله تعالىٰ حرمها على اليهود فى شرع موسىٰ عليه السلام فقد نسخ تحريمها علىٰ لسان محمد صلى الله عليه واٰله وابا حها (تبيان)

[۳]۔معناه ان احدا لايتمكن من رد عقاب الله عن العصاة المستحقين العقاب مع انه تعالىٰ ذو رحمة واسعة (تبيان)

[۴]۔یعنی رحمت کی سمائی سے اب تک تم بچے ہو لیکن نہ جانو کہ عذاب پھر گیا (موضح القرآن)

ہماری نظر میں الفاظ قرآن میں دونوں فقروں کے ورود کا انداز ان دونوں مفہوموں سے اجنبیت رکھتا ہے۔

سَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَىۡءٍ‌ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ حَتّٰى ذَاقُوۡا بَاۡسَنَا‌ ؕ قُلۡ هَلۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡهُ لَنَا‌ ؕ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ‏ ﴿۱۴۸﴾ قُلۡ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبَالِغَةُ‌ ۚ فَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰٮكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ‏ ﴿۱۴۹﴾

”نزدیک ہے وہ وقت کہ مشرک لوگ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم مشرک نہ ہوتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز اپنی طرف سے حرام کرتے۔ ایسا ہی جھٹلایا انہوں نے جو ان کے پہلے تھے، یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ کہیے کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تم ہمارے لئے اسے نکالو۔ تم تو نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی اور نہیں کرتے مگر اٹکل پچو باتیں۔ کہہ دیجئے کہ یہ تو اللہ کی زبردست دلیل ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ زبردستی، چاہتا تو سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا“۔

یہ انسان کی وہ کمزوری ہے یا دھاندلی جو اکثر ست اعمال یا بد اعمال افراد کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم ایسا کیوں کرتے۔ مشرکین اسے مسلمانوں کے سامنے بطور حجت پیش کرتے تھے کہ ہماری یہ سب باتیں اللہ کو ناپسند ہوتیں تو وہ قادر مطلق ہے۔ وہ ہم کو اس سب سے روک نہ دیتا!

مشرکین کے بدعات اور ان کی مذمت

حقیقت امر یہ ہے کہ اس میں مغالطہ ہے۔ ایک چیز رضا اور پسندیدگی ہے اور ایک یہ کہ اپنے نظام حکمت کی بنا پر وہ جبر سے کام لینا نہیں چاہتا، اس لئے جو انسان کرے، اسے کرنے دیتا ہے۔

مشرکین مشیت کے وہ معنی لیتے تھے کہ اللہ اسے پسند کرتا ہے۔ قرآن نے اس کی ردکی اور کہا کہ اگر وہ پسند کرتا تو پھر اس پر سزا کیوں دیتا؟! اور پھر پسند کے ثبوت کے لئے تو اس کی طرف سے کوئی دلیل ہونا چاہیے۔

پہلی بات کو اس آیت میں ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ”تمہارے ہی ایسے افعال قبل والوں نے کئے تھے اور اس پر انہیں ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا“ یہ عذاب کا ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ اسے پسند نہیں ہیں۔

شاہ عبد القادر صاحب نے اسے اس طرح لکھا ہے کہ:

”کافروں کا شبہ ہے کہ اگر ہمارے کام اللہ کو پسند نہ ہوتے تو ہم کو کرنے نہ دیتا۔ اس کا جواب فرمایا کہ اگلوں کو گناہ پر کیوں پکڑا؟ معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک مدت ناپسند کام کرتے تھے، اللہ نہ پکڑتا تھا، آخر پکڑا“۔ (موضح القرآن)

پھر دوسری بات کہی ان الفاظ میں کہ:

’’یا تمہارے پاس کوئی علم ہے کہ ہمارے لئے اسے نکالو‘ یعنی خدا کی جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں، ان میں کہیں بتاؤ کہ تمہارے افعال کی کوئی سند ہے؟!‘‘ [۱]

جب عذاب آنے سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ ان افعال کو پسند نہیں کرتا تو اسی کو پھر انسانوں کے فاعل مختار ہونے کے ثبوت میں پیش کر دیا گیا کہ اگر نظام جبر کارفرما ہوتا تو خالق کی ناپسند باتوں کا وقوع ہی عالم میں نہ ہوتا۔ یہ کفر و شرک اور معصیت کا وقوع خارج میں جو بالمشاہدہ ہے، یہ خود اس کا ثبوت ہے کہ خالق کی جانب سے بندے اپنے افعال میں مجبور نہیں ہیں بلکہ مختار خلق کئے گئے ہیں اور اسی لئے وہ اپنے اختیار سے کبھی اس کا پسندیدہ راستہ اختیار کرتے ہیں تو جزا پاتے ہیں اور کبھی اس کا ناپسند راستہ تو سزا پاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ سواد اعظم کے علماء چاہے زبان سے جبر کا اقرار نہ کریں مگر اختیار کا تصور ان کے دل و دماغ میں جاگزیں نہیں ہے، اس لئے ایسے مقامات پر ان کے بیانات میں عجیب ژولیدگی پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ اس ٹکڑے کی تشریح شاہ عبدالقادر صاحب نے عجیب فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

’’یہ تمہاری غلطی ثابت ہوچکی کہ دلیل نہیں رکھتے تو یہی تو علامت ہے کہ تمہاری قسمت میں ہدایت نہیں ہے‘‘۔ (موضح القرآن)

ارے لیجئے! یہی تو مشرکین بھی کہہ رہے تھے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہماری قسمت میں یہی تھا کہ ہم شرک کریں اور یہ غلط مسائل ایجاد کریں۔ اب ہر پھر کے آخر میں وہی بات صحیح نکلی تو ان کی دلیل پوری ہوئی یا اللہ سبحانہ کی؟ یہ تو کوئی ان کی رد نہ ہوئی بلکہ تائید ہوگئی **نعوذ باللہ من ذٰلك**۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

’’کہہ دیجئے کہ لاؤ [۲] اپنے ان گواہوں کو جو گواہی دیتے ہوں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے، اب اگر وہ گواہی دیں تو آپ ان سے پھر بھی متفق نہ ہوں [۳] اور پیروی نہ کیجئے ان لوگوں کے خیالات کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے پروردگار کا (دوسروں کو) برابر دار سمجھتے ہیں‘‘۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ

---

[۱]۔ یعنی نقلی از کتب الٰھی (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ ھلم لفظ یتعدی تارۃ و اخرٰی لا یتعدی فاذا کانت بمعنی ھاتوا فانھا تتعدی ... و اذا کانت بمعنی تعالیٰ ابنحو ھلم الینا فانھا لا تتعدی (تبیان)

[۳]۔ یا محمد اگر بفرض گواھی دھند ایشان تو معترف مشو با ایشان (شاہ ولی اللہ)

اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

''کہیے کہ آؤ! میں سناؤں [1] جو کچھ تمہارے پروردگار نے تم پر پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کا کسی چیز کو شریک قرار نہ دو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اپنے بچوں کی فقر و فاقہ کے مارے [2] جان نہ لو؛ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی (دیں گے) اور جنسی غلط کاریوں کے پاس نہ جاؤ، چاہے وہ نمایاں ہوں اور چاہے پوشیدہ [3] اور جس جان کی اللہ نے حرمت قرار دی ہے، اسے مارو نہیں مگر حق کے ساتھ۔ یہ وہ ہے جس کی اللہ نے تمہیں ہدایت کی ہے۔ شاید کہ تم عقل و شعور سے کام لو''۔

اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے

''حق'' سے مراد سزائے شرعی ہے جیسے قصاص یا سنگسار کیا جانا۔

محرمات کی فہرست گنوانے میں جو ان کے مقابل حکم ہے، اسے پیش کیا گیا ہے یعنی شرک حرام ہے، اسے یوں کہا گیا کہ اس کا کسی چیز کو شریک قرار نہ دو۔ ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی حرام ہے، اسے یوں کہا کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اسی طرح آخر تک۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

''اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو مگر ایسی صورت سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کی منزل تک پہنچے اور ناپ تول پوری کرو انصاف کے ساتھ۔ ہم کسی پر پابندی نہیں لگاتے مگر اس کی طاقت بھر اور جب بات کہو تو انصاف کرو، چاہے وہ عزیز کیوں نہ ہو [4] اور اللہ کے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ یہ وہ ہے جس کی اس کی طرف سے تمہیں ہدایت ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو''۔

یتیم کے کمال کی منزل تک پہنچنے سے مراد بالغ و راشد ہونا ہے [5]

ناپ تول کے پورا کرنے کے حکم سے متصل یہ جو کہا گیا ہے کہ ''ہم کسی پر پابندی نہیں لگاتے مگر اس کی طاقت بھر'' اس کا مطلب یہ معلوم

---

[1] ۔ بخوانم (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ ڈر افلاس کے سے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ ای علانیتها وسرها (جلالین) قال ابو جعفر علیہ السلام ما ظهر هو الزنا وما بطن هو الخالة (تبیان)

[4] ۔ اگرچہ آن محکوم علیہ صاحب قرابت باشد (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ قال قوم انه لا حد له وانما المراد به حتیٰ یکمل عقله ولا یکون سفیها یحجر علیه (تبیان) وهٰذا قویٰ وجوه (مجمع البیان)

ہوتا ہے کہ نادانستہ اگر کچھ کمی ہو جائے تو اس کی معافی ہے مگر جان کر ایسا نہ کرو۔[1]

جیسا کہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

''اسی وجہ سے شریعت نے یہ بتا دیا کہ خریدار یہ قصد کرے کہ میں دام زیادہ دوں اور چیز کم لوں، اور بیچنے والا یہ قصد کرے کہ میں دام کم لوں، چیز زیادہ دوں کیونکہ فریقین جب یہ قصد کریں گے تو ہرگز کسی کو کم نہ پڑے گا مگر اب تو وہ زمانہ ہے کہ اس کا الٹا ہوتا ہے''۔ (حاشیہ ترجمہ قرآن)

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

''اور یہ کہ یہ میرا خاص راستہ ہے، اس کے ساتھ وہ سیدھا بھی ہے[2] تو اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے تتر بتر کر کے ہٹا دیں[3] یہ ہے جو اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے، شاید کہ تم ان خطرات سے بچو۔''

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

''پھر یہ کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی نعمت تمام کرنے کا ذریعہ اس پر جو نیک کردار ہو[4] اور تفصیل ہر چیز کی اور صحیح رہنمائی اور رحمت بنا کر، شاید کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری پر ایمان لائیں''۔

''پھر'' کا لفظ ہمیشہ ترتیب واقعہ ہی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ترتیب ذکری کے لئے ہوتا ہے یعنی یہ تو سن چکے۔اب یہ سنو۔ اگر یہ آیت شان نزول میں اسی محل پر اتری ہوئی ہو تو یہاں پر لفظ ''پھر'' کے یہی معنی ہیں۔ اس کی نظیر نہج البلاغہ کے پہلے ہی خطبہ میں ہے جہاں خلقت زمین وغیرہ کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے: ثُمَّ اَنْشَاَ. سُبْحَانَهٗ. فَتْقَ الْاَجْوَاءِ, وَشَقَّ الْاَرْجَاءِ, وَسَكَاءَ كَالْهَوَاءِ۔ حالانکہ یہ چیزیں خلقت میں اس کے قبل والی چیزوں پر مقدم ہیں مگر بیان بعد میں ہو رہی ہیں۔اس لئے ثم کا لفظ لایا گیا ہے۔

کچھ اہم محرّمات شرع کی فہرست

شاہ ولی اللہ صاحب نے حالانکہ ترجمہ ایسا کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثم ترتیب ذکری کے لئے ہے[5] مگر حاشیہ میں اسے

---

[1] لما كان التعديل في الوزن والكيل على التحديد ...يتعذر بين سبحانه انه لا يلزم في ذٰلك الا الاجتهاد في التحوز من النقصان (مجمع)

[2] نصب مستقيما على الحال والقائدة ان هٰذا صراطي وهو مستقيم فاجتمع له الله ان ولو رفع مستقيم ان افاده ذٰلك (تبيان)

[3] متفرق کریں گی تم کو راہ اس کی سے (شاہ رفیع الدین) جدا کنندہ شمارا از راہ خدا (شاہ ولی اللہ)

[4] تماما للغة (جلالین) پورا کرنا نعمت کا اوپر اس شخص کے کہ نیکی کرتا ہو (شاہ رفیع الدین)

[5] باز می گویم کہ (شاہ ولی اللہ)

''ترتیب واقعہ'' کے معنی میں قرار دینے کی کوشش کی ہے،اس طرح کہ قبل کی آیات میں جو آیا تھا:قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ الخ ''آؤ!میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حرام کیا ہے'' یہ حرام کرنا روز ازل کا واقعہ ہے یعنی اللہ نے ہمیشہ سے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔اور''پھر''یعنی اس کے بعد اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا کی۔[1]

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے اس بارے میں ان کی پیروی کی ہے[2]۔

مگر معلوم نہیں کہ جب جناب مترجم کے نزدیک یہ معنی ظاہر ہیں تو انہوں نے ترجمہ اس طرح کیوں کیا؟ ہمارے نزدیک یا تو یہ آیت سلسلۂ نزول میں اس مقام کی ہے ہی نہیں،پھر اس کا ربط سابق آیتوں سے قائم کرنا ضروری ہی نہیں۔اگر وہ کسی اور محل پر نازل ہوئی ہے تو ممکن ہے وہاں وہ ترتیب واقعہ ہی کے عنوان سے ہو لیکن اگر یہ آیت یہیں پر نازل ہوئی ہے تو پھر اسے ترتیب ذکری کیلئے قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔[3]

علامہ طبرسیؒ نے اس کے مفہوم میں چار احتمالوں کا ذکر کیا ہے۔تین ترتیب ذکری پر مبنی ہیں اور ایک میں آیت کو اسی مقام پر نازل شدہ مان کر ترتیب واقعہ قرار دی گئی ہے،اس طرح کہ اس کے پہلے جناب ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں جو آیا تھا: وهبنا له اسحٰق ويعقوب''ہم نے انہیں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام عطا کئے''اس پر عطف کر کے کہا گیا ہے کہ''پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی''۔

''ہر چیز کا بیان''اس میں عموم وشمولیت تناسب موضوع کے لحاظ سے ہے یعنی جن چیزوں کا دین وشریعت سے تعلق ہے اور جس جس چیز کی ضرورت تھی،اس میں ہر شے کا بیان آ گیا تھا[4] اس کو غیر متعلق اشیاء یعنی دنیا کی ہر چیز سے متعلق سمجھنا ذوق سلیم کا تقاضا نہیں ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ
اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾
اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ
سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''اور یہ ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے۔اب اس کی پیروی کرو اور نجات کا سامان کرو کہ رحمت

---

[1] مترجم گوید ظاہر نزدیک این بندہ آنست کہ حرام گردانیدیم اشیاء مذکورہ را در ازل و بر قوم نوح دادیم موسیٰ را کتاب واللہ اعلم (شاہ ولی اللہ)

[2] اس سے معلوم ہوا کہ پہلے حکم ہمیشہ سے جاری رہے،پیچھے توریت اتری تو مشرح اور مفصل ہوئی (موضح القرآن)

[3] ثم لترتيب الاخبار (جلالين)

[4] بيان لكل شيء يحتاج اليه في الدين (جلالين)

تمہارے شامل حال ہو [1] لیکن تم ایسا نہ کہو [2] کہ کتاب بس ہمارے پہلے کی دو امتوں پر نازل ہوئی، اگرچہ ہم ان کی تعلیم سے [3] (بھی) انجان ہی رہے) تھے یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راہ راست پر ہوتے تو اب آ گئی تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیل تمہارے پروردگار کی طرف کی [4] اور ہدایت اور رحمت۔ اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو آیات الٰہی کو جھٹلائے اور ان سے روگردانی کرے۔ ہم عنقریب انہیں کہ جو روگردانی کرتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب کی سزا دیں گے اس پاداش میں کہ وہ روگردانی کرتے تھے"۔

پہلے کی دو امتیں یعنی یہود و نصاریٰ جو توریت اور انجیل کی طرف نسبت رکھتے ہوئے اہل کتاب کہے جاتے ہیں۔ [5]

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

"کیا انہیں سوا اس کے کچھ اور انتظار ہے کہ فرشتے خود ان کے پاس آئیں یا تمہارا پروردگار بذات خود آ جائے یا تمہارے پروردگار کی بعض مخصوص نشانیاں [6] آ جائیں، جس دن وہ مخصوص نشانیاں آ جائیں گی، اس دن کسی کو جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں کچھ بھلائی کے کام نہ کئے ہوں [7] ایمان لانا فائدہ نہ دے گا۔ کہیے کہ انتظار کرو، بلاشبہ ہم بھی منتظر ہیں"۔

"کیا انہیں سوا اس کے کچھ اور انتظار ہے" یہ استفہام انکاری ہے یعنی سوا اس کے کچھ اور انتظار نہیں ہے [8] بس اس کا انتظار ہے۔

مطلب اس کا شاہ عبدالقادر صاحب کے لفظوں میں یہ ہے کہ:

"اللہ کی طرف سے جو حد تھی ہدایت کی، سو آ چکی ہے اور شرع اور کتاب تب بھی نہیں مانتے تو اب منتظر ہیں کہ اللہ آپ آوے یا قیامت کے نشان دیکھیں، تب یقین کریں جب قیامت کا نشان آوے گا یعنی آفتاب مغرب سے نکلے، تب کافر کا ایمان اور عاصی کی توبہ قبول نہ

---

[1]۔ ای لکی ترحموا (مجمع البیان)

[2]۔ کراھة تقولوا (مجمع)

[3]۔ قراءتھم (جلالین) بودیم ما از تلاوت ایشاں بے خبر (شاہ ولی اللہ)

[4]۔ ای حجة واضحة ودلالة ظاھرة (مجمع البیان)

[5]۔ الیھود والنصارٰی (تبیان)

[6]۔ التی قضطوّھم الی المعرفة ویزول التکلیف عندھا (مجمع البیان)

[7]۔ یا نفع ندھد نفس را کہ کسب نہ کردہ بود وا ایمان خود عمل خیر (شاہ ولی اللہ)

[8]۔ ما ینتظر المکتابون (جلالین)

ہوگی''۔(موضح القرآن)

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

''یقیناً وہ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور بہت سے گروہوں میں بٹ گئے [1] آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے، ان کا معاملہ بس اللہ کے سپرد ہے، پھر وہ انہیں بتلائے گا کہ وہ کیا کرتے رہتے تھے''۔

''آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے'' اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ان کے باہمی اختلافات میں کوئی دخل نہ دیجئے [2] اور یہ بھی کہ اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ سے اس کا کوئی محاسبہ نہ ہوگا [3] اور یہ بھی کہ آپ کا ان میں سے کسی گروہ سے بھی تعلق نہیں ہے [4] ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بھی معنی کے لحاظ سے وہ کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو قائم و برقرار سمجھا جا سکے لیکن بعض مفسرین کے ذوق جہاد کی شدت پر یہ حکم بار ہوا ہے تو انہوں نے لکھ دیا کہ یہ حکم آیت ''سیف'' سے منسوخ ہوگیا [5] ایسے ہی شارحین ومفسرین قرآن وہ ہیں جو مخالفین اسلام کے اس الزام کو تقویت دیتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلایا گیا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

''جو نیک کام کرے اسے دس گنا اجر ملے گا اور جو برا کام کرے تو اسے بس اتنی ہی سزا ملے گی، اور ان پر ظلم نہیں ہو گا''۔ بھلائی کے بدلے میں زیادہ بھلائی احسان ہے اور تفضّل وکرم۔ یہ خلافِ عدالت نہیں ہے [6] لیکن برائی کے بدلے میں زیادہ پاداش خلاف عدل ہے، جو شان الٰہی کے خلاف ہے۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾

''کہیے کہ بلاشبہ مجھے میرے پروردگار نے ایک بڑے سیدھے راستے کی طرف (خاص طور سے) رہنمائی کی ہے،

---

[1]۔ گروہ در گروہ شدند (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ فلا تعرض لهم (جلالین)

[3]۔ یعنی از تو مواخذہ نہ خواهند کرد

[4]۔ انه على المباعدة التامة من ان یجتمع معهم فی معنى مناطیم الفاسدة (تبیان)

[5]۔ هذا منسوخ بأیه السیف

[6]۔ زیادة الثواب على الجزاء تفضل و احسان فجاز ان زید علیه (تبیان)

اس صحیح ودرست [1] دین کی طرف جو خالص ومخلص ابراہیم کا مسلک ہے [2] اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے''۔

فرقہ بندی کی مذمت

ان آیات سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ خداوند قدوس کا دین فرقہ بندی سے پاک وصاف ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾

''کہیے کہ میری نماز اور میری سب عبادتیں [3] اور میری زندگی اور میری موت خاص اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی پر میں مامور ہوں [4] اور میں سر اطاعت جھکانے والوں میں سب سے پہلا ہوں''۔ [5]

''سب سے پہلا'' باعتبار تقدم زمانی لیا جائے تو اول مخلوق ہونے کے ساتھ بالکل سازگار ہے جیسا کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ سے مستفاد ہے۔ پھر معلوم نہیں سواد اعظم کے بعض مفسرین نے اس میں قید لگانے کی کیا ضرورت محسوس کی ہے کہ اس امت میں پہلا سر اطاعت جھکانے والا ہوں۔ [6]

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اول المسلمین کے معنی ہوں، اول درجہ کا سر اطاعت جھکانے والا جس کی نظیر قرآن میں پہلے آ چکی ہے، تب بھی کوئی قید لگانا اس میں بلا وجہ ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

''کہیے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی پروردگار تلاش کروں حالانکہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔ کوئی شخص بھی برائی نہیں کرتا مگر

---

[1] ۔استغنی بجری ذکر الفعل عن ذکرہ فقال دینا قیما کما قال: اھدنا الصراط المستقیم فیما مستقیما (جلالین)
[2] ۔مراد میدارمرا زیں درست کیش ابراھیم را (شاہ ولی اللہ)
[3] ۔عبادتی من حج وغیرہ (جلالین)
[4] ۔بایں توحید فرمودہ شدمرا (شاہ ولی اللہ)
[5] ۔من نختین مسلمانم (شاہ ولی اللہ)
[6] ۔اول المسلمین من ھذہ الامۃ (جلالین)

یہ کہ وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے اور کوئی دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ پھر تم سب کا رجوع اللہ کی طرف ہوتا ہے تو وہ تمہیں بتائے گا وہ سب جس میں تم آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔''

کا فرو گناہ گار کا وجود انسان کے فاعل مختار ہونے کا ثبوت ہے

پہلے خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے معبود بنانے کی رکاکت کا اپنی جگہ یوں اظہار کیا گیا کہ یہ فطرت کائنات کے خلاف ہے۔ تمام کائنات تو صرف اس ایک اللہ کی اطاعت کر رہی ہو اور انسان اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود مانے یہ قانونِ فطرت کے خلاف کتنی بڑی بدعت ہے؟! اب اس کے خلاف شرک کی چونکہ صرف ایک دلیل تھی اور وہ آباؤ اجداد کی پیروی جسے بار بار پیش کیا کرتے تھے کہ: اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ﴿۲۳﴾ (زخرف) تو اس کی رد کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہر ایک خود اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔

اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے

اگر آباؤ اجداد غلط راستہ اختیار کئے ہوئے تھے تو وہ اس کا بھگتان بھگتیں گے۔ تم کیوں اس راستے پر چلو۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ پہلے اپنے لئے کہا گیا ہے کہ میں کیا اللہ کے سوا کسی کو معبود بناؤں؟ تو پھر روئے خطاب مقابل جماعت کی طرف کر کے اشارتاً کہا گیا ہے کیا رہ گئے تم، تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اس کی جواب دہی مجھ پر نہیں ہے۔ [1]

مگر ہمارے نزدیک تو آغازِ آیت میں ''میں'' سے مراد ''تم'' ہے [2] تو اب دوسروں سے مراد جو اپنے عمل کے ذمہ دار ہیں، آباؤ اجداد ہی کا قرار دیا جانا زیادہ درست ہے۔

وَهُوَ الَّذِيۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَرَفَعَ بَعۡضَكُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِيۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴿۱۶۵﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں پہلوں کی جگہ لینے والا بنایا اور تم میں سے بعض کو دوسروں پر درجوں کے اعتبار سے بلندی عطا کی تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں عطا کیا ہے، اس کے بارے میں تمہاری آزمائش کرے۔ یقیناً تمہارا پروردگار تیزی سے حساب لینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض وغایت

بعض مفسرین نے خواہ مخواہ یہاں ''خلائف'' کو اس خلیفہ کی جمع لے لیا ہے جس کے معنی حکمراں کے ہوتے ہیں [3] حالانکہ اس صورت

---

[1] وجه اتصاله بما قبله انه لا ينفعتي في ابتغاء رب غيره ما انتم عليه من ذٰلك لانه ليس يعذرني في اكتساب الاتم اكتساب غيري له (مجمع البيان)

[2] يقول علىٰ وجه الانكار لفعلهم (تبيان)

[3] ساخت شمارا بادشاهان زمين (شاہ ولی اللہ) کیا تم کو جانشین زمین کا (شاہ رفیع الدین)

میں "منکم" کا لفظ آتا جس سے پتہ چلتا کہ ان کے اندر کچھ لوگوں کو سلطنت عطا ہوئی حالانکہ وہاں تمام نوع یا تمام امت سے کہا جا رہا ہے لیکن اہل سنت میں بعض مفسرین نے وہی معنی کہے ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کئے ہیں [1] اور وہی یہاں پر درست ہیں اور ہمارے مفسرین نے عموماً یہی معنی درج کئے ہیں۔ [2]

تعجب ہے کہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے یہاں یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ:

"تمہیں زمین میں (اپنا) نائب بنایا" جو مسلک جمہور کے مطابق ہے۔ حالانکہ اس آیت میں جمہور نے بھی یہ مفہوم قرار نہیں دیا ہے۔

اہل حق کے عقیدہ میں تمام نوع انسانی اللہ کی نائب نہیں ہے بلکہ اس کے نائب خاص افراد ہوتے ہیں جو تمام نوع میں امتیاز خاص یعنی جوہر عصمت کے حامل ہوتے ہیں۔

---

[1] خلائف الارض...ای یخلف بعضکم بعضاً فیہا (جلالین)

[2] معناہ ان اهل کل عصر یخلف اهل العصر الذی قبلہ کلما مضیٰ واحد خلفه اخر علیٰ انتظام و انساق (تبیان)

سُوۡرَةُ الۡاَعۡرَافِ

مکیّہ......۲۰۰......آیات

چونکہ اعراف کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہے، اس لئے اس سورہ کا یہ نام ہوا۔

سورۂ اعراف کے خاص مضامین

۱----اعمال کا تولا جانا

۲----جناب آدمؑ سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو

۳----لباس بہشت کا جناب آدمؑ و حواؑ کے جسم سے جدا ہونا

۴----نماز کے وقت زینت کا حکم

۵----کھانے پینے میں اعتدال کا حکم و راسراف سے ممانعت

۶----یہ کہ اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں

۷----اہل بہشت و اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو

۸----فساد سے ممانعت

۹----پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ

۱۰----جناب نوحؑ، جناب ہودؑ، جناب صالحؑ، جناب لوطؑ اور جناب شعیبؑ کی تعلیم اور ان کی قوموں کا رویہ

۱۱----حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ اور فرعون کا انجام

۱۲----بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں

۱۳----حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات

۱۴----جناب موسیٰ علیہ السلام کا تیس راتوں کا وعدہ، پھر اس میں بداء چالیس کی میعاد اور قوم کی گمراہی۔

۱۵----دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام

۱۶----گوسالہ پرستی

۱۷----موسیٰ علیہ السلام کا ہارونؑ پر عتاب

۱۸----النبی، اس کے اوصاف اور توریت و انجیل میں اس کا تذکرہ

۱۹---رسالت محمدی ﷺ کی ہمہ گیری

۲۰---اسباط بنی اسرائیل کی تعداد اور بارہ چشمے

۲۱---اہل سبت اور ان کا مسخ ہونا

۲۲---عہد الست یا عالم ذر

۲۳---یہ کہ قیامت کے وقت کا علم کسی کو نہیں

۲۴---قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم......وغیرہ وغیرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان ہے''

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ فَلَا يَكُنۡ فِىۡ صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ لِتُنۡذِرَ بِهٖ وَذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲﴾

''الف۔لام۔میم۔صاد۔ یہ وہ کتاب ہے [۱] جو آپ پر اتاری گئی ہے تو آپ کو اس کی طرف سے دل تنگی نہ ہونا چاہیے کہ آپ اس کے ذریعہ سے ہدایت کریں [۲] اور یاددہانی ہو ایمان والوں کے لئے [۳]''

الفاظ کے باہمی ربط میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔سلجھا ہوا مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آپ پر اتاری گئی ہے تو آپ کو تو اس کی تبلیغ کرنا ہے۔اب یہ لوگ کتنا ہی آپ کو اپنے حملوں کا نشانہ بنائیں،آپ کو دل تنگ نہیں ہونا چاہیے اور وہ اتاری گئی ہے اس لئے تھوڑی کہ آپ اسے خاموشی کے ساتھ اپنے پاس رکھے رہیں بلکہ وہ اتاری اسی لئے گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ سے خلق خدا کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور ایمان لانے والوں کو حقیقتوں کی یاددہانی ہوتی رہے۔لہٰذا یہ کام آپ کو بہر صورت انجام دینا ہے [۴]۔

اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳﴾

''پیروی کرو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے حوالی

---

[۱]۔این کتابیست (شاہ ولی اللہ) اجمع النحویون علیٰ ان قوله: کتاب انزل الیك مرفوع بغیر هٰذه الحروف فالمعنیٰ هٰذا کتاب انزل الیك (مجمع البیان)

[۲]۔لتنذر متعلق بانزل ای للانذار به (جلالین)

[۳]۔وبرای پند مسلمانان را (شاہ ولی اللہ)

[۴]۔قال الفراء والزجاج واکثر العلماء انه علی التقدیم والتاخیر وتقدیرة: کتٰب انزل الیك لتنذر وقال اٰخرون هو متصل بقوله: فلایکن فی صدرك حرج منه لتنذر به ای کن علی انشراح صدر بالانذار (مجمع البیان)

موالی کی پیروی نہ کرو[1] بہت کم ہے تمہارا نصیحت قبول کرنا''۔[2]

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ ﴿۴﴾

''اور بہت سی ایسی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تباہ کیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب راتی رات یا جب وہ دوپہر کو محو آرام تھے۔''

یہی ترجمہ تمام مفسرین کی تفسیر کے مطابق ہے[3] مگر شاہ رفیع الدین نے ایسا ترجمہ کیا ہے جس میں اگر کتابت کی غلطی سے کچھ رہ نہیں گیا ہے تو وہ عجیب ہے:

''پس آیا ان کے پاس عذاب ہمارا اور وہ سوتے تھے''۔

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾

''تو نہ تھی ان کی چیخ پکار[4] جبکہ ہمارا عذاب ان پر آیا سوا اس کے کہ وہ کہہ رہے تھے بے شک ہم گنہگار تھے۔''

یہ اعتراف اگر اس وقت ہو جب موقع اصلاح باقی ہے اور پھر اس کے ساتھ عزمِ اصلاح بھی ہو تو وہ توبہ کی حیثیت رکھے گا، اس لئے سزا سے بچا سکتا ہے مگر یہ اعتراف اس وقت جب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہو یا اس کے پہلے ہی مگر صرف ضمیر کے دباؤ سے ایک اعترافِ حق کی صورت سے جس کے ساتھ آئندہ زندگی میں کسی تبدیلی کی نیت پائی نہ جاتی ہو کچھ بھی نتیجہ بخش نہیں ہے بلکہ اس انسان کے خلاف عذاب کے حق بجانب قرار پانے کے لئے ایک حجت بنتا ہے جیسا کہ یزید کی زبانی حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کرنے کے بعد جو اعترافات تاریخ میں ملتے ہیں وہ اسی نوعیت کے ہیں۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآىِٕبِيْنَ ﴿۷﴾

''تو ہم بلا شبہ ان سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور بلا شبہ رسولوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے، اس کے بعد بے شک ان کے سامنے پوری واقفیت کے ساتھ سب واقعات پیش کریں گے[5] اور ہم غیر حاضر تو تھے نہیں''۔

---

[1]۔ اولیاء یطیعونہم فی معصیۃ تعالیٰ (جلالین)

[2]۔ اند کی پند می پذیرید (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ بیاتا لیلا اوھم قائلون نائمون بالظھیرۃ (جلالین) یعنی فی وقت القیلولۃ وھو نصف النھار (تبیان) ایشان شبانگاہ آرامیدہ بودند یا وقتیکہ ایشان در خواب نیمروز بودند (شاہ ولی اللہ)

[4]۔ ای لم یکن دعاء ھؤلاء (مجمع البیان) پس نہ تھا پکارنا ان کا (شاہ رفیع الدین)

[5]۔ بیان خواھیم کرد بحضور ایشاں بدانش (شاہ ولی اللہ)

یعنی روزحشران سب سے جواب دہی ہوگی اوران کے سامنے خالق کی جانب سے جو کچھ رسولوں کی کارکردگی اورامتوں کی نافرمانی سب ہی پر حاضرو ناظر تھا[1] وہ سب واقعات پیش کئے جائیں گے تاکہ ان کی بنا پر جزا وسزا دی جائے۔

آخر کے جملہ سے کہ ''ہم غیر حاضر تو تھے نہیں'' ظاہر ہے کہ خالق کا پوچھ گچھ کرنا خود معلوم کرنے کی خاطر نہیں ہے اور اسی لئے بعض جگہ قرآن میں سوال کی نفی کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ

گنہگاروں سے ان کے گناہوں کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کیا جائے گا۔ (قصص۔۷۸)

فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَاۗنٌّ ۝۳۹

تو اس دن کسی آدمی یا جنات میں سے کسی سے بھی اس کے گناہ کے متعلق پوچھا نہیں جائے گا۔ (رحمن ۳۹)

یہ پوچھا جانا جس کی نفی ہوئی ہے وہی تحقیق حال کے لئے دریافت کرنا ہے جس کی خالق کو ضرورت نہیں کیونکہ اس کے علم میں سب کچھ ہے۔[2]

لیکن یہ سوال جس کا آیت زیر تحریر میں اعلان ہے کہ ''ہم پوچھیں گے''۔ایک تو تہدیدی حیثیت رکھتا ہے[3] اور پھر اس لئے ہے کہ جزا کی بنیاد خود ان لوگوں پر ظاہر ہو جائے جن کو جزا وسزا دی جارہی ہے اور جزا وسزا کا مفاد پورا ہونے کے لئے ضروری چیز ہے اور یہ ایک بڑا نقصان ہے جو آریوں کے نظام جزا وسزا میں جو تناسخ کے تصور پر مبنی ہے پایا جاتا ہے۔یعنی وہاں جزا اور سزا پانے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کا ہے کی سزا ہے اور اس سے مقصد جزا وسزا کا فوت ہو جاتا ہے۔

تعلیماتِ اسلام میں جزاء وسزا کے ساتھ حساب وکتاب، میزان اور نامۂ اعمال، یہ سب چیزیں اسی نقص کے مقابلہ میں بندوں کو پورے طور پر بنیاد جزاءسزا بتانے کے لئے ہیں۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَىِٕذِۨ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹

''اور اس دن تولا جانا بالکل حق ہے تو جس شخص کے اعمال کے پلے بھاری ہوں گے تو یہی لوگ دین اور دنیا کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں اور جس کے اعمال کے پلے سبک ہوں گے تو یہ ہیں جنہوں نے اپنے کو گھاٹے میں مبتلا کیا، اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے۔''

اعمال کا وزن:

[1] لنخبرنهم عن علم بما فعلوه وما كنا غائبين عن ابلاغ الرسل والامم الخالية بما فعلوا (جلالين)

[2] المراد به لا يسألون سؤال الاستعلام واستخبار (تبيان)

[3] هو تعالىٰ وان كان عالما بما كان منهم فانما اخرج الكلام مخرج التهديد والزجر (مجمع البيان)

''اس دن''،یعنی اس موقع پر جس کا ذکر پہلے ہوا کہ ''ہم ان سے پوچھ گچھ کریں گے اور سب واقعات پیش کریں گے۔[۱]

''تولا جانا''،یعنی اعمال خیر کی زیادتی اور کمی،نیز کمال اور نقص کی جانچ پڑتال[۲]

''حق ہے''،اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ہونا حق ہے اور ایسا ہو کر رہے گا[۳] اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اس دن جو جانچ پڑتال ہو گی،وہ بالکل ٹھیک ٹھیک ہوگی۔[۴]

اور اعمال کے پلوں کا گراں ہونا،نیک اعمال کا زیادہ ہونا ہے[۵]

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم اپنے حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں:

''اعمال کے تولے جانے کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو ترازو میں تول کر بتا دیتا ہے،اسی طرح خداوند عالم عدل و انصاف کے ساتھ حکم دے گا کہ اس میں ذرا سی کی زیادتی نہ ہوگی۔اسی وجہ سے جب کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا اعمال تولے جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اعمال جسم نہیں ہیں کہ تولے جائیں۔اس کے علاوہ تولنے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو اس کی گرانی اور سبکی کو نہ جانتا ہو اور خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔اس نے پوچھا کہ پھر فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اچھے اعمال غالب ہوں۔''

اسی مفہوم کو ہمارے قدیم علماء نے بھی ترجیح دی ہے چنانچہ جناب شیخ الطائفہؒ نے فرمایا ہے:

قال مجاهد والوزن عبارة عن العدل فی الاخرة وانه لاظلم فیها علیٰ احد وهو قول البلخی وهو احسن الوجوه (تبیان)

مجاہد کا قول ہے کہ وزن،آخرت میں کامل عدل وانصاف کی ایک تعبیر ہے اور یہ کہ کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور یہی بلخی کا قول ہے اور یہ تمام توجیہات میں سب سے بہتر ہے۔

اسی کو علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کے تحت میں اس طرح لکھا ہے:

ذکر فیه اقوال احدها ان الوزن عبارة عن العدل فی الأخرة وانه لا ظلم فیها علیٰ احد.

اس میں چند قول بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وزن،آخرت میں عدل وانصاف کی ایک تعبیر ہے اور یہ کہ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔

پھر دوسرے متعدد قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

واحسن الاقوال القول الاول (مجمع البیان)

---

[۱]۔ای یوم السؤال المذکور وهو یوم القیامة (جلالین)

[۲]۔سنجیدن اعمال بانصاف (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔بودنیست (ولی اللہ)

[۴]۔الحق العدل صفة الوزن (جلالین)

[۵]۔هر که گران شد پلۂ نیکیهاے او (شاہ ولی اللہ)

تمام قولوں میں سب سے بہتر پہلا قول ہے۔
اعمال کے ساتھ بھاری اور ہلکے ہونے میں جمع کے صیغے ''موازین'' کا استعمال جس کی بنا پر ہم ترجمہ میں ''پلے بھاری ہوں گے'' اور ''ہلکے پلے ہوں گے'' لکھنے پر مجبور ہوئے، اس کا پتہ دیتا ہے کہ ہر قسم کے اعمال میں صحت و بطلان یا کمال و نقص کے تولنے کے معیار الگ ہیں [۱] اور چونکہ میزان یعنی ترازو حقیقت میں ہر وہ شے ہے جس سے کسی چیز کی زیادتی اور کمی وغیرہ نمایاں ہو سکے۔ اسی لئے منطق کو علم المیزان کہتے ہیں کہ اس میں نتائج کے صحیح وغلط ہونے کے معیار بتائے جاتے ہیں اور اشعر میں ''وزن'' کا لفظ کا استعمال ہوتا ہے کہ تقطیع کر کے ان کی کمی یا زیادتی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ترازو ہر شے کا اس کے اعتبار سے ہوتا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مثلاً نماز کے جانچ کا ترازو کسی کامل نمازی کی نماز ہو اور روزہ کا ترازو کسی ایسے ہی روزہ دار کے روزے ہوں اور راہ خدا میں قربانی کا ترازو ایک بلند مرتبہ شہید کی شہادت ہو اور ایسے ہی زندگی کا ہر شعبہ اور اس سے متعلقہ عبادات وفرائض۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿١٠﴾

''اور بلا شبہ ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمہارے لئے اس میں زندگی کے سامان بنائے [۲] (پھر بھی) بہت کم ہے تمہارا شکر گزار ہونا۔''

''مکنا کم'' کا جو ترجمہ کیا گیا ہے: ''تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا'' یہ اس لفظ کا ذہن سے زیادہ قریب مفہوم ہے جس کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب نے بھی ترجمہ کیا ہے: ''قدرت دی ہم نے تم کو'' لیکن ان کے والد بزرگوار نے اس کے خلاف ترجمہ کیا ہے: ''استقرار دادم شمار ادر زمین'' لیکن قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس طرح کے الفاظ کا جو تمکین سے ہیں پہلے ہی معنی میں استعمال پایا جاتا ہے لہٰذا وہی یہاں بھی ترجیح رکھتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿١١﴾

''اور ہم نے تم کو پیدا کیا اور پھر یہ کہ تمہاری صورت گری کی تو اس کے بعد فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، اس پر ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا۔''

چونکہ بعد والے واقعات کا تعلق نوع بشر میں ہر فرد کے ساتھ نہیں ہے بلکہ صرف ابو البشر حضرت آدم علیٰ نبینا وآلہ وعلیہ السلام سے ہے، اس لئے بعض مفسرین نے شروع سے اس خلقت کو آغاز تخلیق کے معنی میں لے لیا۔ اس طرح ''تمہیں'' یا ''تم کو'' سے مراد یہ ہے کہ تمہارے مورث

---

[۱]۔ انما جمع الموازين لانه يجوز ان يكون لكل نوع من انواع انطاعات يوم القيامة ميزان (مجمع البيان)
[۲]۔ اى ما تعيشون به من انواع الرزق ووجوه النعم والمنافع (مجمع البيان)

اعلیٰ کو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی یعنی تمہارے مورث اعلیٰ کی صورت بنائی [۱] اور بعض نے پہلے جملہ کو آدمؑ سے متعلق کیا ہے اور دوسرے کو تمام نوع سے [۲] مگر تیسرا تو ظاہر بظاہر آدمؑ ہی سے متعلق ہے، اس لئے اسلوب کلام کو اس انتشار پر محمول کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ پہلا فعل یعنی ''تم کو پیدا کیا'' پوری نوع سے متعلق ہو اور اس کے بعد کے واقعات ابوالبشر سے متعلق ہوں اور اسی لئے ثم ''پھر'' کے لفظ کو ہم ترتیب واقعہ کے لئے نہیں سمجھتے بلکہ ترتیب ذکر کے لئے سمجھتے ہیں جسے ترجمہ میں ہم نے یوں ظاہر کیا ہے کہ ''پھر یہ کہ'' بلکہ ہمارے نزدیک تو پہلی صورت میں بھی اس ''ثم'' کے یہی معنی سمجھنا چاہئیں کیونکہ ''صورت کا بنانا'' خلقت کے بعد کا کوئی مرحلہ نہیں ہے جب کہ خود خلقت لازماً کسی صورت پر ہوگی، بلاصورت نہیں ہوسکتی۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ خلق بلاصورت سے مراد وہ منزل ہو کہ جب وہ صلب پدر میں ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت سب کی ایک شکل ہوتی ہے۔ اختلافِ صورت نمایاں نہیں ہوتا اور دوسری منزل شکم مادر کی ہو، جب ہر انسان میں شکل وصورت کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ [۳]

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

''ارشاد ہوا کیا امر تجھے مانع ہوا جو تو سجدہ نہ کرے باوجودیکہ میں نے تجھے حکم دیا۔ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔''

مانع فعل سے روکتا ہے اور ترک کا باعث ہوتا ہے، اس لئے اس کا انتساب قرآن مجید میں ایک جگہ فعل کی طرف ہوا ہے روکنے کے معنی میں اور ارشاد ہوا ہے: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ، وہاں ترجمہ یہ ہوگا کہ کون امر اس سے مانع ہوا کہ تو سجدہ کرے'' اور یہاں اس کا انتساب ترک عمل کی طرف ہوا ہے اس لئے معنی باعث ہونے کے پیدا ہوئے یعنی تعمیل حکم سے کون مانع پیش آیا جو باعث ہوا کہ تو سجدہ نہ کرے؟ [۴]

تعجب ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اور بعض ہمارے مترجمین نے بھی اس مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ کا ترجمہ وہی کیا ہے جو مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ کا ہونا چاہیے۔ [۵]

غالباً یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں پر لا کو زائدہ لکھ دیا ہے۔ [۶]

مگر کچھ مفسرین کی یہ روش جو اکثر آیات قرآنی میں انہوں نے اختیار کی ہے، بالکل غلط ہے جس نے مخالفین اسلام کو قرآن پر زبان طعن

---

[۱] ۔ هر آئينه آفريدیم شمارا یعنی پدر شمارا و صورت داديم شمارا بعنی پدر شمارا (شاه ولی الله) انا بدأنا خلق ادم ثم صورناه (مجمع البيان) كما يذكر المخاطب ويراد به اسلافه (تبيان)

[۲] ۔ الربيع وقتادة والضحاك والسدی ان المعنی خلقنا آدم ثم صورنا كم فی ظهره (تبيان)

[۳] ۔ خلقنا كم فی اصلاب الرجال وصورنا كم فی ارحام النسآء (علی بن ابراهيم)

[۴] ۔ ای ما دعاك الی ان لا تسجد وما اضطرك اليه (مجمع البيان) کس چیز نے منع کیا تجھے کہ نہ سجدہ کیا تو نے (شاہ رفیع الدین)

[۵] چه چیز منع کرد ترا از انکه سجده کنی (شاه ولی الله) تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا (مولانا فرمان علی صاحب)

[۶] ۔ لا زائدة (جلالين)

دراز کرنے کا موقع دیا ہے اور اس پر علامہ شیخ جواد بلاغیؒ نے اپنی تفسیر آلاء الرحمن کے مقدمہ میں بڑی مبسوط بحث کی ہے جسے جدید ایڈیشن میں ہم نے اپنے مقدمہ تفسیر کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کیا ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝١٣ قَالَ اَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝١٤ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝١٥ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝١٦ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝١٧ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝١٨

''ارشاد ہوا تو پھر تو اس میں سے اتر جا کیونکہ تجھے اس میں رہ کر یہ زیب نہیں دیتا کہ تو غرور سے کام لے [۱] تو نکل جا۔ یقیناً تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے، اس نے کہا مجھے مہلت عطا کر اس دن تک کہ جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے، کہا اچھا تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی۔ اس نے کہا تو جیسا تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے، اب میں ضرور بیٹھوں گا ان کیلئے تیرے سیدھے راستے پر۔ پھر میں آؤں گا ان کی طرف ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے اور تو ان میں سے زیادہ کو شکر گزار نہیں پائے گا، اس نے کہا نکل جا یہاں سے قابل نفرت اور مردود ہو کر یقیناً جو ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو میں بھر دوں گا دوزخ کو تم سے سے۔''

''اس میں سے اتر جا'' اس سے اشارہ جنت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور معلق عالم بالا کی طرف بھی۔ [۲]

''مہلت'' کے معنی عام طور پر زندہ رکھنے کے سمجھے جاتے ہیں، اس لئے کہا گیا ہے کہ شیطان کی خواہش کو پورا منظور نہیں کیا گیا کیونکہ اس نے تو قیامت کے دن تک کے لئے زندہ رکھنے کو کہا تھا مگر قیامت تو دوبارہ زندہ کرنے کا دن ہے، نہ کہ موت کا! اس لئے مہلت دی گئی مگر قیامت تک کی نہیں بلکہ قیامت کے پہلے ایک خاص وقت تک جبکہ خالق اس پر موت طاری کر دے گا جسے دوسری جگہ کہا گیا ہے۔

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝٨١ (سورۂ ص) یعنی اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں جو میرے علم میں معین ہے۔

مگر جناب شیخ طوسیؒ کا رجحان اس طرف ہے کہ مہلت سے مراد دنیا میں مورد عذاب نہ بنانا اور اس کے عذاب کو قیامت پر اٹھا رکھنا ہے اور اس کی اس خواہش کو خالق نے منظور فرما لیا اور اس لئے قیامت سے پہلے اس کی تمام نافرمانیوں کی کوئی پاداش نہیں مل رہی ہے۔

---

[۱]۔ فانها ليست بموضع المتكبرين (مجمع البيان)

[۲]۔ منها اى من الجنة وقيل من السمٰوٰت (جلالين)

شیطان کی زبانی ”بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ“ کے جو الفاظ ہیں، ان کا ترجمہ ہم نے یہ کیا کہ ”جیسا تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے“...... یہ اس بنا پر کہ گمراہ کرنے کی نسبت ذات الٰہی کی طرف درست نہیں ہے اور شیطان بھی بر بنائے غرور سرکشی کے باوجود شان الٰہی سے اس وقت اتنا جاہل نہیں مانا جا سکتا کہ گمراہ کرنے کے عمل کو جو قبیح ہے ذات الٰہی کی طرف منسوب کرے مگر علمائے اہل سنت جو حسن و قبح کے عقلی ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلا تکلف گمراہ کرنے کی نسبت اس کی جانب دید دیتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”بسبب آنکه مرا گمراه کردی“۔

ان کے صاحبزادہ بھی اس پہلو سے ان کے پیرو ہیں، اگر چہ اتنا فرق ہے کہ یہ بما اغویتنی کی ”ب“ کو قسم کا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

”قسم ہے اس کی کہ گمراہ کیا تو نے مجھ کو“۔ (شاہ رفیع الدین)

یہ ”ب“ کو برائے قسم لینا پہلے کی بعض تفسیروں کے مطابق ہے [1]۔

شیطان کا یہ کہنا کہ ”میں بنی آدم کی طرف سامنے سے آؤں گا اور دائیں سے اور بائیں سے“ اس میں جناب ابن عباسؓ کی زبانی یہ نکتہ وارد ہوا ہے کہ فوق کی سمت شیطان کے دسترس سے باہر رہی ہے تا کہ خالق کی رحمت کا راستہ پھر بھی کھلا رہے۔ [2]

ایک پر لطف تفسیر ان سمتوں کی جو بظاہر حدیث معصوم سے ماخوذ ہے یہ ہے کہ آگے سے مراد آخرت ہے کہ شیطان لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ انجام میں کچھ بھی نہیں ہے، نہ حساب، نہ کتاب، نہ بہشت، نہ دوزخ، اور پیچھے سے مراد وہ مال و متاع دنیا ہے جو انسان کما چکا ہے، شیطان اسے خیر خیرات میں صرف کرنے سے روکتا ہے اور دائیں سے مراد دین و ایمان ہے کہ وہ حقانیت میں شبے پیدا کر کے اسے کمزور کرتا ہے اور بائیں سے مراد انسانی خواہشیں ہیں جن میں بے راہ روی پیدا کر کے وہ آدمی کی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ (تفسیر علی بن ابراہیم)

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا
وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ
تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾
فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ
عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ
وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٢﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ

---

[1] الباء للقسم (جلالین)

[2] قال ابن عباس ولا يستطيع ان يأتي من فوقهم لئلا يحول بين العبد وبين رحمة الله تعالى (مجمع البيان)

لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

''اور اے آدمؑ! رہو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں اور کھاؤ جہاں سے تم دونوں چاہو اور اس درخت کے نیچے نہ جانا، نہیں تو ہو گے تم دونوں ظالموں میں سے تو وسوسہ میں ڈالا ان دونوں کو شیطان نے تاکہ نمایاں کر دے ان کے لئے وہ جو ان کے چھپانے کے قابل جسم کے حصے خود ان سے چھپے ہوئے تھے اور کہا تم دونوں کو تمہارے پروردگار نے نہیں روکا اس درخت سے مگر اس لئے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ یا ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، اور ان دونوں سے قسم کھائی کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں تو ان دونوں کو اس نے دھوکے میں ڈال دیا تو جب انہوں نے اس درخت میں سے چکھا تو چھپے ہوئے ان کے جسم کے حصے نمودار ہو گئے اور وہ اپنے اپنے اوپر بہشت کے پتوں کو جوڑ کر پردہ کرنے لگے اور آواز دی ان کو ان کے پروردگار نے کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے روکا نہیں تھا اور نہیں کہا تھا کہ بلا شبہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور نہ رحم کرے گا تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔''

جناب آدم و حوا علیہما السلام سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو

اس واقعہ کا بیان پہلے پارے میں آ چکا ہے اور وہاں اس پر بقدر ضرورت تفصیلی بحث بھی کی جا چکی ہے شیطان نے انہیں وسوسہ میں ڈالا ''تاکہ نمایاں کر دے ان کے لئے وہ جو ان کے چھپائے جانے کے قابل جسم کے حصے خود ان کی نگاہ سے پہلے چھپے ہوئے تھے۔'' اس کا یہ مطلب ہو تو سکتا ہے کہ وہ ازاول برہنہ تھے مگر خود انہیں اس کا احساس نہ تھا یعنی یہ حقیقت ان سے چھپی ہوئی تھی جیسا کہ بائبل میں اس واقعہ کے بیان میں درج ہے مگر قرآن مجید میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ ان کے جسم پر لباس جنت موجود تھا اور اس درخت سے کھانے کے بعد وہ لباس ان کے جسم سے جدا ہوا تو وہ برہنہ ہو گئے اور اس لئے جلدی جلدی پتوں سے ستر کرنے لگے، اس لئے یہاں بھی مطلب یہی لینا پڑے گا کہ ان کے جسم پر لباس بہشت کے موجود ہونے کی وجہ سے یہ اعضاء پوشیدہ تھے مگر اب وہ لباس ان کے جسم سے جدا ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ برہنہ ہیں۔

لباس بہشت کا جناب آدم اور حوا علیہما السلام کے جسم سے جدا ہونا

اب یہ کہ شیطان نے یہ اس لئے کیا ''تاکہ نمایاں کرے'' یہ ویسا ہی ہو سکتا ہے کہ جیسے اکثر جگہ اس نتیجہ کو جو کسی امر پر مرتب ہو بطور غرض و غایت بیان کیا جاتا ہے جس کی نمایاں مثال ہے:۔ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا۔ فرعون کے گھر والوں نے موسیٰؑ کو دریا سے نکال لیا تاکہ یہ ان کے دشمن جان اور باعث غم و غصہ ہوں'' ویسے ہی یہاں بھی چونکہ ان کے وسوسہ پر نتیجہ یہی مرتب ہوا، اس لئے ان الفاظ میں ذکر کیا گیا۔

پھر یہ کہ شیطان کا مقصود بہشت سے نکلوانا اور آدمؑ کو نقصان پہنچانا تو ضروری تھا۔ اب چاہے سب لوازم اس کے وہ نہ بھی جانتا ہو، تب بھی اس کی طرف ان تمام چیزوں کا بطور غرض و مقصد استناد ہو سکتا ہے اس لئے بعض مفسرین نے جو اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیطان جانتا تھا کہ اس

درخت کے پاس جانے سے یہ برہنہ ہوجائیں گے اور جو برہنہ ہوجائے، وہ بہشت میں نہیں رہ سکتا[1] کوئی مضبوط وجہ نہیں رکھ سکتا۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿٢٥﴾

”ارشاد ہوا اترو! تم لوگوں میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوگا اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہوگا ایک وقت تک کے لئے[2] (یہ بھی) کہا کہ اس میں تم جیو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے (دوبارہ) نکالے جاؤ گے“[3]

اخلاقی نتائج اس پورے واقعہ کے مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے بہت اچھے لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) آدمی کا ساری خدائی حتیٰ کہ جنوں اور فرشتوں سے بہتر ہونا۔
(۲) طبعی عصمت کا فعلی وارادی عصمت سے کم ہونا۔
(۳) حسد وتکبر کی برائی۔
(۴) اپنی جماعت سے علیحدگی کی برائی۔
(۵) خلقی صفت نسب وغیرہ پر ناز کرنے کی برائی۔
(۶) تعلّی کے خواہشمند کا پست ہونا۔
(۷) برے آغاز کا برا انجام۔
(۸) قصوروار کے بھی واجب حق کا ساقط نہ ہونا۔
(۹) مجرم کے ضد کرنے پر سزا کی زیادتی۔
(۱۰) بدی کے پیرو کا بانی کی طرح انجام خراب ہونا۔
(۱۱) حقیقی دوست کا مشکل سے بہم پہنچنا۔
(۱۲) بے جانچے کسی بات پر بھروسہ کرنے کی برائی۔
(۱۳) دشمن کی بات پر بھروسہ کرنے کی برائی۔
(۱۴) ناصح کے خلاف کرنے میں زک اٹھانا۔
(۱۵) دشمن کی جھوٹی قسموں پر اعتماد نہ کرنا۔
(۱۶) غلطی پر توبہ اور ندامت کا مفید ہونا۔

---

[1] یوجب ان یکون ابلیس علم ان من اکل هٰذه الشجرة بدت عورته وان من بدت عورته لا یترك فی الجنة (مجمع البیان)۔
[2] تا وقتی معین یعنی تا مرگ (شاہ ولی اللہ)۔
[3] عند البعث یوم القیامة (مجمع البیان)۔

(۱۷) ندامت سے پھر اصلی مرتبہ ہاتھ آنا۔
(۱۸) کبھی ذاتی عداوت کا موروثی عداوت ہو جانا۔
(۱۹) دشمن کی لگاوٹ پر نہ اترانا۔

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی است
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ۙ ذٰلِكَ خَیْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

”اے اولاد آدم! ہم نے تم پر پوشاک اتاری ہے جو تمہارے جسم کے چھپانے کے قابل حصوں کو چھپائے اور دیگر ساز وسامان [۱] اور پرہیزگاری کا لباس۔ یہ سب سے اچھی چیز ہے۔ یہ سب اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں

”تم پر پوشاک اتاری“ یعنی وہ چیزیں خلق کیں جن سے پوشاک تیار ہوتی ہے اور تمہیں وہ عقل وشعور عطا کیا جس سے تمہیں ستر پوشی اور آرائش کی ترکیبیں آئیں۔ اس پوشاک کے تذکرہ میں پرہیزگاری کے لباس کا ذکر اس بنا پر ہوسکتا ہے کہ لباس میں بھی تو شریعت کی طرف سے پابندیاں ہیں لہٰذا ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تم ستر پوشی اور آرائش کی دھن میں ان پابندیوں کو نظر انداز کردو۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

”اے نسل آدم کے لوگو! ایسا ہرگز نہ ہو کہ شیطان تمہیں بہکا دے جیسا تمہارے باپ ماں کو اس نے بہشت سے نکلوایا یا اس طرح کہ ان کے جسم سے ان کے کپڑے تک اتروا دیئے تا کہ ان کے جسم کے چھپانے کے قابل حصے ان کی آنکھوں کے سامنے لے آئے یقیناً وہ اور ان کا قبیلہ تمہیں جس طرح دیکھتا ہے، تم انہیں نہیں دیکھتے یقیناً ہم نے شیطان کو ان کا حوالی موالی قرار دیا ہے کہ جو ایمان نہیں رکھتے۔“

”قرار دیا ہے“ یعنی محسوب کیا ہے [۲] جو حقیقت کے مطابق ہے۔ نہ یہ کہ اس نے ان افراد کو ان شیطانوں کی پیروی پر یا ان شیطانوں کو

---

[۱] ۔الریش والاثاث متاع البیت من فراش اودثار (مجمع البیان)
[۲] ۔معناہ اناحکمنا بذلك ومثله قوله: وجعلوا الملئكة الذین هم عباد الرحمن اناثاای حکموا بذلك (تبیان)

ان کی سرپرستی پر مجبور کیا ہے۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾

''اور جب وہ کسی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا تھا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہیے کہ اللہ بدکاری کا حکم نہیں دیا کرتا، کیا تم اللہ پر ایسی بات کی تہمت لگاتے ہو جو تم جانتے نہیں ہو۔''

یہ فقرہ کہ ''اللہ بدکاری کا حکم نہیں دیا کرتا'' اس کی دلیل ہے کہ حکم الٰہی سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی کچھ افعال میں ذاتاً بھلائی اور برائی موجود ہے۔ یہ وہ مسلک ہے جسے عدلیہ اختیار کئے ہوئے ہیں مگر جمہور اہل اسلام اس کے خلاف ہیں، یہ جمہور کا مسلک عقل اور قرآن دونوں کے خلاف ہے۔

یوں تو مشرکین طرح طرح کی بدکاریوں کے مرتکب تھے اور فاحشہ کا لفظ ان سب پر حاوی ہے[1] مگر یہاں مفسرین کا بیان ہے کہ اس سے مشرکین کا برہنہ طواف کرنا مراد ہے۔[2]

وہ اس کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ وہ کپڑے جن میں ہم نے طرح طرح کے گناہ کئے ہیں، اس لائق نہیں ہیں کہ ہم انہیں طواف کی حالت میں جسم پر رکھیں لہٰذا ہم اس حالت میں طواف کرتے ہیں، جس حالت میں معصومیت کے عالم میں ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔[3]

دیکھا جائے تو اسلام نے حالت احرام کے لئے خاص طرح کے لباس کا حکم دے کر کم از کم مردوں کے لئے تو ان کے اس وہم کو بھی دور کر دیا ہے جو عام لباس پہن کر طواف کرتے ہیں ان کے ذہن میں تھا۔ ہاں عورتوں کے لئے عزت نسوانی کا پہلو اتنا اہم تھا کہ ان کے لئے اس طرح کے لباس کو مناسب نہیں سمجھا گیا اور انہی اپنے عام لباس میں احرام کی اجازت دی گئی۔

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿٢٩﴾

''کہیے کہ میرے پروردگار نے عدالت کا حکم دیا ہے اور یہ کہ اپنے چہرہ کو سیدھ پر رکھو ہر نماز کے وقت[4] اور اسے پکارو نری کھری اس کی عبادت کرتے ہوئے جس طرح اس نے پہلی دفعہ تمہیں پیدا کیا، اسی طرح پھر دوبارہ پلٹنا ہو گا۔''

---

[1] ۔ هو اسم جامع للقبائح والسيئات (مجمع البيان)

[2] ۔ كناية عن المشركين الذين كانوا يبدون سوٰاتهم في طوافهم النساء والرجال (تبيان)

[3] ۔ نطوف كما ولدتنا امهاتنا ولا نطوف في الثياب التي قارفنا فيها الذنوب (مجمع البيان)

[4] ۔ راست کنید روئے خود را (شاہ ولی اللہ) سیدھا کرواپنے منہ کو (شاہ رفیع الدین)

چہرہ کو سیدھ پر رکھنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبلہ کی سیدھ پر رکھو جو شرائط نماز میں سے ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خضوع وخشوع کے ساتھ اللہ سے لو لگانا مقصود ہو[1]

علامہ طبرسیؒ نے اس کی تفسیر میں پانچ قول نقل کئے ہیں مگر ہمارا ترجمہ "چہروں کو سیدھ پر رکھو" ان سب ہی پر منطبق ہے۔ اسی لئے ہم نے بریکٹ وغیرہ کے اندر کوئی ایسی تشریح نہیں کی جو صرف ایک قول پر مبنی ہو سکے۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

"ایک گروہ کی اس نے ہدایت کی اور ایک گروہ پر گمراہی ثبت ہوگئی[2] بلا شبہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو سرپرست بنایا اور پھر سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راستے پر ہیں۔"

گمراہی ثبت ہونے کے ساتھ شیطانوں کو سرپرست بنانے کا ذکر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی پر بلا وجہ گمراہی ثبت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کے غلط کردار کا ایک نتیجہ ہوتا ہے جو ظہور پذیر ہوتا ہے۔[3]

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

"اے آدم کی نسل کے لوگو! ہر نماز کے وقت اپنی آرائش کی صورتیں اختیار کرو اور کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔ یقیناً وہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

واجب حد آرائش کی جو نماز میں ضروری ہے وہ لباس ہے جس سے ضروری ستر ہوا اور وہ مرد کے لئے صرف اتنا ہے کہ جو ساتر عورتین ہو اور عورت کے لئے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے سوا پورے جسم کا لباس ہے۔ اس لئے بعض مفسرین نے زینت کی تفسیر یہی کی ہے۔[4] مگر یہ بعید نہیں ہے کہ اس میں لفظ زینت کے اندر اس کے ماسوا چیزیں مثلاً لباس فاخرہ اور بالوں میں کنگا اور عطر وغیرہ بھی داخل ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے متعلق حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہو جیسا کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام دونوں بزرگوں کی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے۔[5]

امام حسن علیہ السلام کا عمل بھی وارد ہوا ہے کہ آپ نماز کے وقت اپنے سب سے بہتر لباس کو زیب جسم فرماتے تھے اور پھر جب کسی نے اس کا

---

[1] ای اخلصوا سجود کم (جلالین)

[2] حق ای وجب (مجمع البیان)

[3] انہ فعل بہم ما فعل من الضلال لانہم اتخذوا الشیاطین اولیآء (تبیان)

[4] زینتکم ما یستر عورتکم (جلالین)

[5] ای خذوا ثیابکم التی تتزینون بہا للصلوٰۃ فی الجمعات والاعیاد عن ابی جعفر الباقر علیہ السلام وقیل ان اخذ الزینۃ ہو المشط عند کل صلوٰۃ روی ذٰلک عن الصادق علیہ السلام (مجمع البیان)

سبب دریافت کیا تو حضرتؑ نے اس آیت کو پیش فرمایا۔[1]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس آیت میں "عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" سے مراد خاص خاص نمازوں کے ہنگام یعنی جمعہ وعیدین مراد ہیں۔[2]

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

''کہیے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی طرف کے سامانِ آرائش کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور اچھی غذاؤں کو؟ کہیے کہ وہ مومنین کے لئے دنیوی زندگی میں بھی ہیں اور روز قیامت تو نری کھری انہی کے لئے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ان کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔''

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کا تعلق نحوی قواعد کے لحاظ سے بظاہر کائنةً یا ثابتةً کے ساتھ ہے جو مقدر ہے یعنی یہ نعمتیں ثابت ہیں مسلمانوں کے لئے زندگانی دنیا میں مگر یہاں غیر مومن بھی ان کے ساتھ شریک ہیں اور روز قیامت تو وہ ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ غیر مومنین کا ان میں کوئی حصہ ہی نہیں ہوگا۔[3]

مگر ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اٰمنوا کے ساتھ متعلق ہو یعنی جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں ان کے لئے یہ چیزیں روز قیامت بالکل مخصوص ہوں گی۔[4]

بعض مترجمین نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے[5] اور پہلے احتمال کی بنا پر بھی مطلب ایک دوسرا ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ لام استحقاق کا ہو یعنی یہ نعمتیں اس زندگانی دنیا میں حق اہل ایمان ہی کا ہیں مگر یہاں دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ غاصبانہ حصہ اپنا لگا لیتے ہیں اور آخرت میں وہ صرف انہی کے قبضہ میں ہوں گی۔ دوسروں کا ان تک دسترس نہ ہوگا۔[6]

پھر خالصة کے لحاظ سے ایک تیسرا مفہوم بھی قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ نعمتیں اس دنیا میں بھی مومنین کو حاصل ہیں مگر یہاں ان کے ساتھ طرح طرح کے افکار وآلام بھی ملے ہوئے ہیں اور آخرت میں وہ نری کھری ان کے لئے ہوں گی یعنی کسی غم ورنج اور فکر کا شائبہ نہ ہوگا۔[7]

---

[1] روی العیاشی باسنادہ (مجمع البیان)

[2] مروی عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال فی الجمعات والاعیاد (تبیان)

[3] ثابتة للذین اٰمنو فی حال خلوصهام یوم القیامة لهم (مجمع البیان)

[4] یحتمل ان یکون قوله فی الحیوة الدنیا متصلة بالصلة التی هی اٰمنوا (مجمع)

[5] واسطے ان لوگوں کے کہ ایمان لائے بیچ زندگانی دنیا کے خالص ہیں دن قیامت کے (شاہ رفیع الدین)

[6] هی للذین اٰمنوا فی الحیوة الدنیا بالاستحقاق وان شارکهم فیها غیرهم (جلالین)

[7] هی للذین اٰمنوا فی الحیوة الدنیا للذین اٰمنوا غیر خالصة من الهموم والاحزان والمشقة وهی خالصة یوم القیامة عن ذٰلك عن الجبائی (مجمع البیان)

بہر حال اصل کلام کا مقصود وہ ہے جس سے آیات شروع ہوئی ہیں کہ ان لوگوں کا تصور غلط ہے جو بغیر ممانعت شرعی کے کچھ لذائذ دنیا کو ممنوع سمجھ لیں لیکن اگر انسان ممنوع نہیں سمجھتا پھر بھی اس نے ذاتی طور پر کچھ چیزوں کو ترک کرنے کی پابندی کر لی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اگر خلق خدا کی ہمدردی وغمخواری یا اور کسی مقصد بلند کے لئے ہے تو ممدوح اور باعث رضائے خالق بھی ہوگی۔[1]

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ وَالۡاِثۡمَ وَالۡبَغۡيَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَاَنۡ تُشۡرِكُوۡا بِاللّٰهِ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا وَّاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ۝۳۳

”کہیے کہ میرے پروردگار نے تو بس حرام کیا ہے بدکاریوں کو جو کھلی ہوئی ہوں ان میں سے اور جو پوشیدہ ہوں اور شراب کو اور حدود سے ناحق تجاوز کو اور یہ کہ اللہ کا شریک کرو کسی کو جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے اور یہ کہ اللہ کی نسبت کہو ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو۔“

شراب کی حرمت

یوں تو اثم کے معنی عام گناہ کے ہیں اور اسی کے مطابق ترجمہ یہاں بھی کیا جا تا رہا ہے مگر ایک تو گناہ کے معنی ہی ہیں کسی ممنوع کام کا ارتکاب تو گناہ کو کہنا کہ اسے حرام قرار دیا گیا ہے بظاہر کسی افادیت کا حامل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ فواحش کا لفظ جس سے متبادر جنسی قسم کے جرائم ہیں، نمبر ایک اور بغی جس سے متبادر دوسروں کے حقوق کے خلاف کسی بھی صورت سے دستِ تعدی دراز کرنا ہے نمبر 3، ان دونوں کے درمیان حرف عطف کے ساتھ "الاثم" کو نمبر 3 بنا کر ذکر کرنا جب اثم کا وہ عام مفہوم نمبر 1 اور نمبر 3 پر بھی حاوی ہے، یہ پتہ دیتا ہے کہ یہ نمبر 2 عام مفہوم گناہ نہیں ہے بلکہ کوئی خاص قسم گناہ ہے جو نمبر 1 اور نمبر 3 کے علاوہ ہے۔ جب کہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ اس لفظ کا استعمال شراب کے معنی میں ہوا ہے جس کے شواہد کلام عرب میں بھی موجود ہیں لہٰذا کیوں نہ یہاں بھی "الاثم" کے یہی معنی لئے جائیں اس لئے اس آیت میں بھی زیادہ قوت میرے نزدیک اسی قول کو ہے کہ اس کے معنی شراب کے ہیں[2] جیسا کہ میں نے ترجمہ کیا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ۝۳۴

---

[1] ظاهر الآية يدل على انه لا يجوز لا حد تجنب الزينة والملاذ الطيبة على وجه التحريم واما من اجتنبها على ان غيرها افضل منها فلا مانع منه (تبيان)

[2] قال قوم الاثم هو الخمر وانشد ابن الانباری به شربت الاثم حتیٰ ضل عقلی کذالك الاثم يصنع بالعقول (تبيان)

”اور جو بھی کسی دور کے لوگ ہوں [1] ان کی ایک عمر ہوتی ہے تو جب ان کی پوری عمر ہونے کا وقت [2] آ جاتا ہے تو ذرا دیر نہ وہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔“

”اجل“ کے معنی مدت مقررہ کے ہوتے ہیں۔ عمر بھی ایک مقررہ مدت ہے۔ اس اعتبار سے وہ خود ایک اَجَل ہے اور اس مدت کا اختتام موت کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے موت حقیقتاً اختتام اجل کا نام ہے لیکن یہ اختتام چونکہ موت کی صورت میں ہوتا ہے، اس لئے عرفاً موت کو ”اجل“ کہا جانے لگا ہے۔

يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ يَقُصُّوۡنَ عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِيۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا عَنۡهَاۤ اُولٰۤـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۶﴾

”اے آدم کی نسل کے لوگو! اگر تمہاری [3] طرف آئیں کچھ پیغمبر تم میں سے جو تمہارے سامنے میرے احکام پیش کریں تو جو پرہیزگاری سے کام لے گا اور اعمال درست رکھے گا تو ان پر نہ خوف طاری ہوگا اور نہ انہیں افسوس کی نوبت آئے گی اور جنہوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں اکڑ سے کام لیا تو یہ لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰۤـئِكَ يَنَالُهُمۡ نَصِيۡبُهُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوۡنَهُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا وَشَهِدُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ اَنَّهُمۡ كَانُوۡا كٰفِرِيۡنَ ﴿۳۷﴾

”تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے؟ انہیں جو ان کے مقدر کا لکھا ہے [4] وہ تو پہنچے گا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس آئیں گے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ان کی روحوں کو قبض کرتے ہوئے، تب وہ کہیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے سوا دہائی دیتے تھے [5] وہ کہیں گے کہ

---

[1] ۔ قیل ذکر الامة یقتضی تقارب اعمالا ھلا العصر (تبیان)

[2] ۔ بیاید میعاد ایشاں (شاہ ولی اللہ) جب آتا ہے وقت ان کا (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ اما اصله ان (تبیان) ای ان یأتکم (مجمع البیان)

[4] ۔ بہرۂ ایشاں از آنچہ نوشته شد در لوح محفوظ (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ تدعون تعبدون (جلالین)

وہ تو ہم سے غائب ہو گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ بے شک کافر تھے۔"

"انہیں جو ان کے مقدر کا لکھا ہے ضرور پہنچے گا" اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں رزق ونعمت الٰہی کا دروازہ ان پر بند نہیں ہوگا [1] اور یہ بھی کہ جو سزا انہیں ملنا ہے، وہ ملے [2] اور چونکہ الفاظ آیت کا دامن وسیع ہے، اس لئے دنیا وآخرت دونوں کی اچھائی برائی، سب ہی پر انہیں حاوی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ [3]

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

"ارشاد ہوگا کہ انہی گروہوں کے ذیل میں جنات اور آدمیوں میں کے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، تم بھی دوزخ میں داخل ہو، جب بھی کوئی گروہ داخل ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ والے دوسرے گروہ کو لعنت ملامت کرتا ہے [4] یہاں تک کہ جب وہ سب وہاں باہم مل جائیں گے [5] تو بعد والے پہلے والوں کے لئے کہیں گے کہ پروردگارا! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تو انہیں دوزخ میں زیادہ عذاب کر۔ ارشاد ہوگا کہ ہر ایک ہی کے لئے دونا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں۔"

"قال" کا لفظ جس کا ترجمہ کیا گیا ہے "ارشاد ہوا" یہ ارشادِ لفظی بھی ہوسکتا ہے اور ارادۂ الٰہی کی ایک تعبیر بھی [6] جیسا کہ کن فیکون میں ہوتا ہے۔ "ہر ایک کے لئے دونا عذاب ہے" یعنی حیثیتیں مختلف ہیں، کسی اعتبار سے اگلوں کا عذاب زیادہ ہے کہ وہ دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث ہوئے اور کسی حیثیت سے پچھلے عذاب کے زیادہ مستحق ہیں کہ انہوں نے سابق امتوں کے انجام سے بھی عبرت حاصل نہ کی۔ [7] نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ہی عذاب کے یکساں طور پر مستحق ہیں۔

---

[1] ۔بما كتب لهم في اللوح المحفوظ من الرزق والاجل وغير ذٰلك (جلالين)

[2] ۔ينالهم ما في الكتاب من عقوبات المعاصى (على بن ابراهيم)

[3] ۔قال مجاهد: جميع ما كتب لهم وعليهم وهو في قول عطية (تبيان)

[4] ۔لعنت كند قوم ديگر مانند خود را (شاه ولى الله)

[5] ۔ادّاركوا اتلاحقوا (جلالين)

[6] ۔يجوز ان يكون ذٰلك اخبار اعن جعله اياهم في جملة اولٰئك في النار من غير ان يكون هناك قول كما قال: كونوا قردة خاسئين والمراد انه جعلهم كذٰلك (تبيان)

[7] ۔یعنی ایک حساب سے پہلی امت کا عذاب بڑھا کہ پچھلوں کو راہ ڈالی اور ایک طرح پچھلوں کا بڑھا کہ پہلوں کا حال دیکھ کر عبرت نہ پکڑی (موضح القرآن)

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور کہا ان میں کے پہلوں نے ان میں کے بعد والوں سے، تو پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت تو نہ ہوئی تو بس چکھو اس عذاب کو اس کی وجہ سے جو تم اعمال کرتے تھے۔''

بعد والے تو یہ چاہتے تھے کہ قبل والوں پر ذمہ داری عائد کر کے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا خود بری الذمہ ہو جائیں اور بالکل نہ بھی بچیں تو پہلے والوں پر عذاب تو ان سے زیادہ ہو اور یہ ان کی بہ نسبت کم عذاب کے مستحق ہوں اس لئے کہ یہ تو ''بیچارے'' دوسروں کے کہنے میں آ گئے تھے۔ اس صورت میں ان کو پہلوں کے مقابل میں کچھ فوقیت ہوتی، خواہ مطلق نجات کی بنا پر اور خواہ کمی عذاب کی بنا پر مگر یہ اس کے قبل کی آیت میں معلوم ہو گیا کہ نہیں، نہ یہ عذاب سے بچ سکتے ہیں اور نہ پہلوں کی بہ نسبت ان کے عذاب میں کمی ہے۔ اس طرح پہلے لوگوں کو ان پر اس طعنہ زنی کا موقع ہو گیا کہ تم جو چاہتے تھے کہ ہم پر ذمہ داری عائد کر کے خود ہم سے بہتر حالت میں ہو جاؤ، یہ تمہاری امید بر نہیں آئی بلکہ معلوم ہو گیا کہ تم پورے پورے اپنی گمراہی اور اپنی بداعمالیوں کی ذمہ دار ہو تو اب ان بداعمالیوں کا مزہ چکھو اور سزا برداشت کرو۔

سیاق کلام کا ظاہر تو یہی ہے کہ یہ ''فذوقوا العذاب''، اب سزا اپنے اعمال کی چکھو'' انہی قبل والوں کے کلام کا تتمہ ہے مگر بعض مفسرین نے اس کو ان کے کلام سے خارج کر کے ارشاد حضرت احدیت قرار دیا ہے یعنی ان کی بات اس پر ختم ہو گئی کہ ''تمہیں ہم پر فوقیت نہیں ہوئی'' اور اب اللہ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ''بس اب اپنے کردار کا مزہ چکھو [1] مگر مجھے پہلے معنی زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

''یقیناً وہ کہ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں اکڑ سے کام لیا، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے اور نہ وہ بہشت میں داخل ہوں گے اس وقت تک کہ جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ چلا جائے اور اسی طرح ہم بالا دیتے ہیں گنہگاروں کو۔ ان کے لئے دوزخ کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر سے اوڑھنا بھی ہے اور یوں ہی ہم پاداش دیتے ہیں ظالموں کو۔''

کافروں کا بہشت میں جانا غیر ممکن

''آسمان کے دروازے کھلنے'' سے مراد ہے رحمت خدا کا متوجہ ہونا اور کلام معصومؑ میں اس کی تشریح یہ وارد ہوئی ہے کہ ان کی دعا اور ان

---

[1] قال تعالیٰ لهم: فذوقوا العذاب بما كنتم تكسبون (جلالين)

کے اعمال بارگاہ الٰہی کی طرف بلند اور قابل قبول نہیں ہوتے۔[1] "اس وقت تک یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ جائے" ...... یہ تعلیق المحال بالمحال ہے۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات میں ناممکن شرط لگا کر خود اس بات کو ناممکن ظاہر کیا جائے۔اب یہاں معنی یہ ہیں کہ جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں جانا غیر ممکن ہے، ویسے ہی ان کا بہشت میں جانا غیر ممکن ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

"اور جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے ہم کسی پر پابندی عائد نہیں کرتے مگر اس کے مقدور بھر، یہ لوگ بہشت والے ہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ہم دور کردیں گے جو ان کے سینوں میں کدورت ہو، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہتے ہوں گے کہ شکر اللہ کا جس نے ہم کو اس راستے پر لگایا اور ہم یہ راستہ نہیں پاسکتے تھے اگر اللہ ہمیں راہ پر نہ لگاتا بلاشبہ آئے ہمارے پروردگار کے پیغمبر سچائی کے ساتھ اور آواز دی جائے گی انہیں کہ یہ بہشت ہے جس کے تم وارث قرار دیئے گئے ہو ان اعمال کے سبب سے جو تم نے انجام دیئے تھے۔"

بہشت میں قلبی کدورتیں دور ہوجائیں گی مگر کون سی؟

اہل بہشت کے متعلق اس ارشاد میں کہ "ہم نے دور کردی ہوگی جو ان کے سینہ میں کدورت ہو" کدورت سے مراد ذاتی اور دنیوی امور سے متعلق منازعات ہی ہوسکتے ہیں جن کا اصول ایمان اور اس صلاح عمل سے کوئی تعلق نہ ہو جو معیار دخول جنت ہے۔اس لئے کہ منازعت اگر ان شعبوں سے متعلق ہوئی تو جو سرنامہ اوصاف اہل جنت کا یعنی اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، وہ دونوں طرف ایک ساتھ موجود ہی نہ ہوگا تو پھر بعد کے تفصیلات اس سے کہاں متعلق ہوسکتے ہیں؟

اس سے ظاہر ہے کہ کچھ مفسرین نے جو اس آیت کے مضمون کو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اور ان سے جنگ کرنے والے افراد مثلاً طلحہ و زبیر وغیرہ سے مرتبط کیا ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

"مثل انچہ میان عثمان و علی و طلحہ و زبیر و عائشہ و عثمان واقع شد"

اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر صاحب نے تو اسے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی زبانی نسبت دے کر وارد کردیا ہے۔

[1]۔قال ابو جعفر علیہ السلام: اما المؤمنون فیرفع اعمالھم وارواحھم الی السمآء فتفتح لھم ابوابھا (تبیان)

فرماتے ہیں:

’’معلوم ہوا کہ نیکوں کے دل میں بھی آپس میں خفگی ہوگی، جنت کے قریب پہنچ کر آپس میں دل صاف ہوں گے، تب جنت میں جاویں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا کہ میں اور عثمان اور طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں ہیں اور جنت کے وارث فرمایا یعنی آدمؑ کی میراث پائی۔‘‘ (موضح القرآن)

ہم اس قول کی نسبت حضرت علی علیہ السلام کی طرف درست نہیں سمجھتے کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا وہ خلاف اصول ہے۔ مزید براں یہ کہ قرآن تو قلبی ’’کدورتوں‘‘ کو کہہ رہا ہے، نہ یہ کہ جب یہ قلبی کدورت عملی حیثیت سے خونریزیوں کے درجہ پر پہنچ جائے اور پھر ایسی ذات کے مقابلہ میں جس کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما گئے ہوں: ’’حَرْبُكَ حَرْبِيْ‘‘ تم سے جنگ مجھ سے جنگ ہے‘‘ اور جس کی محبت اور عداوت کو معیار ایمان وکفر قرار دیا گیا ہے: يَا عَلِيُّ حُبُّكَ اِيْمَانٌ وَبُغْضُكَ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ ‘‘ اے علیؑ تمہاری محبت ایمان اور تمہاری دشمنی کفر و نفاق ہے‘‘...... وہاں اس آیت کے مضمون کو لے جا کر منطبق کرنا صرف اپنے دل کی تسلی یا سخن پروری کے سوا، کیا حقیقت پروری کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟

ایک دوسرا مفہوم ان الفاظ کا بہت قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دلوں سے کینہ وعداوت دور ہو گئے ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے دنیا میں ایک آدمی دوسرے کی بلندی کو دیکھ کر جل جاتا ہے اور اس سے کینہ وعداوت پر کمر باندھ لیتا ہے، یہ بات وہاں نہیں ہوگی۔ اہل جنت آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نہ کینہ رکھتے ہوں گے نہ عداوت رشک وحسد کا وہاں نام نہ ہوگا[1] جیسے دوسرے مقام پر بہشت اور اہل بہشت کے اوصاف میں ہے:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

وہاں انہیں کوئی لغو بات سننے میں نہ آئے گی اور نہ گناہ کی بات سوا ہر طرف دعائے خیر وسلامتی کی باتوں کے۔ (سورۂ واقعہ)

اس کے بعد تو اس کے مضمون کا کوئی تعلق دنیا کے باہمی تعلقات کی کشیدگیوں اور منازعتوں کے ساتھ رہتا ہی نہیں ہے۔

آخری جملوں میں ایک بڑا لطیف اسلوب ہے کہ بندے بتقاضائے عبودیت اپنے انجام بخیر ہونے کا واحد سبب توفیق الٰہی کو قرار دے رہے ہیں کہ ہم اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے اگر اس کی توفیق نہ ہوتی اور اللہ اپنے کرم سے اس کا سہرا ان کے حسن اختیار کے سر پر باندھ رہا ہے کہ یہ تم پر کوئی مفت کا احسان تھوڑی ہے۔ یہ تو تمہارے حسن خدمات کا صلہ ہے جو تمہیں آج دیا جا رہا ہے۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

---

[1] نزع الغل فی الجنة تصبعة الطباع ولسقاط الوساوس واعطاء کل نفس مناھا ولا تتمنی مالغیرھا (تبیان)

''اور آواز دیں گے [1] بہشت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے تو جو ہم سے ہمارے پروردگار نے وعدہ کیا تھا، اسے سچا پایا تو کیا تم نے بھی اس وعدہ کو جو تم سے تمہارے پروردگار نے کیا تھا، سچا پایا؟ وہ کہیں گے 'ہاں' تو ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان اعلان کرے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر، جو اللہ کی راہ سے روکتے رہے ہوں [2] اور اسے کج بنانے کے درپے ہوں اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہوں''۔

اہل بہشت اور اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو

''کج بنانے کے درپے ہونا'' شکوک اور بیجا اعتراضات کے ذریعہ سے راہ راست کو مشتبہ بنانے کی کوشش کرنا ہے [3]

ان لوگوں سے جو وعدہ تھا، وہ ان کی بداعمالیوں پر عذاب کا تھا جو اصطلاحی طور پر وعید کہلاتا ہے مگر قرآن مجید نے اسے خواہ عام مفہوم کے اعتبار سے اور خواہ بطور طنز تعبیر کیا ہے وعدہ ہی کے لفظ کے ساتھ [4]۔

من جملہ کثیر التعداد آیات کے یہ آیت بھی لعن کے استحسان پر دلالت کرتی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ بداعمالی کا ایک درجہ وہ ضرور ہے جو لعنت خدا کا استحقاق پیدا کرتا ہے اور بداعمالی میں خاص چیز جو صراحۃً اس آیت میں درج ہے وہ راہ حق کو مشتبہ بنانے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں: ''حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں بے انصاف فرمایا ہے اکثر گناہوں پر لیکن ہر گناہ پر لعنت نہیں مگر ایسوں پر۔ (موضح القرآن)

پھر کم ازکم ''ایسوں پر'' لعنت میں تمام امت کو متفق ہوجانا چاہیے اور اس کو دشنام نہیں سمجھنا چاہیے۔

اعلان کرنے والا جس کا ذکر قرآن میں ہے ملک تو ہو ہی سکتا ہے جس کے لئے ایک روایت ہے کہ وہ مالک خازن جہنم ہوں گے مگر ایک روایت جو کئی طرق سے وارد ہوئی ہے، یہ بتاتی ہے کہ یہ اعلان کرنے والے اللہ کی طرف سے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہوں گے اور یہ آپ کے ان مناصب میں سے ایک ہے جو آپ کو روز جزاء منجانب اللہ حاصل ہوں گے۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٤٦﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾

''اور ان دونوں کے درمیان ایک حد فاصل ہوگی ''اعراف'' پر کچھ اشخاص ہونگے جو ہر ایک کو اس کی صورت سے

---

[1] نادٰی ای وینادی (مجمع البیان)

[2] یعرضون وقیل معناہ یصرفون غیرھم (مجمع)

[3] یطلبون لها العوج بالشبهة التی یلبسون بها ویوهمون انها تقدح فیها (تبیان)۔

[4] ما وعدکم ربکم من العذاب (جلالین)

پہچانتے ہوں گے اور وہ بہشت والوں کو آواز دیں گے کہ سلام ہو تم پر، وہ اس میں داخل نہیں ہوئے حالانکہ وہ اس کی خواہش رکھتے ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف مڑتی ہیں تو وہ کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم جماعت کے ساتھ قرار نہ دے۔"

اعراف کا ذکر

"ان دونوں" یعنی بہشت و دوزخ کے درمیان [1] ایک پردہ ہے یا حد فاصل ہے یعنی ایک تیسری جگہ ہے جو دونوں کے درمیان ہوگی، اسی کا نام اعراف ہے جس کے نام پر اس سورہ کا نام "اعراف" ہو گیا۔

اعراف کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ وہ بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں ایسے اشخاص کو جگہ دی جائے گی جو دائرہ تکلیف سے خارج ہیں، جن سے نہ جزاء کا وعدہ ہے اور نہ انہیں سزا کا استحقاق ہے یا ایسے لوگ جن کے نیک اور بداعمال کا پلہ برابر ہے۔ [2]

مگر شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں کہ:

"جنت و دوزخ کے درمیان میں ایک دیوار ہوگی، اس کے سرے پر ایک مرد ہیں نجات والے جو حشر اور حساب سے فارغ ہیں، بہشتی اور دوزخی کو نشان سے پہچان کر جنت والوں کو خوشخبری کہیں گے سلامتی کی" (موضح القرآن)

کچھ دوسرے مفسرین کا کلام بھی اس کے موافق ہے [3] اور احادیث اہل بیت علیہم السلام میں جن کی تائید بعض روایات اہل سنت سے ہوتی ہے، یہ وارد ہوا ہے کہ یہ ہستیاں آل محمد علیہم السلام کی ہیں جو مومن اور کافر میں تمیز دے رہی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں جناب امیر علیہ السلام کا لقب: "قسیم الجنة والنار" بہشت اور دوزخ کے تقسیم کرنے والے" کتب فریقین میں مسلم ہے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اہل بہشت کا سلام سلام علیکم ہے، السلام علیکم نہیں ہے جس کا ایک فریق پابند ہو گیا ہے اگرچہ درست وہ بھی ہے مگر آخر سلام علیکم کے جملہ سے پرہیز کی کیا بنیاد ہو سکتی ہے؟

جناب شیخ طوسیؒ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو حدیث درج کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعراف والی بلندی پر جہاں سے جنت اور دوزخ دونوں زیر نظر ہوتے ہیں، معصومین علیہم السلام اہل ایمان کی اس جماعت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہوں گے جن کی بداعمالیاں ابھی تک دخول جنت سے سدراہ رہی ہیں [4] یہ جماعت وہ ہے جو اہل جنت کو بہشت میں جاتے دیکھ کر انہیں سلام کرتی ہے اور خود یہ لوگ اس کے امیدوار ہیں کہ یہی معصومینؑ جنہیں وہ گھیرے ہوئے ہیں، ان کی شفاعت کریں تو ان کے لئے بھی بہشت میں داخلہ کا حکم ہو جائے اور یہی وہ ہیں کہ جب ان کی نگاہ اہل دوزخ پر پڑتی ہے تو وہ اپنے پروردگار سے پناہ طلب کرتے ہیں کہ پروردگارا! ہمیں اس جماعت کے ساتھ قرار نہ دینا۔

---

[1] درمیان بہشت و دوزخ حجابیست (شاہ ولی اللہ)

[2] رجال استوت حسناتہم وسیأتہم کما فی الحدیث (جلالین)

[3] حجاب حاجز قیل ہو سورۃ الاعراف وعلی الاعراف وہو سور الجنۃ (جلالین)

[4] کما یوقف قائد الجیش مع الضعفاء من جندہ (تبیان)

ہماری قدیم تفسیر میں معصومؑ کی زبانی جو حدیث ہے، وہ بھی قریب یہی ہے۔[1]

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ۝۴۸ اَهٰۤؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۝۴۹

''اور آواز دیں گے اعراف والے کچھ لوگوں کو جنہیں وہ ان کی صورت سے پہچانتے ہوں گے کہ تمہیں تمہاری جمع آوری اور اس گھمنڈ نے جو تم رکھتے تھے[2] کچھ فائدہ نہ دیا کیا یہی وہ ہیں جن کے لئے تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ ان تک اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا تم داخل ہو بہشت میں، نہ تم پر خوف ہے اور نہ تم کسی رنج وغم سے دو چار ہو گے۔''

معانی، بیان کی اصطلاح میں یہ انداز کہ کسی جماعت کا پہلے بطور غائب ذکر ہو اور پھر اسی کو صیغۂ حاضر کے ساتھ مخاطب بنا لے ''التفات من الغيبة الى الخطاب'' کہلاتا ہے۔ یہاں اہل اعراف کی آواز میں پہلا تخاطب اہل دوزخ سے ہوا اور اس میں اہل بہشت کا ذکر صیغۂ غائب کے ساتھ اس طرح ہے کہ:

''کیا یہی وہ ہیں جن کے لئے تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ ان تک اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا۔'' اس طرح اہل دوزخ کو شرمندہ اور ان کے سابق مزعومات کو یاد دلا کر پشیمان کرتے ہوئے آخر میں تخاطب اہل بہشت کے ساتھ ہو گیا کہ یہ تو ان کے مزعومات تھے جو غلط ثابت ہو چکے۔ اب تم جاؤ اور شوق سے بہشت میں داخل ہو۔[3] اگر پہلے تخاطب کے ساتھ اس تخاطب کو دیکھا جائے تو یہ ایک نئی قسم التفات ہو گی یعنی التفات من الخطاب الى الخطاب، جس میں انداز کلام کی تبدیلی مخاطب کے بدلنے سے ہوتی ہے یعنی ایک شخص یا جماعت سے خطاب کرتے کرتے ایک دم تخاطب دوسرے سے ہونے لگے۔ یہ بھی فصحائے کلام میں ہر زبان میں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ معانی بیان کی کتابوں میں ''التفات'' کے اقسام میں اس قسم کا ذکر نہیں۔ اور غالباً اسی وجہ سے اکثر مفسرین نے اس جملہ کو کہ ''اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ'' سلسلہ کے ساتھ اہل اعراف کی آواز کا جزء قرار دینے میں زحمت محسوس کی ہے اور انہوں نے اس میں یہ ٹکڑا مقدر (ذہن میں پوشیدہ) قرار دیا ہے کہ ''ان سے کہا گیا کہ'' تم جنت میں داخل ہو۔[4]

---

[1] عن ابی عبداللہ قال: الاعراف كثبان بين الجنة والنار والرجال الائمة صلوٰت الله عليهم يقفون على الاعراف مع شيعتهم فيقول الائمة لشيعتهم من اصحاب الذنوب الخ (علی بن ابراهيم)

[2] جمعكم الاموال والعدد فی الدنيا (مجمع البيان) جمعیت شما وآنکه سرکشی می کردید (ولی اللہ)

[3] ثم يقولون لهٰؤلاء (مجمع البيان)

[4] قد قيل لهم ادخلوا الجنة (جلالين) گفته شد ایشان را که در آئید به بهشت (شاہ ولی اللہ) کہا گیا ان کو بہشت میں داخل ہو (شاہ رفیع الدین)

مگر ہمارے نزدیک اس تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہمارے قول کے لئے سند کافی ہے [1]

قرآن مجید کے معجزانہ انداز کے اسلوب بیان سے اس مقام پر اور اس مطلب کو دیکھتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے تو جیسے ایک منظر اس وقت کا مجسم شکل میں یہ آتا ہے کہ کامل الایمان اور نیک اعمال لوگ جنت میں جارہے ہیں اور یہ ہستیاں جو بیچ میں کھڑی ہوئی ادھر ادھر کا معائنہ کر رہی ہیں ان جنت کی طرف جانے والوں کے بارے میں اہل دوزخ کو مخاطب کر کے ان کے دنیاوی دور حیات کے تشنیعات کو یاد دلا کر تازیانہ لگا رہی ہیں کہ دیکھو! یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تم کہتے تھے کہ انجام ان کا خراب ہے دیکھو آج وہ کس طرح بلا توقف بہشت عنبر سرشت کی طف جارہے ہیں۔ بس اب جیسے ان کے یہ الفاظ ان بہشت کی طرف جانے والوں کے کان میں گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ہمارا کچھ ذکر ہے تو وہ ٹھٹک گئے اور مڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ کون ہیں جو ہمارے لئے یہ فرمارہے ہیں۔ ان کا یہ رکنا اور مڑ کر دیکھنا ان الفاظ کی کہنے والی ہستیوں نے دیکھ لیا اور انہیں مخاطب کر کے کہا ''اے تم کیوں رکتے ہو......؟ یہ تو ہم ادھر والوں سے کہہ رہے ہیں، تم اپنی راہ جاؤ، اس جنت میں داخل ہو جو گویا تمہاری منتظر ہے اور اب اطمینان رکھو کہ اس میں داخل ہونے کے بعد نہ تمہیں کسی خوف کا سامنا ہوگا اور نہ حزن وملال درپیش ہوگا۔ یہ جیسے ان کی ماضی کی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے تو حق کی راہ میں عمر بھر خوف اور حزن کی زندگی گزاری، اس کے صلہ میں اب یہ جنت تمہیں مبارک جس میں خوف اور حزن کا گزر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ انداز گفتگو بتارہا ہے کہ یہ افراد داور محشر کے نمائندہ ہیں اور یہیں پر جو کھڑے ہیں، وہ اس کارخانہ عدل ومجازاۃ کے ایک کارندہ کی حیثیت سے جن کے قصور ان کی آمد کے لئے آغوش کشادہ ہیں مگر انہیں ابھی اپنے کار ہائے منصبی سے فرصت نہیں ہے کہ وہ جاکر اپنے قصور میں متمکن ہوں۔

وَنَادٰٓى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۝٥٠ الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ لَهۡوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ۚ فَالۡيَوۡمَ نَنۡسٰٮهُمۡ كَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ يَوۡمِهِمۡ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ۝٥١

''اور آواز دیں گے دوزخ والے بہشت والوں کو، ڈال دو ہماری طرف بھی [2] تھوڑا سا پانی یا اور جو تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے وہ کہیں گے کہ اللہ نے ان دونوں چیزوں کو حرام کیا ہے کافروں پر، وہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنالیا اور جنہیں زندگانی دنیا نے فریفتہ رکھا۔ اب آج ہم انہیں بھلاوے میں ڈالیں گے اسی طرح جیسے وہ اپنے اس دور کے سامنے آنے کو بھولے رہے اور جیسے وہ ہماری آیتوں کو برابر جھٹلاتے رہے۔''

دوسری آیت کے آخر میں یہ الفاظ کہ ''ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے'' یہ بتلاتے ہیں کہ اہل بہشت کا جواب اس پر ختم ہو گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ''اللہ نے ان دونوں چیزوں کو حرام کیا ہے کافروں پر۔'' اور اس کے بعد یہاں سے کہ: الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ

[1] ۔ اضطربت اقوال المفسرین فی القائل لهذا القول... والصحیح ماذکرناه لانه المروی عن الصادق علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔ الافاضة اجراء المائع من علو (مجمع البیان) بریزید برما (شاہ ولی اللہ) ڈالو اوپر ہمارے (شاہ رفیع الدین)

لَهْوًا وَّلَعِبًا ''جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنالیا'' یہ خود خالق کا ارشاد ہے[1] اور اسی لئے "ننساھم" کے معنی ہم نے نہ بھولنے کے نہیں بلکہ بھلاوے میں ڈالنے کے درج کئے ہیں کیونکہ بھولنے کی نسبت خالق کی طرف درست نہیں ہے۔[2]

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾

''اور ہم ان کے پاس لائے ہیں ایک ایسی کتاب جسے پورے علم کے ساتھ ہم نے تفصیلی بیانات کا حامل بنایا ہے، سراسر رہنمائی اور رحمت قرار دیتے ہوئے[3] ان کے لئے جو ایمان لائیں۔''

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٥٣﴾

''کیا انتظار ہے انہیں سوا اس کے کہ اس کا انجام[4] ان کے سامنے آئے؟ جس دن اس کا انجام آئے گا تو وہ جنہوں نے اس کو پہلے بھلایا ہوگا کہیں گے کہ بے شک ہمارے پروردگار کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کے ساتھ آئے تھے تو کیا اب ہمارے کچھ سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کریں یا ہم واپس کئے جائیں تو اب ایسے اعمال کریں جو پہلے اعمال سے مختلف ہوں، بلاشبہ انہوں نے اپنے کو گھاٹے میں مبتلا کیا ہے اور اب غائب ہو گئے ہیں ان سے وہ سب جو یہ بہتان باندھا کرتے تھے۔''

''اس کا انجام'' یعنی جو عذاب آخر میں ان کے لئے مقدر ہے۔ اس کا شعوری طور پر تو انتظار کافروں کو نہیں ہے کیونکہ وہ اسے مانتے ہی نہیں بلکہ مومنین حقیقت میں اس کا انتظار رکھتے ہیں مگر چونکہ وہ ایمان لانے میں دیر کر رہے ہیں تو ان کی سرزنش کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ ابھی جب موقع ایمان لانے کا ہے وہ ایمان نہیں لاتے تو کیا اس وقت کا انتظار ہے جب عذاب آ ہی جائے اور پھر موقع ایمان لانے کا باقی ہی نہ رہے[5] ایک تصور یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ نہیں، انتظار واقعی ان کو تھا چونکہ انہیں پیغمبر ﷺ کے اطلاع دینے سے دل کے اندر ایک تذبذب کی کیفیت تو کم سے کم

---

[1]۔ یحتمل ان یکون رفعا بالابتداء ویکون اخبار امن اللہ تعالیٰ علیٰ وجه الذم (تبیان)

[2]۔ ننساھم نترکھم فی النار (جلالین) فراموش کردن خدا ترک ایشان است در دوزخ (فتح الرحمن)

[3]۔ ھدیٰ حال من الھاء (جلالین) یجوز ان یکون حالا ویجوز ان یکون مفعولا له (مجمع البیان)

[4]۔ عاقبة مافیه (جلالین) مصداق ایں وعدہ (شاہ ولی اللہ)

[5]۔ انما اضاف الیھم مجاز الانھم کانوا جاحدین لذٰلك غیر متوقعین وانما کان ینتظر بھم المؤمنون (تبیان)

پیدا ہوتی ہی تھی تو وہ راستہ دیکھتے تھے کہ دیکھیں ان کی دی ہوئی ان خبروں کا انجام کیا ہوتا ہے؟[1]

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

”یقیناً تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پھر عرش کی جانب توجہ فرمائی وہ رات کا پردہ ڈالتا ہے دن پر کہ اسے تیزی کے ساتھ جا پکڑتی ہے[2] اور سورج اور چاند اور ستاروں کو قرار دیا ہے ایسا کہ وہ اس کے حکم کے پابند ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے مخصوص ہے پیدا کرنا بھی اور حاکم ہونا بھی[3] بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

رات کا پردہ دن پر ڈالنے سے بظاہر ہر روز کا یہ مشاہدہ مراد ہے کہ ابھی سب چیزیں آنکھوں سے دکھلائی دے رہی ہیں اور ایک دم رات آ کر سب چیزوں کو نظروں سے چھپا دیتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رات کا لشکر تیزی کے ساتھ آ کر دن کو گرفتار کر لیتا ہے اور بعض مفسرین نے اس سے مراد یہ قرار دیا ہے کہ رات کا پردہ دن پر پڑتا ہے یعنی جاڑوں میں رات بڑھ جاتی ہے اور دن کے کچھ گھنٹے رات میں داخل ہو جاتے ہیں۔[4] مگر یہ بات تو دونوں طرف ہے یعنی گرمیوں میں دن آ کر رات پر چھا تا ہے اسی لئے جہاں اس کا ذکر ہوا ہے وہاں دونوں چیزوں کا اس طرح کہ: يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ مگر یہاں دوسری بات کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس ضرورت سے بعض مفسرین نے ان الفاظ سے دونوں پہلو نکالنا چاہے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر ڈھانپتا ہے“[5] لیکن وہاں تو اللیل مفعول اول اور النہار مفعول دوم ہے۔ جس سے مراد رات کا دن پر چھانا ہی نکلے گا، دوسرے کا چھانا اس پر نکل نہیں سکتا، ورنہ استعمال لفظ بوقت واحد دو معنوں میں لازم آئے گا جو قطعاً ممکن نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دوسرے جز کا ذکر بنظر اختصار نہیں ہوا کہ وہ اسی سے سمجھ میں آ جائے گا[6] مگر یہ اختصار یہیں پر کیوں ہوا؟ دوسرے مقامات پر تو ہر جگہ جہاں ایک کا ذکر ہے، دوسرے کا بھی ہے جیسے: يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ”وہ لپیٹتا ہے دن کو رات پر“ یہاں اس طرح کیوں نہیں کہا گیا؟ اس سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہاں وہ مفہوم مراد نہیں ہے۔

---

[1] یعنی کافر راہ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں خبر ہے عذاب کی۔ ہم دیکھ لیں کہ ٹھیک پڑے تب قبول کریں، سو جب ٹھیک پڑے گی تب خلاصی کہاں ملے گی خبر اسی واسطے ہے کہ عذاب سے بچاؤ پکڑیں (موضح القرآن)

[2] یحلل اللیل النہار ای یدخلہ فیہ (تبیان)

[3] اُوراست آفریدن و فرمان روائی (شاہ ولی اللہ)

[4] یعنی گاھی اجزائے شب را بلباس نہار پوشانیدہ در حساب نہار می گرداند از پے در آمدن شب بعد در مشابہ آنست کہ گویا کسی را دوان و شتابان می طلبد (فتح الرحمن)

[5] ای یغطی کلا منہما بالآخر یطلبہ یطلب کل منہما الآخر طالبا حثیثا مریعا (جلالین)

[6] لم یقل: ویغشی النہار اللیل لان الکلام یدل علیہ (مجمع البیان)

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝٥٥

''اپنے پروردگار سے دعا کرو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

آخری فقرہ کا ربط پہلے جملے سے یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں انسان کو سمجھ بوجھ سے کام لینے کی دعوت دی جارہی ہے یعنی دعا کرتے وقت یہ دیکھ لو کہ تم کوئی ناروا اور حد سے بڑھی ہوئی بات تو نہیں مانگ رہے ہو۔[1]

دوسرا مطلب اس کا یہ کہا گیا ہے کہ یہ حد سے تجاوز گڑگڑانے اور چپکے چپکے دعا کرنے کے بالمقابل ہے کہ تم اکڑ کے ساتھ اور بہت اونچی آواز سے دعا مانگو، یہ خدا کو پسند نہیں ہے۔[2]

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝٥٦

''اور دنیا میں اس کے بالکل درست حالت میں ہونے کے بعد خرابیاں نہ پیدا کرو، اور اس سے دعا کرو خوف سے بھی اور امید سے بھی۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک اعمال والوں سے نزدیک ہے۔''

فساد پھیلانے سے ممانعت

بظاہر یہ خطاب مسلمانوں سے اور بالخصوص اسی دور والوں سے ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے دنیا کے حالات درست ہو گئے ہیں[3] اب ایسا نہ کرنا کہ پھر خرابیاں پھیلاؤ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفظ نظام شریعت کے لئے جو انتظام کیا ہے اسے قبول نہ کر کے اپنی من مانی کارروائیاں کرو۔[4]

اور مضرتوں کے خوف اور منافع کی امید میں اللہ سے لو لگانا ضروری ہے مگر یہ یاد رکھو کہ اس کی رحمت تمہارے حسن کردار سے وابستہ ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝٥٧

''اور وہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو مژدہ دیتی ہوئی اس کے بارانِ رحمت کے آگے، یہاں تک کہ جب انہوں نے

---

[1] ای لا تجاوزوا حد الحق فی الدعاء فتطلبوا منازل الانبیاء وما لا یجوز ان یعمل فی الدنیا (تبیان)

[2] وقیل هو الصیاح فی الدعاء (مجمع البیان) انه لا یحب المعتدین فی الدعاء بالتشدق ورفع الصوت (جلالین)

[3] عن ابی حمزة فی هٰذه الاٰیة قال: ان الارض کانت فاسدة فاصلحها الله نبیه صلی الله علیه وآله وسلم (مجمع البیان)

[4] فافسدوا حین ترکوا امیر المؤمنین علیه السلام و ذریته (علی بن ابراهیم)

بوجھل بادلوں کو اٹھایا تو ہم نے انہیں روانہ کر دیا ایک مردہ بستی کی طرف[1] تو برسایا وہاں پانی جس سے نکالے ہر طرح کے پھل اسی طرح ہم مردوں کو (جلا کر) باہر نکالیں گے[2] شاید کہ تم ہدایتوں کا اثر قبول کرو۔"

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

"اور جو اچھی پاکیزہ سرزمین ہوتی ہے، اس کے نباتات[3] خوب نکلتے ہیں اللہ کے حکم سے اور جو خراب ہوتی ہے، اس میں نہیں نکلتی مگر بری گھانس۔ یوں ہم طرح طرح سے حقیقتیں پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہوں۔"

پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ

مطلب یہ ہے کہ نصیحتیں اچھے دلوں میں اثر کرتی ہیں اور جو بدنہاد ہیں، ان میں ان کا اثر خراب ہی پڑتا ہے، اچھا نہیں پڑتا۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"ایں مثل است برای تاثیر پند در قلب سلیم و عدم تاثیر آن در غیر سلیم" (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"ستھرے استعداد والے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد خراب تھی، ان کو فائدہ پہنچ رہا تھوڑا سا" (موضح القرآن)

اگر اس قرآنی انتباہ کو سامنے رکھا جائے تو پیغمبر خدا ﷺ کی صحبت کے سب بیٹھنے والوں کو ایک ہی مرتبۂ بلند پر نہ سمجھا جائے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

"بلاشبہ ہم نے نوحؑ کو بھیجا ان کی قوم کی جانب، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، یقیناً مجھے تمہارے اوپر بڑے سخت دن کی سزا کا اندیشہ ہے، ان کی قوم کے ممتاز لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ ہم تم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! مجھ میں کوئی گمراہی تو ہے

---

[1] البلد المیت ھو الذی اندرست مشاربه وتعفت مزارعه (تبیان)

[2] کذٰلك الاخراج نخرج الموتی من قبورھم بالاحیاء (جلالین)

[3] ای زروعه (مجمع البیان)

نہیں بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

جناب نوح علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ

ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو تعلیم دینا اور جواباً ان کے رویہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾

"اور کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس وعظ و نصیحت کا پیغام تمہارے پروردگار کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر آیا ہے تاکہ وہ تمہیں عذاب کا خوف دلائے اور اس لئے کہ تم پرہیزگاری اختیار کرو اور شاید رحمت تمہارے شامل حال ہو۔"

ذکر اور تذکرہ کے الفاظ دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں ایسے ہی انداز سے آئے ہیں کہ اس سے وعظ و نصیحت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اس لئے یہاں بھی ہم نے ترجمہ یہی کیا ہے جو بعض تفاسیر میں بھی موجود ہے[1]

لیکن بعض مفسرین نے اس کے معنی وضاحت اور بیان کے لئے ہیں۔[2]

جناب شیخ الطائفہ نے فرمایا ہے کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں: ذکر بیان اور ذکر برہان۔ پہلے کے معنی ہیں کسی بات کا ذہن نشین کرنا۔ دوسرے کے معنی ہیں کسی چیز کو حد ثبوت تک پہنچانا۔ یہاں ذکر میں دونوں معنی کا احتمال ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿٦٤﴾

"تو ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا جس کے نتیجہ میں ہم نے انہیں اور ان کو جو کشتی میں ان کے ساتھ تھے، نجات دی اور ان کو جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ہم نے ڈبو دیا، بلاشبہ وہ بے بصیرت لوگ تھے۔"[3]

طوفان نوح علیہ السلام کا اجمالی تذکرہ قرآن میں سب سے پہلے یہیں پر ہوا ہے۔

قرآن سے پتہ نہیں چلتا کہ اس طوفان کی وسعت کتنی تھی؟ بس یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنہوں نے جناب نوحؑ کی تکذیب کی تھی، وہ سب

---

[1] ذکر وموعظۃ (جلالین)

[2] بیان (مجمع البیان)

[3] یقال رجل عم اذا کان اعمی القلب ورجل اعمی فی البصر (مجمع البیان)

غرق ہو گئے[1] اور جو ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ گئے تھے، وہ نجات پا گئے۔
کشتی اور اس کے بنائے جانے اور اس سے متعلقہ تفصیلات قرآن مجید کی آیتوں میں متفرق مقامات پر اس کے بعد ہیں جن کا بیان انشاءاللہ آئے گا۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾

"اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، تمہارا اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے تو تم آخر پرہیزگاری کیوں اختیار نہیں کرتے؟ ان کی قوم کے ان ممتاز آدمیوں نے جو کافر تھے ، کہا کہ یقیناً ہم تمہیں حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور بلاشبہ ہم تمہیں جھوٹوں میں خیال کرتے ہیں۔ کہا اے میری قوم والو! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا ایماندار خیرخواہ ہوں۔"

جناب ہود علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام:

اس کے پہلے آچکا ہے: لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا "ہم نے نوح کو بھیجا"۔ یہ ہودؑ کا ذکر اسی سلسلہ میں ہے یعنی اور قبیلۂ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔[2]
جب ایک ہی واقعہ کی تفصیل سے کلام میں طول ہوا ہو تو یہ فاصلہ معطوف علیہ اور معطوف کے باہمی تعلق میں حارج نہیں ہوتا۔[3]

أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾

"اور کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس نصیحت آئی تمہارے پروردگار کی طرف سے تم ہی میں سے ایک آدمی

---

[1] اغرقنا الذین کذبوا بآیاتنا بالطوفان (جلالین)
[2] عطف سبحانہ علیٰ قصۃ ہود (مجمع البیان)
[3] انتصب قولہ "اخاھم ھودا" بقولہ: ارسلنا، فی اول الکلام وان تطاول بینھما لان تفصیل القصص یقتضی ذلک (تبیان)

پر تا کہ وہ تمہیں متنبہ کرے اور یاد کرو جب اس نے تمہیں نوحؑ کی قوم کے بعد ان کی جگہ صاحب اقتدار بنایا[1] اور تمہیں پیدائشی طور پر طاقت اور قد و قامت میں زیادتی عطا کی تو اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو شاید تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔''

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾

''انہوں نے کہا کیا تم ہماری طرف آئے ہو اس لئے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور جس جس چیز کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے، اسے چھوڑ دیں تو لاؤ وہ ہمارے پاس وہ جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو، اگر تم سچے ہو۔''

تمام انبیاء کے تذکروں سے ظاہر ہے کہ پیغام سب کا بالکل ایک تھا اور ان کے مقابلہ میں جو جو کہا جاتا تھا، وہ سب بھی تقریباً ایک ہی رہا۔ پیغام ایک اکیلے اللہ کی عبادت کا اور اس کے مقابلہ میں دنیا کو اللہ کی عبادت میں اتنا عذر نہ تھا جتنا اسے اکیلا ماننے میں یعنی غیر اللہ کی عبادت کا چھوڑنا ان کیلئے بڑی زحمت کا باعث تھا اور وجہ اس کی تقلید آباء تھی۔

ان ہی منزلوں سے نوح علیہ السلام کو گزرنا پڑا۔ انہی سے ہود علیہ السلام و صالح علیہ السلام کو اور یہی سب کچھ آخر میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں نظر آتا ہے۔

اور اس لئے آپ کی تسلی اور سچے مسلمانوں کے سکون قلب کے لئے گزشتہ انبیاء کے یکے بعد دیگرے واقعات دہرائے جاتے ہیں کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے، یہ کوئی نیا امر نہیں ہے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

''انہوں نے کہا کہ تم لوگوں پر تمہارے پروردگار کی طرف سے عذاب[2] اور غضب نازل ہو گیا ہے، کیا تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو ایسے ناموں کے بارے میں جو خود تم نے اور تمہارے باپ دادا نے تجویز کر لئے ہیں[3] جن کے متعلق اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اچھا تو پھر انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

---

[1] جعلکم سکان الارض من بعد قوم نوح (مجمع البیان)
[2] الرجس العذاب (تبیان)
[3] یعنی بے اصل است (فتح الرحمن)

"نام تجویز کر لئے ہیں۔" یعنی انہیں تم دل بخواہ خدا یا دیوتا وغیرہ سے موسوم کرتے ہو یا مختلف طرح کے تدبیرات سماوی وارضی سے انہیں نسبت دے رکھی ہے، مثلاً فلاں بارش کا دیوتا ہے اور فلاں دولت کی دیوی ہے وغیرہ وغیرہ۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴿۷۲﴾

"تو بچا دیا ہم نے انہیں اور ان کے ساتھ والوں کو اپنی رحمت سے اور رگ و ریشہ اکھاڑ ڈالا[۱] ہم نے ان کا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔"

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴿۷۳﴾

"اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو، اللہ کی نہیں ہے اس کے سوا تمہارا کوئی خدا، تمہارے پاس آیا ہے ایک خاص معجزہ تمہارے پروردگار کی طرف سے[۲] یہ اللہ کی طرف کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے ایک قدرتی نشانی ہے تو اسے چھوڑ دو کہ کھاتی رہے اللہ کی زمین میں اور اسے ذرا بھی تکلیف نہ پہنچانا، نہیں تو تمہیں دردناک عذاب اپنی گرفت میں لے لے گا۔"

جناب صالح علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام

ان آیات میں حضرت صالح علیہ السلام کا اپنی قوم کو تعلیم دینا اور جواباً ان کے رویہ اور انجام کو ذکر کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴿۷۴﴾

"اور یاد کرو وہ وقت کہ جب اس نے تمہیں قوم عاد کے بعد ان کی جگہ صاحب اقتدار بنایا اور تمہیں زمین میں رہنے کا ٹھکانہ دیا کہ تم اس کے نرم و ہموار حصوں میں بھی محلات بناتے اور پہاڑوں کو بھی تراش کر گھر بناتے ہو، تو یاد رکھو اللہ کی نعمتوں کو اور زمین میں خرابیاں پھیلاتے نہ پھرو۔"

---

[۱] ای استأصلناهم (جلالین)

[۲] بینة معجزة من ربکم (جلالین) ای دلالة معجزة شاهدة علیٰ صدق (مجمع البیان)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

”ان کی قوم کے ممتاز آدمیوں نے جو گھمنڈ رکھتے تھے، ان لوگوں سے جو دبے پسے ہوئے تھے، ان سے کہ جو ان میں سے ایمان لائے تھے [1] کہا کیا تم جانتے ہو کہ صالحؑ واقعی اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟ انہوں نے کہا بے شک ہم اس پر جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں اس پر انہوں نے جو گھمنڈ رکھتے تھے کہا کہ جس پر تم ایمان لائے ہم اس کے ساتھ کفر رکھتے ہیں۔“

کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اس لئے جو کسی دین کے عقائد کو نہ مانیں گے، وہ فخر سے کہیں گے کہ ہم اس کے کافر ہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کا غیر مسلموں کو کافر کہنا کوئی ”دشنام“ نہیں بلکہ ایک واقعیت کا اظہار ہے جسے وہ خود تسلیم کرنے پر مجبور رہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۷۹﴾

”آخر انہوں نے اس اونٹنی کو پے کر ڈالا [2] اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی اور کہا اے صالح! لاؤ ہمارے پاس وہ جس کی ہمیں تم دھمکی دیتے رہے ہو [3] اگر تم پیغمبروں میں سے ہو۔ نتیجہ میں ان کو زلزلہ نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ اپنے گھروں میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے تو انہوں نے ان لوگوں سے روگردانی اختیار کی اور کہا اے میری قوم والو! میں نے تمہیں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہارے لئے خیر خواہی سے کام لیا مگر تم خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔“

مضمون کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری آیت یعنی ”فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ ۔۔۔“ الخ انہوں نے ان لوگوں سے روگردانی اختیار کی اور یہ کہا اس عذاب کے آنے اور ان کے ہلاک ہونے کے تذکرہ سے قبل کی ہے اور چونکہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے ایسا ہونا کوئی عجیب امر نہیں ہے۔

---

[1] ۔بدل مما قبله باعادة الجار (جلالین) وهو بدل البعض من الكل الا انه اعيد فيه حرف الجر (تبیان)

[2] ۔ای فنحروا الناقة (مجمع البیان)

[3] ۔فائتنا الان بالعذاب الذی خوفتنا عنه (تبیان)

بعض لوگوں نے اس آیت کو بعد ہی میں مانا ہے اور یہ توجیہہ کی ہے کہ ان کی ہلاکت کے بعد یہ تخاطب ویسا ہے جیسے آدمی غصہ یا رنج میں اپنے تاثرات کو بطور خود ہی اس طرح ظاہر کیا کرتا ہے جس میں دوسروں کے لئے عبرت کا سامان ہوتا ہے۔[1]

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾

''اور لوطؑ کو جب کہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ کیا تم ایسی شرمناک بدکاری[2] کے مرتکب ہوتے ہو جس کا تمہارے پہلے دنیا جہان میں کوئی مرتکب نہیں ہوا۔ ارے تم لوگ نفسانی جذبہ سے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رخ کرتے ہو! تم بڑے حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔''

جناب لوط علیہ السلام کی تعلیم، قوم لوط کی بدکاری اور اس کا انجام

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنسی بے راہ روی میں التذاذ بالمثل کا گناہ قوم لوط کے پہلے دنیا میں ناپید تھا۔ اسی لئے شاید عرف عام میں اس عمل کے مرتکب کا نام ہی لوط کے لفظ کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٨٤﴾

''اور نہ تھا ان کی قوم والوں کا جواب سوا اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو انہیں اپنی بستی سے۔ یہ ایسے اشخاص ہیں جو اپنے کو آلودہ ہونے سے بچاتے ہیں[3] تو ہم نے نجات دی انہیں اور ان کے گھر والوں کو سوا ان کی بیوی کے کہ وہ تھی رہ جانے والوں میں[4] اور ہم نے ان پر ایک خاص طرح کی بارش کی، تو دیکھو کیسا انجام ہوا ان گنہگاروں کا۔''

''ایک خاص طرح کی بارش'' یعنی پتھروں کا مینہ، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں صاف ارشاد ہوا ہے: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ: ہم نے ان پر سخت مٹی کے پتھروں کی بارش کی۔ (حجر: ۷۴)

---

[1]۔ انما جاز ان يناديهم مع كونهم جاثمين موتى لما في تذكر ما اصارهم الى تلك الحال ... من الحكمة والموعظة الحسنة (تبيان)

[2]۔ اى السيئة العظيمة القبح (مجمع البيان)

[3]۔ يتحرجون عن ادبار الرجال (مجمع البيان)

[4]۔ اى من الباقين فى قومه المتخلفين عن لوط (مجمع)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ۚ

''اور مدین[۱] کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو۔ انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی، تمہارا اس سے سوا کوئی خدا نہیں، تمہارے پاس آتی ہے کھلی ہوئی دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے تو تم ناپ تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو[۲] اور دنیا میں اس کی درستی کے بعد خرابی نہ پھیلاؤ۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

جناب شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ

ان آیات سے جناب شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دینا اور جواباً ان کی قوم کے رویہ کو بیان کیا جارہا ہے۔

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور نہ بیٹھو ہر راستے پر اس طرح کہ دھمکاتے ہو اور روکتے ہو اللہ کی راہ سے اس کو جو اس پر ایمان لائے اور اس (راہ) کو کج کرنے کے درپے ہوتے ہو اور یاد کرو اس وقت کہ جب تم کم تھے تو اس نے تمہیں زیادہ کیا اور دیکھو کہ کیسا ہوتا رہا ہے انجام خرابیاں کرنے والوں کا۔''

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور اگر تم میں کے ایک گروہ نے ایمان اختیار کیا اس پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ نے ایمان قبول نہیں کیا تو پھر صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ سب ہی ایمان لے آئیں۔ اب ایسا نہیں ہوا تو نتیجہ میں لازماً ایک گروہ وہ ہوگا جو نجات پائے گا اور ایک گروہ ہلاک

---

[۱] ۔ اسم المدینۃ او القبلۃ (مجمع البیان)

[۲] ۔ النجس النقص عن الحق الذی یوجبہ الحق (تبیان)

ہوگا مگر اس کا فیصلہ آنکھوں کے سامنے آج نہیں آئے گا بعد میں ہوگا۔[1]

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾

’’کہا ان کی قوم کے ان بڑے آدمیوں نے جو گھمنڈ کئے ہوئے تھے کہ ہم نکال دیں گے اے شعیبؑ! تم کو اور انہیں جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے یا تم لوگ واپس آ ؤ ہمارے مذہب میں۔ کہا کیا چاہے ہم اسے ناپسند کرتے ہوں۔ ہم اللہ پر جھوٹ بہتان لگائیں گے اگر واپس آئیں تمہارے مذہب میں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے چھٹکارا دے دیا ہے ہمارے لئے زیبا نہیں کہ ہم اس میں واپس جائیں سوا اس صورت کے کہ ہمارے پروردگار کو یہی منظور ہو۔ ہمارا پروردگار حاوی ہے ہر شے پر علم سے، اللہ ہی پر ہم بھروسہ رکھتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! تو ہی فیصلہ کردے ہمارے درمیان اور ہماری قوم والوں کے درمیان حق کے ساتھ اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔‘‘

قوم شعیبؑ کا رویہ اور انجام

یہ کہنا ان کا کہ ’’تم لوگ واپس آ ؤ‘‘ اور اس کے جواب میں بھی ’’واپس آنے‘‘ کا ذکر ان ساتھ والوں کی اکثریت کے لحاظ سے ہے جو پہلے اس گمراہ جماعت سے وابستہ تھے اور پھر ان سے نکل کر شعیبؑ کے ساتھ آئے تھے، یہ فرداً فرداً ہر ایک کے لئے نہیں ہے کیونکہ کوئی نبی خود کبھی اس جماعت کی گمراہی میں شریک نہیں ہوتا جس کی ہدایت کے لئے وہ آتا ہے۔[2]

ہاں! یہ بھی پہلو ہوسکتا ہے کہ اعلان رسالت کے پہلے قوم کا تصور یہی ہوتا ہے کہ یہ ہم ہی میں سے ہیں۔ وہ تو جب اعلان حق کرتا ہے، تب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہم سے الگ ہے تو ان کا کہنا اور اس کا جواب دونوں میں واپسی کا لفظ ان کے عام تصور کے لحاظ سے ہو جو ظاہر کی بنا پر قائم تھا۔[3]

---

[1] بانجاء المحق اهلاك المبطل (جلالين)

[2] غلبوا فی الخطاب الجمع علی الواحدلان شعيبا لم يكن فی ملتهم قط (جلالين)

[3] لانه كان عندهم فی ظنهم انه كان قبل ذلك علىٰ دينهم (مجمع البيان)

یہ کہ اللہ کو منظور ہو یعنی اس کی توفیق ہمارا ساتھ چھوڑ دے اور ہم اپنے سوء اختیار سے گمراہی میں مبتلا ہو جائیں [۱] جس پر مورد الزام ہم ہی ہوں گے۔ نہ یہ کہ وہ جبراً کسی کو برے راستے پر لگاتا ہے۔

اور یہ "تعلیق المحال بالمحال" کے طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کا کسی کے لئے بھی شرک کو چاہنا غیر ممکن ہے تو ہمارا داخل ہونا بھی تمہاری ملت میں ناممکن شے ہے۔ [۲]

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۝۹۰ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۝۹۱ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ۝۹۲ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۝۹۳

"اور ان کی قوم کے ان بڑے آدمیوں نے جو کافر تھے، کہا کہ اگر تم لوگ شعیب کے پیچھے چلو گے تو یقیناً تم لوگ گھاٹے میں رہو گے تو انہیں زلزلہ نے لے لیا جس کے بعد وہ اپنے گھروں میں مردہ ہو کر اپنے گھٹنوں کے بل گرے ہوئے پڑے تھے جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ گویا کبھی ان مکانات میں رہتے ہی نہ تھے [۳] جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا، وہی گھاٹا اٹھانے والے ثابت ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم والو! میں نے تو تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا لیکن ایک ایسی جماعت پر جو انکار پر قائم رہی افسوس بھی کیوں کر کروں۔"

بڑے آدمیوں کا یہ قول جو یہاں کی پہلی آیت میں بیان ہوا ہے وہ شعیب علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو چھوڑ کر دوسرے عوام سے ہے جن کے لئے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بھی شعیب علیہ السلام کے دین کو اختیار نہ کر لیں۔

آخر کا جملہ خالق کی طرف سے ان بڑے آدمیوں کی بات کا جواب ہے۔

وہ کہتے تھے کہ تم شعیبؑ کی پیروی کرو گے تو خسارہ میں رہو گے تو کہا جا رہا ہے کہ اب دنیا دیکھے خسارہ میں کون رہا؟ [۴]

اور یہاں ضمیر لانے کے بجائے کہ "وہ خسارے میں رہے" پھر اس فقرہ کو کہ "جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا" دہرا دیا گیا، اس پر زور دینے کے لئے کہ شعیبؑ پر ایمان لانا تو خسارہ کا باعث نہیں ہوا، ہاں ان کو جھٹلانا ہی وہ تھا جس کے نتیجہ میں انتہائی خسارہ سب کی آنکھوں کے

---

[۱] یشآء اللہ ربنا ذٰلک فیخذلنا (جلالین)

[۲] کما لا یشآء اللہ عبادۃ الاصنام والقبائح لان ذٰلک لا یلیق بحکمۃ فکذٰلک لا اعود فی ملتکم (تبیان)

[۳] لم یغنوا لم یقیموا فیھا فی دیارھم (جلالین)

[۴] بین سبحانہ انھم الخاسرون دون من اٰمن بہ (مجمع البیان)

سامنے ہے۔ [1]

پورے واقعہ کے ذکر کے بعد، روگردانی کرنے اور پھر اس قوم سے تخاطب کا عنوان وہی ہے جو پہلے آچکا ہے اور اس پر تبصرہ وہاں کیا جا چکا ہے یہاں خاص چیز اس تخاطب کے بعد آخر میں یہ جملہ ہے کہ ''میں ایک ایسی جماعت پر جو انکار پر قائم رہی، کیوں کر افسوس کروں'' اس جملہ سے یہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی ہلاکت پر جیسے انسانی ہمدردی کے جذبہ میں یا بشری حیثیت سے اس انس ومحبت کی بنا پر جو اپنی قوم کے ساتھ ہونا چاہیے جناب شعیبؑ کا دل کڑھا مگر خود ہی ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ لوگ اس کے مستحق نہیں کہ ان پر کوئی صدمہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے خود ہی کفر و عناد پر قائم رہ کے اپنی تباہی کا سامان کیا اور اس عذاب کے مستوجب ہوئے۔ [2]

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ۝۹۴ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۝۹۵

''اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے باشندوں کو سختی اور تکلیف کی گرفت میں ضرور ڈالا [3] شاید کہ وہ تضرع وزاری کریں پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی عطا کردی یہاں تک کہ ان کی تعداد خوب بڑھی [4] اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے بزرگوں کو تکلیف اور راحت دونوں ہی پہنچتی رہی ہیں تو ایک دم ہم نے ان کو گرفت میں لے لیا اس عالم میں کہ انہیں اس کا تصور بھی نہ تھا۔''

قرآن مجید اکثر بیان واقعات میں ایسے اجزاء کو جنہیں قبل اور بعد کے ربط سے ذہن خود سوچ سکے الفاظ میں نظر انداز کردیتا ہے چنانچہ سنت الہیہ کا بیان امم کے بارے میں جو کیا گیا ہے، اس میں پہلا جزیہ ہے کہ انبیاء بھیجے گئے۔ اب اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ معلوم ہے کہ قوم کی اکثریت نے ان کی تکذیب کی [5] اور پیغام ربانی کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو اس کے بعد کی یہ بات ہے جو قرآن بتارہا ہے کہ اللہ نے ان کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا۔

یہ سختی اور تکلیف ابھی بغرض اصلاح ہے کہ وہ اس طرح شاید اللہ سے لو لگائیں اور اپنی اصلاح کریں [6] مگر اس کے بعد بھی صورت کیا ظاہر ہوئی؟ وہ الفاظ قرآنی میں درج نہیں ہے۔ خود سمجھئے کہ ان میں سے اکثر اس کے بعد بھی متنبہ نہیں ہوئے اور وہ اپنے کفر وعصیان پر قائم رہے تو اب وہ سختی اور تکلیف دور کردی گئی جسے قرآن بتارہا ہے۔

---

[1] اعید ذکر "الذین" صفة ثانیة من غیر کنایة لتغلیظ الامر فی تکذیبهم شعیبا (تبیان)

[2] قال ابن اسحٰق عزّی نفسه عنهم بعد ان کان حزن علیهم (تبیان)

[3] گرفتار کردیم اهل آن را بسختی ورنج (شاہ ولی اللہ)

[4] یہاں تک کہ زیادہ ہوئے (شاہ رفیع الدین)

[5] فلم یؤمنوا به بعد قیام الحجة علیهم (مجمع البیان)

[6] لیتنبهوا ویعلموا انه مقدمة العذاب (مجمع البیان)

یہ تکلیف دور کیوں ہوئی؟ اس وجہ سے کہ جو مقصد اس کا تھا وہ جن میں پورا ہونا تھا ان میں پورا ہو چکا اور وہ جماعت زیادہ تر اقلیت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اکثریت کے بارے میں اس مقصد کا حصول ہونے والا نہیں ہے تو اب ان کے لئے راحت و آرام کی فروانی ہو گئی جواب ان کے لئے بطور امہال ہے جس کے نتیجہ میں وہ خوب معاصی الٰہی کے میدان میں کھل کھیلیں گے، حالانکہ اگر ان میں شعور ایمانی ہوتا تو اب اس راحت و آرام سے اللہ کے شکر کی طرف مائل ہوتے مگر انہیں تو عظمتِ الٰہی اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں ہے۔ وہ تو تکلیف اور راحت دونوں کو اتفاقات زمانہ کا نتیجہ قرار دے کر کہتے ہیں کہ یہ کوئی خاص بات تھوڑی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے لئے یہی ہوا کیا کہ کبھی تکلیفوں کا دور ہوا اور کبھی عیش و آرام کا۔[1]

اس سب کے بعد خالق کی طرف سے ان پر حجت پوری طرح تمام ہوگئی اس لئے اس کے بعد ایک دم بے خبری کے عالم میں ان پر عذاب استیصال آ گیا جس نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

اگر مسلمان بصیرت سے کام لیں تو شاید ان کو تاریخ اسلام میں قبل کے سب نمونے مل جائیں اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جسے وہ اپنا سب سے بڑا اسطوت و شوکت کا دور کہتے ہیں، وہ کوئی اللہ کی مہربانی کا نتیجہ ہو بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی ان کے ایک طرح کے امتحان کا دور ہو اور جو بلاؤ مصیبت کے دور آئے وہ بھی آزمائش کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بس ایک بابرکت وجود کا فیض ہے جس سے وہ آخری انجام یعنی عذاب استیصال سے اب تک بچے ہوئے ہیں جس کا صریحی اعلان قرآن میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔

اللہ اس وقت تک ان پر عذاب نازل کرنے والا نہیں جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں۔'' (انفال: ۳۳)

پھر اس کے بعد یہ کتنی عبرت ناک صورت واقعہ ہے کہ ان میں کا ایک بڑا طبقہ اس وجود مقدس کی حیات بابرکات کا قائل نہیں ہے جس کی بدولت اس کی زندگی قائم ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾

''اور اگر ان بستیوں کے باشندے[2] ایمان لاتے اور نجات کا سامان کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو گرفت میں لے لیا ان اعمال کی بدولت جو وہ کرتے تھے۔''

''آسمان کی طرف سے برکت'' بارش ہے اور زمین کی طرف سے نباتات کی پیداوار ہے۔[3]

---

[1] ۔ هٰكذا عادة الدهر (تبیان)

[2] ۔ اهل هٰذه القرى التى اهلكناها (تبیان)

[3] ۔ من السمآء بالمطر والارض بالنبات (جلالین)

اس کے علاوہ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ آسمان کی برکت سے مراد دعا کا قبول ہونا ہے اور زمین کی برکت ضرورتوں کا پورا ہوتے رہنا ہے [1] اور یہ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔

اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّهُمۡ نَآئِمُوۡنَؕ‏ ﴿۹۷﴾ اَوَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًى وَّهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ‏ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوۡا مَكۡرَ اللّٰهِ‌ۚ فَلَا يَاۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ‏ ﴿۹۹﴾

''تو کیا (اب) ان بستیوں والے بالکل بے خوف ہو گئے ہیں اس سے کہ آئے ان پر ہمارا عذاب رات کو [2] جب کہ وہ سوتے ہوں اور کیا وہ بے خوف ہو گئے ہیں اس سے بھی آئے ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے جب کہ وہ کھیل تفریح میں مصروف ہوں تو کیا وہ اللہ کے منصوبہ کی طرف سے بالکل نڈر ہو گئے ہیں مگر اللہ کے منصوبہ سے نڈر نہیں ہوتے مگر وہ جو گھاٹا اٹھانے والے ہوں۔''

مَكۡرَ اللّٰهِ سے جس کا ترجمہ ہم نے ''اللہ کے منصوبہ'' کے لفظ سے کیا ہے، بداعمالوں کے مقابلہ میں اللہ کی طرف کا وہ انتظام مراد ہے جو انہیں پورے طور پر مستحق عقوبت بنا کر آخر سزا میں گرفتار کرنا ہے [3] سابقہ آیتوں میں گزشتہ امتوں کے ساتھ اللہ کا رویہ جو رہا، اسے بیان کیا گیا تھا اور اس کے بعد ان آیتوں میں اس امت کو متنبہ کیا جا رہا ہے [4] کہ یہ اپنے رسول کے ساتھ جو رویہ اختیار کئے ہوئے ہے تو آخر اسے عذاب الٰہی سے اتنی بے خوفی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟!

اَوَلَمۡ يَهۡدِ لِلَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَهۡلِهَاۤ اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ‌ۚ وَنَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ‏ ﴿۱۰۰﴾

''کیا ان لوگوں کے سامنے جو زمین پر اقتدار کے مالک ہیں، اس کے پہلے صاحبانِ اقتدار کے بعد یہ بات نہیں کھلی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کے سبب سے مبتلائے مصیبت کر دیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں کہ وہ سنتے نہیں۔''

''لَمۡ يَهۡدِ'' کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے: یہ بات نہیں کھلی ہے''۔ ظاہر الفاظ سے لغت دیکھے بغیر سمجھ میں زیادہ آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ فعل لازم کے طور پر ہے جس کا فاعل بعد میں: اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ ہے اور بعض تفسیر وتراجم، اس میں ہم سے متفق ہیں۔

---

[1] قيل بركات السمآء اجابة الدعآء والارض تيسير الحوائج (مجمع البيان)

[2] بياتاً ليلاً (جلالين)

[3] اخذ العبد بالضر من حيث لا شعر (تبيان)

[4] استدراجه اياهم بالنعمة واخذهم نعتبة (جلالين) افامن اهل القرىٰ المكذبون لك يا محمدﷺ (مجمع البيان)

[۱]

مگر کچھ مفسرین کے سامنے مشکل ہے کہ ''یہدی'' کی لفظ کا لغت کے اعتبار سے بس ہدایت ہی سے ماخوذ ہونا سمجھ میں آتا ہے اور ہدایت لغۃً فعل متعدی ہے اور اس کے معنی رہنمائی کے ہیں، اس لئے کچھ قاریوں نے اسے ''لم یھد'' کے بجائے ''لم نھد'' (نون کے ساتھ) پڑھا ہے یعنی کیا ہم نے ہدایت نہیں کی اور متداول قرأت کے ساتھ بھی بعض مترجمین نے ترجمہ اسی ہدایت کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر کرنے کی کوشش کی۔ [۲]

مگر اس صورت میں فاعل اس کا واضح نہیں ہوتا کہ کون ہے؟ اس کی خانہ پری کچھ تفاسیر میں فاعل کو ضمیر مقدر مان کر کی ہے کہ ''کیا خدا نے ان کی رہنمائی اس حقیقت کی طرف نہیں کی ہے؟'' ''یا'' جو کچھ پہلے بیان ہوا ہے اس نے ان کی رہنمائی اس طرف نہیں کی''۔ [۳]

ہمارے نزدیک اس صورت میں زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس یَھدِ کے فعل کا فاعل بعد کے فقرہ: ''اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ'' الخ کو مان لیا جائے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا ان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہے اس بات کا تصور کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کے سبب سے مبتلائے مصیبت کر دیں؟ مگر یَھدِ کے اس مفہوم میں جو ہدایت کے معنی پر مبنی ہے بہت بڑی خلش ذہن میں ''لَمۡ یَھدِ'' کے بعد کے لام سے محسوس ہوتی ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اس صورت میں ''لَمۡ یَھۡدِ لِلَّذِیۡنَ'' ہونا چاہیے۔ یہ لام تو اس منزل کے ساتھ آیا کرتا ہے جس کی طرف ہدایت ہو جیسے: ''یَھۡدِیۡ لِلۡحَقِّ'' آخر جن لوگوں کی ہدایت ہونا مدنظر ہے، ان کے ساتھ لام کا ہے کے لئے ہے؟ اس لئے قوت پہلے ہی مفہوم کو ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا تھا۔

تِلۡكَ الۡقُرٰى نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدۡنَا لِاَكۡثَرِهِمۡ مِّنۡ عَهۡدٍ ۚ وَاِنۡ وَّجَدۡنَاۤ اَكۡثَرَهُمۡ لَفٰسِقِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾

''یہ وہ بستیاں ہیں جن کے کچھ واقعات ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں اور بلا شبہ ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے [۴] لے کر آئے تو وہ ایسے نہیں تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ پہلے جھٹلاتے رہے۔ اس طرح اللہ مہر کرتا ہے کافروں کے دلوں پر اور نہیں پائی ہم نے ان میں سے اکثر کے عہد و پیمان کی کوئی حقیقت [۵] اور ہم نے ان میں

---

[۱]۔ لم یھد لم یتبین (جلالین) آیا واضح نشد بر آنانکه وارث زمین شدند بعد از هلاك ساکنان آن زمین (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ کیا نہیں راہ دکھائی واسطے ان لوگوں کے (شاہ رفیع الدین)

[۳]۔ ای اولم یبین اللہ...وقیل معناہ: اولم یھد ما تلونا من انباء القری (مجمع البیان)

[۴]۔ المعجزات الظاھرات (جلاین) بامعجزها (شاہ ولی اللہ)

[۵]۔ ای وفاء بعھدھم (جلالین) قائم رہنا او پر عہد کے (شاہ رفیع الدین)

سے زیادہ تر افراد کو بداعمال پایا۔"

پہلے جھٹلاتے رہے۔اب کتنے ہی معجزے آجائیں، سخن پروری اور بے جا ضد ان کے لئے ایمان لانے سے سد راہ ہے۔

"اسی طرح اللہ مہر کرتا ہے" یعنی یہ قبل کے کفر وتکذیب کا پھر ایک نفسیاتی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اب اور زیادہ ایمان سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تقریباً فطری طور پر ان سے صلاحیت ایمان کا سلب ہونا جو خود ان کے سابق اختیار کردہ کفر کا نتیجہ ہے، اسی کی تعبیر اللہ کی طرف کی مہر سے قرآن مجید میں بہت مقامات پر ہوئی ہے۔

"اکثر کے عہد کی کوئی حقیقت نہیں پائی" یعنی جو ان سے عہد و پیمان تھا، عہد فطرت بزبان عقل وضمیر بھی اور عہد شریعت انبیاء کے ذریعہ سے بھی انہوں نے اس عہد کو اس طرح بے عملی سے نسیاً منسیاً کیا، گویا کہ ان میں کبھی عہد و پیمان ہوا ہی نہ تھا۔[1]

"اور ان میں سے زیادہ تر کو بداعمال پایا" یعنی وہ کافر تو سب ہی ہیں مگر ان میں کچھ بداعمالی میں کم ہیں لیکن زیادہ افراد وہ ہیں جو کفر کے ساتھ ساتھ شدت سے بداعمال بھی ہیں۔[2]

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾

"پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے یہاں کے عمائد کی طرف[3] تو ان لوگوں نے ان کے ساتھ ظلم سے کام لیا[4] تو دیکھو کیسا انجام ہوا فسادیوں کا۔"

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿١٠٥﴾

"اور کہا موسیٰ نے اے فرعون! میں پیغمبر ہوں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔ میری شان یہ ہے[5] کہ اللہ کی نسبت حق کے سوا کوئی بات نہ کہوں میں لایا ہوں تم لوگوں کی طرف معجزہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تو بنی اسرائیل کو آزاد کر دے کہ وہ میرے ساتھ چلے جائیں۔"

---

[1] ای اشراف قومہ وذوی الامر منھم (مجمع البیان) اذا اخذ علی الانسان العھد فنقضہ قیل لیس علیہ ای کانہ لم یعھد الیہ
[2] فیکون تاویل الایۃ کفروا بھا (جلالین) پس ظلم کیا ساتھ اس کے (شاہ رفیع الدین)
[3] ای اشراف توحدوذوی الامر منھم (مجمع البیان)
[4] کفروا بھا (جلالین) پس ظلم کیا ساتھ اس کے (شاہ رفیع الدین)
[5] حقیق جدیر علی ان بان (جلالین) سزاوار آنکہ (شاہ ولی اللہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ، اور فرعون کا انجام

فرعون بنی اسرائیل کو غلام بنائے ہوئے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام ان کی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے اور فرعون سے کہہ رہے تھے کہ انہیں ان کے آبائی وطن شام کی طرف واپس چلا جانے دے۔[1]

قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلۡقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ۚ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾

"اس نے کہا کہ اگر تم کوئی معجزہ لائے ہو[2] تو اسے پیش کرو، اگر تم سچے ہو، انہوں نے اپنے عصا کو پھینک دیا جو ایک دم کھلا ہوا اژدھا بن گیا اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ایک دفعہ ایسا ہو گیا کہ وہ سفید نورانی تھا دیکھنے والوں کے سامنے۔"

"اپنا ہاتھ باہر نکالا" اس میں ایک کڑی درمیان کی ضرور محذوف ہے۔ اس لئے دو قول ہو گئے، ایک یہ کہ ہاتھ گریبان کے اندر لے گئے اور دوسرے یہ کہ بغل کے نیچے[3]

بہر صورت باہر نکالا تو اس سے نور تاباں تھا۔[4]

قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيۡمٌ ۙ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيۡدُ اَنۡ يُّخۡرِجَكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ ۚ فَمَاذَا تَاۡمُرُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوۡۤا اَرۡجِهۡ وَاَخَاهُ وَاَرۡسِلۡ فِى الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِيۡنَ ۙ ﴿۱۱۱﴾ يَاۡتُوۡكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيۡمٍ ﴿۱۱۲﴾

"فرعون والوں میں سے ممتاز آدمیوں نے کہا کہ بلاشبہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے جو تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے تو تم لوگ کیا رائے دیتے ہو؟! ان لوگوں نے کہا کہ انہیں اور ان کے بھائی کو روک رکھئے[5] اور شہروں میں جمع کرنے والے آدمی[6] بھیجے جو ہر بڑے ماہر جادوگر کو بلا کر لائیں۔"

فرعون والوں میں سے ممتاز آدمیوں نے کہا کہ تم کیا رائے دیتے ہو؟ تو یہ کس سے کہا؟ ایک معنی اس کے یہ کئے گئے ہیں کہ انہوں نے

---

[1]۔ ای ما طلق بنی اسرائیل من عقالا لتسخیرو خلھم ان یرجعوا الی الارض المقدسۃ (مجمع البیان)
[2]۔ اگر آوردۂ معجزہ (شاہ ولی اللہ)
[3]۔ فادخل یدہ فی جیبہ وقیل تحت ابطہ ثم نزعھا منہ واظھرھا (مجمع البیان)
[4]۔ قال ابو علی کان فیھا من النور والشعاع مالم یشاھد مثلہ فی ید احد (تبیان)
[5]۔ موقوف دار اورا (شاہ ولی اللہ)
[6]۔ جامعین (جلالین) اکٹھا کرنے والے آدمی (شاہ رفیع الدین)

آپس میں ایک دوسرے سے کہا[1]

دوسرا خیال یہ ہے کہ خواص نے جن میں فرعون بھی تھا، کانفرنس کر کے عوام کی رائے دریافت کی جس کا جواب عوام نے فرعون کو مخاطب کر کے دیا۔[2]

قرآن مجید سورۂ شعراء میں اس قول کی خود فرعون کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

اس لئے بہت ممکن ہے کہ یہاں بھی مراد یہی ہو کہ خود فرعون نے دوسرے لوگوں سے یوں رائے لی اور اس کی نسبت **الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ** کی طرف ویسی ہے کہ جیسے بادشاہوں کی طرف کسی بات کے انتساب میں یوں کہا جاتا ہے کہ ملازمانِ بارگاہ سلطانی نے ایسا کیا اور اس لئے جواب جو ہے، وہ بصیغۂ مفرد خود فرعون ہی سے تخاطب کے ساتھ ہے: **اَرْجِهْ وَاَخَاهُ** جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''ان کو اور ان کے بھائی کو روک رکھئے۔''

ایک بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ تو بنی اسرائیل کے ملک سے باہر لے جانے کا تھا۔ پھر فرعون یا اس کے عمائد نے اپنی قوم سے کیوں کہا کہ یہ تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں؟!

معلوم ہوتا ہے جیسے سیاستداں اصحاب اقتدار کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے دباؤ سے خود مظلوم عوام کی آواز اپنے حق میں اٹھواتے ہیں، اسی طرح یہاں صورت یہ تھی کہ عمائد تو سب قوم قبط سے ہوتے تھے جو فرعون کے خاندن کے لوگ تھے اور بنی اسرائیل بیچارے غریب عوام تھے تو یہ جلسہ ان لوگوں نے انہی بنی اسرائیل کا کر کے ان کے ہمدرد کے لباس میں یہ کہا کہ یہ شخص جو آیا ہے تمہیں تمہارے ملک سے نکال کر بے گھر کرنا چاہتا ہے اور ان عوام نے ان کی مرضی کے مطابق یا خود اپنے فطری ذہن سے یہ جواب دیا کہ یہ دونوں ساحر ہیں تو ان کے مقابلہ کے لئے شہروں شہروں سے ساحر بلوایئے تا کہ اگر یہ غلط قسم کے دعویدار ہوں تو ان کا دعویٰ باطل ہو جائے۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

''اور سب جادوگر فرعون کے پاس آئے، انہوں نے کہا گیا گر ہم غالب آئے تو ہمیں ایک بڑے معاوضہ کا ضرور حق ہوگا، اس نے کہا ''ہاں اور بلاشبہ تم خاص تقرب رکھنے والوں میں سے بھی ہوگے۔'' انہوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تم پھینکو اور یا ہم ہی پھینکنے والے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم ہی پھینکو، جب انہوں نے پھینکا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں خوفزدہ کر دیا اور بہت بڑا جادو پیش کیا۔''

---

[1] ۔ گفتند اشراف از قوم فرعون بایکدیگر (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ قال الملأ... لمن دونهم في الرتبة من الحاضرين (مجمع البيان)

بیان واقعہ میں درمیان کی کڑیوں کا اچھا خاصہ سلسلہ محذوف ہے [1] یعنی ان کے مشورہ کے مطابق فرعون نے اطراف و جوانب میں آدمی بھیج کر ساحروں کو بلوایا اور وہ سب آ کر فرعون کے پاس اکٹھا ہوئے ان سے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا اور ان سے مقابلہ کا انہیں حکم دیا گیا، تب انہوں نے یہ بات کہی۔

جادو کی قسموں میں سے ایک ''شعبدہ بازی'' ہوتی ہے جسے اردو میں ''ڈھٹ بندی'' کہا جاتا ہے۔ اس سے اصل شے کی کیفیت میں تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ دیکھنے والوں کا حاسہ متاثر ہوتا ہے کہ انہیں ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس آیت میں قرآن کے یہ الفاظ کہ ''لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا'' بتلاتے ہیں کہ ساحران فرعون کے جادو کی نوعیت یہی تھی۔ [2]

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ

''ان کے جادو کی وجہ سے خیال یہی ہوتا تھا کہ یہ دوڑ رہے ہیں۔'' (سورۃ طٰہٰ۔ ٦٦)

بعض لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ مطلق سحر کا اثر واقعاً خارج میں موجود نہیں ہوتا بلکہ خیال متاثر ہوتا ہے۔ [3] مگر ہمارے نزدیک بطور عموم یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔ ہاں سحر کی یہ قسم جو وہ ساحر عمل میں لائے تھے، ایسی ہی تھی۔

یہاں پر قرآن مجید کے دونوں جگہ کے الفاظ: سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ اور يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ان کا تقاضا یہی ہے جو دوسرے مفسرین سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے لکھا مگر میں ابھی اس سے مطمئن نہیں ہوں اس لئے کہ اگر ایسا ہو تو اس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کو بھی ماننا پڑے گا کہ انہوں نے دیکھنے والوں کی نگاہوں پر سے اس اثر کو دور کر کے ایک دوسرا اثر پیدا کر دیا کہ وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے ان سانپوں کو نگل لیا مگر الفاظ قرآنی ایسا بتاتے ہیں کہ واقعی وہاں حرکت کرتے ہوئے سانپ موجود تھے جنہیں عصائے موسوی نے اژدھا بن کر نگل لیا۔ بہر صورت ان دونوں واقعوں میں تفریق نہیں ہو سکتی۔ اگر ساحروں کا عمل خیال کو متاثر کرتا تو موسیٰ علیہ السلام کے عمل کو بھی ایسا ہی ماننا پڑے گا اور اگر وہاں واقعیت مانی جائے تو ساحروں کے کرتب کو بھی واقعیت کا حامل تسلیم کرنا ضروری ہے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَاغِرِينَ ﴿١١٩﴾ وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿١٢٠﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١٢٢﴾

''اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا عصا پھینکو تو ایک دم وہ نگلنے لگا اسے جو انہوں نے جھوٹ موٹ ظاہر کیا

---

[1] ۔ فی الکلام حذف کثیر (مجمع البیان)

[2] ۔ بجا دو بستند چشمہائے مردمان را (شاہ ولی اللہ) جادو کر دیا آنکھوں پر لوگوں کے (شاہ رفیع الدین) صرفون عن حقیقۃ ادراکھا (جلالین)

[3] ۔ فی ھذہ دلالۃ علیٰ ان السحر لا حقیقۃ لہ (مجمع البیان)

تھا توحق نمایاں ہوگیا[1] اور جو کچھ وہ کرتب دکھایا کرتے تھے، وہ بے حقیقت ثابت ہوگیا تو اس طرح وہ لوگ[2] مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے[3] اور تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے کہا کہ ہم ایمان لائے تمام جہانوں کے پروردگار پر جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کا پروردگار ہے۔"

"تمام جہانوں کے پروردگار" کہنے کے بعد "موسیٰ اور ہارون کا پروردگار" کہنا اس کا اظہار ہے کہ ہمیں اس "رب العالمین" کا تصور انہی موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ذریعہ سے ہوا ہے کہ فرعون خدائی کا غلط دعویدار ہے اور جس کی طرف سے وہ دعوت دیتے ہیں، وہ خدائے برحق ہے۔[4]

قَالَ فِرۡعَوۡنُ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكۡرٌ مَّكَرۡتُمُوۡهُ فِى الۡمَدِيۡنَةِ لِتُخۡرِجُوۡا مِنۡهَاۤ اَهۡلَهَا ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾

"فرعون نے کہا کہ تم لوگ اس پر ایمان لے آئے اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دوں، یقیناً یہ ایک چال ہے جو تم لوگوں نے اس شہر میں چلی ہے اس غرض سے کہ اس سے اس کے باشندوں کو باہر نکالو۔ اب تمہیں پتہ چلے گا۔ میں یقیناً تمہارے ہاتھوں اور تمہارے پیروں کو مختلف سمتوں سے کاٹ دوں گا۔ پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا، انہوں نے کہا کہ یقیناً ہم اپنے پروردگار کی طرف پلٹیں گے اور تم ناراض نہیں ہماری کسی بات سے سوا اس کے کہ ہم ایمان لائے اپنے پروردگار کی نشانیوں پر جب وہ ہمارے سامنے آئیں۔ اے ہمارے پروردگار! انڈھا دے ہم پر صبر کی طاقت اور ہمیں دنیا سے اٹھا مسلمان ہونے کی حالت میں۔"

"ہاتھوں اور پیروں کو مختلف سمتوں سے کاٹ دوں گا۔" یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پیر[5]

وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰى وَقَوۡمَهٗ لِيُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ

[1] ۔ ثبت وظهر (جلالین)

[2] ۔ فغلبوا اى فرعون وقومه (جلالین)

[3] ۔ صاروا ذليلين (جلالین)

[4] ۔ فيه معنى الذى دعا الى الايمان به موسىٰ وهارون (تبیان)

[5] ۔ اى من كل شق طرف (مجمع البيان)

قٰهِرُوْنَ﴿۱۲۷﴾

''اورفرعون کی قوم کے بڑے آدمیوں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰ اوران کی قوم کے آدمیوں کو چھوڑے رکھیں گے کہ وہ زمین میں خرابیاں پیدا کریں اور آپ کو اور آپ والے خداؤں کو چھوڑ دیں؟ اس نے کہا ہم عنقریب ان کے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور بلا شبہ ہم ان پر پورا قابو رکھتے ہیں۔''

اب معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے گرد بنی اسرائیل کے لوگ کافی جمع ہو گئے تھے اور انہیں اپنا سردار ماننے لگے تھے، اس لئے قوم فرعون کے عمائدین کو تشویش پیدا ہوئی اور انہوں نے فرعون کو ان کے خلاف کسی سخت اقدام کے کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔

ہاں ایک بات قابل غور ہے کہ دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون خود خدائی کا مدعی تھا۔ پھر یہاں قوم کے افراد کے اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ''آپ کو اور آپ کے خداؤں کو چھوڑ دیں''......اس کے لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''فرعون کے بت یہ تھے کہ اپنی صورت بنا دیتا تھا لوگوں کو کہ اس کی پوجا کریں'' (موضح القرآن)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس نے کچھ چھوٹے چھوٹے بت قوم میں بنوا دیئے تھے یہ کہہ کر کہ میں تمہارا اور ان خداؤں کا بھی خدا ہوں (جلالین) اور اس لئے دوسری جگہ فرعون کی زبانی قرآن مجید میں یہ الفاظ ہیں کہ: "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔''

دونوں صورتوں میں "اٰلِهَتَكَ" کے معنی وہی ہوں گے جو ہم نے ترجمہ میں ظاہر کئے ہیں کہ ''آپ کی طرف کے خدا''۔ نہ یہ کہ ''آپ کے خدا'' کیونکہ ان بتوں کو اس نے عوام کے خداؤں کی حیثیت سے بنوایا تھا۔ اپنے خدا کی حیثیت سے نہیں۔

بعض قاریوں نے اس لفظ ہی میں تصرف کر کے اَلْهَتَكَ [1] اور اِلٰهَتَكَ [2] کر دیا جو ہمارے نزدیک درخور اعتناء نہیں ہے۔ میں تو اس لفظ کی اسی قرائت سے مطلب ہے جس پر مسلمانوں کا عمل درآمد ہے اور ہمیں اسی کے معنی سمجھنے کی ضرورت۔

ہماری قدیم تفسیر سے اس سوال کا حل بہت آسان ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فرعون پہلے خود بت پرست تھا اس کے بعد اس نے دعوائے خدائی کیا ہے۔ اس صورت میں اٰلِهَتَكَ کے معنی صاف ہیں کہ جن خداؤں کی آپ پرستش کرتے رہے ہیں۔ [3]

جن مظالم کا فرعون نے اب ارادہ ظاہر کیا ہے، یہ وہی مظالم ہیں جو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کرتا رہا تھا۔ اب اس نے پھر انہی کے اعادہ کا اعلان کیا ہے [4]

ہاں! ان دونوں میں ایک فرق بھی ہوسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے بچوں کا قتل کرنا جو تھا، وہ ان بچوں کا تھا جو نئے پیدا ہوں، تا کہ وہ بچہ موجود نہ رہے جو نجومیوں کے قول کے مطابق اس کی تباہی کا باعث ہوگا اور اب یہ قتل اس قوم کے ان بچوں اور نوجوانوں کا ہے جن سے اندیشہ ہے

---

[1] یعنی عبادتك (تبیان)

[2] انما هو تانیث اله (تبیان)

[3] کان فرعون یعبد الاصنام ثم ادعی بعد ذلك الربوبية (علی بن ابراهيم)

[4] درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ اب پھر قصد کیا (موضح القرآن)

کہ وہ منظم ہو کر اس سے مقابلہ کریں۔[1]

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۟ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

''موسیٰؑ نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ تم اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر و برداشت سے کام لو یقیناً زمین اللہ کی ہے وہ اس پر تسلط عطا کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے[2] اور آخرت کی بہتری پرہیزگاروں ہی کا حصہ ہے۔''

یہاں ''وارث'' کرنے کا مطلب، اسباب تکوینیہ سے تسلط عطا کرنا ہی ہے۔ یہ نہیں کہ جو تسلط حاصل کر لے وہ منجانب اللہ اس تسلط کا حق دار بھی ہے اور اسی لئے بعد میں کہا ہے کہ ''آخرت کی بہتری پرہیزگاروں کے لئے ہے'' یعنی دنیوی تسلط تو دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر تقویٰ کا جوہر نہیں ہے تو یہ دنیوی کامیابی آخرت کی ناکامی کی ذمہ داری ہو گی۔

بے شک جمہور کے مفسرین جو تسلط و اقتدار کو خود حقانیت کا ایک ثبوت سمجھتے ہیں، انہوں نے وارث ہونے سے مطلب استحقاق کا لیا ہے[3] مگر انہیں اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ یہ تسلط و اقتدار تو کبھی کافروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، پھر ان کافروں کو بھی حقدار ہی ماننا پڑے گا اور اس صورت میں خود یہ فرعون بھی جواب تک اس بے پناہ اقتدار کا حامل تھا تو اس اقتدار کو منجانب اللہ استحقاق کا مرادف کیوں نہ سمجھا جائے؟! پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس انتزاع سلطنت کی مہم پر اٹھے ہی کیوں ہیں اور اگر فرعون کے خلاف اٹھنا اس لئے درست ہے کہ وہ خلق خدا پر احکام الٰہی کے خلاف حکمرانی کرتا ہے اور مظالم کا مرتکب ہے تو پھر کسی نام نہاد مسلمان کے اقتدار کے خلاف بھی اٹھنا درست ہے جو یزید ہو کر احکام الٰہی کے خلاف رویہ اختیار کرے اور خلائق کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے۔

قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں آپ کے آنے سے پہلے بھی ایذائیں پہنچیں اور اب آپ کے آنے کے بعد بھی۔ انہوں نے کہا قریب ہے وہ منزل[4] کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں اس کے بجائے زمین پر اقتدار عطا کر کے دیکھے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو۔''

[1]۔ الذين يكون فيهم النجدة والقوة ويصلحون للقتال (مجمع البيان)

[2]۔ اى الى من يشآء نقل المواريث فيورثكم بعد اهلاك فرعون لما اورثها فرعون (مجمع البيان)

[3]۔ زمین کا وارث کرے یعنی ملک کا حکم کرے جو حق ہے حضرت آدم علیہ السلام کا (موضح القرآن)

[4]۔ امیدا ست که (شاہ ولی اللہ) شاب ہے یہ کہ (شاہ رفیع الدین)

بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں

چونکہ جیسا کہ پہلے آچکا ہے، جناب موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے پہلے بھی یہی ہو چکا تھا کہ لڑکے ہلاک کر دیئے جاتے تھے اور لڑکیاں کنیز بنا کر رکھ لی جاتی تھیں اور وہی اب بعثت موسیٰ علیہ السلام کے بعد فرعون نے اپنے ارادہ کا اعلان کیا ہے[1] اس لئے قوم بنی اسرائیل نے گھبرا کر جناب موسیٰ علیہ السلام سے یہ دل شکن جملہ کہا جس میں ان پر معاذ اللہ ایک طرح کی نحوست کا الزام تھا مگر انہوں نے اسے ان کے وقتی اضطراب کا ایک اضطراری نتیجہ قرار دیتے ہوئے اس کا جواب بڑے تسلی آمیز انداز سے دیا ہے جو ان کی اخلاقی رفعت کا آئینہ بردار ہے۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے خیال کی اصلاح کرنا چاہیے جنہوں نے عام شہرت اور بعض غیر مستند روایات کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام سلسلۂ انبیاء میں خاص طور پر ''میر غضب'' مان لیا ہے اور ان کی سیرت کا نقشہ جلال ہی کے چوکھٹے میں دیکھا ہے۔ وہ دیکھیں کہ قوم کی کہی ہوئی کتنی سخت بات کا انہوں نے کتنے نرم لہجہ میں جواب دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوسرے تمام انبیاء ہی کی طرح غیر معتدل اور بے محل غیظ وغضب سے بری ہیں اور وہی حلم وتحمل رکھتے ہیں جو عام طور سے انبیاء کا شعار رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣١﴾

''اور ہم نے فرعون والوں کو گرفتار کیا قحط اور پھلوں کی کمی میں۔ شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں تو جب ان کے لئے بھلائی ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے کہ یہ ہمارا حق ہے[2] اور اگر انہیں کچھ برائی پہنچتی تھی تو موسیٰ اور ان کے ساتھ والوں کی نحوست قرار دیتے تھے۔ ارے ان کی نحوست[3] تو اللہ کے یہاں ہے مگر ان میں کے زیادہ لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ ''ان کی نحوست تو اللہ کے یہاں ہے۔'' اس کا ایک مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شومیٔ تقدیر یا شامت اعمال ہے جو ان کے شامل حال ہے، کسی دوسرے آدمی کی نحوست کا اثر تھوڑی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''اس کا جواب یہ فرمایا کہ شومی ان کے کفر سے تھی، کیونکہ کافر بھی دنیا میں عیش کرتے ہیں، اصل حقیقت تھی، سو فرمایا کہ دنیا کے احوال موقوف بر تقدیر ہیں'' (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین میں جناب شیخ الطائفہ نے بھی یہی تحریر کیا ہے۔[4]

---

[1]۔ الذی کان بعد مجیئ موسیٰ الوعید لھم تجدید ذٰلك العذاب (تبیان)

[2]۔ ای انا نستحق ذٰلك (مجمع البیان)

[3]۔ طائر ھم شو مھم (جلالین)

[4]۔ معناہ ان اللّٰہ ھو الذی یاتی بطائر البرکۃ وطائر الشوم من الخیر والشر والنفع والضر (تبیان)

لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس نحوست کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ:

"یعنی مواخذہ براعمال ایشان است" (فتح الرحمٰن)

اسی کو ہم نے "شامتِ اعمال" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک مفہوم اس جملہ کا جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ہے کہ یہ دنیا کی نحوست جو قحط وغیرہ کی صورت میں ہے، یہ تو کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل نحوست ان کی جو ہے وہ اللہ کے یہاں ظاہر ہوگی یعنی روز جزاء جب انہیں ان کے اعمال کی پاداش ملے گی۔[1]

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٢﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿١٣٣﴾

"اور انہوں نے کہا کہ جو بھی "معجزہ"، تم ہمارے سامنے لاؤ[2] کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرو، پھر بھی ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے، تو ہم نے ان پر بھیجا طوفان ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کے کھلے ہوئے معجزوں کی حیثیت سے[3] اس پر بھی انہوں نے گھمنڈ سے کام لیا اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے۔"

حقیقت میں وہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ امور کو "معجزہ" مان لیتے تو پھر کافر ہی کیوں ہوتے مگر چونکہ یہ باتیں تھیں غیر معمولی اور بحیثیت معجزہ پیش ہوئی تھیں تو انہوں نے پہلے تو "آیت" کا لفظ صرف کیا جس کے معنی نشانی کے ہیں اور اسی کو "معجزہ" کہتے ہیں، پھر اس کی تاثیر کو جادو کہہ کر انہوں نے اپنی کافرانہ ذہنیت کا ثبوت دے دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہم بہر حال ان چیزوں پر جنہیں تم معجزہ کہہ کر پیش کرتے ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٣٤﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿١٣٥﴾

"اور جب ان پر عذاب وقوع میں آ گیا[4] تو انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کرو، اس عہد کے سبب سے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔ اگر تم ہم سے اس عذاب کو ہٹا دو گے تو ہم تم پر ایمان لے

---

[1] معناہ الا انما الشوم الذی یلحقھم ھو الذی وعدوا بہ من العقاب عند اللہ یفعل بھم فی الاخرۃ (مجمع البیان)
[2] ای شئ تاتینا بہ من المعجزات (تبیان)
[3] ای معجزات بینات ظاھرات وادلۃ واضحات (مجمع البیان)
[4] الرجز العذاب (جلالین)

آئیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے تو جب ہم نے ان سے عذاب کو ہٹا دیا اس مدت تک کہ جس تک پہنچنا اُن کے نصیب میں تھا تو وہ ایک دم عہد کو توڑتے ہوئے نظر آئے۔''

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ، اس کے ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ان واسطوں اور دعاؤں کے ذریعہ سے جو اس نے تمہیں بتلائی ہیں [1] ہمارے لئے دعا کرو اور دوسرے یہ معنی کہ جیسا اس نے تم سے پہلے کہہ رکھا ہے کہ اگر یہ ایمان لائیں گے تو میں عذاب سے ان کو بچا لوں گا [2] تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اس نے قبولیت دعا کا جو تم سے عہد کیا ہے [3] مگر مجھے یہ معنی زیادہ ذہن سے قریب معلوم ہوتے ہیں کہ عہد عندک کے معنی ہیں، وہ عہدہ اور منصب نبوت و رسالت کا جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے [4] اس لئے میں نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

''تو ہم نے ان سے بدلا لیا [5] اور انہیں دریا میں ڈبو دیا، اس لئے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے ہم نے زمین کے مشرق اور مغرب کے تمام اطراف پر جن میں ہم نے برکت عطا کی تھی، اقتدار کا مالک بنایا اور تمہارے پروردگار کا نیک وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہو گیا [6] اس بنا پر کہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور مٹا دیا ہم نے اسے جو فرعون اور اس کی قوم والے کرتے تھے اور جو کہ وہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے'' [7]

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ

---

[1] ۔ بآں اسماء وادعیه که وحی کرده است نزدیك تو (شاه ولی الله)
[2] ۔ بما عهد عندك من كشف العذاب عنا ان امنا (جلالین)
[3] ۔ تم سے جو خدا نے (قبول دعا کا) عہد کیا ہے (مولوی فرمان علی صاحب)
[4] ۔ بما عهد عندك من النبوة عن ابي مسلم فعلى هذا يكون الباء باء القسم المعنى بحق ما اتاك الله من النبوة (مجمع البيان)
[5] ۔ اى فجازينا هم على سوء صنيعهم بالعذاب (مجمع البيان)
[6] ۔ راست شد وعدۂ نیك پروردگار تو (شاه ولی الله)
[7] ۔ يرفعون من البنيان (جلالين)

هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴿۱۴۰﴾

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتار دیا تو ان کا گزر ایک ایسی جماعت کی طرف سے ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی عبادت پر ٹوٹی ہوئی تھی [۱] انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک خدا بنا دیجئے جیسے ان کے خدا ہیں۔ انہوں نے کہا تم ایسے لوگ ہو جو جہالت سے کام لیتے ہو، یقیناً یہ لوگ جس عالم میں ہیں وہ مٹنے والا ہے [۲] اور غلط ہیں جو وہ کام کرے رہے ہیں (پھر) کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لئے کوئی خدا تلاش کروں؟ [۳] حالانکہ اس نے تمہیں تمام جہانوں سے زیادہ عطا کیا ہے۔''

فَضَّلَكُمْ کے معنی اکثر مفسرین ومترجمین نے ''فضیلت عطا کی ہے'' قرار دیئے ہیں [۴] اس صورت میں قید لگانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ یہ فضیلت صرف اس دور والوں کے لحاظ سے ہے [۵] اس لئے کہ بعد میں غیر بنی اسرائیل میں ایسی ہستیاں ہوئیں جو بنی اسرائیل کی ہر فرد سے افضل تھیں، مگر ہم اسے فضیلت بمعنی بزرگی سے نہیں سمجھتے بلکہ فضل بمعنی کثرتِ عطا سے سمجھتے ہیں جسے ہم نے اپنے ترجمہ میں ملحوظ رکھا ہے اور اس کی نظیر ابتدا کے پاروں میں آچکی ہے مگر بنی اسرائیل نے اس کثرت عطا کا مقابلہ شدت کفران کے ساتھ کیا، اس لئے وہ ''فضل'' ان کے لئے باعثِ فضیلت بننے کے بجائے انتہائی پستی کا مستوجب ہوگیا۔

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ﴿۱۴۱﴾ع

''اور (یاد رکھنے کا ہے وہ وقت) جب ہم نے تمہیں چھٹکارا دیا فرعون والوں سے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا کرتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔''

یہ مضمون تمام وکمال شروع کے پاروں میں آچکا ہے، اس لئے اس مقام پر کسی تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ

---

[۱] یقیمون علیھا ملازمین لھا (مجمع البیان)

[۲] ھلك ماھم فیه (جلالین) باطل کردہ شدہ است مذھبی که ایشان در آنند (شاہ ولی اللہ)

[۳] اصله ابغی لم (جلالین)

[۴] فضل دادہ است شمار ابر عالمھا (شاہ ولی اللہ) بزرگی تم کو اوپر عالموں کے (شاہ رفیع الدین)

[۵] فی زمانکم (جلالین) قال الحسن وابو علی وغیرھما یرید علیٰ عالمی زمانه (تبیان)

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴿۱۴۲﴾

''اور ہم نے موسیٰ ؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اوران کا تتمہ قرار دیا مزید دس کو جس سے ان کے پروردگار کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی اور موسیٰ ؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا تھا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور ٹھیک کام کرنا اورخرابی کرنے والوں کے طریق کار کی پیروی نہ کرنا۔''

تیس راتوں کا وعدہ اورمزیددس کا اضافہ۔بداء کا کھلا ہوانمونہ

یہ واقعہ جس کا قرآن میں صاف تذکرہ ہے،''بدا''کا کھلا ہوانمونہ ہے۔''بدا''میں کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ مصلحت الٰہی اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ جومختتم نتیجہ تقدیر کا ہے،اسے ایک دم سامنے نہ لایا جائے بلکہ پہلے وہ لایا جائے جوخالق کے یہاں کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے،بعد میں جب اس کی کوئی خاص شرط پوری نہ ہو،جس کا پورا نہ ہونا علم الٰہی میں پہلے ہی سے تھا مگر ظاہر نہیں کیا گیا تھا اس وقت دوسرا فیصلہ سنایا جائے۔مثلاً تقدیرات کے نوشتہ میں یہ لکھ دیا گیا کہ فلاں شخص کی عمر چالیس برس ہے اس کے بعد اس نے راہ خدا میں کچھ صدقہ دے دیا۔اب اعلان کر دیا گیا کہ اس کی عمر میں اس صدقہ کی وجہ سے دس برس کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے اس کی عمر پچاس برس ہوگئی۔

یہاں تقدیر الٰہی میں جوتبدیلی ہے،وہ معاذ اللہ کسی لاعلمی کی بنا پر نہیں ہے۔علم الٰہی میں جس کا مظہر''لوح محفوظ''کہلاتا ہے،از اول یہی تھا کہ اس کی پچاس برس کی عمر ہومگر اس نوشتہ میں جو تقدیروں کا ہے اور جسے''لوح محو و اثبات''کہا جاتا ہے،وہ نتیجہ ایک دم درج نہیں ہوتا بلکہ پہلے چالیس برس درج ہوتے ہیں اور پھر دس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ میں بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔تیس دن کا وعدہ کیا گیا کہ اس کے بعد توریت تم کو عطا ہوگی اور پھر دس دن کا اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد ارشاد ہوا کہ''اس طرح ان کے پروردگار کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی''……یہ میعاد،وہی''لوح محفوظ''یعنی علم الٰہی والی ہے جس کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تدریجی طور پر ہوا ہے۔

اس کا سبب کیا ہوا؟اس کے لئے کتب اہل سنت میں عجیب طرح کی رویت ہے جسے شاہ عبدالقادر دہلوی کی زبان قلم سے سنیئے۔

حق تعالیٰ نے وعدہ دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ تمہاری قوم کو توریت دوں۔اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے خوشی تھی وہ جاتی رہی۔اس کے بدل دس رات اور بڑھا کر مدت پوری کی۔''(موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں بھی تقریباً ایسا ہی ہے بس اس میں فرشتوں کا نہیں خود اللہ سبحانہ کا ذکر ہے کہ تیس(۳۰) راتیں پوری ہونے پر موسیٰ علیہ السلام کو اپنے منہ کی بو بری معلوم ہوئی تو انہوں نے مسواک کرلیا اور اللہ نے دس راتیں بڑھا دیں تا کہ وہ جب اس سے کلام کریں تو دہن سے بو آتی ہوئی ہو۔[1] یہ وجہ ہمیں قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے اور اس سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے کہ صفائی اللہ کو ناپسند ہے،وہ اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے،جب کہ مسواک اسلامی شریعت میں ایک ایسی مستحب عبادت ہے جو واجب کی سرحد سے متصل ہے۔

---

[1] فلما تمت انکر خلوف فمه فاستاك فامره الله بعشرة اخریٰ لیکلمه بخلوف فمه (جلالین)

پھر بھی یہ اس کی نوعیت بہر حال وہی ہے جو "ب ،ا" کی ہوتی ہے جسے یہ علمائے جمہور فرقۂ شیعہ کے خلاف الزامات کی فہرست میں بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

آیت کا جو تتمہ ہے کہ "موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری قوم میں جانشینی کرو، اس سے علامہ طبرسیؒ نے ایک لطیف استدلال کیا ہے جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ نبی تو اس وقت ہو چکے تھے جب جناب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم ہوا، انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا "وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ"، ہارون کو میرے منصب میں شریک قرار دے۔ (سورہ طٰہٰ۔ ۳۲)

اور خالق نے اس کا اعلان کیا کہ:

وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر قرار دیا۔ (سورۂ فرقان۔ ۳۵)

مگر اس نبوت کے باوجود وہ امام یعنی قوم کے سربراہ نہیں تھے، امامت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل تھی۔ طور پر جاتے وقت جب انہوں نے کہا:

اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ "تم قوم میں میری جانشینی کا کام انجام دو"

تو اس کے معنی یہ تھے کہ اپنی عدم موجودگی میں امامت کا منصب ان کے تفویض کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت کا لازمہ امامت نہیں ہے ورنہ جبکہ وہ نبی تھے ہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ضرورت کیا تھی کہ وہ انہیں اپنے خلیفہ قرار دیں۔ [1]

اب اس کے بعد جب ہم متفق علیہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ:

انت منی بمنزلة هرون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی۔

تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

نظر ڈالتے ہیں تو صاف یہ حقیقت جلوہ آرا نظر آتی ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ہارونؑ کی منزل جو موسیٰ علیہ السلام سے تھی وہ اپنے سے حضرت علی بن ابی طالبؑ کے لئے ثابت کی مگر آخر کے جملہ سے نبوت کو مستثنیٰ قرار دیا تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت ہارونؑ کو علاوہ نبوت کے کوئی منزل خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ نسبت حاصل تھی اور وہ بنص قرآن خلافت بصورت امامت تھی اور حضرت علی علیہ السلام سے نبوت کی نفی کر دی گئی تھی تو اب لازماً آپ کے لئے وہ دوسری ہی نسبت حاصل ہے کہ آپ بلافصل خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے لئے نبی کا نہیں بلکہ امام کا منصب من جانب اللہ حاصل ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل تھا اور جو مسلمانوں میں فرقۂ حقہ امامیہ کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام کو حاصل ہے جسے بدنصیبی سے مسلمان اکثریت تسلیم نہیں کرتی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ

[1] ۔ فی هذا دلالة علی ان منزلة الامامة منفصلة عن النبوة وغیر داخلة فیها وانما اجتمع الامران لانبیآء مخصوصین (مجمع البیان)

اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور جب موسیٰ ؑ آئے ہمارے وعدہ کی جگہ پر [1] اور ان سے ان کے پروردگار نے کلام کیا تو انہوں نے کہا پروردگارا! مجھے جلوہ دکھلا کہ میں تیری طرف نظر کروں۔ ارشاد ہوا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھو گے [2] مگر اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ ٹھہرا رہے تو پھر یہ امید کرنا کہ تم مجھے دیکھ لوگے تو جب ان کے پروردگار نے پہاڑ پر جلوہ نمایاں کیا تو اسے ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ ؑ غش کھا کر گر پڑے، جب وہ ہوش میں آئے تو کہا کہ پاک ہے تیری ذات۔ تیری طرف توبہ کرتا ہوں اور میں اول درجہ کا ایمان لانے والا ہوں۔''

دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام

پروردگار کا دیدار اگر کسی دور میں ہونے والا ہوتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھو گے۔ اس ہرگز میں مستقبل کا ہر دور داخل ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام کے غش کھا کے گرنے پر بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ معروضہ کہ ''پاک ہے تیری ذات'' یہ بتلاتا ہے کہ اس واقعہ سے یہ بات نمایاں ہوگئی کہ رویت شان الٰہی کے خلاف ہے اور اس کے واسطے نقص ہے۔ اسی لئے تسبیح یعنی عیوب ونقائص سے اس کے بری ہونے کی گواہی سے آغاز کلام کیا۔

تیسرے یہ اقرار کہ ''اَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ'' میں اول درجہ کا مومن ہوں، اسے ثابت کرتا ہے کہ خالق کے دیدار کو ناممکن سمجھنا جز ایمان ہے [3] اور جناب موسیٰ علیہ السلام اس کا یقین رکھتے تھے۔

رہ گیا موسیٰ علیہ السلام کا معروضہ پیش کرنا کہ ''ارني'' اپنا جلوہ مجھے دکھلا، وہ جیسا کہ دوسری آیتوں سے قرآن مجید کی پتہ چلتا ہے، کچھ جاہل افراد پر اس حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے تھا، نہ کہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے۔ [4]

اس سب کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب نے نہ جانیں، کیوں کر اس آیت ہی سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ:

''معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھا ہوسکتا ہے کیونکہ نمودار ہوا تھا پہاڑ کی طرف لیکن دنیا کے وجود کو برداشت نہ ہوئی، پہاڑ ٹوٹ گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش گرے تو آخرت کے وجود کو برداشت ہوگی، وہاں دیکھنا تحقیق ہے'' (موضح القرآن)

حالانکہ اگر یہ طور پر جو ہوا، جلوۂ ذات تھا تو ''لَنۡ تَرٰىنِيۡ'' کا دعویٰ تو اسی وقت غلط ہوجاتا ہے کیونکہ رویت کی نفی تھی۔ اس کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ تم اس کے بعد ہوش میں رہو گے یا نہیں۔ پھر خدا نے ثبوت رویت کو مطلق طور پر اس دنیا کے وجود کے برداشت کرنے سے وابستہ قرار دیا تھا جب وہ نہیں ہوا تو رویت کی ابدی نفی ہوگئی۔ [5]

آخرت کے وجود کا برداشت کرنا یا نہ کرنا تو یہاں خارج از بحث ہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خالق یہ فرماتا کہ اس دنیا میں تم مجھے نہیں دیکھ

---

[1] الی المکان الذی وقتناہ لہ (مجمع البیان)

[2] ہرگز نہ دیکھ سکے گا تو مجھے (شاہ رفیع الدین)

[3] عن ابی عبداللہ قال معناہ انا اول من اٰمن وصدق بانك لا ترٰی (مجمع البیان)

[4] ماقالہ الجمہور وھو الاقوی انہ لم یسأل الرویۃ لنفسہ وانما سئالہا لقومہ (مجمع)

[5] لانہ لا یعلق المحال الا بالمحال (تبیان)

سکتے۔آخرت میں اس تمنا کو پورا کر لینا تو موسیٰ علیہ السلام کے دل کو پوری پوری تسلی بھی ہو جاتی اور غش کھانے کی نوبت نہ آتی۔

بعض مفسرین نے ایک دوسرا پہلو امکان رویت کا پیدا کیا ہے کہ خالق نے ارشاد کیا: "لَنْ تَرٰىنِيْ"، تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے، یہ نہیں کہا کہ "میں ہرگز نہیں دکھائی دوں گا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ نفس رویت ناممکن نہیں ہے۔موسیٰ علیہ السلام کا احساس شخصی اس سے قاصر تھا کہ اسے دیکھ سکے۔[1]

مگر یہ بھی غلط ہے۔یہ "تم" تو اس لئے ہے کہ انہوں نے سوال اپنے ہی لئے کیا تھا۔اگر وہ کہتے کہ پروردگارا میری خواہش ہے کہ تو کبھی کسی کو دکھائی دے جا تو اس کے جواب میں یہ کہنے کا محل تھا کہ میں ہرگز دکھائی نہ دوں گا۔

پھر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سواد اعظم اس رویت کا "عامۂ مومنین" کے لئے آخرت میں قائل ہے تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام ان عام مومنین کے مقابلہ میں گئے گزرے تھے کہ انہیں تو ہمیشہ کے لئے کہہ دیا گیا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے اور عام مسلمان ایسی تاب نظر رکھتے ہیں کہ وہ دیکھ سکیں گے۔لاحول ولا قوۃ.

حالانکہ یہ سواد اعظم امۂ مسلمین کا کیا ذکر، ان نفوس کو جو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجزائے نور میں داخل تھے، دوسرے عام انبیا و مرسلین سے (چہ جائیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے اولوالعزم رسول) مساوی ماننے کے لئے تیار نہیں، چہ جائیکہ افضل مگر یہاں سخن پروری یا بخاری و مسلم کے مندرجات کی تصحیح کے لئے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیچارے کو عام افراد ملت اسلامیہ سے بھی گھٹا دینے پر تلے نظر آتے ہیں نعوذ باللہ من ذٰلک۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"ارشاد ہوا اے موسیٰ! بلاشبہ میں نے تم کو تمام لوگوں پر مقدم کیا ہے اپنے پیغاموں اور اپنے کلام کے ساتھ تو لو اسے جو میں نے تمہیں دیا ہے[2] اور شکر گزاروں میں سے ہو۔"

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۚ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

"اور لکھا ہم نے ان کے لئے تختیوں میں ہر قسم کے وعظ و نصیحت اور ہر بات کی تفصیل کو[3] تو لو اسے طاقت کے ساتھ اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ ان میں کی بہترین باتوں کے پابند رہیں میں جلدی دکھلاؤں گا تم لوگوں کو بداعمال لوگوں کا گھر۔"

بظاہر اس آیت میں دوبارہ وہ صنعت ہے جسے "التفات" کہتے ہیں، اس لئے کہ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بطور غیبت ہے کہ "لکھا

---

[1] للتعبير به دون "لن أرى" يفيد امكان رؤية تعالىٰ (جلالين)
[2] ما اٰتيتك من الفضل (جلالين)
[3] بدل من الجار والمجرور قبله (جلالين)

ہم نے ان کے لئے'' پھر ان کی طرف خطاب آ گیا کہ ''لو اسے طاقت کے ساتھ اور اپنی قوم کو حکم دو'' پھر اسی سلسلہ میں خطاب پوری قوم کی طرف ہو گیا کہ ''میں دکھلاؤں گا تم لوگوں کو بداعمالوں کا گھر۔''

اس آخری فقرہ سے مقصود یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم دیکھو گے کہ بداعمالوں کا گھر آخرت میں کونسا ہے یعنی دوزخ اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بداعمال لوگوں یعنی فرعون اور اس کی قوم کے برباد شدہ گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے آئیں گے [۱]

جناب شیخ الطائفہ نے یہ دونوں قول درج کئے ہیں۔ [۲]

ہمارے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے۔ اس لئے کہ ''دار'' واحد لفظ ہے جس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ تمام فاسقین کا ایک ہی گھر ہے۔ اگر دوسرے معنی مراد ہوتے تو گھر کے بجائے ''گھروں'' کے ہم معنی جمع کا لفظ لاتا جاتا۔

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَىِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ ؕ هَلۡ يُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾

''میں اپنی آیتوں سے محروم کردوں گا انہیں جو دنیا میں ناحق گھمنڈ سے کام لیتے ہیں اور اگر وہ ہر معجزہ دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگر وہ دیکھیں ہدایت کے راستے کو تو اسے اپنا رستہ نہیں بنائیں گے اور اگر وہ گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے اپنا راستہ قرار دے لیں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ ان کی طرف سے غفلت برتتے رہے اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی حاضری کو جھٹلایا، ان کے اعمال اکارت گئے، کیا انہیں سزا ملے گی سوا اس کے جو وہ اعمال کرتے تھے۔''

''محروم کرنے'' کا ایک مطلب یہ کہا گیا ہے کہ ایسی توفیق ان کے شامل حال نہ ہوگی کہ وہ ان آیتوں پر غور کریں۔ [۳]

مگر چونکہ اس کے بعد صاف ''معجزہ'' کا ذکر معلوم ہوتا ہے، اس لئے پہلے جملہ میں بھی آیت کے معنی معجزہ کے ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں ''سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ'' کے معنی یہ ہوں گے کہ میں مزید اپنے معجزے ان کے سامنے نہیں لاؤں گا، اس لئے کہ یہ گھمنڈی ہیں اور ان کے لئے جو معجزہ بھی پیش ہو، وہ بے کار ہے جیسا کہ خود اس آیت میں ہے کہ ''اگر وہ ہر معجزہ دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے [۴] اور دوسرے

---

[۱] یعنی منازل فرعونیان خراب شدہ خواھید دید (فتح الرحمن)

[۲] قال الحسن ومجاھد والجبائی یعنی بہ جھنم ...وقال قتادۃ ھی منازلھم ای لتعتبروا بھا وبما صاروا الیہ من التکال فیھا (تبیان)

[۳] بان اخذلھم فلا تتفکرون فیھا (جلالین)

[۴] ھٰذا اخبار من اللہ تعالیٰ عن ھٰؤلاء بعلمہ فیھم ...وبیان انہ انما صرفھم عن اٰیاتہ لذٰلك (مجمع البیان)

مقامات پر ہے کہ چونکہ اس کے قبل معجزات سامنے آئے اور انہوں نے ایمان اختیار نہ کیا تو اب مزید معجزات کا پیش کرنا ان کے سامنے لا حاصل ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ
لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ
اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

''اور موسیٰؑ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کی مورتی بنالی جس میں سے آواز پیدا ہوتی تھی، کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا اور نہ انہیں کوئی رہنمائی کر سکتا ہے۔ انہوں نے اسے بنایا اور وہ ظالم لوگ تھے اور جب وہ پشیمان ہوئے اور محسوس کیا کہ وہ گمراہ ہو گئے تھے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمیں نہ بخشے گا تو یقیناً ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوں گے''۔

گوسالہ پرستی

''ان کے بعد'' یعنی کوہ طور پر مناجات کے لئے ان کے جانے کے بعد۔ [۱]

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ
بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ؕ
قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ
الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اور جب واپس ہوئے موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف غصہ اور رنج کے عالم میں تو کہا کتنا برا رویہ اختیار کیا تم نے میرے بعد [۲] کیا تم نے اپنے پروردگار کے حکم کے مقابلہ میں جلدی سے کام کیا [۳] اور تختیاں انہوں نے ہاتھ سے پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر ہاتھ میں لے کر اپنی طرف انہیں کھینچنے لگے، انہوں نے کہا اے میرے ماں جائے! [۴]

---

[۱]۔ من بعد مفارقة موسیٰ لهم ومضيه الی ميقات ربه (تبيان)

[۲]۔ ای بئسما عملتم خلفی (تبيان)

[۳]۔ آیا شتابی کر دید از حکم پروردگار خویش (شاہ ولی اللہ)

[۴]۔ ارادمی وذکرها اعطف لقلبه (جلالين)

یقین مانو کہ ان لوگوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں اب تم تو میرے ساتھ دشمنوں کو طعن و تشنیع کا موقعہ نہ دو اور مجھے ظالم گروہ میں قرار نہ دو۔"

"جلدی سے کام لیا" یعنی میرے آنے میں جو دیر ہوئی تو تم اللہ کی مقرر کردہ مدت ختم ہونے کا انتظار کر سکے۔[1]

شاہ عبدالقادر صاحب برادر صاحب تحفہ نے اس آیت کے مضمون سے کچھ نشیب محسوس کیا، اس لئے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

"حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امامت میں امام تھی لیکن جب ان کی جگہ خلیفہ ہوئی تو امت حکم میں نہ رہی۔ خلافت اور کی قسمت میں تھی۔ خلیفہ وہ کہ امت کو دین اور دنیا کے بندوبست میں رکھے جس طرح پیغمبر سنوار گیا تھا، نصرت حق ان کے ساتھ رہے اور امام وہ کہ پیغمبر کا یادگار رہو، جو خدمت و ایثار پیغمبر سے منظور ہو، سوامت ان سے کرے تا برکت اور قبولیت پاویں" (موضح القرآن)

قطع نظر اس سے کہ یہ دین اور دنیا کا تفرقہ خدا اور قیصر والے حقوق کی تقسیم ہے جس کی دین حق میں گنجائش نہیں، اس سلسلہ میں یہ سوال تو غور طلب بہر حال ہے کہ امت جب امام کے حکم میں نہ رہی تو حق امت کے ساتھ تھا یا امام کے ساتھ؟ اگر حق امت کے ساتھ ہوتا تو ان کی سرتابی و مخالفت کی انہیں سزا کیوں ملتی جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور اگر یہ مان لیا جائے اور ماننا بہر حال ناگزیر ہے کہ حق امام کے ساتھ ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ امام کے خلاف اجماع و شوریٰ وغیرہ جو بھی ہو، وہ باطل ہی ہوگا اور اس اجماع وغیرہ کے نتیجہ میں جو اقتدار قائم ہو، وہ برحق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا یہ کہ خلیفہ وہی ہے جو امت کو صحیح راستے پر قائم رکھے تو ظاہر ہے کہ یہ قائم رکھنا جبر یہ تو نہیں ہو سکتا جب کہ جبر کی طاقت خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا نہیں کی گئی تو خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کیوں کر ہو سکتی ہے۔

خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام بس تبلیغ کرنا ہے، اس سے زیادہ نہیں تو خلیفہ رسول کا کام اس سے زیادہ کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے؟ بلکہ خالق نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تخاطب کر کے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ اعلان کیا ہے کہ خود ہم لوگوں کو راہ راست پر لانے میں اپنی قوت قاہرہ سے کام نہیں لیتے ورنہ دنیا میں کفار کا وجود نہ ہوتا تو جب کافروں کا وجود خدا کی خدائی میں قادح نہیں اور منافقین کا رہنا پیغمبر کی رسالت کی ناکامی کا ثبوت نہیں تو مخالفین کا وجود یا ان کا برسر اقتدار آ جانا خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقاضائے منصب کے خلاف کیوں کر ہو سکتا ہے؟! خلیفہ رسول کا کام خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام سے زیادہ کیوں کر سمجھا جائے؟ اور اس بنا پر یہ تصور بالکل غلط ہے کہ حضرت ہارونؑ کی خلافت ناکام تھی اور انہوں نے اس کام کو حسن و خوبی انجام نہیں دیا تھا۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

"انہوں نے کہا پروردگارا! مجھے بخش دے اور میرے بھائی کو اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو تمام رحم کرنے

---

[1] امر ربکم ای میعاد ربکم فلم تصبروا له (مجمع البیان)

والوں میں سب سے زیادہ رحیم ہے۔ یقیناً جنھوں نے بچھڑا بنایا، انہیں پہنچے گا غضب ان کے پروردگار کی طرف سے اور ذلت اس دنیاوی زندگی میں اور ایسی ہی ہم سزا دیا کرتے ہیں غلط باتیں بتانے والوں کو اور جو غلطیاں کریں، پھر اس کے بعد توبہ کرلیں اور ایمان لائیں تو یقیناً تمہارا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

جناب موسیٰ علیہ السلام کا جناب ہارون علیہ السلام پر بظاہر عتاب

حضرت ہارون علیہ السلام نے جو اپنی صفائی پیش کی، اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً مطمئن ہو گئے اور انہیں ساتھ شامل کر کے بارگاہ الٰہی میں فضل و کرم اور رحمت کی دعائیں مانگنے لگے۔ جس میں اپنا شامل کرنا جیسے اس احساس کا ترجمان ہے کہ میں نے دوسروں کی بداعمالی کا غصہ جو بربنائے یگانگی ان پر اتارا جس میں دوسروں کی تنبیہ کی مصلحت مضمر تھی، یہ حقیقتاً اس کے مستحق نہ تھے۔ [1]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ قوم اگر امام کے ساتھ ظلم و تعدی سے کام لے تو وہ قوم ہی مجرم ہوتی ہے۔ امام پر اس سے کوئی الزام عائد نہیں ہوتا، چنانچہ اس کے بعد جو واقعی مجرم تھے یعنی گوسالہ پرستی کرنے والے انہیں ان کے جرم کی جو پاداش دنیا و آخرت میں ملنے والی ہے۔ اس کا تذکرہ ہے اور اسے شاہ عبدالقادر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ امام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا کرتا ہے جس میں آخرت کی سزا ہی نہیں ہوتی بلکہ دنیوی ذلت اور رسوائی بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کون سمجھ سکتا ہے کہ گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں کی جو رسوائیاں اور ذلتیں ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور آج بھی جس نکبت کا مشاہدہ ہو رہا ہے، اس پر ''مفکر اسلام'' ڈاکٹر اقبال کتنا ہی ''شکوہ'' کریں مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ اللہ کی طرف کے مقرر کردہ امام اور اس کے قائم کردہ نظام ہی کی مخالفت کا نتیجہ تو نہیں ہیں؟ جس کی خبر پہلے ہی قرآن نے دے دی تھی کہ: وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ۔ یعنی سنت الٰہیہ یہی ہے کہ یہی سزا ہوا کرتی ہے افتراء یعنی اللہ کی بات کے مقابلہ میں اپنی طرف سے دل بخواہ باتیں کرنے والوں کی [2] یہ افتراء قولی ہی نہیں ہوا کرتا جو اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے جنہیں یہاں سزا دی گئی ہے، لفظاً کوئی غلط بات اللہ کی طرف منسوب نہیں کی ہے بلکہ یہ عملی افتراء تھا کہ بغیر حکم الٰہی کے اپنے دل سے انہوں نے اپنا ایک معبود بنا لیا تھا جس کا تجویز کرنے والا سامری تھا، اسے بھی سزائے سخت ملی اور اس قوم کو بھی جس نے اس معبود کی پرستش کی تو یقیناً اللہ کے مقرر کردہ نظام کے بجائے دوسرے نظام کو ''دینی نظام'' کہہ کر رائج کرنا بھی بہت بڑا عملی افتراء ہے اور اس کے مقرر کردہ پیشوا کے مقابلہ میں ''سامری صفت'' اشخاص جس صاحب اقتدار کو ''گوسالہ'' بنا کر نصب کر دیں، ان کی بھی سزا اصولی طور پر وہی ہونا چاہیے جو مفترین کی ہوا کرتی ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

[1] ۔رب اغفرلی ما صنعت باخی ولاخی اشرکہ فی الدعاء ارضاء لہ وفعاللسماتہ (جلالین)

[2] ۔كذلك كما جزيناهم نجزى المفترين على الله بالاشراك وغيره (جلالين)

''اور جب موسیٰ ؑ کا غصہ فرو ہوا تو انہوں نے تختیاں اٹھالیں[١] اور ان کے لکھے ہوئے میں[٢] ہدایت اور رحمت تھی ان کے لئے جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہوں۔''

غصہ ساکن ہونے کو سکوت سے تعبیر کرنے میں ادبی حیثیت سے اس کا اظہار مضمر ہے کہ غصہ کے عالم میں وہ جو اپنے بھائی کو خفا ہو رہے تھے، وہ حقیقت میں ان کی آواز نہ تھی، ان کا غصہ تھا جو بول رہا تھا۔ اب جو وہ غصہ کے کم ہونے سے خاموش ہوئے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ غصہ خاموش ہو گیا۔[٣] لیکن چونکہ غصہ قوم کی معصیت پر تھا جس کے اظہار کا ایک طریقہ یہ بھائی کے ساتھ تخاطب تھا، اس لئے اس غصہ کو بھی شانِ رسالت کے خلاف نہیں سمجھا جاسکتا۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٦﴾ۚ

''اور موسیٰ ؑ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو[٤] ہمارے وعدہ کی جگہ کے لئے منتخب کیا۔ جب انہیں زلزلہ نے اپنی گرفت میں لیا[٥] تو انہوں نے کہا کہ پروردگار اگر تو چاہتا تو ان سب کو ہلاک کر دیتا پہلے ہی اور مجھے بھی۔ کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس کے سبب سے جو ہم میں سے احمق لوگوں نے کیا؟ یہ نہیں ہے مگر تیری طرف کی آزمائش[٦] جس سے جنہیں چاہتا ہے، ان کی گمراہی کا سامان کرتا ہے اور جنہیں چاہتا ہے تو ہدایت کرتا ہے۔ تو ہمارا مالک ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو تمام...... بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور لکھ ہمارے نصیب میں اس

---

[١] ۔ اخذ الالواح التی القاھا (جلالین)
[٢] ۔ در مکتوب وے (شاہ ولی اللہ)
[٣] ۔ السکوت فی ھٰذا الموضع احسن من السکوت لتضمنہ معنی سکوتہ عن المعاتبۃ لاخیہ مع اسکون غضبہ (تبیان)
[٤] ۔ اختیار کرد موسیٰ از قوم خود ھفتاد کس (شاہ ولی اللہ)
[٥] ۔ پکڑا ان کو زلزلہ نے (شاہ رفیع الدین)
[٦] ۔ نیست ایں حادثہ مگر امتحان تو (شاہ ولی اللہ)

دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی، ہم نے تجھ سے لو لگائی ہے [۱] ارشاد ہوا کہ میرا عذاب، اسے میں پہنچاتا ہوں جس تک چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر شئے کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں اسے لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگاری سے کام لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔"

یہ ستر آدمیوں کا انتخاب کس لئے تھا؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"تاعذر گویند از عبادت گو سالہ، این جماعت اگرچہ عبادت نکردہ بودند، برعبادت کنند گان انکار ہم نکردند پس خدائے تعالیٰ ہلاک ساخت۔" (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گزشتہ واقعہ ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اب منتخب کرنے کی نوعیت یہ قرار پاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جماعت میں سے ان افراد کو الگ کر لیا جن کے متعلق انہیں علم تھا کہ وہ گوسالہ پرستی سے الگ رہے تھے اور انہیں اس لئے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ وہ اس جرم عظیم پر قوم کیلئے بارگاہ الٰہی میں توبہ و انابت کریں مگر چونکہ علم الٰہی میں یہ لوگ بھی ایک حد تک مجرم تھے جیسا کہ حدیث میں ہے:

الراضی بفعل قوم کالداخل فیہ معھم

جو کسی جماعت کے عمل سے راضی رہے، وہ مثل اس کے ہے کہ جو ان کے ساتھ اس عمل میں شریک رہے۔

اور اسی لئے زیارت حضرت امام حسین علیہ السلام میں یہ الفاظ ہیں کہ:

لعن اللہ امۃ سمعت بذلك فرضیت بہ

اس گروہ پر اللہ کی لعنت جس نے اس ظلم عظیم کو سنا اور وہ اس پر راضی رہا۔

اس لئے خالق نے اس جماعت کو بھی ہلاک کر دیا۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کو یہ دیکھ کر منتخب کیا تھا کہ یہ گوسالہ پرستی میں شریک نہیں ہیں، اس لئے ان کے ہلاک ہونے کو انہوں نے اپنے توقعات کے خلاف محسوس کیا اور اب ان الفاظ کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا

کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس کے سبب سے جو ہم میں سے احمق لوگوں نے کیا ہے۔

احمق لوگوں سے مراد وہ ہوں گے جنہوں نے گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ دوسرے مفسرین کے بیان سے بھی شاہ صاحب کی تائید ہوتی ہے۔ [۲]

مگر ان کے صاحبزادہ نے اس آیت کا محل نزول دوسرا بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ لے گئے ستّر آدمی سردار قوم کے جب حق تعالیٰ نے کلام کیا سن کر کہنے لگے ہم جب تلک نہ دیکھیں ہمیں

---

[۱] ھدنا تبنا (جلالین)

[۲] سبعین رجلا ممن لم یعبدوا العجل بامرہ تعالیٰ ... لیعتذروا من عبادۃ اصحابھم العجل فلما اخذتھم الرجفۃ الزلزلۃ الشدیدۃ قال ابن عباس رضی اللہ عنہ لانھم لم یزایلوا قومھم حین عبدوا العجل قال وھم غیر الذین سألوا الرؤیۃ واخذتھم الصاعقۃ (جلالین)

یقین نہیں، اس سے ان پر بجلی گری اور کانپ کر مر گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس طرح دعا کی آپ کو شامل کر کے، تب بخشے گئے، پھر زندہ ہوئے، یہ شاید بچھڑا پوجنے سے پہلے تھا یا شاید پیچھے تھا۔" (موضح القرآن)

اس صورت میں یہ وہ واقعہ ہے جس کا حوالہ دوسری جگہ قرآن میں اس طرح ہے کہ:۔

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً

انہوں نے موسیٰ ؑ سے تو اس سے بڑا سوال کیا تھا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دیجئے۔ (نساء: ۱۵۳)

ہمارے مفسرین نے دونوں قول نقل کئے ہیں [1] اور بعض نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے [2] مگر جناب موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ بعد والے، اس صورت میں زیادہ چسپاں نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ اس صورت میں جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ خود مجرم تھے۔ پھر یہ کہنا کیسا کہ: "جو ہم میں کے احمق لوگوں نے کیا، اس کی وجہ سے کیا تو ہمیں ہلاک کر دے گا؟"

آخر میں جو خالق کا ارشاد ہے کہ "میں اپنی رحمت ان کے نصیب میں لکھوں گا جو پرہیزگار ہوں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے" اس سے مراد امت محمدیہ کو لیا گیا ہے، غالباً اس بنا پر کہ اس کے بعد بلا فاصلہ یہ آیت ہے کہ

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ. (اعراف۔ ۱۵۷)

جس کی تفسیر ابھی آئے گی۔ اس میں بلا شبہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ماننے والوں کا ذکر ہے لہٰذا یہ فقرات انہی سے متعلق ہونا چاہیے اور اب اس کا تعلق پہلے کے واقعہ سے کیا ہے؟ اسے شاہ عبدالقادر صاحب یوں لکھتے ہیں کہ:

"حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے حق میں دنیا اور آخرت کی نیکی جو مانگی، مراد یہ تھی کہ سب امتوں پر مقدم رہیں دنیا اور آخرت میں۔ فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی فرقہ پر مخصوص نہیں۔ سو عذاب تو اس پر ہے جس کو اللہ چاہے اور رحمت کاملہ لکھی ہے ان کے نصیب میں جو اللہ کی ساری باتیں یقین کریں گے یعنی آخری امت کہ سب کتابوں پر ایمان لاویں گے سو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لائے، وہ پہنچے اس نعمت کو اور حضرت موسیٰ کی دعا اس کو لگے۔" (موضح القرآن)

یہ الفاظ قرآنی کے رو سے بھی بعید نہیں ہے۔ اس لئے کہ سورہ بقرہ کے آغاز میں قرآنی ہدایت سے جو فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کے لئے یہی اوصاف وارد ہوئے ہیں کہ:

لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ (بقرہ)

ان پرہیزگاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کی پابندی قائم رکھتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں۔ ان اوصاف کا مضمون اس کے بالکل مطابق ہے جو یہاں ذکر ہوا ہے کہ:۔

لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۵۶ (اعراف)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اصطلاح قرآنی میں اس امت کے ایمان و عمل صالح رکھنے والے افراد کا سرنامۂ تعریف یہی اوصاف ہیں کہ

---

[1] ۔ قولان احدهما لانهم سألوا الرؤية في قول ابن اسحاق الثاني قال ابن عباس لانهم لا ينهوا عن عبادة العجل (تبیان)

[2] ۔ هو الصحيح ورواه علي بن ابراهيم في تفسيره (مجمع البيان)

جو وہاں بیان ہوئے ہیں۔ انہی کو کہیں پھیلا کر بہت سے اوصاف پر تقسیم کر دیا گیا ہے جیسے سورۂ مومنون میں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ سے لے کر بہت دور تک جو ایک اوصاف کا کس سلسلہ مذکور ہے، یہی اوصاف سمٹ جائیں تو المتقین کے ایک لفظ سے ادا ہوں اور یہی پھیل جائیں تو بہت سے جملوں کی شکل اختیار کریں۔

آخر میں جو دو فقرے ہیں:

(۱) ''میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔''

(۲) ''میں اسے لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگاری سے کام لیں گے۔''

یہ اس بنا پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں دنیا کا بھی ذکر تھا اور آخرت کا بھی تو اس کا جواب بطور لف ونشر اس طرح ہے کہ دنیا والی رحمت تو ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ وہی رحمت ہے جو رحمٰن کے لفظ میں مضمر ہے اور آخرت والی رحمت، اس کا خاص معیار ہے اور وہ ایمان و تقویٰ جو ان جوہروں کے حامل ہوں گے وہ ان کے نصیب میں ہوگی۔ [1]

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷

''جو پیروی کریں اس پیغمبر کی جو وہی نبی اُمّی ہے جسے وہ اپنے پاس لکھا ہوا پاتے ہیں توریت اور انجیل میں، جو انہیں ہدایت کرتا ہے نیک کام کی اور انہیں روکتا ہے برے کرتوت سے اور ان کے لئے صاف ستھری چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ان پر گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان زنجیروں کو جو ان پر تھیں تو جو اس پر ایمان لائیں اور اس کی عظمت کو مدنظر رکھیں اور اس کی مدد کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اس کے ہاتھ اتاری گئی ہے، یہی لوگ ہر طرح کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں۔''

''النبی'' اس کے اوصاف اور توریت وانجیل میں اس کا تذکرہ

چونکہ اس آیت کو عام طور پر گزشتہ آیات سے مرتبط سمجھا گیا ہے، اس لئے یہ تمام اوصاف اسی سلسلہ کے ہوں گے کہ میں اپنی رحمت لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگار ہوں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے اور اس صورت میں یہاں بھی تمام

---

[1] رحمتي وسعت كل شئ في الدنيا فسا كتبها في الآخرة للذين يتقون الخ (جلالين)

افعال مستقبل سے تعلق رکھتے ہوں گے یعنی جو پیروی کرتے ہوں گے اس پیغمبر کی۔ [1]

مگر وہ آیت خالق کے اس خطاب کی حیثیت رکھتی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ اس خطاب کے ذیل میں انجیل کے تذکرہ کو ذہن قبول نہیں کرتا اور جب کہ ترتیب قرآن مسلم مطابق تنزیل نہیں ہے تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اسے گزشتہ آیات سے مرتبط کیا جائے بلکہ اس آیت کے مضمون پر الگ سے نظر کرنا چاہیے اور "الذین آمنوا" کس موصوف کی صفت ہے؟ اس کے صحیح مقام کو نظم قرآنی میں لامعلوم سمجھنا چاہیے۔

"بوجھ کو اتارتا ہے اور ان زنجیروں کو جو ان پر تھیں" اس سے مقصود وہ سخت احکام ہیں جو گزشتہ انبیاء کی امتوں کے لئے تھے۔ [2]

ان مومنین کے اوصاف میں "امنوا بہ" کے ساتھ "وعزّروہ" جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کی عظمت کو مدنظر رکھتے اور آپ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ [3]

ان کے لئے سرمۂ چشم ہے جو تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو داخل شرک قرار دیتے ہیں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

"کہیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا اس اللہ کا پیغمبر ہوں جس سے مخصوص ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت، کوئی خدا نہیں سوا اس کے جو جلاتا اور مارتا ہے تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امّی پیغمبر پر جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، شاید کہ تم صحیح راستے پر آ جاؤ۔"

رسالت محمدی کی ہمہ گیری

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ ہمہ گیر اعلان رسالت ہے جس میں کسی قوم وقبیلہ، کسی ملک بلکہ کسی دور کی بھی تخصیص نہیں ہے جس میں خطاب کی عمومیت ہی ہمہ گیری کے لئے کافی تھی اور پھر "جمیعا" کے لفظ نے اس میں اور قوت پیدا کر دی۔ [4]

اس کے برخلاف کسی ایک جگہ بھی قرآن میں یا ایھا العرب، کہہ کے آواز نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے اس دور کے بعض سیکولر قسم کے افراد کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو ان الفاظ میں ماننا کہ وہ عرب قوم کی ہدایت کے لئے آئے تھے اور انہوں نے قوم عرب کو بہت اچھی تعلیم دی اور وہ بڑے درجہ کے رسول تھے وغیرہ وغیرہ، یہ رسالت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس پیغام کے ساتھ جو آپ نے پیش کیا تھا کفر ہی ہے۔ دینی اصطلاح میں جیسا کہ کلمات معصومینؑ سے معلوم ہوا ہے، رسالت کا منصب نبوت سے بالا ہے پھر ان دونوں آیتوں میں "رسول" کہہ کر

---

[1] خواھد نوشت رحمت اخرویہ برای آنانکہ پیروی می کنند (شاہ ولی اللہ)

[2] امر ھم یعنی الثقل بامور محرمۃ فی تکلیفھا مشقۃ کتحریم العروق والغدد وتحریم السبت (تبیان)

[3] تعظیم کردند اور را (شاہ ولی اللہ) عزّروہ وقرّوہ (جلالین)

[4] امر سبحانہ نبیّنا ان یخاطب جمیع الخلق من العرب والعجم (مجمع التبیان)

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصف ''نبی'' کے ساتھ کیوں لایا گیا ہے؟ اس کا راز بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اور اس کا حوالہ گزشتہ آیت میں دیا بھی گیا ہے کہ: يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وہ اسے پا رہے ہیں لکھا ہوا توریت میں بھی اور انجیل میں بھی''......ان دونوں کتابوں میں اب بھی وہ فقرے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے ماسلف نے اس پیغمبر کے آنے کی اطلاع ''وہ نبی'' کہہ کر دی تھی۔ گویا کہ اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لقب انبیاء کی زبان میں "النبی" تھا۔ اسی لئے قرآن میں خالق کی طرف سے آپ کے ساتھ تخاطب اکثر "یا ایھا النبی" کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور ان دونوں آیتوں میں رسول کہنے کے بعد آپ کو "النبی" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

''اور موسیٰؑ کی قوم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو حق کا رستہ دکھاتے ہیں اور اس کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں''[۱]

جن کا یہ وصف ہوگا، وہ حق کی آواز پہنچنے پر اسے قبول کر ہی لیں گے لہٰذا وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان اختیار کر لیں گے اور جو ان کی کتابوں میں آپ کی بشارتیں ہیں، وہ دوسرے لوگوں کو بھی سنا کر انہیں ایمان کی دعوت دیں گے۔

لیکن بعض روایات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ امۃ مسلمہ یعنی مسلمان قوم سے الگ ایک طبقہ کا پتہ دیا جا رہا ہے جو کسی دور دراز مقام پر بسا ہوا ہے اور وہ صحیح معنی میں شریعت موسوی پر عامل ہوتے ہوئے خالق کی توصیف وثناء کا مستحق ہوا ہے[۲] اور چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اس تک پہنچی ہی نہیں لہٰذا اس کے لئے وہی شریعت موسوی پر قائم رہنا نجات کے لئے کافی قرار پایا ہے۔[۳]

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

''اور ہم نے انہیں بارہ نسلوں کے اعتبار سے[۴] گروہوں میں تقسیم کیا اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی جب ان سے ان کی قوم نے پانی پلانے کی درخواست کی کہ تم اپنی لکڑی کو مارو پتھر پر تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ

---

[۱] ای بالحق یکون ویعدلون فی حکمھم (مجمع البیان)

[۲] قال ابو جعفر علیہ السلام ھم قوم خلف الرمل لم یغیروا ولم یبدلوا (تبیان)

[۳] لا یمنع ان یکون قوم لم تبلغھم الدعوۃ من النبی علیہ السلام فلا نحکم بکفرھم (تبیان)

[۴] اسباطا ای قبائل (جلالین)

پڑے۔ ہر گروہ نے اپنا پانی گھاٹ جان لیا اور ہم نے ان پر ابر کا سایہ کیا اور ان پر من وسلوٰی اتارا کہ کھاؤ اچھی غذاؤں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔"

اسباط بنی اسرائیل کی تعداد

اللہ کے جتنے احکام ہوتے ہیں، وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ خود ان کا نقصان ہوتا ہے، اس اعتبار سے اکثر جگہ کافروں اور بداعمالوں کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ ہم پر ظلم تھوڑی کرتے ہیں خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یعنی بھگتان اس ظلم کا انہی کو بھگتنا پڑتا ہے اور نقصان انہی کا ہوتا ہے[1] ورنہ جہاں تک ان کے کردار کا تعلق ہے، یہ بے شک اللہ پر ظلم کرتے ہیں کہ اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے جیسا کہ شرک کے لئے قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔ (لقمان۔ ۱۳)

واقعات اس آیت میں جتنے بیان ہوئے ہیں ان کا ذکر قرآن میں آچکا ہے اور وہاں ان کی تشریح ہو چکی ہے۔

وَاِذۡ قِيۡلَ لَهُمُ اسۡكُنُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ وَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ وَقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا نَّغۡفِرۡ لَـكُمۡ خَطِيۡٓـٰٔتِكُمۡ‌ؕ سَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾

"اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں جا کر قیام کرو اور وہاں جس جگہ سے چاہو کھاؤ اور "حِطّۃ" کہو اور دروازہ میں داخل ہو سجدہ کرتے ہوئے تو ہم تمہاری غلطیوں کو معاف کر دیں گے جو نیک اعمال والے ہیں، ان کو زیادتی عطا کریں گے تو جو ان میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے، انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل کر دوسری بات کہہ دی تو ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے رہتے تھے۔"

اس واقعہ کا ذکر پہلے پارہ میں ہو چکا ہے۔

وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ‌ۘ اِذۡ يَعۡدُوۡنَ فِى السَّبۡتِ اِذۡ تَاۡتِيۡهِمۡ حِيۡتَانُهُمۡ يَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا وَّيَوۡمَ لَا يَسۡبِتُوۡنَ‌ ۙ لَا تَاۡتِيۡهِمۡ‌ ‌ۛۚ كَذٰلِكَ‌ ‌ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾

"اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی جب کہ وہ ہفتے کے دن کے بارے میں حد سے قدم

---

[1] معناہ ما نقصونا شیئا ولکن نقصوا انفسھم (تبیان)

آگے بڑھاتے تھے، جب کہ ان کے پاس ان کی مچھلیاں کھلے بندوں آتی تھیں اس دن جب وہ ہفتہ کے احترام کے پابند ہوتے تھے [1] اور جب ہفتہ کا دن نہیں ہوتا تھا [2] تو وہ نہیں آتی تھیں۔ یوں ہم ان کی آزمائش کرتے تھے، اس بنا پر کہ وہ بداعمالیاں کیا کرتے تھے"۔

اہل سبت کا ذرا تفصیلی تذکرہ

یہ بستی کون سی تھی؟ اس میں کئی قول ہیں جن میں سے کوئی بھی مستند نہیں ہے [3] لہٰذا اس کی تعیین وثوق کے ساتھ بالکل نہیں ہوسکتی۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿١٦٤﴾

"اور جب ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ کیوں نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں بہت سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے تو انہوں نے کہا کہ صرف اپنے پروردگار کے پاس عذر پیش کرنے کے لئے اور یہ کہ شاید وہ پرہیز گاری اختیار کریں۔"

اسے گزشتہ آیت کے سلسلہ ہی میں لیا جائے تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ ان اصحاب سبت کو نصیحت کرنے والے افراد سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہیں نصیحت کرنے سے فائدہ کیا ہے؟ [4]

مگر اس کے قبل کی آیات میں چونکہ اس نصیحت اور ان نصیحت کرنے والوں کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسی سلسلہ کی آیت ہے۔ پھر بھی چونکہ اس کے بعد کی آیتیں زیادہ واضح طور پر انہی لوگوں کے بارے میں ہیں جو اصحاب السبت تھے لہٰذا اس آیت کا بھی اسی سلسلہ میں ہونا زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ مضمون اس کا کسی ایسے ہی موقع سے متعلق ہے جس میں کچھ مرتکب گناہ ہوں، کچھ انہیں نصیحت کرتے ہوں اور کچھ لوگ تماشائی کے طور پر خاموش ہوں اور یہ خاموش رہنے والے ہی وہ ہیں جو نصیحت کرنے والوں کو یہ کہہ کر منع کرتے ہیں [5] کہ آخر انہیں نصیحت کرنے سے فائدہ کیا؟ یہ لوگ تو کم بخت عذاب کے مستحق ہو ہی رہے ہیں۔ اس پر وہ لوگ جو نصیحت کر رہے ہیں یہ جواب دیتے ہیں۔

چونکہ وہ امت جو اپنی بداعمالی سے عذاب کی حقدار ہوتی ہے جب اس پر عذاب آیا کیا ہے، تو اس نے ان لوگوں کو بھی گھیر لیا ہے جو ان کے ساتھ اصل عمل میں شریک نہ تھے مگر خاموش رہے تھے جیسا کہ اس کے پہلے گوسالہ پرستی کے سلسلہ میں آچکا ہے، اس لئے ان نصیحت کرنے

---

[1] روزی کہ ایشاں بتعظیم شنبہ مشغول می شدند (شاہ ولی اللہ)

[2] یوم لا یکون السبت (مجمع البیان)

[3] هي ايلة عن ابن عباس وقيل هي مدين عنه ايضا وقيل الطبرية عن الزهري (مجمع البيان)

[4] فكانوا اثلث فرق: فرقة قانصة وفرقة ساكنة وفرقة واعظة (مجمع البيان) اهل دیہ سہ قسم بودند قسمی شکار می کردند و قسمی ازاں نہی می کردند و قسمی نہ شکار کردند و نہ ازاں منع کردند (فتح الرحمن)

[5] فقال الساكتون للواعظين والناهين (مجمع)

والوں کا یہ کہنا کہ ”پروردگار کے پاس عذر پیش کرنے کے لئے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نصیحت کرنے کے بعد کم از کم پیش خدا ہم معذور قرار پائیں گے، اس لئے اس عذاب کا استحقاق نہ ہوگا جس کا سکوت کی صورت میں اندیشہ ہے۔[1]

پھر آخری فقرہ: ”لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ“ یہ بتلاتا ہے کہ ان کی طرف سے بالکل مایوسی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی پر کوئی اثر نصیحت کا نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ کوئی ان میں سے نصیحت کا اثر قبول ہی کرلے[2] تو وہ اس نصیحت کا پورا ماحاصل ہوگا اور اس لئے یہ اس اصول کے خلاف بھی نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کی شرط ہے کہ سننے والے کے اثر لینے کا کم از کم احتمال ہو، ورنہ یہ فریضہ عائد نہ ہوگا۔

فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖۤ اَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ وَاَخَذۡنَا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۭ بَـئِيۡسٍۭ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوۡا عَنۡ مَّا نُهُوۡا عَنۡهُ قُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـئِيۡنَ ﴿۱۶۶﴾

”تو جب انہوں نے بھلا دیا اسے جو انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے انہیں نجات دے دی جو برائی سے روکتے رہتے تھے اور انہیں کہ جو ظالم تھے، ان کی بداعمالی کے سبب سے سخت عذاب میں گرفتار کر دیا اور جب انہوں نے سرکشی کی ان چیزوں کے بارے میں جن سے وہ روکے جاتے تھے تو ہم نے انہیں کہا کہ ہو جاؤ ذلیل بندر۔“

اہل سبت کا عذاب الٰہی سے مسخ ہو جانا

پہلی آیت میں چونکہ نجات کو روکنے والوں سے مخصوص قرار دیا گیا ہے، اس لئے ظالموں کے تحت میں وہ بھی داخل سمجھے جا سکتے ہیں جو خاموش رہے اور اس طرح عذاب ان کے لئے بھی ثابت ہوگا مگر دوسری آیت میں جو کہا گیا کہ ”انہوں نے سرکشی سے کام لیا ان چیزوں میں کہ جن سے وہ روکے جاتے تھے“ اس سے مراد وہی ہو سکتے ہیں جو اصل مرتکب تھے کیوں کہ روکے وہی جاتے تھے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ عذاب الٰہی ان کے لئے نہیں تھا جو عملاً ان سے علیحدہ رہتے تھے، اگرچہ خاموش رہے ہوں۔

ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ پہلی آیت کی بنا پر ظالمین کے لفظ کو دونوں پر حاوی سمجھا جائے اور اس طرح وہ عذاب جو ظلم کے نتیجہ میں ہے دونوں کے لئے ہو لیکن یہ خاص عذاب یعنی بندروں کی شکل میں مسخ ہونا، انہی لوگوں کے لئے ہو جو اصل میں مرتکب گناہ تھے۔

بہرحال ان خاموش رہنے والوں کے لئے آیت کے الفاظ سے کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلتا جسے صدر اول کے مفسرین بھی پیچیدہ مسئلہ سمجھتے رہے تھے[3]۔

---

[1] لئلا ینسبتا الیٰ تقصیر فی ترك النهی (جلالین)

[2] لعلهم یتقون الصید (جلالین)

[3] قال ابن عباس ما ادری ما فعل بالفرقة الساکتة وقال عکرمة لم تهلك لانها کرهت ما فعلوه وقالت لم تعظون الخ وروی الحاکم عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انه رجع الیه واعجبه (صافی) روی عن ابن عباس فیهم ثلثة اقوال (مجمع البیان)

اس ذیل میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جناب ابن عباسؓ اس آیت کو اپنے دور کے حالات پر منطبق کر کے روتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہم اس وقت اسی تیسرے گروہ میں داخل ہیں اور اس لئے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔ [1]

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبۡعَثَنَّ عَلَيۡهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ يَّسُوۡمُهُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ‌ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۶۷﴾

"اور جب کہ تمہارے پروردگار نے یہ اطلاع دے دی ہے [2] کہ وہ ان کے خلاف قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے رہیں گے یقیناً تمہارا پروردگار بہت جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بلاشبہ بڑا بخشنے والا بھی ہے، بڑا مہربان۔"

یہ آیت یہود کے لئے بظاہر حکم قطعی کی حیثیت رکھتی ہے کہ روز قیامت تک برابر ایسے افراد کے ہاتھ میں مبتلا رہیں گے جو انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں چنانچہ بارہ تیرہ سو برس کا مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا رہا۔ اس لئے یہ حکم ہمیشہ اٹل سمجھا جاتا رہا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ خود اسی آیت میں آخری جملہ کو "وہ بلاشبہ بڑا بخشنے والا بھی ہے، بڑا مہربان"۔ اس کی گنجائش پیدا کرتا ہے کہ یہ قوم بھی اپنے کردار کی کبھی اگر اصلاح کر لے تو جس حد تک وہ اصلاح کرے، اس حد تک یہ عذاب کم یا برطرف بھی ہوسکتا ہے۔

خیر، یہ تو یہود کا معاملہ ہے مگر یہاں پر شاہ عبدالقادر صاحب کا یہ نوٹ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:

"یہ احوال اس امت کو سنایا ہے کہ یہ سب کچھ ان پر بھی ہوگا۔" (موضح القرآن)

اسے یاد رکھیں وہ افراد امت جو اپنی نکبت پر اللہ سے "شکوہ" کرنے بیٹھتے ہیں۔

وَقَطَّعۡنٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اُمَمًا‌ ۚ مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰ لِكَ‌ ۚ وَبَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۶۸﴾

"اور ہم نے انہیں دنیا میں بہت سی جماعتوں کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان میں نیک لوگ ہیں اور ان میں ان کے علاوہ بھی ہیں اور ہم نے بھلائیوں اور برائیوں کے ساتھ ان کی آزمائش کی، شاید وہ اللہ سے لو لگائیں"۔ [3]

یہ ھُم کی ضمیر بنی اسرائیل کی طرف ہے کہ ان کے بہت سے جتھے ہو گئے۔

"بھلائیوں اور برائیوں کے ساتھ" یعنی کبھی دنیا کے راحت و آرام اور اقتدار و دولت کے ساتھ ان کی آزمائش کی اور کبھی تکلیف و

---

[1] ۔روی عن عطا ان رجلہ دخل علیٰ ابن عباس وبین یدیہ المصحف وھو یبکی وقد اتی علیٰ ھٰذہ الاٰیۃ الیٰ اخرھا فقال ابن عباس قد عملت ان اللہ اھلک الدین اخذ واالحیتان وانجا الذین نھو ھم ولا ادری ماصنع بالذین لم ینھو ھم ولم یواقعوا المعصیۃ وھی حالنا (تبیان)

[2] ۔معنی "تأذن" اعلم (تبیان)

[3] ۔ای یرجعوا الیٰ طاعہ وینیبوا الیٰ امتثال امرہ (تبیان)

اذیت اور مصیبت ونکبت میں مبتلا کر کے [1] کہ ان میں سے ہر ایک چیز باختلاف مزاج وطبیعت اصلاح کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

''تو ان کے بعد ایسے ناخلف [2] توریت کی ذمہ داری کے حامل ہوئے جو اس دنیا کے عارضی ساز وسامان [3] کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو بخش ہی دیئے جائیں گے، اور اگر اتنا ہی اور عارضی ساز وسامان ہاتھ آئے تو اس پر بھی قبضہ کریں۔ کیا ان سے توریت والا یہ عہد و پیمان نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی نسبت نہ کہیں کوئی بات سوا حق کے اور انہوں نے پڑھا ہے اسے جو اس میں ہے اور آخرت والا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگار ہوں، پھر کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟!''

ان ناخلفوں سے جو توریت کے وارث ہوئے علمائے یہود مراد ہیں [4] جن کا سب سے بڑا برائیوں کا سرچشمہ قرآن نے دنیا طلبی کو قرار دیا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ علماء کے طبقہ میں یہی فساد کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے جس سے ان کے علیٰحدہ رہنے کی ضرورت ہے۔

اور یہ جو ارشاد ہوا کہ ''اتنا ہی عارضی ساز وسامان اور ہاتھ آئے تو اس پر بھی قبضہ کرلیں''، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا طلبی کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں جس پر کبھی ان میں ندامت و پشیمانی بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کو اپنی کامیابی و کامرانی سمجھتے ہیں [5] اور اس کے بعد بھی مغفرت کا تصور رکھتے ہیں حالانکہ مغفرت تو اس کی ہوتی ہے جو گناہ پر اصرار نہ رکھتا ہو [6] اور گناہ پر اصرار کے باوجود مغفرت کا تصور ہی خدا پر ایک طرح کا بہتان ہے، اس لئے کہ اس نے کبھی ایسا وعدہ نہیں کیا۔ [7]

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

---

[1] ۔ بلوناهم بالنعم والنقم والرخاء الشدة (مجمع البيان)
[2] ۔ جانشینان بد (شاہ ولی اللہ) برے جانشین (شاہ رفیع الدین)
[3] ۔ العرض مايعرض ويقلّ لبثه (مجمع البيان)
[4] ۔ يعنى احبار بنى اسرائيل (فتح الرحمن)
[5] ۔ دليل علىٰ اصرارهم (تبيان)
[6] ۔ اى يرجون المغفرة وهم عائدون الى ما فعلوه مصرون عليه (جلالين)
[7] ۔ فلم كذبوا عليه بنسبة المغفرة اليه مع الاصرار (جلالين)

''اور جو لوگ کتاب کے ساتھ تمسک رکھتے ہیں [1] اور جو ''صلوٰۃ'' ادا کرتے رہے ہیں تو بلا شبہ ہم درست اعمال رکھنے والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتے۔''

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دور فترت میں یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کے پہلے اہل کتاب میں ایسے لوگ تھے جو انبیاء کے تعلیمات کی پیروی کرتے تھے اور جو اس وقت طریقۂ عبادت تھا اور اس دور میں ''صلوٰۃ'' سے موسوم وہی طریقہ تھا، اس پر قائم تھے۔ یہ پیش خدا ضرور اجر پائیں گے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اب جنہوں نے توریت وغیرہ کی بشارتوں پر عمل کرتے ہوئے رسول ﷺ پر ایمان اختیار کیا اور نماز ادا کی یعنی مسلمان ہوئے اور اس طریقہ سے عبادت کرنا اختیار کیا، وہ نجات پائیں گے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

''اور جب ہم نے پہاڑ جڑ سے اکھاڑ کر بلند کیا ان پر جیسے کہ وہ ایک سائبان ہے اور انہیں گمان ہوا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے کہ لو اسے جو ہم نے تمہیں دیا ہے مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھنا اسے جو اس میں ہے، شاید تم بچاؤ کا سامان کرلو۔''

پہاڑ کے اونچا کرنے کا ذکر پہلے کئی مقامات پر آچکا ہے، یہاں جو لفظ صرف کیا گیا ہے، اس کے معنی میں ''جڑ سے اکھاڑنے'' کے پہلو کا اضافہ ہے [2] یعنی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ پہاڑ کا کوئی ٹکڑا الگ ہو کر ان کے سر پر بلند ہو گیا ہو بلکہ پہاڑ سرتاسر نہ سہی تو کم از کم اس کا وہ جزء جو ان کے حدِ نظر کے سامنے ہے، پورا زمین سے اکھڑ کر اونچا ہوا اور ان کے سر پر سایہ افگن ہوا جیسے کہ وہ ان پر گرا چاہتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

''اور جب کہ تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو لیا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں، اس لئے کہ [3] کہیں تم بروز قیامت

[1] - يمسكون بالكتاب و يمسكون و يتمسكون و ستمسكون بمعنى واحد (تبيان)
[2] - النتق قلع الشىء من الاصل (مجمع البيان)
[3] - این شاهد گرفتن برای احتراز از آں است که نگویند (شاه ولی الله)

یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے یا تم کہو کہ اصل شرک تو ہمارے باپ دادا نے پہلے کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل تھے تو کیا تو ہمیں ہلاک کرے گا اس سبب سے جو باطل پرستوں نے کیا اور اس طرح ہم حقیقتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور شاید وہ رجوع کریں''۔[1]

عہد اَلَست اور عالم ذر

اس آیت کی بنا پر ''عالم ذر'' اور ''روزِ الست'' کے محاورات مسلمانوں میں رائج ہوئے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قبل تخلیق ظاہری ایک وقت ایسا تھا کہ تمام اولاد آدم علیہ السلام کسی خاص شکل میں بیک وقت جمع کی گئی تھی اور اس سے یہ سوال و جواب ہوا تھا۔

بعض لوگ اسے کسی ایک دن کی بات نہیں قرار دیتے بلکہ اسے رفتہ رفتہ جو نسلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں ان سب کے متعلق بیانِ حال کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ عجیب ہیں جن سے شروع میں سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس کے قائل ہیں جو مشہور عقیدہ ہے کہ یہ کوئی خاص دن تھا اور بعد میں کچھ ایسا کہہ دیا ہے جو دوسرے تصور کا پتہ دیتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

یعنی روز میثاق از آدم اولاد اورا پیدا کرد و از ایشان اولاد ایشان را بترتیبی که در خارج متحقق شود (فتح الرحمٰن)

یعنی عہد الست کے دن آدمؑ سے ان کی اولاد کو پیدا کیا اور ان سے ان کی اولاد کو اس ترتیب سے جو ان کی وجود خارجی میں واقع ہوگی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کو واضح طور پر قبل تخلیق سے متعلق قرار دیا ہے مگر یہ زیادہ صاف نہیں کہ یہ معاملہ بحیثیت مجموعی سب سے ایک ہی دن ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کرایا اپنی خدائی کا اور پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ کہ خدا کو ماننے میں ہر کو آپ کی بات ہے۔ باپ کی تقلید نہیں۔ اگر باپ شرک کرے تو بیٹا ایمان لاوے، اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا۔ پھر کیا حاصل تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں رہا ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق ہے۔ سارا جہاں قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے اور جو شرک کرتا ہے، سوا اپنی عقل ناقص کے دخل سے، پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے'' (موضح القرآن)

جو سوال ممدوح نے اٹھایا ہے، اس کا جواب صاحب جلالین نے یوں دیا ہے:

و التذ کیر بہ علی لسان صاحب المعجزة قائم مقام ذکرہ فی النفوس.

صاحب اعجاز کی زبانی اس کی یاددہانی قائم مقام ہے اس کی کہ خود اپنے ذہن میں اس واقعہ کی یاد موجود ہوتی۔

ہمارے بعض بالغ نظر علماء جنہیں جرأتِ تحقیق عطا ہوئی تھی اور وہ مخالفت جمہور میں سطحی نگاہ والوں کی طرف سے انکارِ مسلمات کے الزام کی پرواہ نہیں رکھتے تھے جیسے علم الہدیٰ جناب سید مرتضیٰؒ ''امالی'' میں اور شریف رضی موسوی ''حقائق للتاویل'' میں اور جناب شیخ الطائفہ ''تبیان'' میں اس شہرت عامہ کو الفاظ قرآنی اور عقل کے خلاف قرار دیتے ہیں اور انہوں نے اس کا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے جس کے بعد وہ سوال جو مذکورہ تصور

---

[1] نبینہا مثل ما بینا المیثاق لیتدبروھا ولعلھم یرجعون عن کفرھم (جلالین)

میں اٹھ رہا تھا ختم ہو جاتا ہے چنانچہ انہی قدیم اکابر علماء کا تتبع کرتے ہوئے اس نقطۂ نظر کو جناب امین الاسلام علامہ طبرسیؒ نے ''مجمع البیان'' میں چونکہ کافی وضاحت کے ساتھ درج کیا ہے لہٰذا اس بحث کی اہمیت کے پیش نظر اس مقام پر اس تفسیر کی پوری بحث کو جو اس آیت کے متعلق ہے عیون الفاظ کے ساتھ مع ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

ذکر سبحانه ما اخذ على الخلق من المواثيق بعقولهم عقيب ما ذكره من المواثيق التى فى الكتب جمعا بين دلائل السمع والعقل وابلاغا فى اقامة الحجة فقال: واذا خذ ربك اى واذ كر لهم يا محمد اذا خرج ربك من بنى اٰدم من ظهور هم اى من ظهور بنى اٰدم ذريتهم واشهد هم علٰى انفسهم الست بربكم قالوا بلٰى، اختلف العلماء من العام والخاص فى معنى هٰذه الاٰية وفى هٰذا الاخراج والاشهاد علٰى وجوه! احدها ان الله تعالٰى اخرج ذرية اٰدم من صلبه كهيئة الذر فعرضهم علٰى اٰدم وقال انى اٰخذ علٰى ذريتك ميثاقهم ان يعبدونى ولا يشركوا بى شيئاً ثم قال لهم الست بربكم قالوا بلٰى شهدنا انك ربنا فقال للملٰئكة اشهد وافقالوا شهدنا وقيل ان الله تعالٰى جعلهم فهمآء عقلآء يسمعون خطابه ويفهمونه ثم ردهم الٰى صلب اٰدم و الناس محبوسون باجمعهم حتى يخرج كل من اخرجه فى ذٰلك الوقت وكل من ثبت على الاسلام فهو على الفطرة الاولٰى ومن كفر وجحد فقد تغير عن الفطرة اولاولى عن جماعة من المفسرين وردوا فى ذلك اٰثارا بعضها مرفوعة وبعضها مرفوعة يجعلونها تاويلا للاٰية ورد المحققون هٰذا التاويل وقالوا انه مما يشهد ظاهر القراٰن بخلافه لانه تعالٰى قال: واذ اخذ ربك من بنى اٰدم ولم يقل من اٰدم وقال من ظهور هم ولم يقل من ظهره وقال ذريتهم ولم يقل ذريته ثم اخبر تعالٰى بانه فعل ذٰلك لئلا يقولوا انهم كانوا عن ذٰلك غافلين او يعتذر وابشرك اٰ بائهم وانهم نشأوا بينهم وهٰذا يقتضى ان يكون لهم اٰبآء مشركون فلا يتناول الظاهر ولد اٰدم لصلبه وايضاً فان هٰذه الذرية المستخرجة من صلب اٰدم لا يخلوا ما ان جعلهم الله عقلاء اولم يجعلهم كذٰلك فان لم يجعلهم عقلاء فلا يصح ان يعرفوا التوحيد وان يفهوا خطاب الله تعالٰى وان جعلهم عقلاء واخذ عليهم الميثاق فيجب ان يتذكر واذٰلك ولا ينسوه لان اخذ الميثاق لا يكون حجة على الماخذ عليه الا ان يكون ذاكر اله فيجب ان نذكر نحن الميثاق ولانه لايجوز ان ينسى الجمع الكثير والجمّ الغفير من العقلاء شيئا كانوا عرفوه وميزوه حتٰى لا يذكره احد منهم وان طال العهد الاترٰى ان اهل الجنة يعرفون كثيرا من احوال الدنيا حتى يقول اهل الجنة ان قد وجدنا ما وعد ربنا حقا ولو جاز ان ينسوا ذٰلك مع هذ الكثرة جاز ان يكون الله تعالٰى قد كلف الخلق فيما مضى ثم اعادهم اما ليثيبهم واما ليعاقبهم ونسوا ذٰلك وذٰلك يؤدى الى التجاهل والى صحة مذهب الناسخته.

خداوند عالم نے ان عہد و پیمان کے واقعات کے ذکر کے بعد جو کتب سماوی میں خلقِ خدا سے لئے گئے تھے، اس عہد و پیمان کا ذکر کیا ہے جو ان سے ان کے عقل وضمیر کے ذریعہ سے لئے گئے ہیں تاکہ نقلی اور عقلی دلائل ہم آہنگ ہو جائیں اور استدلال میں کوئی پہلو باقی نہ رہ جائے تو ارشاد کیا: اور وہ موقع جب تمہارے پروردگار نے لیا یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ ہنگام یاد دلایئے جب آپ کے پروردگار نے اولاد آدم سے ان کی

پشتوں سے یعنی اولاد آدم کی پشتوں سے برآمد کیا ان کی نسل کو اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ سنّی اور شیعہ علماء کے درمیان اس آیت کے معنی اور اس برآمد کرنے اور گواہ بنانے کے بارے میں اختلاف ہوا ہے جس میں چند قول ہیں:۔ پہلے یہ کہ خداوند عالم نے آدمؑ کی نسل کو جو ان کے صلب سے پیدا ہونے والی تھی، چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں (ذروں) کی شکل میں برآمد کر کے ان سب کو آدم کے سامنے پیش کیا اور کہا میں تمہاری نسل سے عہد و پیمان لینا چاہتا ہوں کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں پھر ان سب سے کہا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم اس کے گواہ ہیں کہ تو ہمارا پروردگار ہے، تو فرشتوں سے ارشاد ہوا کہ تم گواہ رہنا انہوں نے کہا ہم گواہ ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ نے ان کو فہم و عقل عطا کی کہ وہ اس کے تخاطب کو سنیں اور سمجھیں۔ پھر انہیں آدم کی پشت کی طرف پلٹا دیا اور آدمیوں کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک کہ وہ تمام اشخاص جو اس وقت تک باہر آئے تھے پیدا ہو کر باہر آ جائیں اور جو مسلمان رہتا ہے وہ اپنی اصلی فطرت پر برقرار ہے اور جو کافر ہوتا اور جان بوجھ کر انکار کرتا ہے، وہ اپنی پہلی فطرت سے پلٹ گیا ہے۔ یہ قول مفسرین میں ایک جماعت کا ہے، اور اس بارے میں انہوں نے حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن میں سے بعض کا استناد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے اور بعض کی سند بیچ میں رک گئی ہے، ان روایات کو وہ اس آیت کی تفسیر قرار دیتے ہیں اور محققین نے اس تفسیر کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے ظاہری معنی اس تفسیر کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ ارشاد ہوا ہے کہ "جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے برآمد کیا، یہ نہیں کہا کہ آدم سے اور کہا کہ ان لوگوں کی پشتوں سے یہ نہیں کہا کہ آدمؑ کی پشت سے اور کہا ان لوگوں کی نسل سے اور یہ نہیں کہا کہ آدم کی نسل سے پھر یہ ارشاد ہوا کہ اللہ نے یہ اس لئے کیا کہ وہ یہ نہ کہیں کہ وہ اس سے بے خبر تھے یا یہ عذر نہ کریں کہ ان کے آباؤ اجداد نے شرک کیا تھا اور وہ انہی میں پلے بڑھے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد میں مشرک افراد تھے لہٰذا ان کے ظاہری مفہوم میں آدم کی براہ راست صلبی اولاد داخل نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ نسل جو برآمد کی گئی تھی آدم کی صلب سے اس میں دو ہی صورتیں ہیں:۔ یا تو یہ کہ اللہ نے ان کو عقل عطا کی تھی یا صاحب عقل نہیں بنایا تھا۔ اگر انہیں عقل و تمیز عطا نہیں کی تھی تو ان کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ توحید کو جانیں اور اللہ کے تخاطب کو سمجھیں اور اگر انہیں صاحب عقل و شعور بنایا تھا اور پھر ان سے عہد و پیمان لیا تو ضرور انہیں وہ پیمان یاد ہونا چاہیے اور فراموش نہ ہونا چاہیے اس لئے کہ عہد و پیمان کا لینا اس شخص کے خلاف جس سے وہ عہد لیا گیا تھا سند نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اسے یاد نہ ہو لہٰذا ضروری ہے کہ ہمیں وہ عہد و پیمان یاد ہو اور پھر یہ ممکن بھی نہیں کہ اتنا بڑا مجمع اور صاحبانِ عقل کا جم غفیر ایک ایسی چیز کو جسے انہوں نے جانا تھا اور سمجھا تھا ایک دم بھول جائیں اس طرح کہ ایک کو بھی ان میں سے یاد نہ ہو چاہے زمانہ کتنا ہی زیادہ گزر گیا ہو کیا تم نہیں دیکھتے کہ اہل بہشت دنیا کے گزرے ہوئے بہت سے حالات کو محسوس کر رہے ہوں گے، یہاں تک کہ (اہل دوزخ سے) کہیں گے کہ جو ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا تھا ہم نے اسے سچا پایا اور اگر اتنی کثرت تعداد کے باوجود بھول ممکن ہو تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ قبل کے جنم میں اللہ نے احکام جاری کئے ہوں پھر اب انہیں اس دنیا میں لایا ہو تا کہ اس جنم کے اعمال کا ثواب دے یا عذاب کرے مگر وہ اس جنم کو بھولے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ اصولِ دین میں شک پیدا ہونا ہے اور پھر آواگون کا تصور درست ہو جائے گا۔

اس طویل عبارت میں جو استعاراتِ عقل مذکور ہیں، ان کا میری نظر میں اتنا وزن نہیں ہے جتنا الفاظ آیت سے اس استدلال کا کہ اس آیت میں ضمیر خود جناب آدمؑ کی طرف نہیں ہے، نہ ان کا خود پہلے ذکر ہے بلکہ قبل میں بنی آدم کا ذکر ہے اور **ظهورهم** اور **ذريتهم** یہ ضمیریں سب انہی کی طرف ہیں لیکن آغاز آیت جس انداز سے ہوا ہے: **واذا خذ ربك** جس کے معنی عموماً اس طرح کے ہوتے ہیں کہ وہ موقع بھی خاص تھا

یا وہ موقع بھی یاد رکھنے کا ہے، یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ کسی ایک وقت پر وقوع میں آنے والے کسی واقعہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حدیثوں میں بھی جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ موجود ہے 'یوم الذر اور یوم اخذ المیثاق'، یعنی عہد الست کا ذکر ہے۔ اس لئے ان محققین کی اتنی مستحکم بحث کے بعد بھی میں اس مرحلہ میں کسی قابلِ اطمینان نتیجہ تک نہیں پہنچا ہوں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

''اوران کے سامنے بیان کیجئے واقعہ اس کا جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں تو وہ ان سے عاری ہو گیا جس کے بعد شیطان اس کے پیچھے لگ گیا وہ گمراہوں میں سے قرار پایا اور اگر ہم چاہتے تو ان کی وجہ سے اسے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو خود زمین سے لگ گیا اور اپنی نفسانی خواہش کا پیرو ہو گیا تو اس کی کیفیت اس کتے کی سی ہوئی کہ اگر اس پر بوجھ رکھو تو وہ زبان منہ سے نکالے یا اسے یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان باہر نکالے۔ یہ مثال ہے ان کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آپ یہ واقعات پیش کرتے رہیے شاید وہ غور کریں۔ کیا بری مثال ہے اس جماعت کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جو خود اپنے اوپر ستم ڈھاتے رہے''۔

''اپنی آیتیں عطا کیں''، یعنی ان کا علم دیا۔[1]

''وہ ان سے عاری ہو گیا''، یعنی ان آیات کے علم کا جو تقاضا تھا اسے ترک کر دیا۔[2]

ایک عالم بے عمل کا حال

یہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ کسی شخص خاص کا واقعہ ہے جو عالم ہونے کے باوجود عمل کے جوہر سے خالی رہا تو اس کی مذمت وارد ہوئی۔

روایات اس شخص کا نام بلعم باعور بتاتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا اور اس نے باوجود کتب سماویہ کا علم رکھنے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی[3]

[1] دادہ بودیم اورا علم آیات (شاہ ولی اللہ)

[2] یعنی تابع شہوت نفس شد و تابع شہوت نفس را عالم نتواں گفت (فتح الرحمن)

[3] ھو بلعم بن باعوراء من علماء بنی اسرائیل سئل ان یدعوا علی موسیٰ واھدی الیہ شئی فدعا فانقلب علیہ (جلالین)

اور ایک روایت یہ ہے کہ وہ امیہ بن ابی الصلت ثقفی ہے جو زمانہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھا[۱]
یہ جو ارشاد ہوا کہ ''اگر ہم چاہتے تو ان کی وجہ سے اسے بلندی عطا کرتے'' تو یہ چونکہ حکیم مطلق چاہتا ہے لہٰذا بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر چاہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''اگر ہم اسے اس لائق سمجھتے تو ان آیات کے علم کی وجہ سے اسے رفعت و سربلندی حاصل ہوتی[۲] مگر کیا کیا جائے کہ ''وہ تو خود زمین سے لگ گیا'' یعنی دنیا طلبی کر کے سیرت و کردار کی پستی میں گر گیا۔[۳]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ چاہنا اس کے ذاتی صفات کی بنا پر ہوتا اور یہ نہ چاہنا اس کے سوء اختیار کی بنا پر ہوا۔

یہ کہ ''اس کی کیفیت اس کتے کی سی ہے'' اسے صرف تمثیل پر بھی مبنی سمجھا جاسکتا ہے مگر بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ اس پر عذاب یہی نازل ہوا تھا کہ اس کی زبان کتے کی طرح منہ سے باہر نکل پڑی تھی[۴]

کتے کے وصف میں یہ ارشاد کہ: اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ، اسے عموماً حمل سے لیا گیا ہے[۵] چنانچہ ہم نے اس کا ترجمہ بوجھ رکھنے کے ساتھ کیا ہے مگر یہ ''حملہ'' سے بھی ہوسکتا ہے یعنی اسے ڈانٹو، ڈپٹو اور اس کی طرف مارنے کے لئے بڑھو۔[۶]

مگر یہ معنی اس وقت مناسب ہوتے جب لہث کے یعنی بھونکنے کے ہوتے کہ کتے کی یہ حالت ہے کہ تم اس سے بولو نہ بولو، وہ بھونکتا ہے مگر زبان منہ سے نکالنے اور ہونکنے[۷] کی کیفیت کے ساتھ بوجھ کا لادنا زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

''جسے اللہ ہدایت کرے، وہ ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو یہی لوگ وہ ہیں جو گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔''

اللہ ہدایت اسی کی کرتا ہے جس میں طلب صادق اور سعی خالص پاتا ہے (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) اور گمراہی میں اسی کو چھوڑ دیتا ہے جو مسلسل اعراض سے کام لیتا ہے، اس لئے نتیجتاً دونوں باتیں انسان کے اختیار سے وابستہ ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ

---

[۱]۔ بلغنا ایضاً واللہ اعلم انہ امیہ بن ابی الصلت الثقفی الشاعر المشہور (مجمع البیان)
[۲]۔ یعنی منزلت اور السبب ایں آیات (فتح الرحمن)
[۳]۔ سکن الی الدنیا ورکن الیہا (تبیان)
[۴]۔ اس کو عذاب یہ ہوا کہ کتے کی طرح زبان نکل پڑی (موضح القرآن)
[۵]۔ بوجھ رکھے تو اوپر اس کے (شاہ رفیع الدین)
[۶]۔ ان تحمل علیہ بالطرد والزجر (جلالین)
[۷]۔ اللہث التنفس الشدید من شدۃ الاعیاء (تبیان)

كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴿۱۷۹﴾

''اور بے شک ہم نے دوزخ کے واسطے پیدا کیا ہے جنات اور آدمیوں میں سے بہتوں کو، ان کے دل و دماغ ہیں۔جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں وہ جن سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔یہ وہ ہیں جو بالکل مدہوش ہیں۔''

اصل میں اللہ نے پیدا تو اس لئے نہیں کیا تھا بلکہ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾ (ذاریات۔۵۶)۔

پیدا اس لئے کیا تھا کہ وہ تقاضائے عبودیت پر عمل کر کے بہتر سے بہتر انجام تک پہنچیں مگر چونکہ نتیجتاً اکثریت نے اپنے سوء اختیار سے جو راستہ اپنایا، اس کا مال دوزخ ہی ہے، اس لئے یہاں یہ تعبیر کی گئی کہ ہم نے ان سب کو دوزخ کے لئے پیدا کیا تھا[1] اس کی نمایاں نظیر قرآن کی جو اور دوسرے ایسے مقامات پر بکثرت پیش کی جاتی ہے، یہ ہے کہ:

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا۔

موسیٰ کو فرعون کے گھر والوں نے دریا سے نکال لیا تا کہ وہ ان کے لئے دشمن اور باعث غم وغصہ قرار پائیں۔(قصص:۸)

ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے تو اس لئے نہیں نکالا تھا مگر چونکہ نتیجہ یہی ہوا اس لئے اس نتیجہ کا بیان اس طرح کیا گیا جیسے کہ انہوں نے نکالا اسی لئے تھا۔

''وہ چوپایوں کے مثل ہیں''۔یہ تو بے شعوری کے لحاظ سے اور ''ان سے زیادہ گمراہ ہیں''۔کیونکہ وہ بھی اپنے حس فطری سے اپنے فائدہ کی چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے اور مضرتوں اور اذیتوں سے بچتے ہیں مگر یہ خود اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان کرتے ہیں۔[2]

پھر یہ بھی کہ وہ اپنی پست کردار میں مورد الزام نہیں، اس لئے کہ ان میں عقل و شعور اور تمیز حق و باطل نہیں ہے اور یہ عقل و شعور رکھتے ہوئے اس پستی میں مبتلا ہیں تو یہ مورد الزام اور گنہگار بھی ہیں۔[3]

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۸۰﴾

''اور اللہ سے مخصوص ہیں وہ نام جو بہترین ہیں تو اسے پکارو انہی کے ذریعہ سے[4] اور چھوڑو انہیں جو غلط راستہ

---

[1]۔اللام فی "لجهنم" لام العاقبة والمعنى انه لما كانوا يصيرون اليها بسوء اختيار هم وقبح اعمالهم جاز ان يقال انه ذرأهم لذلك (تبيان)

[2]۔اضل من الانعام لانها تطلب منافعها وتهرب من مضارتها وهؤلآء يقدمون على النار معاندة (جلالين)

[3]۔اضل من الانعام لان الانعام لم تعط آلة المعرفة والتميز فلا تلحقها المذمة وهؤلآء اعطوا آلة المعرفة والتمييز فضيعوها.(مجمع البيان)

[4]۔سموه لها (جلالين)

اختیار کرتے ہیں[1] اس کے ناموں میں جلد ہی انہیں سزا ملے گی اس کی جو وہ کیا کئے ہیں۔''

ایسے ناموں سے جو شانِ الٰہی کے لائق نہیں ہیں، اس کو یاد کرنا اس کی ذات کے بارے میں کسی غلط اعتقاد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اسی کو غلط راستہ کہا گیا ہے۔[2]

ایک دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اس واسطے ہیں کہ ان سے دعا کرو اور اس کی حمد وثناء میں ان کا استعمال کرو۔ یہ نہیں کہ ان سے سحر وغیرہ کا کام لو۔[3]

اس صورت میں کج روی کا تعلق تعیین اسماء سے نہیں بلکہ طریقۂ استعمال سے ہے۔ ایک تیسری صورت کج روی کی یہ ہے کہ الفاظ جو ذاتِ باری کے لئے ہیں، وہی رہیں مگر انہیں کو بعینہٖ یا انہیں بگاڑ کر وہ نام غیر اللہ کے لئے استعمال کر دیئے جائیں جیسا کہ مشرکین کرتے تھے۔[4]

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

''اور ہماری مخلوق میں ایک گروہ ہے ان کا جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں''۔[5]

پہلے یہی الفاظ بنی اسرائیل کے لئے آئے تھے کہ ان میں کچھ ایسے ہیں اور اب عامۂ خلائق میں کہا جا رہا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں اور الفاظ بتاتے ہیں کہ ایسے لوگ خلائق کے اندر اقلیت ہی میں ہیں۔ اکثریت اس کے خلاف ہے۔

ایک معنی آیت کے یہ لئے گئے ہیں کہ ہر دور میں کچھ لوگ راہ راست اور حسن کردار پر قائم رہنے والے ضرور موجود رہیں گے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ تمام خلق گمراہی پر کبھی مجتمع نہیں ہوسکتی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ اس طرح درست ہے کہ ہم ہر دور میں ایک معصوم کے وجود کو ضروری مانتے ہیں جو خلق پر حجت خدا کی حیثیت رکھتا ہے، اس طرح ضلالت کے عام طوفان میں بھی ایک منارۂ ہدایت قائم رہتا ہے۔[6]

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر بھی جو غالباً حدیثوں سے ماخوذ ہے، اسی کے مطابق ہے۔[7]

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

---

[1]۔ الالحاد الغدول عن الاستقامة والانحراف عنها (تبیان)

[2]۔ یعنی ابو المسیح والو الملائکہ ھی گفتند (فتح الرحمن)

[3]۔ ایک کج راہ یہ ہے کہ سحر میں چلاوے (موضح القرآن)

[4]۔ حیث اشتقوا منہا اسماء لالھتھم کاللات من اللہ والعزیٰ من العزیز ومنات من المنان (جلالین)

[5]۔ ای بالحق یحکمون (مجمع البیان)

[6]۔ عندنا انہ لا یخلو وقت من الاوقات ممن یجب اتباعہ ویثبت عصمتہ ویکون حجۃ اللہ علیٰ خلقہ فیمکن ان یکون المراد بانہ ماذکرناہ (تبیان)

[7]۔ ھٰذہ الآیۃ لآل محمد ﷺ واتباعھم (علی بن ابراھیم)۔

''اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، انہیں ہم آہستہ آہستہ گرفت میں لیں گے [1] اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی اور میں انہیں ڈھیل دوں گا۔ [2] یقیناً میرا منصوبہ بڑا مضبوط ہوتا ہے'' [3]

لفظ ''کید'' قرآن میں زیادہ تر ایسے ہی انتظام کے لئے آتا ہے جس میں دوسرا شخص بے شعوری کے عالم میں رہے اور اس کی تباہی کا سامان ہو جائے، ہم نے ''منصوبہ'' کے لفظ سے اس کا ترجمہ مجبوری ہی سے کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''کید'' کے لفظ کے تمام خصوصیات ''منصوبہ'' کے لفظ سے ادا نہیں ہوتے جیسا کہ کہیں ہم نے اس کا ترجمہ ''ترکیب'' کے لفظ کے ساتھ بھی کیا ہے، اس کی بھی یہی نوعیت ہے مگر یہاں مضبوطی کے لفظ کے ساتھ ترکیب سے ''منصوبہ'' کا لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨٤﴾

''کیا وہ سوچتے نہیں کہ ان کے ساتھی میں کسی طرح کی دیوانگی نہیں ہے، وہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا خطرہ سے ہوشیار کرنے والا۔''

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں کو سن کر، ان کے دل و دماغ پر جو اثر ہوتا تھا، اسے مٹانے کے لئے وہ آپ کی باتوں کو ''دیوانہ'' کہہ کر ٹالنا چاہتے تھے۔ یہ ان کی بالکل رواروی کی ایک ترکیب تھی۔ قرآن نے ''کیا وہ سوچتے نہیں'' کہہ کر ان کی اسی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہاری اس رواروی سے تمہاری بریت نہیں ہو سکتی۔ ذرا سوچ سمجھ کر سنجیدگی سے محسوس کرو کہ کیا تمہارا ساتھی یعنی یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس سے تمہارا سابقہ ہے اس میں کوئی بھی جنون کی علامت ہے؟ اگر تم غور کرو تو خود تمہاری سمجھ میں یہ آجائے گا کہ وہ حقیقتاً تمہارا ہمدرد ہے جو تمہیں خطروں سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔

چونکہ ان کے دل میں دل ڈال کر بات کرنا تھی اور وہ رسول نہیں مانتے تھے، اس لئے صاحب یعنی ساتھی کے لفظ کا استعمال ہوا ہے جو قرآن مجید کے بعض دوسرے مقامات پر بھی ہوا ہے۔

پھر اسی میں یہ بھی مضمر ہے کہ یہ کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں۔ یہ تو برابر ان کے ساتھی رہے ہیں اور اسی ساتھ رہنے سے جو انہیں ان کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا اندازہ ہے، وہ ان پر خدا کی طرف سے ایک بڑی حجت ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٥﴾

''کیا وہ غور نہیں کرتے آسمانوں اور زمین کے کارخانۂ قدرت میں اور ان چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں اور یہ کہ ممکن ہے ان کی موت [4] نزدیک آچکی ہو تو اب کس کلام پر وہ اس کے بعد ایمان لائیں گے؟!!''

''اس کے بعد'' کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن جس نے اتنے مؤثر انداز میں ان باتوں کو پیش کیا ہے، اس کے بعد بھی وہ نہیں مانتے تو

---

[1]۔ تاخذھم قلیلا قلیلا (جلالین)
[2]۔ امھلھم ولا اعاجلھم بالعقوبۃ (مجمع البیان)
[3]۔ ھر آئینہ تدبیر من محکم است (شاہ ولی اللہ)
[4]۔ اجلھم ھو ھلاکھم (علی بن ابراھیم)

اور کون سا کلام ہوگا جس کا ان پر اثر ہو اور وہ ایمان قبول کریں [1]
اور یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ اب نہ مانیں گے تو کیا ہلاکت واقع ہوجائے گی، اس کے بعد وہ مانیں گے؟ مگر ''بایّ حدیث'' ''کس کلام پر'' کے لفظ سے ذہن میں زیادہ آنے والا مفہوم پہلا ہی ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

''جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے، اس کا کوئی رہنما نہیں ہوسکتا اور وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے ان کی سرکشی میں کہ وہ دل کے اندھے بنے رہیں'' [2]

''سرکشی'' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے گمراہی میں چھوڑ دینا، اس بنا پر ہوتا ہے کہ اتمام حجت کی حد بھر ان کی ہدایت ہوئی مگر انہوں نے کسی طرح قبول نہ کیا تو اب اللہ بھی ان سے صرفِ نظر کر لیتا ہے اور جب اللہ ایسا قادر وحکیم اور پھر مہربان ان کی طرف سے مایوس ہو کر رخ پھیر لے تو اب کس کے بس میں ہوگا کہ ان کی ہدایت کرے۔

مترجمین اہل سنت جو عدالت باری تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں، بلا تکلف یہ ترجمہ کر دیتے ہیں کہ ''جسے اللہ گمراہ کرے، اسے کون ہدایت کر سکتا ہے'' [3] مگر ہم اصول حق کی بنا پر اس ترجمہ سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

''آپ سے پوچھتے ہیں قیامت کی گھڑی کے متعلق کہ اس کا قیام [4] کب ہوگا؟ کہیے کہ اس کا علم تو بس میرے پروردگار کے پاس ہے، نہیں نمایاں کرے گا اسے اس کا ہنگام آنے پر [5] مگر وہی، بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں [6] نہیں وہ تمہارے پاس آئے گی مگر بس اچانک آپ سے پوچھتے ہیں ایسا جیسے کہ آپ اس کے متعلق غلطان و

---

[1] بایّ حدیث بعد القراٰن یؤمنون (تبیان)
[2] العمه فی القلب کالعمی فی العین (مجمع البیان)
[3] هر که گمراه سازد ش خدا (شاہ ولی اللہ) جس کو گمراہ کرے اللہ (شاہ رفیع الدین)
[4] ای وقت قیامها وثباتها (تبیان)
[5] لوقتها اللام بمعنی فی (جلالین)
[6] گران شده است در آسمانها و زمین (شاہ ولی اللہ)

پہچان رہے ہیں [1] کہیے کہ اس کا علم تو بس اللہ کے پاس ہے مگر زیادہ تر لوگ نہیں جانتے"۔

قیامت کے وقت کا علم کسی کو نہیں

"بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں" اس کا مطلب بمناسبت سیاق یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا علم اہل آسمان و زمین سب ہی کے لئے دشوار ہے [2] اور یہ بھی کہ اس کے شدائد و اہوال تمام اہل آسمان و زمین کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں [3]

"آپ سے پوچھتے ہیں ایسا جیسے کہ آپ اس میں غلطان و پیچان رہے ہیں" یعنی جیسے کہ آپ اس کے درپے رہے ہیں تو اپنے خالق سے بار بار اس کے متعلق دریافت کر کے علم حاصل کر لیا ہوگا۔ [4]

"مگر زیادہ تر لوگ نہیں جانتے" اس بات کو کہ اس کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے کسی دوسرے کو نہیں ہے [5]

اس سے نمایاں طور پر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ایسا علم ہے جو اس نے اپنے انبیاء و مرسلین کو بھی عطا نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد کتنی بے بنیاد ہیں وہ پیشین گوئیاں جو وقتاً فوقتاً قیامت کے لئے ہوتی رہتی ہیں اور کتنی بے عقلی ہے ان پیشین گوئیوں سے وحشت زدہ ہونا اور انہیں اہمیت دینا جس کے حالات ماضی قریب میں کئی مرتبہ اخباروں کے صفحے پر بھی آچکے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

"کہیے کہ میں نہیں قدرت رکھتا اپنے لئے کسی نفع اور نہ نقصان پر مگر جو اللہ چاہے اور میں خود غیب جانتا ہوتا تو بہت فائدہ اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھ تک کوئی برائی پہنچتی ہی نہ میں تو نہیں ہوں مگر خطرہ سے متنبہ کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کو جو ایمان لائیں"۔

اس آیت کی بنا پر مطلق طور سے شفاعت وغیرہ کی نفی کا تصور درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ماشاءاللہ "جو اللہ چاہے" کے استثناء میں داخل ہے۔ اسی طرح غیب کے جاننے سے جو انکار ہے وہ بھی ذاتی علم کی نفی ہے۔ نہ کہ عطائے الٰہی سے جو علم حاصل ہو جس کا ثبوت قرآن اور اخبار متواترہ دونوں میں موجود ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ

---

[1] ۔ گویا کہ تو بحث کرنے والا ہے اس سے (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔ یعنی مشکل شدہ است دانستن قیامت (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ ثقلت عظمت ...لهولها (جلالین)

[4] ۔ مبالغ فی السؤال عنها حتیٰ علمتها (جلالین)

[5] ۔ لا یعلمون ان ذٰلك لا یعلمه الا اللہ ویظنون انه قد یعلمه الانبیآء وغیرهم من خلقه (تبیان)

فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

''وہ وہ ہے جس نے تم کو ایک متنفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے شریک حیات کو قرار دیا تاکہ وہ اس کے ساتھ سکون پائے تو جب اس (مرد) نے اس (عورت) سے مباشرت کی تو ایک ہلکا بوجھ اس کا لے لیا اور اس کو لئے ہوئے چلنے پھرنے لگی۔ پھر جب اس پر بار زیادہ ہوتا تو دونوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ اگر تو ہمیں ایک نیک فرزند عطا کرے تو ضرور ہم تیرے شکرگزاروں میں سے ہوں گے مگر جب اس نے ان دونوں کو ایک اچھی اولاد عطا کی تو ان دونوں نے اس کے لئے شریک قرار دیئے اس میں جو انہیں اس نے عطا کیا۔ برتر ہے اللہ اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔''

آغاز میں ابتدائے خلقت کا ذکر ہے جو آدم اور حوا کی تخلیق کی منزل ہے اور پھر عام مرد اور عورت کے حال کی مصوری ہے [1] جن میں زیادہ تر افراد اللہ سے نعمت اولاد التجاؤں اور تمناؤں کے ساتھ مانگ کر پاتے ہیں اور پھر ناشکرا پن کرتے ہیں چنانچہ شروع میں اگرچہ تثنیہ کے صیغے ہیں جو مرد اور عورت کے لحاظ سے ہیں اور فعل بھی ماضی ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ گزرے ہوئے خاص واقعہ کا اظہار ہے مگر آخر میں "فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ"(اعراف۔۱۹۰) جمع اور حال کا صیغہ آ گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ عام انسانوں کی بات ہے جو ان کی حالی کیفیت سے متعلق ہے۔ جناب آدم اور حوا کا کوئی خاص گزرا ہوا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے۔

سوادِ اعظم کے یہاں احادیث کے ذخیرہ میں بہت سی چیزیں دشمنان اسلام کے یہاں کی آ گئی ہیں چنانچہ اس آیت کے تحت میں ترمذی وغیرہ نے ایک روایت درج کر دی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ یہ آخر تک خود آدمؑ اور حواؑ کا تذکرہ ہے اور یہ کہ ان کے یہاں شروع میں کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی تو شیطان نے ان سے آ کر کہا کہ اب کی جو لڑکا ہو، اس کا نام عبدالحارث رکھنا اور وہ زندہ رہا۔

ہمارے نقطۂ نظر سے اس روایت کا کیا درجہ ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا براہ راست پہلا راوی سمرہ بن جندبؔ ہے جس کی سفاکیوں کے تذکرے دورِ بنی امیہ میں صفحات تاریخ پر آج تک درج ہیں۔

علمائے اہل سنت کا عصمت انبیاء کے بارے میں موقف عجیب رہا ہے، ان سے عصمت انبیاء کا کھل کر انکار کرتے بھی نہیں بنتا اور اس کے اقرار پر بھی پورے طور پر جمنا کچھ ان کے لئے دشوار معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس آیت کے ذیل میں ان کی پریشان ذہنی اور پریشان کلامی کا جو منظر ہے اسے ذرا ملاحظہ کیجئے۔ جلالین صاحبان سمرہ کی اس روایت کو درج کرتے ہیں اور اسے صحیح بھی مانتے ہیں مگر ارشاد ہوتا ہے:

ولیس باشراك فی العبودیة لعصمة اٰدم

یہ عبودیت الٰہی میں شرک نہ تھا، اس لئے کہ آدم معصوم تھے۔

---

[1] ۔فالکنایة فی جمیع ذٰلك غیر متعلقة بأدم وحواء (مجمع البیان)

مگر قرآن کی آیت کے الفاظ جعلا لہ شرکاء ہیں جس کی تشریح میں انہوں نے یہ اضافہ کیا ہے کہ:۔ بتسمیہ عبدالحارث یعنی یہ اللہ کے ساتھ شریک قرار دینا اس طرح تھا کہ انہوں نے ''عبدالحارث'' نام رکھا اور اس حدیث میں جسے وہ مان رہے ہیں، آخر میں ہے:

وکان ذٰلك من وحی الشیطان وامرہ

اور یہ شیطان کی وحی اور اس کے حکم سے تھا۔

پھر اس کے صحیح تسلیم کرنے سے آدمؑ کی عصمت کیوں کر قائم رہ سکتی ہے جب کہ آیت کا خاتمہ اس جملہ پر ہے "فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" برتر ہے اللہ اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔ اب شاہ ولی اللہ صاحب کو جو بڑے محدث اور ولی مانے جاتے ہیں، کارنامہ ملاحظہ ہو، وہ فرماتے ہیں:۔

مترجم گوید منطبق بر حال حوا چنانکه در حدیث صحیح آمده که چوں حوا حامله شد شیطان بدلش وسواس انداخت چوں فرزند متولد شد نام اورا عبدالحارث مقرر کرد وچوں وجود جمیع قیود در امثال ایں مواضع ضرور نیست آدم از لوث شرک مبرا باشد وایں آیة عصمت اور امصارمت نکند کذا فہمت۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حوا کے حال پر منطبق ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب حوا حاملہ ہوئیں تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا جب لڑکا پیدا ہوا تو نام اس کا عبدالحارث رکھا اور چونکہ تمام قیدوں کی موجودگی ایسے مقامات پر ضروری نہیں ہے لہٰذا آدم شرک کے دھبے سے بری رہیں گے۔

اور یہ آیت ان کی عصمت سے نہیں ٹکرائے گی۔ میں ایسا ہی سمجھا ہوں۔

اب یہ ہر بافہم پڑھنے والا غور کرے کہ وہ خود اس سے کچھ سمجھا؟ اس کے بعد بلا فاصلہ موصوف کا پھر ارشاد یہ ہے:

فلما تغشا ہا کلام علیٰحدہ است یعنی خدائے تعالیٰ آدم و حوا پیدا کرد و از ایشاں نسل بسیار پیدا آورد و بعد ازاں تفصیل انتشار نسل می فرماید۔

''جب اس (مرد) نے اس (عورت) سے مقاربت کی'' یہ الگ کلام ہے یعنی خداوند عالم نے آدم اور حوا کو پیدا کیا اور ان سے بہت سی اولاد خلق فرمائی اور اس کے بعد ان کی نسل پھیلنے کی کیفیت بیان فرمائی۔

اس کے بعد آیت کے دوسرے جز:۔ **فلما اثقلت الخ** ''جب اس پر بار زیادہ ہوا'' پر حاشیہ لکھا ہے:

مترجم گوید ایں تصویر است حال آدمی را کہ نزدیک ثقل حمل نیت اخلاص درست کند وچوں فرزند بوجود آید آں را فراموش سازد و در تسمیہ اشراک کند و اینجا دانستہ شد کہ شرک در تسمیہ نوعیست اس شرک چنانکہ اہل زمان ما غلام فلاں و عبد فلاں نام می نہند" (فتح الرحمن)

میں کہتا ہوں کہ یہ مرقع کشی ہے آدمی کی حالت کی کہ جب حمل کا بوجھ بڑھتا ہے تو اس وقت تک اپنی نیت کو خلوص کے ساتھ ٹھیک رکھتا ہے مگر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے بھول جاتا ہے اور اس کے نام کے رکھنے میں شرک کرتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ نام رکھنے میں شرک بھی ایک قسم ہے شرک کی جیسا کہ ہمارے زمانے والے فلاں کا غلام اور فلاں کا بندہ نام رکھتے ہیں۔''

یہ بعد والی تشریح پہلے سے بالکل مطابق نہیں ہے اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے پہلے وہ حاشیہ لکھا تھا جس کے آخر میں ہے: کذا **افهمت** یعنی میں ایسا ہی سمجھا ہوں، پھر ان کا ضمیر خود اس سے مطمئن نہیں ہوا تو انہوں نے اسے قلمز د کر دیا اور یہ حاشیہ لکھا جو: "**فلما تغشاها** کلام علیحدہ است" سے شروع ہوتا ہے۔ یہ اس حدیث کے رد کر دینے پر مبنی ہے اور بالکل ہماری درج کردہ تشریح سے جو پہلے لکھی جا چکی ہے، مطابق ہے۔

مگر پھر آخر میں جو موصوف نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک "وہابی تصور" کے ثابت کرنے کا نتیجہ نکالا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غلام محمد یا عبدالحسین نام رکھنا ایک طرح کا شرک ہے، یہ فقط آیت قرآن سے تو نتیجہ نہیں نکلے گا جب تک کہ اس حدیث کو بھی قبول نہ کیا جائے جو "عبدالحارث" والے نام کے متعلق قبل میں درج ہوئی ہے۔ اس صورت میں ممدوح کی یہ تشریح کہ "**فلما تغشاها کلا علیحدہ است**" درست نہیں ہوگی کیونکہ اس حدیث میں تو پورا قصہ حضرت آدم اور حوا ہی سے متعلق کہا گیا ہے! نسل آدم سے نہیں جیسا اب شاہ صاحب عصمت آدم کے تحفظ کے لئے تشریح فرما رہے ہیں۔ کیا یہ اضطراب بیان خود اضطراب ذہن کا ترجمان نہیں ہے؟!

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے عجائب وغرائب میں مزید اضافہ فرما کر اپنے کمال علمی کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"بعضے کہتے ہیں حضرت آدم اور حوا پر یہ گزرا، اول جو حمل ہوا، ابلیس ایک نیک مرد کی صورت میں آیا اور ڈرایا کہ تیرے پیٹ میں شاید کچھ بلا ہے۔ جب دونوں دعا کرنے لگے، تب یہ کہا کہ میری دعا سے یہ بلا بدل کر بیٹا ہوگا۔ اس کا نام رکھئے عبدالحارث۔ حارث شیطان کا نام تھا۔ وہی کیا، اس قصہ میں پیغمبروں سے شرک ثابت ہوتا ہے، یا یہ قصہ غلط ہے۔ اس آیت میں مرد اور عورت کو فرمایا ہے۔ آدم اور حوا کو نہیں کہ اول ان کا ذکر ہو چکا۔ یا یوں کہیے کہ جو کچھ انسانوں میں ہونا مقدر تھا، وہ حضرت آدم میں اول ظہور پکڑ گیا، اس میں وہ نمونۂ تقدیر تھے۔ اولاد کے گناہ ان میں نظر آئے جیسے آئینہ میں صورت، چنانچہ نفس کی خواہش اور اللہ کی بے حکمی اور کہہ کر بھول جانا اور دے کر مکر جانا، یہ سب اولاد کی خوئیں ان میں نظر آ چکیں" (موضح القرآن)

علمائے شیعہ بہر صورت اس روایت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور وہ ان کے نزدیک ضروریات دین کے خلاف ہے۔[1]

اس کے علاوہ بجائے خود بھی اس کی سند معتبر نہیں ہے۔[2]

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾ۖ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾

"کیا وہ شریک کرتے ہیں انہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بنائے جاتے ہیں اور نہ وہ ان کی کچھ مدد پر

---

[1] فان البراهين الساطعة التی لا یصح فیها الاحتمال ولا یتطرق الیها المجاز والاتساع قد دلت علی عصمة الانبیآء فلا یجوز علیهم الشرك والمعاصی وطاعة الشیطان (مجمع البیان)

[2] مطعون فی سنده لانه یرویه قتادة عن الحسن عن سمرة وهو مرسل لان الحسن لم یسمع من سمرة شیئا فی قول البغدادیین۔ (تبیان)

قدرت رکھتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں اور اگر تم انہیں ٹھیک راستے کی طرف دعوت دو تو وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے، تمہارے لئے برابر ہے خواہ تم انہیں دعوت دو یا تم چپکے رہو۔"

"انہیں ٹھیک رستے کی طرف دعوت دو، وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے" یہ مشرکین یعنی ان اصنام کی عبادت کرنے والوں کے لئے بھی ہوسکتا ہے جیسے دوسری جگہ ہے۔

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾

ان پر یکساں ہے، آپ انہیں متنبہ کیجئے یا آپ انہیں متنبہ نہ کیجئے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (یٰسین)

ایک قول اس کے موافق ہے[۱] چونکہ اس کے قبل کی ضمیریں معبودان باطل یعنی اصنام کی طرف راجع ہیں، اس لئے دوسرے لوگوں نے بعد والی ضمیروں کا مرجع بھی انہی کو قرار دیا ہے[۲] اور مطلب یہ لیا ہے کہ کسی بھی کام کو ان سے کہو تو وہ چونکہ ایسے بے حس وحرکت ہیں، نہ تمہاری سنیں گے اور نہ اس پر عمل کریں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

"یقیناً یہ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر، وہ تمہارے ایسے اللہ کے بندے ہیں، اچھا تو پکارے جاؤ، تب جانیں کہ وہ تمہاری حاجت براری کریں، اگر تم سچے ہو۔"

پکارنے سے مراد بحیثیت معبودان کی دہائی دینا ہے[۳] اس لئے شاہ ولی اللہ نے ترجمہ بھی کیا ہے کہ "کسانیکہ عبادت می کنید ایشاں را" اس بنا پر اگر معبود حقیقی اللہ کو مانتے ہوئے صرف سبب مجازی اور ذریعۂ ظاہری ہونے کی حیثیت سے کسی کو پکارے اور اس سے مدد کا خواستگار ہو تو وہ اس آیت کے تحت میں داخل نہ ہوگا۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾

"کیا ان کے پیر ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ جھپٹ کر کچھ اٹھائیں[۴] یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہئے کہ تم پکارو اپنے تمام شریکوں کو پھر

[۱] عن الحسن (مجمع البیان)
[۲] ای الاصنام (جلالین) لانہا جمادات لا تفقہ ولا تعقل (تبیان)
[۳] یریدتدعونہم الٰھۃ (مجمع البیان)
[۴] معنی البطش التناول والاخذ بشدۃ (مجمع البیان)

میرے خلاف کاروائی کرو کہ مجھے مہلت بھی نہ دو۔"

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ سب بتوں کے متعلق کہا گیا ہے [1] اور مخاطب وہی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ، پیر، کان، آنکھیں تو ہیں جن سے اپنے مطلب کے لئے سبھی کام لیتے ہو اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، ان کے تو یہ سب بھی نہیں ہے، اس لئے وہ تم سے بدتر ہیں، پھر کتنی بڑی بے عقلی ہے کہ تم انہیں اپنا معبود بنائے ہوئے ہو۔ [2]

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَکُمۡ وَلَاۤ اَنۡفُسَهُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَی الۡهُدٰی لَا یَسۡمَعُوۡا ؕ وَتَرٰىهُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَهُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۹۸﴾

"یقیناً میرا والی [3] اللہ ہے جس نے یہ کتاب [4] اتاری ہے اور وہ سرپرستی کرتا ہے نیک اعمال لوگوں کی اور جنہیں تم پکارتے ہو اسے چھوڑ کر وہ تمہاری مدد پر قدرت نہیں رکھتے اور نہ خود اپنی ہی مدد کرتے ہیں اور اگر انہیں ٹھیک راستے کی طرف دعوت دو تو وہ نہیں سنیں گے اور دیکھو گے انہیں [5] کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ انہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

صورت تو بتوں کی آدمیوں ہی کی طرح کی بنائی جاتی تھی تو دور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں [6] مگر وہ تو پتھر، لوہے وغیرہ کی آنکھ ہے، اس میں بینائی تھوڑی ہے۔

خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِیۡنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۰۰﴾

"معاف کرنے کا وتیرہ اختیار کیجئے اور نیکوکاری کا حکم کیجئے اور جاہلوں سے بے اعتنائی کیجئے اور اگر شیطان کی طرف سے آپ کو کچھ بھڑکانے کی کوشش ہو تو اللہ سے پناہ مانگئے، یقیناً وہ بڑا سننے والا ہے، جاننے والا۔"

یہ جاہل کون ہوتے ہیں؟ وہ جو برائیوں پر تنبیہ سن کر بجائے قائل ہونے کے لڑنے لگتے ہیں، ان کی طرف سے جو سخت کلامی یا دشنام طرازی ہو چکی، اس کے لئے معاف کرنے کی ہدایت ہوئی کہ اب اس کے بدلے کا کوئی خیال رکھنا نہ چاہیے۔ یہ "گزشتہ را صلوات" ہے اور آئندہ

---

[1] الھم ... ای لھؤلاء الاصنام (مجمع البیان)
[2] فیکف یجوز لکم ان تتخذوھا آلھة (تبیان)
[3] یتولی اُموری (جلالین)
[4] القرآن (جلالین)
[5] می بینی بتان را (شاہ ولی اللہ)
[6] تراھم فاتحة اعینھم نحو کم علیٰ ما صورتم علیه من الصور (تبیان)

کے واسطے ''احتیاط'' کا حکم یوں دیا گیا کہ ''ان سے بے اعتنائی کیجئے'' یعنی اب عمومی حیثیت سے نیکو کاری کی ہدایت کرتے رہیے مگر ایسے جاہلوں کو مخاطب کر کے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ معاف کرنا اور پھر بے اعتنائی کرنا ایک جہاد نفس کی منزل ہے، کچھ آسان تھوڑی ہے۔ بعض وقت طبیعت آمادہ کرتی ہے کہ اپنا اور ان کا خون ایک کر دیا جائے۔ اسی طبیعت کی تحریک کو کہا گیا کہ اگر شیطان کی طرف سے بھڑکانے کی کوشش ہو تو اللہ سے پناہ مانگئے یعنی ضبط نفس سے کام لیجئے اور اللہ کی توفیق کو رفیق راہ بنایئے اور اشتعال سے کام نہ لیجئے۔

''خدا سننے والا ہے اور جاننے والا'' یعنی اس ہدایت حق میں جو زخم زبان آپ کو پہنچتے ہیں، اللہ انہیں سنتا ہے اور جو کچھ آپ کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے، اسے وہ جانتا ہے[۱] اس لئے آپ کے صبر وتحمل کی جزا بھی اس کے یہاں ہے اور ان ظالموں کی سزا بھی اس کے ذمہ ہے۔ ہم نے جو ترجمہ کیا ہے اور جو تشریح لکھی ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ عفو کے معنی معاف کرنے کے ہیں مگر علامہ طبرسیؒ نے اس قول کو سب سے آخر میں درج کیا ہے[۲] اور سب سے پہلے جو غالباً ان کے مختار کی حیثیت رکھتا ہے، یہ قول ہے کہ یہ ''عفو'' کا لفظ اس آیت میں ویسا ہے، جیسے دوسری آیت ہے:

''وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ''

اس ''عفو'' کے معنی ہوتے ہیں ''ضرورت سے فاضل مال'' اس صورت میں یہاں مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں سے ان کی ضرورتوں سے فاضل جو مال ہو، وہ لیجئے۔[۳]

مگر ہمیں پہلا مفہوم خود آیت کے الفاظ اور سیاق مضمون آیات کے لحاظ سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝۲۰۱ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۝۲۰۲

''جو پرہیز گار ہیں، جب انہیں شیطان کی طرف کا کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں[۴] اور ایک دم ان کی بصیرت تازہ ہو جاتی ہے اور جو ان کے بھائی بند ہوتے ہیں، وہ انہیں گمراہی میں کھینچتے ہیں، پھر کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔''

''ان کے بھائی بند'' یعنی شیطانوں کے حوالی موالی جو ہیں[۵] وہ خوب شیطانوں کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔

مطلب بہر حال یہی ہے، خواہ ھم کی ضمیر کافروں کی طرف پھیری جائے حالانکہ ان کا کسی طرح بھی پہلے ذکر نہیں ہے یا شیطانوں کی طرف جن کا جنس شیطان کی شکل میں پہلے ذکر موجود ہے۔

---

[۱] ۔سمیع بالقول علیم بالفعل (جلالین)

[۲] ۔قیل العفو هو قبول العذر عن المعتذر وترك المؤاخذة بالاساءة (مجمع البیان)

[۳] ۔ای خذ یا محمد ما عفا من اموال الناس ای ما فضل عن النفقة (مجمع البیان)

[۴] ۔تذكروا فعرفوا ما عليهم من العقاب بذلك فيجتنبونه ويترونه (تبیان)

[۵] ۔ای اخوان الشیاطین میں الکفار (جلالین)

"کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے" یعنی مکمل گمراہی کا سامان کر کے انہیں ہلاکت ابدی میں مبتلا کر کے رہتے ہیں۔[1]

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾

"اور جب کوئی خاص معجزہ ان کے سامنے پیش نہ کیجئے تو وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اسی کو کیوں منتخب نہ کیا؟ کہہ دیجے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس پروردگار کی طرف سے پیغام پہنچتا ہے، یہ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ان کے لئے جو ایمان لائیں۔"

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ ان کے سامنے معجزات خالق کی طرف سے پیش ہوتے تھے مگر وہ اپنے فرمائشی کسی معجزہ پر اصرار کرتے تھے[2] اس پر جواب یہ دیا گیا ہے کہ میں تو وحی الٰہی کا پابند ہوں اور تمہارے سامنے اتنے معجزات پیش ہو چکے ہیں جو اتمام حجت کے لئے کافی ہیں، اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ تم جو کہتے ہو، وہی معجزہ تمہیں ضرور دکھلایا جائے، اس پر مقدمۂ تفسیر میں ہم نے کافی روشنی ڈالی ہے۔

تعجب ہے کہ بعض مترجمین کو اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں دقت ہوئی ہے اور انہوں نے عجیب عجیب ترجمے کئے ہیں[3] جس میں قبل کے بعض مفسرین کی ژولیدہ بیانیوں کا بھی دخل ہے۔[4]

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾

"اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو[5] اور خاموش رہو، شاید کہ رحمت تمہارے شامل حال ہو۔"

قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم

یہ ہدایت ہے مسلمانوں کے لئے اسی لئے جس طرح قرآن کا پڑھنا عبادت ہے اسی طرح اس کا سننا بھی عبادت ہے۔

یہ قرآن مجید کی ایک طرح کی بے احترامی ہے کہ قرآن بآواز پڑھا جا رہا ہو اور لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہیں۔

ایک صورت وہ ہے جس میں خاموشی سے سننا واجب ہے اور وہ نماز جماعت میں ماموم کے لئے جب امام حمد و سورہ پڑھ رہا ہو، اس لئے

---

[1] ۔لا يقصرون عن استغوائهم (تبیان)

[2] ۔باية يقترحونها (تبیان)

[3] ۔چوں نمی آوری نزدیك ایشان آیتی می گویند چرا از طرف خود انشا نمی کنی (شاه ولی الله) اور جب نہ لاتا تو ان کے پاس نشانی کہتے ہیں کیوں نہ کھینچ لایا تو اس کو (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔هلا اجتبيتها معناه اختلقتها وافتعلتها من قبل نفسك فی قول الزجاج والقراء ... وفی رواية اخری عن ابن عباس و قتادہ معناہ هلا اخذتها من ربك وتقبلتها منه (تبیان)

[5] ۔النصات السكوت مع استماع (مجمع البيان)

بعض مفسرین کا رجان یہ ہے کہ اس آیت سے یہی صورت مراد ہے [۱]

ہماری قدیم تفسیر بھی اس کے مطابق ہے [۲]

مگر آیت کو جس انداز سے ختم کیا گیا ہے ''شاید کہ رحمت تمہارے شامل حال ہو''......اس سے اس حکم کا وجوبی ہونا ذہن میں نہیں آتا لہٰذا کیوں نہ اسے حکم استحبابی سمجھا جائے جس کے بعد حالت نماز کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، یہ ایک تہذیب اسلامی کی تعلیم ہے جس کا قرآن مجید کی شان وجلالت کے پیش نظر تاکیدی حکم ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت بھی اس کے مطابق ہے۔ [۳]

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

''اور اپنے پروردگار کو یاد کرو اپنے دل میں بھی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اور ڈری سہمی حالت میں اور زبان سے بھی ایسی آواز سے جو زیادہ اونچی نہ ہو [۴] صبح اور شام اور غفلت کرنے والوں میں سے نہ ہو''

حدیث معصوم سے پتہ چلتا ہے..........................کہ ذکر الٰہی کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے مختلف صورتیں ہیں۔ پہلا جز کہ دل ہی دل میں یاد کرو یعنی زبان سے کچھ پڑھو ہی نہیں، یہ حالت جماعت میں ماموم کے لئے ہے کہ امام کو سورے پڑھنے کا حکم ہے اور ماموم کو خاموش رہنے کا [۵] اور بعد والی صورت امام جماعت یا فرادیٰ نماز پڑھنے والے کے لئے ہے کہ اسے نماز آواز سے پڑھنا چاہیے مگر زیادہ چیخ چیخ کر نہیں جو شانِ خضوع وخشوع کے خلاف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدۃ

''یقیناً جو تمہارے پروردگار سے نزدیک ہیں، اس کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔''

''جو پروردگار سے نزدیک ہیں'' یعنی فرشتے [۶]

ان کے کردار کو پیش کرتے ہوئے انسانی شرافت کو غیرت دلائی گئی ہے کہ اسے کب زیبا ہے کہ اس کی عبادت میں کوتاہی کرے۔

قرآن مجید میں یہ پہلا مقام ہے جہاں سجدہ وارد ہوا ہے مگر فقہ اہل بیت کرام علیہم السلام میں یہ سجدہ واجب نہیں ہے۔ [۷]

---

[۱] لانہ لا حال یجب فیہا الانصات لقراءۃ القران الا حال قراءۃ الامام فی الصلوۃ (تبیان)

[۲] یعنی فی الصلوۃ اذا سمعت قراءۃ الامام الذی تأتم بہ فانصت (علی بن ابراھیم)

[۳] عن ابی عبداللہ انہ فی حال الصلوۃ وغیرھا وذلک علیٰ وجہ الاستحباب (تبیان)

[۴] فوق المسر دون الجھر من القول ای قصدا بینہما (جلالین)

[۵] روی زرارۃ عن احدھما: قال معناہ اذا کنت خلف الامام مأتم بہ فانصت وسبح فی نفسک (مجمع البیان)

[۶] ھم الملائکۃ (مجمع البیان)

[۷] ھٰذہ اول سجدات القران وھی عندنا مستحبۃ غیر واجبۃ (تبیان)

سُوۡرَةُ الۡاَنۡفَالِ

مکیّہ......۷۵......آیات

سورۂ انفال کے خاص خاص مضامین

اس سورہ کی ابتداہی چونکہ انفال کے بیان سے ہوئی ہے جس کے معنی ابھی پہلی آیت کے ذیل میں لکھے جائیں گے،اس لئے اس سورہ کا انفال نام ہوا۔اس کے علاوہ جو خاص اموراس سورہ میں درج ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱-----جنگ بدر کا پس منظر

۲-----فرشتوں کا میدانِ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا۔

۳-----میدانِ جنگ سے فرار کا باعثِ دوزخ ہونا۔

۴-----ہجرت کے موقع پر حفاظتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے خداوندی تدابیر کی طرف اشارہ۔

۵-----وجودرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مانع نزول عذاب۔

۶-----خمس کا صریحی حکم۔

۷-----تنازع باہمی کے خراب نتائج پر انتباہ۔

۸-----جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم۔

۹-----مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم

۱۰-----ایک اور دس کے مقابلہ کی دعوت پر مسلمانوں کی کمزوری کا ثبوت اور پھر ایک اور دو کے مقابلہ کا کم سے کم حکم۔

۱۱-----قیدیوں کے بارے میں الٰہی منشا کا اعلان وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان ہے"

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ①

"آپ سے پوچھتے ہیں انفال کے متعلق، کہیے کہ انفال اللہ کے لئے ہیں اور پیغمبر کے لئے لہٰذا غضب خدا سے ڈرو

اور اپنے درمیانی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان والے ہو۔"

انفال کے متعلق حکم خداوندی

انفال کے معنی اموال غنیمت کے کہے گئے ہیں[1]

شاہ ولی اللہ نے اس سورہ کی شان نزول لکھی ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوا ہے:

مسلمانان در غنیمت مباحثه می کردند آنا نکه غارت کرده بودند خواستند که تنها بران متصرف شدند دیگراں خواستند علی السویه قسمت شود خدائے تعالٰی نازل ساخت که متصرف و مختار غنائم خدا و رسول اوست و دیگری رادریں باب دخل نیست وانچه اہل جاہلیت می کردند از استیثار غارت کننده بغنیمت باطل است بعد ازان حکم فرمود که غنیمت را پنج قسم باید کرد چہار قسم درمیان غانماں قسمت کنند ویکی دربیت المال نگاه داشته بمصرف آں رسانند واین تصرف حق است وعطای اوست بغیر دخل غارت کنندگان پس آیۂ قل للّٰہ والرسول محکم است غیرمنسوخ. (فتح الرحمٰن)

مسلمان غنیمت کے بارے میں باہم بحث کر رہے تھے، جنہوں نے لوٹا تھا انہوں نے چاہا کہ اس پر وہ اکیلے قابض ہوں، دوسروں نے چاہا کہ برابر سے تقسیم ہو، خداوند عالم نے یہ حکم اتارا کہ اموال غنیمت پر قابض ومتصرف اور صاحب اختیار خدا اور رسول ہیں اور کسی دوسرے کو اس بارے میں کوئی دخل نہیں ہے اور جو زمانۂ جاہلیت والے کرتے تھے کہ لوٹنے والے کو مال غنیمت پر قبضہ میں ترجیح دیں، وہ غلط ہے اس کے بعد حکم دیا کہ مال غنیمت کے پانچ حصے کرنا چاہئیں، چار حصے غنیمت حاصل کرنے والوں میں تقسیم کئے جائیں اور ایک بیت المال میں محفوظ رکھا جائے اور پھر مناسب موقع پر صرف ہو اور یہ حق تعالیٰ کا اختیار ہے اور اس کی عطا ہے جس میں لوٹنے والوں کا کوئی دخل نہیں لہٰذا یہ آیت کہ "انفال اللہ کے لئے ہیں اور پیغمبر کے لئے" برقرار ہے اور منسوخ نہیں ہوئی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"جنگ میں بعض آگے بڑھے اور بعض پشت پر رہے جب غنیمت جمع ہوئی، بڑھنے والوں نے کہا یہ حق ہمارا ہے کہ فتح ہم نے کی اور پشتی والوں نے کہا کہ ہماری ہی قوت سے لڑے۔ حق تعالیٰ نے دونوں کو خاموش کیا کہ فتح اللہ کی مدد سے ہے اور کسی کی پیش نہیں جاتی، سو مالک اللہ ہے اور نائب اس کا رسول ہے۔ پھر آگے بہت دور تک یہی بیان فرمایا کہ فتح اللہ کی مدد سے ہے۔ اپنی قوت نہ سمجھو۔" (موضح القرآن)

بعض مفسرین یہ اختلاف جوانوں اور بوڑھوں کے درمیان کا بتاتے ہیں:

لما اختلف المسلمون فی غنائم بدر فقال الشبان ھی لنا لانا باشرنا القتال وقال الشیوخ کنا ردءً لکم تحت الرایات ولو انکشفتم لفئتم الینا فلا نستأثروا بھا نزل (جلالین)

جب مسلمانوں کے درمیان جنگ بدر کے اموال غنیمت میں اختلاف ہوا کہ جوانوں نے کہا کہ یہ سب ہمارا ہے اس لئے کہ ہم نے

---

[1] می پرسند ترا از غنیمتھا (شاہ ولی اللہ) سوال کرتے ہیں تجھ کو لوٹوں سے (شاہ رفیع الدین)

جنگ کی ہے اور بڈھوں نے کہا کہ ہم تمہاری پشت پناہ تھے اور اگر تم میدان سے ہٹتے تو پلٹ کر ہمارے پاس پناہ لیتے تو ان اموال میں تم اپنے کو مقدم نہ کرو تو یہ آیت نازل ہوئی۔

مذکورہ بالا مندرجات سے جمہور کے درمیان کی پریشان خیالی ظاہر ہے مگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات نے انفال کے اقسام پر کافی بسط وتفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے [1] اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انفال حسب ذیل قسم کی چیزیں ہیں:

(۱) جو مال دارالحرب سے بغیر جنگ حاصل ہو۔

(۲) وہ زمین جس کے مالک بغیر لڑے اسے چھوڑ کر چلے جائیں۔

(۳) لاوارث شخص کا ترکہ۔

(۴) جنگل، میدان اور پہاڑوں کی چوٹیاں وغیرہ، غرض جن چیزوں کا کوئی خاص انسان مالک نہیں ہے۔ یہ سب مِلک خدا ہونے کے لحاظ سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد امام کا حق ہے جس میں عام مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ آیت کے بعد کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ عام مسلمان اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی نزاع کررہے تھے جس پر سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

”خاص ایمان والے تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہوجائے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب اس کی آیتوں کی تلاوت ان کے سامنے ہوجائے تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کا باعث ہوتی ہیں اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں، جو نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو خاص ایمان والے ہیں۔ ان کے لئے مرتبے ہیں ان کے پروردگار کے یہاں اور بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔“

قرآن مجید نے اہل ایمان کا جو معیار پیش کیا ہے وہ ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے اور جتنا کوئی اس سے قریب ہوگا، اتنا اس کے ایمان کا درجہ سمجھا جائے گا لہٰذا قرآن مجید کی اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ جس میں یہ اوصاف بحدکمال موجود نہ ہوں، وہ ایمان کا کوئی حصہ رکھتا ہی نہیں۔ [2]

---

[1] صحت الرایۃ عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہما السلام (مجمع البیان)

[2] ھذہ صفات خیار المؤمنین وافاضلھم ... فلا تدل علی ان من کان دونھم فی المنزلۃ خارج عن الایمان (مجمع البیان)

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝٥ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝٦

''جیسا کہ نکالا آپ کو آپ کے پروردگار نے آپ کے گھر سے بالکل صحیح [1] اور ایک جماعت مسلمانوں میں کی اسے ناپسند کر رہی تھی۔ آپ سے صحیح طریقۂ کار کے بارے میں جب کہ وہ ظاہر ہو گیا تھا وہ بحث کر رہے تھے گویا کہ وہ موت کی طرف لے جائے جا رہے ہوں [2] اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں۔''

''جیسا کہ'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ انفال کے بارے میں اللہ کا فیصلہ اسی طرح ہے جیسا کہ ابتدا میں اس کا اس مہم یعنی بدر کی جنگ کے لئے آپ کو آپ کے گھر یعنی مدینہ سے [3] نکالنا حق تھا اور اس موقع پر بھی جمہور نے اختلاف کیا تھا مگر اللہ نے ان کی رائے پر عمل نہیں کیا اور اس وقت بھی ان میں سے بہت لوگ اس فیصلہ سے متفق نہیں ہیں، مگر اللہ کو اس کی پرواہ نہیں ہے [4] کاش جمہور اس کے بعد محسوس کرے کہ حکم خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں رائے جمہور کوئی چیز نہیں ہے۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٧ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝٨

''اور جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا دونوں گروہوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے لئے ہے اور تم لوگ خواہش رکھتے تھے کہ جو فوجی ساز و سامان والا نہیں ہے، وہ تمہارے حصہ میں آئے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام کے تحت حق کو ثابت کر دے اور کافروں کی اصل نسل کو ختم کر دے تاکہ وہ اپنی باتوں سے حق کو ثابت کر دے اور باطل کو نیست و نابود کر دے چہرے بداعمال لوگ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں۔''

جنگ بدر کا پس منظر

ایک طرف تو تجارتی قافلہ آ رہا ہے اور دوسری جانب سے ابوسفیان فوج لئے ہوئے آ رہا تھا۔ خالق نے خبر دی تھی کہ تم لوگ مدینہ سے نکلو

---

[1] ۔بتدبیر درست (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ہانکے جاتے ہیں طرف موت کے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔بیتك یراد به المدینة اخرجه الله الی بدر. (تبیان)

[4] ۔یعنی کار در قسمت غنائم بر موافق حکم خدا است, نه موافق ازوی نفوس چنان که بیرون آوردن بتدبیر درست بودو از نزدیك خدا بر خلاف ارادۂ قوم (فتح الرحمن) یعنی غنیمت کا جھگڑا بھی ویسا ہی ہے جیسا نکلتے وقت عقل کی تدبیریں کرنے لگے اور آخر صلاح وہی نکلی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو ہر کام میں یہی اختیار کرو کہ حکم برداری میں اپنی عقل کو دخل نہ دو۔ (موضح القرآن) ای هٰذه الحالة فی کراهتهم لها مثل اخراجك فی حال کراهتهم وقد کان خیر الهم فکذالك ایضا (جلالین)

گے تو ان میں کے ایک سے تمہاری مڈبھیڑ ہوگی[1] اس پر خود غرض اور پست ذہنیت والے مسلمان یہ سبز باغ دیکھنے لگے کہ وہ تجارتی قافلہ ہمارے ہاتھ آئے گا اور ہم اس کے سامان تجارت پر قابض ہو جائیں گے۔

قرآن نے اس کی نسبت صیغۂ جمع کے ساتھ عام مسلمانوں کی طرف دی ہے، کہیں اس میں یہ نہیں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قافلہ کو لوٹنے کے لئے مدینہ سے نکلے تھے مگر اسے کیا کیا جائے کہ دشمنانِ اسلام کا ذکر نہیں شاہ ولی اللہ صاحب تک یہ لکھتے ہیں کہ:

"دراین آیات تعریض است بآن قصد که آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در غزوۂ بدر برای غارت کردن کاروانِ قریش متوجه شد" (فتح الرحمن)

کلام الٰہی کا انداز بالکل اس کے خلاف ہے اور ان دنیا طلب مسلمانوں کی تنبیہ ایسے انداز میں ہے جس سے ان کی مذمت نمایاں ہے بلکہ آخری فقرہ بھی "چاہے بداعمال لوگ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں" انہی لوگوں سے متعلق معلوم ہوتا ہے جو قافلہ کے ہاتھ آنے کی خواہش رکھتے تھے اور فوج سے مقابلہ کو ناپسند کرتے تھے، اگرچہ عام تفسیروں نے اسے کفار و مشرکین سے متعلق کر دیا ہے[2] حالانکہ مشرکین کو ناگواری تو اس قافلہ کے مسلمانوں کے ہاتھ آجانے پر زیادہ ہوتی بلکہ ان کا عین مقصد یہی تھا کہ قافلہ مسلمانوں کے ہاتھ نہ آئے بلکہ فوج کا مقابلہ ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجہ اس مقابلہ کا ایسا نکلا جو ان کی مرضی کے خلاف تھا مگر یہاں تو نتیجہ کا نہیں اصل اس مقابلہ کا ذکر ہے لہٰذا یہاں مجرمین سے مراد یہی مسلمان ہو سکتے ہیں جو قافلہ کے لوٹنے کے خیال میں تھے۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝٩

"جب کہ تم لوگ اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری التجا قبول کی کہ میں تمہیں مدد دوں گا ہزار فرشتوں کے ساتھ جس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔"

یعنی ان ہزار ہی پر مدد ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ یہ پہلی قسط ہوگی جس کے بعد اس میں اور اضافہ ہوگا۔[3]

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝١٠

"اور اسے نہیں قرار دیا ہے اللہ نے مگر خوشخبری کے طور پر اور اس لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو اطمینان ہو اور فتح و ظفر نہیں ہے مگر اللہ کی طرف سے یقیناً اللہ زبردست ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔"

---

[1] ۔ المجرمون المشرکون (جلالین)

[2] ۔ المجرمون المشرکون (جلالین)

[3] متتابعین یردف بعضھم بعضا وعدھم بہا اولا ثم صارت ثلثة الالاف ثم خمسة کما فی اٰل عمران (جلالین) یعنی یك هزار بودند بعد ازان سه هزار گشتند و بعد ازان پنج هزار شدند (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی اصول نہیں ہے کہ ہمیشہ فرشتے آہی جایا کریں۔ یہ تو اس دفعہ ہو گیا کہ تمہارے دلوں کو تقویت ہو جائے مگر آئندہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو اور اصل فتح وظفر عطا کرنے والا تو خداوند عالم ہے۔ فرشتے بھی صرف ایک ظاہری ذریعہ ہی ہیں اور فرشتوں سے کام لینا بھی ہو تو اتنی تعداد کی ضرورت نہیں۔ ایک فرشتہ حکم الٰہی سے ایک قوم کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ [1]

بعض لوگوں نے اس خوشخبری اور تقویت قلب کے لفظ سے یہ عجیب نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کا آنا اصل میں کچھ نہیں ہے۔ یہ بس مسلمانوں کی تقویت قلب کے لئے ایک سامان تھا کہ فرشتوں کے آنے کا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر اللہ کی خوشخبری معاذ اللہ ایسی ہوا کرے کہ اسے واقعیت سے کوئی لگاؤ نہ ہو، بس دل کے بہلاوے کا ایک سامان ہی ہو تو اس سے وہ تقویت قلب کا مقصد ہی کہاں پورا ہو گا اور پھر وہ خوشخبری کب ہوگی۔ وہ تو دل کی تسلی ہوگی جو شان الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔

خدا ہی آج کل کے روشن خیالوں کو ہدایت فرمائے کہ وہ روشن خیالی کی دُھن میں اتنے تو مدہوش نہ ہوں کہ ان کو خود خبر نہ ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

''جب کہ وہ تم پر نیند غالب کر رہا تھا، اپنی طرف سے سکونِ دل کے لئے اور اتار رہا تھا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تمہاری طہارت کا سامان کرے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کرے اور اس لئے کہ تمہارے دلوں میں قرار پیدا کرے [2] اور اس کے ذریعہ سے قدموں کو جما دے۔''

مفسرین لکھتے ہیں کہ جنگ بدر میں بہت سے مسلمانوں کو غسل کی ضرورت تھی مگر پانی تھا نہیں کہ وہ غسل کریں اور اس لئے ان کے دلوں میں یہ وسواس ہو رہا تھا کہ آج رنگ اچھا نہیں اور ہمیں شکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور زمین نرم تھی جس سے پیر چلنے میں دھنسے جا رہے تھے مگر صبح جو ہوئی تو خوب بارش ہو گئی جس کے پانی سے انہوں نے غسل کیا، اس سے ذہن کو یکسوئی ہوئی تو نیند آ گئی اور اس طرح ان کے دلوں کا وسوسہ بالکل دور ہو گیا اور سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔ [3]

ثبات قدم خود ہی سکون قلب کا اثر ہوتا ہے، پھر یہ کہ بارش کے اثر سے زمین سخت ہو گئی جس سے پاؤں زمین پر جمنے لگے اور ریت میں جو دھنسے جاتے تھے، وہ بات جاتی رہی [4] بلکہ دشمنوں کی طرف کی زمین جو پہلے ذرا سخت تھی، وہاں کیچڑ ہو گئی۔ [5]

---

[1]۔ کما فعل جبریل بقوم لوط فاھلکھم (مجمع البیان)

[2]۔ بہ بند دبر دل شما یعنی ثابت دارد دلھا را (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ فشربوا واغتسلوا ذھب بہ وسوسۃ الشیطان (تبیان)

[4]۔ یثبت بہ الاقدام ان تسوخ فی الرمل (جلالین)

[5]۔ تلبدت بہ ارضھم واوحلت ارض عدوھم (مجمع البیان)

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ﴿۱۲﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

’’جب کہ تمہارا پروردگار خطاب فرما رہا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ثبات قدم پیدا کرو ان میں جو ایمان لائے ہیں، بہت جلد ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو تم ان کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ اور ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ، یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے مقابلہ کیا اللہ اور اس کے پیغمبر سے اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے مقابلہ کرے گا تو بلا شبہ اللہ سخت سزا والا ہے تو اب اس کا مزہ چکھو اور بلا شبہ کافروں کے لئے آتش دوزخ کا عذاب ہے۔‘‘

فرشتوں کا جنگ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا

پہلی آیت کی ابتدا چونکہ اس تذکرہ سے ہے کہ فرشتوں کو یہ پیغام دیا جا رہا تھا تو ظاہر یہی ہے کہ آخر تک خطاب انہی سے ہے اور اس لئے گردنوں اور ہاتھوں پر ضربیں لگانے کی ہدایت انہی کو ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے تسلی کے لئے صرف اترے ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ جنگ بھی کی۔

اس جگہ بعض علماء کی یہ توجیہ بھی وقیع ہے کہ فرشتوں کو آدمیوں کی شکل میں انہی کی طرح بنی آدم سے جنگ کرنے کا پہلے کبھی موقع نہیں آیا تھا، اس لئے خالق کی طرف سے انہیں طریقۂ جنگ کی تعلیم دی گئی۔[۱] دوسرا ضعیف قول یہ ہے کہ اس میں صنعت التفات ہے جس کے معنی ہیں ایک انداز میں کسی سے بات کرتے کرتے انداز پلٹ دینا، یہاں پہلے خطاب فرشتوں سے تھا کہ اہل ایمان میں ثباتِ قدم پیدا کرو، اس کے بعد تخاطب مسلمانوں سے ہوگیا کہ تم ان کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ[۲] اور اس کے بعد چونکہ کافروں کا تذکرہ آ ہی گیا کہ انہیں تلواریں لگاؤ تو آخر میں تخاطب ان کافروں سے ہوگیا ہے ’’تو اب اس کا مزہ چکھو‘‘[۳]

یہاں بلا شبہ صنعت التفات ہے کہ پہلے کافروں کا ذکر بصیغۂ غائب تھا اور اب خود ان سے تخاطب کا انداز ہوگیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾
وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ

[۱]۔ قال ابن الانباری ان الملائکۃ حین امرت بالقتال لم تعلم این تقصد بالضرب من الناس فعلمھم اللہ تعالیٰ (تبیان)

[۲]۔ اے مسلمانان (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ خطاب للمشرکین (تبیان) فذوقوہ ایھا الکفار (جلالین)

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

''اے ایمان لانے والو! جب کافروں سے جنگ میں مڈبھیڑ ہوتو ان کے سامنے سے پیٹھ نہ پھراؤ اور جو ان کے سامنے سے پیٹھ پھرائے گا بجز تدبیر جنگ کے لئے کسی سمت ہٹتے ہوئے یا کسی خاص گروہ کی طرف پناہ لیتے ہوئے تو وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوگا اور اس کی جائے پناہ دوزخ ہوگی اور وہ بہت بری بازگشت ہے۔''

میدان جنگ سے فرار کا باعث دوزخی ہونا

تدبیر جنگ کے لئے ہٹنے کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ دکھاوے کے طور پر پیچھے ہٹیں تاکہ مخالف فریق دھوکا کھا کر آگے بڑھے اور پھر زد پر لاکر انہیں گھیر لیا جائے۔ یہ فرار میں داخل نہیں ہے۔[۱]

علمائے اہل سنت شاید کسی حفظ ماتقدم کے لئے اس کے قائل ہیں کہ میدانِ جنگ سے فرار پر یہ غضب الٰہی اور سزائے آخرت کا اعلان جنگ بدر سے مخصوص تھا مگر الفاظ آیت اس تخصیص کے متقاضی نہیں ہیں اور روایت اہل بیتؑ یہی ہے کہ کسی بھی میدان جنگ سے فرار ہو، وہ غضب خداوندی کا مستوجب ہے۔[۲]

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

''تو تم لوگوں نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کے قتل کا سامان کیا اور آپ نے جب (سنگریزے) پھینکے تو آپ نے نہیں پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے اور اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے ایک خاص فضل وکرم کا مظاہرہ کرے[۳] یقیناً اللہ سننے والا ہے بڑا جاننے والا۔ یہ حقیقت ہے[۴] اور یقیناً اللہ کافروں کی ترکیب کو شکست دینے والا ہے۔''

روایت میں ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر میں تھوڑی سی کنکریاں ہاتھ میں لے کر فوج دشمن کی جانب پھینکیں جس کے بعد انہیں شکست ہوئی[۵] اسی کو قرآن کی آیت میں کہا جارہا ہے۔

---

[۱]۔ بان یریھم الفرۃ مکیدۃ وھو یرید الکرۃ (جلالین)

[۲]۔ قال ابن عباس ھو عام وھو قول ابی جعفر وابی عبداللہ (تبیان)

[۳]۔ تا عطا کند مسلمانان را از نزدیک خویش عطائے نیکو۔ (شاہ ولی اللہ)

[۴]۔ ذلکم الابلاء حق (جلالین)

[۵]۔ ذکر جماعۃ من المفسرین کابن عباس وغیرہ (تبیان)

إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۖ وَإِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٩﴾

''اگرتم فتح چاہتے تھے تو سامنے فتح آ تو گئی اور اگر باز آ جاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر پھر تم ایسا کرو گے تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے اور تمہیں تمہاری جمعیت چاہے کتنی ہی زیادہ ہو کچھ فائدہ نہ دے گی اور بات یہ ہے کہ اللہ ضرور بالضرور ایمان والوں کے ساتھ ہے۔''

یہ تخاطب کفار کے ساتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ روز بدر ابوجہل نے کہا تھا کہ خداوندا جو ہم میں سے زیادتی کر رہا ہے، اسے شکست ہو تو قرآنی ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو خود تمہاری دعا تھی کہ جو حق پر ہو اس کی فتح ہو چنانچہ حق والوں کی فتح ہوگئی۔

دوسرے بہت سے مفسرین بھی اس سے متفق ہیں۔[1]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾

''اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اور اس کی طرف سے روگردانی نہ کرو، درحالیکہ تم سن رہے ہو اور ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے کہا تو کہ ہم نے سن لیا مگر وہ (جو حقیقت میں سننا ہوتا ہے، اس طرح) سنتے نہیں ہیں۔''

''ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے یوں کہا اور نہ کیا'' بعض نے اس کی تفسیر یہود و نصاریٰ کے ساتھ کی ہے[2] اور بعض نے مشرکین اور اس امت کے منافقین کے ساتھ[3] مگر مشرکین پر تو اس کا منطبق ہونا مشکل ہے اس لئے کہ وہ زبان سے بھی دعویٰ نہیں رکھتے کہ ''ہم نے سن لیا'' جس میں قبول کرنے کا مفہوم مضمر ہے اور ظاہر ہے کہ مشرکین اس کے قبول کرنے سے انکاری ہیں، پھر وہ کیوں کہیں گے سمعنا 'سنا ہم نے'' ہاں! اہل کتاب اس امت کے منافقین، یہ دونوں اس سے مراد ہو سکتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے جو سلوک اپنی کتابوں کے ساتھ کیا یعنی زبانی اقرار اور قلباً انکار، وہی منافقین کا عمل اس کتاب یعنی قرآن اور احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ تم منافقین میں سے نہ ہو۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

''بلاشبہ زمین پر بدترین چلنے والے، اللہ کے نزدیک یہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''

---

[1] حیث قال ابو جهل : اللهم اينا كان اقطع للرحم وانا نا بما لانعرف فاحنه الغداة اى اهلكه (جلالين) قال الحسن و مجاهد والزهرى والضحاك والسدى والفراء (تبيان)

[2] یعنی مانند اهل کتاب که توریت خوانند و بزبان معترف شدند و بر ان عمل نه کردند (فتح الرحمن)

[3] هم منافقون والمشركون (جلالين)

گمراہ اور پست کردار انسان جانوروں سے بدتر

زمین پر چلنے والے حیوان اور انسان سب ہی ہیں، ان میں سب سے بدتر کہا گیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ انسان جانوروں سے اور ان میں بھی سب سے بدتر ہیں۔[۱]

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴿۲۳﴾

''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا ہوتا تو انہیں سناتا اور اگر انہیں وہ سناتا تو بھی وہ پیٹھ پھراتے اس صورت سے کہ وہ بے اعتنائی اختیار کئے ہوئے ہیں۔''

ایک سنانا تو ہدایت عام کی صورت سے سب ہی کے لئے ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے اتمام حجت ہوتی ہے، وہ یہاں مراد نہیں ہوسکتا بلکہ یہ سنانا خصوصی ہدایت کا انتظام ہے جو اسی وقت ہوتا ہے جب کسی سے اثر پذیر ہونے کی امید ہو، اس اثر پذیری کی صلاحیت کو یہاں خیراً یعنی ''کوئی بھلائی'' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔[۲]

یہاں کہا گیا ہے کہ ''اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا'' ظاہر ہے کہ جاننا کسی حقیقت واقعیہ سے متعلق ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ذاتی قصور اس کا باعث ہے کہ اللہ ان کی خصوصی ہدایت نہیں فرماتا مگر بعض مفسرین اہل سنت کو کیا کیا جائے کہ وہ بلاوجہ بھی بعض آیات میں جبر کا مفہوم پیدا کرتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''یعنی اللہ نے ان کے دل میں ہدایت کی لیاقت نہیں رکھی، جن میں لیاقت رکھی، انہی کو ہدایت دیتا ہے'' (موضح القرآن)

ہمیں نہیں معلوم کہ جاننے کے معنی ہدایت کی لیاقت رکھنا کس لغت میں ہیں؟

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴿۲۴﴾

''اے ایمان لانے والو! لبیک کہو اللہ اور رسول کی آواز پر جب وہ تمہیں دعوت دیں اس چیز کی طرف جو تمہیں زندہ کردے گی اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہوجاتا ہے اور وہ وہ ہے جس کی طرف تم محشور ہوکر جاؤ گے۔''

یہ دعوت اس دین کی دعوت ہے جو حیاتِ ابدی کا پیغام ہے[۳] اس پر لبیک کہوتا کہ توفیقاتِ الٰہی تمہارے شامل حال ہوں اور اگر تم نے روگردانی کی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ توفیقات تم سے سلب ہوجائیں۔ اس کو کہا گیا ہے کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہوجاتا ہے۔

غنیمت ہے کہ یہاں شاہ عبدالقادر نے بھی حقیقت بینی سے کام لیا ہے اور لکھا ہے:

---

[۱] ان ھؤلاء الکفار شر من دب علی الارض من الحیوان (مجمع البیان) یعنی جانوروں سے بدتر ہیں وہ آدمی جو دین حق کو نہ سمجھیں (موضح القرآن)

[۲] انھم یصلحون بما یوردہ علیھم من حججہ وایاتہ (تبیان) قبولاً للھدیٰ واقبالا علیٰ طلب الحق (مجمع البیان)

[۳] لما یحییکم من امر الدین لانہ سبب الحیوۃ الابدیۃ (جلالین)

''یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو، شاید اس وقت دل ایسا نہ رہے۔ اور اللہ اول کسی کے دل کو روکتا نہیں اور مہر نہیں کرتا۔ جب بندہ کاہلی کرے تو اس کی جزا میں روک دیتا ہے یا ضد کرے، حق پرستی نہ کرے تو مہر کر دیتا ہے۔'' (موضح القرآن)۔

چونکہ آخر میں یہ جملہ ہے کہ تم اسی کی طرف محشور ہو گے لہٰذا پہلا مفہوم ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ کسی برے انجام سے خوف دلایا جا رہا ہے مگر علامہ طبرسیؒ نے دو روایتیں جو معصومؑ کی طرف نسبت رکھتی ہیں ایسی درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ''یحول بین المرء وقلبه'' اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے گمراہی سے بچاتا ہے[1] اس طرح یہ اس کی دعوت پر لبیک کہنے کا ایک صلہ ہے جس کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

ان حدیثوں کو دیکھنے کے بعد ذہن بھی اس مفہوم کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس صورت میں آخر کے جملہ کو بھی کہ ''اسی کی طرف تمہیں محشور ہونا ہے'' کوئی تہدید نہیں، بلکہ ڈھارس دینا سمجھنا چاہیے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾

''اور بچو اس ابتلاء سے کہ جو بلاشبہ انہی لوگوں سے مخصوص نہیں رہے گا کہ جو تم میں سے ظلم و تعدی کے مرتکب ہیں اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سخت سزا والا ہے۔''

یعنی بلا جو آتی ہے، وہ چاہے ایک طبقہ کی بداعمالی کے سبب سے ہو مگر وہ اپنی لپیٹ میں سب ہی کو لے لیتی ہے[2] لہٰذا اس سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے اس طرح کہ خود ایسے اعمال کے مرتکب نہ ہوں اور جو مرتکب ہوتے ہیں، ان کو روکنے کی کوشش کریں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٦﴾

''اور یاد کرو وہ وقت کہ جب تم ایسے کم تعداد میں تھے، اس سرزمین پر کمزور شمار کئے جانے والے کہ تمہیں اندیشہ رہتا تھا کہ لوگ تم پر جھپٹا نہ ماریں[3] تو اس نے تم کو پناہ دی اور اپنی مدد سے تقویت پہنچائی اور تمہیں پاک و پاکیزہ غذا پہنچائی کہ تم شکر گزار رہو۔''

---

[1]۔ روی یونس بن عمار عن ابی عبداللہ قال: معناہ لا یستیقن القلب ان الحق باطل ابدا ولا یستیقن القلب ان الباطل حق ابدا وروی هشام بن سالم عنه قال: معناہ یحول بینه وبین ان یعلم ان الباطل حق اوردھما العیاشی فی تفسیرہ (مجمع البیان)

[2]۔ معناہ انها تعم لان الهرج اذا وقع دخل ضررہ علی کل احد (تبیان)

[3]۔ یاخذ کم الکفار بسرعة (جلالین) اچک لے جاویں تم کو (شاہ رفیع الدین)

سرزمین مکہ میں مہاجروں کا عالم پریشانی

یہ مسلمان مہاجرین سے خطاب ہے اوران کو سرزمین مکہ والا ماضی یاد دلایا جارہا ہے[1] پھر مدینہ کا حال ہے جہاں ان کو پناہ، قوت اور خوشحالی سب ہی کچھ حاصل ہوا۔

''شاید کہ تم شکر گزار ہو'' اس میں یہ طنز محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تم میں سے بہت سے ناشکرے ہوں گے جو اطاعت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے سے منحرف ہوجائیں گے۔

علاوہ ان آیتوں کے جن میں بہت صفائی سے ''کردارِ صحابہ'' پر روشنی ڈالی گئی ہے قرآن کے یہ مجمل اشارے بھی جمہور کے ''عدالت صحابہ'' کی عمومیت والے مسلمہ کو بڑی شدید ضربیں لگاتے ہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

''اے ایمان لانے والو! اللہ اور پیغمبر سے خیانت نہ کرو اور خود اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو درحالیکہ تم علم رکھتے ہو اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے مال اور اولاد آزمائش کا ذریعہ ہیں اور یہ کہ اللہ وہ ہے کہ اس کے پاس بڑے سے بڑا صلہ ہے۔''

امانتوں میں اموال بھی ہیں اور وہ ذمہ داریاں جو اقرار دین کی بنا پر عائد ہوتی ہیں[2]

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت کا تعلق ابولبابہ سے ہے جنہیں بنی قریظہ نے مشورہ لینے کے لئے طلب کیا تھا تو انہوں نے اشارہ سے انہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ جوان کے بارے میں ہے بتلا دیا تھا[3]

فتنہ کے معنی بعض لوگوں نے یہ قرار دیئے ہیں کہ یہ راہِ حق سے ہٹانے کا سبب ہیں[4] مگر یہ اس معنی والا سبب نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس کے خلاف ممکن نہ ہو بلکہ یہ ناقص نفوس کی کمزوری ہے کہ ان کے لئے ان کی محبت اس کا باعث ہوتی ہے اور یہی ان کے ذریعۂ آزمائش ہونے کی بنیاد ہے لہٰذا فتنہ کے معنی ذریعۂ آزمائش ہی کے درست ہیں[5] کیونکہ یہ چیزیں انسان کے ارتفاع درجات کا باعث بھی ہوتی ہیں جبکہ وہ حق اور فرض کے

---

[1]۔ در زمین یعنی در مکہ (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ ماؤ تمنتم علیہ من الدین وغیرہ (جلالین)

[3]۔ قال الزھری نزلت فی ابی لبابۃ فی قصۃ بنی قریظۃ وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبداللہ علیہما السلام (تبیان)

[4]۔ فتنۃ لکم صادۃ عن امور الاٰخرۃ (جلالین)

[5]۔ المراد بالفتنۃ ھٰھنا المحبۃ التی تطھیر بھا فا فی النفس من اتباع الھدٰی او تجنبہ (تبیان) لیختبر خلقہ بالاموال والاولاد۔ (مجمع البیان)

راستے پر ثابت قدم رہے۔

کیونکہ یہی چیزیں انسان کے ارتفاع درجات کا باعث بھی ہوتی ہیں جبکہ وہ حق اور فرض کے راستے پر ثابت قدم رہے۔اور اسی لئے اس فتنہ سے بچنے کی کوشش کوئی ممدوح بات نہیں بلکہ وہ منزل جہادِ نفس سے فرار کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے جسے علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کے ذیل میں درج فرمایا ہے کہ:

لا يقولن احد كم اللهم انى اعوذبك

تم میں سے کوئی ہرگز یہ نہ کہے کہ خدایا میں تجھ سے۔

من الفتنة لانه ليس احد الا و هو مشتمل علی فتنة ولكن من استعاذ فليستعذ من مضلات الفتن.(مجمع البیان)

مانگتا ہوں پناہ فتنہ سے، اس لئے کہ فتنہ (آزمائش کا سامان) تو ہر آدمی کے لئے ناگزیر ہے، ہاں جو شخص پناہ مانگے، وہ پناہ مانگے ان فتنوں سے جو آدمی کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّكُمۡ فُرۡقَانًا وَّيُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۝٢٩

”اے ایمان لانے والو! اگر اللہ کے غضب سے بچنے کی فکر رکھو تو وہ تمہارے لئے ایک خاص طرح کی حد فاصل بنا دے گا اور تمہاری غلطیوں سے درگزر کرے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ بڑا فضل و احسان والا ہے۔“

”حد فاصل“ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ تمہیں مرتبہ میں بلندی عطا فرما کر ایک خاص امتیاز کا مالک بنا دے گا [1] اور یہ بھی کہ فتح و غلبہ عطا فرما کے فوقیت کے لحاظ سے امتیاز دیدے گا [2] اور یہ بھی کہ ان اندیشوں سے جو تمہیں راہ حق میں درپیش ہیں، الگ کردے گا [3] اور یہ بھی کہ تمہیں وہ نگاہ عطا کرے گا جس سے تم حق و باطل میں تمیز کرسکو [4] غالباً معصومؑ سے یہی تفسیر وارد ہے [5] اس سب کے علاوہ خود قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی یہ دعا وارد ہے کہ:

فَافۡرُقۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ۝٢٥

جدائی ڈال دے ہم میں اور اس فاسق گروہ میں (سورۂ مائدہ)

یہ آیت فرقان کے لفظ کے ساتھ بھی اس مفہوم کو ذہن میں لاتی ہے کہ اللہ تمہیں گمراہوں اور گنہگاروں سے الگ رکھے گا اور تم ان کے

---

[1] ۔کرے گا واسطے تمہارے امتیاز (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔پیدا کند برای شما فتحی را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔فرقانا بينكم وبين ما تخافون فتنجون (جلالین)

[4] ۔ای هداية ونورا فی قلوبكم تفرقون بها بين الحق والباطل (مجمع البیان)

[5] ۔يعنی العلم الذی تفرقون به بين الحق والباطل (علی بن ابراهیم)

وبال میں مبتلا نہیں ہوگے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ط وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

''اور جب کہ آپ کے خلاف کافر لوگ منصوبے بنا رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا جان سے ماریں یا آپ کو نکال باہر کریں اور وہ تو اپنے منصوبے بنا رہے تھے اور اللہ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر منصوبہ بنانے والا ہے۔''

حفاظت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خداوند عالم کی تدبیریں

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ کفار کی منصوبہ سازی قبل ہجرت اس وقت کی ہے جب حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ معظمہ میں تھے۔ [۱]

ہوسکتا ہے کہ یہ اس وقت کا ذکر ہو، جب بالآخر یہ طے پایا کہ آپ کا اور بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا جائے جس کے بعد آپ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ اس صورت میں ان کے بالمقابل اللہ کا منصوبہ وہ قرار پائے گا جس کی تکمیل جناب ابو طالبؑ کے ذریعہ سے ہوئی اور جس جس طرح انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت فرمائی، وہ خالق کے اس منصوبہ کے اجزاء ہوں گے مگر بعض مفسرین تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مقصود مشرکین کی وہ منصوبہ سازی ہے جو دار الندوہ میں مشورہ کے لئے اجتماع کے موقع پر ہوئی تھی جس کے بعد ہجرت ہوئی [۲] اس صورت میں خالق کا منصوبہ وہ ہوگا جس کی تکمیل اس نے علی بن ابی طالبؑ کو بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلا کر فرمائی جس کے نتیجہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسلامتی ہجرت فرمائی [۳] اور اس تدبیر الٰہی کی صورت بھی بے شک ایسی ہے جسے خالق ان کے مکر کے مقابلہ میں لفظ مکر سے تعبیر فرمائے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب سے بچانے اور آسمان پر اٹھانے کے موقع پر بھی ارشاد ہوا ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ (آل عمران)

مگر مجھے اس محل نزول کے ماننے میں بس اتنا تامل ہے کہ ہجرت کا منصوبہ تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بن چکا تھا چنانچہ اصحاب سب تقریباً مدینہ کی طرف بھیجے جا چکے تھے۔ اسی منصوبہ کو ناکام بنانے کے لئے مشرکین کا اجتماع ہوا تھا۔ اس صورت میں مشرکین کے منصوبہ میں لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ کی دو شقیں تو سمجھ میں آتی ہیں کہ آپؐ کو قید کریں یا قتل کر دیں مگر تیسری شق: اَوْ يُخْرِجُوْكَ ''یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکال دیں'' سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ نکالنا تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد کو پورا کرنا تھا، اسے ناکام بنانا نہیں تھا، پھر اگر ان کے منصوبہ کا یہ بھی جز تھا تو خالق کا اس کے بالمقابل یہ منصوبہ کہ ''نکل جائیے'' کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ ان کے منصوبہ کو شکست دینا کہاں ہوا؟

ہاں! اس صورت میں بھی ایک قول قرین قیاس ہے کہ نکالنے سے مراد ایک خاص طرح سے نکالنا تھا یعنی ایک شتر سرکش پر سوار کر کے

---

[۱] ۔ تعریض است بآن قصد کہ کفار در مکہ جمع شدہ این رائے می روند (فتح الرحمن)

[۲] ۔ وقد اجتمعوا للمشاورة فی شانك بدار الندوة (جلالین)

[۳] ۔ بان اوحیٰ الیك ما دبروه وامرك بالخروج (جلالین)

اسے ہنکا دینا جو باعث ہلاکت ہو جائے۔[1]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣١﴾

''اور جب ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کریں۔ یہ نہیں ہیں مگر اگلے زمانہ کی فرضی کہانیاں۔''

یہ ان کا کہنا کہ ''ہم چاہیں تو ہم ایسا ہی کلام پیش کریں'' دھاندلی کے طور پر اپنے کھسیانے پن کو چھپاتے ہوئے نفسیاتی طور پر ضمیر کے اس چور کا غماز ہے کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہم ایسے کلام پر قادر نہیں ہیں۔ ورنہ ''ہم چاہیں'' کے کیا معنیٰ؟ قرآن کے مسلسل تازیانوں پر کہ اس کا مثل لا سکتے ہو تو لاؤ، چاہنا تو فطری امر ہے۔

آخر میں وہ مقابلہ میں جانیں دے رہے ہیں تو اسے کیوں نہیں چاہتے کہ ہم قرآن کے اس مطالبہ کو منظور کر کے اس کا مثل پیش ہی کر دیں۔ یہ ''نہ چاہنا'' ان کی زبان میں حقیقتاً مجبوری کا دوسرا نام ہے۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٢﴾

''اور وہ بھی ایک وقت ہے جب انہوں نے کہا کہ خداوندا! اگر یہ تیری طرف کا حق ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر لا کوئی اور ایسا ہی دردناک عذاب۔''

چونکہ وہ ظاہرا ایسا کرتے تھے کہ یہ حق نہیں ہے، اس لئے گویا اپنی سچائی کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے چاہے دل میں اسی وقت ڈر رہے ہوں مگر دیدہ دلیری سے کام لے کر زبان سے اس طرح کی دعا کرتے تھے اور اللہ کی اس مہلت سے جو انہیں دی جا رہی تھی، غلط فائدہ اٹھا کر اس تکذیب کے حق بجانب ہونے کی بخیال خود ایک دلیل پیش کر رہے تھے کہ اگر یہ سچ ہو تو ہم خود اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم پر پتھروں کا یا اور اسی قسم کا عذاب نازل کر دے مگر دیکھو ہماری اس دعا کے باوجود ہم پر ایسا کوئی عذاب نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پیغام میں کوئی حقانیت نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿٣٣﴾

''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر عذاب نازل کرے اس حالت میں کہ آپ ان کے درمیان ہیں اور نہ اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا ہے اس حالت میں کہ جب وہ معافی مانگ رہے ہوں۔''

---

[1] قال الفراء: او يخرجوك على بعير يطرد به حتى تهلك (تبيان)

وجودِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانع نزولِ عذاب

اس میں اللہ کی طرف کے ایک عام قاعدہ کا اعلان ہے جسے شاہ ولی اللہ صاحب ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

یعنی سنة اللّٰہ آنست کہ تا پیغامبر درمیان قوم باشد عذاب عام نمی کند وہمچنیں تا آن کہ ایشاں استغفار می کنند عذاب نمی نماید (فتح الرحمن)

یعنی اللہ کا مستقل طریقہ یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے درمیان ہوتا ہے وہ عمومی عذاب نازل نہیں کرتا اور اسی طرح جب تک وہ معافی مانگتے رہتے ہیں عذاب نازل نہیں کرتا۔

اس کا ربط محل کلام سے ظاہر کرتے ہوئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یعنی مکہ میں حضرت کے قدم سے عذاب رک رہا تھا، اب ان پر عذاب آیا، اسی طرح جب تک گنہگار نادم رہے اور توبہ کرتا رہے تو پکڑا نہیں جاتا، اگرچہ اس سے بڑا گناہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ گنہگاروں کو دو چیز پناہ ہیں، ایک میرا وجود اور دوسری استغفار'' (موضح القرآن)

اس سے دنیا کو محسوس ہونا چاہیے کہ اب جب کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے اور خلق خدا کی بداعمالیوں کا اس وقت سے اب تک ہر شخص مشاہدہ کر رہا ہے تو دنیا پر عذاب کیوں نہیں آتا؟

اس سے لازمی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ دنیا اس حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود سے خالی نہیں ہے اور اس سلسلہ کی کوئی فرد اب بھی آنکھوں کے سامنے نہیں تو پردۂ غیبت میں قائم و برقرار ہے اور اسی کے سبب سے یہ آسمان و زمین قائم ہیں اور خلق خدا عذاب استیصال سے محفوظ ہے۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۴

''اور کیا استحقاق ہے انہیں کہ اللہ ان پر عذاب نہ کرے جب کہ وہ مسجد الحرام سے روکتے رہے حالانکہ وہ اس کے کوئی ورثہ دار نہیں ہیں، اس کے ورثہ دار نہیں ہیں مگر پرہیزگار لوگ لیکن ان میں کے زیادہ تر آدمی علم نہیں رکھتے۔''

یعنی یہ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان میں موجودگی تھی کہ ان پر عذاب نازل ہوا، ورنہ ان کے افعال ایسے ہی تھے کہ یہ موردِ عذاب ہو جاتے۔ [1]

وہ اپنے کعبہ کا والی و وارث سمجھتے تھے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ اس کے اولیاء ہونے کے لائق نہیں ہیں، اس کے اولیاء تو پرہیزگار ہی ہو سکتے ہیں اور وہ مسلمان ہیں۔

اولیاء کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے ''ورثہ دار'' یہ عام ترجموں میں چاہے نہ کیا گیا ہو [2] مگر اس کی جو تشریح کی جاتی ہے وہ اسی ترجمہ کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''قریش آپ کو اولاد ابراہیم سمجھ کر کعبہ کے مختار ٹھہراتے تھے اور مسلمانوں کو آنے نہ دیتے تھے۔ سو فرمایا کہ اولاد ابراہیم میں جو

---

[1] یعنی اصل استحقاق عذاب دارند ولیکن بودن پیغامبر درمیان ایشان مانع بود (فتح الرحمن)

[2] نیستند سزاوار آنجا (شاہ ولی اللہ) نہیں وہ لائق والی ہونے اس کے (شاہ رفیع الدین)

پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے۔" (موضح القرآن)

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اور ان کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹی یا تالیاں بجانے[۱] کے سوا نہ تھی، تو اب اس سزا کو چکھو اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے تھے۔"

بموقع حج مشرکین کے لغویات

یعنی بجائے نماز و عبادت کے جو اس خانۂ مقدس کے شایان شان ہے، وہ وہاں ایسے ناشائستہ حرکات کرتے تھے۔[۲]

کہا جاتا ہے کہ "اس سزا" سے مراد وہ تباہی ہے جو ان پر جنگ بدر میں آئی۔[۳]

اور آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ بصورت کلام یا بزبانِ حال ان سے یوں کہا جائے گا[۴] کہ اب اس سزا کو چکھو اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے تھے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

"بلاشبہ کافر لوگ اپنے مال صرف کرتے ہیں اس غرض سے کہ اللہ کے راستے سے روکیں، تو بہت جلد ایسا ہوگا[۵] کہ یہ ان کو صرف کریں گے اور پھر وہ ان کے لئے رنج و ملال کا باعث بنیں گے، پھر وہ مغلوب بھی ہوں گے اور جو کافر ہیں وہ حشر میں دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے تا کہ اللہ امتیاز کر دے ناپاک کا پاک سے اور جو کچھ ناپاک ہو، اسے ایک دوسرے پر رکھ دے اور ان سب کو تہہ بہ تہہ کر کے دوزخ میں ڈال دے، وہ لوگ ہیں جو گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔"

---

[۱]۔ التصدية التصفيق وهو ضرب اليد باليد (مجمع البيان)

[۲]۔ اى جعلوا ذٰلك موضوع صلوٰتهم التى امروا بها (جلالين)

[۳]۔ فذوقوا العذاب ببدر (جلالين)

[۴]۔ قال ابو على الجبائى: يقال لهم فى الأخرة: ذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون (تبيان)

[۵]۔ زود باشد كه (شاه ولى الله)

''اللہ کے راستے سے روکیں''یعنی دین الٰہی کے قبول کرنے سے۔[1]

''جو کچھ ناپاک ہو، اسے ایک دوسرے پر رکھ دے''یعنی جس طرح وہ خیرات جو راہِ خدا میں ہو ذخیرۂ آخرت ہوتی ہے، اسی طرح یہ خرچ جو وہ بڑی فیاضی کے ساتھ باطل پروری کے لئے کر رہے ہیں آخرت کے لئے اکٹھا ہو رہے ہیں اور وہاں یہ سب جمع ہو کر ان کے لئے عذاب آخرت میں اضافہ کا سبب ہو جائیں گے۔[2]

اور گھاٹا اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کیونکہ یہ سب اموال خرچ بھی کریں اور پھر آخرت میں اس کی شدید سزا بھی پائیں گے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾

''کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لئے بخشش ہو جائے گی اس کی جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اور اگر وہ پھر ایسا کریں گے تو یہ اگلے آدمیوں کی روش ہے جو ہوتی چلی آئی ہے۔''

آخری فقرہ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، یہ ایک تشریح کے مطابق ہے[3] دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اگلے لوگوں کے لئے اللہ کا جو طریقہ ہے وہ سب کے سامنے آچکا ہے یعنی یہ کہ جب ان کی بداعمالیاں زیادہ ہو جائیں تو ان پر عذاب نازل ہو[4] مگر یہ معنی ظاہر الفاظ سے ذرا بعید ہیں۔ پھر بھی علامہ طبرسیؒ نے جو اس کی حمایت میں ارشاد فرمایا ہے وہ قابل لحاظ ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں سنۃ (جس کا ترجمہ روش یا طریقہ کے ساتھ ہوتا ہے) اس کی اضافت قرآن مجید میں کئی طرح سے آئی ہے۔ پہلے یہی کہ وہ طریقہ جس کے ساتھ اختیار کیا جائے، اس کی طرف اضافت ہو جیسے یہاں کہا گیا: سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ''پہلے والوں کا طریقہ''یعنی اللہ کا طریقہ جو اس نے پہلوں کے ساتھ اختیار کیا۔[5]

دوسرے وہ طریقہ جس کے ہاتھ سے عمل میں آئے، اس کی طرف اضافت جیسے:۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا ''ان کے طریقہ کے مطابق جنہیں ہم نے رسول بنایا'' یہاں طریقہ کی اضافت مرسلین کی طرف کی گئی ہے، اس لئے کہ اس کا ظہور انہی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ اور تیسرے خود اپنی طرف اضافت جو کہ حقیقتاً اس طریقہ کا جاری کرنے والا ہے جیسے اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا — تم ہمارے طریقہ کو بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔ (بنی اسرائیل: ۷۷)

یہ علامہ طبرسیؒ کا ارشاد بہت وقیع ہے مگر اس میں کمی بس اتنی ہے اور وہ بہت بڑی کمی ہے کہ پہلی قسم کی اضافت میں زیر بحث آیت کے علاوہ کوئی شاہد موصوف نے درج نہیں کیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس مفہوم کو کافی تقویت حاصل ہو جاتی۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

---

[1] ۔سبیل اللہ ھنا ھو دین اللہ (تبیان)

[2] ۔فیعاقبھم بہ کما قال: یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم الاٰیۃ (مجمع البیان)

[3] ۔گزشتہ است روش پیشینان (شہ ولی اللہ) تحقیق گزری ہے یہی عادت پہلوں کی (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔سنۃ الاولین فی تعجیل العقاب لھم (تبیان) ای سنۃ فیھم (جلالین)

[5] ۔اضاف السنۃ الیھم لانھا کانت تجری علیھم (مجمع البیان)

بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

''اوران سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ کا وجود نہ رہے اور عبادت بالکل اللہ کی ہونے لگے اب اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ دیکھنے والا ہے اس کا جو وہ کرتے ہیں اور اگر وہ منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا مالک ہے، کتنا اچھا مالک اور کتنا اچھا سرپرست۔''

''فتنہ'' کے معنی غلبۂ کفر وکفار کے کہے گئے ہیں[1] اور بعض مفسرین نے خود کفر شرک کے ساتھ تفسیر کی ہے۔[2]

بعد کا فقرہ: ''يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' عبادت بالکل اللہ کی ہونے لگے[3] اس تشریح کے ساتھ بہت چسپاں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ہے کہ اس آیت کا مضمون ابھی تک وقوع میں نہیں آیا ہے وہ وقع میں اس وقت آئے گا جب امام منتظر علیہ السلام ظہور فرمائیں گے[4]۔

مولیٰ کے معنی مددگار کے لئے جاتے ہیں[5] مگر اس صورت میں آخری فقرہ: ''نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ'' میں معنوی حیثیت سے تکرار ہو جاتی ہے لیکن جب مولیٰ کے معنی مالک کے لیں تو دونوں فقروں میں سے ہر ایک مستقل افادیت کا حامل قرار پاتا ہے اور معانی بیان کا مسلمہ اصول ہے کہ التا سیس اولی من التا کید یعنی کسی نئے معنی کا لفظ میں پیدا ہونا اس سے بہتر ہے کہ اسے گزشتہ معنی ہی پر زور دینے پر محمول کیا جائے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

''اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو چیز بھی تم بطور غنیمت حاصل کرو تو بلا شبہ اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہوگا اور پیغمبر کے لئے اور صاحبان قرابت اور یتیموں اور غریبوں اور اس کے لئے جو سفر کی راہ میں ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور اس پیغام پر جو ہم نے اتارا اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن، اس دن جب دونوں جمعیتوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

---

[1] فتنه يعني غلبهٔ كفر (شاہ ولی اللہ)

[2] فتنة شرك (جلالين)

[3] يكون الدين كله لله وحده ولا يعبد غيره (جلالين)

[4] روى زرارة وغيره عن ابي عبدالله (مجمع)

[5] مولا كم ناصر كم (جلالين)

خمس کا صریحی حکم

لغت میں غنم کے معنی فائدہ کے ہیں اور اس لئے مالی فائدہ جو حاصل ہو وہ ما غنمتم کا مصداق ہوتا ہے لیکن چونکہ عموماً جہاد کے سلسلہ میں کفار کی شکست کے بعد جو اموال مسلمانوں کے ہاتھ آئیں، وہ مال غنیمت کہلاتے ہیں، اس لئے عام مفسرین نے اس ما غنمتم کو انہی اموال غنیمت کے معنی میں لیا ہے۔[۱]

فقہائے شیعہ اس کے دائرہ کو اس کے لغوی معنی کی وسعت کے مطابق تعلیمات اہل بیت علیہم السلام کی روشنی میں حاوی کرتے ہیں بہت سی قسم کے اموال پر جیسے دفینے اور معاون اور منافع اموال تجارت اور غیر مسلمین سے جو مال کسی ایسے ذریعہ سے حاصل ہو جو عام انسانی قوانین کے ماتحت جرم نہیں ہے لیکن شریعت اسلام اسے ممنوع قرار دیتی ہے[۲] تفصیل اس کی کتب فقہیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بہر حال ما غنمتم کے جو بھی حدود ہوں، یہ تو صاف نص قرآن سے ظاہر ہے کہ علاوہ زکوٰۃ کے ایک فریضہ مال خمس کا ہے اور یہ اتنا معزز حق ہے کہ اس کے حقداروں میں سب سے پہلے اللہ کا نام ہے اور اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور اس کے بعد ذوی القربیٰ کا۔

شکر ہے کہ یہاں بہت سے مفسرین اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں کہ ذوی القربیٰ سے خود مسلمانوں کے قرابت دار مراد نہیں ہیں بلکہ قرابت دارانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"یعنی خویشاوندانِ پیغمبر راکه بنی ہاشم و بنی مطلب اند" (فتح الرحمن)

تفسیر جلالین میں بھی ایسا ہی ہے۔

"قرابة النبی صلی الله علیه وسلم من بنی هاشم و المطلب"

بس اس بارے میں بھی دونوں فرقوں کے نقطۂ نظر میں اتنا فرق ہے کہ یہاں چونکہ ذوی القربیٰ بصورت جمع نہیں بلکہ ذی القربیٰ بصورت واحد ہے جس کا مفہوم نکلتا ہے ایک شخص خاص جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امتیازی رشتہ رکھتا ہے، اس لئے شیعہ تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد امام ہے[۳] اور چونکہ وہی بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمائندہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے، اس لئے حق اللہ، حق الرسول اور حق ذی القربیٰ، ان تینوں کا مجموعہ جو خمس کا نصف حصہ ہوتا ہے، وہ "سہم امام" کہلاتا ہے۔

پھر آخر میں جو "وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ" کے الفاظ قرآن مجید میں ہیں اگر چہ بلا قید ہیں مگر ہمارے یہاں احادیث کی بنا پر یہ قید ثابت ہوئی ہے کہ ان میں سادات ہونے کی شرط ہے[۴] اور اس لئے ان تینوں کے مجموعہ کو "سہم سادات" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوتی کہ حصوں کی تعیین میں یا تقسیم کے طریقہ میں شیعہ اور سنی میں اختلاف ہو جاتا جیسا کہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

---

[۱] ۔اخذتم من الکفار قهرا (جلالین) آنچه غنیمت یافتند از کافران (شاه ولی الله)

[۲] ۔عند اصحابنا یجب فی کل فائدة تحصل للانسان من المکاسب و ارباح التجارات و الکنوز و المعاون و الفوض و غیر ذٰلك ... لان جمیع ذٰلك یسمیٰ غنیمة (تبیان)

[۳] ۔هو الامام (علی بن ابراهیم)

[۴] ۔فهم ایتام آل محمد علیهم السلام خاصة و مساکینهم و انباء سبیلهم خاصة (علی بن ابراهیم)

''چہار خمس عانمانرا باید داد و یک خمس در بیت المال نہادہ بر پنج حصہ یا سہ حصہ قسمت باید کرد علی اختلاف المذہب۔'' (فتح الرحمن)
جو فقہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف ہے مگر اندوہناک سانحہ تو یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت کے باقی ہوتے ہوئے جمہور اہل سنت کے یہاں خمس کا فریضہ ہی ساقط کر دیا گیا اور ہمیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس حکم کے آخر میں یہ تہدیدی الفاظ کہ ''اگر ایمان رکھتے ہو اللہ پر'' اسی مستقبل کو دیکھتے ہوئے رکھے گئے تھے کہ باوجود دعوائے اسلام و ایمان کے مسلمانوں کی اکثریت اس حکم پر خط نسخ کھینچ دے گی۔

جنگ بدر کے کچھ کیفیات

''فیصلہ کے دن'' اور ''دونوں جمعیتوں کی مڈبھیڑ کے دن سے مراد روز بدر ہے[1] اور اس کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ اس دن کی فتح مسلمانوں کے لئے صرف قدرتِ ربانی اور تائید الٰہی سے ایک معجزہ کے طور پر ہوئی تھی لہٰذا مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ فتح وہ اپنی قوت بازو سے حاصل کرتے ہیں اور مال غنیمت کا پورا پورا استحقاق خود انہی کو ہے۔ اس میں دوسرے حصے کیوں قرار دیئے جاتے ہیں؟ انہیں اس موقع کو یاد دلا کر ایک طرف استحکام ایمان کا سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے کہ اگر ابھی تمہارے ایمان میں کمزوری ہے تو ان قدرتی آثار کو دیکھ کر جو جنگ بدر میں نمودار ہوئے تمہارے ایمان کو مستحکم ہو جانا چاہیے اور دوسری طرف یہ کہ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ تمہارے فتوحات تائید حق پر مبنی ہیں تو جو اس کی طرف کا فریضہ ہو اس کے ادا کرنے کے لئے برضا و رغبت تیار ہو۔

اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الۡقُصۡوٰى وَالرَّكۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ ؕ وَلَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِى الۡمِيۡعٰدِ ۙ وَلٰـكِنۡ لِّيَقۡضِىَ اللّٰهُ اَمۡرًا كَانَ مَفۡعُوۡلًا ۙ لِّيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۙ ﴿۴۲﴾

''جب کہ تم ادھر کے کنارے پر تھے اور وہ اُدھر کے کنارے پر[2] اور قافلہ تم سے نیچے اور اگر تم میں آپس میں وقت مقرر ہوا ہوتا تب بھی تم میں باہم وقت کے اعتبار سے اختلاف ہو جاتا مگر اللہ کو تو پورا کرنا تھا اس بات کو جو کہ ہونے والی تھی تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ حجت کی بنا پر زندہ رہے اور یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

یہاں سے جنگ بدر کی روئداد بیان ہونا شروع ہوتی ہے۔ مسلمان مدینہ کی طرف سے چلے اور ابوجہل کی سرکردگی میں مشرکین کا لشکر مکہ سے آ رہا تھا اور ابوسفیان کی سرکردگی میں تجارتی قافلہ شام کی جانب سے آ رہا تھا ہوسکتا تھا کہ مسلمان مکہ والوں کے آنے سے پہلے آگے بڑھ جاتے اور شام کے قافلہ تک پہنچ جاتے اور کفار مکہ کی جماعتیں ٹھیک ایک دوسرے کے مقابلہ میں ایک ہی وقت پر اس طرح آمنے سامنے پہنچ گئیں کہ مقابلہ

---

[1] یوم الفرقان ای یوم بدر الفاروق بین الحق والباطل (جلالین)
[2] العدوۃ شفیر الراوی (تبیان) شما بکنارۂ نزدیک بودید و ایشان بکنارۂ دور تر (شاہ ولی اللہ)

ناگزیر ہوگیا۔اس کوایک غیر معمولی کرشمۂ قدرت کے طور پر بیان کیا جارہا ہے کہ اس طرح ایک ہی وقت پر اس جگہ دونوں جماعتوں کا پہنچنا ہوا کہ معلوم ہوتا ہے جیسے پہلے سے دونوں میں طے ہوگیا تھا کہ وہاں پر ہم دونوں اس وقت پر ملیں گے بلکہ اگر آپس میں اس طرح کا قول وقرار بھی ہوتا تب بھی کچھ تو اختلاف ہو ہی جاتا کہ ایک کچھ پہلے پہنچتا اور دوسرا کچھ بعد لیکن یہ خداوندی انتظام تھا تاکہ اب ایک دفعہ کفر کو اسلام کے مقابلہ میں طاقت آزمائی کا موقع دے ہی دیا جائے اور پھر ظاہری اسباب کے تقاضا کے بالکل برخلاف اس اقلیت کو اس اکثریت کے مقابلہ میں فتح عطا کر کے دکھلا دیا جائے [1] اور اس کرشمۂ قدرت کے ذریعہ سے حق اور باطل بالکل نمایاں ہوجائے۔

اب جو ہلاک ہو یعنی کفر پر قائم رہے وہ حق کے آثار آنکھوں سے نمایاں دیکھنے کے بعد [2] صرف ہٹ دھرمی سے کفر پر قائم رہے گا اور جو زندہ ہو یعنی ایمان اختیار کرے وہ حجت یعنی پوری بصیرت ایمان کے ساتھ۔

اِذۡ يُرِيۡكَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَنَامِكَ قَلِيۡلًا ؕ وَلَوۡ اَرٰٮكَهُمۡ كَثِيۡرًا لَّـفَشِلۡتُمۡ وَلَتَـنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾

”جب کہ اللہ نے آپ کے خواب میں ان کی تعداد آپ کو کم دکھائی اور اگر وہ آپ کو ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو تم لوگ سست ہوجاتے اور طریقۂ کار میں آپس میں دست وگریبان ہوجاتے [3] لیکن اللہ نے خیریت رکھی یقیناً وہ سینوں کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے۔“

اس آیت سے ظاہر ہے کہ جنگ بدر کے پہلے پیغمبر خدا ﷺ کو اس جنگ کی صورت خواب میں دکھلائی گئی ہے اور اسی کے پیش نظر آپ برآمد ہوئے۔

اس سے بھی وہ حکایت یا خیال غلط ہوجاتا ہے کہ پیغمبر ﷺ اصل میں مشرکین کے قافلہ کو لوٹنے کے لئے نکلے تھے مگر اتفاق سے مقابلہ اس فوج سے ہوگیا جو قافلہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہوئی تھی۔

ہاں! قرآن یہ کہتا ہے کہ رسول ﷺ کو کواب میں تعداد مشرکین کی کم دکھائی گئی ورنہ رسول ﷺ اس خواب کو بیان فرماتے تو عام مسلمانوں پر خوف ودہشت طاری ہوجاتی اور طریق کار کے اختیار کرنے میں اختلاف ہوجاتا یعنی کچھ اشخاص مرعوبیت کے نتیجہ میں ایسی رائیں دیتے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور گوشۂ عافیت سے نکلنا نہ پڑے۔

خالق کریم نے اس مصلحت سے خواب میں تعداد کم دکھائی اور اس طرح اس باہمی اختلاف اور کشمکش سے بچالیا۔ [4]

یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ خواب رسول ﷺ کو دکھایا گیا ہے مگر سستی وغیرہ کی نسبت رسول ﷺ کی طرف نہیں ہے ورنہ اس کا ذکر اسی واحد حاضر کے صیغہ کے ساتھ ہوتا جو آیت کے شروع میں ہے بلکہ اس کی نسبت عام مسلمانوں کی طرف ہے اس لئے صیغۂ جمع حاضر استعمال کیا جارہا

---

[1] ۔لیقضی اللہ امرا کان مفعولا فی عملہ وھو نصر الاسلام ومحق للکفر (جلالین)

[2] ۔قیام حجۃ علیہ بمارأی من المعجزات الماھرات (تبیان)

[3] ۔بزدلی می کردید وبایکدیگر نزاع می کردید (شاہ ولی اللہ) البتہ سستی کرتے تو تم اور البتہ جھگڑتے تم بیچ کام کے (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔سلمکم من الفشل والتنازع (جلالین)

ہے۔(لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ)

یہ قرآن مجید کے اندازِ تعبیر کے وہ پہلو ہیں جن پر سطحی نگاہیں اکثر متوجہ نہیں ہوتیں اور اس لئے غلط اندیشوں میں مبتلا ہوتی ہیں۔

شاہ عبدالقادر نے یہاں پر ایک اچھی نکتہ آفرینی کی ہے وہ لکھتے ہیں: ''پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے وقت تا کہ جرأت سے لڑیں پیغمبر کا خواب غلط نہیں، ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے اکثر وہ تھے جو پیچھے مسلمان ہوئے۔''(موضح القرآن) مگر یہ حقیقت تو از روئے قرآن نا قابل انکار ہے کہ اس وقت جو حقیقت واقعہ یعنی جتنی تعداد فوج کی تھی اسے خالق نے خواب میں نمایاں نہیں کیا جس کی مصلحت خداوند عالم کی جانب سے بتائی جارہی ہے اس کے بعد اس اصول کا تو قائل ہونا چاہیے کہ بعض اہم مصالح کی بنا پر حقیقت کو نمایاں نہ ہونے دینا درست ہے اور اس سے تقیہ کا جو مطلق طور پر انکار کیا جاتا ہے یا اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، وہ بلاشبہ غلط قرار پاتا ہے۔

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٤٤﴾

''اور جب کہ تمہارے ایک دوسرے کے آمنے سامنے پہنچنے کے وقت وہ ان کی تعداد تمہاری آنکھوں میں کم دکھلا رہا تھا تا کہ اللہ پورا کرے اس بات کو جو وہ کرنے والا تھا اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہے تمام چیزوں کا۔''

مشرکین کی تعداد مسلمانوں کو زیادہ نظر آتی تو ان میں سستی پیدا ہوتی اور کفار کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ محسوس ہوتی تو وہ مقابلہ سے گریز کرتے لہٰذا وہ جنگ نہ ہوتی جس میں اللہ کو اپنی قوت قاہرہ کا ثبوت دے کر کفار کو شکست دینا تھی لہٰذا اس نے اپنی قدرت کے تصرف سے ان کی تعداد انہیں کم دکھائی اور ان کی تعداد انہیں کم محسوس ہوئی اس طرح دونوں نے جم کر مقابلہ کیا اور نتیجتاً قدرت کو جو منظور تھا وہ وقوع میں آکر رہا مگر معلوم ہونا چاہیے کہ کفار کا یہ احساس کہ مسلمان تعداد میں بہت کم ہیں جو کہ واقعہ تھا، جنگ شروع ہونے کے قبل تک قائم رہا اور جب لڑائی شروع ہوگئی تو اب خالق کا کرنا یہ تھا کہ یہ انہیں تعداد میں اپنے سے دو نے نظر آنے لگے جس کا سورۂ آل عمران میں تذکرہ ہے۔[1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٤٥﴾

''اے ایمان لانے والو! جب کسی جماعت کا سامنا کرو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔''

میدانِ جنگ میں برقرار رہنے کی تاکید

اس کے پہلے سلبی پہلو یعنی فرار سے ممانعت ہو چکی ہے اور اب مثبت طور پر ثابت قدمی کا حکم دیا جا رہا ہے جس سے التزامی طور پر وہ ممانعت برآمد ہوتی ہے۔

---

[1] ھٰذا قبل التحام الحرب فلما التحم اراھم ایاھم مثلیھم کما فی ال عمران (جلالین)

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ فرار کرنے والے ''بہتری'' سے محروم رہیں گے اور چونکہ یہ دین و دنیا کی بہتری ہے اور دینی بہتری کے معنی نجات کے ہیں، اس لئے اس سے ظاہر ہے کہ فرار کرنے والے نجات سے محروم رہیں گے اور بعض مترجمین نے فلاح کے معنی ہی نجات کے قرار دے دیئے ہیں۔ [1]

بے شک یہ حکم کہ جب کسی جماعت کا سامنا کرو تو ثابت قدم رہو، اس میں عقلی و نقلی قرائن سے یہ قید ضروری ہے کہ وہ جماعت ایسی ہو جس سے جنگ بحکم شرع درست ہو اس لئے کہ اگر جنگ ناجائز ہوئی تو اس میں ثابت قدمی بھی شرعاً کوئی ممدوح چیز نہیں ہو سکتی۔ [2]

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۚ﴿۴۶﴾

''اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کہ تم میں سستی پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی اور صبر و برداشت سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

تنازع باہمی کے خراب نتائج

آیت بتا رہی ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کی بجائے آپس کے اختلافات میں پڑ گئے تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو نکلے اپنے گھروں سے اکڑ میں [3] اور آدمیوں کو دکھانے کے لئے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اللہ اس پر جو وہ کرتے ہیں حاوی ہے۔''

خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں تعریض ابوجہل اور اس کے ہمراہیوں پر ہے [4] مگر دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ خود مسلمانوں کو جو جہاد میں جاتے ہیں تنبیہ ہے کہ اس میں اکڑ اور دکھلاوے کی نیت شامل نہ ہونا چاہیے [5] مگر اس صورت میں راہ راست سے روکنے کا جز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ

---

[1]۔ بود کہ شمار سنگار شوید (شاہ ولی اللہ) تو کہ تم چھٹکارا پاؤ (شاہ رفیع الدین)

[2]۔ الفئة المذکورة فی الاٰیة وان کانت فتطلقة فالمراد منها اکمشرکة او الباغیة (تبیان)

[3]۔ از روئے سرکشی (شاہ ولی اللہ) اتراکر (شاہ رفیع الدین)

[4]۔ ایں حال ابوجهل و تابعان اوست (فتح الرحمن) هم قريش لما جت خدمت لتحصی ایقن (تبیان)

[5]۔ جہاد عبادت ہے، عبادت پر اتراوے یا دکھاوے کو کرے تو قبول نہیں (موضح القرآن)

وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾

''اور جب کہ شیطان نے ان کے سامنے ان کے کرتوتوں کو بنا ٹھنا کر پیش کیا اور کہا کہ آج آدمیوں میں کوئی تم پر غالب آنے والا ہے ہی نہیں اور میں تمہارا حمایتی ہوں [۱] اس کے بعد جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے آئیں تو وہ پچھلے پیروں پلٹ گیا ور کہا میں تم سے بے تعلق ہوں بلا شبہ میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں تو یقیناً اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت سزا والا ہے۔''

بعض مفسرین تو لکھتے ہیں کہ واقعی شیطان آدمی کے بھیس میں آیا اور اس نے ابوجہل سے اس طرح گفتگو کی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''وہ شیطان تھا جب اس نے جبریلؑ و میکائیلؑ دیکھے مسلمانوں کی طرف، تب بھاگا'' (موضح القرآن)

بلکہ صورت بھی بتائی گئی ہے کہ:

كان اتاهم فى صورة سراقة ابن مالك سيد تلك الناحية (جلالين)

وہ ان کے پاس سراقہ بن مالک کی صورت میں آیا تھا جو ان اطراف کا سردار تھا۔

ہمارے یہاں بھی اس کی روایت موجود ہے [۲]

اور ایسا نہ بھی ہو تو وہ بداعمال لوگوں کے ذہن میں خیالات اسی طرح پیدا کرتا ہے جیسے کہ وہ ان سے باتیں کر رہا ہو۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۴۹﴾

''جب کہتے تھے منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ ان لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے ان کے دین نے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ زبردست ہے صحیح و درست کام کرنے والا۔''

کھلا ہوا مطلب تو اس کا یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جنگ کے قبل مسلمانوں کی قلت اور دشمنوں کی کثرت کی بنا پر منافق اور مسلمانوں کے بدخواہ گویا خوش ہو رہے تھے اور مسلمانوں پر یہ طعنے کس رہے تھے کہ ان کے دین نے ان کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ یہ اس بے سروسامانی کے عالم میں اتنی کثیر جمعیت کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں۔ اب غرهم کا لفظ غرور بمعنی فریب سے ہوگا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے [۳] جلالین کی تشریح بھی یہی ہے:

غرّ هٰؤلآء المسلمين دينهم اذ خرجوا مع قلتهم يقاتلون الجمع الكثير توهما انهم ينصرون بسببه.

---

[۱] ۔ من مدد کنندہ ام شمارا (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔ هو قول ابی جعفر و ابی عبدالله عليهما السلام (تبیان)

[۳] ۔ فریفتہ است این مسلمانان را دین ایشان (شاہ ولی اللہ) فریب دیا ہے ان کو دین ان کے نے (شاہ رفیع الدین)

دھوکا دیا ہے ان مسلمانوں کو ان کے دین نے جب کہ وہ اپنی قلت تعداد کے باوجود نکلے ہیں اس بڑی جماعت سے جنگ کے لئے یہ تصور کر کے کہ اس دین کے سبب سے مدد الٰہی ان کے شامل حال ہوگی۔

ہمارے اکابر مفسرین نے بھی اسی کے مطابق تشریح کی ہے [1] مگر شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند شاہ عبدالقادر نے اس غرور کو گھمنڈ کے معنی میں لے کر یہ مطلب کہا ہے کہ:

مسلمانوں کی دلیری دیکھ کر منافق اس طرح طعن کرنے لگے تھے سو اللہ نے فرمایا کہ یہ غرور نہیں توکل ہے"۔(موضح القرآن)

پہلی صورت میں آخری فقرہ منافقوں کی اس طعنہ زنی کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ڈھارس بندھانا ہے کہ ان کی کثرت تعداد جتنی بھی ہو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اللہ کی طاقت سے بڑھ کر نہ کسی کی طاقت ہے نہ اس کی طرح صحیح و درست کوئی کام کرنے والا ہے۔ تم کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٥٠﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٥١﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٥٢﴾

"اور کاش تم دیکھو [2] وہ موقع جب فرشتے کافروں کی قبض روح کر رہے ہوں گے، وہ مارتے ہوں گے ان کے منہ اور پشت پر اور (کہتے ہوں گے) چکھو اس آگ میں جلنے کا مزہ [3]۔ یہ پاداش اس کی ہے جو تمہارے ہاتھ کر چکے ہیں اور یہ کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اسی طرح کہ جیسے ہوا [4] فرعون کے حوالی موالی اور ان کے ساتھ جو ان کے پہلے تھے انہوں نے آیات الٰہی کے ساتھ کفر اختیار کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کے سبب انہیں گرفت میں لے لیا یقیناً اللہ طاقتور ہے سخت سزا دینے والا۔"

بعض تفاسیر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ بدر ہی کے موقع کا تذکرہ ہے جب ملائکہ مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے تھے اور کافروں سے جنگ کر رہے تھے۔ اور یہ منہ اور پشت پر مارنا جنگ کے عالم کا حال ہے کہ وہ انہیں اسلحہ جنگ سے منہ اور پشت پر ضربیں لگا رہے تھے۔ [5]

---

[1] ۔ الغرور اظهار النصح مع ابطان الغش (تبیان)

[2] ۔ کاش کہ دیکھے تو (شاہ رفیع الدین) دوسرے لوگوں نے "لو" کو شرطیہ لیا ہے جیسے "تعجب می کردی اگر می دیدی (شاہ ولی اللہ) جواب "لو": لرایت امرا عظیما. (جلالین)

[3] ۔ ویقولون لهم ذوقوا (جلالین) می گویند بچشید (ولی اللہ)

[4] ۔ مانند عادتِ قوم فرعون (ولی اللہ)

[5] ۔ انه یوم بدر (تبیان)

اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ "جب فرشتے کافروں کی پوری طرح جانیں لے رہے تھے اس طرح کہ مار رہے تھے ان کے منہ اور پشت پر اور (کہتے تھے)...... (یہ تو اس وقت تمہاری سزا ہے اور) چکھنا (اس کے بعد دوزخ کی) آگ کا مزہ" یعنی ابھی یہ تو تلوار کی آنچ ہے جس میں تم بھسم ہو رہے ہو مگر اسی پر خاتمہ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد آتش جہنم کا عذاب بھی ہے جس میں تمہیں مبتلا ہونا ہے مگر آیت کے الفاظ سے مجھے یہ مفہوم زیادہ قریب معلوم نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٥٣ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝٥٤

"یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ نہیں ہے بدلنے والا کسی نعمت کا جو اس نے کسی جماعت کو دی ہے جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کریں اور یہ کہ اللہ سننے والا ہے، جاننے والا، اسی طرح کہ جیسے ہوا فرعون کے حوالی موالی اور ان کے ساتھ جو ان کے بھی پہلے تھے، انہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کو جھٹلایا تو ان کے گناہوں کے سبب سے ہم نے ان کو ہلاک کیا اور فرعون کے حوالی موالی کو ڈبو دیا اور وہ سب ظالم لوگ تھے۔"

خدا کی نعمتوں میں تبدیلی خود اپنے نفوس کی تبدیلی کا نتیجہ

یہ وہی اصول قدرت ہے جو دوسری جگہ قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ.

خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔ (سورۂ رعد۔۱۱)

یہ تبدیلی کیا ہے جو وہ اپنے میں کریں گے؟! یعنی خالق کی نعمتوں کی ناقدری کرنے لگیں، اسے بھول جائیں، تن آسانی اور عیش پرستی میں مبتلا ہو جائیں، معاصی الٰہیہ میں منہمک ہو جائیں، تب اللہ اپنی نعمتوں کو سلب کر لیتا ہے۔

کیا اس کے بعد اقبال کو اپنے "شکوہ" کا جواب کچھ نظم کرنے کی ضرورت تھی؟ پورے شکوہ کا جواب یہ ایک قرآن کی آیت ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٥٥ ۖ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝٥٦ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝٥٧

"یقیناً بدترین چلنے پھرنے والی مخلوق اللہ کے نزدیک یہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا تو اب کسی طرح وہ ایمان

لائیں گے ہی نہیں جن سے آپ معاہدہ کرتے ہیں پھر وہ ہر دفعہ اس عہد و پیمان کو توڑ ڈالتے ہیں اور انہیں اس میں کوئی باک نہیں ہے تو اب اگر جنگ میں وہ آپ کے ہاتھ آ جائیں تو ان کا صفایا کر کے ان کے بعد والوں کی جمعیت کو منتشر کر دیجئے [1] شاید وہ اس سبق کو یاد رکھیں۔"

کفر اگر نادانستہ، بے شعوری کے ساتھ ہو تو وہ درحقیقت ایک کیفیت ہے، انسان کا فعل نہیں ہے قرآن مجید میں زیادہ تر "کافر کی صفت استعمال کرنے کے بجائے اسم موصول کے ساتھ فعل لایا گیا ہے:

"اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا" جس کا ترجمہ یہ ہوا کرتا ہے کہ "جنہوں نے کفر اختیار کیا" یہ اختیار ایک دانستگی کا اظہار کرتا ہے جس میں دھاندلی، سخن پروری، نفسانیت اور عناد کے کیفیات مضمر ہیں اور یہ چیزیں قبول حق سے آئندہ بھی سد راہ ہیں، اسی لئے یہاں ماضی کے کفر کے ساتھ کہ "الذین کفروا" جنہوں نے کفر اختیار کیا آئندہ کی خبر کو کہ "وہ ایمان نہیں لائیں گے" ف صرف تفریع کے ساتھ بطور نتیجہ بیان کیا ہے یعنی قبل میں جب کہ جان بوجھ کر انکار کیا ہے تو آئندہ کے لئے ان سے یہ امید غلط ہے کہ وہ کبھی ایمان لائیں گے۔ [2]

بعد میں جو اوصاف ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ بنی قریظہ کا کردار ہے۔ آخر میں جو ہے کہ "شاید وہ اس سبق کو یاد رکھیں" یعنی ان کے انجام کو دیکھ کر بعد والے عبرت حاصل کریں اور متنبہ ہو جائیں۔ [3]

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

"اور اگر آپ کو کسی جماعت سے بد دیانتی کے آثار محسوس ہوں تو ان کے عہد و پیمان کو ان کی طرف پھینک دیجئے [4] کہ معاملہ برابر ہو جائے، بلاشبہ اللہ بد دیانتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس کے پہلے جو حکم تھا کہ "وہ جنگ میں آپ کے ہاتھ آ جائیں تو صفایا کر دیجئے" ان لوگوں کے لئے تھا جن سے غداری ظہور میں آ چکی ہو لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ابھی غداری عمل میں نہیں آئی لیکن آثار و قرائن اس کے پیدا ہو گئے ہیں کہ یہ بھی غداری کریں گے۔ ان کے لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ عہد و پیماں کے قائم رکھتے ہوئے تو ان پر کوئی دستِ تعدی دراز نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے لئے یہ صورت ہے کہ ان کے عہد و پیمان کو ان کی طرف پھینک دیا جائے یعنی انہیں آگاہ کر دیا جائے کہ اب ہم اس معاہدہ کو منسوخ کرتے ہیں۔ [5]

"معاملہ برابر ہو جائے" یعنی معاہدہ کے قبل جو صورتِ حال تھی کہ کوئی خاص آئینی پابندی ان کے بارے میں عائد نہیں تھی، وہی

---

[1] متفرق ساز بسبب کشتن ایشان آنان را کہ پس پشت ایشاں باشند (شاہ ولی اللہ)

[2] کانہ قال کفروا مصممین علی الکفر فھم لا یؤمنون (تبیان)

[3] لعلھم ای الذین خلفھم (جلالین)

[4] اطرح عھدھم الیھم (جلالین)

[5] لظھور امارات الخیانۃ التی دلت علیٰ نقض العھد (تبیان)

صورتحال اب پیدا ہو جائے۔[1]

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿59﴾

''اور وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، یہ نہ سمجھیں کہ وہ نکل گئے، بلاشبہ وہ عاجز نہیں کر سکیں گے۔''

یہ آیت باعتبار مضمون گزشتہ سلسلہ سے بھی متعلق ہو سکتی ہے اور ''نکل گئے'' کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی ترکیب چل گئی اور وہ داؤں اپنا کر گئے۔[2]

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ جنگ بدر کے شکست خوردہ مشرکین کے بارے میں ہے اور ''نکل گئے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بچ کر نکل گئے اور اب وہ محفوظ ہیں، نہیں تقدیر الٰہی سے بچ کر وہ کہیں تھوڑی جا سکتے ہیں۔[3]

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿60﴾

''اور مہیا رکھو ان کے لئے جو تم فراہم کر سکو طاقت کی قسم سے اور گھوڑوں کو مورچوں پر تیار رکھنے کی صورت سے جن کے ذریعے سے تم خوف زدہ بناؤ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن اور دوسروں کو جو ان کے علاوہ ہیں، جنہیں تم نہیں جانتے ہو اللہ انہیں جانتا ہے اور جو چیز بھی تم اللہ کی راہ میں صرف کرو گے، پوری پوری تمہیں ادا کر دی جائے گی اور تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کی جائے گی۔''

جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم

''اللہ کے اور مسلمانوں کے دشمن''...... یہ کھلے ہوئے دشمن کفار و مشرکین اور ''دوسرے جو تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے'' اس سے مراد منافقین ہیں جو اپنے دلوں میں طرح طرح کی سازشوں کے خیالات کو پرورش دے رہے ہیں، تمہاری اس تیاری سے وہ بھی خوف زدہ ہو جائیں گے۔

تمام مفسرین کو اس جملہ کے یہی معنی سمجھنے اور لکھنے پڑے ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں ''یعنی اہل نفاق (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''وہ لوگ جن کو تم نہیں جانتے، وہ منافق ہیں کہ ظاہر مسلمانی کے پردہ میں ہیں (موضح القرآن)

---

[1] ۔برابر کے برابر یعنی جو سرانجام صلح سے پہلے کر سکتے ہو، سو اب بھی کر سکتے ہو لڑائی کا، اس میں کچھ بدقولی نہیں (موضح القرآن)

[2] ۔ایشان پیش دستی کردہ اند (شاہ ولی اللہ) کہ آگے نکل گئے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔نزل فی من افلت یوم بدر ...سبقوا اللہ ای فاتوہ...انہم لا یعجزون لا یفوتونہ (جلالین)

اس سے کہ ''تم نہیں جانتے'' صاف ظاہر ہے کہ ایک طبقہ منافقوں کا ایسا تھا جن کا عموماً مسلمانوں کو علم اور احساس نہیں تھا۔ اس لئے منافقین کے لفظ کو جہاں جہاں قرآن میں آئے، بس عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں پر ڈھال کر اطمینان کی سانس لینا درست نہیں ہے۔ یہ تو وہ منافقین تھے جن کا نفاق بالکل کھل گیا تھا اور سب جانتے تھے کہ یہ منافقین ہیں اور اسی لئے ان سے تو بعد میں احکام اسلام بھی سلب کر لئے گئے چنانچہ رسول ﷺ کو ان پر نماز جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا، استغفار کرنے سے منع کیا گیا تو یہ منافقین وہ کب ہو سکتے ہیں جن کے لئے خالق ارشاد فرما رہا ہے کہ ''تم لوگ انہیں نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں'' اور یہ فقرہ قرآن کا، جلالین کی اس کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے جو انہوں نے اس لفظ کو مشکوک بنانے کے لئے کیا ہے اور کہا ہے:

وهم المنافقون او اليهود اس سے مراد منافقین ہیں یا یہودی

یہ تردید و تردد بالکل بے محل ہے، اس لئے کہ یہود کے لئے کون نہیں جانتا تھا کہ وہ دشمن اسلام ہیں، جو خالق فرماتا کہ ''انہیں بس ہم ہی جانتے ہیں''۔

اس فقرہ کو دیکھتے ہوئے یہی ماننا ناگزیر ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں اور منافق بھی وہ نہیں جو عام طور پر منافق سمجھ ہی لئے گئے تھے بلکہ کچھ بڑے گہرے قسم کے منافق جو آخر تک اسلامی جماعت میں گھلے ملے رہے اور اسلام کے پردہ میں اپنے کو مخفی کئے رہے۔

بعد میں مسلمانوں میں قیامت تک کے واسطے جو انتشار و افتراق کا سامان مہیا کیا، وہ سب انہی منافقین کے گروہ نے جن کے خطرات سے خالق نے بہت سے مقامات پر قرآن میں مسلمانوں کو آگاہ کیا تھا۔

رہ گئے عبداللہ بن ابی وغیرہ، وہ تو وقتی سازشیں کرتے رہتے تھے جو اسی وقت پر منکشف ہو جاتی رہیں اور اس لئے وہ جماعت رسوا اور ذلیل ہو کر ختم ہو گئی۔ اس سے اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو کیا صدمہ ایسا پہنچا جس کا اثر کوئی دیر پا ہوتا اور جس پر متنبہ کرنے کی قرآن اتنی قوت و شدت کے ساتھ برابر ضرورت محسوس کرتا۔

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝٦١

''اور اگر وہ صلح کی جانب مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جایئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے، یقیناً وہ سننے والا، بڑا جاننے والا۔''

مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم

اسلام میں جنگ اضطراری صورت سے ہوتی ہے یعنی جب امن وصلح کے امکانات ختم ہو گئے ہوں اس وقت جنگ شروع ہونا چاہیے اور جب امن وصلح کے امکانات پھر پیدا ہو جائیں تو اس وقت جنگ کو ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ اس آیت سے بالکل صاف ظاہر ہے۔

''اللہ پر بھروسہ کیجئے''...... یعنی اس پر غور بھی نہ کیجئے کہ وہ صلح کی جانب جو مائل ہوئے ہیں، اس سے کہیں مہلت پا کر انہیں مزید مضبوطی حاصل کرنا مقصود نہ ہو یا یہ کہ مسلمانوں پر بے خبری کی حالت میں حملہ کرنا مقصود نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ ان دور دراز کے اندیشوں کو صلح کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور صلح کر لینا چاہیے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ”آپ بھی صلح کی طرف مائل ہوجائیے“ والے ٹکڑے کے مضمون پر جو ان کے لفظوں میں ہے، حاشیہ دیا ہے کہ:

”این امر برائے اباحت است“ (فتح الرحمٰن)

مطلب یہ ہے کہ ”مائل ہوجائیے“ سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے بلکہ اجازت ہے کہ آپ بھی مائل ہوسکتے ہیں مگر اس کے ساتھ جو ”اللہ پر بھروسہ“ کرنے کا حکم ہے، وہ کیا بس جواز کا پتہ دیتا ہے؟!

پھر آخر میں جو کہا ہے کہ ”وہ سننے والا ہے، جاننے والا“......یعنی جو پیشکش صلح کی ان کی طرف سے ہوئی، اس بات کو اللہ سن رہا ہے اور اس پیشکش کا جواب ویسا ہی دینا چاہیے جیسا خدا کو مطلوب ہے اور ”جاننے والا ہے“ یعنی ان کی نیت اس صلح کی پیشکش سے کیا ہے؟ اسے اللہ جانتا ہے لہٰذا وہ اس کا تدارک کرے گا یا ان کو اس کی سزا دے گا[1] بہر حال تم کو ان کی نیت سے کوئی بحث نہ ہونا چاہیے۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ حکم قرآنی میں حالات کی نوعیت کا دخل ہو۔ بعض حالات میں مخالف کی پیشکش قبول کرنا لازم ہو اور بعض حالات میں جائز ہو جس پر نظر کرنا اس سربراہ کی ذمہ داری ہے جس کی قیادت میں جہاد ہو رہا ہے۔[2]

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِىۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۳﴾

”اور اگر وہ چاہیں گے کہ آپ کو دھوکا دیں تو بلا شبہ آپ کے واسطے اللہ کافی ہے، وہ وہ ہے جس نے آپ کو تقویت پہنچائی اپنی امداد سے اور ایمان والوں کی جماعت سے اور ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی۔ اگر آپ تمام روئے زمین کی دولت صرف کردیتے تو بھی ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا نہیں کرسکتے تھے مگر اللہ نے ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی، یقیناً وہ زبردست ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔“

بندگان الٰہی کے مددگار ہونے کا ثبوت

اصل مدد کرنے والا تو خداوند عالم ہے مگر ظاہری ذریعہ امداد کا ایمان والوں کی جماعت ہے تو اس کا بھی خالق نے اپنی امداد کے ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے۔[3]

اس مثال کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ کسی ولی الٰہی کسی مقرب بارگاہ خداوندی اور خصوصیت کے ساتھ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام یا دیگر آل طاہرینؑ کو وقت مصیبت طلب امداد کے لئے پکارنے پر جو ایک جماعت ”شرک“ ”شرک“ کی آواز بلند کرتی ہے، وہ کتنا غلط ہے۔

---

[1] یعنی اگر دل میں دغا کریں گے، اللہ کو معلوم ہے۔ اس کی سزا دے گا۔ (موضح القرآن)

[2] لیس فی الاٰیة ما یدل علی ان الکفار اذا مالوا الی الهدنة وجب اجابتهم ایها علی کل حال لان الاحوال تختلف فی ذٰلك (تبیان)

[3] بیاری دادن خود و مسلمانان (شاہ ولی اللہ) ساتھ مدد اپنے کے اور ساتھ مسلمانوں کے (شاہ رفیع الدین)

خالق نے مومنین سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرائی تو وہ اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ''سہارے'' کے طور پر ''**بالمومنین**'' کہہ کے ذکر فرما رہا ہے، اب وہی اگر ان بزرگواروں سے ہماری مدد کرا دے تو اس میں شرک کا کیا سوال ہے؟!

پکارنے والے کے ذہن میں یہ ہونا چاہیے کہ اصل مدد کرنے والا خداوند عالم ہے اور یہ حضرات اس کی طرف سے مقرر شدہ ذرائع ہیں اور بس۔ اس میں شرک کا کوئی تصور قائم کرنا بالکل غلط ہے۔

یہ الفت باہمی جسے خالق نے قدرت الٰہی کا کرشمہ کہا ہے، انصار کی جماعت سے تعلق رکھتی ہے جن میں پہلے اوس وخزرج کے دو جتھے ہمیشہ برسر پیکار رہے تھے [1] مگر اسلام نے انہیں گلے ملا دیا اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد تاریخ میں اوس وخزرج کی قبیلہ داری جنگ پھر کبھی وقوع میں نہیں آئی مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ اس کے بعد خود مہاجرین میں ''حب دنیا'' پھوٹ ڈلوا دے اور پھر ''مؤلفة القلوب'' کی جماعت کا ایک تیسرا عنصر بھی ایسا داخل ہو جائے جس سے بعد میں مسلمانوں کے درمیان وہ خوں ریز لڑائیاں برپا ہو جائیں جن کی لپیٹ میں مہاجرین وانصار سب ہی آ جائیں اور جن کی ہنگامہ خیزی کی شدت کے سامنے اوس وخزرج کی پرانی لڑائیاں بھی گرد کارواں بن کر پیچھے رہ جائیں اور جن کے نتائج آج تک مختلف خطہ ہائے ارض میں مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہے ہوں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾

''اے پیغمبر! آپ کے لئے اللہ کافی ہے اور مومنین میں سے وہ جس نے آپ کی پیروی کی ہے''۔

وہابیت شکن قرآنی صراحت

اے لیجئے! یہاں تو ''کافی'' ہونے کی منزل میں اللہ نے الفاظ قرآن میں اپنے ساتھ ان مومنین کو بھی شریک کر لیا چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی ترجمہ میں یہی لکھتے ہیں:

''کفایت کنندہ است ترا خدا وکفایت کنند ترا آنانکہ پیروی تو کردہ انداز مسلمانان''

شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں:

''کفایت ہے تجھ کو اللہ اور جن نے پیروی کی تیری مسلمانوں میں سے''۔

مفسرین نے بھی یہی تشریح کی ہے:۔

حسب اللہ وحسبك من اتبعك من المؤمنين (جلالين)

کافی ہے آپ کے لئے اللہ اور کافی ہے آپ کے لئے وہ جس نے مومنین میں سے آپ کی پیروی کی۔

اب ہر مسلمان جانتا ہے کہ بالذات اللہ کافی ہے مگر اسی کی دی ہوئی طاقت سے جو کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کر رہا ہے جب اللہ اپنے ساتھ اس پر بھی ''کافی'' کے ہم معنی لفظ کا اطلاق کر رہا ہے تو اب اگر کوئی اسی کو ''مددگار'' ''کارساز'' ''مشکل کشا'' وغیرہ کے الفاظ سے یاد

[1] ۔المراد بالمؤمنين الانصار و بتأليف قلوبهم ما كان بين الاوس والخزرج من المعاداة القتال هٰذا قول ابي جعفر عليه السلام (تبيان)

کرے تو اس پر "شرک، شرک" کی آوازیں کیوں بلند ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس سے ظاہر ہے کہ جماعت "اہل ایمان" میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو پیغمبر کے پیروی کی حیثیت نہیں رکھتے اب وہ پیروی کرنے والے چاہے دو چار ہی ہوں بلکہ کسی منزل پر ایک ہی رہ جائے تو اسی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لئے کافی سمجھیں گے جیسا کہ احد میں ہوا کہ مددگاروں کی جماعت متفرق ہوگئی تھی اور آخر میں ایک علی بن ابی طالبؑ کی ذات تھی جس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کا حق ادا کر کے آخر میں جنگ کو فتح کر کے دکھلا دیا جس پر ملک کو بھی کلمہ پڑھنا پڑا کہ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار.

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

"اے پیغمبر! ایمان لانے والوں کو جنگ پر آمادہ کیجئے۔ اگر تم میں کے بیس صبر کرنے والے ہوں تو دو سو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں کے سو (۱۰۰) ہوں تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے اس لئے کہ وہ ایک ایسی جماعت ہے جو سمجھ نہیں رکھتی۔"

ایک اور دس کے مقابلہ کا حکم

کیا معنی "سمجھ نہیں رکھتی"؟ یعنی بصیرت ایمانی سے محروم ہے۔ [۱]

شاہ عبد القادر کے لفظوں میں "یعنی یقین نہیں رکھتے اللہ پر اور ثواب پر اور جس کو یقین ہو، وہ موت پر دلیر ہے" (موضح القرآن)

کہا گیا ہے کہ "يَغْلِبُوْا" کے معنی خبر کے نہیں کہ "غالب آئیں گے" بلکہ مطالبہ کے ہیں کہ غالب آنا چاہیے۔ [۲]

چنانچہ وقوع اس کا نہیں ہوا جو بعد کی آیت سے ظاہر ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ جب خالق کی طرف کی خبر مشروط تھی ان میں صبر اور بصیرت ایمانی کے ساتھ تو اس نتیجہ کے عدم وقوع کو اس کی دلیل کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان میں صبر کی کمی ثابت ہوئی اور آخرت پر یقین کی بھی جو اس معیاری مقابلہ کی شرط تھی۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

---

[۱] ۔انهم علی جهالة خلاف من قاتل علی بصيرة وهو يرجو به ثواب الاٰخرة (تبيان)

[۲] ۔وان كان بلفظ الخبر فالمراد به الامر (تبيان)

''اب اللہ نے تم پر سے بار ہلکا کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ اچھا تو اب تم میں کے سو صبر والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں کے ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب آئیں۔ اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

مسلمانوں میں کمزوری کا ثبوت

ترتیب قرآن میں دونوں آیتیں پاس پاس ہیں لیکن دونوں کے مضمون سے ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا فاصلہ ہے۔ وہ آیت معرکۂ امتحان میں جانے سے پہلے کی ہے اور یہ معرکۂ امتحان کے نتیجہ کے وقوع میں آنے کے بعد کی ہے جن کے درمیان نہ جانے کتنی آیات اور کتنے سورے دوسرے مضمونوں سے متعلق نازل ہوئے تھے لیکن وہ سب اور مقامات پر ہیں اور یہ دونوں آیتیں ایک ساتھ درج ہو گئی ہیں۔

آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا زعم اپنے ثبات قدم اور بصیرت ویقین کے استحکام پر بہت کچھ تھا جس کے لئے پہلا معیار پیش کیا گیا اور اس کے بعد یہ اس پر پورے نہیں اترے۔

اللہ کو علم اس کا ازل سے تھا لیکن وہ امتیاز وقوع میں اب آیا۔ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ اسے علم ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی کہہ رہے ہیں کہ:

''دانست کہ درمیان شما ضعفی ہست۔''

ضعف کیا؟ مادی طاقت سے ضعف تو پہلے ہی تھا، اس لئے کہ کفار دس گنے زیادہ تھے۔ ماننا پڑے گا کہ ایمان کا ضعف، یقین کا ضعف اور صبر میں ضعف ہے۔ اور یاد رکھئے کہ ''تم میں ضعف ہے''

یہ نہیں کہ ''تمہاری آئندہ نسلوں میں ضعف ہوگا لہٰذا تخفیف کی جاتی ہے'' مگر شاہ عبدالقادر نے اس میں کچھ خطرناک پہلو محسوس کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ:

''اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے ان پر حکم ہوا تھا کہ آپ سے دس برابر کافروں پر جہاد کریں۔ پچھلے مسلمان ایک قدم آگے تھے تب یہی حکم ہوا کہ دونوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے'' (موضح القرآن)

اب جلالین کو ملاحظہ فرمایئے، قرآن تو تخفیف کا سبب بتا رہا ہے کہ تم میں کمزوری ظاہر ہوئی اور وہ فرماتے ہیں کہ:

ثم نسخ لما کثروا بقوله: اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ.

جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ پہلا حکم اس آیت کے ذریعہ سے منسوخ کر دیا گیا کہ اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے۔

یعنی جب تعداد کم تھی تو وہ سخت حکم تھا اور جب تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ دوسری آیت اتری، سبحان اللہ یہ اضطراب کیا ضمیر کے کسی چور کا پتہ نہیں دیتا؟!

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰى حَتّٰى يُثۡخِنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ تُرِيۡدُوۡنَ عَرَضَ الدُّنۡيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ‌ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۷﴾

''کسی نبی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ میں کچھ قیدی ہوں، جب تک کہ خوب زمین میں ان کے خون نہ بہائے[1] تم لوگ مال دنیا کے طلبگار رہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا۔''

قیدیوں کے بارے میں الٰہی منشا کا اعلان

کہا جاتا ہے کہ جنگ بدر میں کچھ صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ کفار کے قیدیوں سے فدیہ یعنی مالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے اور خالق کا منشا یہ تھا کہ انہیں قتل کیا جائے۔ اس پر یہ آیت آئی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حکم وقتی تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا اور یہ حکم ہوا کہ فدیہ لے کر چھوڑا جا سکتا ہے۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ ترتیب کے شان نزول کے مطابق نہ ہونے سے ہم سمجھ نہیں سکتے کہ یہ حکم کن حالات میں ہوا تھا حالانکہ خالق کی جانب سے بعد میں بڑے نرم لب ولہجہ میں عفو وکرم اور فدیہ کی اجازت دی گئی ہے جس کا اس آیت کے لب ولہجہ سے کوئی تناسب محسوس نہیں ہوتا تو معلوم ہوتا ہے کہ خالق کا یہ قہر آمیز عتاب اس پر ہوا کہ کچھ مسلمانوں نے صرف مال دنیا کی حرص میں بغیر حکم الٰہی از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ ان سے مالی معاوضہ لے لیا جائے بلکہ بعد کی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وصول بھی کر لیا جس پر ارشاد ہوا کہ یہ ایسی بات تھی کہ اس پر عذاب الٰہی کا نازل ہو جانا بعید نہ تھا۔

لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوۡا مِمَّا غَنِمۡتُمۡ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۶۹﴾

''اگر خالق کی طرف سے پہلے سے نوشتہ موجود نہ ہوتا تو تم نے جو کیا، اس میں تم پر بڑا عذاب آ جاتا لہٰذا کھاؤ اس سے جو صاف ستھرا مال غنیمت میں تمہیں ملے اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان''۔

''اگر پہلے سے نوشتہ موجود نہ ہوتا۔'' اس سے کون نوشتہ مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''یعنی بعفو غیر منصوص''۔

''خالق کا یہ حکم کہ جس بات میں ممانعت وارد نہ ہوئی ہو، وہ معاف ہے۔''

اس صورت میں نوشتہ سے مراد حکم تشریعی ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''وہ بات یہ لکھ چکا کہ ان قیدی لوگوں میں بہتوں کی قسمت تھی مسلمان ہونا'' (موضح القرآن)

اس صورت میں یہ نوشتۂ تقدیر ہے۔

جلالین رقم طراز ہیں:

لولا کتاب من اللہ سبق باحلال الغنائم والاسریٰ لکم

---

[1] یبالغ فی قتل الکفار (جلالین)

[2] ھٰذا منسوخ بقولہ: فَاِمَّا منا بعد واما فداء (جلالین)

اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے یہ نہ ہو گیا ہوتا کہ مالہائے غنیمت اور قیدی تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔

اس صورت میں بھی نوشتہ سے مراد حکم تشریعی ہے لیکن اگر نوشتہ یہ تھا کہ یہ حلال ہیں تو پھر عتاب کا ہے پر ہے؟ عتاب اس پر ہے کہ تم نے بغیر اجازت کے آئے ہوئے از خود یہ اقدام کیوں کر لیا؟[1] وہ تو اتفاق سے تمہارا عمل نوشتۂ الٰہی کے مطابق ہو گیا، اس لئے تم عذاب سے بچ گئے ......ورنہ یہ کام تم نے ایسا کیا تھا کہ عذاب آ جاتا۔

بہت سے قدیم مفسرین نے اس نوشتۂ الٰہی کو عذاب نہ آنے سے متعلق قرار دیا ہے اور اس کی بنا پر ہمارا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس نوشتہ سے خود قرآن کا یہ اعلان مراد ہے کہ:

ما کان اللہ لیعذبہم و انت فیہم

آپ کی موجودگی میں ان پر عذاب نہیں آ سکتا

تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تمہارا کردار تو یہ ایسا تھا جیسے کردار سے امم سابقہ پر عذاب آ جایا کرتا تھا مگر کیا کیا جائے کہ تم رحمۃ للعالمین کے زیر سایہ ہو اور ان کا وجود تم پر عذاب سے سد راہ ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۰ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

"اے پیغمبر! کہہ دیجئے ان قیدیوں سے جو آپ لوگوں کے قبضہ میں ہیں کہ اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ بھلائی تو وہ عطا کرے گا تمہیں بہتر اس سے کہ جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخشے گا اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان اور اگر انہوں نے آپ سے غداری کرنا چاہی تو وہ اس کے پہلے اللہ سے غداری کر چکے ہیں تو اس نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔"

"بھلائی" سے مراد یہاں خیر خواہی، خلوص اور چال چلن کا آئندہ ٹھیک رہنا ہے[2] اور "عطا کرے گا بہتر" یعنی تمہارے حسن خدمات سے خوش ہو کر جتنا تم سے فدیہ ان مسلمانوں نے لے لیا ہے، اس سے زیادہ تمہیں یہاں سے مل جائے گا اور پھر ایمان و عمل صالح کی صورت میں آخرت کی بخشش، اس کے ماوراء ہوگی، جس کے مقابلہ میں یہ اتنا سا روپیہ جو تم سے لے لیا گیا ہے، کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ قرآن کا حکیمانہ انداز بیان دیکھنے کا ہے کہ اُدھر مسلمانوں کو تو رسول ﷺ سے تخاطب کر کے اتنا سخت عتاب کیا گیا اور ادھر ان قیدیوں کی جن سے فدیہ لیا گیا تھا، اس طرح دلجوئی کی جا رہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

[1] عاتبہم علیٰ ذلك لانہم بادروا الیہ قبل ان یؤمروا بہ (تبیان)

[2] ہو ھھنا البصیرۃ فی دین اللہ وحسن النیۃ فی امر اللہ (تبیان)

وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

''بلا شبہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت نہیں کی، تمہیں ان کی حمایت کا کچھ موقع نہیں، جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اور اگر تم سے کسی دینی مہم میں مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ مدد کرو، سوا اس صورت کے کہ جب کسی ایسی جماعت کے خلاف ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان ہے اور اللہ اس کا جو تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے۔''

پہلے مہاجرین کا ذکر ہے کہ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا اور پھر انصار کا ذکر ہے: ''الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا'' ''جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی'' اور ان سب کو کہا گیا ہے[۱] کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار رہیں یعنی ہونا چاہیے اور ان میں ملکی اور غیر ملکی کا کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

''یعنی مہاجرین و انصار با یکدیگر باید کہ نصرت دہند و مواخات کنند'' (فتح الرحمن)

یہ وہ قومیت ہے جس کی وحدت تصور اور اتحاد عقیدہ پر بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اس وحدت قومی کا تقاضا شاہ عبدالقادر کے لفظوں میں یہ ہے کہ: ''جتنے مسلمان حضرت کے ساتھ حاضر ہیں، ان سب کی صلح اور جنگ ایک ہے۔ ایک کا موافق سب کا موافق، ایک کا مخالف سب کا مخالف'' (موضح القرآن)

مگر یہ یکجہتی انہی مسلمانوں کے ساتھ ہو سکتی ہے جو آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں لیکن اگر کچھ مسلمان ابھی مشرکین کے زیر اقتدار ہیں تو ان کے معاملات وہاں کے حالات سے وابستہ ہیں۔ ان کے ساتھ یہاں کے مسلمان یکجہتی اختیار نہیں کر سکتے اور ان کے سیاسی قسم کے معاملات سے آزاد ملک کے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں اگر کسی دینی مہم میں وہ خود امداد طلب کریں تو یہ لوگ دینی رشتہ سے امداد کریں، ورنہ خواہ مخواہ ان کے معاملات میں اپنا پاؤں اڑانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ بسا اوقات مفید ہونے کے بجائے مضر ہوگا۔

بعض مفسرین نے اولیاء بعض کے مفہوم میں یہ قرار دیا ہے کہ ایک دوسرے کا وارث بھی قرار دیا گیا تھا[۲] اور اس لئے کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی اور اسی سورہ کی آخری آیت سے جس میں میراث کی بنیاد قرابت رکھ دی گئی ہے۔[۳]

---

[۱] ۔ اولئك يعني المهاجرين والانصار (تبيان)

[۲] ۔ اولياء بعض في النصرة والارث (جلالين)

[۳] ۔ هٰذا منسوخ بالاٰخر السورة (جلالين)

مگر ہمیں یہاں کی آیتیں آخر سورہ تک ایک ڈال ہونے کی بنا پر ایک ساتھ نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں لہٰذا ان میں ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ ماننے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ اس لئے قبل کی ولایت میں میراث کو داخل کرنا ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا شاہد درمیان کی آیت ہے جو ابھی آئے گی کہ:

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ فِى الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ كَبِيۡرٌ ؕ‏﴿۷۳﴾

جو کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو دنیا میں بڑا فتنہ برپا ہوگا اور بڑی خرابی ہوگی۔ (سورۂ انفال)

ظاہر ہے کہ کافروں میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ ایک دوسرے کا وارث ہو تو اہل ایمان کو جس ولایت کی دعوت دی جا رہی ہے اسے میراث سے متعلق کیوں سمجھا جائے۔

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ فِى الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ كَبِيۡرٌ ؕ‏﴿۷۳﴾

''اور جو کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو دنیا میں بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور بڑی خرابی ہو گی۔''

اس میں مسلمانوں کی غیرت ایمانی پر ایک طرح کا تازیانہ بھی ہے اور ان کی بصیرت ایمانی کے لئے ایک طرح کا سرمہ بھی۔

تازیانہ تو اس طرح جیسے حضرت علی بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں یوں غیرت دلائی ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ اہل شام اپنے امام کی باطل کی راہ میں اطاعت کرتے ہیں اور تم اپنے امام کی حق کی راہ میں نافرمانی کرتے ہو، ویسے ہی یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ کافر تو ''کافری'' میں ایک دوسرے کے مددگار اور حمایتی ہیں۔ اب کتنے غضب کی بات ہے کہ تم مومن ہو کے آپس میں یکجہتی نہ رکھو۔

اور بصیرت کے لئے سرمہ یہ ہے کہ تمہارے آپس میں یکجہتی نہ رکھنے سے [1] بڑا فتنہ اور بڑی خرابی ہے یہ فتنہ اور خرابی کیا ہے؟ سب سے زیادہ یہ کہ کفر کو قوت ہوگی اور حق میں ضعف پیدا ہوگا۔ [2]

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا‌ ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ‏ ﴿۷۴﴾

''اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ کہ جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی، یہ لوگ حقیقتاً ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے لئے بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔''

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا مَعَكُمۡ فَاُولٰٓـئِكَ مِنۡكُمۡ‌ ؕ وَاُولُوا

---

[1] لا تفعلوا ما امر تم به من التناصر والتعاون والبرائة من الكفار (تبيان)

[2] بقوة الكفر وضعف الاسلام (جلالين)

الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

''اور جو بعد میں ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کریں تو یہ بھی تمہارا ہی جز ہیں اور جو صاحبانِ قرابت ہوں، وہ اللہ کے قانون میں ایک دوسرے سے زیادہ اتصال رکھتے ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

اگر چہ ترتیب قرآن عموماً مطابق تنزیل نہیں ہے، پھر بھی بعض آیات کا مضمون اتنا باہم دگر چسپاں اور دست و گریبان ہوتا ہے کہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سب ایک ہی وقت کی نازل شدہ ہیں چنانچہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے یہ سلسلہ آیات ایسا ہی مربوط و مسلسل ہے اور وہ ایک ہی موقع کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ قبل کی آیات میں اس تصور کا امکان تھا کہ میراث بھی صرف اخوت دینی کی بنیاد پر تقسیم ہوگی جس کی بنا پر بعض ذہنوں نے پہلی آیت کے معنی یہی قرار دیئے اور پھر اسے منسوخ مانا جس کی ہم نے رد کی، اب اس آخری آیت میں اس تصور کو دور کیا گیا ہے کہ یہ تو اخوت ایمانی تھی جس کا تذکرہ پہلے ہوا ہے، جسے اتحاد و عمل اور تعاون کی بنیاد ہونا چاہیے مگر صاحبان قرابت جو ہیں وہ آپس میں زیادہ اتصال رکھتے ہیں۔[1] لہٰذا وراثت کا تعلق قرابت ہی سے ہوگا جس میں وحدت دینی بس شرط کے طور پر معتبر ہوگی۔

اس آیت کے آخری ہی جز کی بنا پر جس کی ہم مضمون آیت دوسری جگہ بھی قرآن میں موجود ہے، ان عزیزوں کے علاوہ جن کے حصے قرآن میں بیان کئے گئے ہیں اور جنہیں ''ذوی الفروض'' کہتے ہیں، دوسرے اقرباء کی وراثت کا حکم فقہ اسلامی میں قائم ہوا ہے جنہیں میراث میں اسی نام یعنی ''صاحبانِ قرابت'' کے عنوان کے ماتحت ترکہ دلوایا جاتا ہے اور پھر ان میں طبقات ارث کی تفریق اسی وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ کے اصول پر ہے کیونکہ قرابت اضافی چیز ہے۔ ہر قریب اپنے سے قریب تر کی موجودگی میں دور قرار پا جاتا ہے، اس لئے اسے میراث کا استحقاق نہیں ہوتا لہٰذا ماں باپ اور اولاد کی موجودگی میں جن تک خطوط قرابت بلا واسطہ پہنچتے ہیں، اخوہ واجداد (بھائی بہنوں اور دادا، دادی، نانا، نانی) کا حق نہیں ہے جن تک خط قرابت ایک واسطہ کے ساتھ پہنچتا ہے اور اس لئے یہ دوسرے طبقہ میں ہیں اور ان کی موجودگی میں ''اَعْمَامِكُمْ و اَخْوَالِكُمْ'' (چچا، پھوپھی، اور ماموں، خالہ) کا حق نہیں ہے جن تک خط قرابت دو واسطوں سے منتہی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ محجوب الارث ہونے کا اصول اسی بنیاد پر ہے یعنی بیٹے کی موجودگی میں پوتا میراث نہیں پا سکتا اور بھائی کی موجودگی میں بھتیجے کو میراث نہیں ملے گی۔

غرض بہت سے احکام شرعیہ ہیں جو اس ایک قرآنی فقرہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[1] ۔بعض ایشان نزدیك تر است ببعضی (شاہ ولی اللہ) نزدیک تر ہیں ساتھ بعض کے (شاہ رفیع الدین)

سُوۡرَةُ الۡبَرَآءَةِ

مدنیّہ......۱۲۹......آیات

اس سورہ کا نام حدیثوں میں تو "سورة البراءة" ہی ہے جو سورہ کے پہلے لفظ "بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ" کے مطابق ہے مگر سورہ کی پیشانی پر عموماً "سورة التوبة" لکھا جاتا ہے یہ توبہ کا ذکر اس سلسلہ کی تیسری آیت میں بالکل ضمنی طور پر ہے:

فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اور اس کے فوراً ہی بعد اس کی مقابل شق بڑے سخت انداز میں ہے۔

وَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ

اور اگر روگردانی کرو تو جان لو کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ بنیادی رخ ان آیات میں تہدید اور سرزنش ہی کا ہے ایسی صورت میں اس ''توبہ'' کے ذکر کو اتنا اہم بنانا کہ سورہ کا نام یہی ہو، سمجھ میں نہیں آتا۔ تصور ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ براءۃ کے لفظ کے ساتھ اعلان تبرّا سے جو ایک ناگواری مسلمانوں کے اکثریتی طبقہ کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے، اس کے دور کرنے کے لئے ''سورة البراءة'' کے نام کے بجائے جو غضب الٰہی کا ترجمان ہے اس کا نام سورة التوبہ کر دیا جس میں مہربانی کی جھلک نمایاں ہے۔ تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر اسلام ہی میں ایک طبقہ کی طرف سے یہ تبدیلی عمل میں آ گئی تھی جس پر اسی وقت اہل حقیقت نے اعتراض کیا اور اسے اس سورہ کی بنیادی روح کے خلاف قرار دیا۔[1]

حالانکہ مسلماً جیسا کہ ابھی آئے گا یہ سورہ سورۂ عذاب ہی سمجھا گیا اور اسی لئے اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے۔

سورۂ براءت کے خاص خاص مضامین

۱-----مشرکین کیلئے جو رعایتیں اب تک تھیں انہیں منسوخ کرنا اور ان سے قطعی طور پر تبرّا یعنی ترک موالات کا اعلان۔

۲-----مشرک جو پناہ طلب کرے اسے پناہ دینے اور اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہونے کا حکم۔

۳-----مساجد الٰہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت۔

۴-----جنگ حنین کا تذکرہ اور باوجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار پیدا ہونے کی کیفیت۔

۵-----نجاستِ مشرکین۔

---

[1] روی عن حذیفة انه قال کیف یسمونها سورة التوبة وهی سورة العذاب وروی عن سعید بن جبیر قال قلت لابن عباس سورة التوبة قال: تلك الفاضحة (تبیان)

۶-----آخر میں دین اسلام کے تمام ادیان ومذاہب پر غالب ہونے کا اعلان۔

۷-----اکتناز کی ممانعت۔

۸-----بارہ مہینے اور ان میں چار خاص طور پر محترم۔

۹-----محترم مہینوں میں جدال وقتال کی ممانعت۔

۱۰-----نسیٔ یعنی لوند کا مہینہ لگا کر مہینوں کو بدلنے کی سخت ممانعت۔

۱۱-----شبِ ہجرت کا تذکرہ۔

۱۲-----جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے مظاہروں کا تذکرہ۔

۱۳-----منافقین کے کردار کے نمونے۔

۱۴-----مستحقین زکوٰۃ کا بیان۔

۱۵-----کفار کے علاوہ منافقین سے بھی جہاد کا حکم۔

۱۶-----کھلے ہوئے منافقین کی نماز جنازہ سے ممانعت۔

۱۷-----اللہ کے ساتھ رسول ﷺ اور کچھ خاص افراد کے نگراں ہونے کا اعلان۔

۱۸-----ایسے منافقین کے وجود پر انتباہ جن کا نفاق طشت از بام نہیں ہوا ہے۔

۱۹-----مسجد ضرار کا ذکر اور اس کے انہدام کا حکم۔

۲۰-----مومنین کے جان ومال کی خریداری۔

۲۱-----مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت۔

۲۲-----"تفقہ فی الدین" کے لئے سفر کا واجب کفائی ہونا۔

۲۳-----اجتہاد وتقلید وغیرہ وغیرہ۔

اس سورہ کے آغاز کی خصوصیت

اس سورہ کے شروع میں تمام عالم اسلام کے قرآن اس پر متفق ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہوتی۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ جن سوروں میں بسم اللہ اوپر لکھی گئی ہے ان کے ساتھ بسم اللہ من جانب اللہ نازل ہوئی تھی اور اس سورہ میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی۔

اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بسم اللہ آیۂ رحمت ہے اور یہ سورہ سورۂ عذاب ہے اس لئے بسم اللہ اس کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کا عجیب سبب لکھا ہے کہ:

"یہ سورۂ برأت حضرت ﷺ نے بیان نہیں فرمایا کہ جدا سورہ ہے یا اور سورۃ کی آیتیں ہیں۔ سورہ کا نشان تھا بسم اللہ نازل ہوئے۔ اس واسطے اس پر بسم اللہ نہیں" (موضح القرآن)

حالانکہ اگر اس کا مستقل سورہ ہی ہونا محقق نہ ہوتا تو اس کا سورۂ برات یا سورۂ توبہ مستقل نام کیوں ہوتا اور اس کے آیات ورکوعات کو علیحدہ شمار کر کے لکھا کیوں گیا ہوتا۔ نیز قرآنی سورتوں کی تعداد میں اس پر اختلاف کیوں نہ ہوا ہوتا۔

دوسرے مفسرین اہل سنت ہماری اس توجیہ کے ساتھ متفق ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر جلالین۔

ولم تكتب فيها البسملة لانه ﷺ لم يامر بذلك كما يؤخذ من حديث رواه الحاكم واخرج في معناه عن علي رضي الله عنه ان البسملة امان وهى نزلت لرفع الامن بالسيف وعن حذيفة انكم تسمونها سورة التوبة وهى سورة العذاب (جلالين)

اور اس میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کا حکم نہیں دیا جیسا کہ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے جسے حاکم نے نقل کیا ہے اور اس بارے میں حضرت علی سے بھی وارد ہوا ہے کہ بسم اللہ امان ہے اور یہ سورہ اترا ہے امان کے ختم کرنے کے لئے تلوار کے ساتھ اور حذیفہ سے منقول ہے کہ تم لوگ اسے "سورۂ توبہ" کہتے ہو، حالانکہ وہ عذاب کا سورہ ہے۔

بخاری کی روایت ہے کہ یہ سب سے آخری سورہ ہے جو رسول ﷺ پر نازل ہوا مگر اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والا سورۂ مائدہ ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝٢

"بیزاری ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے کہ جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا تھا، اب تم (اے مشرکو!) اس سرزمین میں بس چار مہینے تک گھوم پھر لو اور یقین رکھو کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔"

مشرکین سے معاہدۂ سابق کی منسوخی اور ان سے قطعی تبرا یعنی ترک موالات کا اعلان

جیسا کہ ترجمہ میں بریکٹ کے ذریعہ سے ہم نے واضح کیا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں خطاب سے خطاب کی طرف "التفات" ہے یعنی ابتدا میں تخاطب مسلمانوں کے ساتھ ہے کہ جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا تھا، اور پھر روئے خطاب مشرکین کی طرف ہے کہ چار مہینے تمہیں مہلت دی جاتی ہے۔

یہ دو اور ان کے بعد کی چند آیتیں ہی سورۂ براءت کی وہ ہیں جن کا حامل بنا کر جناب ابوبکر کو بھیج دیا گیا تھا کہ وہ مکہ میں جا کر مشرکین کے مجمع میں سنا دیں۔ پھر حکم الٰہی رسول ﷺ کے پاس آیا کہ انہیں یا آپ خود پہنچایئے یا ایسا شخص پہنچائے کہ جو آپ کا جز ہو۔ اس پر حضرت ﷺ

نے ان کو واپس بلوایا اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کو مامور فرمایا۔ یہ ہجرت کے نویں سال کا واقعہ ہے۔[1]

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

سال نہم حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی مرتضیٰ را در موسم حج فرستاد تا عہود مشرکان را بر اندازد (فتح الرحمٰن)

ہجرت کے نویں سال حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی مرتضیٰ علیہ السلام کو حج کے زمانے میں روانہ کیا تا کہ آپ مشرکین کے عہد و پیمان کو توڑ دیں۔

تفسیر جلالین میں ہے:

قد بعث صلى الله عليه وسلم عليا من السنة وهى سنة تسع فاذن بهم النحر بمعنى بهذه الأيات وان لا يحج بعد العام مشرك ولا يطوف بالبيت عريان رواه البخارى

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال یعنی ۹ ھ میں حضرت علی علیہ السلام کو بھیجا تو انہوں نے روز عید قرباں، منیٰ میں ان آیات کا اعلان کیا اور یہ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کو نہ آئے اور کوئی بالکل ہی برہنہ خانہ کعبہ کا طواف نہ کرے، اسے بخاری نے درج کیا ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾

"اور اعلان ہے[2] اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف سے تمام لوگوں کو سب سے بڑے حج کے دن کہ اللہ اور اس کا پیغمبر بیزار ہیں مشرکوں سے۔ اب اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے اور کافروں کو خوشخبری دو دردناک عذاب کی۔"

یہاں التفات غیبت سے خطاب کی طرف ہے یعنی "اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیزار ہیں مشرکوں سے" یہاں ان کا ذکر بطور غائب ہے اور پھر یہ کہ اگر تم توبہ کرلو، اور "اگر روگردانی کرو" یہ انہی کی طرف تخاطب ہے۔ پھر آخر میں ایک دوسرا پلٹا صنعتِ التفات کی قسم کا یہ ہے کہ "خوشخبری دو کافروں کو" ......اور کافر یعنی وہی مشرک جن کا ذکر پہلے بطور غیبت تھا اور پھر انہی سے تخاطب ہوگیا اور اب مسلمانوں سے یا کسی بھی مخاطب غیر معین کی طرف روئے خطاب کرکے انہی کا ذکر بطور غیبت ہو گیا۔

"خوشخبری دو" ......کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ "خوشخبری" دی جانا چاہیے اور کوئی بھی یہ خوشخبری دے سکتا ہے اور بعض مفسرین کے رویہ کے مطابق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں کہ آپ یہ خوشخبری دیجئے۔

---

[1] ۔نزلت براءة فی سنة تسع (تبیان)

[2] ۔اعلام (جلالین) خبر رسانیدن است (شاہ ولی اللہ) پکارنا ہے (شاہ رفیع الدین)

اب مسلمان حج کا دن عرفات کے مقام یعنی ۹رذی الحج کو سمجھتے ہیں اور اس لئے جب اس دن جمعہ ہوتو اسے ''حج اکبر'' کہتے ہیں مگر اس آیت میں یوم الحج الا کبر ''بڑے حج کا دن'' بقول اکثر مفسرین روزعید قربان یعنی ۱۰رذی الحج کو کہا گیا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

''سوا مشرکین میں سے ان کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہو، پھر انہوں نے تمہارے لئے کچھ کمی نہ کی ہو اور نہ تمہارے خلاف کسی کی امداد کی ہو تو ان کے لئے ان کے معاہدہ کو ان سے مقرر کی ہوئی مدت تک پورا کرو، یقیناً اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے''۔

''تمہارے لئے کوئی کمی نہ کی ہو'' یعنی جو شرائط معاہدہ کی طے تھیں، ان میں سے کسی بات میں انہوں نے کمی نہیں کی۔[۱]

آخری فقرہ سے کہ ''اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے''...... یہ معنی نکلتے ہیں کہ کفار کے ساتھ بدعہدی کرنا تقویٰ کے خلاف چیز ہے اور اس میں مؤاخذۂ اخروی ہے جس سے بچنا تمہیں ضروری ہے۔[۲]

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

''جب محترم مہینے گزر جائیں تو پھر ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں گرفتار کرو اور ان کا گھیراؤ کرو اور ہر کمین گاہ میں ان کی تاک میں بیٹھو، ہاں اگر وہ باز آجائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

یہ ان پہلی قسم کے مشرکین کا ذکر ہے جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا یا جنہوں نے معاہدہ کی پابندی نہیں کی اور ظاہر ہے کہ وہ مشرکین ایسے ہی تھے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم کرتے رہے تھے۔ اس لئے ان سے ایک صورت جنگ قائم ہی تھی۔ انہی کو چار مہینے کی مہلت دی گئی تھی اور انہی مہینوں کے گزرنے کے بعد[۳] یہ احکام ہیں کہ جب تک مسلمان نہ ہوجائیں ان کے واسطے اب پناہ نہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اسلام میں تبلیغ کے لئے تلوار سے کام لینے کی تعلیم دی جارہی ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ

---

[۱] لم ینقصوکم شیئا من شروط العهد (جلالین)
[۲] یحب المتقین باتمام العهود (جلالین)
[۳] یعنی آن چهار ماه که ایشان را فرصت داده بودند (فتح الرحمن)

مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

”اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دیجئے تا کہ وہ اللہ کے کلام کو سنے۔ پھر اس کے اطمینان کی جگہ پر پہنچوا دیجئے یہ اس لئے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو واقف نہیں ہیں۔“

پناہ کے طلب گار مشرکوں کو پناہ دینے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا حکم

معلوم ہوا کہ پہلا حکم ان کے واسطے تھا جو اتمام حجت کی تمام منزلیں ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کے لئے برسر آزار رہے لیکن ایسے مشرکین جو خالی الذہن ہیں اور ان میں کچھ افراد حق طلب بھی ہو سکتے ہیں، ان کے لئے یہ روادارانہ حکم ہے کہ اگر وہ اسلامی مرکز میں تحقیق کے لئے آنا چاہتے ہیں تو انہیں پورے تحفظات کے ساتھ آنے دیا جائے اور پھر ان کو اپنی طرف سے پورے انتظام حفاظت کے ساتھ ان کے مستقر تک [1] پہنچا دینا چاہیے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ
يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹ لَا
يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰

”بھلا مشرکوں کا کوئی عہد و پیمان ہو ہی کیوں کر سکتا ہے اللہ اور اس کے پیغمبر کے یہاں، سوا ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے تو جب تک وہ تمہارے لئے ٹھیک طرح سے برقرار ہیں تم بھی ان کے واسطے برقرار رہو [2] یقیناً اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے حالانکہ وہ اگر تم پر غلبہ حاصل کریں تو تمہارے بارے میں کسی رشتہ اور کسی ذمہ داری کا لحاظ نہ کریں گے تمہیں وہ اپنے منہ سے خوش کرتے ہیں اور ان کے دل انکاری ہیں اور ان میں سے اکثر بد اعمال ہیں۔ انہوں نے آیات الٰہی کے عوض میں تھوڑی سی قیمت حاصل کی ہے تو اس کے راستے سے منحرف ہو گئے ہوں گے، بہت برا ہے وہ کام جو وہ کرتے رہے ہیں۔ وہ نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے بارے میں کسی رشتہ اور نہ ذمہ داری کا اور یہی لوگ ظلم و تعدی کرنے والے ہیں۔“

---

[1] موضع امنه وهو دار قومه (جلالين)

[2] ما استمروا لكم على العهد والاستقامة الاستمرار على وجه الصواب (تبيان)

مسجد حرام کے پاس والے معاہدہ سے مراد حدیبیہ والی صلح اور اس کے شرائط ہیں۔ اسے کہا گیا ہے کہ تمہیں اس وقت تک پابند رہنا چاہیے جب تک وہ پابند ہیں[1]۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، رسول ﷺ اس عہد و پیمان کے پابند رہے لیکن بعد میں کفار مکہ کی طرف سے بدعہدی ہوئی اور قبیلۂ خزاعہ پر جو رسول ﷺ کا حلیف تھا، بنی بکر نے چھاپہ مارا اور اس کا قلع قمع کیا تو اس وقت رسول ﷺ بھی اس ذمہ داری سے بری ہو گئے اور فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔[2]

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ‌ؕ وَنُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَطَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَٮِٕمَّةَ الۡـكُفۡرِ‌ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنۡتَهُوۡنَ ﴿۱۲﴾

''اس کے بعد اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں، اور ہم حقیقتوں کو صاف صاف پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں اور اگر اپنی قسموں کو اپنے عہد و پیمان کے بعد توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن و تشنیع کریں تو کفر کے ان سرغناؤں سے[3] جنگ کرو یقیناً ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، شاید یہ باز آجائیں''۔

''توبہ کریں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام لے آئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان لانے کیلئے اسلامی زندگی کا عملی طور پر اختیار کرنا بھی ضروری ہے جس میں حقوق اللہ بھی ہیں جن کا مثالی عنوان نماز ہے اور حقوق الناس بھی ہیں جن کی جامع سرخی ''زکوٰۃ'' ہے۔ قسموں کے توڑنے کے ذکر کے بعد یہ جملہ کہ ''ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قسمیں ہی کیا جو توڑی جائیں یعنی انہوں نے کھائیں تو تھیں قسمیں مگر جب توڑ دیں تو بے حقیقت ہو گئیں۔[4]

اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ وَهَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ وَهُمۡ بَدَءُوۡكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ‌ ؕ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ‌ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾

''کیوں نہیں تم جنگ کرتے ان لوگوں سے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور پیغمبر کو نکالنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے ہی پہلی دفعہ تمہارے مقابلہ میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ اس سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو''

جنگ کے لئے ان موجبات کے ذکر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصلاً و بالذات جنگ محبوب و مطلوب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے

---

[1]۔ ما استمروا لکم علی العهد و الاستقامة الاستمرار علی وجه الصواب (تبیان)

[2]۔ قد استقام علی عهدهم حتی تقضوا با عانة بنی بکر علی خزاعة (جلالین)

[3]۔ باپیشوایان کفر (شاہ ولی اللہ)

[4]۔ انما المراد به انهم لا ایمان لهم یفون بها و یتمسکون بمر جبها (تبیان)

خاص اسباب نہ ہوں جو جنگ کو حق بجانب قرار دیں۔

یہ جملہ کہ ''انہوں نے ہی پہلی دفعہ تمہارے مقابلہ میں پہل کی'' [1] ان تمام روایات کا قلع قمع کر دینے کے لئے کافی ہے جو ہوا خواہانِ آلِ ابوسفیان نے جنگ بدر میں رسول ﷺ پر جارحیت کا الزام عائد کرنے کے لئے وضع کئے ہیں جنہیں ناسمجھی سے مسلمانوں کی تاریخ میں باریابی ہوگئی ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

''جنگ کرو ان سے، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دلوائے گا اور انہیں رسو کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور ایک صاحب ایمان جماعت کے سینہ کی حسرتیں پوری کرے گا اور ان کے دلوں کے غم وغصہ کو دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہتا ہے، رحمت کے ساتھ توجہ فرماتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

توبہ کے اصل لغوی معنی توجہ کرنے ہی کے ہیں ہم نے اس موقع پر بھی یہی مفہوم مناسب محسوس کیا ہے جس کے موافق دورِ قدیم میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے [2] مگر بعض اکابر مفسرین نے اس کے معنی توبہ قبول کرنے ہی کے لئے ہیں اور یہ مطلب لیا ہے کہ کافروں میں جو توبہ کر لیں گے، اللہ ان کی توبہ قبول کرے گا اور پھر ان سے جنگ کی ضرورت نہ ہوگی۔ [3]

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تم چھوڑ دیئے جاؤ گے اس حالت میں کہ ابھی اللہ نے معلوم نہیں کیا ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہو تم میں سے اور اللہ اور اس کے پیغمبر اور اہل ایمان کو چھوڑ کر کوئی جگری دوست [4] نہ بنایا ہو، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، باخبر ہے۔''

اس طرح کی آیتیں پہلے آچکی ہیں اور وہاں اللہ کے معلوم کرنے کا مطلب بیان کیا جا چکا ہے۔

---

[1] قال الطبری: یدؤھم بخروجھم الی بدر لقتالھم (تبیان)

[2] بر حمت باز گردد خدا بر ہر کہ خواہد۔(شاہ ولی اللہ)

[3] یتوب اللہ علیٰ من یشآء بخروجہ عن موجب القتال (تبیان)

[4] بطانۃ واولیاء (جلالین)

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ
اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۱۷ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ
فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۸

''مشرکوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اپنے اوپر کفر کا اقرار کرتے ہوئے۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال اکارت ہیں اور وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہ آباد کرے گا جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی سے ڈرے نہیں تو یہ لوگ بہت ممکن ہے کہ ہدایت قبول کرنے والوں میں ہوں۔''

مساجد الٰہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت

قریش کو فخر تھا کہ وہ مسجد حرام کے آباد رکھنے والے ہیں یہ اسی کا جواب ہے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ
وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰ يُبَشِّرُهُمْ
رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ
اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲

''کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس کے برابر قرار دیا ہے کہ جو ایمان لائے اللہ اور روز آخرت پر اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ وہ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا، جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے نزدیک مرتبہ میں بہت بڑے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ انہیں خوشخبری دیتا ہے اور ان کا پروردگار اپنی طرف کی خاص رحمت اور خوشنودی اور ان بہشتوں کی جن میں ان کے لئے برقرار رہنے والی نعمت ہے جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یقیناً اللہ کے پاس وہ صلہ ہے جو بہت بڑا ہے۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

''اوپر سے یہاں تک پانچ آیتیں نازل ہوئیں اس پر کہ کچھ گفتگو ہوئی حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عباسؓ میں حضرت عباسؓ نے آخر کو ہجرت کی ہے۔ کہا حضرت علی علیہ السلام نے کہ اگر تم اول ہجرت کرتے تو جہاد میں حاضر ہوتے اور مرتبے بلند پاتے جیسے ہم نے پائے۔ حضرت عباس نے کہا کہ ہم بھی خدا کے کام میں تھے، خدمت حاجیوں کی اور آبادی مسجد حرام کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ کام ان کے برابر نہیں۔ کوئی مسلمان خدمت کرے تو قبول ہے'' (موضح القرآن)

پہلی دو باتیں حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد حرام کا آباد رکھنا ایمان باللہ وغیرہ کے مقابلہ میں درج ہوئی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ وہ اعمال حالت عدم ایمان کے ہیں جنہیں فخر کے موقع پر پیش کیا جارہا تھا اور قرآن مجید نے اس کی رد فرمائی۔ جناب شیخ الطائفہ تحریر فرماتے ہیں:۔

خاطب الله تعالیٰ لهذه الاية قوما جعلوا القيام بسقي الحجيج وعمارة المسجد الحرام من الكفار مع مقامهم على الكفر مساويا اوافضل من ايمان من امن بالله واليوم الاخر وجاهد في سبيل الله (تبیان)

خداوند عالم نے اس آیت میں ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جنہوں نے حاجیوں کے سیراب کرنے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو باوجود کفر پر برقرار رہنے کے برابر قرار دیا تھا یا بہتر اس شخص کے ایمان سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔

ممکن ہے کہ یہاں جناب عباسؓ کا نام لینے کے بجائے ''لوگوں'' کی مبہم لفظ کہہ دینا خلافت بنی عباس کے دور کے تقاضوں کے لحاظ سے اختیار کیا گیا ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَكُمۡ وَاِخۡوَانَكُمۡ اَوۡلِيَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡكُفۡرَ عَلَى الۡاِيۡمَانِ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝۲۳ قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ وَاِخۡوَانُكُمۡ وَاَزۡوَاجُكُمۡ وَعَشِيۡرَتُكُمۡ وَاَمۡوَالُ ۨاقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ۝۲۴

''اے ایمان لانے والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنے حوالی موالی میں داخل نہ کرو، اگر وہ کفر کو ایمان کے مقابلہ میں پسند کریں اور جو تم میں سے انہیں حوالی موالی بنائے گا تو یہی ظالم لوگ ہیں، کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہاری اولاد اور تمہارے بھائی اور تمہارے شریک زندگی اور تمہارے عزیز اور وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور وہ کاروبار جس کے مدھم ہو جانے کا تمہیں ڈر ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں، اللہ اور اس کے پیغمبر اور اس کی راہ میں جہاد سے تم کو زیادہ محبوب ہیں تو پھر منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کرے اور اللہ بداعمال

لوگوں کو منزلِ مقصود تک پہنچا یا نہیں کرتا ہے۔"

یہ تاریخ وسیرت کی مسلمہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے لئے جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روانہ ہونے والے تھے تو حاطب بن ابی بلتعہ نے جو صحابۂ بدر میں کے معزز گروہ میں داخل تھے، خفیہ طور پر اس کی اطلاع مکہ کی طرف ایک قاصد کے ہاتھ بھیجی تھی جسے قدرت کی طرف سے افشائے راز کئے جانے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستے میں روکنے کا انتظام فرمایا۔ ہمارے یہاں کی روایت کے مطابق جو بطور حدیث صراحۃً موجود ہے، یہ آیتیں اسی واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔[1]

مگر قدیم تفسیر میں جس کے متعلق گمان غالب ہے کہ حدیث پر مبنی ہوتی ہے، اس کا گزشتہ آیات ہی سے تعلق بتایا گیا ہے کہ جب یہ حکم ہوا کہ مشرکین مکہ میں اب سے داخل نہ ہوں تو بعض مسلمانوں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ اس سے ہماری تجارت کو نقصان پہنچے گا اور ہمارے اہل وعیال کو بھی جو مکہ میں ہیں ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2] مگر ہمیں پہلی تفسیر زیادہ مرجح معلوم ہوتی ہے۔

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَوَاطِنَ كَثِيۡرَةٍ ۙ وَّيَوۡمَ حُنَيۡنٍ‌ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـئًا وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ‌ۚ ۝۲۵ ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَـتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا‌ ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا‌ ؕ وَذٰ لِكَ جَزَآءُ الۡـكٰفِرِيۡنَ ۝۲۶ ثُمَّ يَتُوۡبُ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰ لِكَ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۲۷

"اللہ نے تمہاری مدد کی ہے بہت سے مقامات پر اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت تعداد نے تم میں غرور پیدا کر دیا[3] تو اس نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا اور تم پر زمین اپنی وسعت کے ساتھ ساتھ تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھرا کے پسپا ہوئے، پھر اللہ نے اپنی طرف کا سکون واطمینان[4] اتارا اپنے پیغمبر اور (سچے) ایمان والوں پر اور ایسی فوجیں اتاریں جنہیں تم نے دیکھا نہیں اور سزا دی انہیں جنہوں نے کفر کیا اور یہی سزا ہوتی ہے کافروں کی پھر اللہ اس کے بعد جس کی چاہتا ہے توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔"

جنگِ حنین کا تذکرہ اور باوجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار

---

[1] ۔ روی عن ابی جعفر وابی عبداللہ (تبیان)

[2] ۔ لما اذن امیر المومنین علیہ السلام بمکۃ ان لا یدخل المسجد الحرام مشرک بعد ذلك العام جزعت قریش جزعا شدیدا وقالوا ذھبت تجارتنا وضاعت عیالنا وضربت دورنا فانزل اللہ عزوجل فی ذلك (علی بن ابراھیم)

[3] ۔ العجب السرور بالنفس علی الفخر بما یستحب منہ (تبیان)

[4] ۔ طمانینہ (جلالین)

ان موقعوں سے جہاں اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی، وہ مواقف جہاد مراد ہیں جہاں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اور مخالفین اسلام کا مقابلہ ہوا۔ روایت میں وارد ہوا ہے کہ ان مہموں کی تعداد اسی تھی[1]

اس سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ کثیر کی قید کے ساتھ کوئی نذر وغیرہ کی جائے تو اسّی کی تعداد کثیر کا یقینی مصداق ہو گی۔ (یعنی اگر کوئی شخص نذر مان لے کہ کثیر افراد کو کھانا کھلانے کی نذر مان لے تو اس کے لئے اسی افراد کو کھانا کھلا دینا کافی ہوگا اور یہ تعداد کثیر تعداد کہلائے گی)۔

مسلمان اس جنگ میں بارہ ہزار تھے اور کفار صرف چار ہزار تو بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ اب تو ہم اکثریت میں ہیں، اس لئے دشمن پر غالب آنے میں کوئی شک نہیں۔ اسی کو قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ تمہاری کثرت نے تم میں غرور پیدا کر دیا۔[2]

ان الفاظ سے کہ ایسی فوجیں اتاریں جنہیں تم نے دیکھا نہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بدر کی طرح جنگ حنین میں بھی فرشتوں کا لشکر مدد کے لئے آیا تھا۔[3]

بعض لوگوں نے بدر اور حنین میں یہ فرق بتایا ہے کہ حنین میں فقط مسلمانوں میں سکونِ قلب پیدا کرنے کے لئے فرشتے اترے تھے جنگ نہیں کی تھی مگر بدر میں جنگ کی تھی۔[4]

لیکن ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حنین میں بدر ہی کی طرح جنگ بھی کی تھی۔[5]

يَآيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِكُوۡنَ نَجَسٌ فَلَا يَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا‌ ۚ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۲۸

''اے ایمان لانے والو! مشرکین سراسر نجاست ہی نجاست ہیں تو وہ اس سال کے بعد آئندہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ جائیں اور اگر تمہیں مفلسی کا اندیشہ ہو[6] تو عنقریب اللہ تمہیں اپنے فضل وکرم سے انشاءاللہ غنی کر دے گا۔ یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

خالق نے صاف الفاظ میں مشرکین کو ''سراسر نجاست'' کہا ہے اور انما کلمۂ حصر کے ساتھ جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا کہ ''نجاست ہی

---

[1] روی عن ابی عبدالله انها كانت ثمانين موطنا (تبیان)

[2] فقلتم لن تغلب اليوم من قلة (جلالین)

[3] المراد بها ههنا الملائكة (تبیان)

[4] قال الجبائی انما نزلت الملائكة يوم حنين من جهة الخاطر الذى يستجمع قلوبهم ويجبن عنهم اعدآءهم ولم تقاتل الا يوم بدر خاصة۔ (تبیان)

[5] قال رجل يقال شجرة بن ربيعة للمؤمنين وهو اسير فى ايديهم ابن الخيل البلق والرجال عليهم الثياب البيض فانما قتلنا بأيديهم... قالو اتلك الملائكة (علی بن ابراهيم)

[6] يعني بسبب انقطاع سودا گران (فتح الرحمن)

نجاست ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں طہارت کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں اور اسی لئے فقہ اہل بیت علیہم السلام میں انہیں نجس العین مانا جاتا ہے مگر سواد اعظم کے اقتدار دنیا کی بنا پر سیاسی مصالح، ان کی طہارت کے متقاضی ہوئے لہٰذا وہ قرآن کے اس نص قطعی کے خلاف ان کی طہارت کے قائل ہو گئے اور اس لئے شاہ عبدالقادر قرآن کے حکم صریحی نجاست کے تحت یوں رقم طراز ہیں کہ:

''پلیدی ان کے دل میں، بدن پر نہیں'' (موضح القرآن)

حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن ان پر نجس ہی نہیں بلکہ نَجَس کا جس کے معنی ہوئے عین نجاست، اطلاق کیوں کرتا؟!

جلالین کا مشرب اگرچہ وہی ہے لیکن مقام تشریح میں ان کے الفاظ پھر بھی ایک حد تک درست ہیں کہ:

نجس قذر لخبث باطنھم

وہ نجس یعنی بالکل نجاست ہیں اپنے باطن کی گندگی کی وجہ سے۔

یہاں باطن کی نجاست کو علت حکم قرار دیا ہے مگر اس علت سے حکم جو مرتب ہوا وہ کیا ہے؟ خود ان کا نجس ہونا جو ان کی اس خباثت باطنی پر ایک پاداش کی حیثیت رکھتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مشرکین کے نجس ہونے کی آیت ۹ھ ہجری میں یعنی رسول ﷺ کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے نازل ہوئی ہے۔[1]

لہٰذا اس کے پہلے مسجد رسول ﷺ میں کچھ کفار کے داخلہ یا نشست و برخواست یا اکل و شرب کے واقعات جو ہوں، وہ طہارت مشرکین کے ثبوت میں پیش نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ احکام تدریجی طور پر نازل ہوئے ہیں اور اسی تدریج کے ساتھ ان پر عمل ہوا ہے۔ قبل ورود شرع اگر عمل اس کے خلاف ہوا ہو تو وہ اس حکم کے مقابلہ میں کوئی سند نہیں ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَـقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾

''اہل کتاب میں سے ان سے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ روز آخرت پر اور نہیں حرام سمجھتے اسے جو اللہ اور اس کے پیغمبر نے حرام قرار دیا ہے اور سچے دین کو اختیار نہیں کرتے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ احساس کمتری رکھتے ہوئے سیدھے ہاتھ[2] جزیہ ادا کریں۔''

سلسلۂ ترتیب تنزیلی میں اس کا فیصلہ مشکل ہے کہ یہ آیت کس منزل پر اتری ہے۔

---

[1] ۔ بعد عامھم ھذا عام تسع من الھجرۃ (جلالین) سنۃ تسع من الھجرۃ التی نبذ فیھا براءۃ المشرکین وکانت بعدہ حجۃ الوداع (تبیان)

[2] ۔ عن ید ای منقادین او بایدیھم لا یوکلون بھا (جلالین)

سورۃ ''براءۃ'' کا جزء ہونا تو اس کا مقتضی ہے کہ یہ آخری دورِ حیاتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت ہو مگر اس وقت معاملہ مشرکین یعنی بت پرستوں کا تھا۔ اس میں یہ اہل کتاب کا ذکر کہاں سے آ گیا؟ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴿٣٠﴾

''اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ اپنے منہ سے ان کی باتیں ہیں، ویسی ہی باتیں کہتے ہیں جیسے پہلے کے کافروں کی باتیں تھیں اللہ ان کو غارت کرے[1] کس طرح کج روی کر رہے ہیں۔[2]''

یہ اپنے منہ سے ان کی باتیں ہیں'' یعنی بلا ثبوت۔ ان کے پاس ان باتوں کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے[3] اور نہ کوئی صحیح مفہوم ان کا ان کے ذہن میں ہے[4] ''پہلے کے کافروں کی ایسی باتیں ہیں'' یعنی مشرکین بھی تو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے[5] یا یہ کہ خود ان کے باپ دادا اور مذہبی پیشوا جیسے پال جنہوں نے یہ باتیں ایجاد کیں اور یہ اندھا دھند ان کی پیروی کر رہے ہیں۔[6]

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾

''انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے علاوہ پروردگار بنا رکھا ہے اور مریم کے فرزند مسیح کو۔ حالانکہ حکم نہیں تھا سوا اس کے کہ وہ ایک خدا کی عبادت کریں جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، وہ بری ہے اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔''

احبار یہودیوں کے علماء کہے جاتے تھے اور راہب عیسائیوں کے تارک الدنیا عابد۔[7]

''انہوں نے پروردگار بنا رکھا ہے'' یعنی چاہے زبان سے انہیں خدا نہ کہیں لیکن حلال و حرام میں صرف ان کے اقوال پر انہوں نے

---

[1] ۔لعنھم اللہ (جلالین) لعنت کرد ایشان را خدا (شاہ ولی اللہ)
[2] ۔کیف یصرفون عن الحق مع قیام الدلیل (جلالین)
[3] ۔یعنی اصلی ندارد (فتح الرحمن)
[4] ۔لا یرجع الی معنی صحیح فھو لا یجاوز افواھھم (تبیان)
[5] ۔یعنی اہل کتاب ہو کر مشرکین کی پیروی کرنے لگے (موضح القرآن)
[6] ۔الذین کفروا من قبل من اٰبائھم تقلیدا لھم (جلالین)
[7] ۔احبار ھم علماء الیھود و رھبانھم عباد النصاریٰ (جلالین)

اپنادارومدار قرار دے لیا ہے۔[1]

حالانکہ علماء کا کام تشریح احکام نہیں ہے بلکہ احکام شرعیہ کو ان کے ماخذوں سے معلوم کر کے عوام کو بتلانا ہے۔ مسلمانوں میں علماء کا جو مرتبہ ہے، وہ اسی حد تک ہے، تشریع احکام میں کسی عالم کا قول ہرگز مستند نہیں ہے۔

مفسرین اہل سنت نے بھی اس کی تشریح یہی کی ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں ہے:

حیث اتبعوھم فی تحلیل ما حرم و تحریم ما احل

اس طرح کہ انہوں نے ان کی پیروی کی حلال سمجھنے میں اس کے جو خدا نے حرام کیا تھا اور حرام سمجھنے میں اس کے جو اس نے حلال کیا تھا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ان کے عالم یا درویش جو اپنی عقل سے ٹھہرا دیتے، وہ جانتے خدا کے ہاں ہم کو چھٹکارا ہو گیا، سو عالم کا قول عوام کو سند ہے جب کہ وہ شرع سے سمجھ کر کہے۔'' (موضح القرآن)

مگر یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اصول فقہ میں اہل سنت کے یہاں جو اصول ''تصویب'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احکام شرعی مجتہدین کے اقوال کے پابند ہیں اور مجتہدین بس چار گزرے ہیں۔ ابوحنیفہ وغیرہ اور سب کے لئے انہی کے اقوال پر چلنا باعث نجات ہے تو بتایئے کہ یہود و نصاریٰ کے اس تصور اور اسلام کی طرف منسوب شدہ تصور میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ انکاری ہے کسی بات سے سوا اس کے کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچائے چاہے کافر لوگ ناگواری محسوس کریں۔''

''اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں'' یعنی پھونکوں سے اس چراغ کو خاموش کر دیں۔

شاہ عبدالقادر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

''یعنی جیسے کوئی پھونک سے چراغ بجھا دے، وہ چاہتے ہیں کہ اپنی جھوٹی باتوں سے دین اسلام کو نہ پھیلنے دیں۔'' (موضح القرآن)

ان کے والد شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

''یعنی بشبہات تقریر می کنند در ابطال دین''۔ (فتح الرحمٰن)

جلالین کے الفاظ یہ ہیں۔

نور الله شرعه وبراهينه بأفواههم بأقوالهم فيه۔

[1] معنی اتخاذھم ار بابا انھم قبلو امنھم التحریم والتحلیل بخلاف ما امر الله تعالیٰ وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبدالله (تبیان)

''نور خدا'' یعنی اس کی شریعت اور اس کے دلائل ''اپنے منہ سے'' یعنی اپنے اقوال سے اس کے بارے میں۔

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ''جھوٹی باتوں'' ''شبہات'' اور ''اقوال'' کی خصوصیت افواہ یعنی دہنوں کی لفظ کو دیکھتے ہوئے کی ہے حالانکہ یُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ ''وہ اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں''...... یہ الفاظ تو بطور استعارہ ہیں۔ یعنی ان کی کوششوں کو دین کے مٹانے میں چراغ کو بجھانے والے کی کوشش سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بافواھم ''اپنے دہنوں سے'' یہ لفظ مشبہہ بہ یعنی چراغ بجھانے کی مناسبت سے ہے کہ یہ بجھانے کی کوشش زیادہ تر منہ سے ہوا کرتی ہے۔ اس کے لئے یہ ضرورت نہیں ہے کہ مشبہ یعنی دین کے مٹانے کی جو کوشش ہے، وہ بھی منہ سے ہی متعلق سمجھی جائے۔ وہ چیزیں یعنی شبہات اور اس طرح کے اقوال، وہ ایک نوع کی کوشش دین کے مٹانے کی ہے لہٰذا وہ بھی اس کے تحت میں داخل ہیں لیکن ان کے علاوہ جتنی طرح کی کوششیں بھی دین کے خلاف ''دامے، درمے، قدمے، سخنے'' ہوں اور اس سے آگے بڑھ کر زیر تلوار، اور لشکروں اور سیاسی کرتبوں سے وہ کوششیں جو رہنمایان دین کیخلاف ہر دور میں ہوئیں، سب اس کے تحت میں داخل ہیں جن میں سب سے بڑی کوشش جس میں سلطنتیں مصروف رہیں، وہ ان ہستیوں کی زندگی کا خاتمہ تھا جنہیں محافظ دین کی حیثیت سے خالق نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد برقرار رکھا تھا مگر خالق صاف ارشاد فرما رہا ہے کہ ''یَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ'' (یعنی) اللہ طے کئے ہوئے ہے کہ وہ اپنے نور کو کمال کی منزل تک پہنچا کے رہے گا۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ان تمام قہاری طاقتوں کی کوشش کے باوجود ان رہنمایان دین کا سلسلۂ وجود ختم نہیں ہوا اور ان تمام منصوبوں کے برخلاف ان میں سے ایک محافظ دین قائم و برقرار ہے جو دین الٰہی کے کمال تک پہنچانے کا ضامن اور ''**واللہ متم نورہ**'' کا ثبوت کامل ہے۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾

''وہ وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے ہر دین کے مقابلہ میں غالب کر کے رہے، چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناپسند ہو۔''

آخر میں دین اسلام کے غالب آنے کا اعلان

اصل میں دین تو وہی ہے جو سچا ہو۔ اس کے خلاف جو کچھ ہو، وہ بے دینی ہے مگر اکثر باطل تصورات چونکہ بنام دین جاری ہیں، اس لئے دین ایک نہ رہا، بہت سے دین ہو گئے اور اب دین کی قسمیں ہو گئیں، دین حق اور ادیان باطلہ [1]

عبوری منزلوں میں اس عمر دنیا کی اکثر باطل غالب بھی نظر آتا ہے مگر آخر میں خالق کا یہ اعلان ہے کہ وہ دین حق کو بلا استثناء تمام ادیان باطلہ کے مقابلہ میں غلبہ عطا کر کے رہے گا یہی غلبۂ دین حق وہ ہے جس کے اہل حق منتظر ہیں [2] اور اس محافظ دین کی راہ دیکھ رہے ہیں جس کے ظہور سے یہ غلبۂ حق دنیا کی آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ **اللھم عجل فرجه وسهل مخرجه.**

---

[1]۔ الدین کله جمیع الادیان المخالفة له (جلالین) دین الحق هو الاسلام ...و کل دین سواه باطل (تبیان)

[2]۔ قال ابو جعفر علیہ السلام: ان ذٰلك یکون عند خروج القائم (تبیان)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ
النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى
عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا
كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

”اے ایمان لانے والو! یقیناً بہت سے پادری اور راہب، لوگوں کے اموال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انحراف کرتے ہیں [۱] اور وہ جو سونے اور چاندی کے ذخیرے اکٹھا کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سناؤ، جس دن آتش جہنم میں ان (سونے چاندی کے سکوں) کو تپایا جائے گا، اوران سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لئے ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اب چکھو مزہ ان کا جو تم ذخیرہ جمع کرتے رہتے تھے۔“

اکتناز کی مذمت اور اس کی سزا

”لوگوں کے اموال ناحق کھاتے ہیں“ یعنی رشوت وغیرہ لے کر غلط مسئلے بتاتے ہیں [۲] اکٹھا کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے سے مراد زکوٰۃ وغیرہ حقوق مالی کا جو فرض عین ہیں، ادا نہ کرنا ہے۔ [۳]

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ
اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۤفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۤفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ
مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

”بلاشبہ مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک بارہ مہینوں کی ہے اللہ کے نوشتہ میں اس دن کہ جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہ صحیح دین ہے تو ان میں اپنے نفوس پر ستم نہ ڈھاؤ اور مشرکوں سے

---

[۱]۔ دوسرا ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ”باز می دارند از راہ خدا“ (شاہ ولی اللہ) یہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے:۔ یصدون الناس

[۲]۔ اکل المال بالباطل تملکه من الجهات التی یحرم منها اخذه (تبیان)

[۳]۔ لانّهم لو اخرجوا زکوٰتها و کنزوا ما بقی لم یکونوا ملومین بلا خلاف. (تبیان)

سبھوں سے جنگ کرو جیسے وہ سب ہی تم سے جنگ کرتے ہیں اور جانے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"

مہینوں کی تعداد بارہ اور چار محترم جن میں جنگ وجدل حرام ہے

"اللہ کے نوشتہ" سے مراد لوح محفوظ بھی ہوسکتی ہے اور سابق کی نازل شدہ آسمانی کتابیں بھی[1]

"جب سے آسمان وزمین پیدا ہوئے" یعنی ہمیشہ سے "چار مہینے حرام ہیں" یعنی ان کی عزت وحرمت ایسی ہے کہ ان میں جدال وقتال حرام ہے۔ یہ چاروں مہینے ذیقعد، ذی الحج، محرم اور رجب ہیں۔ ان چاروں میں سے محرم کا تو تقریباً نام ہی ہوگیا "محرم الحرام"۔

یہ صحیح دین ہے" یعنی ان مہینوں کی اس عزت وحرمت کو ماننا دین کا لازمی تقاضا ہے۔[2]

اور ہوسکتا ہے یہ پورے سے متعلق ہو یعنی پیش خدا بارہ مہینوں کا ہونا اور ان میں سے چار کا محترم ہونا یہ دین حق کا لازمی جز ہے۔

اس کے ساتھ مشرکین کے مقابلہ میں جنگ کا جو حکم آیا ہے اس قید کے ساتھ کہ "جیسے تم سے سب مل کر لڑتے ہیں"...... اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان مہینوں کی حرمت کو نہ مانیں اور آغاز جنگ کردیں تو تم بھی مقابلہ کرو پھر تم پر ان مہینوں کی بے حرمتی کا الزام عائد نہ ہوگا۔[3]

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَّيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوٓءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِينَ ﴿٣٧﴾

"مہینوں میں ردوبدل کرنا، کفر میں ایک بڑی زیادتی ہی ہے جس سے گمراہ ہوتے ہیں، وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام بنادیتے ہیں تاکہ جو اللہ نے حرام قرار دیئے ہیں، ان کی گنتی پوری کردیں اور اس طرح جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اسے حلال کردیں۔ ان کی بداعمالی ان کے لئے خوش آئند معلوم ہوتی ہے اور اللہ کافروں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔"

نسی یعنی مہینوں کی تبدیلی کی شدید مذمت

نسیئ یعنی مہینوں میں ردوبدل کس طرح ہوتی تھی؟

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"گاہے صفر را محرم می ساختند و محرم را صفر و علی ہذا القیاس" (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسم کے اعتبار سے تو جو حرام مہینے ہیں، ان ہی کو حرام قرار دیتے تھے مگر مسمّٰی کو ان کے بدلتے تھے یعنی جو واقعاً

---

[1] فیما کتبہ اللہ فی اللوح المحفوظ وفی الکتب المنزلۃ علیٰ انبیائہ (تبیان)

[2] ذٰلك تحریمها (جلالین)

[3] واقتلوا المشرکین کافۃ ای جمیعاً فی کل الشهور (جلالین)

محرم ہوتا، اسے صفر قرار دیتے اور جو صفر ہوتا، اسے محرم مگر یہ کیونکر ہوتا تھا؟ اس کے لئے مزید تشریح درکار ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”کافروں نے ایک گمراہی نکالی تھی کہ آپس میں لڑتے اس میں آجاتا ماہ محرم، اس کو ہٹا دیتے کہتے اب کے برس صفر پہلے آیا، محرم پیچھے آوے گا تو ماہ حرام میں لڑتے اس حیلہ سے“ (موضح القرآن)

یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

كما كانت الجاهلية تفعله من تاخير حرمة المحرم اذا اهل وهم فى القتال الى صفر

جیسا کہ جاہلیت والے کرتے تھے کہ اگر جنگ میں مصروف ہیں اور اس میں محرم کا چاند ہو گیا تو اس کی حرمت کو بعد میں صفر کی طرف منتقل کر دیتے تھے۔

ایک خیال یہ ہے کہ اس کا باعث معاشی پہلو کا لحاظ تھا چونکہ عربوں کی گزر بسر لوٹ مار پر تھی اور تین مہینے مسلسل محترم ہونے کی وجہ سے اتنی طویل مدت تک وہ اپنی روزی سے محروم رہتے تھے، اس لئے وہ محرم کی جگہ صفر کا اعلان کر دیتے تھے تاکہ وہ درمیان میں لوٹ مار کر لیں اور پھر صفر کے مہینہ میں محرم بنالیں[1] اس کو قرآن نے روکا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

”اے ایمان لانے والو! تمہیں کیا ہے کہ جب کہا جاتا ہے تم سے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین گیر ہو جاتے ہو! کیا تم آخرت کے بدلے اس دنیاوی زندگی پر راضی ہو تو نہیں ہے اس دنیوی زندگی کا سروسامان آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت کم۔“

یہ تبوک کی جنگ کے لئے چلنے کی دعوت پر کچھ مسلمانوں کے رویہ کا بیان ہے۔[2]

اس جنگ کے لئے روانگی کا حکم بڑی سخت گرمی کے موسم میں تھا اور پھر بظاہر رومی سلطنت کا مقابلہ تھا اس لئے مسلمان بڑی مشکل سے جنگ کے لئے آمادہ ہو رہے تھے۔

مفسرین اہل سنت جنہیں کردار صحابہ کو سنبھالنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے، کہتے ہیں کہ یہ صرف تین آدمی تھے[3] مگر وہ تین آدمی تو وہ

---

[1] انما دعاهم الى ذٰلك لوالى ثلثة اشهر حرم لا يغيرون فيها و كان معاشهم من الغارة. (تبیان)

[2] قال الحسن و مجاهد دعوا الى الخروج الٰى غزوة تبوك بعد فتح مكة وغزو طائف. (تبیان)

[3] آن حضرت ﷺ در وقت عسرت و گرمی هوا مر توجه غزوه تبوك شدند و بسیاری از صحابه موافقت كردند و از مسلمین سه كس بے عذر تخلف كردند. (فتح الرحمن)

تھے جو آخر تک نہیں گئے اور پھر نادم ہوئے۔ ان کی توبہ اور اس کی قبولیت کا ذکر تین عدد کی صراحت کے ساتھ دوسری آیت میں موجود ہے مگر صرف تین عدد کا کردار ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے کہ اس پر تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے انتباہ کیا جائے اور ایسی ایسی سخت تہدید و تخویف کی صورتیں اختیار کی جائیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ ''محمل'' میں بڑی ''گرانی'' اور ''ذوق اطاعت'' میں بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے ''نوا'' کو ''تلخ تر'' اور ''حدی'' کو ''تیز تر'' قرار دیے جانے کی ضرورت تھی۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

''اگر تم باہر نہ نکلو گے تو وہ تمہیں دردناک عذاب کے ساتھ سزا دے گا اور تمہارے بدلے کسی دوسرے گروہ کو کھڑا کر دے گا اور تم انہیں کچھ نقصان نہ پہنچاؤ گے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

انداز کلام سے ظاہر ہے کہ یہ آیتیں سب جنگ میں روانگی سے پہلے کی ہیں اور اس وقت مسلمانوں میں یعنی صحابہ میں ایک عام بددلی، سستی اور عدول حکمی کے رجحان کی لہر سی پھیلی ہوئی تھی۔

پھر ان سخت تنبیہوں کے نتیجہ میں بادل ناخواستہ تمام لوگ روانہ ہوئے مگر تین آدمی ایسے تھے جو حیلے حوالے کر کے پھر بھی نہ گئے جن کے متعلق بعد میں آیتیں نازل ہوئیں۔

لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا میں ضمیر کس کی طرف راجع ہے؟ اس میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اللہ کی طرف ہے اور دوسرے یہ کہ رسول ﷺ کی طرف۔[1]

ہم نے دوسرے قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے، اس لئے کہ اس کے بعد کی آیت میں بلا فاصلہ جو ضمیریں ہیں، وہ واضح طور پر رسول ﷺ ہی کی طرف راجع ہیں۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

''اگر تم ان کی مدد نہ کرو گے تو (کیا ہوا؟) اللہ نے ان کی مدد کی ہے اس وقت جب کافروں نے ان کو نکال دیا تھا، جب وہ دو میں کے ایک تھے[2] جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ

---

[1] ۔قیل فی من یرجع الیہ قولان: احدھما انہ یعود علی اسم اللہ والآخر انہا تعود الی النبی ﷺ (تبیان)

[2] ۔ای احد اثنین (جلالین)

کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ نے اپنی طرف کا سکون واطمینان ان پر اتارا اور ان کو تقویت پہنچائی ایسی فوجوں سے جنہیں تم لوگوں نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کیا اور اللہ کی بات سب سے بالا اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا۔''

شب ہجرت کا مختصر حال

غار میں دوسرے شخص جو حضرت پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ تھے، یہ مشہور ومعروف صحابی ابوبکرؓ تھے۔

یہ رسول ﷺ پر بڑا سخت وقت تھا جس کی سختی میں ساتھ والے کی وجہ سے اضافہ ہو گیا تھا ورنہ نصرت الٰہی کے تذکرہ میں اس واقعہ کے بیان کی کہ ساتھ کون تھا اور اس کی کیا حالت تھی؟ کوئی ضرورت نہ تھی۔

اُدھر مشرکین تعاقب میں آرہے تھے اور ادھر عین اس موقع پر جب مشرکین غار کے دہانے پر تھے، رسول ﷺ کے ساتھی پر رقت طاری ہو گئی جس کے لئے روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

قد قال له لمّا رأى اقدام المشركين لو نظر احدهم تحت قدمه لابصرنا.(جلالین)

جب انہوں نے مشرکین کی پیش قدمی دیکھی تو رسول ﷺ سے کہنے لگے کہ ان میں سے کوئی بھی نظر جھکائے اپنے پیر کے نیچے تو وہ ضرور ہمیں دیکھ لے گا۔

مشرکین پہنچ تو گئے ہی تھے وہاں تک۔ بس ایک آواز کی کمی تھی جو نظروں کو قدموں کے نیچے متوجہ کر دے یہ کمی پوری ہو گئی گر یہ کے غلبہ سے تو بس اس وقت پیغمبر خدا ﷺ کی حفاظت صرف خدا کی قدرت کا کرشمہ تھی اور اس نے ان پر سکون واطمینان اتارا یعنی پیغمبر ﷺ پر اس لئے کہ قبل اور بعد کی تمام ضمیریں حضرت ﷺ ہی کی طرف راجع ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ درمیان کی اس ضمیر کو کسی اور کی طرف پلٹا دیا جائے۔ [1]

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

''چل کھڑے ہو ہلکے پھلکے اور بھاری، بوجھل (جیسے بھی ہو) اور اپنے مال وجان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو۔''

''ہلکے پھلکے'' اور ''بھاری بوجھل'' کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ خواہ تمہارے پاس مال ودولت موجود ہو اور تم طاقت رکھتے ہو اور خواہ تم محتاج، پریشان حال اور کمزور ہو، اس صورت میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے اس ارشاد الٰہی سے کہ:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ------حَرَجٌ کمزوروں پر--------سختی نہیں ہے۔

مگر شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ اس معنی سے طاقت اور ضعف یہاں مراد نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خواہ تمہارے پاس اسباب، حشم وخدم زیادہ ہو اور خواہ اتنا ہی بس موجود ہو جو پیٹ پالنے کے لئے کافی ہے، اس سے زیادہ لاؤ لشکر پاس نہ ہو، وہ کہتے ہیں:

---

[1] فان جميع الكنايات قبل هذا وبعده راجعة الى النبى ﷺ (تبیان)

"بایں توجیہہ آیۃ محکم باشد غیر منسوخ" (فتح الرحمٰن)۔

محققین علماء کے خیال کے مطابق گراں باری اور سبک باری کی بہت سی شکلیں ہیں جن کے لحاظ سے بہت سے اقوال ہو گئے ہیں۔ یہ کہ خواہ تم جوان ہو یا بوڑھے، یہ کہ مالدار ہو یا غریب، یہ کہ تمہاری طبیعت اس کے لئے آمادہ ہو یا طبیعت پر گراں ہو، کہ سوار ہو یا پیادہ، یہ بھی کہ تم کوئی پیشہ کرتے ہو یا بے کار ہو، صاحب اہل وعیال ہو یا اس بار سے سبکدوش ہو لہٰذا اس کی ضرورت کیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک میں آیت کے مفہوم کو محدود بنایا جائے بلکہ کیوں اسے ان تمام پہلوؤں پر حاوی قرار نہ دیا جائے۔[1]

بہرصورت اسے منسوخ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّا تَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

"اگر قریبی کوئی منفعت ہوتی تو[2] اور سفر معمولی ہوتا[3] تو وہ آپ کے پیچھے پیچھے ہو جاتے مگر ان پر بڑی دور دراز مسافت پڑ گئی اور بہت جلد وہ اللہ کی قسم کھائیں گے کہ اگر ہم روانہ ہو سکتے تو آپ کے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔"

یہ دور دراز مسافت شام کی سرزمین تھی جہاں جنگ تبوک کے لئے جانے کی دعوت دی گئی تھی۔[4]

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

"اللہ آپ کو معاف کرے، کیوں آپ نے انہیں اجازت دی جب تک کہ کھل نہ جائیں آپ پر وہ جو سچے ہیں اور وہ معلوم ہو جائیں کہ جو جھوٹے ہیں۔"

کچھ منافقین نے پیغمبر ﷺ سے خصوصی طور پر اجازت طلب کی کہ ہم گھروں میں بیٹھے رہیں اور ساتھ نہ جائیں۔ حضرت ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔ ارشاد حضرت احدیت ہے کہ اب تو ان کے لئے ایک پردہ ہو گیا عدول حکمی کے الزام سے بچنے کے لئے۔ آپ اجازت نہ دیتے تو پورا انکشاف ہو جاتا کہ کون تعمیل حکم سچائی کے ساتھ کرتے ہیں اور کون جھوٹے ہیں؟

حضرت ﷺ کو اجازت دینے کا حق بنص قرآن حاصل تھا جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

---

[1]۔ ان یحمل علیٰ عمومہ فیدخل فیہ جمیع ذلک وھو الاولیٰ والالیق بالظاھر (تبیان)

[2]۔ اگر بودی انچہ بآن دعوت می کنی نفع قریب الحصول (شاہ ولی اللہ)

[3]۔ سفراً سھلاً باقتصادہ من غیر طول (تبیان)

[4]۔ یعنی الیٰ تبوک (علی بن ابراھیم)

وَرَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ.

اگر وہ اپنی کسی مجبوری سے جنگ میں نہ جانے کی اجازت مانگیں تو جسے آپ چاہیں اجازت دے دیجئے۔ (نور:۶۲)

اس لئے یہ اجازت دینا معاذ اللہ کوئی فعل ناجائز نہ تھا جو منافی عصمت ہو مگر خالق کی نظر میں اس موقع پر اجازت نہ دینا زیادہ مناسب تھا۔ [۱]

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

”آپ سے چھٹی نہیں مانگتے وہ جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس سے [۲] کہ وہ اپنے مال اور جان سے جہاد کریں اور اللہ پرہیز گاروں کا خوب جاننے والا ہے۔ آپ سے چھٹی کے طالب تو بس وہ ہوتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں کو شک ہے تو وہ اپنے شک میں ڈانواڈول رہتے ہیں“ [۳]

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

”اور اگر وہ باہر نکلنے کی نیت رکھتے تو اس کے لئے پہلے سے تیاری کرتے مگر اللہ کو ان کا چل کھڑا ہونا ناپسند تھا تو اس نے ان کی ہمت پست کر دی اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھو بیٹھنے والوں کے ساتھ“

توفیق الٰہی ذوق وطلب کے ساتھ شامل حال ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت۔۶۹)

یہ لوگ اس ذوق سے محروم تھے، اس لئے توفیق ان سے سلب ہوگئی جس کا نام خذلان ہوتا ہے، اسی کو یہاں اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ عام مفسرین نے اسے تقدیر الٰہی کے معنی میں قرار دیا ہے جو ازل سے ثابت ہے [۴] مگر اس طرح وہ بےقصور قرار پا جاتے ہیں۔ جناب شیخ الطائفہؒ نے اس کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ یہ منافق لوگ اگر رسول ﷺ کے ساتھ واقعی نصرت اسلام اور جہاد کی نیت سے جانے کا قصد رکھتے ہوتے تو وہ اس کا سامان کرتے لیکن ان کی نیت یہ نہ تھی وہ تو یہ سوچے ہوئے تھے اگر پیغمبر ﷺ نے ہمیں یہاں رکنے کی اجازت نہ دی تو ہم جائیں گے اور ان کا کام بگاڑنے کی کوشش کریں گے اور مسلمانوں میں بددلی پھیلائیں گے لہٰذا اس طرح ان کے جانے کو اللہ

---

[۱]۔ ما كان الاولىٰ ان لا يأذن (تبيان)

[۲]۔ فی التخلف ان يجاهدوا (جلالين)

[۳]۔ معناه فهم فی شكهم يذهبون ويرجعون (تبيان)

[۴]۔ ای قدر تعالىٰ ذٰلك (جلالين)

نے ناپسند کیا، اور ایسے اسباب فراہم کئے کہ ان کی ہمت پست ہوجائے۔

یہ ان کی ہمت کا پست ہونا اس طرح کے جانے سے ہے جو ان کے پیش نظر تھا۔ نہ کہ واقعی نصرت اسلام کے لئے جانے سے جو بلا شبہ اللہ کو پسند ہے اور اسے کہا نہیں جا سکتا کہ اللہ نے اسے ناپسند کیا[1] اس صورت میں قدرت کی طرف سے ان کی راہ میں زبردست رکاوٹیں ڈالنے ہی کی ہمارے خیال میں بہت پُرزور تعبیر یہ ہے کہ ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھو گھر میں بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ یہ کہا جانا قدرتی اشارہ کے طور پر حکم کُن کی طرح کی چیز ہے مگر تعجب ہے کہ مفسرین نے ''کہہ دیا گیا'' کے معنی میں اختلاف کے ساتھ یہ بحث کر ڈالی ہے کہ یہ کہنے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اس پہلو کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جو ہم نے لکھا ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اگر وہ تم میں شامل ہوکر نکلتے تو تم میں بس خرابیوں میں اضافہ کرتے[2] اور تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے[3] اس کوشش میں کہ تم میں فتنہ وفساد برپا ہو[4] اور تم میں ایسے ہیں جو ان کی خوب سنتے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔''

وہ تو منافقین کا ذکر تھا جو جنگ میں ساتھ نہیں گئے اور اب یہ مسلمانوں کی اس جماعت سے خطاب ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گئی تھی اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ تو ان کے کردار کی مذمت ہے جسے خالق نے ظاہر کیا ہے مگر تمہیں ان کے اپنے ساتھ نہ جانے کا کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ ان کا تمہارے ساتھ جانا تمہارے لئے زحمت کا باعث ہوتا۔ وہ اپنی بے عملی اور سہل انگاری سے تمہارے نظم وضبط میں کمی کا باعث بھی ہوتے اور ادھر کی ادھر کرکے خود آپس ہی میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش بھی کرتے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے''...... اور ایک معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے فرار کی صورت سے بھاگ دوڑ کرتے[5] مگر الفاظ سے پہلے معنی کا تبادر ذہن کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔

آخر میں بتلایا ہے کہ یہ ساتھ جانے والے بھی سب پختہ کار اور صحیح لوگ نہیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ: یعنی تم میں ایسے لوگ ہیں جو ان کی باتوں میں آتے اور ان کے آلۂ کار بنتے ہیں۔[6]

اس طرح وہ اگر میدان جنگ میں جاتے تو وہ اپنی سیسہ کاری سے پوری جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش ہی نہ کرتے بلکہ بہت

[1]۔ فثبطهم الله عن الخروج الذی عزموا علیه ولم یثبطهم عن الخروج الذی امرهم به لان الاول کفر والثانی طاعته (تبیان)

[2]۔ فسادا تخذیل المومنین (جلالین)

[3]۔ اسرعوا بینکم بالمشی بالنمیمة (جلالین)

[4]۔ یطلبون لکم الفتنة بالقاء العداوة (جلالین)

[5]۔ ای هربوا عنکم (علی بن ابرهیم)

[6]۔ سماعون لهم ما یقولون سماع قبول (جلالین)

ممکن ہے وہ کامیاب ہو جاتے۔
اس آیت سے گزشتہ آیت کے مفہوم کی بالکل تشریح ہو جاتی ہے اور اسے تقویت ہوتی ہے جو آخر میں جناب شیخ الطائفہؒ کے حوالہ سے درج کیا گیا ہے۔[1]

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

''وہ پہلے بھی فتنہ پردازی کے خواہاں رہے ہیں اور آپ کے لئے معاملات کو درہم و برہم کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ حق سامنے آ گیا اور اللہ کی بات غالب آ گئی، درصورتیکہ وہ ناپسند کرتے تھے۔''

یہ بظاہر تو کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ جناب شیخ الطائفہؒ نے اس کے تحت میں جنگ احد کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی اپنے ساتھ والوں کی جمعیت کے ساتھ عین موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے الگ ہو کر مدینہ واپس گیا اور اس طرح دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی پست ہمتی کا باعث ہوا۔[2]

دوسرے مفسر اس کے لئے اس خاص موقع کا پتہ نہیں دیتے بلکہ اسے عام بات قرار دیتے ہیں کہ منافقین ہجرت کے بعد شروع ہی میں آپ کو نقصانات پہنچانے کی کوشش کرتے رہے مگر انہیں برابر ناکامی ہوئی۔[3]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

''اور ان میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے چھٹی دیجئے اور مجھے گمراہی میں مبتلا نہ کیجئے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ گمراہی میں وہ خود پڑ ہی چکے ہیں اور بلاشبہ دوزخ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔''

جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے نمونے

کہا جاتا ہے کہ یہ شخص جس کی طرف اشارہ ہے جدّ بن قیس تھا۔ اس نے جنگ تبوک کے لئے جانے سے یہ عجیب عذر کیا کہ مجھ پر جنسی خواہش کا غلبہ ہے اور وہاں روم کی حسین عورتیں سامنے آئیں گی تو میں ضبط نہ کر سکوں گا اور گمراہی میں پڑ جاؤں گا۔[4]

تفسیر علی بن ابراہیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے قبل و بعد کی آیتوں میں سب میں اسی جدّ بن قیس کی باتوں کی رد ہے۔ اسی نے یہ کہا تھا

---

[1] بين الله فى هذه الاية الوجوه فى كراهية انبعاثهم ووجه العلة فى تبشيطهم عن ذٰلك (تبيان)
[2] طلبوا افساد ذات بينكم وافتراق كلمتكم فى يوم احد (تبيان)
[3] من قبل اول ما قدمت المدينة (جلالين)
[4] انى صغرم بالنسآء واخشى ان رأيت نساء بنى الاصفران لا اصبر عنهن فافتتن (جلالين) مرا ببيلا و روم بريد كه جمال روميان ديده مفتون خواهم شد (فتح الرحمن) بہانہ لایا کہ روم کی عورتیں خوبصورت ہیں۔ اس ملک جا کر بدی میں گرفتار ہوں گا۔ (موضح القرآن)

کہ مجھے گمراہی میں مبتلا نہ کیجئے اور اسی نے لوگوں سے کہا تھا کہ اس گرمی میں سفر نہیں کرنا چاہیے اور اسی نے یہ کہا تھا کہ اس جنگ سے زندہ واپس نہیں آ سکتے جس پر اس کے بعد کی آیت اتری کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں صدمہ ہوگا۔

بعض مفسرین نے فتنہ یعنی گمراہی کا مطلب بس یہ لیا ہے کہ ایسا حکم مجھے نہ دیجئے جس کی میں تعمیل نہ کروں، اس طرح گمراہی سے مراد بس یہی عدم تعمیل حکم ہے۔[1]

بہرصورت اس کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے کہ وہ گمراہی میں پڑیں گے کیا؟ نصرت حق میں پہلوتہی کرنے کی گمراہی خود کیا کم ہے جس میں وہ مبتلا ہیں ہی۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ۝۵۰ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝۵۱

''اگر آپ کے لئے کوئی بھلائی ہو تو وہ ان کے لئے رنج کا باعث ہوگی اور اگر آپ پر کوئی مصیبت آ جائے تو وہ کہیں گے کہ (خیر) ہم نے اپنا انتظام پہلے سے کر لیا ہے اور وہ پلٹیں گے اس عالم میں کہ وہ خوش نظر آتے ہوں گے۔ کہہ دیجئے کہ ہرگز ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے، وہ ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

''ہم نے اپنا انتظام پہلے سے کر لیا ہے''...... اس انتظام سے مراد دشمنوں سے کوئی سازش بھی ہو سکتی ہے اور جنگ سے کنارہ کشی بھی۔[2]

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ۝۵۲

''کہہ دیجئے کہ تم ہمارے لئے دو بھلائیوں میں سے ایک کے سوا اور کاہے کا انتظار کر سکتے ہو؟ اور ہمیں تمہارے لئے اس کا انتظار ہے کہ اللہ تمہیں سزا دے، خواہ اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سے تو تم انتظار رکھو، یقین سمجھو کہ ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار میں شریک ہیں۔''

بڑے بلیغ انداز میں تعلیم دی گئی ہے کہ ایک مومن کی ذہنیت کیا ہونا چاہئے اور پھر اس ذیل میں ایمان اور کفر کا جو لازمی انجام ہے، اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] ای لا تو ثمنی بان تکلفنی المشقة فی ذٰلك فارقم بالعصیان (تبیان)

[2] یعنی پنہاں با اعدا موافقت کردہ ایم یا از سفر تخلف نمودہ ایم (فتح الرحمن)

مثل تو یہ مشہور ہے کہ "جنگ دو سر دارد" مگر ایمان اور کفر کی جنگ میں جو بظاہر "دوسر" ہیں، وہ نتیجتاً ایک ہی ہیں۔
جنگ میں "دوسر" کیا ہوتے ہیں؟ فتح وشکست نا؟ اور کسی ایک انسان کے لحاظ سے زندگی اور موت ہی نا؟ ان کے علاوہ تو تیسری شق کوئی نہیں ہے؟ لیکن یہ اگر مومن ہے اور حق کی خاطر جہاد کر رہا ہے تو فتح پائے تو اور شکست کھائے تو فتح پا کر زندہ واپس جائے تو، اور قتل ہو کر وہیں کام آجائے تو، بہر حال وہ کامیاب ہے یعنی اس کا انجام بخیر ہے لہٰذا بہر صورت دو بھلائیوں میں کی ایک اسے ملنا ضروری ہے۔
اور جو کفر کے راستے پر چل رہے ہیں، وہاں بھی وہ دونوں "سر" نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ اگر انہوں نے جنگ میں فتح پائی یعنی زندہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر میں "انہیں کسی حادثۂ ارضی وسماوی کا شکار ہونا پڑے گا جس سے خدا انہیں ان کے کفر ومعصیت کی دنیا میں بھی سزا دے لے گا اور پھر آخرت میں جو سزا ہوگی، وہ تو ہے ہی اور اگر مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مومنین کے ہاتھ سے انہیں دنیا میں سزا دلوائی اور پھر آخرت کی سزا اس سے الگ رہی۔
غرض اہل حق کے لئے نتیجہ میں کسی برائی کا تصور نہیں ہو سکتا اور اہل باطل کے لئے نتیجہ میں کسی بھلائی کا امکان نہیں۔ اگر یہ چیز پیش نظر رہے تو کسی صاحب ایمان پر مایوسی طاری ہونے کا کہیں امکان ہے؟ یعنی اگر انسان کا ضمیر مطمئن ہو تو اسے یہ غور کرنا ہے ہی نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ اسے سوا کامیابی وکامرانی کے کسی دوسرے تصور کی گنجائش ہی نہیں۔ اسی کو حضرت علی بن ابی طالبؑ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے کہ:
فَاِنَّ الْمَرْءَ الْمُسْلِمَ مَا لَمْ يَغْشَ دَنَاءَةً تَظْهَرُ فَيَخْشَعُ لَهَا اِذَا ذُكِرَتْ، وَيُغْرَى بِهَا لِئَامُ النَّاسِ، كَانَ كَالْفَالِجِ الْيَاسِرِ شة الَّذِى يَنْتَظِرُ أَوَّلَ فَوْزَةٍ مِنْ قِدَاحِهِ تُوجِبُ لَهُ الْمَغْنَمَ، وَيُرْفَعُ عَنْهُ بِهَا الْمَغْرَمُ. وَ كَذٰلِكَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ الْبَرِىءُ مِنَ الْخِيَانَةِ يَنْتَظِرُ مِنَ اللهِ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ: اِمَّا دَاعِيَ اللهِ فَمَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ لَهُ، وَاِمَّا رِزْقَ اللهِ فَاِذَا هُوَ ذُو أَهْلٍ وَمَالٍ، وَمَعَهُ دِينُهُ وَحَسَبُهُ. (نہج البلاغہ مطبوعۂ مصر ص ٦٧ و ٦٨)
جب تک کوئی مرد مسلمان کسی ایسی ذلیل حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا کہ جو ظاہر ہو جائے تو اس کے تذکرہ سے اس کی آنکھیں نیچی ہو جائیں اور جس سے ذلیل آدمیوں کی جرأت بڑھے وہ اس کامیاب جواری کے مانند ہے جو جوئے کے تیروں کا پانسہ پھینک کر پہلے مرحلہ پر ہی ایسی جیت کا متوقع ہوتا ہے جس سے اسے فائدہ حاصل ہو اور پہلے نقصان ہو بھی چکا ہے تو وہ دور ہو جائے، اسی طرح وہ مسلمان جو بد دیانتی سے پاک دامن ہو، دو اچھائیوں میں سے ایک کا منتظر رہتا ہے، یا اللہ کی طرف سے بلاوا آئے تو اس شکل میں اللہ کے یہاں کی نعمتیں ہی اس کے لئے بہترین ہیں اور یا اللہ کی طرف سے دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں تو اس صورت میں اس کے مال بھی ہے اور اولاد بھی اور پھر اس کا دین اور عزت نفس بھی برقرار ہے۔ (ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب مطبوعہ لاہور بار اوّل جلد اوّل، ص ۱۳۹)

قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا لَّنۡ يُّتَقَبَّلَ مِنۡكُمۡ ؕ اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ۵۳

"کہہ دیجئے کہ تم بخوشی یا بناخوشی کتنی ہی خیرات کرو، تم سے ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ یقیناً تم بداعمال لوگ ہو۔"

کہا جاتا ہے کہ اسی جد بن قیس نے (جس کا ذکر چار آیتوں کے پہلے آیت ۴۹: "وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّىۡ وَلَا تَفۡتِنِّىۡ" کے تحت میں آچکا ہے) ساتھ چلنے میں اپنی شہوانی کمزوری کی بنا پر معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں مال سے مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، یہ

اسی کا جواب ہے۔[1]

وَمَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوۡلِهٖ وَلَا يَاۡتُوۡنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمۡ كُسَالٰى وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ﴿۵۴﴾

''اور کون سی چیز مانع ہے اس سے کہ ان کی خیرات ان سے قبول ہو سوا اس کے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر اختیار کیا ہے اور نماز کی طرف نہیں آتے مگر الکساتے ہوئے اور خیرات نہیں کرتے مگر اس حالت میں کہ دل سے اسے پسند نہیں کرتے۔''

شرط قبول اعمال ایمان ہے۔ ان میں ایمان جو شرط صحت عمل ہے مفقود ہے۔ اس کا مرکزی اظہار تو اسی جملہ سے ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں لیکن اگر وہ کھلے ہوئے کافر ہوتے تو اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ اس کے لئے آثار وقرائن کی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ ہیں وہ منافق یعنی زبان سے ایمان کا ادعاء رکھنے والے لہٰذا صرف انہیں کافر کہہ دینے پر اکتفاء نہیں کی جاتی بلکہ دل سے ان کے ایمان نہ رکھنے کے شواہد بیان کئے جاتے ہیں کہ جو مؤمن ہیں، وہ تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کیلئے بڑے ذوق وشوق سے آتے ہوں گے لیکن یہ لوگ چونکہ دل سے تو ذوق اطاعت رکھتے نہیں، اس لئے شتم پشتم بڑے الکساتے ہوئے نماز میں آتے ہیں اور خیرات بھی رغبت اور شوق کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ دکھاوے کی خاطر مصالح پر نظر کر کے بادل ناخواستہ خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا مال بیکار جا رہا ہے۔[2]

فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ﴿۵۵﴾

''تو تمہیں ان کے مال اور اولاد خوش آئند نہ معلوم ہوں[3] اس سے اللہ بس یہ چاہتا ہے کہ انہیں اس دنیاوی زندگی میں سزا دے اور کشاں کشاں ان کی جانیں نکلیں[4] اس عالم میں کہ وہ کافر ہیں۔''

یعنی کافروں کے لئے دنیوی مال ودولت وغیرہ اکثر عذاب کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے ان کے معاصی میں اور اضافہ ہوتا ہے اور وہ دنیا سے جاتے وقت پورے پورے عذابِ آخرت کے مستحق ہو کر جاتے ہیں۔[5]

وَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمۡ لَمِنۡكُمۡ ؕ وَمَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلٰـكِنَّهُمۡ قَوۡمٌ يَّفۡرَقُوۡنَ﴿۵۶﴾ لَوۡ

---

[1]۔ وہ جو مدد خرچ دینے لگا تھا، سو جواب ملا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں (موضح القرآن)

[2]۔ لانّهم يعدونها مغرما. (جلالین)

[3]۔ ای لا تستحسن نعمتنا عليهم فهی استدراج (جلالین)

[4]۔ الزهق الخروج بصعوبة (تبیان)

[5]۔ فيعذبهم فی الأخرة اشد العذاب (جلالین)

يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

"اور وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے ہیں نہیں مگر وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پا جائیں یا غار یا کوئی داخل ہونے کی جگہ تو وہ بگ ٹٹ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گئے۔"

جموح کا لفظ سواری کی سرکشی کے لئے آتا ہے چنانچہ شاہ رفیع الدین نے **یجمعون** کے لفظ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "پھر جائیں طرف اس کے اور وہ سرکشی کرتے ہوں۔" اس کے برخلاف ان کے والد شاہ ولی اللہ نے اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ "متوجہ شوند بآن شاب کنان۔" یہ جلالین کے اتباع میں ہے جنہوں نے لکھا ہے:

یسرّعون فی دخوله والانصراف عنکم اسراعا لا یردّہ شئ کالفرس الجموح.

اس کے اندر جانے اور تم سے منحرف ہونے میں بہت زیادہ تیزی کرتے ہیں جس سے کوئی چیز روک نہیں سکتی جیسے سرکش گھوڑا۔

ہم نے جو ترجمہ "بگ ٹٹ" کے لفظ کے ساتھ کیا ہے، وہ غالباً دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ "وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں"......یعنی ان کے دلوں میں کفر و عناد چھپا ہے، اس کے اظہار سے وہ ڈرتے ہیں لہٰذا ظاہر داری سے کام لے کر تمہاری دوستی کی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ [ا]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

"اور ان میں سے کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو اموال زکوٰۃ کے بارے میں آپ پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اگر انہیں اس میں سے مل جائے تو وہ راضی رہیں گے اور انہیں اس میں نہ دیا گیا تو وہ ایک دم ناراض ہو جاتے ہیں اور کاش وہ راضی رہتے اس پر کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر نے انہیں دیا ہے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ وہ عنقریب ہمیں اپنے فضل و کرم سے عطا کرے گا اور اس کا پیغمبر بلا شبہ ہم اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں۔"

یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں دو دفعہ عطا کی نسبت اللہ کے ساتھ ساتھ اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دی گئی ہے تو پھر معلوم نہیں کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کو مانتے ہوئے بحیثیت وسیلہ یہ کہے کہ اس کا رسول یا اس کا ولی ہماری مدد کرے گا ہمیں مالا مال کر دے گا، ہمیں اولاد عطا کرے گا تو اس پر کچھ مسلمان کیوں "شرک" "شرک" کی آواز بلند کرتے ہیں؟!

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ

[ا] یفرقون من اظهار الکفر (تبیان)

عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝٦٠

”اموال زکوٰۃ کا استحقاق تو بس فقیروں اور محتاجوں کو ہے اور انہیں کہ جو زکوٰۃ کے کارندے ہوں اور مؤلفۃ القلوب کو اور گلو خلاصی میں غلاموں کنیزوں کی اور قرض داروں کو اور راہ خدا میں اور مسافروں کو۔ یہ لازمی قانون ہے اللہ کی طرف کا اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

مستحقین زکوٰۃ کا بیان

تمام مستحقین زکوٰۃ جماعت اہل اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر...... درمیان میں ایک صنف مؤلفۃ القلوب کی ہے۔ یہ وہ غیر مسلم اور خام کار نو مسلم [1] ہیں جنہیں مدد دینا اسلامی ہمدردی اور اخلاق کے اثر کو ان کے دل پر قائم کر کے انہیں محاسن اسلامی پر غور کرنے کی ایک طرح سے دعوت دینا ہے۔ مؤلفۃ القلوب کے علاوہ دوسرے اقسام میں یہ شرط کہ صحیح العقیدہ مسلمان ہوں، قرآن میں مذکور نہیں ہے بلکہ سنت سے ثابت ہے۔ نیز یہ کہ غیر سادات کی زکوٰۃ سادات پر حرام ہے۔ [2]

وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ؕ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝٦١

”اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو پیغمبر کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہیں، کہیے کہ تمہارے لئے بہتری کا کان جو اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہے اور مسلمانوں کی بات کو باور کر لیتا ہے اور (اللہ کی) مہربانی ان کے لئے جو تم میں سے ایمان رکھتے ہوں اور جو پیغمبر خدا کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

پیغمبر خدا ﷺ کا حسن خلق یہ تھا کہ آپ ہر ایک کی بات سن لیتے تھے اور اس پر چپ رہتے تھے جیسے کہ وہ اسے باور کر رہے ہیں۔ اس پر منافقین کہنے لگے کہ یہ تو بس کان ہیں یعنی ہر ایک کی سن لینا ہی ان کا کام ہے۔ [3]

اس پر ارشاد قدرت ہوا کہ یہ تو تمہارے لئے بڑی اچھی بات ہے۔ اس پر شکوہ کیسا!

يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ لِيُرۡضُوۡكُمۡ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ يُّرۡضُوۡهُ اِنۡ كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ۝٦٢

”وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تمہیں خوش کریں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس کا زیادہ حقدار ہے

[1] یعنی ضعیف اسلام (فتح الرحمن)

[2] بینت السنة ان شرط المعطی منها الاسلام وان لا یکون ھاشمیا و مطلبیا (جلالین)

[3] یعنی ھرچه کسی بگوید قبول می کند (فتح الرحمن)

کہ وہ اسے خوش کریں اگر وہ ایمان لائے ہوئے ہوں۔"

اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّهٗ مَنۡ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيۡهَا ؕ ذٰلِكَ الۡخِزۡىُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۶۳﴾

"کیا انہیں نہیں معلوم کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے مخالفت کرے گا تو بلا شبہ اس کے لئے دوزخ کی آگ ہوگی جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔"

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کفار و مشرکین کا ذکر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں سے ان افراد کا ذکر ہے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کریں۔[1] اس سے ظاہر ہے کہ مخلد فی النار ہونا کفار و مشرکین سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ظاہری اسلام لانے والوں میں بھی جو نص خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ مانیں وہ اس زد میں آتے ہیں۔

يَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَيۡهِمۡ سُوۡرَةٌ تُنَبِّئُهُمۡ بِمَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ قُلِ اسۡتَهۡزِءُوۡا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخۡرِجٌ مَّا تَحۡذَرُوۡنَ ﴿۶۴﴾

"منافق لوگ ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی سورہ ایسا نہ اتر آئے کہ جو انہیں بتلا دے وہ جو ان کے دلوں میں ہے۔ کہیے کہ اڑاؤ مذاق، یقیناً اللہ برآمد کرے گا اسے جس سے تم ڈرتے ہو۔"

منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر "یعنی مسلمانوں پر[2] " کوئی سورہ ایسا نہ اتر آئے جو انہیں بتلا دے وہ جو ان کے "یعنی منافقین کے دلوں میں ہے۔[3] یہ ڈرنا اگر حقیقتاً ہوتا تو وہ تو اللہ اور رسالت دونوں پر ایمان کا نتیجہ ہوتا مگر یہ تو منافق ہیں لہٰذا انہیں واقعاً یہ ڈر کیوں کر ہو سکتا ہے بلکہ یہ بطور تمسخر اس ڈر کا اظہار ہے یعنی وہ آپس میں مذاق اڑانے کے طور پر کہتے ہیں کہ ارے بھئی! ایسی باتیں نہ کرو، کہیں کوئی سورہ ان پر اتر نہ آئے جو انہیں ان باتوں کی اطلاع دے دے، اس لئے قرآن نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اڑاؤ مذاق۔ یہ تمہارا خوف جسے تم بطور تمسخر ظاہر کرتے ہو حقیقت کا لباس پہن کر رہے گا۔ ہماری قدیم تفسیر اس کے مطابق ہے۔[4]

بعض مفسرین نے اس پہلو کو نہ سمجھ کر اس جواب کو مرتبط بنانے کے لئے ایک فقرہ کو محذوف مانا ہے کہ وہ ڈرتے تو ہیں اس بات سے اور

---

[1] ۔علیٰ وجه التهديد والتقريع والتوبيخ لهؤلآء المنافقين (تبیان)

[2] ۔عليهم ای المؤمنين (جلالین)

[3] ۔خبر دهد ایشاں را بانچه در دل منافقان است (شاه ولی الله)

[4] ۔كان قوم من المنافقين لما خرج رسول الله ﷺ الی تبوك كانوا يتحلقون فيما بينهم ويقولون لو يرئ محمد ان حرب الروم مثل حرب غيرهم لا يرجع منهم احد ابدا فقال بعضهم اخاف ان يخبر الله محمدا بما كنا فيه وبما فی قلوبنا وينزل عليه بهٰذا قرانا يقرأ على الناس وقالوا هٰذا علیٰ حد الاستهزاء (علی بن ابراهيم)

پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں [1] اس پر کہا گیا کہ کہہ دیجئے کہ خوب مذاق اڑاؤ، اللہ ان باتوں کو ظاہر کر کے رہے گا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اور اگر ان سے پوچھئے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو بحث کر رہے تھے اور تفریح کر رہے تھے، کہئے کہ کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے پیغمبر کے ساتھ تم تمسخر کر رہے تھے۔''

بعض لوگ کسی غلط بات کی اہمیت کو مذاق کہہ کر گھٹانا چاہتے ہیں حالانکہ جس کی عظمت نظر میں ہو اس کے ساتھ بطور مذاق بھی انسان کوئی گستاخی نہیں کر سکتا۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾

''عذر خواہی نہ کرو، تم مسلمان ہونے [2] کے بعد کافر ہو چکے ہو۔ اگر تم میں سے ایک گروہ سے ہم درگزر بھی کریں تو دوسرے گروہ کو سزا دیں گے اس بنا پر کہ وہ گنہگار تھے۔''

''عذر خواہی نہ کرو'' یعنی ایسی عذر خواہی جو صدق دل سے نہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

''ایک گروہ سے درگزر کریں تو دوسروں کو سزا دیں گے'' یہ تفریق بلاوجہ نہ ہوگی بلکہ وہ چند آدمی پہلے گروہ والے وہ ہوں گے جنہوں نے صدق دل سے توبہ کی [3] اور جنہیں سزا دی جائے گی، وہ ہیں جو آخر تک اپنے نفاق اور مخالفت پر قائم رہے [4] اور اسی لئے آخر میں کہا گیا:۔ ''بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ'' اس بنا پر کہ وہ گنہگار تھے۔ [5] اس سے ظاہر ہے کہ وہ جنہیں معاف کر دیا گیا، وہ ہیں جو توبہ کی وجہ سے گنہگار کی صف سے باہر نکل گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تین آدمیوں کا ذکر جو قرآن میں کیا گیا ہے (وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا)۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ پوری جماعت تین ہی آدمیوں کی تھی بلکہ یہ تین آدمی وہ ہیں جن کی توبہ قبول ہوئی اور ان کے علاوہ کتنے وہ تھے جو اپنے نفاق پر قائم و برقرار رہے۔ ان کی تعداد کہیں قرآن میں مذکور نہیں ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

---

[1] وهم مع ذلك يستهزأون (جلالين)

[2] یعنی ایمان زبانی خود (فتح الرحمن)

[3] باخلاصها وتوبتها بخشي بن حمب بضم الحاء وفتح الميم وسكون الباء (جلالين)

[4] معناه انهم كانوا مجرمين مصرين على النفاق (جلالين)

[5] معناه انه انما يعذب الطائفة التي يعذبها لكونها مجرمة مذنبة مرتكبة لما يستحق به العقاب (تبيان)

الۡمَعۡرُوۡفِ وَيَقۡبِضُوۡنَ اَيۡدِيَهُمۡ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمۡ ؕ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ هُمُ
الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ
فِيۡهَا ؕ هِىَ حَسۡبُهُمۡ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ۙ﴿۶۸﴾

”منافق مرد اور منافق عورتیں۔ سب ایک تھالی کے چٹے بٹے ہیں [۱] برائیوں کی تحریک کرتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انہیں بھلاوے میں ڈال دیا [۲] بلاشبہ منافق لوگ فاسق ہیں۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے منافق مردوں، منافق عورتوں اور تمام کافروں سے آتش دوزخ کا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ ان کے واسطے کافی ہے، اور اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لئے رہنے والا عذاب ہے۔“

”اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں“ یعنی راہ خدا میں خیرات سے ہاتھ روکے رہتے ہیں۔ [۳]

كَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ كَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡكُمۡ قُوَّةً وَّاَكۡثَرَ اَمۡوَالًا وَّاَوۡلَادًا ؕ
فَاسۡتَمۡتَعُوۡا بِخَلَاقِهِمۡ فَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِخَلَاقِكُمۡ كَمَا اسۡتَمۡتَعَ الَّذِيۡنَ مِنۡ
قَبۡلِكُمۡ بِخَلَاقِهِمۡ وَخُضۡتُمۡ كَالَّذِىۡ خَاضُوۡا ؕ اُولٰۤـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى
الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۶۹﴾

”ان لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے، تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ تھے تو وہ اپنے نصیب سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد تم بھی اپنے نصیب سے ویسے ہی بہرہ اندوز ہوئے جیسے وہ کہ جو تم سے پہلے تھے اپنے نصیب سے بہرہ ور ہوئے اور تم بھی ویسے ہی مہملات میں پڑے جیسے وہ پڑے تھے [۴] یہ وہ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہوئے اور یہی لوگ گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔“

اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۙ وَقَوۡمِ اِبۡرٰهِيۡمَ
وَاَصۡحٰبِ مَدۡيَنَ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتِ ؕ اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ

---

[۱] ۔ المعنى ان بعضهم يضاف الى بعض بالاجتماع على النفاق كما يقول القائل لغيره انت منى وانا منك والمعنى ان امرنا واحد لا ينفصل (تبيان)

[۲] ۔ تركهم من لطفه (جلالين)

[۳] ۔ اى يمسكون اموالهم عن انفاقها فى طاعه الله ومرضاته (تبيان)

[۴] ۔ خضتم فى الباطل والكذب على الله (تبيان)

لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۷۰

''کیا انہیں نہیں پہنچی خبران لوگوں کی جو ان کے پہلے تھے، نوحؑ کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیمؑ کی قوم اور مدین والے اور مؤتفکات والے۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے[1] لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتے تھے۔''

''مؤتفکات'' سے مراد قوم لوط کی بستیاں ہیں، چونکہ وہ تین تھیں، اس لئے یہاں انہیں بصورت جمع لایا گیا ہے اور دوسری جگہ سورۂ نجم میں ان سب کو ایک کر کے اس طرح کیا گیا ہے کہ ''وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى''۔ بہر صورت کہا گیا ہے کہ ان بستیوں کو اس لفظ سے ان کے انجام کے لحاظ سے یاد کیا گیا ہے کہ ان پر عذاب نازل کیا گیا تو انہیں الٹ دیا گیا۔[2]

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝۷۱ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝۷۲

''اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ وہ نیک باتوں کی تحریک کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت اتارے گا، یقیناً اللہ زبردست ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔ اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں سے وعدہ کیا ہے ان بہشتوں کا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک و پاکیزہ مکانات کا ہمیشہ رہنے والے بہشتوں میں اور اللہ کی طرف کی ذرا بھی خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے، یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔''

سابق میں جو اوصاف اور ان کے نتائج نفاق رکھنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے بیان ہوئے تھے ان کے بالمقابل اوصاف اور نتائج اب صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کے لئے بیان ہو رہے ہیں۔ ''مومنین اور مومنات آپس میں ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہیں'' یعنی انہیں آپس میں ہمدم و ہم قدم ہونا چاہیے اور اتحاد و عمل سے کام لینا چاہیے۔ یہی ان کی ایمانی وحدت کا تقاضا ہے۔[3]

---

[1] بالبینات بالمعجزات (جلالین)

[2] قریٰ قوم لوط ای اھلھا (جلالین) قال الزجاج معناہ ائتفکت باھلھا انقلبت (تبیان)

[3] ای یلزم کل واحد منھم نصرة صاحبه (تبیان)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ وَاغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ‌ ؕ وَمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ‌ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۝٧٣

"اے پیغمبر! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔"

کفار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کا حکم

یہاں صاف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار اور منافقین سے جہاد کا حکم ہوا ہے اور دونوں ایک ہی لفظ سے ہیں۔ اس لئے اس میں یہ تفریق کہ وہ پہلا جہاد تلوار والا ہے اور دوسرا زبان سے [1] بالکل "ایجاد بندہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن میں ذرا بھی یہ تفریق نہیں ہے۔

مگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی مدت حیات میں جتنے جہادوں کا موقع ملا وہ سب کفار کے مقابلہ میں تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی نے اتنی وفا نہیں کی کہ وہ دوسرے جزء کی تکمیل فرما سکیں۔ اس لئے لازماً ضرورت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد خود اپنے کسی ایسے جانشین کو چھوڑ جائیں جو آپ کے باقی کام کی تکمیل کرے۔ اس لئے کہ کوئی بعد میں بطور خود جانشین بن جائے یا دوسرے لوگ بنا دیں تو وہ اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس کے فعل سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری پوری نہیں ہوتی۔ ہاں وہ جانشین اگر بحکم خدا خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقرر کیا ہوا ہے تو جو کچھ وہ کرے، اس کے ذمہ دار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھے جا سکتے ہیں۔ اب جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے جزء کی تکمیل فرمائی اس ظرف زمانہ کے لحاظ سے، اسی طرح اگر ان کے بعد والا جانشین اپنے ظرف زمانہ کے مطابق صرف دوسرے جز کی تکمیل کرتا ہوا نظر آئے جو تتمۂ فعل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے تو اس کے دور پر یہ اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے پہلے جز پر کیوں عمل نہ کیا یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنے دور میں کافروں سے کوئی جہاد کیوں نہ کیا جب کہ تقسیم عمل کے طور پر تقدیر الٰہی نے ایک فریضہ کے دو جز دو زندگیوں میں تقسیم کر دیئے تھے تو اب دونوں کو ملا ہی کر دیکھنا درست ہوگا۔ جس طرح پہلے جز کے وقت دوسرے جز کو ڈھونڈھنا غلط ہے اسی طرح دوسرے جز کے ہنگام میں پہلے جز کو تلاش کرنا اصولاً بالکل غلط ہوگا۔

یہی تقسیم عمل ہے جسے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متفق علیہ حدیث میں حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو مخاطب کر کے ظاہر فرمایا تھا کہ:

انك تقاتل علیٰ تأویل القرآن كما قاتلت علیٰ تنزیله.

(اے علیؑ) تم تاویل قرآن پر جنگ کرو گے جس طرح میں نے اس کی تنزیل پر جنگ کی۔

ظاہر ہے کہ تنزیل قرآن کے منکر کافر تھے اور تاویل قرآن کے منکر یعنی صحیح مفہوم کے بجائے غلط مفہوم تراشنے والے تنزیل قرآن کو بظاہر ماننے والے ہوں گے لہٰذا وہ منافقین ہوں گے اور ان سے جنگ کرنا حضرت علی علیہ السلام کی ذمہ داری ہے۔

يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوۡا ؕ وَلَقَدۡ قَالُوۡا كَلِمَةَ الۡكُفۡرِ وَكَفَرُوۡا بَعۡدَ اِسۡلَامِهِمۡ وَهَمُّوۡا بِمَا لَمۡ يَنَالُوۡا‌ ۚ وَمَا نَقَمُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ اَغۡنٰٮهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ ۚ فَاِنۡ يَّتُوۡبُوۡا يَكُ خَيۡرًا لَّهُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ يَّتَوَلَّوۡا يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ فِى الدُّنۡيَا

[1] الکفار بالسیف والمنافقین باللسان والحجة (جلالین)

وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

''وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کہا کفر کا کلمہ اور اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے اور ایسے منصوبے بنائے جن میں کامیاب نہیں ہوئے اور کوئی بات ایسی نہیں جس سے وہ ناراض ہوں سوا اس کے کہ اللہ اور پیغمبر نے انہیں اپنے فضل و کرم سے مالدار بنایا۔ اب اگر وہ توبہ کر لیں تو انہی کے لئے بہتر ہے اور اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں اللہ دنیا و آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور روئے زمین پر ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔''

''کوئی بات ایسی نہیں جس سے وہ ناراض ہوں سوا اس کے'' یہ جملہ معانی و بیان کے لحاظ سے ایک صنعت کے قبیل سے ہے جسے ''تاکید المدح بما یشبہ الذم'' کہتے ہیں یعنی تعریف میں زور پیدا کرنا ایسے انداز میں جو مشابہ مذمت کے ہو' اس کی مثال عربی میں شاعر کا یہ شعر ہے:

و لا عیب فیہم غیر انّ سیوفہم
بہن فلول من قراع الکتائب

''ان میں کوئی عیب نہیں ہے سوا اس کے کہ ان کی تلواریں جا بجا گر گئی ہیں افواج سے جنگ میں۔''

عرب نقطۂ نظر سے مسلسل جنگ آزمائی و شمشیر زنی کوئی عیب نہیں، بلکہ بڑا ہنر ہے۔ یہ کہنا کہ سوا اس کے کوئی عیب نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ عیب ڈھونڈھا بھی جائے تو ہنر ہی ملے گا۔ نتیجہ یہی ہے کہ ان میں قطعاً کوئی عیب نہیں ہے۔

اسی طرح یہاں قرآن کا جملہ ہے کہ ''وہ ان کی کسی بات سے ناراض نہیں سوا اس کے کہ اللہ اور رسول ﷺ نے ان کو دولت مند بنا دیا'' ......ظاہر ہے کہ یہ ناراضگی کی بات نہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ناراضگی رسول ﷺ سے قطعاً حق بجانب نہیں ہے اور ہرگز کوئی وجہ ناراضگی کی ان کے لئے رسول ﷺ سے عقلی طور پر نہیں ہے۔ اس آیت پر نظر کر کے پھر یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مالدار بنانے کی نسبت اللہ کے ساتھ رسول ﷺ کی طرف دے رہا ہے۔[۱] حالانکہ اصل فاعل خداوند عالم ہے لیکن یہی وہ چیز ہے جس کے کسی مسلمان کی زبان پر آنے سے ایک طبقہ ''شرک'' ''شرک'' کی آوازیں بلند کرنے لگتا ہے جو از روئے قرآن مجید صحیح نہیں ہے۔ ''جو منصوبہ ان منافقین نے بنایا تھا، اس میں کامیاب نہیں ہوئے'' ......یہ منصوبہ رسول خدا ﷺ کو شہید کرنے کا تھا، اس موقع پر جب آپ تبوک سے واپس ہو رہے تھے۔[۲]

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَ

[۱]۔ تو گر ساخت ایشان را خدا و رسول او (شاہ ولی اللہ) دولت مند کیا ان کو اللہ نے اور رسول اس کے نے (شاہ رفیع الدین)

[۲]۔ ھموا مالم ینالوا من الفتك بالنبی ﷺ لیلة العقبة عند عوده من تبوك (جلالین)

عَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿٧٧﴾

''اوران میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ اپنے فضل وکرم سے ہمیں عطا کرے تو ہم خیرات کریں گے اور نیک اعمال بجالانے والوں میں سے ہوں گے تو جب اللہ نے انہیں اپنے فضل وکرم سے دیا تو انہوں نے اس کے ساتھ بخل کیا اور بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے روگردانی سے کام لیا تو اللہ نے ان کا انجام یہ کیا کہ ان کے دلوں میں نفاق رہ گیا[۱] اس دن تک کے لئے کہ جب تک وہ اسے منہ دکھائیں گے، اس سزا میں کہ انہوں نے خلف وعد کیا اللہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

مفسرین اس ذیل میں ایک ہی آدمی کا نام لیتے ہیں اور اس کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ میرے لئے وسعت رزق کی دعا فرمائیں چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور اس کے مال ودولت میں فراوانی ہوئی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے نماز جماعت میں آنا چھوڑ دیا اور زکوٰۃ بند کردی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں زکوٰۃ لے کر آیا مگر آپ نے اس کے قبول کرنے سے انکار فرمادیا۔ پھر وہ خلیفۂ اول کے دور میں آیا۔ انہوں نے بھی اس کی زکوٰۃ نہیں لی یہاں تک کہ انہی کے دور میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس شخص کا نام ثعلبہ بن حاطب تھا۔ حالانکہ الفاظ قرآن مجید میں جمع کے صیغے صرف ہوئے ہیں۔ اس نظیر کو سامنے رکھئے تو آیۂ ولایت میں یہ سوال پیدا نہیں ہوگا کہ الفاظ قرآن مجید میں جمع کے ہیں: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت خاص حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿٧٨﴾

''کیا انہیں نہیں معلوم کہ اللہ جانتا ہے ان کی خفیہ باتیں اور ان کی سرگوشیاں اور یہ کہ اللہ غیب کی باتوں کا بہت بڑا جاننے والا ہے۔''

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾

''وہ لوگ جو نکتہ چینی کرتے ہیں خیرات کے بارے میں ایسے مومنین پر جو اپنی خوشی سے خیرات کرتے ہیں[۲] اور جو اپنی محنت مزدوری کے سوا اور کچھ رکھتے ہی نہیں[۳] تو ان کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ خود ان کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔''

ایک غریب اگر اپنی حسب حیثیت تھوڑا سا راہ خدا میں دیتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وقعت اس کی پیش خدا اس بڑی رقم سے زیادہ ہو جو کوئی

---

[۱] ۔صیر عاقبتهم نفاقا ثابتا فی قلوبهم (جلالین)

[۲] ۔معناه المتنفلین من طاعة الله بما لیس بواجب.(تبیان)

[۳] ۔یعنی بمزدوری چیزی پیدا می کنند و صدقه می دهند.(فتح الرحمن)

امیر دیتا ہے مگر دنیا والے رقم کی کمی پر نظر کرتے ہوئے اس غریب کی پیش کش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور بسا اوقات اس پر طعن و تشنیع کرتے اور تمسخر کرتے ہیں جس پر قرآن نے اتنے سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

''آپ ان کے لئے دعائے مغفرت کیجئے یا ان کے لئے دعائے مغفرت نہ کیجئے۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی[1] ان کے لئے دعائے مغفرت کیجئے تو اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ کفر اختیار کیا ہے اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔''

کفر کی بنیاد پر یہ بتانا کہ ''آپ استغفار کیجئے ان کے لئے یا نہ کیجئے، یکساں ہے'' اس کا ثبوت ہے کہ دوسرے گنہگاروں کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استغفار سودمند ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''یہاں سے فرق نکلتا ہے بے اعتقاد کا اور گنہگار کا۔ گناہ ایسا کون سا ہے کہ پیغمبر کی بخشائی سے نہ بخشا جائے اور بے اعتقاد کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ستر مرتبہ استغفار فائدہ نہ کرے۔ اب جو بے اعتقاد لوگ بھروسہ کریں پیغمبر کی سفارش پر کس دلیل سے مثلاً آدمی سے بدی ہو یا نماز وروزہ نہ ہو اور وہ شرمندہ ہے اور نادم ہے تو وہ گنہگار ہے اور جو کوئی بد کام کو عیب نہ جانے اور فرض خدا کو کرنا، نہ کرنا برابری سمجھے اور کرنے والوں کو طعن کرے، وہ بے اعتقاد ہے'' (موضح القرآن)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

''جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، وہ پیغمبر خدا کے پیچھے گھروں میں بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہوں نے ناپسند کیا اسے کہ وہ اپنے مال اور جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کہا کہ گرمی میں سفر نہ کرو، کہہ دیجئے کہ دوزخ کی آگ زیادہ گرم ہے، کاش وہ سمجھ سے کام لیں۔''

''خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ'' کے معنی جو ہم نے کئے ''پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے'' یہ ترجمہ ایک تفسیر کے مطابق ہے[2] لیکن دوسری تفسیر کی بنا پر اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ ''جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، وہ پیغمبر خدا کی مخالفت میں بیٹھے رہنے پر خوش ہیں''۔[3]

---

[1]۔ المراد به المبالغة لا العدد الخصوص (تبیان)

[2]۔ ای بعد رسول اللہ (جلالین) پیچھے رسول اللہ کے (شاہ رفیع الدین)

[3]۔ قال ابو عبیدة بعد رسول اللہ... وقال غیره معناه المصدر من قولك خالف خلافا (تبیان)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

''تو انہیں ہنسنا کم چاہیے اور انہیں رونا زیادہ چاہیے، سزا میں اس کی جو وہ کرتے رہے ہیں۔''

یعنی دنیا میں ان کی خوشی بے بنیاد ہے۔ اگر یہ انجام سے واقف ہوں کہ آخرت میں ان کے لئے کیا ہونے والا ہے تو ان کی ہنسی سب ختم ہوجائے گی۔ بعض وقت صحیح باتوں کیلئے دلیل غلط پیش کی جاتی ہے۔ اس کا بہت بڑا نمونہ یہ ہے کہ جو بہت چلا ہوا ہے کہ عزائے امام حسینؑ میں گریہ کے ثبوت میں اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ آیت منافقین و کفار کے بارے میں ہے اور جو کہا جا رہا ہے وہ بداعمالی کی سزا کے طور پر ہے۔ اس کا اہل ایمان سے نعوذ باللہ ربط ہی کیا ہوسکتا ہے؟ ایک مفہوم آیت کا یہ کہا گیا ہے کہ ان کی ہنسی کا زمانہ بہت کم ہے یعنی اس دنیا کی مختصر عمر اور انہیں رونا بہت پڑے گا سزائے اخروی سے جس کی مدت بے حد طولانی ہے۔[1]

اس کے بعد اور بھی اس کا تعلق محل استدلال سے ختم ہوجاتا ہے۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

''اب اگر اللہ آپ کو واپس لائے ان میں کی ایک جماعت کی طرف اور آپ سے اجازت نکلنے کی مانگیں تو کہہ دیجئے کہ تم اب میرے ساتھ کبھی نہیں نکل سکتے اور میرے ساتھ کسی دشمن کے مقابلہ میں کبھی تم جنگ نہیں کر سکتے۔ تم تو پہلی ہی مرتبہ گھر بیٹھنے پر راضی ہوئے تو اب بیٹھو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔''

جنگ تبوک میں تو موسم بھی بڑا سخت تھا اور مقابلہ بھی بظاہر زبردست دشمن یعنی سلطنت روم تھا مگر اب کسی اور دفعہ جب سازگار حالات میں کوئی مہم درپیش ہوگی تو یہی لوگ جو اس وقت حیلے بہانے کر کے ساتھ جانے سے باز رہے، مال غنیمت کی توقع میں[2] آ آ کر اپنی خدمات کو پیش کریں گے تو قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد اب صاف انکار کر دیجئے گا کہ اس دفعہ جب تم نے جہاد سے کنارہ کشی کی تو اب کبھی تمہیں اس سعادت سے بہرہ یاب نہیں کیا جائے گا۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور کوئی ان میں سے مرجائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوجایئے، بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ اور مر گئے اس عالم میں کہ وہ بداعمال تھے۔''

---

[1] فاضحكوا بقليل تمتعكم فی الدنيا فانكم ستبكون كثيرا يوم القيامة (تبيان)

[2] برای احراز غنائم (شاہ ولی اللہ)

کھلے ہوئے منافقین کی نمازِ جنازہ سے ممانعت

اہل سنت کی روایت یہ ہے کہ حضرت ﷺ نے ابی بن کعب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی جس پر بعض صحابہ نے اختلاف کیا تھا مگر حضرت ﷺ نے نہ مانا۔اس پر یہ آیت اتری[1] حالانکہ جہاں ایسا ہوا ہے کہ مصلحت الٰہی اس کی متقاضی ہوئی ہے کہ پیغمبر ﷺ کے کسی عمل پر ٹوکا جائے وہاں یہ کہا گیا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا جیسے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ. اللہ آپ کو معاف کرے، آپ نے کیوں چھٹی دی انہیں؟

مگر یہاں کوئی اس کا اشارہ نہیں بلکہ یہ مستقل طور پر ہدایت ہے کہ ان منافقین کی آپ نماز جنازہ کبھی نہ پڑھیے گا۔ یہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ یہ حکم کچھ خاص منافقین کے لئے تھا جن کی عدول حکمی اس درجہ پر پہنچ گئی کہ ان پر احکامِ کفر جاری ہو گئے، ورنہ بہت سے منافقین کے لئے تو قرآن کی تصریح ہے کہ:

لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ. آپ انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں۔ (توبہ۔۱۰۱)

ظاہر ہے کہ جب اسباب ظاہری سے نفاق ان کا معلوم ہی نہیں ہوا تھا تو پیغمبر ﷺ اس کے مکلف کیوں کر ہو سکتے ہیں کہ وہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نفاق کا دائرہ محدود تھا اور وہ بس یہی لوگ تھے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ایک ضمنی استدلال اس آیت سے اور ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان منافقین کے لئے کہا جا رہا ہے کہ ان کی قبر پر کبھی کھڑے نہ ہو جایئے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنین کے واسطے جس طرح نماز جنازہ احکامِ اسلام میں داخل ہے، اسی طرح ان کے قبور پر وقتاً فوقتاً جانا بھی راجح و مستحسن ہے۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

"اور تم کو ان کے مال اور اولاد خوش آئند معلوم نہ ہوں۔ اللہ کا مطلب بس یہ ہے کہ ان کو دنیا میں انہی کے ذریعہ سے سزا دے اور ان کی جانیں نکلیں اس حال میں کہ وہ کافر ہیں۔"

اس مضمون کی آیت پہلے آ چکی ہے۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

---

[1] لما صلی النبی ﷺ علی اُبی نزل (جلالین)

"اور جب بھی کوئی سورہ[۱] اترتا ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے پیغمبر کی معیّت میں جہاد کرو تو ان میں کے قوت وطاقت رکھنے والے افراد آپ سے چھٹی مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں گھر بیٹھنے والوں کے ساتھ چھوڑ دیجئے۔ ان کو پسند ہوئی یہ چیز کہ یہ گھر میں بیٹھنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی تو وہ سمجھیں گے نہیں۔"

ان کے کردار کے وہی پہلو ہیں جو پہلے پیش کئے جا چکے ہیں مگر انہی کو اس طرح دہرایا جا رہا ہے جیسے کوئی حاکم یا بزرگ بڑے زور زور سے کسی پر خفا ہوتا اور ڈانٹتا ہے تم ہمیشہ یہی کرتے ہو تمہاری عادت یہی ہے جب بھی میں تمہیں حکم دیتا ہوں تم ہمیشہ ایسے ہی حیلے حوالے کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب جملوں میں بڑے سخت تیور اور کرخت آواز بنائیے تب پورا مطلب واضح ہوگا۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

"مگر پیغمبر اور وہ مومنین جو ان کی معیت میں ہیں، انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور یہ وہ ہیں جن کے لئے بھلائیاں ہیں اور یہی وہ ہیں جو ہر طرح کی بھلائی حاصل کرنے والے ہیں۔ اللہ نے تیار رکھا ہے ان کے لئے ان بہشتوں کو جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

منافقین بھی باعتبار زمانہ رسول ﷺ کے ساتھ معیت رکھتے تھے، نیز پاس رہتے بھی تھے، اٹھتے بیٹھتے بھی تھے مگر خالق نے یہاں ان کے مقابلہ میں خالص مومنین کے لئے "مَعَهٗ" کا لفظ استعمال کیا ہے کہ وہ مومنین جو ان کی معیت میں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معیت رسول ﷺ کی عالم مشاہدہ میں ساتھ رہنے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ خالص ایمان اور اطاعت سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کے بعد اس آیت کے مفہوم میں کوئی گنجلک نہیں رہتی جہاں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ

جس کی تفسیر کی منزل ہماری کتاب میں ابھی بہت دور رہے مگر یہاں کی آیت اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

وَجَاۗءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

"اور صحرائی عربوں میں سے معذور اشخاص آئے کہ انہیں چھٹی دے دی جائے اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے جھوٹ بولے ہیں، وہ بیٹھ رہے، عنقریب پہنچے گا انہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا ان میں سے دردناک عذاب"

[۱] سورۃ ای طائفۃ من القرآن (جلالین)

"الْمُعَذِّرُوْنَ" کا ترجمہ "معذور" ایک تفسیر کے مطابق ہے۔[1] لیکن دوسری تفسیر یہ ہے کہ تعذیر کے معنی تقصیر کے ہیں یعنی قصور وار اشخاص[2] جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جھوٹ بولے، وہ "بیٹھے رہے" یعنی عذر خواہی کے لئے بھی نہیں آئے۔[3]

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾

"نہیں ہے کمزوروں پر اور بیماروں پر اور نہ ان پر جن کے پاس خرچہ نہ ہو کوئی سختی[4] جب کہ وہ اللہ اور رسول کے وفادار ہیں۔ نیک اعمال لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے[5] اور اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان اور نہ ان پر کہ جب وہ آپ کے پاس آئیں اس غرض سے کہ آپ ان کے لئے سواری کا انتظام کردیں، اس پر آپ ان سے کہیں کہ میرے پاس نہیں ہے کوئی چیز جو میں سواری کے لئے تمہیں دوں تو وہ واپس ہوں اس حال میں کہ آنکھیں ان کی آنسو بہا رہی ہیں اس رنج میں کہ ان کے پاس (راہ خدا میں) خرچ کے لئے پیسہ نہیں ہے۔"

کمزوروں کو جو بیماروں سے پہلے ذکر کیا گیا ہے تو اسے مراد وہ ہیں جو پیدائشی طور پر یا بڑھاپے سے ناتواں ہیں[6] اور بیماری ایک عارضی مجبوری ہے جو قوی ہیکل آدمی کو بھی وقتی طور پر معذور بنا سکتی ہے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

"الزام[7] تو بس ان پر ہے جو آپ سے چھٹی مانگتے ہیں باوجود یکہ وہ دولت مند ہیں، وہ راضی ہوئے اس پر کہ گھر بیٹھنے والیوں کے ساتھ رہیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔"

---

[1] ۔ای المعتذرون بمعنی المعذورین (جلالین) اھل عذر از صحرا نشینان (شاہ ولی اللہ)
[2] ۔المعذر المقصر (تبیان)
[3] ۔من المجیئ للاعتذار (جلالین)
[4] ۔اثم فی التخلف عنہ (جلالین)
[5] ۔ هیچ راہ عتاب (شاہ ولی اللہ)
[6] ۔ هو الذی قوته ناقصة (تبیان)
[7] ۔الطریق بالعقاب والحرج (تبیان)

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ
نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ
الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

"وہ عذرخواہی کریں گے تم سے جب تم لوگ ان کی طرف واپس آ ؤ گے، کہیے کہ تم عذرخواہی نہ کرو، ہم کبھی تمہارا یقین نہیں مانیں گے، ہمیں اللہ نے تمہارے حالات کی اطلاع دے دی ہے [۱] اور اللہ اور اس کا پیغمبر تمہارے اعمال کو دیکھے گا [۲] پھر تم پلٹا کر لے جائے جاؤ گے۔ اس کی طرف جو حاضر وغائب کا جاننے والا ہے، وہ تمہیں بتلائے گا کہ تم کیا کرتے تھے"

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا
عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾
يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ
الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

"وہ اللہ کی قسمیں تم سے کھائیں گے جب تم ان کی طرف پلٹو گے تا کہ تم ان سے بے اعتنائی اختیار کرو تو اچھا تم بے اعتنائی ان سے اختیار کر لو، وہ سراپا خباثت ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے سزا میں ان کی جو وہ کرتے تھے وہ تم سے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم لوگ ان سے خوش ہو جاؤ تو تم ان سے خوش ہو بھی جاؤ تو بلا شبہ اللہ بداعمال لوگوں سے خوش ہونے والا نہیں ہے"۔

دونوں آیات کو ملا کر مطلب نکالا جائے تو یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے بار بار قسمیں کھانے کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ تم لوگ ان سے آئندہ کوئی شکایت نہ کرو اور بے اعتنائی اختیار کر لو، اور دوسرے یہ کہ تم ان سے خوش بھی ہو جاؤ تو جہاں تک پہلی بات ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، تم ان سے بے شک کوئی تعرض نہ کرو، اس لئے کہ خالق کی مصلحت ہی یہی ہے کہ جو لوگ اسلام کے دامن میں پناہ لیں، ان کے ظاہری اسلام کو قبول کیا جائے اور انہیں اس دنیا میں ان کی منافقت کی سزا نہ دی جائے اور شکوہ شکایت سے کوئی فائدہ نہیں مگر دوسری بات یعنی تم ان سے خوش بھی ہو جاؤ، یہ بالکل غلط تصور ہے۔ [۳]

ایک تو مسلمانوں پر جب ان کی منافقت کا حال کھل گیا تو یہ ان سے دل سے خوش نہیں ہو سکتے۔ پھر اگر یہ خوش ہو بھی جائیں تو اس سے کیا

---

[۱] ۔ای اخبرنا باحوالکم (جلالین)
[۲] ۔یعنی در دنیا (شاہ ولی اللہ)
[۳] ۔یعنی جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے، اس کی طرف سے تغافل روا ہے لیکن دوستی اور محبت اور یگانگی روا نہیں (موضح القرآن)

ہوتا ہے، خالق جو عالم الضمائر والاسرار ہے وہ تو ان سے کبھی خوش ہونے والا نہیں اور ظاہر ہے کہ نجات کا انحصار اس کی خوشی پر ہے۔ دنیا والے خوش ہو بھی جائیں تو کیا ہے۔[1]

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

''صحرائی عرب کفر اور نفاق میں بہت سخت ہوتے ہیں اور زیادہ امکان ہوتا ہے اس کا کہ وہ نہ واقف ہوں اور ان احکام کے حدود وقواعد سے جو اللہ نے اپنے پیغمبر پر اتارے ہیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح صحیح کام کرنے والا''۔

صحرائی عربوں کی مذمّت

جہاں تک سمجھ میں آتا ہے یہ اس وقت کے زیادہ تر صحرائی عربوں کی عام کیفیت اور مرکز علم سے دوری کی وجہ سے طبعی اقتضاء کا اظہار ہے نہ کہ کسی اصول کا اعلان ہے اس میں نہ عمومیت ہے اور نہ دوام واستمرار ہوسکتا ہے کہ اس وقت بھی ان میں ناقابل لحاظ اقلیت میں کچھ ایسے اشخاص ہوں جو خاص ومخلص مومن اور احکام شرعیہ سے واقف ہوں اور ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد ان میں ایسے افراد پیدا ہوجائیں جو ایمان علم شریعت کے حامل ہوں۔ خود اس آیت کے بعد ہی قرآن اعراب میں دو قسم کے لوگوں کا پتہ دے رہا ہے جو ابھی آپ کے سامنے آئے گا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

''اور صحرائی عربوں میں سے کچھ ایسے ہیں کہ خیر وخیرات میں جو صرف کرتے ہیں اسے ایک بڑا گھاٹا سمجھتے ہیں اور تم لوگوں کے لئے زمانہ کی گردشوں کا راستہ دیکھتے ہیں انہی کو برے دن دیکھنا پڑیں[2] اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا، اور ان صحرائی عربوں میں کچھ ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ اور روز آخرت پر اور جو خیرات کرتے ہیں اسے بارگاہ الٰہی میں تقرب اور پیغمبر کی دعائے خیر کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بلاشبہ وہ ان کے لئے تقرب کا سبب ہوگا، عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

---

[1]۔ لا ينفعهم رضا كم مع سخط الله عليهم (تبیان)

[2]۔ يدور العذاب الهلاك عليهم لا عليكم (جلالين)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

''اور شروع شروع ہی میں پہلے اسلام لانے والے مہاجر اور انصار اور جو حسن عمل کے ساتھ ان کی پیروی کریں، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں اور اس نے مہیا رکھے ہیں ان کے لئے بہشت جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے بہت بڑی کامیابی''۔

اسلام میں سبقت رکھنے والوں کی تعریف

سبقت اسلام کے بہت سے درجے ہیں، سب سے سابق تو کوئی ایک فرد ہی ہوگا، اور وہ تاریخ اسلام میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی ذات گرامی ہے اس کے بعد اضافی حیثیت سے دیکھا جائے تو مثلاً پہلے ہفتہ میں دعوت اسلام کے ایمان لانے والے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ سابق الاسلام ہیں پھر مثلاً پہلے مہینہ میں ایمان قبول کرنے والے پھر پہلے سال میں۔ اسی طرح ہجرت کے پہلے اسلام لانے والے بہ نسبت ان کے جو بعد میں اسلام لائے ہیں یہاں چونکہ کہ السّابقون الا وّلون میں مہاجرین کے ساتھ انصار کا بھی نام ہے اور ظاہر ہے کہ انصار آغاز دعوت اسلامی میں وجود نہ رکھتے تھے اس لئے یہ سبقت کچھ زیادہ وسیع معنی میں ہے اور یہ سبقت اس حد تک ہوسکتی ہے کہ ہجرت کے قبل اسلام لانے والے السّابقون الا وّلون مانے جائیں اس لئے کہ انصار یعنی باشندگان مدینہ بہت سے وہ تھے جو غائبانہ طور پر یا بیعت عقبہ کے موقع پر رسولؐ کی خدمت میں جا کر مسلمان ہو گئے تھے یعنی علماء اس سبقت کو ہجرت کے بعد بھی جنگ بدر کے اعتبار سے لیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جنگ بدر تک جو مسلمان ہوئے ہیں وہ آگے بڑھ جانے والے ہیں اور باقی ان کے تابع ہیں''۔ (موضح القرآن)

بعض اس کو بیت الرضوان سے وابستہ قرار دیتے ہیں جو حدیبیہ میں ہوئی۔ [1]

اور بعض اس کے دائرہ کو تمام صحابہ پر حاوی قرار دے لیتے ہیں۔ [2]

بہرصورت اللہ کی یہ خوشنودی ان کی اس صفت سے متعلق ہے جو سبقت الی الاسلام ہے اور اس کا صلہ بجائے خود وہ ہے جو آخر میں بتایا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ان کی مستقبل کی زندگی کے متعلق بھی کوئی ضمانت ہوگئی ہے کہ وہ اسی معیار پر قائم رہے گی اور یہ ظاہر ہے کہ آخرت کا انجام جو بھی ہو، وہ مجموعی زندگی اور بالخصوص آخری حالت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے نہ کہ ابتدائی یا عبوری دور کے کسی عمل سے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى

[1] قال الشعبی نزلت فی من بایع بیعۃ الرضوان (تبیان)

[2] او جمیع الصحابۃ (جلالین)

النِّفَاقِ قف لَا تَعْلَمُهُمْ ط نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ط سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾

''اور تمہارے اردگرد جو صحرائی عرب ہیں ان میں سے کچھ منافق ہیں اور اس شہر (مدینہ) کے باشندوں میں سے بھی، وہ نفاق پر سرکشی کے ساتھ قائم ہیں[1] آپ انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں دو دفعہ سزا دیں گے، پھر وہ بڑے عذاب کی طرف پلٹائے جائیں گے''۔

''دو دفعہ سزا دیں گے'' اس کے معنی دو قسم کے سزا کے بھی ہو سکتے ہیں[2] اور یہ بھی کہ بار بار انہیں سزا ملے گی[3] اور دو کا عدد صرف تکرار کے اظہار کے لئے ہے۔ بہرحال یہ سزا جسے دو دفعہ یا بار بار کہا گیا ہے، قیامت کے پہلے کی ہے[4] کیونکہ قیامت کی سزا کا عذاب عظیم کہہ کے، بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾

''اور دوسرے کچھ ہیں جنہیں اقرار ہے اپنے گناہوں کا، انہوں نے نیک اور بد اعمال ملے جلے کئے ہیں بہت ممکن ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر ڈالے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان، ان کے اموال کی زکوٰۃ آپ لے لیجئے جس کے ذریعہ سے آپ انہیں پاک کر دیں اور انہیں برکت دیں اور ان کے لئے دعائے خیر کیجئے۔ یقیناً آپ کی دعائے خیر ان کے لئے باعث سکون ہوگی اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

سابق میں منافقون میں سے بعض کا تذکرہ آچکا ہے کہ وہ زکوٰۃ، اب دیں بھی تو ان سے نہ لی جائے۔ یہ اسی کے بالمقابل حکم ہے کہ جنہوں نے صدق دل سے توبہ کی ہے وہ زکوٰۃ لائیں تو ان سے قبول کیجئے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾

''کیا انہیں نہیں معلوم کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور زکوٰۃ لیتا ہے اور یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے

---

[1] ۔ الحوا فيه واستمروا (جلالين)
[2] ۔ یعنی درمیان مسلمانان ذلیل شوند و در اموال و اولاد آفات بینند (فتح الرحمٰن)
[3] ۔ تکلیف پر تکلیف (موضح القرآن)
[4] ۔ فعلم ان الموتین معا قبل ان یردوا الی عذاب یوم القیامة (تبیان)

والا ہے، بڑا مہربان"۔

انداز بتاتا ہے کہ یہ اس غلط فہمی کا دفعیہ ہے کہ توبہ قبول کرنا، نہ کرنا اور زکوٰۃ کو لینا، نہ لینا ذاتاً خود رسولؐ کا کام ہے اس طرح لوگ سمجھتے تھے کہ یہ تفریق آپ کی طرف سے بلاوجہ ہے کہ آپ ایک سے زکوٰۃ اب وہ لاتا بھی ہے تو نہیں لیتے اور باقی دوسرے لوگوں سے لیتے ہیں خداوند عالم نے اس تصور کو غلط قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ رسولؐ کا خود فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا عمل ہے جو رسولؐ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اس لئے یہ تفریق اسی کی جانب سے ہے جسے لوگ رسولؐ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

"اور کہیے کہ تم عمل کرتے رہو، اللہ دیکھے گا تمہارے عمل کو اور اس کا پیغمبر اور ایمان والے اور بہت جلد تم پلٹائے جاؤ گے غائب و حاضر ہر بات کے جاننے والے کی طرف تو وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا اعمال کرتے تھے"۔

اس آیت کا مضمون پہلے آچکا ہے مگر وہاں صرف اللہ اور پیغمبرؐ کا ذکر تھا اور یہاں ان کے ساتھ اہل ایمان کا بھی تذکرہ ہے اب چونکہ مخاطب بھی کھلے ہوئے کافر تو نہیں ہیں بلکہ آمنّا کہنے والے بہ اقرار خود مومنین ہی ہیں اس لئے ان اہل ایمان سے مراد جنہیں کہا گیا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ ساتھ یہ تمہارے اعمال دیکھ رہے ہیں وہ خالص و مخلص افراد ہی ہو سکتے ہیں جن کے یہاں نفاق و عصیان کا شائبہ تک نہیں اور اس کے مصداق اکمل صرف معصومینؑ ہی ہو سکتے ہیں جو ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے۔[1]

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

"اور وہ دوسرے ایسے ہیں جن کا معاملہ اللہ کے حکم پر موقوف ہے یا انہیں سزا دے گا اور یا ان کی توبہ قبول کرلے گا اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا"۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

---

[1] ۔ المومنون ھھنا الائمۃ الطاھرون صلوٰۃ اللہ علیھم (علی بن ابراھیم)

''اور وہ بھی ہیں [1] جنہوں نے مسجد بنائی ضرر رسانی، کفر، مومنین میں تفرقہ پیدا کرنے اور ان لوگوں کو موقع دینے کے لئے جنہوں نے اس کے پہلے اللہ اور اس کے پیغمبر سے جنگ کی ہے اور ضرور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے سوائے بھلائی کے اور اللہ اس کا گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں آپ اس میں کبھی کھڑے نہو جیے، بے شک وہ مسجد جس کی شروع دن سے ہی بنیاد پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے اشخاص ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ پاک رہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

مسجد ضرار کا ذکر

قرآن مجید جس حد تک بیان کرتا ہے اس میں واقعات بطور اجمال ہی معلوم ہوتے ہیں، یہ تشنگی باقی رہتی ہے کہ اس کا پورا واقعہ کیا ہے اور پیاس بغیر احادیث و روایات کے مطالعہ کے بجھ ہی نہیں سکتی چنانچہ روایات سے متفرق طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ انصار کے قبیلہ بنی عوف کے کچھ لوگ تھے۔

اس مسجد کی تعمیر میں جو اغراض مضمر تھے ان میں قرآن مجید نے تفریق بین المومنین کو بھی درج کیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کار خیر بھی اگر پارٹی بندی کی بنا پر ہوا ہے [2] تو وہ خالق کے غضب کا مستوجب ہو جاتا ہے۔

اس کے بالقابل جس مسجد کی تعریف کی گئی ہے وہ مسجد قبا ہے یا مسجد مدینہ جسے ''مسجد نبوی'' کہا جاتا ہے۔

اس میں ایسے لوگ ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ پاک رہیں اس پاکی سے مراد پرہیزگاری ہوسکتی ہے مگر ہمارے آئمہ معصومینؑ کی تفسیر جو ظاہر لفظ کے بالکل مطابق ہے یہی ہے کہ اس سے طہارت پسندی مراد ہے [3] جو بحمد اللہ موالیان اہل بیت علیہم السلام کی خاص طور پر امتیازی علامت ہے۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

''کیا وہ جو اپنی عمارت کی بنیاد رکھے خوف الٰہی اور اس کی خوشنودی پر وہ بہتر ہے یا جو اپنی بنیاد رکھے ایک گڑھے کے کنارے جو دھنس جانے والا ہو تو وہ اس کے ساتھ دھنس جائے آتش جہنم میں اور اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا''۔

---

[1]۔ تقدیرہ: ومنہم الذین (تبیان)

[2]۔ انما یکون تفریقا بین المومنین بان یتحزّبوا فحزب یصلی فیہ و حزب یصلی فی غیرہ (تبیان)

[3]۔ قیل یطھّرون بالماء من الغایط والبول وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبداللہؑ (تبیان)

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

''یہ ان کی عمارت جو انہوں نے تعمیر کی ہے ہمیشہ ان کے دل میں خلجان پیدا کئے رہے گی الا یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا''۔

''خلجان''، یعنی حقانیت اسلام میں ان کے شکوک وشبہات بڑھتے ہی رہیں گے [1] کیونکہ وہاں جو بھی جمع ہوں گے وہ سب منافق قسم کے لوگ ہوں گے لہٰذا آپس کی باتوں میں عمر بھر اصلاح کے بجائے اور ذہنیت میں خرابی پیدا ہوتی رہے گی اور یہی ''عمر بھر'' کا مفہوم ان الفاظ سے ادا کیا گیا ہے کہ ''الا یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں'' [2]

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

''بلاشبہ اللہ نے خرید لیے ہیں ایمان لانے والوں سے ان کے جان اور مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ یہ وعدہ ہے اس کے ذمہ سچا توریت اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کا پورا کرنے والا کون ہے تو مبارک ہو تمہیں تمہارا یہ بیچنا جس کی معاملت تم نے اس سے کی ہے یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے''۔

یہ مومنین کو کوئی حکم نہیں ہے کہ تمہیں بیچنا چاہیے اور اس کے بعد اللہ تم سے خرید لے گا کہ یہ اس صورت میں ان کے ارادہ واختیار سے وابستہ ہوتا کہ فروخت کریں یا نہ کریں۔ بلکہ یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ خود ایمان اختیار کرنا یہ اپنے جان و مال کو اللہ کے ہاتھ فروخت کرنے کا معاہدہ ہے اور اس ایمان کے ساتھ ہی اللہ اس جان و مال کا خود ہمارے معاہدہ کی بناء پر مالک ہوجاتا ہے جس کے بعد کسی سچے مسلمان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ نہ انفرادی طور پر، نہ اجتماعی طور پر، اس طرح نہ شوریٰ کی کوئی وقعت رہتی ہے نہ اجماع کی۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ

[1] ۔ همیشه باشد سبب شك ..... در دل ایشان (شاه ولی الله)

[2] ۔ الیٰ ان تقطع قلوبهم بالموت والبلی (تبیان)

الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۱۲﴾

''توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمدِ الٰہی بجالانے والے، روزوں میں عمر بسر کرنے والے رکوع کرنے والے، سجدے کرنے والے، اچھائیوں کی ہدایت کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے، حدود خداوندی کی حفاظت کرنے والے، اور خوش خبری دو ایسے ایمان لانے والوں کو''۔

السآئحون کا جو ہم نے ترجمہ کیا ہے ''روزوں میں عمر بسر کرنے والے'' یہ بڑے معتبر مفسرین کے قول کے مطابق ہے جس کی تائید میں حدیث رسولؐ بھی موجود ہے۔ ورنہ لغت کی مدد سے اس کا ترجمہ کیا جائے تو معنی ہوں گے ''رواں دواں پھرنے والے'' [1] اس کے ساتھ قید لگانے کی ضرورت ہے کہ ''خدمت دین میں'' یا ''راہ خدا میں'' [2] کیونکہ ظاہر ہے کہ بجائے خود رواں دواں پھرنا کوئی صفت مدح نہیں ہے۔

اس کے قبل کی آیت جس میں جہاد میں مرنے مارنے کی دعوت تھی اور یہ آیت مقام تنزیل میں ایک ساتھ ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ قرآنی معیار پر جہاد راہ خدا وہ ہے جس کے ذمہ دار افراد ان اوصاف سے متصف ہوں جن کا کامل مرقع سوا معصومینؑ کے کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک حدیث میں معصومؑ نے اسی آیت سے اس پر استشہاد فرمایا ہے کہ عام مسلمان جسے جہاد سمجھ رہے ہیں وہ سیاسی لڑائیاں ہیں۔ قرآنی معیار کے مطابق جہاد نہیں ہیں [3]

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِىۡ قُرۡبٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۳﴾

''پیغمبرؐ کو اور انہیں جو ایمان لائے ہیں، یہ حق نہیں کہ وہ دعائے مغفرت کریں مشرکین کے لئے، چاہے وہ عزیز ہوں بعد اس کے کہ ان پر ثابت ہو گیا وہ دوزخ والے ہیں''۔

مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت

قرآن مجید میں اکثر دوسروں کے انتباہ کے لئے اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے ایک بات کہی گئی ہے اور یہاں تو صراحۃً پیغمبرؐ کے ساتھ ایمان لانے والوں کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس آیت کا تعلق کچھ اس وقت کے مسلمانوں ہی کے ساتھ ان کو متنبہ کرنے کے لئے ہے جس میں صرف اصول کی وحدت نمایاں کرنے کے لئے پیغمبرؐ کا نام لے لیا گیا ہے جیسے:

---

[1] روی عن النبی ﷺ انه قال سیاحة امتی الصوم وھو قول ابن مسعود و ابن عباس و سعید بن جبیر و الحسن و مجاھد (تبیان) السّائحون الصائمون (جلالین)

[2] سفر در راہ خدا کنندگان (شاہ ولی اللہ) پھرنے والے ھیں (شاہ رفیع الدین)

[3] حدّثنی ابن عن بعض رجاله قال لقی الزھری علی بن الحسینؑ فی طریق الحج فقال یا علی بن الحسین ترکت الجھاد و صعوبته واقبلت للحج... واللہ یقول: انّ اللہ اشتریٰ من المومنین الخ قال له علی بن الحسین اتم الآیة فقال: التّائبون العابدون السّائحون... اذا رأینا ھٰؤلاء الذین ھٰذہ صفتھم فی الجھاد معھم افضل من الحج (علی بن ابراھیم)

لئن اشرکت لیحبطنّ عملك

اگر آپ بھی شرک کریں تو آپ کے سب اعمال اکارت ہو جائیں۔

وہی صورت یہاں بھی ہے مگر جمہور اہلسنّت نے جنہیں جناب ابو طالبؑ کے ایمان پر حرف لانے کے ساتھ خاص دلچسپی ہے اس آیت کا تعلق ابو طالبؑ ہی سے قرار دیا ہے کہ ان کے لئے رسولؐ نے استغفار کیا، اس پر آیت نازل ہوئی ہم اس سے متفق نہیں ہیں۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

''اور ابراہیم کا دعائے مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے نہ تھا مگر ایک وعدہ کی رو سے جو انہوں نے کیا تھا اس سے مگر جب ثابت ہو گیا ان پر کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے اظہار برأت کر دیا، بلاشبہ ابراہیم غم خوار انسان تھے تحمل سے کام لینے والے''۔

جناب ابراہیمؑ کے استغفار کا پس منظر

جس وعدہ کا اس آیت میں حوالہ ہے اس کا بیان بھی دوسری جگہ قرآن مجید میں موجود ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو میں جو انہوں نے اپنے چچا یا کسی دوسری طرح کے عزیز آذر سے جسے وہ باپ کہہ کر پکارتے تھے کی تھی جس میں ہدایت حق کو سن کر اس کے انکار پر انہوں نے کہا تھا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (یعنی) تمہیں اپنے فعل کا اختیار ہے مانو، یا نہ مانو، بہرحال میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے دعائے مغفرت کروں گا۔

یہاں پر تو الفاظ قرآن سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس استغفار کے وعدے سے قبل اس نے کچھ رجحان ایمان لانے کا ظاہر کیا ہو مگر ممکن ہے اس میں موجود ترتیب قرآن کا قصور ہو۔ زیر نظر آیت کے جو الفاظ ہیں، ان سے جناب شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آذر نے جناب ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں ایمان اختیار کرلوں تو تمہیں میرے لئے دعائے مغفرت کرنی لازم ہوگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کرلیا اور اس نے اظہار ایمان کر دیا چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسب وعدہ اس کے لئے خالق سے مغفرت طلب کی مگر بعد میں ثابت ہوا کہ اس کا اظہار ایمان صرف نمائشی تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے برأت کر لی۔

یہ نتیجہ انہوں نے قرآن کے ان الفاظ سے نکالا ہے کہ ''جب ثابت ہو گیا ان پر کہ وہ اللہ کا دشمن ہے'' کیونکہ اگر اس نے درمیان میں اظہار ایمان نہ کیا ہوتا تو ابتدائے عمر سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا مشرک ہونا معلوم تھا اس صورت میں ''ثابت ہو گیا'' کے معنی ہی کیا ہوں گے؟ اس کے علاوہ انہوں نے دعائے مغفرت میں یہ الفاظ صرف کئے ہیں کہ:

واغفر لا بی انه کان من الضآلین

میرے باپ کو بخش دے! وہ گمراہوں میں سے تھا (شعراء ۸۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جس وقت دعائے مغفرت کی ہے اس وقت کی صورت ظاہر یہی ہے کہ وہ اب راہ راست پر آ گیا ہے اور گمراہوں

میں سے نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کسی جماعت کو گمراہ قرار دے [۱] جب کہ انہیں اس نے راہ راست پر لگا دیا جب تک کہ صاف صاف ان پر ظاہر نہ کردے وہ باتیں جن سے انہیں بچنا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

تکلیف بلا بیاں کا صحیح نہ ہونا

یہ اس اصول کا اعلان ہے جو اصول فقہ میں اصل برأت کے ذیل میں عقلی و نقلی طور پر ثابت ہوا ہے کہ تکلیف بلا بیان قبیح ہے اور جب تک کہ کسی شے سے ممانعت وارد نہ ہو، اس پر مواخذہ ہونے والا نہیں ہے۔

''اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اضلال اور ہدایت اللہ کا اندھادھند کوئی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک صفت ثابت پر مبنی ہے جس سے علم الٰہی کا تعلق ہوتا ہے اور وہ اسی اپنے علم پر احکام ضلال و ہدایت مرتب فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

''یقیناً اللہ کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں اور زمین کی، وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی حامی اور نہ مددگار''۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

''اللہ نے رحمت کی نظر ڈالی [۲] پیغمبر اور اُن مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے سختی کے وقت پر ان کا ساتھ دیا جب کہ قریب تھا کہ ان میں سے کچھ کے دلوں میں کجی آ جائے۔ پھر اللہ نے ان پر نظر رحمت ڈالی۔ یقیناً وہ ان کے ساتھ شفیق ہے، بڑا مہربان''۔

یاد رکھئے کہ مہاجرین و انصار میں سے انہی کے لئے نظر رحمت کی توجہ کا بیان ہو رہا ہے جنہوں نے سختی و مصیبت میں رسولؐ کا ساتھ دیا

---

[۱] یعنی در حساب گمراہان نمی شمارد قومی را (فتح الرحمن) نہیں ہے اللہ کہ گمراہ ٹھہرائے قوم کو (شاہ رفیع الدین)
[۲] برحمت متوجہ شد (شاہ ولی اللہ)

ہو، نہ یہ کہ رسولؐ کو مصیبت میں چھوڑ کر انہوں نے اپنے لئے گوشہ ہائے عافیت تلاش کئے ہوں۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

''اوران تینوں پر کہ جو پیچھے رہ گئے تھے یہاں تک کہ یہ عالم ہوا کہ زمین ان پر باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنے سے تنگ ہوگئے [۱] اور انہوں نے سمجھا کہ اللہ سے بچاؤ کے لئے کوئی جائے پناہ سوا خود اسی کے نہیں ہے پھر اللہ نے ان کی طرف توجہ فرمائی کہ وہ توبہ کریں، یقیناً اللہ ہی وہ ہے جو بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

''اوران تینوں پر'' اس کا تعلق اس کے قبل والی آیت کے ساتھ ہے کہ اللہ نے اپنی نظر توجہ مبذول فرمائی رسولؐ اور ان مہاجرین وانصار پر جنہوں نے رسولؐ کی پیروی کی اور ان تین آدمیوں پر جنہوں نے جنگ تبوک کے سفر میں رسولؐ کا ساتھ چھوڑنے کے بعد صدق دل سے توبہ کی اور یہ حقیقت میں ان افراد کی انتہائی دل جوئی ہے کہ ان کی توبہ قبول کرنے کا تذکرہ کرنے کے لئے رسولؐ اور آپ کی سچی اطاعت کرنے والے افراد پر اپنی نظر توجہ کا تذکرہ پہلے کرتے ہوئے اسی سلسلہ میں ان کا نام لے کر اس کا عملی طور پر ثبوت دے دیا کہ التّائب عن ذنبه كمن لا ذنب له: گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے وہ جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔

چونکہ ان کی توبہ کو بطور نتیجہ ذکر کیا ہے تاب اللہ کے مضمون پر مترتب کرکے، اس لئے پہلے تابَ کے معنی ہم نے قبول توبہ کے نہیں بلکہ توجہ مبذول فرمانے کے قرار دیے ہیں اور اس توبہ کے بعد جو توّاب آیا ہے اس کے معنی توبہ قبول کرنے والا قرار دیے ہیں جو بالکل سیاق قرآنی کے مطابق ہیں۔

یہ الفاظ کہ زمین اُن پر تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنے سے تنگ ہوگئے اس ضمیر کی شدید بے چینی کے اظہار کے لئے ہیں جو صحیح احساس جرم کی بنا پر ان میں پیدا ہوئی تھی اور پھر روایت بتاتی ہے کہ ان کے لئے حالات بھی ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ گھر والوں تک اُن سے بات نہ کرتے تھے اور انہوں نے خود بھی آپس میں ایک دوسرے سے بات کرنا موقوف کردی تھی اور جنگل میں ایک دوسرے سے بالکل الگ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ [۲]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو''۔

---

[۱] ۔ ان کی جانیں (تک) ان پر تنگ ہوگئیں (مولانا فرمان علی صاحب)

[۲] ۔ فضاقت عليهم المدينة فخر جوا الى روس الجبال فكان اهاليم يجيون لهم بالطعام و يتركونه لهم ولا يكلّمومنهم فقال بعضهم لبعض قدهجوا الناس ولا يكلّمنا احد فهلاّ نتهاجر نحن ايضا فتفرقوا ولم يجتمع منهم اثنان (تبیان)

صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم

یہ ایک مستقل آیت ہے اور چونکہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے اس لئے یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ماقبل یا مابعد ہی کے سلسلہ کی کوئی آیت ہے لیکن مفسرین اہل سنت نے بلاوجہ اس کا تعلق سیاق سے قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اصلی مرکز سے دور ہوگئی ہے۔[1]

تفسیر اہل بیتؑ یہ ہے کہ صادقین سے مراد معصومینؑ ہیں۔

مَا كَانَ لِاَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ وَمَنۡ حَوۡلَهُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ يَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰهِ وَلَا يَرۡغَبُوۡا بِاَنۡفُسِهِمۡ عَنۡ نَّفۡسِهٖ‌ؕ ذٰ لِكَ بِاَنَّهُمۡ لَا يُصِيۡبُهُمۡ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخۡمَصَةٌ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوۡنَ مَوۡطِئًا يَّغِيۡظُ الۡكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوۡنَ مِنۡ عَدُوٍّ نَّيۡلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمۡ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۙ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ نَفَقَةً صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً وَّلَا يَقۡطَعُوۡنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمۡ لِيَجۡزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحۡسَنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾

”مدینہ کے باشندوں اور ان کے ارگرد کے صحرائی عربوں کو یہ درست نہیں ہے کہ وہ پیغمبر خداؐ کا ساتھ چھوڑ کر گھر بیٹھیں اور اپنی جانوں کو آپ کا ساتھ دینے سے بچائیں، اس لئے کہ انہیں نہ پیاس، نہ زحمت، نہ مشقت اور نہ بھوک کی مصیبت راہ خدا میں پہونچے گی اور نہ کہیں قدم ایسا رکھیں گے [2] جو کافروں کے لئے غم وغصہ کا باعث ہو اور نہ وہ دشمنوں کے مقابلہ میں کوئی کامیابی حاصل کریں گے مگر یہ کہ اس کے سبب سے ایک نیک عمل ان کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، بلاشبہ اللہ اچھے اعمال والوں کے ثواب کو رائیگاں نہیں کیا کرتا اور نہ وہ کوئی خرچ کریں گے چھوٹا اور نہ بڑا اور نہ کوئی وادی قطع کریں گے مگر یہ کہ ان کے واسطے اسے نامہ عمل میں لکھا جائے گا تا کہ اللہ انہیں صلہ دے ان کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے“۔

وَمَا كَانَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لِيَنۡفِرُوۡا كَآفَّةً‌ ؕ فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوۡا فِى الدِّيۡنِ وَلِيُنۡذِرُوۡا قَوۡمَهُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَحۡذَرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

”اور ایمان لانے والوں کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں تو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر

---

[1] ۔ کونوا مع الصادقین فی الایمان والعود بان تلزموا الصدق (جلالین) ساتھ مہاجرین وانصار کے تین شخص اور بھی داخل ہوئے پچاس دن میں (موضح القرآن)

[2] ۔ موطأ مصدر بمعنی وطأ (جلالین)

جماعت میں سے کچھ لوگ سفر کریں تاکہ دین کے سمجھنے کی قابلیت حاصل کریں اور پھر جب واپس جائیں تو اپنی قوم کو متنبہ کریں، شاید وہ اثر لیں۔"

تحصیل علم دین کے لئے سفر کا حکم وجوب کفائی

اس آیت کا تعلق گزشتہ سلسلہ کلام سے معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ وہ جہاد میں جانے کا ذکر تھا اور وہاں تو پیچھے رہنے والوں کی سختی کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اگر یہ آیت اس سے متعلق سمجھ لی جائے تو رسولؐ کے ساتھ نہ جانے والوں پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ اور جیسا کہ بہت دفعہ لکھا گیا، ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے لہذا کوئی وجہ بھی نہیں کہ خواہ مخواہ اسے گزشتہ کے ساتھ مرتبط کرنے کی کوشش کی جائے۔[1]

درحقیقت یہ آیت ایک دوسری بات سے متعلق ہے اور وہ تحصیل علم دین کے لئے سفر ہے اور اسی بناء پر علماء نے اسے اجتہاد اور تقلید کے ثبوت میں پیش کیا ہے اس لئے کہ قرآن نے تحصیل علوم دین کا ذریعہ یہی بتایا ہے کہ ایک جماعت جا کر قابلیت فہم احکام دینیہ کی حاصل کرے۔ یہ ہوئے فقہاء اور پھر جب وہ واپس آئیں تو قوم کے دوسرے لوگوں کو وہ احکام دین پر مطلع کریں اور وہ ان احکام پر عمل کریں۔ یہ ہوئے مقلدین۔ یہی عملی طریقہ ہے جو عقل وفطرت کے عین مطابق ہے۔

تفسیر جلالین میں ایک عجیب طرح سے اس آیت کو گزشتہ سے مرتبط بھی کیا ہے اور پھر اسے علم دین کے واجب کفائی ہونے سے بھی متعلق قرار دیا ہے اور اس تضاد کو بھی رفع کرنے کی کوشش کی ہے جسے ہم نے پہلے دکھلایا ہے کہ اگر جہاد میں جانا واجب کفائی ہوتا جیسا کہ سیاق سے متعلق قرار دینے کے بعد اس آیت سے ثابت ہوتا ہے تو اس کے پہلے ساتھ نہ جانے والوں پر اتنی زجر وتوبیخ کیوں ہوتی۔

وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ آیات کے نازل ہونے کے بعد ایک مہم اور پیش آئی تو اب کہ جتنے مسلمان تھے، سب کے سب چل کھڑے ہوئے اور مدینہ میں کوئی نہ رہ گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (یعنی) مومنین کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ اس میں بیچ میں انہوں نے بڑھایا الی الغزو یعنی میدان جنگ کی طرف، مطلب یہ نکلا کہ تمام مومنین کو ایک دم جنگ کے لئے روانہ نہیں ہونا چاہیے فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر قبیلہ میں سے کچھ لوگ جائیں۔ اب یہاں وہ جملہ بڑھاتے ہیں: ومكث الباقون اور باقی لوگ قیام کریں۔ لِّيَتَفَقَّهُوْا تاکہ وہ لوگ یہاں پر وہ تشریح فرماتے ہیں: ای الماكتون یعنی یہ قیام کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اور وہ اپنی قوم کو آگاہ کریں جب وہ یعنی وہ قوم جو جہاد میں گئی ہے واپس آئے۔

اب اس تضاد کو یوں رفع کیا ہے کہ:

قال ابن عباس فهذه مخصوصة بالسرايا والتي قبلها بالنهي عن تخلف احد فيما اذا خرج النبي ﷺ۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آیت سریوں سے مخصوص ہے (جن میں پیغمبرؐ خود تشریف نہیں لے جاتے تھے اور کسی کو سردار لشکر بنا کر بھیج دیتے تھے) اور جو آیات اس کے پہلے ہیں کہ کوئی پیچھے نہ رہ جائے وہ اس صورت کے لئے ہیں کہ جب خود رسول تشریف لے جائیں۔

---

[1]۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ "اور یہ (بھی) مناسب نہیں کہ مومنین کل کے کل (اپنے گھروں سے) نکل کھڑے ہوں۔" (مولانا فرمان علی صاحب)

اب بظاہر تو چولیں سب بیٹھ گئیں مگر اس کی بنیاد میں ایک بڑی منطقی کمزوری ہے وہ یہ ہے کہ اصل الفاظ قرآن یہ ہیں۔
فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ کیوں نہیں ایک گروہ ان میں کا سفر کرتا تا کہ وہ علم دین حاصل کریں۔

یہاں ضمیر وہ کے پہلے ذکر سفر کرنے والوں کا ہے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہوگا کہ وہ سفر کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ قیام کرنے والوں کا کوئی ذکر ابھی آیہ قرآنی میں نہیں ہے۔ یہ تو مفسر صاحب نے بیچ میں ''ومکث باقون'' اور باقی لوگ قیام کریں بڑھایا اور پھر لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ کے معنی قرار دے رہے ہیں کہ وہ قیام کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ گویا خداوند عالم ضمیر پھیر رہا ہے ایک ایسے مرجع کی طرف جسے کئی صدی کے بعد جلالین صاحبان میں کا کوئی ایک بیچ میں لکھ کر اس خلا کو پر کرے گا جو قرآن میں معاذ اللہ پایا جاتا تھا۔
اسی بناء پر بعض مفسرین اہل سنت نے بھی اس سفر کو جہاد سے متعلق قرار نہیں دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ممکن نیست مومناں را کہ برآیند پر نوٹ دیا ہے یعنی بطلب علم اور آخر میں لکھا ہے یعنی طلب علم فرض کفایہ است (فتح القرآن)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اے ایمان لانے والو! جنگ کرو ان سے کہ جو تمہارے آس پاس ہیں اور وہ تم میں سختی و مضبوطی محسوس کریں اور جانے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

قرآن مجید کی اکثر آیات سلسلہ نزول کے مطابق مرتب نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پس منظر سے جدا ہوگئی ہیں جن میں وہ آیت نازل ہوئی تھی یہ آیت بھی اسی طرح کی ہے اور اس لئے ایک ایسا شخص جو اسلام کو شمشیر زنی اور خونریزی کا حامل قرار دینے کے درپے ہے، بآسانی اس آیت کا استعمال کرسکتا ہے لیکن اگر اس آیت کو اس منظر میں دیکھا جائے جس میں یہ آیت اتری تھی تو معلوم ہوگا کہ اسباب جنگ ان کفار سے پہلے سے موجود تھے اور ان کی بنا پر یہ حکم آیا ہے جسے کوئی عمومی حیثیت نہیں ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کے لئے یہ اصول قائم ہو کہ انہیں اپنے آس پاس کے کافروں سے جنگ کرنا لازم ہو۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

''اور جب کوئی سورہ اترتا ہے تو ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم میں سے کون ہے جس کے ایمان میں اس نے اضافہ کیا ہو تو (اس کا جواب یہ ہے کہ) جو ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں پہلے سے بیماری ہے، ان کو تو ان کی موجودہ خباثت کے ساتھ اور خباثت میں

اضافہ ہوتا ہے اور وہ مریں گے بھی اس عالم میں کہ وہ کافر ہیں"۔[1]

نفاق کا مظاہرہ نکتہ چینیوں کی شکل میں ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسا ہی سوال و جواب سورہ بقرہ میں آ چکا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝٢٦ ﴿البقرۃ﴾ اللہ نہیں شرماتا اس سے کہ مچھر یا اس سے بھی چھوٹی چیز کی مثال دے تو جو ایمان رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ انکے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کا مطلب کیا ہے۔ بہت سوں کو وہ اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے اور گمراہی میں انہی کو ڈالتا ہے جو بد اعمال ہیں۔

ویسا ہی یہاں ہے کہ قرآن مجید کی کچھ آیات اترنے پر منافقین کہتے ہیں کہ اس کا حاصل کیا ہوا؟ اس میں افادیت ہی کیا ہے؟ اس سے آخر کس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے؟ اس کا جواب قرآن نے یہی دیا ہے کہ تم میں ایمان ہو تو تمہارے ایمان میں اضافہ بھی ہو۔ تم میں تو نفاق کی بیماری دلوں میں موجود ہے اس لئے آیات الٰہی سے تمہارے نفوس میں بجائے ایمان کے اور خباثت ہی زیادہ ہوتی ہے، اور یہ آخری لمحہ زندگی تک تمہاری کیفیت برقرار رہے گی مرو گے بھی تم اسی کفر کے عالم میں"۔

معلوم ہوا کہ خالق کی جانب سے کوئی جبر کی کارفرمائی نہیں ہے، انسانی نفوس کی بذات خود حالت ہے جس سے آیات الٰہی کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝١٢٦

"کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک دو بار آزمائشوں میں مبتلا کئے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد بھی نہ وہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں"۔

یہ آزمائشیں مختلف طرح کے عوارض و امراض کے ساتھ ہوا کرتی ہیں جن سے صاحبان ایمان اصلاح نفس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ ان سے کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝١٢٧

"اور جب کوئی سورہ اترتا ہے تو ان میں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتا ہے کوئی تمہیں دیکھتا تو نہیں ہے؟ پھر وہ پلٹ جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے اس سبب سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں"۔

---

[1] ماتوا علی لفظ الماضی لانه عطف علی زادهم... والمعنی انهم یموتون وهم کافرون (تبیان)

کوئی سورہ یعنی ایسی قرآن کی آیات جن میں ان کی منافقانہ روشوں کا تذکرہ اور ایسے اوصاف ہیں جو بالکل انہی پر منطبق ہیں۔[1] ایک دوسرے کی صورت دیکھتا ہے۔اس کے ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ وہ کچھ شرمندگی اور انفعال محسوس کرتے ہیں۔[2] یا یہ کہ جب رسولؐ ان آیات کو مجمع میں سناتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے آپس میں اشارے کرتے ہیں کہ اب یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں، چلنا چاہیے۔[3]

پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں کہ کوئی مسلمان انہیں دیکھتا تو نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اسی مطلب سے ہو کہ کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ الفاظ وہ کہتے بھی ہوں۔ بلکہ یہ ان کی صورت حال کی ترجمانی ہے جو قرآن نے کی ہے[4] مگر عام مترجمین یہاں ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں کہ وہ ایسا کہتے ہیں[5]

پھر وہ پلٹ جاتے ہیں یعنی اس بزم سے ہٹ کر ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔[6]

اللہ کا ان کے دلوں کو پھیر دینا از خود نہیں ہے بلکہ ان کے شعور ایمانی سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے جسے آخر میں ظاہر کردیا ہے۔[7]

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾

''تمہارے پاس آیا ہے تم ہی میں سے ایسا پیغمبر جس پر تمہاری زحمت و تکلیف شاق ہے، جسے تمہاری ہر وقت فکر ہے، جو ایمان قبول کرنے والوں پر بہت شفیق ہے بڑا مہربان۔''

یہ آیت گویا اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ ﴿۴﴾ ﴿القلم﴾ کے متن کی ایک بڑی متین شرح ہے جس کی تفصیل ہم بیان کرنا چاہیں تو دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

اوصاف پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پیغمبرؐ کو جا بجا جو مِنۡ اَنۡفُسِكُمۡ کہا ہے، اس کے معنی عموماً قوم قبیلہ کے لئے جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی یہی معنی لئے گئے ہیں۔ حالانکہ پیغمبر کی رسالت بنص قرآن تمام نوع بشر پر حاوی ہے جس میں قبیلہ اور قومیت کا اختلاف ظاہر ہے۔اس لئے میں ایک دوسری قرآنی نظیر کے سہارے اور وہ یہ ہے کہ متعدد مقامات پر شریک حیات کے لئے یہ مضمون ہے کہ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا (روم۔۲۱) اس نے تم ہی

---

[1] سورۃ فیہا ذکرھم (جلالین) یعنی سورتی کہ دروے بیان نفاق ایشاں باشد (فتح الرحمن)
[2] از جہت شرمندگی (فتح الرحمن)
[3] یریدون الھرب (جلالین)
[4] فکانھم یقول بعضھم بعض ھل یریٰکم من احد (تبیان)
[5] (یہ کہہ کر کہ) تم کو کوئی مسلمان دیکھتا تو نہیں ہے پھر (اپنے گھر پر) پلٹ جاتے ہیں (مولانا فرمان علی صاحب)
[6] ای تفرقوا (علی بن ابراھیم)
[7] پیغامبری از قبیلہ شما (شاہ ولی اللہ)

میں سے تمہارے لئے شریک زندگی پیدا کئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ زوجہ ہمیشہ اسی قوم کی نہیں ہوتی جس قوم قبیلہ سے اس کا شوہر ہے لہٰذا اس کے معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ وہ حقیقت نوعیہ میں اس شوہر کے ساتھ شریک ہے چونکہ ایک عرصہ تک دانشوروں میں یہ چیز محل بحث رہی کہ عورت نوع انسانی میں داخل ہے یا نہیں؟ تو اس کا فیصلہ قدرت نے مِنْ اَنْفُسِكُمْ کہہ کر کیا، اسی طرح انبیاء ومرسلین کے لئے ایسا تصور ہر دور میں ہوتا رہا اور آج بھی موجود ہے کہ وہ حقیقت ونوعیت ذات میں افراد انسانی سے الگ ایک مخلوق ہوتے ہیں، اسے پیش نظر رکھ کر خالق نے متعدد جگہ قرآن مجید میں اس پر زور دیا ہے کہ پیغمبر تم ہی میں سے ایک ہوتا ہے یعنی حقیقت وماہیت نوعیہ میں تمہارا ہم جنس ہی ہوتا ہے۔ فرشتہ یا کسی دوسری نوع کا فرد نہیں ہوتا۔ بے شک اس کے صفات شخصی ہوتے ہیں جو اسے افراد نوع سے ممتاز بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ تم اگر اس کی پیروی کروگے تو اسی پیروی کے تناسب سے تم بلند سے بلند تر درجے حاصل کرکے نوع انسانی میں ایک شرف وامتیاز کے حامل ہوجاؤ گے۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۱۲۹﴾

"اس کے بعد وہ اگر روگردانی کریں تو کہیے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، اس پر میرا بھروسہ ہے اور وہ عظیم المرتبت عرش کا مالک ہے۔"

بعض روایات میں اہل سنت میں ہے کہ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ سے لے کر یہاں تک، یہ دو آیات قرآن کی سب سے آخری آیات ہیں ان کے بعد پھر کوئی آیت نازل نہیں ہوئی ہے۔[1]

[1] روی الحاکم فی المستدرک عن ابی بن کعب قال اٰخر اٰیۃ نزلت: لقد جاء کم رسول الٰی اٰخر السورۃ (جلالین)

سُوۡرَةُ یُوۡنُس

مکیّہ۔۔۔۱۰۹ آیات

سورۂ یونس کے خاص خاص مضامین

مگر دو تین آیات کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔ [ا]

اس سورہ میں جو خاص واقعہ مذکور ہے اور موجودہ ترتیب قرآن میں سب سے پہلے یہیں درج ہوا ہے وہ قوم یونسؑ پر عذاب کا آنا اور پھر توبہ وانابت سے اس کا برطرف ہوجانا ہے اور یہ واقعہ تاریخ امم میں ایک نادر حیثیت رکھتا ہے کہ عذاب نازل ہو اور پھر سچے دل سے توبہ ہونے کی وجہ سے وہ پلٹ جائے اس لئے اس واقعہ کو یاددلانے کی خاطر اس سورہ کا نام ''سورۂ یونس'' ہوا۔

یوں جناب یونس علیہ السلام کا نام اور دوسری سوروں میں بھی آیا ہے مگر وہ ضمناً ہے اس واقعہ کا تذکرہ اسی سورہ میں ہے ہاں اس واقعہ کی بعض کڑیوں کی طرف انتیسویں پارہ کے سورہ قلم میں اشارہ ہے مگر وہاں جناب یونس علیہ السلام کا نام نہیں ہے اور واقعہ کی خاص کڑی یعنی قوم سے عذاب دور ہونے کا ذکر وہاں نہیں ہے۔اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص باتیں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔۔۔۔۔قرآن اور تعلیم اسلام کے بوحی الٰہی ہونے پر رسولؐ کی اس خاموش زندگی سے جو قبل بعثت تھی، استدلال کہ یہ سب اگر ان کے ذہن کی پیداوار ہوتا تو کبھی اس چالیس برس کے اندران کی زبان سے اس طرح کی باتیں تمہیں سننے میں آتیں۔

۲۔۔۔۔۔یہ اصول کہ جو خود دوسرے کی رہنمائی کا محتاج ہو، وہ پیشوائے خلق نہیں ہوسکتا۔

۳۔۔۔۔۔جس چیز کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہ آئے، اس میں کوئی حکم اپنے دل سے جاری کرنا اللہ پر افتراء ہے۔

۴۔۔۔۔۔اولیائے الٰہی خوف وحزن سے بری ہے۔

۵۔۔۔۔۔حقانیت معجزہ کا معیار، جو غلط بات اللہ کی طرف منسوب کی جائے، اس کا باطل ثابت کرنا اللہ کو لازم ہے۔

۶۔۔۔۔۔فرعون کا جسم کا غرق ہونے کے بعد پھر دریا سے نکل کر محفوظ ہوجانا۔۔۔وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا ، بڑا مہربان ہے

الٓرٰ‌ قف تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ ①

[ا] ۔مکیۃ الا فان کنت فی شك الأیتین او الثلث او ومنهم من یؤمن به الأیة (جلالین)

''الف۔لام۔را۔یہ [۱] آیات ہیں حکمت والی کتاب کی''۔

شروع کے حروف تو مقطعات قرانیہ ہیں جن کے متعلق لکھا جا چکا ہے کتاب کے وسط میں حکیم کی لفظ کو عموماً حکمت سے لیا گیا ہے [۲] جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے محکم سے لیا ہے جس کے معنی مضبوط کے ہیں۔ [۳]

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۣ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲

''کیا یہ لوگوں کے لئے عجیب بات تھی کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص پر وحی بھیجی کہ آپ لوگوں کو ڈرا دیجئے اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دیجئے کہ ان کے لئے سچائی کی روایت قائم ہے ان کے پروردگار کے یہاں کافر کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے''۔

انہی میں سے ایک شخص یعنی رسالت مآبؐ جن کا خاص فریضہ بشارت و انداز ہے اور آپ کا لقب ہی بشیر و نذیر تھا۔ [۴]

''قَدَمَ صِدْقٍ'' کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے اس میں بھی تقدم یعنی ماقبل کی صورت حال کا تصور محفوظ ہے [۵] اور بعض مفسرین نے تقدم کا مطلب یہ لیا ہے کہ جو سچائی کا ذخیرہ وہ اپنے گفتار و کردار سے اللہ کے یہاں پہلے بھیج چکے ہیں اور وہ اللہ کے یہاں جزا کی صورت میں ان کے لئے محفوظ ہے۔ [۶]

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

''یقیناً تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر برقرار ہوا تدبیر کائنات کرتا ہوا کوئی سفارشی نہیں ہے مگر اس کی اجازت کے بعد یہ ہے کہ اللہ تمہارا پروردگار تو عبادت کرو اس کی۔ تو کیا تم نصیحت قبول نہ کرو گے۔؟''

---

[۱]۔ قال ابو عبیدہ ''تلك'' معناہ هذا (تبیان)

[۲]۔ ایں آیتہای کتاب حکمت است (شاہ ولی اللہ) یہ ہیں نشانیاں کتاب حکمت والی کی (شاہ رفیع الدین)

[۳]۔ الحکم المحکم (جلالین)

[۴]۔ استواءً یلیق بہ (جلالین)

[۵]۔ معناہ استولیٰ علیہ بانشاء التدبیر من جھتہ كيستولی الملك علیٰ سریر ملکہ بالاستیلاء علی تدبیرہ (تبیان)

اس آیت کے تمام اجزاء پہلے آچکے ہیں آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنا، عرش پر مستوی ہونا یا استواء جس کا ترجمہ ہم نے برقرار ہونے سے کیا ہے جسمانی نہیں ہے[1] بلکہ مقام انتساب میں نقطہ اعلیٰ کو عرش یعنی تخت سلطنت قرار دیا گیا ہے[2] تو اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ عرش پر ہے تدبیر کائنات بذات خود کر رہا ہے یہ شرک کی اس قسم کے مقابلہ میں ہے جو کائنات کے نظام کو مختلف دیوتاؤں پر تقسیم کرکے اللہ کو اس نظام سے بے تعلق بنا دیتی ہے اور اس لئے عبادت بھی انہی دیوتاؤں کی کرتی ہے اللہ سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اسلام میں اس طرح کے وسائط کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جن کے بعد اللہ سے کوئی مطلب نہ رہے۔

اسلام میں جس طرح کے وسیلہ اور شفیع کا تصور ہے وہ وہی ہے جسے اس آیت میں الا من بعد اذنه کہہ کر مستثنیٰ کیا گیا ہے یعنی جو وسیلہ ہوتا ہے وہ بھی اللہ کی اجازت سے اور جو شفیع ہوتا ہے وہ بھی اس کے اذن سے۔ اس لئے اس وسیلہ اور شفیع کے ساتھ وابستگی کے بعد بھی بندہ کی لو اللہ سے لگی رہتی ہے اور اس کی طرف سے ذہن کی توجہ منقطع نہیں ہوتی۔

یہی وہ نکتہ ہے جسے وہابی جماعت نہیں سمجھتی اور وہ مشرکین کے تصور وسائل اور مسلمین ومومنین کے تصور وسائل میں فرق محسوس نہیں کرتی حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرکین چونکہ وسائل کو مستقل مان لیتے ہیں اور اللہ سے اب بے نیاز ہونے کا احساس رکھتے ہیں اس لئے عبادت انہیں وسائل کی کرنے لگتے ہیں اور مسلمان ان وسائل کے بعد بھی اصل کارساز اللہ کو جانتا ہے اس لئے مقربین سے توسل کے باوجود بھی عبادت ان مقربین کی نہیں کرتا بلکہ عبادت اللہ ہی کی کرتا ہے۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

''اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، بلاشبہ وہی پہلے پہل مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ اسے زندہ کرے گا تا کہ جزا دے انہیں کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے عدالت کے ساتھ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، انہیں کھولتا ہوا پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے''۔

جزا وسزا کو عدالت کے ساتھ وابستہ کرنا اس عقلی حقیقت کا اظہار ہے کہ کارگاہِ آخرت کی ترتیب عدل الٰہی کا نتیجہ ہے اس لئے جو مسلمان فرقے عدل کو اللہ کے لئے ضروری نہیں سمجھتے ان کا آخرت پر ایمان بے بنیاد قرار پاتا ہے جسے صرف رسمی حیثیت حاصل ہوسکتی ہے حقیقی ایمان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤

’’وہ وہ ہے جس نے آفتاب کو چمک دار بنایا اور چاند کو روشن اور اس کی مختلف منازل قرار دیں تا کہ تمہیں برسوں کا شمار اور حساب معلوم ہو۔ اللہ نے یہ سب نہیں پیدا کیا مگر بالکل صحیح ومناسب [۱] وہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے آیات ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں‘‘۔

اسلام میں ماہ وسال کے قمری حساب کا اعتبار

چاند کی منازل قرار دینے کا مقصد برسوں کا شمار قرار دینا، اس کی دلیل ہے کہ اسلام میں سال قمری ہی معتبر ہے نہ کہ سال شمسی جیسا کہ آج کل کے بعض خودرو، آزاد مفکرین کا رجحان ہے

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝۶

یقیناً رات اور دن کی ادل بدل میں [۲] اور اس میں کہ جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو نجات کی فکر رکھتے ہوں۔‘‘

رات اور دن کے ادل بدل کے ساتھ خلقت آسمان وزمین کیلئے جن نشانیوں کا اجمالی حوالہ دیا گیا ہے ان کا کافی زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کے پہلے دوسرے پارہ میں تذکرہ آچکا ہے، اس طرح کہ:

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات اور دن کی ادل بدل میں کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں، اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا تو اس سے زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد جان دار بنادیا اور اس میں ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلا دیئے، ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور اس بادل میں جسے آسمانوں اور زمین کے درمیان پابند رہنا پڑتا ہے، نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقل سے کام لیں‘‘۔ (بقرہ آیت ۱۶۴)

وہاں ان نشانیوں کو کہا گیا تھا **لقوم یعقلون** ان کے لئے جو عقل سے کام لیں، یہاں کہا جارہا ہے: **لقوم یتقون** ان لوگوں کے لئے جو نجات یعنی عذاب آخرت سے بچنے کی فکر رکھتے ہیں، یہ دونوں باتیں لازم وملزم کی حیثیت رکھتی ہیں، عقل کا تقاضا یہی ہے کہ امکانی خطرات سے اپنا بچاؤ کرے اور یہی عقل کا فیصلہ تحقیق حق اور فکر ونظر کی دعوت دیتا ہے اور جب فکر ونظر سے کام لے گا تو پھر یہ دلائل قدرت جو کائنات آسمان وزمین میں جلوہ گر ہیں، رہنمائی کریں گے اور انسان اپنے ضمیر کے فیصلہ سے قبول حق اور ایمان کے لئے مجبور ہوگا۔ [۳]

ان لوگوں کے لئے ان نشانیوں کا ہونا اسی طرح کہا گیا ہے جیسے قرآن کو کہا گیا ھدًی للمتّقین وہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ فائدہ اس سے یہی لوگ اٹھاتے ہیں اسی طرح یہ نشانیاں نمایاں تو سب کے لئے ہیں، لیکن ان سے صحیح فائدہ اٹھانے

---

[۱] ۔ لا عبثا تعالیٰ عن ذٰلك (جلالین)

[۲] ۔ بالذّھاب والمجیئی والزیادۃ والنقصان (جلالین)

[۳] ۔ یتقون فیئومنون (جلالین)

والے وہی ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور جو نجات کی فکر رکھتے ہیں۔[1]

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝۸

''یقیناً وہ جنہیں ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے اور وہ اس دنیوی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہیں اور وہ جو ہماری آیات سے بے پرواہ ہیں، یہ وہ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ میں ہیں ان اعمال کی سزا میں جو وہ کرتے تھے''۔

ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے'' یعنی اس دنیا کے بعد کسی اور دور حیات کے جسے آخرت کہتے ہیں، وہ قائل نہیں ہیں۔[2]

چونکہ دنیا میں جو حالات انسان کو پیش آتے ہیں اکثر اسباب طبیعیہ کی طرف یا کسی انسان کی طرف منسوب ہوتے ہیں لیکن آخرت کی تمام منازل وہ ہیں جن میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا سبب کارفرما ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے ان منازل کے پیش آنے کو مجازاً قرآن میں لقائے الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔[3]

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝۹ دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۰

''یقیناً وہ کہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کئے، انہیں ان کا پروردگار ان کے ایمان کی بدولت منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ ان کے زیر قدم نہریں رواں ہوں گی، آرام والے بہشت کے باغوں میں، وہاں ان کی صدا یہی ہوگی کہ پاک ہے تیری ذات اے اللہ اور آپس کی ملاقات کے وقت ان کی دعا سلام کے ساتھ ہوگی اور آخر میں ان کی آواز ہوگی کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

اہل بہشت کا سلام۔ سلامٌ علیکم

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

اوّل عجائب نعمات دیکھ کر کہیں گے پاک ذات یعنی سبحان اللہ، پھر اس کی لذت پا کر کہیں گے الحمدللہ اور جنت میں طور ملاقات یہی ہے، السلام علیک جو دنیا میں مسلمان کرتے ہیں (موضح القرآن)

اب اسے دھاندلی نہ کہیے تو کیا کہیے کہ قرآن کہہ رہا ہے: سلام (بغیر الف لام) اور آپ اس کی شرح میں فرما رہے ہیں السلام علیک

---

[1] خصّ المتّقین بالذکر لما کانوا ھم المنتفعین دون غیرھم (تبیان)
[2] لقاءنا بالبعث (جلالین)
[3] لاق ملاقاة مالا یقدر علیہ الا اللہ یحسن ان یجعل لقاء اللہ تعظیما لشانہ (تبیان)

(الف لام بڑھا کر) جس کی عادت آپ کو ہے، یہ آخر کیوں؟
یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اہل جنت کا آپس کا سلام ''سلام علیکم'' ہی ہے جو دنیا میں مومنین کرتے ہیں۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾

''اور یہ لوگ بھلائی حاصل کرنے کے لئے جتنی جلدی کرتے ہیں، اتنی جلد اگر اللہ ان کے واسطے خرابی لے آئے تو ان کی عمر کا خاتمہ ہی ہو جائے مگر ہم تو چھوڑے ہوئے ہیں ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہ وہ اپنی سرکشی کے اندر اندھا دھند مبتلا رہیں۔''

انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کے خوش گوار نتائج جلد سے جلد اس کے سامنے آ جائیں خالق فرماتا ہے کہ اسی طرح اگر ان کے برے کاموں کے جو خراب نتائج ہیں، ان کے سامنے لانے میں اللہ یونہی جلد بازی سے کام لے تو کیا ہو؟ لیکن اللہ ایسا نہیں کرتا تحمل سے کام لیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ وہ خوب کھیل کھیل لیں، پھر آخر میں ان کو جس سخت ترین سزا کے وہ مستحق ہیں، وہ دی جائے گی۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور آدمی پر جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے کروٹ کے بل یا بیٹھے یا کھڑے (جس عالم میں بھی ہو) اس کے بعد جب ہم اس کی مصیبت دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا چلتا ہوتا ہے جیسے کہ کسی مصیبت میں جو اس پر پڑی ہو، اس نے ہمیں پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے آراستہ ہوا وہ طرز عمل جو وہ اختیار کئے ہوئے تھے''۔

ظاہر ہے کہ صریحی کافروں اور اللہ کے منکروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو زبان سے خدا کے قائل ہیں لیکن عملی زندگی میں اس کی اطاعت سے بے نیاز ہیں، یہ جب وقت پڑتا ہے تو دیکھئے کیسی منتیں مرادیں مانتے ہیں اور کس طرح خدا سے دعا کرتے ہیں اور جب وقت نکل جاتا ہے تو کس طرح خدا فراموشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہی ہیں جن پر اس آیت میں تنبیہی تازیانہ لگایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

''اور ہم نے تمہارے پہلے بہت نسلوں کو ختم کر دیا جب کہ انہوں نے ظلم سے کام لیا اور ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے لے کر آئے اور وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہ تھے، یونہی سزا دیتے ہیں ہم مجرم لوگوں کو۔''

"قرن" یوں تو زمانہ کی ایک خاص مدت کا نام ہے مگر یہاں پر ہر زمانہ کے وہ لوگ مراد ہیں جو اس کے بعد والے زمانہ میں افسانہ ماضی بن جاتے ہیں اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔[۱]

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں روئے زمین پر ان کی جگہ پیدا کیا تا کہ ہم دیکھیں تم کیسے اعمال کرتے ہو"۔

یعنی اگر تم نے بھی ویسا ہی ظلم وستم کیا جیسا کہ وہ کر چکے تھے تو تمہیں بھی اسی انجام کا منتظر رہنا چاہیے جو ان کا ہوا۔[۲]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

"اور جب ان کے سامنے ہماری آیات جو بہت ہی صاف ہیں پیش ہوتی ہیں تو وہ جنہیں ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے، کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کیجیے یا اس کو بدل دیجیے، کہیے کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اسے خود اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو نہیں پیروی کرتا مگر اس کی کہ جو میری جانب وحی ہوتی ہے یقیناً میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، تو میں ڈرتا ہوں ایک بڑے دن کے عذاب سے"۔

ان کے مطالبہ میں جو دو لفظ ہیں: "اس کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کیجئے یا اس کو بدل دیجئے" اس کا مطلب ہمارے ذہن میں جو پہلی دفعہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ "اس کے علاوہ" پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسری کتاب پیش کیجئے۔ جو بنیادی طور پر اس کتاب سے الگ ہو اور بدل دیجئے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اپنے ڈھانچے کے لحاظ سے تو یہی رہے مگر اس کی مندرجہ مضامین میں کچھ ردوبدل ہو جائے جو ان کے حسب دل خواہ ہو مگر ایک فرق ان دونوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا قرآن پیش کیجئے۔ اس میں تو یہ ہے کہ یہ کتاب بھی چاہے رہے مگر کوئی اور قرآن بھی جو ہمارے لئے قابل قبول ہو، پیش کیجئے اور بدلنے کے یہ معنی ہیں کہ یہ کتاب اٹھا ہی لی جائے اور اس کے بجائے دوسری کتاب آجائے۔[۳]

مگر مجھے اس تفسیر کے دیکھنے کے بعد بھی پہلا ہی مفہوم درست معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ وہ تو اس قرآن سے اس لئے ناراض ہیں کہ اس میں ان کے خداؤں کی مذمت ہے اور ان کے شرک اور دیگر مزعومات کی رد ہے تو اگر یہ قرآن اسی طرح باقی رہا اور کوئی دوسری کتاب بھی اگر تو اس سے ان کی طبیعت کو پھر بھی خوشی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ چیز تو موجود ہی ہے جو ان کے لئے باعث آزار و تکلیف ہے۔

پھر یہ کہ اس کے ساتھ دوسری کتاب آنے اور اسی میں تبدیلی ہونے میں بنیادی طور پر اتنا فرق ہے کہ اس کے جواب میں رسولؐ کی طرف سے پھر دو باتوں کے کہنے کی ضرورت ہے کہ نہ میرے لئے دوسرا قرآن پیش کرنا ممکن ہے اور نہ اس کا بدلنا ممکن ہے لیکن جواب میں جو کہا گیا

---

[۱] القرون الامم (جلالین) سمی اهل كل عصر قرنا لمقارنه بعضهم لبعض (تبیان)

[۲] معناه انكم ان عملتم بالمعاصی مثل ما عمل بها اولئك اهلكم كما اهلك من تقدم (تبیان)

[۳] انما فرق۔۔۔ لان الایتان بغیره قد یكون معه۔۔۔ وتبدیله لا یكون الا یرفعه (تبیان)

ہے اس میں تبدیلی ہی کو کہا گیا ہے کہ میرے اختیار میں نہیں ہے یہ ہمارے مفہوم کی بنا پر درست ہے کیونکہ اس صورت میں دونوں شقیں تبدیلی ہی کی حیثیت رکھتی ہیں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں کل کی تبدیلی کا مطالبہ ہے دوسرے میں جز کی تبدیلی کا۔ اس لئے جواب میں مطلق تبدیل کو اپنے اختیار سے باہر کہنے سے دونوں ہی باتوں سے معذوری کا اظہار ہو جاتا ہے۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"کہیے کہ اگر اللہ کو ایسا منظور ہوتا تو میں اس کو تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ وہ تمہیں اس پر مطلع کرتا[۱] کیونکہ اس کے پہلے میں ایک عمر تک تمہارے درمیان رہ چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے؟"

قبل بعثت رسول کی خاموشی سے آپ کے پیغام کے الٰہی ہونے کا ثبوت

انسانی تصورات فطری طور پر تدریجی حیثیت سے نشوونما پاتے ہیں، اگر رسالت کا وہ تصور صحیح ہوتا جو ذہنی ارتقاء اور ماحول وغیرہ کی مناسبتوں پر بنیاد قائم کر کے آج بھی اکثر تعلیم یافتہ حلقوں کے اندر پیش کیا جاتا ہے کہ اس وقت کے سماجی ماحول کے تقاضے سے رسول کا ذہن جو فطری طور پر غیر معمولی حس رکھتا تھا، متاثر ہو کر ان اصلاحات کی طرف مائل ہوا جو انہوں نے بنام رسالت پیش کیں تو چالیس برس تک آپ کی زبان پر وقتاً فوقتاً اس طرح کی گفتگو میں آنا چاہئیں تھیں جو اس ماحول سے بیزاری اور ان امراض کی نشان دہی پر مشتمل ہوتیں جنہیں آپ سماج میں محسوس فرما رہے تھے[۲] مگر چالیس برس تک آپ کی زبان پر اس قسم کا کوئی جملہ نہ آنا[۳] اور پھر ایک دم اس پیغام کو لے کر کھڑے ہو جانا، یہ خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ آپ کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خدا کی طرف کا پیغام ہے جس کے آپ حامل بنائے گئے ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

"تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیات کو جھٹلائے یقیناً جو مجرم ہیں وہ کبھی فلاح و نجات نہیں پا سکتے"۔

قرآنی رواداری کی نمایاں مثال

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور یہ انتہائی روادارانہ انداز میں فریق مخالف کو اپنے برابر کی سطح پر لا کر دعوت تفکر دینا ہے۔
یعنی۔۔۔ سوچو، سمجھو اور غور کرو، جو میں پیش کر رہا ہوں، وہ اگر میری طبع زاد چیز ہو اور میں خدا کی طرف غلط نسبت دے رہا ہوں تو بے

---

[۱]۔ معنی قوله ولا ادرا کم به قال ابن عباس ولا اعلمکم به (تبیان) خبردار نکردے خدا شمارا بآن (شاہ ولی اللہ)
[۲]۔ یعنی اپنی طرف سے بناتا تو چالیس برس کی عمر میں بناتا یا اس قسم کا خیال رکھتا (موضح القرآن)
[۳]۔ مکثت فیکم عمرا سنین اربعین من قبله لا احدّثکم شئی (جلالین)

شک مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں لیکن اگر یہ اللہ کا کلام ہے اور تم اس کا انکار کر رہے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو حقیقۃً اللہ کی آیات ہیں، انہیں تم جھٹلا رہے ہو تو تم سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں، اب خوب سمجھ لو اور غور کر لو کہ ہم میں سے کون ہے جو واقعتاً ایسے جرم عظیم کا مرتکب ہے۔[1]

یہی حکیمانہ انداز بحث وہ ہے جسے آج غیر اقوام کے سامنے دعوت تدبر کے لیے اختیار کیا جاتا ہے تو ایک حلقہ اس میں انکار مسلمات یا عقائد کو مشکوک قرار دینے کے پہلو پیدا کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہی حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ سبیل رب کی طرف دعوت کا اصل انداز ہے جس کی قرآن نے تعلیم بھی دی ہے اور پیغمبرؐ خدا کا بوحی الٰہی اسی کے مطابق عمل بھی قرآن میں موجود ہے۔

بے شک بعض مفسرین ہیں جنہوں نے دونوں جزء کو کفار سے متعلق قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے سے مراد اس کے لیے شریک قرار دینا اور آیات قرآن کو جھٹلانا ہے۔[2]

مگر اس صورت میں افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ(یونس۔۱۷)اللہ پر جھوٹ افتریٰ کرے اور اس کی آیات کی تکذیب کرے'' ہوتا اس لیے کہ ان میں دونوں باتیں جمع تھیں مگر قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یا تو اس پر جھوٹ افترا کرے اور یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔اس سے پہلے ہی معنی زیادہ صحیح ومناسب معلوم ہوتے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

''وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ انہیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں، کہئے کہ کیا تم اللہ کو اطلاع دیتے ہو ایک ایسی چیز کی جس کی خود اسے آسمانوں اور زمین میں کوئی خبر نہیں ہے پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اس سے کہ جو یہ شریک قرار دیتے ہیں''۔

علم مطابق واقعہ ہوتا ہے، جب کہ ان کا شریک خدا ہونا خلاف واقعہ ہے تو اللہ کو اس کا علم بھی کہاں ہوسکتا ہے، اللہ کو علم نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شے کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔[3]

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

---

[1] ۔لا احد اظلم ممّن اختراع کلاما واخبرا ثم اضافه الی الله ویرید به النبی ﷺ نفسه او کان فعل "او كذّب بآيته" (تبیان) یعنی اگر میں بناتا ہوں تو مجھ سا ظالم نہیں اور جو میں سچا ہوں تو جھٹلانے والوں پر یہی بات ہے۔(موضح القرآن)

[2] ۔افتریٰ علی الله كذبا بنسبته الشريك اليه (جلالين)

[3] ۔لما نفی العلم بذلك نفی المعلوم (تبیان) لو كان له شريك لعلمه اذلا يخفى عليه شئ (جلالين)

''اور نہ تھے لوگ مگر ایک مذہب کے، پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی ایک بات جو پہلے سے طے شدہ تھی تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان باتوں میں کہ جن میں ان کے درمیان اختلاف تھا''۔

اس آیت کا مضمون بھی قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے ''سب ایک مذہب کے تھے''، یعنی سب کا اصلی دین اسلام تھا[1] یہ اختلاف بعد میں پیدا ہوا۔

''اگر نہ ہوتی اللہ کی ایک بات جو پہلے سے طے شدہ تھی۔'' یعنی یہ کہ اصل جزا و سزا اعمال کی آخرت میں ہوگی[2] تو یہی دنیا میں فیصلہ ہو جاتا یعنی کافروں پر عذاب نازل ہو جاتا اور دنیا میں ایک ہی دین رہ جاتا جو دین حق ہے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟ کہہ دیجئے کہ غیب اللہ سے مخصوص ہے تو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں''۔

یہ کفار کی دھاندلی تھی کہ آیات و دلائل حقانیت پیش ہونے کے باوجود[3] وہ برابر کہے جاتے تھے کہ کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟ اس کے جواب طرح طرح سے قرآن میں آئے ہیں۔

یہاں جو کہا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں آ چکیں، تو تم نے مانیں نہیں، اب آگے کونسی نشانی ایسی ہوگی جسے تم بھی مان لو، یہ غیب کی بات ہے، تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

وَإِذَآ أَذَقْنَا ٱلنَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ ٱللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾

''اور جب ہم انسانوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں کسی تکلیف کے بعد جو ان پر پڑی ہے تو وہ ہماری قدرت کی نشانیوں کے بارے میں اپنی ترکیبیں لڑانے لگتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اللہ ترکیب میں زیادہ تیز ہے، بلاشبہ ہمارے نمائندے لکھ رہے ہیں، وہ جو تم ترکیبیں لڑاتے ہو''۔

ترکیبیں لڑانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نعمت الٰہی کے لئے اعتراف کے تیار نہیں ہوتے بلکہ ایک تو اپنی ذہانتیں صرف کر کے اس کے مادی اسباب تجویز کرنے لگتے ہیں اور پھر اس نعمت الٰہی کے استعمال کے ایسے ایسے طریقے نکالتے ہیں جو مرضی الٰہی کے خلاف ہیں، یہ دونوں کفران نعمت

---

[1] ۔علی دین واحد وھو الاسلام من لدن اٰدم علیہ السلام الیٰ نوح علیہ السلام (جلالین)

[2] ۔بتاخیر الجزآء الیٰ یوم القیامۃ (جلالین) من انہ لا یعاجل العصاۃ بالعقوبۃ (تبیان)

[3] ۔قد کان اتاھم بالمعجزات التی تدل علی صدقہ (تبیان)

کی صورتیں ہیں۔ [۱]

"اللہ ترکیب میں زیادہ تیز ہے" یعنی اسباب بھی تو اسی کے قبضہ میں ہیں۔ وہ چاہے تو اسباب راحت کے بجائے پھر فوراً اسباب زحمت پیدا کردے۔ [۲]

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَنْجٰىھُمْ اِذَا ھُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

"وہ وہ ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوئے اور وہ چلیں ان (مسافروں) کو لے کر موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوئے تو آ گئی ان پر تیز جھکڑ کی ہوا اور آ گئیں ان پر لہریں ہر طرف سے اور انہوں نے سمجھا کہ وہ گھر گئے ہیں تو وہ پکارنے لگے اللہ کو خالص اس سے لو لگاتے ہوئے [۳] اگر تو ہم کو اس سے چھٹکارا دے دے تو ضرور ہم شکر گزار ہوں گے۔ اس کے بعد جب اس نے انہیں چھٹکارا دے دیا تو ایک دم وہ دنیا میں ناحق بغاوت کرنے لگے اے لوگو! تمہاری بغاوت سے نقصان خود تمہارا ہی ہے۔ اس دینوی زندگی سے فائدہ اٹھالو، پھر ہماری ہی طرف تمہارا پلٹنا ہے تو ہم تمہیں بتائیں گے جو تم اعمال کرتے تھے۔ گزشتہ آیت میں انسان کا رویہ جو مجملاً بیان ہوا تھا، اس کی یہاں تمثیلی طور پر تفصیل ہے"۔ [۴]

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىھَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِيْدًا

[۱] ۔یعنی سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر اللہ پر رہتی ہے جب کام بن گیا، لگا اسباب پرکھنے (موضح القرآن)

[۲] ۔ڈرتا نہیں کہ اللہ پھر ایک سبب کھڑا کردے اسی تکلیف کا (موضح القرآن)

[۳] ۔مخلصین له الدین الدعاء (جلالین)

[۴] ۔خدا تعالیٰ بیان می فرماید کیفیت مکر و کفران نعمت (فتح الرحمن)

كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''دنیوی زندگی کی مثال تو بس اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے سبب سے مل جل کر پیدا ہوئیں زمین سے اگنے والی چیزیں جنہیں انسان و مویشی کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین زیب و زینت کو لے چکی اور وہ سنور گئی اور اس کے باشندے سمجھنے لگے کہ انہیں اس پر قابو حاصل ہے تو آ گیا اس پر ہمارا حکم رات یا دن کو تو ہم نے اس کو کٹا پھٹا بنا دیا ایسا جیسے کہ کل اس کا وجود ہی نہ تھا، اس طرح تفصیل کے ساتھ ہم آیات پیش کرتے ہیں ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں''۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

''اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگاتا ہے''۔

''سلامتی'' کے گھر ''یعنی بہشت کی طرف''[1] یہ دعوت اس کی سب ہی کو ہے اور یہ اس کا بلانا وہ ہدایت عام ہے جس کے ذریعہ سے اتمام حجت ہوتی ہے، اس کا سب کے لیے ہونا ضروری ہے۔ اب جن میں طلب خیر کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے اس کی توفیقات خاص شامل حال ہوتے ہیں، انہیں کہا گیا ہے کہ ''جسے چاہتا ہے، سیدھے راستے پر لگاتا ہے''۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

''جنہوں نے نیک کام کیے ہوں، ان کو ویسا ہی نیک بدلہ ملے گا اور کچھ بڑھ کر اور نہیں چھائے گی ان کے چہروں پر سیاہی اور نہ ذلت و حقارت یہ جنت والے ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنہوں نے برے اعمال کیے تو انہیں برائی کی سزا ملے گی، ان پر ذلت و حقارت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ سے ان کو بچانے والا کوئی نہیں ہے، گویا ان کے چہروں کو ڈھانپ دیا گیا ہوگا اندھیری رات کے ٹکڑوں سے، یہ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

''نیک کاموں'' کے بدلے میں ''ویسا ہی'' کہا گیا پھر کہا گیا ''کچھ بڑھ کر'' کیوں کہ جزا کا بڑھ کر دینا تفضّل ہونے کی بنا پر مستحسن ہے

---

[1] ۔ یعنی الجنة (علی بن ابراھیم)

لیکن برے کاموں میں بس اتنی ہی کا اعلان ہے کیوں کہ سزا کا بڑھ کردینا ظلم ہے جو عدل الٰہی کے خلاف ہے۔[1]

علمائے اہل سنت جو دیدار کے قائل ہیں، انہوں نے اس سے اپنا مطلب عجیب طرح نکالا ہے کہ جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے حسنی ہے یعنی جنت اور زیادتی ہے یعنی دیدار الٰہی[2] مگر اس صورت میں اس کے بالمقابل بداعمالوں کے لیے بھی ہونا چاہیے کہ ان کے لیے ویسی ہی سزا ہے اور وہ دوزخ ہے اور اس پر زیادتی اور وہ دیدار سے محرومی مگر ایسا نہیں کہا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جو تصریحات موجود ہیں، ان کے پیش نظر یہاں جو جزا کے لیے "الحسنی و زیادہ" کہا گیا اور سزا کے لیے جو "جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا" کہا گیا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ وہی چیز ہے جو دوسرے مقامات پر دوسرے الفاظ میں کہے گئے ہیں۔ مثلاً مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا جو نیک کام کرے، اسے دس گنا ملے گا اور جو برا کام کرے، اسے بس اتنی ہی سزا ملے گی۔[3] (انعام ۱۶۰)

اب یہاں جلالین یا ان کے پہلے صحیح مسلم کی راوی صاحب کیا کہیں گے؟ ایک جزا سے مراد لیں جنت اور پھر نو عدد کی جو زیادتی ہے، اسے کیا نو بار دیدار کے معنی میں لیں گے؟ اور پھر ایک جگہ جو راہ خدا میں خیرات کی جزا بتائی گئی ہے:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

مثل اس دانہ کے جس سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ (بقرہ ۲۶۱)

اور پھر: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ 'اللہ جسے چاہتا ہے اور بڑھا کر دیتا ہے' اسے کیا کہا جائے گا؟ دیدار کا شوق بھی اتنا کیا کہ قرآن کے ہر لفظ سے بلاوجہ دیدار ہی کا خواب نظر آئے۔

ہاں الحسنی و زیادۃ کا ایک اور مفہوم ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے جس کے قبول کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ الحسنی سے مراد تو ایمان و عمل کی اصل جزا ہے جس کا آخرت سے تعلق ہے اور وہ بہشت ہے اور "زیادہ" سے مراد یہ ہے کہ اس جزا کے علاوہ دنیا میں انہیں جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں، وہ اس پر مزید ہیں یہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی نعمتیں ان کے آخرت کے ثواب میں سے مجرا کر لی جائیں۔[4]

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲۸

---

[1] ۔ لان الزیادۃ علی قدر المستحق من العقاب ظلم ولیس کذٰلك الزیادۃ علی قدر المستحق من الثواب لان ذٰلك تفضل یحسن تعلہ ابتداءً (تبیان)

[2] ۔ الحسنی الجنہ وزیادۃ ھی النظر الیہ تعالیٰ کما حدیث فی مسلم (جلالین)

[3] ۔ معناہ ان لھم زیادۃ الفضل علی قدر المستحق علی طاعاتھم من الثواب وھی المضاعفۃ المذکورۃ فی قولہ: فلہ عشر امثالھا (تبیان)

[4] ۔ فاما الحسنی فالجنۃ و اما الزیادۃ فالدنیا ما اعطاھم اللہ فی الدنیا لم یحاسبھم بہ فی الاٰخرۃ و یجمع ثواب الدنیا والاخرۃ (علی بن ابراھیم)

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ۝۲۹ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۝۳۰

''اور جس دن ہم ان سب کو محشور کریں گے، پھر کہیں گے ان سے جنہوں نے شرک کیا تھا، رہو اپنی جگہ [۱] تم اور تمہارے بنائے ہوئے شریک، تو ہم تفرقہ ڈال دیں گے ان کے درمیان اور ان کے بنائے ہوئے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔ اچھا تو اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بے خبر تھے۔ یہ وہ موقع ہوگا کہ جب ہر ایک نتیجہ دیکھ لے گا [۲] اس کا جو وہ پہلے کر چکا ہے اور سب پلٹائے گئے ہوں گے اللہ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے [۳] اور غائب ہو جائے گا ان سے جو وہ جھوٹ تہمت لگاتے تھے''۔

''تفرقہ ڈال دیں گے ان کے درمیان'' سیاق اور سباق کے لحاظ سے یہ ضمیر مشرکین اور ان کے بنائے ہوئے شرکاء کی طرف راجع معلوم ہوتی ہے۔ یعنی آج ان کا باہمی ایکا ختم ہو جائے گا اور ہر ایک شرک کے جرم کو دوسرے پر ڈال کے خود الگ ہونا چاہیے گا [۴] لیکن ایک مفہوم کے لحاظ سے جو مجھے الفاظ آیت سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ضمیر مشرکین اور مومنین کی طرف راجع ہے کہ ان میں امتیاز اس دن نمایاں ہو جائے گا۔ [۵]

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۝۳۱ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ښ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۝۳۲

''کہیے کہ کون تمہیں روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون ہے جو سننے کی طاقت اور نگاہوں کا مالک ہے؟ اور کون نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے اور کون کائنات کا انتظام کرتا ہے؟ اس پر وہ کہیں گے کہ اللہ، کہئے کہ پھر تم بچاؤ کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ تو یہی تو تمہارا حقیقی پروردگار ہے تو کیا ہے حق کو

---

[۱]۔ مکانکم نصب بالزموا مقدرا (جلالین)

[۲]۔ دریابد ہر شخصی (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ مالك حقیقی ایشان (شاہ ولی اللہ) مالك اپنے حق کے (شاہ رفیع الدین)

[۴]۔ المعنی فرقنا بین المشرکین باللہ وما اشرکوا بہ (تبیان)

[۵]۔ میزنا بینہم وبین المومنین کما فی اٰیۃ: وامتازوا الیوم ایہا المجرمون (جلالین)

چھوڑنے کے بعد سوا گمراہی کے تو کیسے تم مڑے چلے جا رہے ہو"۔ [۱]

"سننے کی طاقت اور نگاہوں کا مالک ہے" یعنی کون انسان کو یہ نعمتیں عطا کر سکتا ہے اور پھر ان طاقتوں کا کام کرتے رہنا بھی اسی کے اختیار سے وابستہ ہے۔ [۲]

جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنے کی مثال بتائی گئی ہے کہ حیوان کو برآمد کرتا ہے نطفہ سے اور پھر نطفہ کو حیوان سے۔ [۳]

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

"اسی طرح تمہارے پروردگار کی بات سچ ہوئی ان لوگوں پر جو بد اعمال ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے"۔

ان کی بدعملی، اعراض اور عناد کا تقاضا تھا جس کی بنا پر خالق نے اعلان فرمایا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، وہی نتیجہ آخر میں سامنے آ گیا، نہ یہ کہ خدا کا یہ اعلان کر دینا اس نتیجے کے وقوع کا باعث ہوا تا کہ اس کی ذمہ داری خالق پر عائد ہو۔

سواد اعظم کے علماء اس منزل جبر و اختیار میں ہمیشہ گومگو میں رہے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں دورنگی سی نظر آتی ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

"یعنی اللہ نے ازل سے ان کی قسمت میں یقین نہیں لکھا اور سبب اس کا بے حکمی" (موضح القرآن)

آخر الفاظ سے ظاہر ہے کہ خالق کے فیصلہ کا سبب ان کی بے حکمی یعنی مخالفت احکام الٰہی ہے۔ نہ یہ کہ ان کی بے حکمی کا سبب خالق کا فیصلہ ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "پروردگار کی بات" سے مراد عذاب کرنے کا فیصلہ ہو۔ اس صورت میں "انھم لا یومنون" کا ترجمہ ہوگا "اس لیے کہ وہ ایمان اختیار نہیں کرتے۔ [۴]

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

"کہیے کہ تمہارے والے شریکوں میں سے کیا کوئی ہے ایسا جو کائنات کو پہلے پہلے پیدا کرتا ہو، پھر اسے دوبارہ زندہ کرتا ہو، کہیے کہ اللہ وہ ہے جو کائنات کو پہلے پہل پیدا بھی کرتا ہے اور اسے دوبارہ زندہ بھی کرے گا، تو تم کس طرح

---

[۱]۔ کیف تصرفون عن الایمان مع قیام الدلیل (جلالین)

[۲]۔ ان شآء اللہ اصحہا وان شآء امرضہا (تبیان)

[۳]۔ حیوان را از نطفہ را از حیوان (فتح الرحمن)

[۴]۔ التقدیر بأنہم او لانہم لا یؤمنون (تبیان)

منحرف ہوتے ہو؟[1] کہیے کہ کیا تمہارے والے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہو؟ کہیے کہ اللہ حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہے؟ کہیے کہ اللہ حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہے تو کیا جو حق کی طرف رہ نمائی کرے، وہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود اس وقت تک راستا نہ پائے جب تک کہ اسے راستہ دکھایا نہ جائے، تو تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے فیصلے کرتے ہو''؟

ابتدائے آفرینش سے جتنے انبیاء آئے سب خدائے واحد کی طرف دعوت دیتے رہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ رہ نمائی خلائق کا نظام اسی ایک ذات کا قائم کیا ہوا ہے جسے ''اللہ'' کہتے ہیں، کوئی دوسرا واقعی خدا ہوتا تو اس کا بھی کوئی ولی کبھی آتا مگر جب ہدایت خلق ایک ہی کی طرف سے ہو رہی ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ خدائے واحد ایک اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یہی وہ استدلال ہے جسے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے اس وصیت نامہ میں جو امام حسن علیہ السلام کے نام ہے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:

لَوْ كَانَ لِرَبِّكَ شَرِيكٌ لَاَتَتْكَ رُسُلُهٗ وَلَرَاَيْتَ اٰثَارَ مُلْكِهٖ وَسُلْطَانِهٖ

اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے اور اس کی سلطنت وحکمت کے بھی آثار تمہیں دکھائی دیتے۔

(نہج البلاغہ شائع کردہ احباب پبلشرز لکھنؤ ص ۷۷۵)

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

''اور ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو نہیں پیروی کرتے مگر ایک طرح کے گمان کی، بلا شبہ گمان حق تک پہنچنے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یقیناً اللہ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو''۔

حجیت ظن کی بحث میں ارشاد الٰہی اور اس کا انعقاد

''حجیت ظن'' کی بحث میں یہ آیت اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے کہ ظن یعنی گمان غالب شرعاً معتبر نہیں ہے مگر یہ قابل لحاظ بات ہے کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں آتی ہے جو اپنا معبود اصنام کو صرف توہمات باطل کی بنا پر بنائے ہوئے ہیں انہیں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس کوئی علمی سند نہیں ہے صرف خیال اور گمان ہے جس کی یہ پیروی کر رہے ہیں۔ یہ اصول دین کا باب ہے اور اصول دین میں کوئی بھی ظن کو معتبر قرار نہیں دیتا۔ حجیت ظن کی بحث جو ہے وہ مسائل شرعیہ کے باب میں ہے اس بناء پر اس آیت سے اس بحث میں استدلال قابل نظر ہے۔

لیکن کہا جا سکتا ہے کہ آغاز آیت یعنی وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اس کا تعلق اگرچہ خاص مشرکین کے ساتھ ہے مگر بعد کا فقرہ:

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا

یقیناً گمان حق تک پہونچنے میں کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

---

[1] ۔تصرفون عن عبادته مع قيام الدليل (جلالین)

یہ ایک عام اصول کے طور پر دین وشریعت کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اس لئے محل ورود اصولِ دین سے متعلق سہی مگر اس کلیہ کے دائرہ میں احکام ومسائل شرع بھی داخل ہوجاتے ہیں اور اس سے استدلال ہر مقام پر درست قرار پاتا ہے، اس لئے بعض مفسرین اہل سنت کو جو اس آیت کے ہوتے ہوئے بھی ظن پر عمل کی گنجائش باقی رکھنا چاہتے ہیں اس کی تفسیر میں قید لگانا پڑی ہے:

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا فِیْمَا الْمَطْلُوْبُ مِنْهُ الْعِلْمُ (جلالین)

بلاشبہ گمان حق تک پہونچنے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا" ان چیزوں میں کہ جن میں یقین مطلوب ہے۔

حالانکہ حکمت آیت تو عام ہے یہ قید اس میں کچھ بلا وجہ سی معلوم ہوتی ہے۔

بے شک کسی خاص طریق ظنی کو جب شارع مقدس نے مستند قرار دے دیا ہے، اپنے نظام حکیمانہ کی بناء پر جو مصالح عمومی یا خصوصی پر مبنی ہوتا ہے تو پھر اس ظن پر عمل حقیقۃً ظن پر عمل ہے ہی نہیں بلکہ اس دلیل علمی پر عمل ہے جو اس ظن کے معتبر ہونے کی متقاضی ہے لہٰذا ایسے ظن کے مطابق عمل اس آیت کی رو سے ممنوع نہیں ہوسکتا۔ [ا]

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۷﴾

"یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے غلط بنا دیا گیا ہو بلکہ وہ تو تصدیق ہے اس کی جو اس کے پہلے ہے اور قانون الٰہی کی تفصیل ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے"۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۹﴾

"کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ پھر لے آؤ ایک سورہ اس کے مثل اور بلا لو جس جس کو بلاسکو اللہ کے علاوہ، اگر تم سچے ہو، بلکہ انہوں نے جھٹلایا اسے جس کے علم پر وہ حاوی نہیں ہیں اور جس کی حقیقت ابھی ان کے سامنے نہیں آئی، اسی طرح جھٹلاتے رہے وہ جو ان کے پہلے تھے تو دیکھو کیا ہوا انجام ان ظالموں کا"۔

یہ انسان کی کوتاہ اندیشی ہے کہ جسے پورے طور پر سمجھتا نہیں، اس کا انکار کرتا ہے اور پھر اس میں جلد بازی کا دخل ہوتا ہے کہ حقیقت ابھی سامنے نہیں آئی تو انکار کردیا۔

[ا] ۔انما تعبدالله فی الشرع فی مواضع بالرجوع الی الظن... لما فی ذلك من المصلحة (تبیان)

شاہ ولی اللہ نے لما یاتھم تاویلہ کا ترجمہ کیا ہے:

وہنوز نیامدہ است مصداق وعدۂ وے

اور ابھی وہ جس پر اس کا وعدہ منطبق ہوتا ہے آیا نہیں ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے بطور شرع لکھا ہے:

''اس کی حقیقت نہیں آئی یعنی جو وعدہ ہے اس قرآن میں، وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا ہے'' (موضح القرآن)

اس کے بعد کیا قابل افسوس بات نہیں ہے یہ کہ اس امت کا ایک طبقہ بھی یہی کر رہا ہے کہ مہدی منتظرؑ کے وعدہ کا مصداق چونکہ ابھی تک سامنے نہیں آیا، اس لئے وہ بجائے انتظار کے انکار پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ہماری تفسیر بتاتی ہے کہ یہ آیت رجعت ہی کے بارے میں ہے۔[1]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۴۰ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْۗـــــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۴۱

''اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ان پر ایمان نہیں لاتے اور تمہارا پروردگار خوب جاننے والا ہے فسادیوں کا اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہیے کہ میرے لئے میرے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، تم بے تعلق ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بے سروکار ہو اس سے جو تم کرتے ہو''۔

یہ روادارانہ انداز تبلیغ ہے جو دوسرے کو اگر وہ عناد و انکار پر بالکل تلا ہوا نہ ہو، اپنے موقف پر غور کرنے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔[2]

''بے سروکار'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے افعال کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہو گی جسے دوسرے مقام پر یوں کہا گیا ہے کہ

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى

کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

اس میں کوئی حکم شرعی ایسا نہیں ہے جس میں اختلاف اوقات سے تبدیلی پیش آنے کا امکان ہو۔ مگر بعض مفسرین بلا وجہ لکھ رہے ہیں کہ یہ آیت احکام جہاد آنے کے بعد منسوخ ہو گئی۔[3]

دراصل یہ بعض قدیم مفسرین اہل سنت کا قول ہے مگر نظر تحقیق سے اس آیت کا جو مطلب نکلتا ہے اور جو درج ہوا، اس میں جیسا کہ ہم نے

---

[1] ۔ نزلت فی الرجعة (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ لم یقل النبی ﷺ ھذا القول شکا فیما یجازی اللہ الکفار و المؤمنین بہ من الثواب و العقاب وانما قال علی وجہ التلطف لخصمہ و حسن العشرۃ وان یستقبلھم لما یکرھونہ من الخطاب فر بما کان داعیا لھم ذٰلک الی الانقیاد و النظر الی قولہ (تبیان)

[3] ۔ ھذا منسوخ بأیۃ السیف (جلالین)

لکھا، نسخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔[1]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۴۲﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ﴿۴۳﴾

''اور ان میں کچھ تو وہ ہیں جو آپ کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں مگر کیا آپ بہروں کو بھی سنا دیں گے؟ چاہے وہ عقل سے کام نہ لیتے ہوں اور ان میں کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں مگر کیا آپ اندھوں کو بھی راستا دکھا دیجئے گا؟ چاہے وہ دیکھیں نہ''۔

پیغمبرؐ کو تسلّی مختلف اندازوں سے دی گئی ہے ان میں سے ایک انداز یہاں ہے مطلب یہ ہے کہ جو توجہ سے سنتے ہیں، آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ متاثر بھی ہوتے ہیں اور ایمان قبول کرتے ہیں مگر جو آنکھیں ہوتے ہوئے اندھے بنے رہیں اور کان رکھتے ہوئے بہرے رہیں، ان کے لئے آپ کیوں اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی ہدایت ضرور ہو جائے، جب وہ اندھے بہرے ہیں تو آپ کے لئے ممکن ہی کب ہے کہ آپ انہیں صدائے حق سنا دیں اور راہ حق دکھا دیں۔

اس تشریح کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو توجہ سے سنتے ہیں وہ اور ہیں اور جنہیں بہرا کہا گیا ہے وہ دوسرے ہیں جو توجہ سے نہیں سنتے، اسی طرح جو نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ اور ہیں اور جنہیں اندھا کہا گیا، وہ دوسرے ہیں جو نظر اٹھا کر دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔

یہ تشریح بالکل اس کے قبل کی آیت کے بھی مطابق ہے کہ:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ

ان میں سے کچھ ایمان لاتے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لاتے۔

وہ جو ایمان لاتے ہیں وہ وہی ہیں جنہیں کہا گیا ہے کہ وہ توجہ سے سنتے ہیں آپ کی باتیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں آپ کی طرف اور اسی بنا پر وہ ایمان لے آتے ہیں اور وہ جو ایمان نہیں لاتے وہ، وہ ہیں جنہیں بہرا اور اندھا کہا گیا ہے اور جو عقل سے کام نہیں لیتے اور دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، ان کے ایمان لانے کا بظاہر کوئی امکان بھی نہیں۔

اس میں بظاہر تو کوئی پیچیدگی نہیں ہے مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے خواہ مخواہ اس کی تشریح میں جبر کا پہلو پیدا فرما دیا ہے وہ توجہ سے سننے والوں ہی کو بہرا اور نظر اٹھا کر دیکھنے والوں ہی کو اندھا قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع میں کہ ہمارے دل پر تصرف کر دیں جیسا بعضوں پر ہو گیا، سو یہ بات اللہ کے ہاتھ میں ہے''(موضح القرآن)

اب یہ جماعت بے چاری کتنی مستحق ہمدردی ہوگئی اور اب روز قیامت خالق کا اسے کفر وعدیم ایمان کی سزا دینا معاذ اللہ کتنا بڑا ظلم ہو جاتا ہے؟ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿الاسراء:۴۳﴾

---

[1] قال ابن زید ھٰذہ الایۃ منسوخۃ بایۃ الجھاد وعلیٰ ما قلناہ لا یحتاج الیٰ ذلک (تبیان)

حالانکہ اس کے بعد بلا فاصلہ وہ آیت آتی ہے جس میں خالق اپنے سے ظلم کی نفی کر رہا ہے۔

ایک دوسری طرح سے بھی دونوں فقروں کو ایک ہی جماعت سے متعلق کیا گیا ہے ایسے انداز میں کہ جبر لازم نہیں آتا۔ اور وہ یہ ہے کہ کافروں میں کچھ ایسے ہیں جو بڑے غور سے آپ کی باتیں سنتے ہیں مگر یہ فیض حاصل کرنے کی خاطر نہیں ہوتا بلکہ نکتہ چینی کے پہلو تلاش کرنے کے لئے لہٰذا ایسا ان کا سننا نیت کے خراب ہونے کی وجہ سے مثل نہ سننے کے ہے اور اس بنا پر کہا گیا ہے کہ یہ بہروں کی طرح ہیں اور ان میں سے کچھ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں مگر فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں لہٰذا ان کا دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر ہے اور اس دیکھنے کے باوجود اندھے ہیں جنہیں ہدایت نصیب نہیں ہوسکتی۔ [1]

اس میں ویسا ہی محذور تو کوئی نہیں ہے جیسا پہلی تشریح میں ہے مگر اس تشریح کی یہ کڑی کہ یہ سننا نکتہ چینی کی خاطر ہے اور دیکھنا بغیر استفادہ کی نیت کے ہے الفاظ قرآن سے سمجھ میں نہیں آتے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٤﴾

”یقیناً اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا مگر لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں“۔

اب یہاں عبدالقادر صاحب بھی ایک دم پلٹا کھا گئے، فرماتے ہیں:

”یعنی بعضوں کے دل میں اثر نہیں دیتا، سو ان کی تقصیر ہے کہ دل صاف کر کے نہیں سنتے“۔ (موضح القرآن)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿٤٥﴾

”اور جس دن ہم انہیں قیامت میں اٹھائیں گے، ایسا معلوم ہوگا کہ وہ نہیں رہے اس عالم میں مگر دن کے تھوڑے حصہ میں، آپس میں ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے اس وقت گھاٹے میں ہیں وہ جو اللہ سے ملنے کو غلط کہتے تھے اور وہ صحیح راستے پر نہ تھے“۔

دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ اس دن ایک دوسرے کو پہچانتا نہ ہوگا مگر یہ دونوں باتیں درست ہیں، قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد فطری طور پر تو ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے مگر پھر ہول محشر وہ ہوگا کہ جس سے بدحواسی اور نفسا نفسی کا عالم ہو جائے گا اور اب جیسے کہ کوئی دوسرے کو پہچانتا ہی نہ ہوگا۔ [2]

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ

---

[1]۔ کانو ا یطلبون السمع الرد لا للفھم... فھم اذا سمعوہ علیٰ ھٰذا الوجہ کانھم ختم لم یسمعوہ... ثم قال : افانت تھدی العمی... ای نظر ھم الیک لا علیٰ وجہ الاستفادۃ بمنزلۃ نظر الاعمی الذی لا یبصر (تبیان)

[2]۔ یعرف بعضھم بعضا اذا بعثوا ثم ینقطع التعارف لشدّۃ الاھوال (جلالین)

شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور خواہ ہم آپ کو آنکھوں سے دکھا دیں کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا آپ کو پہلے ہی دنیا سے اٹھالیں، بہرصورت ان کی رجوع ہماری ہی طرف ہوتی ہے پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو یہ کرتے تھے''۔

یعنی آخر میں اسلام غالب آکر رہے گا اور دوسری تمام جماعتیں مضمحل ہو کر رہیں گی اب اگر ابھی تک یہ بات پورے طور پر نظر نہ آتی ہو اور یقیناً نظر نہیں آتی تو ایمان بالقرآن کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لئے آیندہ وقت کا انتظار کیا جائے کیونکہ یہ مختتم غلبہ کا اعلان ہے ایسا وقتی غلبہ نہیں جو ہوا کے جھونکوں کی طرح سامنے آئے اور پھر ختم ہو جائے۔ اس لئے شاہ عبدالقادر صاحب نے یہاں بلا وجہ اپنے منظورِ نظر صحابہ کی مدح کا جو پہلو پیدا کیا ہے کہ:

''غلبہ اسلام کچھ حضرتؐ کے روبرو ہوا اور باقی ان کے خلفاء سے (موضح القرآن) یہ درست نہیں ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہر قوم کے لئے ایک پیغمبر ہوتا ہے تو جب ان کا پیغمبر آجاتا ہے تو ان کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ ہو جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کی طرف سے رہنما کے آئے بغیر اتمام حجت نہیں ہوتا اس لئے سزا کا استحقاق پیدا نہیں ہو سکتا مگر جب خالق کی طرف کا رہنما آجاتا ہے تو اب جو مخالفت کرتے ہیں انہیں سزا کا استحقاق ہوتا ہے اور ظلم لازم نہیں آتا۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے کچھ عجیب سا لکھا ہے کہ:

عمل آگے سے ہوتے ہیں لیکن رسول کے پہونچنے سے سزا ملتی ہے (موضح القرآن)

اس کا مطلب واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنے لئے نہ کسی نقصان پر قبضہ رکھتا ہوں اور نہ کسی نفع پر مگر جو اللہ چاہے، ہر قوم کی ایک عمر ہوتی ہے جب ان کی عمر پوری ہو جاتی ہے تو ذرا دیر نہ پیچھے ہٹتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں''۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

الْمُجْرِمُوْنَ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ﴿۵۱﴾
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ
تَكْسِبُوْنَ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ﴿۵۳﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پہ اس کا عذاب رات کے وقت یا دن کو آجائے تو وہ کیا چیز ہوگی جس کی گنہگار لوگ جلدی کررہے ہیں؟ کیا اس کے بعد جب وہ آجائے گا تو تم ایمان لاؤ گے؟ کیا اب! حالانکہ اس کی تم جلدی کررہے تھے۔ پھر کہا جائے گا ان سے جو ظالم تھے کہ چکھو ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب، کیا تمہیں سزا مل رہی ہے سوا اس کے کہ جو تم اعمال کرتے تھے؟ اور وہ آپ سے دریافت کررہے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے؟ کہیے کہ ہاں خدا کی قسم وہ ضرور سچ ہے اور تم بے بس نہیں بنا سکتے''۔

یعنی اللہ جب تمہیں سزا دینے کے لئے اپنی گرفت میں لائے تو تم بھاگ کر اس کے قبضہ سے نکل نہیں سکتے کہ وہ بے بس ہوجائے۔ [۱]

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا
رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴿۵۴﴾

''اور اگر ہر اس شخص کی ملک میں جو ظالم ہے، وہ سب ہو جو روئے زمین پر ہے تو وہ معاوضہ میں دے دے اور وہ دل میں چھپائے ہوئے ہوں گے پشیمانی جب کہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور ان کے درمیان فیصلہ ہوا ہوگا، عدالت کے ساتھ [۲] اور ان پر ظلم نہیں ہو رہا ہوگا''۔

پشیمانی کا دل میں چھپانا، اس انسان کی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہے کہ وہ پشیمان ہوتا بھی ہے تو کوشش یہی کرتا ہے کہ لوگوں پر اس کا اظہار نہ ہوتا کہ کسی دوسرے کو طعن وتشنیع کا موقع نہ ملے اس کے لئے حدیث نبوی بھی نقل ہوئی ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی روایت آئی ہے۔ [۳]

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا

---

[۱]۔ ای لستم تقدرون علیٰ اعجاز اللہ عما یرید من انزال العذاب بکم (تبیان)

[۲]۔ بالقسط بالعدل (جلالین)

[۳]۔ روی انه قیل لرسول اللہ ما یعنیهم اسرار الندامة وهم فی النار قال یکرهون شماتة الاعداء وروی مثله عن ابی عبداللہ علیہ السلام (تبیان) عن جابر ابن عیسیٰ رواہ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قیل له ما ینفعهم اسرار الندامة وهم فی العذاب قال کرهوا شماتة الاعداء (علی بن ابراهیم)

يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

”معلوم ہونا چاہیے کہ بلا شبہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، آگاہ ہو کہ بلا شبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر ان میں کے زیادہ نادانی میں مبتلا ہیں۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹنا ہے“۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

”اے انسانو! تمہارے پاس آیا ہے وعظ و نصیحت کا مجموعہ تمہارے پروردگار کی طرف سے اور سینوں کے اندر کی بیماریوں کا علاج اور رہ نمائی اور رحمت ایمان لانے والوں کے لئے کہیے کہ یہ اللہ ہی کی طرف کے فضل و کرم سے ہے تو اس پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے، وہ بہتر ہے اس دولت سے جو وہ جمع کرتے ہیں“۔

موعظہ، وشفاء وہدایت ورحمت، یہ سب اوصاف جن کا پہلی آیت میں ذکر ہے، قرآن مجید اور شریعت محمدیہ سے متعلق ہیں۔ [۱]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

”کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ جو اللہ نے تمہارے لئے روزی کا سامان پیدا کیا ہے تو تم نے اس میں حرام اور حلال خود قرار دے لئے ہیں، کہیے کہ کیا اللہ نے تمہیں حکم دیا تھا یا تم اللہ پر غلط تہمت لگاتے ہو“؟۔

بغیر ثبوت شرعی کسی چیز کو حرام سمجھنا اللہ پر بہتان ہے اور کفران نعمت بھی ہے

چاہے یہ آیت نازل ہوئی ہو اہل کتاب کے بارے میں کہ انہوں نے دل بخواہ کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ کو حرام قرار دے لیا تھا۔ [۲] مگر اس سے یہ عام اصول بھی مستفاد ہوتا ہے کہ حرام اور حلال کے احکام کو خالق کی جانب سے ہونا چاہیے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے دل سے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام قرار دے لے، اگر ایسا کرے گا تو وہ خالق پر ایک افتراء و بہتان کی حیثیت رکھے گا، اسی لئے جناب شیخ مرتضٰی انصاری رحمہ اللہ نے اس آیت کو اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ جب تک خالق کی طرف سے کوئی حکم اس کے مقرر کردہ ذرائع سے ثابت نہ ہو صرف گمان پر حکم لگانا حرام و ناجائز ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ

---

[۱] يريد بذلك القرآن ما اتى به النبي من الشريعة (تبيان)

[۲] هو ما احله وحرمه اهل الكتاب (علي بن ابراهيم)

عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

''اور کیا ہے گمان ان کا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں قیامت کے دن اور بلا شبہ اللہ لوگوں پر بڑے فضل وکرم والا ہے مگر زیادہ تر لوگ شکر گزاری نہیں کرتے''۔

کیا ہے گمان؟ یعنی قیامت کے دن جو جزا وسزا کا دن ہے ان کا گمان چیز ہی کیا ہے؟ اس کی وقعت ہی کیا ہے؟ وہاں ان کے گمان پر تو فیصلہ نہیں ہوگا۔

دوسرے معنی یہ قرار دیے گئے ہیں کہ ان کا روز قیامت کے متعلق کیا گمان ہے یعنی خدا ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، اس بارے میں ان کا کیا تصور ہے؟[1]

آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ نے انسانی رزق کے لئے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں سے کچھ کو بلا وجہ حرام قرار دے لینا کفرانِ نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سے ہمارے اخباری اصحاب کو بھی ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے، جنہوں نے حالت شک میں احتیاط اسی میں سمجھی ہے کہ اس شے کو حرام سمجھ لیا جائے، حالانکہ قرآن مجید پتہ دے رہا ہے کہ اس سے کفران نعمت کی زد میں آنے کا خطرہ ہے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾

''اور نہیں ہوتے آپ کسی حالت میں اور نہ اس کی طرف کی کوئی چیز آپ پڑھتے ہیں اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو مگر تمہارے اوپر حاضر و ناظر ہوتے ہیں جب تم اس میں بڑے انہاک کے ساتھ مصروف ہوتے ہو[2] اور تمہارے پروردگار سے کوئی ذرہ بھر چیز پوشیدہ نہیں رہتی زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور بڑی مگر یہ کہ وہ ایک واضح نوشتہ میں موجود ہے''۔

یعنی لوح محفوظ میں جو علم الٰہی کی خزانہ دار ہے[3] یہ اللہ کے حاضر وناظر ہونے کا تصور ہی سب سے بڑا خوف الٰہی کا معیار ہے جو اصلاح نفوس کے واسطے اور بے راہ روی سے روکنے کے لئے کافی ہے مگر جو گنہگار ہیں ان پر ان کا اثر مرتب نہیں ہوتا اور اثر پذیر اس سے سب سے زیادہ

[1] ۔لمعنی ای شئ یظن الذی یکلفربون علی اللہ انہ یصیبھم یوم القیامۃ علیٰ افترائھم علیٰ اللہ ای لا ینبغی ان یظنوا ان یصیبھم علی ذلك العذاب والعقاب (تبیان)

[2] ۔فالا فاضۃ الدخول فی العمل علیٰ جھۃ الانصاب علیہ وھو الانبساط الیہ فالعمل ماخوذ من فیض الاناء اذا انصب من جوانبہ (تبیان)

[3] ۔مبین بین ھو اللوح المحفوظ (جلالین)

وہی ہوتے تھے جن کا دامن گناہ سے کبھی آلودہ ہی نہ ہوا تھا۔[1]

اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۶۴﴾

''آگاہ ہو کہ اللہ کے جو دوست ہیں، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں رنج ہوتا ہے جو ایمان لائیں اور پرہیزگار رہیں، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی، وہ بہت بڑی کامیابی ہے''۔

دنیوی خوف اور رنج پیش آتے ہیں مگر یہ سب عارضی ہوتے ہیں نتیجہ میں ان کے واسطے کامیابی و کامرانی کے سوا کچھ اور نہیں ہے[2] جس کی خوشخبری ان کو دنیوی زندگی میں مل جاتی ہے جو پیش آمدہ مشکلات و مصائب کے خوف اور رنج کو خوش گوار بنا دیتی ہے اور یہ خوش خبری قرآن وحدیث کے ان عام اعلانات سے بھی ملتی ہے جو ایمان اور تقویٰ پر گراں قدر اجر و ثواب کے متعلق ہیں اور کبھی خصوصی طور پر خواب وغیرہ کے ذریعہ سے جس کے متعلق اہل سنت کے یہاں بھی حدیث ہے[3] اور ہمارے یہاں بھی[4] اور آخرت میں اس کے مظاہر و آثار آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔

وَ لَا یَحۡزُنۡکَ قَوۡلُہُمۡ ۘ اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ؕ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۵﴾

''اور ان کی گفتگو آپ کو رنجیدہ نہ کرے، یقیناً عزت تمام کی تمام اللہ کے لئے ہے، وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

مشرکین رسولؐ کی شان میں جو توہین آمیز جملے کہتے تھے، ان کے مقابلہ میں رسولؐ کو تسلی دی جا رہی ہے[5] کہ ان کی ان باتوں سے آپ کی شان گھٹ تھوڑی سکتی ہے اصل عزت کا مالک اللہ ہے اور جب اس کی طرف سے آپ کو عزت دی گئی ہے تو دنیا میں وہ کون ہے جو آپ کو سبک اور حقیر کر سکے؟

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰہِ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ شُرَکَآءَ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۶۶﴾

---

[1]۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ اذا قرا ھٰذہ الآیۃ بکی بکاءً شدیدا (علی بن ابراھیم)

[2]۔ فی الآخرۃ (جلالین)

[3]۔ فسرّت فی حدیث صحّحہ الحاکم بالرّؤیا الصالحۃ یراھا الرجل او تریٰ لہ (جلالین)

[4]۔ فی الحیاۃ الدّنیا الرّؤیا الحسنۃ یراھا المؤمن و فی الآخرۃ عند الموت (علی بن ابراھیم) قال ابو جعفر علیہ السلام البشریٰ فی الدنیا الرویا الصالحۃ یراھا المومن لا تریٰ لہ (تبیان)

[5]۔ المراد بہ تسلیۃ النبی عن قولھم الذی یؤذونہ بہ (تبیان)

”آگاہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر شرکاء کی جو دہائی دیتے ہیں وہ کا ہے کی پیروی کرتے ہیں؟ وہ نہیں پیروی کرتے کسی چیز کی سوائے گمان کے اور نہیں ہیں وہ سوا اس کے کہ اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں؟“

مايتبع میں جو ”ما“ کا لفظ ہے یہ نافیہ بھی ہوسکتا ہے جس کے بعد معنی یہ ہوں گے کہ جو اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے ہیں وہ نہیں پیروی کرتے کچھ اور شرکاء کی [۱] وہ نہیں پیروی کرتے کسی چیز کی سوا گمان کے مگر ہمیں یہ قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ماسوا الیہ ہے جس کی بنا پر وہ ترجمہ ہوا کہ وہ کا ہے کی پیروی کرتے ہیں۔ [۲]

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

”وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات کو قرار دیا، اس لئے کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو دیکھنے والا، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں“۔

دن خود دیکھنے والا نہیں ہوتا مگر چونکہ دن کو چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں، اس لئے محاورۂ عرب میں دن کی صفت ”دیکھنے والا“ قرار پاتی ہے جس کی مثال ایک بہت زیادہ شائع وذائع محاورہ ہے جو اردو کا بھی تقریباً جز سمجھا جاسکتا ہے ”قائم اللیل و صائم النهار“۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ ”نماز گزار راتوں والا اور روزہ دار دنوں والا۔“ ظاہر ہے کہ راتیں نماز گزار اور دن روزہ دار نہیں ہوتے۔ مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص راتوں میں نماز پڑھتا رہتا ہے اور دنوں میں روزہ سے رہا کرتا ہے۔

بس اسی طرح دن کو دیکھنے والا کہا گیا ہے، اس اعتبار سے کہ دن میں چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ [۳]

مبصرا کے لفظی ترجمہ میں ”دکھلانے والا“ کہنا درست [۴] نہیں ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا

---

[۱] پیروی نمی کنند (شاہ ولی اللہ) نہیں پیروی کرتے وہ (شاہ رفیع الدین)

[۲] یحتمل ”ما“ فی قوله ”وما یتبع“ وجهین: احدهما ان تکون بمعنی ای کانه قال: وای شئ یتبع الذین یدعون من دون الله شرکاء (تبیان)

[۳] جعل النهار مبصرا وانما یبصر فیه (تبیان) اسناد الابصار الیه مجاز لانه مبصر فیه (جلالین)

[۴] دن کو دکھلانے والا (شاہ رفیع الدین)

مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

''انہوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بیٹا بنایا ہے [1] پاک ہے اس کی ذات، وہ بے نیاز ہے، اس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، تمہارے پاس کوئی دلیل اس پر نہیں ہے، کیا تم اللہ پر منڈھتے ہو ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو۔ کہہ دیجئے کہ بلا شبہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھتے ہیں وہ بہتری حاصل نہیں کریں گے، دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھالیں، پھر ہماری طرف ان کی رجوع ہوگی، پھر ہم ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے بدلے میں اس کے جو وہ کفر اختیار کرتے تھے''۔

پہلے پارہ کی ایک آیت کے ذیل میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک بیان آچکا ہے کہ نصاریٰ کا ایک فرقہ اس کا قائل ہے کہ مسیح، اللہ کے بیٹے نہیں ہیں مگر اللہ نے ان کو متنبیٰ بنالیا ہے اور انہیں اپنے کاموں میں شریک کرلیا ہے انہوں نے اِتّخذ کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ قرآن نے اسی فرقہ کی رد کی ہے مگر اس آیت کے ذیل میں ہم نے اس خیال سے اختلاف کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہاں رد میں جو الفاظ کہے گئے ہیں وہ حقیقی ابن ہونے کی رد بتلاتے ہیں۔ اس طرح کے متنبیٰ بنائے جانے کی نہیں مگر یہاں آیت میں بعد میں جو الفاظ ہیں ان سے یہ سمجھ میں ضرور آتا ہے کہ یہ اسی متنبیٰ بنانے کی رد ہے۔

پہلے یہ کہنا کہ **هو الغنى** یعنی وہ بے نیاز ہے، اس کو دوسرے کی ضرورت نہیں [2] دوسرے یہ کہنا کہ ایسی بات کہتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو، ان سب سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ ابن حقیقی ہونے کا عقیدہ نہیں ہے جو بالکل محال عقل ہے اور خدا کی ذات کا بے مثال ہونا اس سے مانع ہے بلکہ یہ وہی ابن قرار دینے کا تصوّر ہے جس کا ایک جز کہ اس نے اپنا شریک قرار دیا ہے، اس کی یہ کہہ کر رد کی گئی ہے کہ اللہ تنہا کیا خدائی کے کام انجام نہیں دے سکتا۔ جو وہ شریک قرار دے اور پھر بیٹا بنانے کی ردیوں کی جارہی ہے کہ اپنا بیٹا قرار دینا، یہ تو اللہ کا عمل ہے کیا اس کی طرف سے تمہارے پاس کوئی پیغام آیا ہے کہ میں نے مسیح کو اپنا بیٹا قرار دیا۔ پھر بلاوجہ اللہ پر تہمت کیوں لگاتے ہو؟!

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ
وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا
يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٧١﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا
سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ
الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰۗىِٕفَ
وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾

---

[1] فرزند گرفته است خدا (شاه ولی الله)

[2] انما يطلب الولد من يحتاج اليه (جلالين)

''اوران کے سامنے نوحؑ کا واقعہ بیان کیجئے کہ جب کہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا: اے میری قوم والو! اگر تم پر شاق ہے میرا قیام اور میری نصیحت کرنا آیاتِ الٰہی کے ساتھ تو میرا تو بھروسا صرف اللہ پر ہے تو تم اپنے تمام مددگاروں کو ساتھ میں ملا کر اپنی مہم کی تیاری کرو[1] پھر تمہیں اس میں کوئی تذبذب وتردد بھی نہیں ہونا چاہیے پھر کر گزرو میرے ساتھ جو کرنا ہو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو، اب اگر تم روگردانی کرتے ہو تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگا ہے میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اللہ پر اور میں مامور اس پر ہوں کہ اس کے سامنے سر جھکائے رہوں، اس پر ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو ہم نے انہیں چھٹکارا دیا اور انہیں کہ جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے اور انہیں دوسری جگہ متمکن کیا، اور غرق کر دیا انہیں کہ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا تو دیکھو کیسا برا انجام ہوا ڈرائے جانے والوں کا''۔

جناب نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی اور طوفانِ عذاب کا تذکرہ متفرق طور پر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہوا ہے یہاں وہ پورا واقعہ بیان نہیں ہوا۔ صرف کشتی اور غرق کا لفظ ہے جو اس پورے واقعہ کی تفصیل کی طرف اجمالی اشارہ کرتا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

''پھر ان کے بعد بہت سے پیغمبران کی قوموں کی طرف ہم نے بھیجے تو وہ ان کے پاس معجزے لے کر آئے[2] مگر وہ ایمان نہیں لانے والے تھے اسی پر کہ جسے پہلے جھٹلا چکے تھے اس طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں ظلم وتعدی کرنے والوں کے دلوں پر''۔

''ان کے بعد'' یعنی نوح کے بعد[3] بہت سے پیغمبر آئے جیسے حضرت ابراہیم، ہود اور صالح علیہم السلام وغیرہ''۔

''مہر لگا دیتے ہیں ظلم وتعدی کرنے والوں کے دلوں پر'' اس سے ظاہر ہے کہ مہر لگنا یعنی سلب توفیقات الٰہیہ نتیجہ ہوتا ہے خود اختیاری ظلم و تعدی کا، نہ کہ اس پر مجبور کرنے والا سبب۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا

---

[1] یعنی سمجھانے سے برا مانتے ہو تو جو کر سکو میرا کر ڈالو (موضح القرآن)

[2] فاتوھم بالحجج والمعجزات الدالۃ علی صدقھم (تبیان)

[3] من بعدہ ای نوح (جلالین)

يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ﴿۷۷﴾

''پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کو فرعون اور اس کے یہاں کے بڑے بڑے آدمیوں کی طرف [1] اپنی نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے تکبر سے کام لیا اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے تو جب ان کے پاس حق آیا ہمارے پاس سے تو انہوں نے کہا یقیناً یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کیا تم حق کو ایسا کہتے ہو جب کہ وہ تمہارے پاس آیا، کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر لوگ کبھی بہتری حاصل نہیں کرتے''۔

اس میں دلیل اعجاز کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی تشریح ہم نے ''مقدمہ تفسیر میں کی ہے یعنی اگر یہ جادو ہوتا تو خدا اسے باطل کردیتا اور جب اس کے باطل کرنے کی کوشش کرنے والے ساحر خود ہی شکست کھائیں گے جیسا کہ بعد میں آئے گا تو اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ پروردگار کی طرف کا حق ہے۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ﴿۸۲﴾

''انہوں نے کہا کہ کیا تم آئے ہو اس لئے کہ ہمیں پھیر و اس سے کہ جس پر ہم نے باپ داداؤں کو پایا ہے اور تمہارے لئے بڑائی ہو اس سرزمین پر [2] اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور فرعون نے کہا کہ لاؤ میرے پاس ہر بڑے واقف کار جادوگر کو تو وہ جادوگر آئے تو ان سے موسیٰ نے کہا کہ پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو تو جب انہوں نے پھینکا، موسیٰ ؑ نے کہا کہ جو تم لائے ہو، وہ جادو ہے یقیناً اللہ اسے باطل کردے گا، بلاشبہ اللہ ٹھیک نہیں رہنے دیتا کام فسادیوں کا اور اللہ حق کو اپنی باتوں سے ثابت کردے گا، چاہے گنہگار لوگ ناپسند کریں''۔

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ کا ترجمہ ہم نے اسے ایک جملہ قرار دے کر یوں کیا ہے کہ ''جو تم لائے ہو، وہ جادو ہے'' دوسرے مترجمین بھی اس سے متفق ہیں [3] مگر ایک تشریح کی بنا پر اس جملہ کا ترجمہ یوں ہوتا ہے کہ کیا ہے وہ جو تم لائے ہو؟ وہ تو جادو ہے'' [4]

---

[1]۔ الملاء الجماعة الذین هم وجوه القبيلة مأخوذ من انهم تملأ الصدور هيبتهم عند منظر هم (تبيان)

[2]۔ ارض مصر (جلالین)

[3]۔ آنچه آورده اید سحر است (شاہ ولی اللہ) جو کچھ لائے ہو تم ساتھ اس کے جادو ہے (شاہ رفیع الدین)

[4]۔ ما استفهامية مبتداء خبره جئتم به (جلالین)

مذکورہ بالا آیات میں معجزہ کی حقانیت کا عقلی فلسفہ درج ہے جیسا کہ اس کے پہلے ابھی آیت ۷۷ کے ذیل میں ہم نے مجملاً اشارہ کیا ہے وہ اب ان آیات میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے جس پر مقدمہ تفسیر میں ہم نے ان آیات کو پیش کرتے ہوئے تبصرہ کیا ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٨٣﴾

''تو نہیں ایمان لائے موسیٰ علیہ السلام پر مگر ان کی قوم کے کچھ بچے فرعون اور ان کے بڑے آدمیوں سے سہمے ہوئے کہ کہیں وہ انہیں سزا نہ دیں اور بلاشبہ فرعون سرکشی کرنے والا تھا روئے زمین پر اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا''۔

''ان کی قوم'' سے بقرینۂ اتصال وتقدم ذکر سمجھ میں یہی آتا ہے کہ ''موسیٰ کی قوم'' یعنی بنی اسرائیل [۱] لیکن بعض لوگوں نے اس ضمیر کو فرعون کی طرف عائد کیا ہے کہ اس کی بھی قوم کے کچھ بچے ایمان لائے۔ [۲]

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾

''اور موسیٰ ؑ نے کہا اے میری قوم والو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو پھر اسی پر بھروسہ رکھو اگر تم مسلم ہو، اس پر انہوں نے کہا کہ اللہ ہی پر ہم بھروسا کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم جماعت کا تختۂ مشق نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں نجات دے اس کافر جماعت سے''۔

اللہ پر ایمان اس مرکز کا صحیح تصور ہے جو انسان کا ملجا و مأویٰ ہو سکتا ہے اور ''اسلام'' عملی منزل میں اس کے تقاضے کو پورا کرتا ہے کہ اپنے تمام امور کو اس پر چھوڑ دے پھر کسی بات کی پرواہ نہ رکھے، اسی لئے شروع میں کہا گیا ہے اگر تم ایمان لائے ہو اور آخر میں کہا گیا اگر تم مسلم ہو۔ [۳]

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٧﴾

''اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ جگہ لو اپنی قوم کے لئے مصر کے گھروں میں اور بناؤ اپنے

---

[۱] جماعتی از قوم وے (شاہ ولی اللہ)

[۲] طائفة من اولاد قومه ای فرعون (جلالین)

[۳] قوله "ان کنتم مسلمین" بعد قوله "ان کنتم اٰمنتم باللّٰه" لتبین المعنی بالصفتین من الاسلام والایمان علی ان الثقة باللّٰه توجب الاستعلام لامره (تبیان)

گھروں کوقبلہ اورنماز کی پابندی کرواورخوش خبری دوایمان والوں کو‘‘۔

’’گھروں کوقبلہ بناؤ‘‘اس کے ایک معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ گھروں کوقبلہ رخ بناؤ۔[1]

حالانکہ یہ ان الفاظ کے معنی نہیں ہوتے ہیں اس کا مطلب ہماری قدیم تفسیر میں یہ درج ہے کہ نماز اپنے گھروں کے اندر ادا کرو[2] یعنی راز فاش نہ ہواور فرعون والوں کے شر سے محفوظ رہو۔

پہلے معنی قرار دینے والے بھی شاید یہی مطلب قرار دیتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

’’مساجدالبیت بناکنند‘‘(فتح الرحمن)

اپنے گھروں کے (اندر) مساجد بناؤ۔

تفسیر جلالین میں ہے:

مصلّٰی یصلّون فیہ لیأمنوا من الخوف وکان فرعون منعھم من الصلوٰۃ

قبلہ یعنی نماز کی جگہ کہ وہیں نماز پڑھیں تاکہ ضرور دشمن سے محفوظ رہیں کیونکہ فرعون انہیں نماز سے روکتا تھا۔

اب دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ تقیہ کی تعلیم نہیں تو کیا ہے؟

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓي اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

’’موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اوراس کے ساتھ کے بڑے آدمیوں کو اس دنیوی زندگی میں زیب وزینت اور بہت اموال دے رکھے ہیں، اے پروردگار! نتیجہ اس کا یہ ہے کہ[3] وہ تیرے راستے سے بہکاتے ہیں، اے ہمارے مالک! نیست ونابود کردے ان کے اموال اور سختی کر ان کے دلوں پر کہ جب تک درد ناک عذاب وہ دیکھ نہ لیں گے ایمان نہیں لائیں گے۔ اس نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوتی ہے اب تم ذرا ٹھیک رہنا اوران کے راستوں کی پیروی نہ کرنا جو علم نہیں رکھتے‘‘۔

دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بیان ہوئی ہے ممکن ہے جناب ہارون علیہ السلام نے آمین کہی ہو کیونکہ جواب موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کو مخاطب

---

[1]۔بسازیدآن خانہای خودرا قبلہ رو (شاہ ولی اللہ) کرو گھروں اپنوں کو روبقبلہ (شاہ رفیع الدین)

[2]۔امروا ان یصلوا فی بیوتھم (علی بن ابراھیم)

[3]۔لیضلوا فی عاقبۃ (جلالین)

کر کے دیا گیا ہے[1] اور تنبیہ پوری قوم بنی اسرائیل کو ہے کہ اب تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا دشمن تباہ تو کیا جاتا ہے مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی کفران نعمت کرو اور پھر تم بھی تباہی کے مستحق قرار پاؤ۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

''اور ہم نے گزار دیا، بنی اسرائیل کو دریا سے تو پیچھا کیا ان کا[2] فرعون اور اس کے لشکر والوں نے بغاوت اور ظلم و تعدی سے یہاں تک کہ جب اس کو ڈوبنے کی صورت سامنے آئی تو اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوا اس ذات کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں، اب؟ حالانکہ اس کے پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فسادیوں میں سے تھا۔ اب آج ہم تجھے تیرے جسم کے ساتھ چھٹکارا دے دیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے قدرت کی نشانی رہے اور لوگوں میں زیادہ ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں''۔

پوری قوم کے ڈوبنے کے ساتھ صرف ایک آدمی کی لاش کا محفوظ طریقہ پر نکل کے خشکی پر آجانا[3] خود ہی ایک غیر فطری بات ہے اور پھر ''بعد والوں کے لئے نشانی'' ہونے کا ذکر بتاتا ہے کہ وہ جسم بعد والی نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ رہے گا۔

اس آیت الٰہی کا تذکرہ قرآن سے پہلے کی کتب آسمانی کے مجموعہ بائبل میں نہیں ہے اب اسے معجزہ قرآنی نہ سمجھا جائے تو کیا ہے کہ اہرام مصر کی کھدائی میں جو لاشیں برآمد ہوئی ہیں ان میں اس فرعون کی لاش بھی موجود ہے جو جناب موسیٰؑ کا ہم عصر تھا اور جو بائبل اور قرآن دونوں کی متفقہ شہادت کے مطابق غرق ہو گیا تھا۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا

---

[1]۔ انما قال ''اجیبت دعوتکما'' والداعی موسیٰ لان دعا موسیٰ کان مع تامین ھٰرون (تبیان)

[2]۔ اتبعہ اتباعا و تبعہ بمعنی (تبیان)

[3]۔ اما فرعون فنبذہ اللہ وحدہ فالقاہ بالساحل لینظر والیہ ولیعرفوہ (علی بن ابراھیم) نلقیک علیٰ نحوۃ من الارض ببدنک عریانا دون روحک (تبیان) نخرجک من البحر ببدنک جدک الذی لا روح فیہ (جلالین) بر مکان بلند افگینم یعنی بروئے آب آریم ترا بھمان جسد تو یعنی بغیر تغیر (شاہ ولی اللہ)

حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور ہم نے جگہ دی بنی اسرائیل کو شایانِ شان مقام پر اور اچھی اچھی نعمات سے انہیں غذا دی تو انہوں نے آپس میں اختلاف نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس آیا علم یقیناً تمہارا پروردگار ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے''۔

علم آنے کے پہلے اختلاف پیدا ہوتا تو قابل معافی ہوسکتا تھا لیکن علم آنے اور حجت تمام ہونے کے بعد انہوں نے اختلاف کیا اس لئے روز آخرت کی باز پرس سے بچ نہیں سکتے اور یہ باز پرس ہی غلط کاروں سے وہ فیصلہ قدرت ہے جو قیامت میں ان کے درمیان ہوگا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ
كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

''تو اگر کوئی شک ہو آپ کو اس میں جو ہم نے آپ پر اتارا ہے تو پوچھ لیجئے ان سے جو کتاب پڑھا کرتے ہیں آپ کے پہلے سے آپ کے پروردگار کی طرف سے حق آ گیا ہے تو نہ ہوجیے شک کرنے والوں میں سے اور نہ ہوجیے ان میں سے جنہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا اور آپ ہونگے گھاٹا اٹھانے والوں میں سے، یقیناً وہ کہ جن پر آپ کے پروردگار کی بات پوری ہو کر رہی، وہ ایمان نہیں لائیں گے، چاہے ان کے پاس ہر طرح کا معجزہ آ جائے، جب تک کہ دردناک عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں''۔

قرآن مجید کا یہ حکیمانہ انداز بیان ہے کہ بہت سی باتیں پیغمبر خداؐ کو مخاطب بنا کر کہتا ہے اور اس سے تنبیہ دوسروں کی مقصود ہوتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

نہ آپ کو کوئی شک تھا نہ آپ کو اہل کتاب سے پوچھنے کی ضرورت تھی[1] نہ آپ کے لئے یہ اندیشہ تھا کہ آپ معاذ اللہ جھٹلانے والوں میں ہوں گے یہ سب باتیں دوسروں سے متعلق ہیں اور یہ راز فاش ہوتا ہے آخر کی آیات سے جب ارشاد ہوا ہے کہ: ''جن پر اللہ کی بات پوری ہوچکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے چاہے کتنے ہی معجزے دیکھ لیں، جب تک کہ عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ معلوم ہوا کہ شروع سے سب

---

[1] روی عنه رضی اللہ عنہا انه قال: ما شككت والا ان شاك وقال ابو عبدالله علیہ السلام لم یسئال النبی رضی اللہ عنہا ویقول ان الخطاب متوجه الی النبی رضی اللہ عنہا والمواد به غیره یشهد به قوله بعد هٰذا: یا ایها الناس ان کنتم فی شك (تبیان)

باتیں انہی لوگوں کی تنبیہ کے لئے کہی جا رہی تھیں' جب تک عذاب آنکھوں سے نہ دیکھ لیں' یعنی بعد از وقت [1] اس لئے کہ عذاب سامنے آنے کے بعد توبہ کرنے کی کوئی قیمت نہیں ہے جس کا مشاہدہ اس کے پہلے قصہ فرعون میں ہو چکا۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾

''تو کیوں نہ کوئی بستی اس وقت ایمان لائی جب کہ اسے اس کا ایمان فائدہ پہنچائے سوائے یونس کی قوم کے جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ہٹا دیا ان سے رسوائی والا عذاب اس دنیوی زندگی میں اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا انہیں ایک مدت تک''۔

پہلے کے جملہ میں جو ضمناً ایک نفی نکلتی تھی کہ عذاب کو دیکھنے کے بعد ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے یا یہ کہ عذاب کے آثار پیدا ہونے کے بعد بھی کوئی بستی ایسی نہ تھی جو صدق دل سے پوری کی پوری ایمان لے آئی ہو [2] اس سے استثناء ہوا ہے کہ قوم یونس کا عموماً تو ایسا ہی ہوتا رہا ہے مگر بس ایک مثال اس کی ہے کہ عذاب آنے کے بعد پوری قوم نے صدق دل سے توبہ کر لی اور وہ توبہ قبول ہو گئی۔

جناب یونسؑ کے قصہ کے اجزاء متعدد مقامات پر قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں یہاں اتنے جز کا حوالہ دیا گیا ہے جو موضوع کلام سے متعلق ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾

''اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو دنیا میں جتنے ہیں، سب ہی ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کیجئے گا کہ وہ مومن ہو جائیں''؟

نظام حکمت الٰہی جبر کا متقاضی نہیں

مطلب یہ ہے کہ خالق کا نظام حکمت جبر کا متقاضی نہیں ہے ورنہ اگر خدا جبر کی طاقت سے کام لینا چاہتا تو کافر کا وجود ہی کہاں رہتا۔ [3]

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٠﴾

---

[1] فلا ینفعھم حینئذ (جلالین)

[2] قال الحسن: معنی الایة انہ لم یکن فیما خلا ان یؤمن اھل قریة باجمعھا حتی لا یشذ منھم احد الا قوم یونس فھلا کانت القریٰ کلھا ھٰکذا (تبیان)

[3] یعنی لو شاء اللہ ان یجبر الناس کلھم علی الایمان لفعل (علی بن ابراھیم)

''اور کسی متنفس کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کی مشیت کے مطابق اور اللہ نجاست کا حکم لگا دیتا ہے ان پر جو عقل سے کام نہیں لیتے''۔

یعنی جبری ایمان اللہ کے اصول کے خلاف ہے تو اس طرح سے تو کوئی آدمی مومن قرار بھی نہیں پا سکتا۔ ان کا کام تو یہ ہے کہ عقل سے کام لیں اور آزاد ضمیر کے فیصلہ کے مطابق ایمان لائیں اور جو ایسا نہیں کرتے [1] انہیں اللہ کفار کے زمرہ میں شمار کر کے نجاست کا حکم لگا دیتا ہے اور مورد عذاب بناتا ہے۔[2]

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''کہیے کہ غور کرو، کیا کیا ہے آسمانوں اور زمین میں؟ اور نشانیاں قدرت کی اور تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں ان کو جو ایمان نہیں لاتے۔ تو کیا انتظار کر رہے ہیں وہ سوا ایسے دنوں کے جیسے ان لوگوں پر آئے جو ان کے پہلے تھے کہیے کہ اچھا پھر انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں، پھر ہم چھٹکارا دیتے ہیں اپنے پیغمبروں کو اور ان کو جو ایمان لائے ہیں، اس طرح ہمارے ذمہ حق ہے [3] کہ ہم اہل ایمان کو چھٹکارا دیں''۔

ما تغنی الایات والنذر میں اگر ما کو استفہامیہ مانا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ بھلا نشانیاں قدرت کی اور تنبیہات کیا فائدہ دے سکتی ہیں انہیں جو ایمان نہیں لاتے۔[4]

مطلب اس کا بھی یہی ہے کہ قدرت کی نشانیاں اور تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

---

[1] لا یعقلون یتدبرون آیات اللہ (جلالین)

[2] قیل فی معناہ: قولان احدھما قال الفراء الرجس العذاب۔۔ الثانی قال الحسن الرجس الکفر (تبیان)

[3] واجبا علینا (تبیان)

[4] قولان: احدھما ان تکون "ما" نفیا والاٰخر ان تکون للاستفھام (تبیان)

وَلَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۰۶﴾

’’کہیے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے کچھ شک وشبہ میں گرفتار ہو تو (صاف سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان کی کہ جن کی اللہ کو چھوڑ کر تم عبادت کرتے ہو بلکہ میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو تمہاری روح قبض کرتا ہے اور میں مامور ہوں اس پر کہ ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور یہ (مجھ سے کہا گیا ہے) کہ تم اپنے چہرہ کو ادھر ادھر سے ہٹا کر اس دین کی طرف سیدھا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی دہائی نہ دو جو نہ تمہیں نفع پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً اس وقت تم ظالموں میں سے ہو گے‘‘۔

وَاِنۡ يَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنۡ يُّرِدۡكَ بِخَيۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ ؕ يُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ وَاصۡبِرۡ حَتّٰى يَحۡكُمَ اللّٰهُ ۖۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۱۰۹﴾

’’اور اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے تو سوا اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تمہارے ساتھ بھلائی چاہے تو کوئی اس کے فضل وکرم کا پلٹانے والا نہیں، اللہ سے پہنچاتا ہے اپنے بندوں میں سے جس تک چاہتا ہے اور وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان، کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس آیا ہے حق تمہارے پروردگار کی طرف سے تو جو ہدایت حاصل کرے گا وہ صرف اپنے لئے ہدایت حاصل کرے گا اور جو گمراہ ہو گا وہ گمراہ ہو کر اپنا ہی نقصان کرے گا اور میں تمہارا کوئی ٹھیکہ دار نہیں ہوں اور پیروی کیجئے اس کی جو آپ پر وحی اتاری کی گئی ہے اور صبر وتحمل سے کام لیجئے جب تک کہ اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے‘‘

سُوْرَةُ هُوْدٍ

مکیّہ-----۱۲۳ آیات

جناب ہود علیہ السلام کا تذکرہ تو اس سورہ کے علاوہ اور سوروں میں بھی ہے اور اس سورہ میں جس طرح جناب ہود علیہ السلام کا ذکر ہے اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ کا بھی ذکر ہے پھر بھی نام اس کا سورہ ہود قرار پایا ہے جس کی خصوصیات کا کوئی سبب ابھی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ جو خاص امور اس سورہ میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ ہود کے خاص خاص موضوعات:

۱......عطائے منصب بحسب قرینہ فضیلت

۲......قرآن کے کلام الٰہی ہونے سے منکر، قوم عرب کے فصحاء و بلغاء سے اس کے مثل دس سوروں کا مطالبہ

۳......طوفان نوح کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ

۴......فرزند نوح کی غرقابی، نوح علیہ السلام کی بارگاہ الٰہی میں سفارش اور خالق کا جواب

۵......بغیر عمل صالح، پیغمبرؐ کی فرزندی بھی کارگر نہیں۔

۶......کوہ جودی پر کشتی نوح کا ٹھہرنا

۷......قوم لوط پر عذاب لانے والے فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کی بشارت دینا، جناب سارہؑ کا تعجب اور فرشتوں کا جواب

۸......اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا
اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ
یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ ؕ وَ اِنۡ
تَوَلَّوۡا فَاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ کَبِیۡرٍ ﴿۳﴾ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی

كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝٤

”الف۔ لام۔ را۔ وہ کتاب ہے جس کی آیات مضبوط اتاری گئی ہیں پھر یہ کہ انہیں واضح بنایا گیا ہے اس ٹھیک ٹھیک کام کرنے والے کی طرف سے جو بڑا باخبر ہے یہ کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی۔ میں تمہیں اس کی طرف سے متنبہ کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور یہ کہ بخشش کے طلبگار رہو اپنے پروردگار سے، پھر اس کی بارگاہ میں لو لگاؤ، وہ تمہیں بہرہ مند کرے گا اچھے فائدوں سے ایک مقررہ مدت تک اور ہر مرتبہ والے کو اس کے درجہ کے مطابق عطا کرے گا اور اگر تم نے روگردانی کی تو مجھے اندیشہ ہے تمہارے لئے ایک بہت بڑے دن کے عذاب کا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے“۔

مقطعات قرآنیہ میں ہمارے ایک ہم عصر صاحب نظر نے یہ ریسرچ کی ہے کہ ہر جگہ اس کے بعد پیغمبرؐ سے تخاطب ضرور ہے اور اس سے وہ اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ یہ مختلف القاب کے ساتھ حضرت کو پکارا گیا ہے ہم نے جستجو کے بعد اکثر مقامات پر ہم عصر کی اس تلاش کو صحیح پایا ہے مگر اس سورہ میں ایسا نہیں ہے یہاں ”الرٰ“ کے بعد کوئی لفظ پیغمبرؐ سے تخاطب کے لئے نہیں ہے بلکہ خود آپ کی جانب سے بطور تکلم بیان ہے۔ کتاب کے معنی میں ایک پیغام کا ہونا مضمر ہے اس لئے یہ کہنے کے بعد کہ یہ کتاب ایسی ہے جو محکم ہے، مفصل ہے، خالق کی طرف سے ہے، اس پیغام کا خلاصہ شروع کر دیا گیا ہے کہ وہ پیغام یہ ہے۔[1]

اس میں یہ اعلان کہ ہر مرتبہ والے کو اس کے درجہ کے مطابق وہ عطا کرے گا[2] بہت دوررس ہے اس سے اس اصول عقلی کی تصدیق ہوتی ہے کہ ترجیح، بلا مرجح اور ترجیح مرجوح دونوں قبیح ہیں اور ان اشخاص کا تصور بالکل غلط ہے جن میں ایک حمد و ثنائے کے باری تعالی میں یہ کہنے کی جرأت کر ڈالتا ہے کہ ”قدیم المفضول علی الفاضل“ اسی نے غیر افضل پر مقدم کر دیا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمۡ يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ ؕ اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ ۙ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝٥

”آگاہ ہو کہ وہ اپنے سینوں کو دوہرا کیے دیتے ہیں کہ اس سے چھپنے کی کوشش کریں۔ آگاہ ہو کہ جب وہ اوڑھتے لپیٹتے ہیں اپنے کپڑوں کو تو وہ جانتا ہے اسے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ یقیناً وہ سینہ کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے“۔

”سینوں کے دہرا کرنے“ کا ذکر دل کے رازوں کو چھپانے کی کوشش کے مجسم صورت میں اظہار کا ایک پیرایہ ہے یہ کوشش ایسی ہے جیسے کہ جھکے جاتے ہیں اپنے سینوں کو دبائے لیتے ہیں، سینوں کو توڑے مروڑے ڈال رہے ہیں کہ اندر کے راز کہیں باہر نکل کر طشت ازبام نہ ہو جائیں۔

---

[1] بآں مضمون کہ پیغامبر گوید عبادت کنید الخ (شاہ ولی اللہ)

[2] دے گا ہر بڑائی والے کو بڑائی اس کی (شاہ رفیع الدین)

شاہ عبدالقادر صاحب نے اس تمثیل کو بطور واقعہ شانِ نزول کی صورت سے بیان کیا ہے کہ:

''کافر لوگ کچھ مخالفت کی بات گھر میں کہتے، اس کا جواب قرآن میں اترتا، سمجھتے کہ کوئی کھڑا سنتا ہے، جا کر رسول خدا ﷺ سے کہہ دیتا ہے تب سے ایسی بات کہتے تو کپڑا اوڑھ کر، جھک کر، دہرے ہو کر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل کیا''۔ (موضح القرآن)

شاہ ولی اللہ نے اس سے ایک دوسرے معنی پیدا کئے ہیں جو بظاہر بعید ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

می تواں گفت پیچیدن سینه عبارت از ایں است که فکر ہای نا صواب کند و بشبہات واہیه دل خودرا اطمینان وبدو عقائد حقه را فراموش سازد زیر آله صدور اینجا بمعنی علوم صدر آمده (فتح الرحمٰن)

کہا جا سکتا ہے کہ سینہ کے دہرا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نادرست فکریں کرتے ہیں اور کمزور شبہات کے ساتھ اپنے دل کو اطمینان دلاتے ہیں اور صحیح عقائد کو بھول جاتے ہیں کیونکہ سینوں کا لفظ یہاں سینہ کے علوم کے معنی میں آتا ہے۔

شروع میں کہا جا سکتا ہے'' کہہ کر تو موصوف نے پھر بھی احتیاط سے کام لیا تھا مگر آخر میں کیوں کہ سینوں کا لفظ یہاں سینہ کے علوم کے معنی میں آیا ہے کہہ کے جواد عا فرمایا ہے اس کے لیے کسی مستحکم ثبوت کی ضرورت ہے ورنہ الفاظ قرآنی اس کے قبول سے انکاری معلوم ہوتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝٦

''اور کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ پر اس کی روزی ہے اور وہ جانتا ہے اس کے قیام کی جگہ اور اس کے ٹھہرائے جانے کے مقام کو۔ ہر بات ایک صاف کھلے ہوئے نوشتہ میں ہے''۔

صاف کھلے ہوئے نوشتہ سے مراد اس کے پہلے بھی اور یہاں بھی اور شاید اس کے بعد بھی لوح محفوظ ہوا کرتی ہے [1] اور ان نظیروں سے ایک اور آیت:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿الأنعام: ٥٩﴾

کوئی خشک وتر ایسا نہیں جو ایک صاف کھلے ہوئے نوشتہ میں نہ ہو۔

اس کا یہ مطلب جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز موجود ہے، مشکوک ہو جاتا ہے مستقر ''قیام کی جگہ'' اور مستودع ''ٹھہرائے جانے کا مقام'' ان دونوں میں فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ مستقر تو مستقل قیام کی جگہ ہے اور ''ٹھہرائے جانے کا مقام'' عارضی قیام کا محل ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جہاں ٹھہرنا ہے بہشت، دوزخ، جہاں سونپا جاتا ہے اس کی قبر''۔ (موضح القرآن)

شاہ ولی اللہ نے یہ فرق بتایا ہے کہ:

''مستودع'' جائی است که بغیر اختیار او آنجا نگاه داشته باشند مانند صلب ورحم و ''مستقر'' جائی است

---

[1] یعنی اللوح المحفوظ (تبیان) هو اللوح المحفوظ (جلالين) يعنى درلوح نوشته شده (فتح الرحمٰن)

که باختیار خودمی ماند مثل خانه" (فتح الرحمن)

"مستودع" وہ جگہ جہاں بلا اس کے اختیار کے اس کو رکھا گیا ہو، جیسے پشت پدر اور شکم مادر اور مستقر وہ جگہ ہے جہاں اپنے اختیار سے رہتا ہے جیسے گھر۔

مگر اس فرق کا دونوں الفاظ کے لغوی معنی میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

تیسرا فرق یہ بتایا گیا ہے کہ:

مستقرھا مسکنھا فی الدنیا او الصلب و مستودھا بعد الموت او الرحم (جلالین)

مستقر اس کے رہنے کی جگہ ہے دنیا میں یا صلب پدر میں اور ودیعت رہنے کی جگہ سے مراد موت کے بعد کی جگہ ہے یا شکم مادر میں۔

اس ایک فرق میں بطور احتمال ایک دوسرا فرق بھی ہے مگر ان میں سے کسی کی بھی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

ہمارے یہاں تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے:

مستقرھا حیث یأدی باللیل و مستودعھا حیث یموت

مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ رات کو قیام کرتا ہے اور مستودع وہ ہے جہاں اس کی موت ہوگی۔

اس کی نسبت اگر معصومؑ کی طرف ہوتی تو اس کا دینی وزن ہوتا یوں اس کی بھی حیثیت وہی ہے جو دوسرے اقوال کی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اور وہی وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اعمال میں بہتر ہے اور اگر آپ کہیے کہ تم لوگ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو ضرور وہ جو کافر ہیں، کہیں گے کہ یہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو"۔

پہلا جز تو متعدد مرتبہ آچکا ہے اس کے بعد خاص جز یہ ہے کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ یعنی آسمان اور زمین کی خلقت کے پہلے، اس سے ظاہر ہے کہ کچھ اسلامی علمائے ریاضی کا یہ تصور کہ عرش قرآن نے آسمان ہفتم یعنی فلک افلاک ہی کو کہا ہے درست نہیں ہے بلکہ قرآن بتا رہا ہے کہ جب آسمان نہ تھے تب بھی عرش تھا۔

وہ "پانی پر تھا" اس سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ عرش اس طرح کی جسمانی قسم کی چیز نہیں ہے جسے ہم کسی مادی نوعیت میں محدود کریں بلکہ جلال و جبروت الٰہی کا بلند ترین مرکز جو کائنات پر حاوی ہے وہی عرش ہے اور اسی سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے پہلے کائنات میں پانی تھا یہ نہج البلاغہ میں جو تخلیق عالم کی کیفیت بیان ہوئی ہے اس کے بالکل مطابق ہے [1] تاکہ تمہیں آزمائے اس کا تعلق کا ہے سے ہے؟ ایک

---

[1] علی الماۤء وھو علیٰ متن الریح (جلالین)

خیال یہ ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے یعنی آسمان وزمین کی تخلیق کے بعد پھر تمہیں پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے[1] مگر یہ محذوف جزء چونکہ سلسلہ کلام سے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے وہ اصول تکلم کے خلاف معلوم ہوتا ہے دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ تمہاری آزمائش کی جائے کہ تم اس سب سے کس طرح صحیح فائدہ اٹھاتے ہو[2] یہ معنی ظاہر الفاظ سے زیادہ قریب الفہم معلوم ہوتے ہیں۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸﴾

''اور اگر ہم ان پر عذاب میں دیر کریں ایک مقررہ مدت تک[3] تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ کونسی چیز اسے روکے ہوئے ہے؟ آگاہ ہونا چاہیے کہ جس دن وہ ان پر آئے گا تو اسے ان سے ہٹایا نہیں جا سکے گا اور گھیر لے گا انہیں وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے''۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

''اور اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے کچھ رحمت کا مزہ چکھائیں پھر اس سے اسے سلب کر لیں تو وہ بلاشبہ بڑا مایوس اور ناشکرا ثابت ہوتا ہے اور اگر اسے کسی نعمت کا مزہ چکھائیں بعد کسی سختی کے جو اسے لائق تھی تو وہ کہے گا کہ بس مصیبتیں مجھ سے دور ہوئیں بلاشبہ وہ خوش ہونے والا ہوگا۔ بڑا ہی فخر کرنے والا، سوا اُن کے جو صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور بہت بڑا ثواب ہے''۔

صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں یہ دونوں ٹکڑے زندگی کے دو مختلف ادوار سے متعلق ہیں، سختی و مصیبت سے متعلق صبر ہے اور جب کشائش، راحت اور آرام ہو تو عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر فرائض سے غفلت نہ برتیں، اسے یہاں عملوا الصالحات کی لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔[4]

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ

---

[1]۔ آفریدن شما آنکہ تا بیازماید شمارا (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ لیبلو کم متعلق بخلق ای خلقھا وفیھا من منافع لکم و مصالح لتختبرکم (جلالین)

[3]۔ تامدّتے شمردہ شدہ (شاہ ولی اللہ) کما قال: وادّکر بعد امّۃ ای حین (تبیان)

[4]۔ صبروا فی الشدۃ وعملوا الصالحات فی الرخآء (علی بن ابراھیم)

عَلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ؕ﴿۱۲﴾

''تو جیسے آپ چھوڑ دیں گے کچھ ان باتوں کو جن کی آپ کی طرف وحی ہوتی ہے اور اس سے آپ کا دم الجھتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پر ایک خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ ارے آپ تو بس متنبہ کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے''۔

''جیسے آپ چھوڑ دیں گے'' یعنی آپ کو ان کے کفر عصیان اور بے ہودہ مطالبات سے تکلیف اتنی پہنچتی ہے کہ کوئی اور ہو تو اس کام کو چھوڑ ہی دے جس پر اسے یہ سب سننا پڑتا ہے۔

اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ مشرکین ایسا تصور کرتے ہیں کہ ان کا یہ تشدد، یہ زخم زبان اور یہ آزار رسانیاں آپ کو اس راہ سے ہٹا دیں گی[1] مگر یہ ہونے والی بات نہیں ہے اور یہ حسرت ان کی کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۳﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ پھر لے آؤ اس کے مثل دس ہی سورہ گھڑے ہوئے ہیں اور بلا لو جنہیں بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو''۔

دس سوروں کا جواب لانے کا مطالبہ

اس کے پہلے سورہ بقرہ کے تقریباً شروع ہی میں پہلے پارے میں ایک سورہ کے مقابلہ کی دعوت بڑی شدت وقوت کے ساتھ آ چکی ہے اور اس اعلان کے ساتھ اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر تم کو تیار ہونا چاہیے اس آگ کے لئے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی جماعت جس کے سامنے ایک سورہ کے پیش کرنے کا مطالبہ پیش ہو چکا ہو اور وہ ناکام ہو چکی ہو، پھر اس کے سامنے دس سوروں کے مثل پیش کرنے کا مطالبہ پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لئے یہ مقام ان بدیہی قرائن میں سے ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ ترتیب قرآن مطابقہ تنزیل نہیں ہے اور اس لئے شاہ ولی اللہ صاحب کو بھی حاشیہ میں لکھنا پڑا ہے کہ:

مترجم گوید نخست بده سوره مخدّی واقع شد و چوں ازاں عاجز شد ند بیک سوره تحدی فرمود (فتح القرآن)

میں کہتا ہوں کہ پہلے دس سوروں کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے اور جب اس سے عاجز ثابت ہوئے تو ایک سورہ کے مقابلہ کی دعوت دی گئی۔

تفسیر جلالین میں ہے:

---

[1] یوھمون علیك انھم یزیلونك عن بعض ما انت علیه من امر ربك (تبیان)۔

تحدی بها اولاً ثم بسورة۔

پہلے یہ (دس سوروں کے لانے کا) مطالبہ کیا گیا پھر ایک سورہ کا۔

فَاِلَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ وَاَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

''تو وہ اگر تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو جان لو کہ وہ بس اللہ کے علم سے اُتارا گیا ہے، اور یہ کہ سوا اس کے کوئی معبود نہیں ہے، تو اب کیا تم اسلام لاؤ گے؟!''

''بس اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے'' یعنی اگر انسانی ہنر کا نتیجہ ہوتا تو اس مرتبۂ فصاحت و بلاغت پر ہوتے ہوئے فصحائے عرب اس کے مقابلہ سے عاجز نہ ہوتے'' اور یہ کہ سوا اس کے کوئی معبود نہیں ہے'' یعنی اگر کوئی اور معبود ہوتا جسے مشرکین مانتے ہیں تو وہ اپنے پیرووں کی اس مہم میں امداد کیوں نہ کرتا؟

اس طرح یہ دلیل اثباتِ رسالت کے ساتھ اثباتِ وحدانیت کی بھی کفیل ہوگی۔

''اگر وہ تمہاری دعوت پر لبّیک نہ کہیں'' یعنی تم جنہیں اپنے مدد کے لیے بلاتے ہو، وہ تمہاری مدد کے لیے نہ آئیں یہ خطاب اُنہی مشرکین سے ہے جنہیں کہا گیا کہ ''بلا لو جنہیں بلاسکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو'' اسی لیے ہم نے کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''تو اب کیا تم اسلام لاؤ گے'' بعض تفاسیر اسی کے مطابق ہیں [۱]۔

ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہو یعنی تم نے جو اُن مشرکین کو مقابلہ کی دعوت دی ہے، اگر وہ اس سے عاجز رہیں اور دس سوروں کے مثل پیش نہ کر سکیں تو تم جان لو یہ یعنی اس ثبوت کے بعد اس حقیقت کا مزید یقین حاصل کر لو۔ اس صورت میں کے معنی ہوں گے کہ اب تمہیں اسلام پر قائم رہنا چاہیے [۲]۔

میرے نزدیک چونکہ قبل کی آیت میں دعوت دینے کی لفظ مشرکین سے مخاطب ہو کر ان کے لیے تھی، جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، اس لیے اس لبّیک کا اُسی دعوت سے تعلّق زیادہ قریب الفہم ہے۔

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰۤـئِكَ الَّذِيۡنَ لَـيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ‌ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

---

[۱] ۔ فالم يستجيبوا لكم اى من دعوتموهم للمعاونة فاعلموا خطاب للمشركين فهل انتم مسلمون بعد هٰذه الحجة القاطعة اى اسلموا (جلالين)

[۲] ۔ اگر قبول نکنند آں کافراں سخن شمارا پس آیا شما مسلماں ہستید (شاہ ولی اللّٰہ) یعنی بر اسلام ثابت باشید (فتح الرحمٰن)

''جو دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کا طلب گار رہو تو ہم اس میں اُن کے کاموں کا پورا پورا نتیجہ ظاہر کر دیں گے اور اُن کے لیے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ یہ وہ ہوں گے جن کے لیے آخرت میں سوا آتش دوزخ کے کچھ اور نہیں ہے اور جو کچھ انھوں نے اس میں کیا ہوگا اور جو کچھ ان کے کام تھے، وہ بے حقیقت ثابت ہوں گے''۔

اس میں ''غازیانِ راہ خدا'' کی صفوں میں شامل ہونے والے وہ ''مجاہدین'' بھی داخل ہیں جن کا مقصد فقط مال غنیمت کا حصول ہو[1]۔ جب تمام اعمال خیر میں نیت صرف دنیا کے حصول کی ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام بقصد قربت نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ عبادتوں کی صحت میں قصد قربت کے نہ ہونے سے باطل ہوئیں۔ اس کے بعد آخرت میں دوزخ کے سوا رہ ہی کیا جاتا ہے[2]۔

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

''تو کیا جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی حقانیّت کی دلیل کے ساتھ آیا ہے اور جس کے پیچھے آیا ہے اُس کا گواہ جو اُسی کا جزء ہے اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ایک پیشوا اور رحمت کی حیثیت سے یہ اس پر ایمان لائیں گے؟ اور جو ان گروہوں میں سے اُس کے ساتھ کفر اختیار کرے گا تو اس سے قول و قرار بس آتش دوزخ کا ہے تو تمہیں اس میں کوئی شک نہ ہو، وہ یقیناً حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے''۔

ذکر رسالت مآبؐ و ولایت مآبؑ

جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل لے کر آیا ہے؟ وہ کون ہے؟ باجماع مفسرین اس سے مراد حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔[3]

اب وہ گواہ جو اس کے پیچھے آیا ہوا اور اس کا جز ہو، وہ کون ہے؟ اسے خود پیغمبرؐ کے اقوال میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ علی منی وانا منه اور پھر قصہ برات میں وحی الٰہی: لا يبلغها الا انت اور جل منك ''اس کی تبلیغ کوئی نہیں کر سکتا سوا آپ کے یا ایسے شخص کے جو آپ کا جز ہو'' اور باجماع مفسرین و محدثین اس کے بعد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی کے سپرد یہ خدمت کی گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ یہ گواہ تھا جو اس گواہی کے لئے پیدا ہوا تھا اس لئے اس کے قول و عمل سے کوئی بات اس گواہی کے خلاف کبھی ظاہر

---

[1] ۔ هٰذا صفة المنافقين ذكره الجبائی (تبیان)

[2] ۔ من عمل الخير علىٰ ان يعطيه الله ثوابه فی الدنيا اعطاه ثوابه فی الدنيا و كان له فی الأخرة النار (علی بن ابراهيم)

[3] ۔ هو النبی صلی اللہ علیہ وآلہ (جلالين)

ہی نہیں ہوئی۔ یہ تفسیر اقوال اہل بیت علیہم السلام میں تو وارد ہوئی ہے، اس کے علاوہ بعض صحابہ سے بھی نقل ہوئی ہے۔ [1]

بعض مفسرین اہل سنت نے معنی میں تبدیلی کی خاطر یَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ کی دونوں ضمیروں کے مرجع میں تفریق کردی ہے یعنی یتلوہ کی ضمیر تو رسولؐ کی طرف راجع کی ہے اور شَاهِدٌ مِّنۡهُ کی ضمیر خدا کی طرف۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اس کے پیچھے آیا ہے ایک گواہ اس کی طرف سے یعنی خدا کی جانب سے [2] مگر ظاہر ہے کہ یہ ضمیروں کا اختلاف ظاہر کلام کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل حقانیت کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب یہ گواہ اس کی طرف سے کیا ہے؟ اسے سمجھانے کی یوں کوشش کی گئی ہے کہ وہ کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل جس کے ساتھ رسول آئے ہیں وہ تو دلیل عقل ہے اور یہ بعد میں جو گواہ آیا، وہ قرآن ہے [3] مگر عقل تو اس گواہ یعنی معجزات کی بنا پر جن میں سب سے اہم قرآن ہے، نبوت پر دلالت کرسکتی ہے گواہ یعنی قرآن سے پہلے نبوت خاصہ یعنی رسالت مآب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دلیل عقلی کیا ہوسکتی ہے؟ اسی لئے مفسرین اہل سنت بھی سب اس سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل قرآن ہے تو اب اس کے پیچھے جو گواہ آیا ہے؟ وہ کون ہے؟ اس پر گھبرا کر کہہ دیتے ہیں ''جبریل''۔ [4]

اب اسے منطقی طور پر جانچئے۔ اول تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ جو لوگوں کے سامنے آکر گواہی دے۔ ان کے وجود پر ایمان تو خود قرآن اور رسالت کے تسلیم کرنے پر موقوف ہے۔ پھر یہ کہ قرآن لے کر جبریل امین علیہ السلام ہی تو آئے تو وہ قرآن کے ساتھ یا اس کے پہلے ہوئے، اس کے بعد کہاں سے ہوئے؟

دیکھئے حقیقت کو چھوڑ کر انسان کو کس کس طرح ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں؟

آخر ضمیروں کو الگ الگ مان کر جس سے یہ معنی ہوں گے کہ ان کے بعد آیا ہے ایک گواہ اس کی طرف سے۔ یعنی خدا کی طرف سے، پھر بھی اگر گواہ سے مراد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو لے لیا جائے تو ان حضرات کا کیا نقصان ہو جائے گا؟ جب کہ الفاظ قرآنی اس صورت میں بغیر کسی زحمت کے صادق آئیں گے۔ جو دلائل لے کر آئے وہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور جو گواہ بنا کر اللہ کی طرف سے بھیجے گئے وہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام ہیں اور پھر جب کہ دلائل اور گواہ کے مفہوم میں یہ فرق بھی بالکل ذوق سلیم کے مطابق ہے کہ دلائل وبے زبان سچائی کی نشانیاں ہیں جن سے عقل رسالت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلیم کرتی ہے اور گواہ وہ ناطق انسان ہے جو اپنے گفتار و کردار سے ان کی سچائی کو عمر بھر ثابت کرتا رہا۔

ایک شک اس آیت میں جمہور مفسرین کو محسوس ہوا جس نے انہیں غلطاں و پیچاں بنایا صرف اس سبب سے کہ جو حقیقت ہے اسے وہ قبول کرنا نہیں چاہتے اور ایک دوسری پیچیدگی آیت کی ترکیب نحوی میں محسوس ہوئی ہے جو ہمارے ترجمہ میں بالکل نہیں ہے ہم نے مَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ مبتداء اقرار دیا ہے اور اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ پورے جملہ کو اس کی خبر اور ہمزۂ استفہام کے سوالیہ مضمون کو ہم اس جملہ سے متعلق قرار دیتے ہیں یعنی جو اس طرح دلیل لے کر آیا ہو اور اس کے بعد اس کا گواہ ہو اور اس کے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اس کی گواہی دے رہی ہو تو کیا

---

[1] روی عن ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین علیہ السلام انہ علی بن ابی طالب ورواہ الرّمانی و ذکرہ الطبری باسنادہ عن جابر بن عبداللہ عن علی علیہ السلام (تبیان)

[2] متصل وے می آید گواہی از جانب پروردگار او (شاہ ولی اللہ) پیچھے پیچھے آتا ہے اس کے ایک شاہد اس کی طرف سے (شاہ رفیع الدین)

[3] حجتی از جانب پروردگار خود یعنی دلیل عقل---وگواہی از جانب پروردگار! و یعنی قرآن (فتح الرحمن)

[4] بیّنة بیان من ربه...وھی القرآن ویتلوہ یتبعه شاھد یصدّقه منه الی من اللہ وھو جبرئیل (جلالین)

یہ لوگ اس پر ایمان لائیں گے؟ ہمیں تو اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی مگر عام مترجمین ومفسرین کی سمجھ میں یہ نہیں آیا ہے۔ وہ اولئك یومنون به کو مستقل ایک جملہ خبر یہ قرار دینا چاہتے ہیں تو اب اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (تا آخر فقرہ) کی خبر کا آیت میں وجود نہیں رہتا تو اس کے لئے انہیں کوئی فقرہ بڑھانا پڑتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

آیا کسی کو باشد برحجتی مثل دیگران باشد؟

کیا وہ جو روشن دلیل کے ساتھ ہو۔۔۔مثل دوسروں کے ہوگا؟

یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے انہوں نے اس کو عربی میں اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ کے پورے فقرہ کی تشریح کے ساتھ اس طرح لکھا ہے کہ:

كمن ليس كذالك   مثل اس کے ہوگا جو اس طرح نہ ہو

مگر ہم اس حذف واضمار کی مضمون آیت میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾

”اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے؟ یہ لوگ پیش ہوں گے اپنے پروردگار کے سامنے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر غلط تہمت لگائی، آگاہ ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکیں اور اسے ٹیڑھا کرنے کی کوشش کریں اور وہ آخرت کے منکر تھے۔ یہ لوگ دنیا میں اللہ کے قبضہ سے نکل نہ سکتے تھے اور نہ ان کے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مددگار تھے۔ ان کو دونا دوں عذاب ہو گا، نہ وہ سن ہی سکتے تھے اور نہ آنکھوں سے دیکھتے ہی تھے یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کیا اور غائب ہوگئے ان سے وہ جنہیں وہ غلط طور پر گھڑتے تھے بلاشبہ آخرت میں وہی گھاٹا اٹھانے والے ہیں“۔

”گواہی دینے والے کہیں گے“ یہاں گواہ دینے والوں سے کاتبان اعمال مراد لئے گئے ہیں جو روز آخرت انسانوں کے اعمال کی گواہی

دیں گے [1] اور جن جن کو اس حقیقت کا علم ہو وہ سب بھی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ [2]

''نہ وہ سنتے ہی تھے اور نہ آنکھوں سے دیکھتے ہی تھے''یعنی باوجود گوش وہوش رکھنے کے عقل سے کام نہ لیتے تھے۔ [3]

یہی اللہ کی حجت ہے ان کے خلاف جو انہیں موردِ عقوبت قرار دیتی ہے۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

می تواں گفت ہمزۂ استفہام انکاری محذوف است یعنی آیا نمی توانستند شنید و آیا نہ می دیدند (فتح الرحمٰن)

کہا جا سکتا ہے کہ سوالیہ معنی پیدا کرنے کے لئے (عربی میں) جو ہمزہ (الف مفتوح) ہوتا ہے جس کا مقصد انکار واعتراض ہے، وہ محذوف ہے کیا وہ نہیں سن سکتے تھے اور کیا وہ نہیں دیکھتے تھے؟

مگر یہ خلاف ظاہر کلام ہے۔

یہ اللہ کی لعنتیں اور عذاب وغیرہ کس پر ہیں؟ پھر سن لیجئے۔

''اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں پر، ان پر جنہوں نے اللہ کی راہ سے روکا اور اسے کج کرنے کی کوشش کی''۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

''خدا پر جھوٹ بولنا کس طرح ہے؟ علم میں غلط نقل کرنا یا خواب بنا لینا یا عقل سے حکم کرنا، دین کی بات میں یا دعویٰ کرنا کہ کشف رکھتا ہوں، یا اللہ کا مقرب ہوں''۔ (موضح القرآن)

اب اسی فہرست میں بڑھا لیجئے: کسی ایسے منصب کا جو اللہ سے تعلق رکھتا ہو، مدعی ہو جانا یا کسی ایسے عہدہ پر جس کا مقرر کرنا اللہ کے ذمہ ہو، بطور خود یا کسی اجماع یا شوریٰ کا ڈھونگ رچا کر کسی کو متمکن بنانا اور کسی کا بن جانا۔ ان سب کے لئے اللہ قرآن حکیم میں لعنت کا اعلان فرما رہا ہے کسی ایسے مذہب کے پیرو نہیں ہے جسے کہہ دیجئے:

دشنام بمذہبی کہ طاعت باشد

مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢٣

''یقیناً جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے اور لگاتار اپنے پروردگار سے لو لگائے رہے [4] یہ اہل بہشت

---

[1] ۔ھم الملائكة يشهدون على الرسل بالبلاغ وعلى الكفار بالتكذيب (جلالين) یعنی کراماً کاتبین (فتح الرحمن)

[2] ۔یعنی الملائكة والانبيآء والعلماء (تبيان) گواہی والے آخرت میں فرشتے ہوں گے جو عمل لکھتے ہیں اور نیک بخت آدمی جن کو خبر تھی (موضح القرآن)

[3] ۔یعنی لفرط كراهتهم له كانهم لم يسمعوا ذٰلك (جلالين)

[4] ۔ای تواضعوا الله واعبدوه (علی بن ابراهيم) الاخبات الخشوع المستمر على استوائه فيه (تبيان)

ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے''

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ
اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''ان دونوں فریقوں کی مثال اندھے، بہرے اور آنکھ کان والے کی ہے کیا ان دونوں کی بات یکساں ہے؟ کیوں نصیحت قبول نہیں کرتے ہو''؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۚ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ
اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ
مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ
الرَّاْىِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ
اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَاٰتٰىنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ
عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ
وَلٰكِنِّىْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ
اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تمہارے لئے کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں کہ عبادت نہ کرو کسی کی سوا اللہ کے، یقیناً مجھے ڈر ہے تمہارے لئے ایک دردناک دن کے عذاب سے۔ تو کہا ان کی قوم کے بڑے آدمیوں نے کہ جو کافر تھے، ہم نہیں دیکھتے ہیں تمہیں مگر اپنا ایسا ایک آدمی اور نہیں دیکھتے ہم کہ تمہاری پیروی کی ہے مگر ایسوں نے جو ہم میں پست طبقہ کے لوگ ہیں رواروی میں [1] اور نہیں دیکھتے ہم تم لوگوں کے لئے اپنے مقابلہ میں کوئی فضیلت بلکہ ہم تم لوگوں کو جھوٹا خیال کرتے ہیں کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے حقانیت کی دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت دی ہے مگر وہ تمہاری سمجھ میں نہ آتی ہو تو کیا ہم تمہیں زبردستی اس کا پابند بنا سکتے ہیں جب کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ اے میری

[1] ای ابتداءً من غیر تفکر فیه (جلالین) بتامل سرسری (شاہ ولی اللہ)

قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی مالی معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اللہ پر اور میں نکالنے والا نہیں ہوں انہیں جو ایمان لائے وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم جہالت سے کام لیتے ہو اور اے میری قوم والو! کون اللہ کے عذاب کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا اگر میں انہیں نکال دوں؟ کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے''؟

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِىْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣١﴾

''اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، ہاں میں ان لوگوں کے لئے جنہیں تمہاری نگاہیں حقیر محسوس کر رہی ہیں، یہ بھی نہیں کہتا کہ انہیں اللہ ہرگز کوئی بھلائی عطا نہیں کرے گا اللہ خوب جانتا ہے اسے جو ان کے دلوں میں ہے اس وقت بلاشبہ میں ظالموں میں سے ہوں گا''۔

یہ غالباً اس جزء کا جواب ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو تمہیں بس ایک آدمی جانتے ہیں ہم تم میں اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں پاتے۔ اس کا جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ میں خود کب اس کا مدعی ہوں کہ میں آدمی کے سوا کچھ اور ہوں اور یہ کہ مجھ میں ذاتاً کوئی ایسی بات ہے کہ میں عجوبہ چیز ہوں۔ [1]

اصل تو یہ ہے کہ خالق نے مجھے نوازا ہے اور مجھے نبوت کے خلعت سے سرفراز کیا ہے، اس کی میں تبلیغ کرتا ہوں تو پھر تم جو وہ سب کچھ میرے مقابلہ میں کہہ رہے ہو، یہ جہالت نہیں تو کیا ہے؟

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٣٣﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ اے نوح! تم نے تو ہم سے تکرار کی ہے اور بہت زیادہ تکرار کی ہے تو بس اب لے آؤ اسے جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر تم سچے ہو، کہا کہ اسے اللہ ہی لائے گا اگر چاہے گا اور تم اسے (بھاگ کر) بے بس نہیں کر سکتے''۔[2]

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِىْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٤﴾

[1]۔ انی لا ارفع نفسی فوق قدرها (تبیان)

[2]۔ لستم تفرتونه هربا (تبیان)

''اور تمہیں میری نصیحت فائدہ نہیں پہنچا سکتی، کتنا ہی میں تمہیں کرنا چاہوں، اگر اللہ تمہیں گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہو، وہ تمہارا پروردگار ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے''۔

اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے انسان کے سوء اختیار سے تو نتیجتاً مطلب یہ ہوا کہ جب تم خود گمراہی میں پڑے رہنا چاہتے ہو[1] تو میری نصیحت تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ اب تو عذاب تم پر آ ہی جائے گا جو تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ کو منظور ہے کہ تم پر نازل کرے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝۳۵

''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ اگر میں نے اسے گھڑا ہے تو میرے جرم کی ذمہ داری مجھ ہی پر ہے اور میں بری ہوں اس جرم سے جو تم کرتے ہو''۔

یہ ایک خاص روادارانہ گفتگو کا انداز ہے جسے مسلمات کے حامی اصول وعقائد کے خلاف قرار دے سکتے ہیں مگر حقیقت میں یہ انداز آزاد ضمیر کو معاملہ پر غور کرنے کی دعوت دیا کرتے ہیں۔

اس کے پہلے جناب نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی گفتگو کا ذکر تھا اور اس کے بعد بھی اسی کا سلسلہ ہے لیکن درمیان میں یہ خود ہمارے پیغمبرؐ سے تخاطب آ گیا ہے اور آپ کی قوم جو قرآن کا انکار کر رہی ہے اس کا ذکر ہے۔[2]

اس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ مقام تنزیل میں اس سلسلہ کے ساتھ یہ آیت تعلق ہی نہیں رکھتی اور ترتیب میں بے جوڑ طور پر درمیان میں درج ہو گئی ہے اور اس نظیر کو سامنے رکھتے ہوئے آیہ تطہیر کی نوعیت وقوع کے سمجھنے میں دشواری نہیں رہتی مگر مفسرین اہل سنت نے کہا ہے کہ درمیان میں یہ آیت اس لئے آئی ہے کہ مشرکین قریش بھی تقریباً ویسی ہی باتیں کہتے تھے جیسی قوم نوح علیہ السلام کے افراد نے کہی تھیں۔ اس مطابقت کو دکھانے کے لئے درمیان میں ذکر مشرکین عرب کا آ گیا۔[3]

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ۚۖ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷

''اور نوح کی طرف وحی بھیجی گئی کہ اب ان لوگوں کے سوا جو ایمان لے آئے ہیں تمہاری قوم میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا تو رنجیدہ نہ ہو تم اس سے جو وہ کرتے ہیں اور بناؤ کشتی ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہماری وحی سے

---

[1] مع ایاتانکم بما یوجب خیبتکم والعذاب الذی جرہ علیکم قبیح افعالکم و یرید اللہ اھلا کم و عقوبتکم علی ذلک (تبیان)

[2] یقولون ای کفار مکۃ افتراہ اختلق محمد القرآن (جلالین) یا محمد آیا می گویند بربستہ است قرآن را (شاہ ولی اللہ)

[3] این جملہ زیادہ کردہ شدہ است درو سط قصہ قوم نوح تامتنبہ باشد بر تطبیق حال مشرکین مکہ باحال حضرت نوح علیہ السلام (فتح الرحمن) یہاں تک جتنے سوال اس قوم کے تھے وہی تھے حضرت کی قوم کے۔ گویا یہ سب جواب ان کو ملے، ایک کا نیا دعویٰ تھا سو آ گئے فرمایا (موضح القرآن)

اور مجھ سے بات نہ کرنا ان کے بارے میں جو ظالم ہیں، وہ سب یقیناً غرق کر دیئے جائیں گے"۔

طوفانِ نوح علیہ السلام کی غرقابی اور اس کا پس منظر

آیت کا سیاق اس مشہور تصور کی نفی کرتا ہے کہ خواہ مخواہ حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے عذاب کی دعا کرتے تھے اور ہر مرتبہ خالق اسے ایک مدت کے لئے ٹال دیتا تھا اور آخر میں جب دعا کی تو یہ ارشاد ہوا کہ ایک کشتی بناؤ۔

قرآن کا انداز بتاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام تو جیسے اب بھی پُرامید تھے اور خیال کرتے تھے کہ شاید قوم ہدایت پا جائے مگر خالق نے خود اطلاع دی کہ اب جو باقی رہ گئے ہیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اب حضرت نوح علیہ السلام نے وہ دعا مانگی جس کا سورہ نوح میں تذکرہ ہے کہ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿نوح:۲۶﴾ اس وقت حکم ہوا کہ کشتی بناؤ۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝۳۸ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۳۹

"اور وہ کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان کی قوم کے کچھ بڑے لوگ گزرتے تھے تو ان سے وہ تمسخر کرتے تھے انہوں نے کہا اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی (ایک دن) تم سے تمسخر کریں گے جس طرح تم تمسخر کر رہے ہو۔ اب بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کر دے اور اترتا ہے اس پر قائم رہنے والا عذاب"۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"وہ ہنستے تھے اس پر کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے۔ یہ ہنستے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں"۔ (موضح القرآن)

دوسرا عنوان تمسخر کا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اچھا! آپ پیغمبری کرتے کرتے، اب بڑھئی گیری کرنے لگے ہیں۔[1]

حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْــرٖ۪ىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۴۱

"یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور تندور اُبلا، ہم نے کہا کہ سوار کر لو اس (کشتی) میں ہر چیز کے دو جوڑے اور اپنے گھر والوں کو سوا ان کے جن پر بات پہلے ہو چکی ہے اور جو ایمان لائے ہوں اور نہیں ایمان لائے تھے ان پر مگر

---

[1] قیل انّھم کانوا یقولون یانوح صرت نجّارا بعد النبوّة (تبیان)

بہت کم اور کہا کہ سوار ہو اس میں اللہ کے نام کے سہارے پر اور اس کا چلنا اور اس کا رکنا۔ یقیناً میرا پروردگار بخشنے والا ہے بڑا مہربان"۔

"سوا ان کے جن پر بات پہلے ہو چکی ہے" یعنی پہلے کہا جا چکا ہے کہ

لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷

مجھ سے ظالموں کے بارے میں بات نہ کرنا، وہ تو غرق ہو کر رہیں گے (ہود۔۳۷)

اس کے بعد بعض لوگوں کا یہ لکھنا کہ اس قول سے مراد قضائے الٰہی ہے[1] تو ہم جبر پیدا کرنے کے شوق کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ پھر خود شاہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ یہ جن کے لئے بات پہلے ہو چکی تھی، دو تھے "یعنی زن نوح وکنعان پسر نوح" (فتح الرحمن)

شاہ عبد القادر لکھتے ہیں:

"گھر والوں میں سے جس پر بات پڑ چکی ایک بیٹا کنعان اور اس کی ماں، سو وہ ڈوبے" (موضح القرآن)

روایات بتاتے ہیں کہ پانی ایک تندور میں سے ابلا تھا جس میں روٹیاں پکتی تھیں۔

شاہ عبد القادر لکھتے ہیں:

"تنور تھا حضرت نوح علیہ السلام کے گھر میں" (موضح القرآن)

مگر تفسیر جلالین میں ہے:

فارا التنور للنجار بالماء۔

ایک نان بائی کا تندور پانی سے اُبلنے لگا۔

معلوم نہیں کس وجہ سے تھا شاہ ولی اللہ نے اس کو استعارہ پر محمول کر کے حاشیہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ:

"یعنی تنور غضب الٰہی" (فتح الرحمن)

حالانکہ بطور استعارہ دریائے غضب الٰہی تو محاورہ میں ہے "تنور الٰہی" نہیں اور تنور غضب الٰہی کے ساتھ بطور استعارہ کہا جائے تو وہ مشتعل ہو گا، طوفان نہیں لائے گا۔

اس طرح کا بعید استعارہ بخیال خود "خلاف فطرت" تصورات سے بچنے کے لئے نیاز صاحب فتح پوری ایسے افراد کو تو زیب دے سکتا ہے، کسی ذمہ دار "مسلمان عالم" کو نہیں۔

طوفان نوح کی غرقابی اور اس کا پس منظر

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰى نُوْحُۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۴۲ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ

[1] ۔ سبقت کردہ است بروے قضا (شاہ ولی اللہ)

الۡمَآءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الۡيَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيۡنَهُمَا الۡمَوۡجُ فَكَانَ مِنَ الۡمُغۡرَقِيۡنَ ﴿۴۳﴾

''اور وہ چل رہی تھی ان کو لئے ہوئے ایسی لہروں میں جو پہاڑوں جیسی تھیں اور آواز دی نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ الگ ایک طرف تھا کہ اے میرے بیٹے! سوار ہو لے ہمارے ساتھ اور کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ اس نے کہا میں بہت جلد پناہ لے لوں گا ایک ایسے پہاڑ کی طرف جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ انہوں نے کہا آج اللہ کا حکم سے بچانے والا کوئی نہیں ہے سوا اس کے جس پر وہ رحم کرے اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی تو وہ ڈوبے جانے والوں میں سے تھا''۔

وَقِيۡلَ يٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِىۡ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقۡلِعِىۡ وَغِيۡضَ الۡمَآءُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ وَاسۡتَوَتۡ عَلَى الۡجُوۡدِىِّ وَقِيۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۴﴾

''اور کہا گیا کہ اے زمین نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان تھم جا[1] اور پانی تہہ نشین ہو گیا اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور وہ جودی (پہاڑ) پر ٹھہری اور کہا گیا کہ لعنت ہو ظالم لوگوں پر''۔

یہ اُن آیات میں سے ایک ہے جن کی فصاحت و بلاغت نے ارادہ مقابلہ کرنے والے منکرین قرآن کے ہاتھ سے قلم گرا دیا، یہ اور بات ہے کہ ہمارا اردو یا کسی اور زبان کا ترجمہ ان تمام کیفیات کا حامل نہیں ہو سکتا جو اس آیت کے اصل الفاظ میں موجود ہیں اور جن کا احساس اہل زبان ہی خوب کر سکتے ہیں۔

وَنَادٰى نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِىۡ مِنۡ اَهۡلِىۡ وَاِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَـقُّ وَاَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰـنُوۡحُ اِنَّهٗ لَـيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَـيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَـيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۴۷﴾

''اور پکارا نوحؑ نے اپنے پروردگار کو تو کہا اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہا اے نوح! وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے وہ تو برے اعمال کا مجسمہ ہے، تو مجھ سے سوال نہ کروا ایسا جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ

[1]۔ امسکی عن المطر (جلالین) باز مان (شاہ ولی اللہ) بس کر (رفیع الدین)

ہو۔ کہا اے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں خود تجھ سے اس بات سے کہ تجھ سے سوال کروں ایسا جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور نہ رحم کرے تو میں خسارا اٹھانے والوں میں سے ہوگا''۔

عمل صالح کے بغیر کسی پیغمبر کی فرزندی بھی کارگر نہیں

سوال کے معنی طلب کے ہیں اس لئے مجھ سے سوال نہ کرو ایسا جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بے سمجھے مجھ سے کسی بات کی خواہش نہ کرو۔ شاہ عبدالقادر نے خواہ مخواہ سوال کو پوچھنے کے معنی میں لے لیا اس لئے ایک پیچیدگی میں پڑ گئے اور پھر اس سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے ہیں وہ کہتے ہیں:

آدمی پوچھتا وہی ہے جو معلوم نہ ہو لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیے، یہ کام ہے جاہل کا کہ اگلے کی مرضی نہ دیکھے پوچھنے کی، پھر پوچھے۔ (موضح القرآن)

واقعہ یہ ہے کہ یہاں حضرت نوح علیہ السلام پوچھ کچھ بھی نہیں رہے تھے۔ وہ تو خواہش کر رہے تھے کہ میرے بیٹے کو نجات دے دے، پھر سوال کے معنی پوچھنے کے قرار دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟!

ہماری قدیم تفسیر میں معصوم کی حدیث ہے کہ یہ جناب نوح علیہ السلام کا صلبی بیٹا نہ تھا بلکہ مادر جلو تھا یعنی اس کی ماں جناب نوح علیہ السلام کے حبالۂ عقد میں آئی تو وہ اس کے ساتھ تھا، اس لیے بیٹا کہلایا[1]۔ جو عام محاورہ کے مطابق ہے۔ اس لیے خالق نے بھی ''بیٹے'' ہونے کی نسبت کی نفی نہیں فرمائی لیکن اہل میں سے ہونے کی نفی کر دی۔

اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو کچھ علمائے شیعہ کا یہ تصوّر کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سوا جو پیغمبرؐ کی بیٹیاں تاریخ سے معلوم ہوئی ہیں، وہ حضرتؐ کی صلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ وہ جناب خدیجہؑ کے ساتھ آئی تھیں، اس نظیر کے مطابق محسوس ہوگا۔ اس لئے ممکن ہے قرآن مجید کے الفاظ میں جو پردہ کے بارے میں ہیں:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ

اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہیے۔ (احزاب۔ ۵۹)

وہ بیٹیاں داخل سمجھ لی جائیں مگر جب پیغمبرؐ کچھ خاص افراد کو جمع کر کے یہ فرمائیں کہ ھٰؤلاء اھلی'' یہ میرے اہل ہیں'' تو وہاں بالاتفاق ایک ہی بیٹی نظر آئے اور وہ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہوں۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

''کہا گیا ہے کہ اے نوحؑ! اتر ہماری طرف کی سلامتی اور برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور تمہارے ساتھ والوں سے

[1]۔ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال لیس بابنہ انّما ھو ابنہ عن زوجتہ علیٰ لغۃ طی یقولون لابن المرأۃ ابنہ (علی بن ابراھیم)

پیدا ہونے والی نسلوں پر ہیں [۱] اور کچھ جماعتیں ایسی ہوں گی جنہیں ہم فائدہ اٹھانے کا موقع دیں گے، پھر اُن پر ہماری طرف سے دردناک عذاب آ جائے گا"۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے تسلی فرما دی کہ پھر ساری قوم نوع انسان ہلاک نہ آوے گا قیامت سے پہلے مگر بعض فرقے ہلاک ہوں گے"۔ (موضح القرآن)

مگر اس میں آخر کا ٹکڑا خلاف واقعہ ہے اکثر فرقے بھی جو گمراہ ہیں ان کی ہلاکت قیامت ہی سے وابستہ ہے ورنہ دنیا میں تو اکثر پھلتے پھولتے بلکہ غلبہ و تسلط بھی حاصل کرتے اور اقتدار سلطنتی کے مالک ہو جاتے ہیں۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جنہیں ہم آپ پر وحی کے ذریعے سے بھیجتے ہیں آپ اس سے پہلے ان سے واقف نہ تھے اور نہ آپ کی قوم والے، تو برداشت سے کام لیجئے، بلاشبہ انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہے"۔

یعنی جیسی نوح علیہ السلام کو تکلیفیں پہنچائی گئیں اور انہوں نے صبر سے کام لیا اور انجام میں انہیں کامیابی ہوئی، ویسے ہی آپ بھی صبر سے کام لیجئے آخر میں کامیابی آپ کو ہو کر رہے گی۔ [۲]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جناب نوح علیہ السلام کا صبر و ضبط خالق کی نگاہ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے اور یہ تصور کرنا کہ انہوں نے معاذ اللہ منشائے الٰہی کے خلاف بار بار قوم کے لئے بددعا کی، حقیقت کے خلاف ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

"اور قبیلہ عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو تمہارا سوا اس کے کوئی خدا نہیں ہے نہیں ہو تم مگر دل سے باتیں بنانے والے، اے میری قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں

---

[۱] ۔ ممن معك في السفينة اي من اولادهم وذرياتهم وهم المؤمنون (جلالين)

[۲] ۔ فاصبر على التبليغ واذىٰ قومك كما صبر نوح (جلالين) امر للنبي ﷺ بان يصبر على اذىٰ قومه وجهلهم. بموضعه كما صبر نوح قبل ذٰلك على اذىٰ قومه (تبيان)

مانگتا۔ میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اس پر کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے تو کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے اور میری قوم والو! اپنے پروردگار سے بخشش کے طلبگار رہو، پھر اس سے لو لگاؤ کہ وہ تمہاری طرف گھٹا بھیجے خوب برستی ہوئی اور تمہاری قوت میں مزید قوت عطا کرے اور تم مجرمانہ طور پر روگردانی اختیار نہ کرو“۔

قبیلۂ عاد اور جناب ہود علیہ السلام کا حال

اس کے پہلے نوح علیہ السلام کے ساتھ ارسلنا کا لفظ آچکا ہے کہ ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف، یہ ہود علیہ السلام کا ذکر بطور عطف اسی سلسلہ سے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ اور قبیلہ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا[1]۔
ہود کو بھائی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی قبیلہ کا ایک فرد تھے۔[2]

قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ۝۵۳ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۝۵۴ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ۝۵۵ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝۵۶ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ۝۵۷

”ان لوگوں نے کہا اے ہود! تم ہمارے پاس کھلی ہوئی دلیل نہیں لائے اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم سوا اس کے کچھ کہہ نہیں سکتے کہ ہمارے خداؤں میں کسی نے تمہیں کچھ نقصان پہنچا دیا ہے، انہوں نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بے تعلق ہوں ان سے جنہیں تم اسے چھوڑ کر شریک مانتے ہو تو تم سب مل کر میرے خلاف تدابیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو، بلاشبہ میرا بھروسا ہے اللہ پر جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر یہ کہ وہ پکڑے ہوئے ہیں اس کی پیشانی کے اوپر کے بالوں کو یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔ اب اگر تم روگردانی کرو تو میں تمہیں تبلیغ کر چکا اس کی جس کے ساتھ مجھے تمہاری جانب بھیجا گیا تھا اور میرا پروردگار تمہاری جگہ

---

[1]۔ نصب بتقدیر ارسلنا (تبیان)
[2]۔ اخاھم من القبیلة (جلالین)

تمہارے علاوہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے یقیناً میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے"۔

"ہم سوا اس کے کچھ کہہ نہیں سکتے" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہمارے بتوں کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟ بس یہ ایک بات ہو سکتی ہے کہ انہوں نے تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہو اور انتقام کے جذبہ میں تم ان کی مخالفت کر رہے ہو۔[1]

اس کے بعد جناب ہود علیہ السلام نے جو جواب دیا ہے اس میں یہ پہلو ہے کہ یہ اصنام بیچارے بھلا مجھے کیا تکلیف پہنچا ئیں گے؟ ہر چیز تو اللہ کے قبضہ میں ہے یہ اصنام بالکل بے بس ہیں، کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

پیشانی کے اوپر جو سر کے بال ہیں، وہ اگر پکڑ میں آجائیں تو انسان بالکل بے قابو ہو جاتا ہے اس لئے پیشانی کے اوپر کے بال پکڑنے کا مطلب ہے پورے طور پر قدرت رکھنا یعنی اللہ ہر چلنے پھرنے والے پر کامل اقتدار رکھتا ہے"۔[2]

"یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے" یعنی وہ جو کرتا ہے، ٹھیک ہی ہوتا ہے۔

تفسیر جلالین میں ہے:

علیٰ صراط مستقیم ای طریق الحق والعدل

سیدھے راستے پر ہے" یعنی حق اور عدالت کے راستے پر۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"یعنی حکیم است" (فتح الرحمن)

ہمارے یہاں کی تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔[3]

مگر شاہ صاحب موصوف کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ:

"جو سیدھی راہ پر چلے، وہ اس سے ملے"۔ (موضح القرآن)

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

"اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے ہود کو اور انہیں کہ جنہوں نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے ایمان اختیار کیا تھا اپنی

---

[1] ۔ مانقول فی سبب الخلاف الّا ان اعتراك (تبیان)
[2] ۔ خص الناصیة بالذکر لان من اخذ بناصیة یکون فی غایة الذل (تبیان)
[3] ۔ معناہ ان امر ربی فی تدبیر خلقه ۔۔۔ لا عرج فیه والاضطراب (تبیان)

طرف کی رحمت کے ساتھ چھٹکارا دے دیا اور انہیں بڑے سخت عذاب سے بچا دیا اور یہ ہے وہ قبیلہ عاد جس نے جان بوجھ کر اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور ہر ہٹ دھرم، سرکش کے احکام کی پیروی کی اور ان کے پیچھے لگادی گئی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی معلوم ہونا چاہیے کہ قبیلہ عاد نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔ آگاہ ہو کہ لعنت ہے عاد پر جو ہود کی قوم والے تھے''۔

''ہمارا حکم آ گیا'' یعنی عذاب۔ [۱]

''یہ ہے وہ قبیلہ عاد'' یعنی اس قبیلہ کی سرگزشت ہے جو آپ کے سامنے پیش کی گئی [۲] اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ دنیا میں آنکھ کھول کر ذرا ان کا عالم دیکھو کہ کیا ہو گیا۔ [۳]

قبیلہ عاد کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ ''انہوں نے اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی، حالانکہ قرآن نے ان کی جانب صرف ایک نبی کی بعثت کا ذکر کیا ہے اور وہ جناب ہود علیہ السلام ہیں مگر چونکہ پیغام تمام رسولوں کا مشترک ہوتا ہے، اس لئے ایک پیغمبر کی جو نافرمانی کی گئی، وہ تمام پیغمبروں کی نافرمانی ہے۔ [۴]

''ان کے پیچھے دنیا میں بھی لعنت لگادی گئی اور آخرت میں بھی' اسے ان افراد کو دیکھنا چاہیے جو فخر یہ کہتے ہیں کہ ہم تو شیطان پر بھی لعنت نہیں کرتے وہ محسوس کریں کہ منشائے ربانی کیا ہے؟

یہ تفسیر جلالین سے ظاہر ہے:

اتبعوا فی ھٰذہ الدنیا لعنۃ من الناس ویوم القیامۃ لعنۃ علیٰ رؤس الخلائق

ان کے پیچھے لگادی گئی ہے اس دنیا میں بھی لعنت لوگوں کی طرف سے (کہ وہ برابر لعنت کرتے رہیں گے) اور قیامت کے دن تمام خلق کے مجمع عام میں (منادی قدرت کی طرف سے لعنت ہوگی)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾

''اور قبیلہ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی، اس کے سوا کوئی تمہارا خدا نہیں ہے، اس نے تم کو شروع شروع میں زمین سے پیدا کیا اور تمہیں اس میں آباد کیا تو اس سے

---

[۱]۔ امرنا عذابنا (جلالین)

[۲]۔ اینست سرگزشت عاد (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ تلك عاد اشارۃ الیٰ اٰثارھم ای فسیحوا فی الارض فانظروا الیھا (جلالین)

[۴]۔ جمع لان من عصیٰ رسولا فقد عصیٰ جمیع الرسل لاشتراکھم فی اصل ماجآؤا بہ وھو التوحید (جلالین)

مغفرت طلب کرو، پھر اُس سے لولگاؤ، یقیناً میرا پروردگار نزدیک ہے، دعاؤں کا قبول کرنے والا''۔

قبیلۂ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال

وہی سلسلہ ہے کلام کا کہ نوح علیہ السلام کو ہم نے بھیجا اور عاد کی طرف ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ اب کہا جارہا ہے کہ ثمود کی طرف صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ زمین سے پیدا کیا''یعنی ابتدائے خلقت میں ابوالبشر کی تخلیق خاک سے کی۔[1]

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٦٢﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ اے صالحؑ! ہمارے اندر تم سے اس کے پہلے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، کیا تم ہمیں روکتے ہو، اس سے کہ ہم عبادت نہ کریں اس کی جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے اور ہم اس سے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو بڑے شک وشبہ میں ہیں جو پریشان کن ہے''۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾

''انہوں نے کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے حقانیت کی نمایاں دلیل کے ساتھ بھیجا گیا ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے خاص رحمت عطا کی ہے تو کون میری مدد کرے گا اللہ کے مقابلہ میں اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ اس صورت میں تو ہمارے لئے سوا خسارہ پہنچانے کے کچھ اور نہیں کرسکتے اے میری قوم والو! یہ اللہ کی طرف کی اونٹنی ہے تمہارے لئے ایک معجزہ کے طور پر تو اسے زمین خدا سے غذا حاصل کرنے دو اور کوئی برائی اسے چھلانا بھی نہیں کہ تمہیں بہت جلد عذاب گرفت میں لے لے گا''[2]

''ناقہ صالح''، مشہور ہے خدا نے اس کو بطور اعزاز یہاں اور سورہ والشّمس میں بھی ناقۃ اللہ کہا ہے صرف اس لئے کہ خالق نے بطور اپنے مظاہرہ قدرت کے نمودار کیا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کو جو روح اللہ کہا گیا ہے، اس کی حقیقت بھی ظاہر ہوجاتی ہے جسے خواہ مخواہ مسیحی حضرات جناب عیسیٰؑ کے بارے

---

[1] قیل فی معناہ قولان: احدھما انہ خلقکم من ادم و ادم من تراب۔ الثانی انہ خلقکم من الارض والاول اختیار الجبائی وھو الاقویٰ (تبیان)

[2] اخذ کم عذاب عاجل (تبیان)

میں اپنے مزعومہ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

ناقہ صالح اپنے اس انتساب کی وجہ سے محترم بھی ہو گیا چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

''حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی تعظیم کرنا ہوگی'' (موضح القرآن)

بے شمار شواہد و دلائل میں سے کیا یہ نظیر بھی یہ ثابت نہیں کرتی کہ غیر اللہ کی تعظیم مطلقاً شرک نہیں ہے بلکہ اگر اللہ کی طرف انتساب کی وجہ سے ہو تو مطلوب الٰہی ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

''تو ان لوگوں نے اسے پے کر دیا تو انہوں نے کہا کہ اپنے گھروں میں بس اب تین دن تک مزے اڑا لو، یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہے، چنانچہ جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے صالح کو اور انہیں جنہوں نے ان کا ساتھ دے کر ایمان اختیار کیا تھا اپنی طرف کی رحمت کے ساتھ نجات دے دی اور اس دن کی رسوائی سے بچا دیا، یقیناً تمہارا پروردگار طاقت ور ہے بڑا زبردست اور جو ظالم تھے ان کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ اپنے مکانوں میں منہ کے بل گر گئے جیسے کبھی وہ یہاں بسے ہی ہوئے نہ تھے آگاہ ہو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا، آگاہ ہو کہ لعنت ہے ثمود پر''۔

نزول عذاب کے بعد اس قوم کے بے جان ہونے کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے کئی جگہ قرآن مجید میں **جاثمین** کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عموماً گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے ہوتے ہیں اور یہی اکثر مفسرین نے اس کے معنی کہے ہیں [1] مگر بے جان ہونے سے گھٹنوں یا زانوؤں کے بل بیٹھنے کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا، لیکن چونکہ عموماً اس لفظ کے یہی معنی ہوتے تھے، لہٰذا **فاصبحوا فی دیارھم جاثمین** کا ترجمہ بعض جگہ ہم نے اس طرح کیا ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے بے جان ہو گئے لیکن جناب شیخ الطائفہ نے اس کے معنی لکھ دیے ہیں ''منہ کے بل گرنا'' [2] جو بے جان ہونے کے ساتھ زیادہ مناسب رکھتے ہیں، اس لئے ہم نے اب اس کا ترجمہ اسی تفسیر کے لحاظ سے کیا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ

---

[1] باركين على الرّكب مبين (جلالین) فجر اٹھے، گھروں اپنے کے زانو پر گرے ہوئے (شاہ رفیع الدین)

[2] الجثوم السقوط على الوجوه (تبیان)

جَآءَ بِعِجۡلٍ حَنِيۡذٍ۝۶۹ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيۡدِيَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَيۡهِ نَكِرَهُمۡ وَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ
خِيۡفَةً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰى قَوۡمِ لُوۡطٍ ؕ۝۷۰

''اور جب ابراہیم کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے خوش خبری لے کر آئے، کہا سلام پھر ذرا دیر نہ گزری کہ وہ لے آئے بھنا ہوا بچھڑا تو جب دیکھا ان کے ہاتھوں کو کہ نہیں پہنچتے اس تک تو انہیں ان پر شک ہوا، اور دل ہی دل میں ان سے ذرا ڈر محسوس کیا[1] انہوں نے کہا ڈریے نہیں۔ ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ولادت اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری

''بھیجے ہوئے'' فرشتے تھے اور خوش خبری ولادت فرزند کی تھی جس کا ذکر اس کے بعد ہے، انہوں نے سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے جواب سلام دیا۔ یہاں دیکھ لیجئے سلام ہی ہے السلام نہیں ہے۔ جلالین میں ہے قَالَ سَلَامٌ، عَلَيْكُم انہوں نے کہا سَلَامٌ عَلَيْكُم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف السَّلَامُ کہا ہو اور عَلَيْكُم مقدر ہو۔[2]

قوم لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں ''یعنی ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے'' اصل منزل مقصود وہ تھی، اور بر سر راہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس ٹھہر گئے بشارت دینے کے لئے۔

وَامۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتۡ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ۝۷۱
قَالَتۡ يٰوَيۡلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوۡزٌ وَّهٰذَا بَعۡلِىۡ شَيۡخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ عَجِيۡبٌ۝۷۲
قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِيۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ ؕ اِنَّهٗ
حَمِيۡدٌ مَّجِيۡدٌ۝۷۳

''اور ان کی بیوی کھڑی ہوئی تھیں تو وہ ہنسنے لگیں، اس پر ہم نے ان کو اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے پیچھے یعقوبؑ کی۔ وہ کہنے لگیں: ارے غضب! کیا میرے یہاں اولاد ہوگی اس حال میں کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر ہیں اسی عالم میں کہ بوڑھے ہیں؟ بلاشبہ یہ ایک عجیب چیز ہے انہوں نے کہا آپ تعجب کرتی ہیں اللہ کی بات سے۔ اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہیں۔ آپ لوگوں پر اے اس گھر والو! یقیناً وہ قابل تعریف ہے، بزرگی والا''۔

یہ بیوی جناب سارہ تھیں وہ خواہ اس صورت حال پر کہ ان کے شوہر نے مہمان نوازی کے ذوق میں فرشتوں کے سامنے کھانا رکھ دیا اور

---

[1]۔ اوجس اضمر فی نفسه (جلالین)
[2]۔ تقدیره: "سلٰم علیکم" فحذف الخبر کما حذف من قوله: فصبر جمیل (تبیان)

بعد میں پتہ چلا کہ وہ فرشتے ہیں اور خواہ خوف ودہشت کے دور ہونے سے جس کا شروع میں غلبہ ہوا تھا[1] اور خواہ قوم لوط پر عذاب آنے کی خبر سننے سے خوش ہو کر[2] ہنسنے لگیں، اس پر فرشتوں نے انہیں ولادت فرزند کی بشارت دی۔ یہ فرزند اسحاق علیہ السلام تھے اور پھر یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی یعنی یہ بھی خوش خبری سنائی کہ فرزند جو پیدا ہو گا وہ زندہ رہے گا اور اس کی نسل چلے گی۔

اہل بیت کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے اس گھر والو یہ ہم ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ مفسرین اہل سنت نے بھی یہی کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"بخشایش خدا و برکات او بر شما است اے اہل ایں خانہ"

شاہ رفیع الدین کے الفاظ یہ ہیں:

رحمت ہے اللہ کی اور برکات اس کی او پر تمہارے ہیں اے گھر والو"۔

اسے یاد رکھئے۔ اب آیہ تطہیر میں جو کہا گیا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ. تو وہاں اہل البیت کا ترجمہ یہی کرنا پڑے گا کہ "اس گھر والو" اور اس کے بعد لغت میں بیت دیکھ کر اس کا مطلب سمجھ میں نہ آئے گا جب تک کہ "اس" کے اشارہ کو نہ دیکھا جائے کہ وہ کس گھر کی طرف ہے اب اس گھر میں جو ہیں وہی آیت میں اہل البیت سے مراد ہوں، چاہے لغوی طور پر اہل خانہ کی مصداق کچھ فرمادیں اور ہوں۔

ہاں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ جناب سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فقط زوجیت کا رشتہ نہ رکھتی تھیں بلکہ وہ نسبی رشتہ داری بھی جناب ابراہیم علیہ السلام سے رکھتی تھیں یعنی خاندان رسالت کی ایک فرد بھی تھیں اور اس لئے اہل البیت کے خطاب میں وہ بلا تکلف داخل ہوئیں۔ اتنا تو ہمارے پہلے کے مفسرین نے بھی کہا ہے[3] اور اس میں ہم مزید یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جناب ابراہیم علیہ السلام سے سببی و نسبی رشتہ کے علاوہ سنخ وجوہر شخصی میں بھی ایسا اتحاد رکھتی تھیں کہ ملائکہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ ان سے بلا واسطہ کلام کیا۔ یہ بات ہر ایک کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿٧٥﴾ يٰاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿٧٦﴾

"تو جب ابراہیمؑ سے خوف ودہشت کی کیفیت دور ہوئی اور خوش خبری انہیں مل گئی تو وہ ہم سے لوطؑ کی قوم کے بارے میں لڑنے لگے۔ یقیناً ابراہیم بڑی قوت برداشت رکھنے والے، ہمدردی رکھنے والے، خدا سے لو لگانے والے تھے۔" "اے ابراہیمؑ درگزر رو اُس سے بلا شبہ آچکا ہے حکم تمہارے پروردگار کا اور یقیناً آکے رہے گا ان پر وہ

---

[1] ۔ اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنس پڑیں (موضح القرآن)

[2] ۔ فضحکت استبشارا بهلا كهم (جلالین) یعنی بسبب خوش وقتی از هلاك قوم لوط (فتح الرحمن)

[3] ۔ انما جعل سارة من اهل البيت لما كانت بنت عمه (تبيان)

عذاب جو پلٹایا نہیں جاسکتا''۔

ایک بندہ بارگاہ الٰہی میں جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ عرض معروض ہی کہلایا جاسکتا ہے بھلا بندہ کی کیا مجال اور وہ بھی ایک پیغمبر کی کہ وہ خالق سے بحث کرے، تکرار کرے اور لڑے؟ مگر یاد رکھئے کہ یہ وہ بندہ ہے جسے خالق نے اپنے خلیل یعنی دوست کا درجہ دیا ہے جو کچھ ابراہیم علیہ السلام کا عمل تھا اسے خود ابراہیم علیہ السلام بیان کرتے تو یقیناً اسے عرض ومناجات ہی کے نام سے یاد کرتے کہ میں نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض معروض کیا مگر خالق اس ''دوست'' ہونے کے رشتہ کو سامنے رکھ کر ان الفاظ میں اس کا ذکر کررہا ہے کہ وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں لڑنے لگے یعنی یہ کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح عذاب ان سے ٹل جائے مگر یہ لڑنا ایسا تھا جو خالق کی نظر میں قابل تعریف ٹھہرا کہ اس پر ابراہیم علیہ السلام کے لئے ثنا یہ الفاظ صرف کئے جانے لگے کہ ''اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ'' ابراہیم بڑے متحمل، دردمند دل رکھنے والے، خداترس تھے۔

یہ اور بات ہے کہ حکمت الٰہی اب اس قوم کو زیادہ مہلت دینے کی متقاضی نہ تھی اس لئے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عرض معروض کے عذاب آکر رہا اور اس قوم کو چھٹکارا حاصل نہ ہوسکا۔

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ۝٧٧ وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ ؕ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡ ؕ اَلَيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ ۝٧٨ قَالُوۡا لَـقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَـنَا فِىۡ بَنٰتِكَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَـتَعۡلَمُ مَا نُرِيۡدُ ۝٧٩ قَالَ لَوۡ اَنَّ لِىۡ بِكُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِىۡۤ اِلٰى رُكۡنٍ شَدِيۡدٍ ۝٨٠

''اور جب وہ ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے تو وہ رنجیدہ ہوگئے ان کی وجہ سے اور وہ ان کے سبب سے شش وپنج میں پڑ گئے اور کہا یہ بڑا شر انگیز دن ہے اور ان کی قوم والے دوڑتے ہوئے ان کی طرف آگئے اور اس کے پہلے برابر وہ سیاہ کاریوں کے مرتکب رہا ہی کرتے تھے انہوں نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! یہ میری لڑکیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے زیادہ مناسب ہیں تو اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمان کے معاملہ میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی شائستہ شخص موجود نہیں ہے؟ ان لوگوں نے کہا تم جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ تم بلاشبہ جانتے ہو کہ ہمارا مقصد کیا ہوا کرتا ہے؟ انہوں نے کہا کاش مجھے تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں سہارا لے سکتا کسی مضبوط ستون کا''۔

قوم لوط صنف مماثل کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے میں مشہور ہے فرشتے جناب لوطؑ کے پاس نوعمر لڑکوں کی صورت میں آئے تو انہیں دیکھ کر اس قوم کے اوباشوں نے لوطؑ کو گھیر لیا اور سمجھے کہ ان کو ہوس رانی کا اچھا ذریعہ ہاتھ آیا۔ اس سے جناب لوط علیہ السلام کو بڑا صدمہ پہنچا اور ان سے ان کی قوم سے یہ گفتگو ہوئی۔

''بیٹیوں'' کے لفظ سے عام طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے ان کے سامنے خود اپنی بیٹیوں کو پیش کیا مگر ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ بیٹیوں کے لفظ سے خود اس قوم کی عورتیں مراد ہیں کیونکہ ایک نبی کے لئے اس قوم کی سب عورتیں ایک طرح بیٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ [1]

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

''انہوں نے کہا اے لوط! ہم آپ کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ ہرگز آپ تک نہیں پہونچ سکیں گے، اب آپ اپنے اہل کو لے کررات کے کسی حصہ میں چلے جایئے گا اور کوئی آپ لوگوں میں سے مڑ کر نہ دیکھے سوا آپ کی بیوی یقیناً اس تک پہونچنے والی ہے وہی مصیبت جو ان لوگوں پر آئے گی۔ بلاشبہ ان کا مقررشدہ وقت صبح کا ہے کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟ چنانچہ جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس سرزمین کو تہ وبالا کر دیا اور ان پر مسلسل کنکر پتھر برسائے جو تمہارے پروردگار کے یہاں نشان زدہ تھے اور وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں؟

قوم لوط پر نزولِ عذاب

فرشتوں نے جب جناب لوط علیہ السلام کو بہت پریشان دیکھا تو انہیں مطمئن کیا اور حقیقت حال سے اطلاع دی ''سوا آپ کی بیوی کے''، یعنی اسے اپنے ساتھ نہ لے جایئے گا''۔ [2]

آخر کا فقرہ وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں'' اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ قوم لوط کے وہ شہر جن پر عذاب نازل ہوا تھا مسافت کے اعتبار سے مکہ والوں سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں، یہ اُن کے حالات خود معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ یہ ظالم بھی اپنی بداعمالی کے اعتبار سے ایسے ہی عذاب کے مستحق ہیں اور وہ پتھر ان سے کچھ دور نہیں ہیں۔ [3]

ہمیں یہ مفہوم بھی بعید معلوم نہیں ہوتا کہ ''الظالمین'' سے جنس مراد ہو یعنی جو بھی اس درجہ کے ظالم ہوں، وہ اسی طرح کے عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ کی جانب کے کسی خاص عفو وکرم کی بنا پر یا رحمۃ للعالمین کے وجودی جودکی برکت سے یا کسی اور مصلحت سے وہ عذاب نازل نہ ہو۔

---

[1]۔ عنٰی به ازواجهم وذٰلك ان النبی ابو امة (علی بن ابراهیم)
[2]۔ استثنآء من الاهل ای فلا تسر بها (جلالین)
[3]۔ هی الحجارة او بلادها (جلالین)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ﴿۸۶﴾

''اور سرزمین مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے تمہارے لئے گھیرنے والے دن کے عذاب کا اور اے میری قوم والو! پورا کیا کرو ناپ تول کو عدالت کے ساتھ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، اللہ کی نعمت جو باقی رہ جائے بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم باایمان ہو اور میں کوئی تمہارا نگہبان نہیں ہوں''۔

جناب شعیبؑ اور ان کی قوم کا حال

وہی سلسلہ یعنی نوح علیہ السلام کو بھیجا۔۔۔ ہود علیہ السلام کو۔۔۔ صالح علیہ السلام کو اور اب کہا جا رہا ہے کہ مدین کی طرف شعیبؑ کو بھیجا۔

''اللہ کی نعمت جو باقی رہ جائے'' اس سے بعض لوگوں نے یہ مراد لیا ہے کہ پورے ناپ تول کے بعد جتنا نفع تمہارے لئے رہ جائے وہ بہت اچھا ہے، اس لئے کہ وہ مال حلال ہوگا جس میں مواخذہ تم سے نہیں ہوگا[1] اور اس سے زیادہ واضح مجھے یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں کی باقی رہنے والی نعمات جو اس کے حکم کی اطاعت سے وابستہ ہیں بہتر ہیں اس دولت فانی سے جو یوں ناجائز طریقہ پر تم حاصل کرتے ہو۔[2]

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ﴿۸۷﴾

''ان لوگوں نے کہا اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تم پر یہ حکم نافذ کرتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں اسے جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے آئے ہیں یا اسے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کریں۔ تم تو یقیناً بڑے ضبط و تحمل والے ٹھیک آدمی ہو''۔

یعنی ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم نمازیں پڑھا کرتے ہو تو پڑھے جاؤ ہمارا کیا نقصان ہے؟ مگر اب نمازیں پڑھتے پڑھتے تم ہمیں یہ نصیحتیں

---

[1] رزقه الباقي لكم بعد ايفاء الكيل والوزن (جلالين)

[2] بقية الله من نعمة و قيل بقية الله طاعة الله۔۔۔ لانه يبقى ثوابها ابدا (تبيان)

کرنے لگے تو کیا تمہاری نماز نے اب تمہیں اس فریضہ پر مامور کیا ہے؟ تم تو بڑے ضبط وتحمل والے ٹھیک آدمی ہو یعنی ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم ہم سے یہ بات کہو گے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کی عبادت چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں حسب دل خواہ جو تصرف کرتے ہیں، وہ تمہارے کہنے سے ترک کر دیں۔

بعض لوگوں نے اس تعریف میں کہ ''تم بڑے ضبط وتحمل والے آدمی ہو'' تمسخر کا پہلو محسوس کیا ہے [1] مگر مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی بلکہ ان کے اس کہنے میں کہ بڑے ضبط وتحمل والے ٹھیک آدمی ہو مجھے یہ پہلو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے افعال واعمال سے تمہیں اتفاق تو کبھی نہیں تھا اور تم ناگواری محسوس کرتے تھے مگر تم نے کبھی اس کا اظہار نکتہ چینی یا اعتراض کی شکل میں نہیں کیا، نہ ہمیں اس کے خلاف کوئی تبلیغ وتلقین کی۔

اس میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ پیغمبران خدا بعثت سے پہلے بھی قوم کی گمراہیوں اور بداعمالیوں سے بیزار اور بے تعلق ہوتے ہیں مگر وہ لب کشائی اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ بعثت ہو یعنی وہ خالق کی طرف سے اس تبلیغ وتلقین پر مامور ہوں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿٨٨﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٩﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿٩٠﴾

''انہوں نے کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا؟ اگر میں نمایاں دلیل پر ہوں اپنے پروردگار کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی ہے اپنی طرف سے اچھی روزی؟ اور میرا یہ مقصود نہیں ہے کہ میں تمہاری مخالفت کروں خود ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جن سے تم کو منع کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا مگر اصلاح جہاں تک کر سکوں نہیں مجھے توفیق مگر اللہ کی طرف سے اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی میں لو لگاتا ہوں اور اے میری قوم والو! میری مخالفت تم سے ایسے کام کہیں نہ کروا دے کہ تمہیں پہنچ جائے ایسی آفت جیسی پہنچی نوح کی یا ہود کی قوم کو یا صالح ؑ کی قوم کو اور لوطؑ کی قوم تو تم سے دور نہیں ہے اور اپنے پروردگار سے مغفرت کے طالب ہو، پھر اس سے لو لگاؤ، یقیناً میرا پروردگار مہربان ہے، بڑی محبت والا''۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا

[1] قالوا ذٰلك استهزاء (جلالین)

رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ؗ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ
وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾

"ان لوگوں نے کہا: اے شعیب! جو کچھ تم کہتے ہو، اس کا زیادہ حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہم تم کو اپنے میں کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے اور تم ہمارے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، انہوں نے کہا: اے میری قوم والو! کیا میرا قبیلہ تمہاری نظر میں اللہ سے زیادہ زبردست ہے؟ اور تم نے اسے اپنے پس پشت ڈال دیا ہے یقیناً میرا پروردگار اس پر جو تم کرتے ہو، حاوی ہے اور اے میری قوم والو! تم اپنی جگہ جو کچھ کرتے ہو، کیے جاؤ اور جو میں کرتا ہوں، میں کئے جاؤں گا بہت جلد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کر دے اور کون جھوٹا ہے؟ اور انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا
بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

"اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے بچا دیا شعیب کو اور انہیں کہ جنہوں نے ان کا ساتھ دے کر ایمان اختیار کیا تھا اپنی رحمت سے، اور گرفت میں لے لیا ان کو جو ظالم تھے کڑک نے، تو وہ اپنے گھروں میں گر گئے، منہ کے بل، گویا کہ وہ وہاں بسے ہی ہوئے نہ تھے، آگاہ ہو کہ لعنت ہے مدین کے لئے جیسی لعنت میں مبتلا ہوئے ثمود"۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا
اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ
النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ
الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

"اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی طرف کے معجزہ اور کھلے ہوئے اقتدار کے ساتھ فرعون اور اس کے ساتھ والے بڑے آدمیوں کے پاس تو ان لوگوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم بالکل صحیح نہ تھا وہ اپنی قوم کی قیادت

کرے گا قیامت کے دن اور اس طرح انہیں دوزخ کی آگ میں پہنچا دے گا کیا بری ہوگی یہ منزل جہاں وارد ہوا جائے گا اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن کیا بُرا عطیہ ہے جو انہیں عطا کیا گیا[1] ‘‘

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

’’یہ ان بستیوں کی خبریں ہیں جو آپ کے سامنے ہم بیان کرتے ہیں ان میں کچھ کچھ رہ گئی ہیں اور کچھ کا قلع قمع ہو چکا ہے اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تو نہیں فائدہ پہنچایا انہیں ان کے خداؤں نے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے تھے جب آ گیا آپ کے پروردگار کا حکم اور انہوں نے سوا تباہی و بربادی کے انہیں کچھ اور نتیجہ نہ بخشا‘‘۔

’’ان میں کچھ رہ گئی ہیں اور کچھ کا قلع قمع ہو چکا ہے‘‘ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض اقوام کی نسلیں باقی ہیں اور بعض بالکل ختم ہو گئیں کہ نسل بھی باقی نہیں رہی اور دوسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ کچھ ایسی بستیاں ہیں کہ وہاں کے باشندے ختم ہو گئے مگر وہ کھنڈر اب تک باقی ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے آثار بھی مسمار ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

’’اور اسی طرح ہوتا ہے گرفت میں لینا تمہارے پروردگار کا جب وہ گرفت میں لیتا ہے بستیوں کو اس عالم میں کہ وہ ظلم و ستم کی مرتکب ہیں یقیناً اس کی گرفت دردناک ہوتی ہے، سخت‘‘۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ؕ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

’’یقیناً اس میں نشانی ہے اس کے لئے جو ڈرے آخرت کے عذاب سے۔ وہ ایسا دن ہے جس کے لئے تمام خلق اکٹھی کی جائے گی اور وہ ایسا دن ہے جس میں سب حاضر ہوں گے اور ہم اس کے لانے میں دیر نہیں کر رہے ہیں مگر ایک مقررہ مدت کے پورا ہونے کے لئے، جس دن وہ آئے گا تو کوئی متنفس بات نہ کرے گا مگر اس کی اجازت سے تو ان میں کچھ بدنصیب ہوں گے اور کچھ خوش نصیب‘‘۔

قرآن مجید کی ایک آیت سے دوسری آیت کی تشریح ہوا کرتی ہے یہاں بات نہ کرنے میں استثناء اجازت کا کر دیا گیا ہے تو دوسری جگہ

---

[1] ۔ انما قیل ھھنا وفدلان اللعنة جعلت بدلا من الرفد بالعطية (تبيان)

مطلق طور پر جو کہہ دیا گیا ہے:

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ۔

وہ دن ایسا ہوگا کہ وہ بات تک نہیں کر سکیں گے۔ (مرسلات:۳۵)

اس سے یہی سمجھنا چاہیے کہ بغیر اللہ کی اجازت کے ایسا نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ وہ ارشاد ہے کہ بات تک نہیں کر سکیں گے، مجرموں کی حالت کا اظہار ہے اور بات سے مراد حجت و دلیل اور کوئی قابل قبول صفائی ہے جسے وہ پیش کر سکیں۔ [1]

اور یہاں اذن کے استثناء کے ساتھ جو ارشاد ہے اس میں تمام خلق کا تذکرہ ہے جن میں وہ بھی داخل ہیں جو مقرب بارگاہ الٰہی ہیں اور جنہیں اس نے خود اس دن کلام کے لئے مامور فرمایا ہے وہ دوسروں کے خلاف گواہی پر بھی مامور ہو سکتے ہیں جو ہماری قدیم تفسیر میں وارد ہے۔ [2]

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

''تو جو بدنصیب ہیں، وہ آتش دوزخ میں ہوں گے، ان کے لئے اس میں چیخ پکار ہوگی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سوا اس کے جو تمہارا پروردگار چاہے یقیناً تمہارا پروردگار جو ارادہ کرتا ہے، اسے کر کے رہنے والا ہے، اور جو خوش نصیب ہیں، وہ بہشت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان و زمین ہیں سوا اس کے کہ تمہارا پروردگار چاہے، یہ عطائے الٰہی ایسی ہوگی جو قطع ہونے والی نہیں ہیں''۔

مذکورہ آیات میں دو فقرے ذرا ذہن کو پریشان کرتے ہیں:

پہلے دوزخ اور جنت دونوں میں یہ کہہ کر ہمیشہ وہاں رہیں گے یہ فقرہ کہ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں حالانکہ یہ آسمان و زمین قائم ہیں حالانکہ یہ آسمان اور زمین تو پہلے ہی ختم ہو چکے ہوں گے اور وہاں والے آسمان و زمین، وہ تو اس بہشت و دوزخ کے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ بہشت و دوزخ ہمیشہ رہنے والے ہیں تو وہ آسمان و زمین بھی ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

دوسرے دونوں میں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا استثناء ہے، سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے سے متعلق ہے یعنی اہل دوزخ، دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے سوا اس کے جسے اللہ چاہے، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جسے وہ چاہے، وہ ہمیشہ نہ رہے گا اور اہل بہشت، بہشت میں ہمیشہ رہیں گے سوا اُس کے جسے اللہ چاہے یعنی جسے اللہ نہ چاہے، ایسا شخص ہمیشہ نہ رہے گا اب یہ کون لوگ ہیں جو دوزخ میں ہمیشہ کے لئے ڈالے جائیں اور

---

[1] ای لاینطقون بحجته (تبیان)

[2] یشهد علیهم الانبیاء و الرّسل (علی بن ابراهیم)

پھر مشیت الٰہی متقاضی ہو تو وہ نکال لئے جائیں گے اور جو جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل کئے جائیں اور پھر مشیت الٰہی متقاضی ہو اور وہ وہاں سے خارج کر دیئے جائیں۔

شاہ ولی اللہ نے اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا تعلق دوزخ اور جنت میں ہمیشہ کے لئے قیام سے قرار ہی نہیں دیا ہے بلکہ اسے مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ جسے متعلق کیا ہے مگر ایسی ژولیدہ بیانی سے جس کا مطلب سمجھنا دشوار ہے وہ لکھتے ہیں:

یعنی مدت ماندن در بہشت و دوزخ مانند مدت دوام آسما نہا و زمین است درد دنیا اگر زیادتی را کہ در مشیت خدا است و در فہم کسی نمی گنجد، اعتبار نکنذ حاصل بیان دوام است با بلغ وجوہ (فتح الرحمٰن)

یعنی جنت اور جہنم میں ان کے رہنے کی مدت آسمانوں اور زمین کے دنیا میں قیام کی مدت کے مثل ہے اگر اس زیادتی کا جو مشیت الٰہی میں ہے اور کسی کے ذہن میں اس کے سمجھنے کی وسعت نہیں ہے لحاظ نہ کیا جائے اور خلاصہ مطلب انتہائی مکمل طریقہ پر ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا اظہار ہے۔ ان کے فرزند شاہ عبدالقادر میرے خیال میں زیادہ حقیقت کے قریب پہنچے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

”دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ رہیں گے کہ آگ میں جتنی دیر رہ چکے ہیں آسمان و زمین دنیا میں مگر جتنا اور چاہے تیرا رب وہ اسی کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ رہیں گے آگ میں جب تک ہے آسمان و زمین اس جہان کا یعنی ہمیشہ مگر جو چاہے رب تو موقوف کر دے لیکن چاہ چکا کہ موقوف نہ ہو۔ اس کہنے میں فرق نکلا اللہ کے ہمیشہ رہنے میں اور بندے کے کہ بندہ کو ہمیشہ رہنے کے ساتھ یہ بات ممکن ہے کہ اللہ چاہے تو فنا کر دے“ (موضح القرآن)

ان میں سے جو پہلے معنی ہیں یعنی مَا شَآءَ رَبُّكَ کا یہ مفہوم کہ اللہ چاہے تو اس مدت کو اور بڑھا دے، یہ جلالین سے ماخوذ ہیں:

تفسیر جلالین میں ہے:

مادامت السمٰوٰت والارض ای مدۃ دوامھا فی الدنیا الا غیر ماشآء ربك من الزیادۃ علی مدتھھما مما لا منتھی لہ والمعنی خالدین فیھا ابدا.

جب تک کہ رہے آسمان اور زمین یعنی جتنے عرصہ تک وہ دنیا میں قائم رہے ”سوا اس کے جو تمہارا پروردگار چاہے“ یعنی اور زیادتی ان کی مدت میں جس کی کوئی انتہا نہیں اور مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

پھر آخر میں لکھا ہے:

وما تقدم من التاویل ھو الذی ظھر لی وھو فال عن التکلف واللہ اعلم بمرادہ

جو معنی بیان ہوئے ہیں وہ میرے ذہن میں آئے ہیں اور ان میں کوئی زحمت نہیں ہے اور اللہ اپنے مطلب سے خود زیادہ واقف ہے۔

ہماری ایک قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ یہ قیامت میں ثواب وعذاب کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پہلے برزخ والے ثواب اور عذاب کا تذکرہ ہے[1]۔

---

[1] ففی النار... فی نار الدنیا قبل یوم القیامۃ... ففی الجنۃ یعنی فی جناب الدنیا التی تنتقل الیھا ارواح المؤمنین (علی بن ابراھیم)

اس کے بعد مَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اور اِلَّا مَا شَآءَ اللہ دونوں فقروں میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

''تو جن چیزوں کی یہ عبادت کرتے ہیں ان سے تمہیں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے، یہ نہیں عبادت کرتے مگر اسی طرح کہ جیسے اس کے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے اور ہم پورا پورا ان کا حصہ انہیں دیں گے، جس میں کوئی کمی نہ ہوگی''۔

اس تمہیں کا مخاطب رسولؐ کو نہیں ماننا چاہیے یا تو لفظی طور پر ہی جیسا کہ بہت سے مقامات پر ہم نے اسے ترجیح دی ہے کہ مخاطب شخصیت خاص نہیں بلکہ ہر سننے والا اور سمجھنے والا ناظر کتاب یا سامع قرآن ہے اور یا لفظی طور پر رسولؐ کے مخاطب ہوتے ہوئے مقصود اس سے آپ کی امت کو متنبہ کرنا ہے۔[1]

جس کی نظیریں بھی قرآن مجید میں بہت ہیں۔

''پورا پورا حصہ'' دینے سے ایک لطیف پیرایہ ہیں پوری پوری سزا دینا مراد ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

''اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا ہوا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی طرف کی بات جو پہلے طے ہو چکی تھی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا اور وہ یقیناً اس میں پریشان کرنے والے شک میں مبتلا ہیں اور بلا شبہ ہر ایک کو ایک وقت پورا پورا دے گا تمہارا پروردگار ان کے اعمال کا معاوضہ۔ یقیناً وہ اس سے جو وہ کرتے ہیں، باخبر ہے''۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو اپنی قوم کے انکار سے دل تنگی پیدا ہوتی تھی اس کی بناء پر بہت سی آیات میں گزشتہ انبیاء کی نظیریں پیش کر کے آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کی مثال اسی مقصد سے دی گئی ہے۔[2]

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ

---

[1]۔ نهى الله تعالىٰ نبيّه والمراد به امته (تبيان)

[2]۔ اراد بذلك تسلية النبى ﷺ على تكذيب قومه (تبيان)

أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''تو مضبوطی سے برقرار رہیے جیسا کہ آپ مامور ہیں اور وہ بھی جو آپ کے ساتھ لو لگاتے ہیں اور تم لوگ سرکشی نہ کرو۔ یقیناً جو جو کچھ تم کرتے ہو اس کا دیکھنے والا ہے اور ان کی طرف جو ظالم ہیں نہ جھکو کہ پہنچے تم کو آتش دوزخ اور اللہ کو چھوڑ کر تمہارے کوئی حوالی موالی نہ ہوں گے پھر تمہاری مدد نہ ہوگی''۔

''یہ برقرار رہنا'' انتہائی مشکل کے باوجود حق کے جادہ پر ثابت قدم رہنا ہے جس کی جاہل لوگ ضد سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کی خالق کی طرف سے رسولؐ کو ہدایت ہے[1] اور ان کے ان پیروؤں کو جو اللہ سے لو لگائے ہوں یعنی اس کی مرضی کے مقابلہ میں دنیا کی پرواہ نہ کریں اور اس کے مقابل کردار کو سرکشی سے تعبیر فرمایا ہے جس پر ان الفاظ میں ڈرایا گیا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھنے والا ہے''۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''اور نماز ادا کرو دن کے دونوں طرف کے حصوں میں اور رات کے کچھ حصوں میں یقیناً نیکیاں ختم کر دیتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد آوری ہے ان کے لئے جو یاد تازہ رکھنا چاہیں۔

اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ

اس پر سب متفق ہیں کہ دن کے دونوں طرف کے حصوں میں نماز سے مراد صبح اور ظہر و عصر ہے اور رات کے حصوں میں نماز سے مراد مغرب وعشاء ہے جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے:

طرفی النّهارِ الغداة والعشی ای الصّبح و الظّهرو العصر و زلفا جمع زلفة ای طائفة من اليل المغرب والعشاء.

دن کے دونوں طرف کے حصے صبح اور دوپہر سے شام تک یعنی صبح اور ظہر و عصر اور زلف کا لفظ کا زلفۃ کی جمع ہے یعنی رات کا ایک حصہ اس میں مغرب اور عشاء ہے۔

اسے جس طرح قرآن نے کہا ہے اس سے اوقات نماز کے بارے میں جو فقہ جعفری کی تعلیم ہے، وہی ثابت ہوتی ہے۔

جمہور کا تصور کیا ہے؟ یہ کہ پانچ نمازوں کے پانچ الگ الگ وقت ہیں جن کے درمیان ایسے وقفے گزرتے ہیں جو کسی بھی نماز سے تعلق نہیں رکھتے۔

طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک صبح کا وقت ہے اور طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک کسی نماز کا وقت نہیں ہے ویسے زوال آفتاب کے بعد تھوڑی دیر تک ظہر کا وقت ہے اس کے بعد ظہر کا وقت نکل جاتا ہے اور ابھی عصر کا وقت آتا نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ درمیان

---

[1] ۔امر الله النّبی ﷺ و امته ان يستقيموا كما امرهم الله (تبیان)

میں ایک جز ایسا آ گیا جس میں کسی نماز کا وقت نہیں ہے ایسے ہی عصر کے بعد مغرب تک ایک وقفہ ہوتا ہے جو نماز سے خالی ہے اور مغرب کے بعد پھر ایک وقفہ ایسا ہے جس میں عشاء کا وقت داخل نہیں ہوتا اور اس کے بعد عشاء کی نماز ہے جس کے بعد صبح تک پھر نماز واجب کا وقت نہیں ہے اگر یہ صورت ہوتو قرآن کو نماز کے پانچ وقت الگ الگ بیان کرنا چاہئیں۔ وہ کہے کہ دن کے ابتدائی حصہ میں نماز قائم کرو۔ پھر بیچ میں نماز ادا کرو، یہ ظہر ہے۔ پھر آخر کے کچھ حصہ میں نماز ادا کرو جو نماز عصر ہے۔ پھر رات کے اول حصہ میں ادا کرو۔ یہ مغرب ہوگی۔ پھر رات کے درمیانی حصہ میں ادا کرو یہ عشاء ہوگی۔ مگر قرآن تمام اوقات کو تین پر تقسیم کررہا ہے۔ دو طرفی النہار ''دن کا اول اور آخری حصہ''......اول حصہ میں صبح ہے اور آخر حصہ میں ظہر وعصر ہے۔ معلوم ہوا کہ صبح اور ظہر کے بیچ میں ایسا وقفہ ہے جس میں کسی نماز کا وقت نہ ہو مگر دن کا آخر حصہ پورا نماز کے وقت کا ہے جس میں صرف ترتیب ظہر کے پہلے اور عصر کے بعد میں ہونے کی وجہ سے عقلاً کوئی ایک جزء ایک سے مختص ہوجائے وہ اور بات ہے ورنہ اس پورے وقت میں یہ دونوں نمازیں ادا ہوسکتی ہیں اور پھر رات کا کچھ حصہ ہے جس میں مغرب اور عشاء دونوں کا وقت مشترک ہے یہ اور بات ہے کہ ترتیب کی وجہ سے شروع کا کچھ جزء مغرب سے اور آخر کا کچھ جزء عشاء سے مختص ہوجائے۔ ورنہ ہے یہ پورا وقت ان ہی نمازوں کا جنہیں ہم ''مغربین'' کہتے ہیں یہی فقہ امامیہ کی تعلیم ہے اور یہی صاف قرآن سے ثابت ہے۔

اس کے علاوہ یہ دیکھئے کہ مغرب اور عشاء دونوں کے وقت کو زلفاً من الیل کہا جاتا ہے رات کا کچھ حصہ ظاہر ہے کہ تاریکی چھائے ہوئے بغیر رات کو اطلاق کسی حیثیت سے نہیں ہوسکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فقط سورج کی ٹکیا کی نظر سے اوجھل ہونے کے ساتھ جب تک کچھ تاریکی آ نہ جائے، نماز مغرب کا وقت نہیں آتا۔ جس طرح روزہ کے اختتام کے لئے کہا ہے:

اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیۡلِ۔

روزہ کو رات تک مکمل کرو۔

معلوم ہوا کہ اس جزء میں بھی فقہ جعفری ہی قرآن کے موافق ہے کہ غروب حسّی یعنی آفتاب کے نگاہ سے غائب ہونے پر فوراً نہ نماز مغرب پڑھنا درست ہے اور نہ روزہ کھولنا۔ صحیح ہے بلکہ انتظار کرنا چاہیے کہ ذرا تاریکی پیدا ہوجائے اور وہ اسی وقت ہوگی کہ جب حمرۂ مشرقیہ زائل ہوجائے اور سیاہی سر کے قریب آجائے بغیر اس کے لیل کا اطلاق کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور بغیر لیل کے آئے ہوئے از روئے قرآن نہ مغرب کی نماز پڑھنا درست ہے اور نہ روزہ کھولنا۔

وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾

''اور صبر و برداشت سے کام لیجئے، اس لئے کہ اللہ اچھے اعمال کرنے والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتا''۔

یہاں پر ترتیب اگر مطابق تنزیل ہے تو صبر و برداشت کا حکم گزشتہ دونوں آیات کے مضمون سے مجموعاً متعلق ہوسکتا ہے یعنی راہ حق میں جو مشکلات درپیش ہوں، ان پر صبر سے کام لے استقامت یعنی ثبات قدم برقرار رکھئے اور پابندی فرائض میں محافظت اوقات رکھتے ہوئے، عام طور پر ایسی پابندی میں انسان کو جو کلفت یعنی زحمت محسوس ہوتی ہے اسے برداشت کیجئے۔[1]

اور یہ پہلے ہی آچکا ہے کہ یہ حکم خاص رسولؐ کو نہیں ہے بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے وفادار افراد امت کو بھی ہے۔

---

[1]۔ امر اللہ تعالیٰ نبیہ ﷺ بالصبر علیٰ اذیٰ قومہ۔۔وعلی القیام بما افترض علیہ من اداء الواجب (تبیان)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا
مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

''تو کیوں نہ ہوئے ان اقوام میں جو تمہارے پہلے تھیں ایسے بچے کھچے سمجھدار لوگ جو زمین میں خرابیاں پھیلانے سے منع کرتے سوا تھوڑے سے ایسے افراد کے جن کو ہم نے نجات دی ان میں سے ظالم تھے وہ پیچھے لگے رہے ان عیش و عشرت کی لذات کے جو انہیں دی گئی تھیں اور وہ گناہگار تھے''۔

یعنی ہر قوم میں تھوڑے ایسے ضرور تھے جو ان کی بداعمالیوں سے الگ تھے اور انہیں منع بھی کرتے تھے چنانچہ ہمیشہ عذاب نازل ہونے کے موقع پر معدودے چند بچ جاتے تھے لیکن اگر بہت سے ایسے افراد ہوتے جو برائیوں سے روکیں تو قوم پر عذاب نازل ہی نہ ہوتا۔[۱]

اولو بقیّۃ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے بچے کھچے سمجھدار لوگ یہ مختلف تفسیروں سے مستفاد ہوتا ہے۔[۲]

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

''اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو تباہ کرے ظلم کے ساتھ حالانکہ ان کے باشندے درست اعمال ہوں''۔

یعنی عذاب الٰہی بلاوجہ نہیں آیا کرتا جب تک کہ وہاں کے باشندوں کے اعمال ایسے خراب نہ ہوں کہ انہیں سزا دینا ضروری ہو۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ
رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ
وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ
فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو سب کو ایک مذہب پر بنا دیتا[۳] اور وہ برابر اختلاف کرتے رہیں گے سوا اس کے جس کو تمہارے پروردگار کا رحم و کرم شامل حال ہو حالانکہ اس نے پیدا انہیں اسی لئے کیا تھا اور تمہارے پروردگار کی بات پوری ہوئی کہ میں ضرور بھردوں گا دوزخ کو جنات اور انسانوں سے۔ اور پیغمبروں کے واقعات میں سے ہر وہ

---

[۱] ۔یعنی نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی تھوڑے تھے سو اب بچ گئے (موضح القرآن)

[۲] ۔ای کان یجب ان یکون منھم قوم باقون فی الارض ینھون۔۔ و معنی اولو بقیۃ اصحاب جماعتہ تبقیٰ من نسلھم والبقیۃ ممدوحۃ یقال فی فلان بقیۃ ای فیہ فضل و خیر (تبیان) اھل خرد (شاہ ولی اللہ) صاحب شعور کے (شاہ رفیع الدین)

[۳] ۔امۃ واحدۃ ای علیٰ دین واحد کما قال: انا وجدنا اٰبائنا علیٰ امۃ (تبیان)

چیز ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں جس سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور آئی ہے آپ کے پاس اس میں حقیقت اور موعظت اور نصیحت اہل ایمان کے لئے''۔

یہ آیت مشکلاتِ قرآن میں سے ہوگئی ہے اور جبر کے ماننے والوں نے بلاتکلف اسے کہ اللہ نے انہیں اسی لئے پیدا کیا ہے اس معنی میں لے لیا ہے کہ خدا نے اسی اختلاف کے لئے ان کو پیدا کیا ہے [1] اور اس نے پہلے سے طے کردیا ہے کہ دوزخ کو ان سے بھرا جائے گا مگر عقلی طور پر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں اگر اُس نے اسی اختلاف کے لئے انہیں پیدا کیا ہے تو اختلاف کرکے وہ اس کے مقصد کی تکمیل کرتے ہیں پھر دوزخ کو ان سے کیوں بھرا جائے اور اگر وہ اس اختلاف میں مبتلا ہوکر دوزخ میں بھیجے جانے کے مستحق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اختلاف کے لئے انہیں پیدا نہیں کیا ہے اور وہ اختلاف کرکے اس کی مرضی کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اسی لئے دوزخ کے مستحق بنتے ہیں مگر جب کہ اس سے پہلے قریب ہی من رحم ربك موجود ہے تو کیوں نہ ''ذالك'' کا مشارٌ الیہ اسی رحمت کو قرار دیا جائے جس کی تائید میں ہمارے قدیم مفسرین کے اقوال موجود ہیں اور اس لئے ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ [2]

یعنی قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں یا یہ کہ اس سورہ میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں [3] وہ کوئی تاریخ نگاری یا قصہ گوئی کے مقصد سے نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ عملی پہلو ہوتے ہیں جن کی طرف توجہ دہانی منظور ہوتی ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور کہیے ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنے طور پر عمل کرتے رہو، ہم بھی عمل کر رہے ہیں اور انتظار کرو، ہم بھی انتظار رکھتے ہیں''۔

یعنی تمہارے اور ہمارے اعمال کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے دیکھنے کے تم بھی منتظر رہو، ہم بھی منتظر ہیں۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اللہ سے مخصوص ہے آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم اور اسی کی طرف تمام تر معاملہ کی رجوع ہے تو اسی کی عبادت اور اسی پر بھروسا کرو اور تمہارا پروردگار اس سے جو تم لوگ کرتے ہو بے خبر نہیں ہے''۔

---

[1]۔ برای این اختلاف آفریدہ است ایشان را (شاہ ولی اللہ)

[2]۔ خلقهم يعنى اهل امة لا يختلفون فى الدين (على بن ابراهيم) قال ابن عباس و مجاهد و قتادة والضحاك ان المواد: وللرحمة خلقهم (تبيان)

[3]۔ درایں سورہ (شاہ ولی اللہ) فى هٰذه الأيات والانبيآء (جلالين) الاوّل اصحّ والتقدير جآءك فى هٰذه السّورة الحقّ مع ماجآءك فى سائر السّور (تبيان)

سُوْرَةُ یُوسُف

مکیّہ-----۱۱۱ آیات

جناب یوسف علیہ السلام کا نام تو بسلسلہ انبیاء اور انفرادی طور پر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر موجود ہے لیکن اس واقعہ کا ذکر جسے قصہ یوسفؑ کہا جاتا ہے اور قرآن نے اسے تمام قصوں میں بہترین کہا ہے، اس سورہ میں درج ہے پھر خود اسی واقعہ کے ذیل میں بہت سی عبرتیں، نصیحتیں اور تعلیمات موجود ہیں۔ مثلاً

سورۂ یوسف کے خاص خاص موضوعات:

۱-----خوفِ فتنہ، خوف خدا یا کسی اہم مصلحت کی وجہ سے حقیقتوں اور واقعیتوں کے اخفاء کا مستحسن ہونا۔

۲-----باوجود دوسرے پر حقیقتاً اطمینان نہ ہونے کے پھر بھی ظاہری قول وقرار پر اتمام حجت کے لئے اعتماد کر کے عمل کرنا۔

۳-----وقتی تکالیف اور مصائب میں حکمت ربانی کے جلوے اور انجام میں کامیابی وکامرانی اور بہتر سے بہتر نتیجہ کا ظہور۔

۴-----امانت داری اور پاک دامانی کی اہمیت اور سخت ترین ماحول میں خطرات کی پرواہ کیے بغیر اس پر ثبات وقرار۔

۵-----تبلیغ حق کے لئے مناسب موقع سے فائدہ اٹھانا اور قید وبند یا کسی بھی عالم میں اپنے نصب العین کو نظر انداز نہ کرنا۔

۶-----قید ومصیبت سے رہائی کہ بہ نسبت زیادہ اہم جرم سے اپنے بری ہونے کی تصدیق۔

۷-----رہنمائے دین کی معاشی نظام کی حکمتوں سے بہترین واقفیت۔

۸-----دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی مجبوری کے مشاہدہ سے رحم دلانہ تاثر۔

۹-----نظر بد کے خطرہ کی مذہبی اصلیت۔

۱۰-----گریہ کا جواز۔

۱۱-----گریہ باوجود علم بحیات

۱۲-----ظالموں کو گریہ سے ناگواری اور ان کی طرف سے اس پر اعتراض

۱۳-----قابو پا کر اپنے ظالموں کے ساتھ عفو وکرم کا مظاہرہ۔

۱۴-----سجدہ تعظیمی کا سابق میں جواز اور اس کے شرک نہ ہونے کا ثبوت۔

۱۵-----اکثریت کا راہ ایمان سے انحراف وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہاراﷲ کے نام کا جوسب کوفیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞١ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞٢

''الف۔لام۔را۔یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنا کر اتارا ہے،شاید تم لوگ عقل سے کام لو''۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۞٣

''ہم آپ کے سامنے بہترین قصے سناتے ہیں اس سے جو ہم نے آپ کی طرف قرآن کی وحی بھیجی ہے اگر چہ آپ اس سے پہلے بے خبر تھے''۔

یعنی ہماری تعلیم سے قطع نظر کر کے ذاتاً آپ کسی بھی علم واطلاع کے مالک نہ تھے کیونکہ آپ تو مخلوق ہیں مخلوق کا کوئی کمال بھی اس کا ذاتی نہیں ہوسکتا۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۞٤ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۞٥ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞٦

''جب کہا یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہ اے بابا! میں نے خواب میں دیکھا گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے۔انہوں نے کہا اے بیٹا اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا کہ کہیں تمہیں نقصان پہنچانے کے لئے کوئی سازش نہ کریں۔یقیناً شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اور اسی طرح تمہیں تمہارا پروردگار امتیاز عطا کرے گا اور تمہیں تعبیر خواب کا علم عطا کرے گا اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے گا اور یعقوب کے خاندان پر جس طرح اس نے اسے پورا کیا اس کے پہلے تمہارے آباؤ اجداد میں سے دو ابراہیم اور اسحاق پر،یقیناً تمہارا پروردگار جاننے والا ہے،بڑا ٹھیک کام کرنے والا''۔

جناب یوسف علیہ السلام کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گفتگو

اس طرح تمہیں تمہارا پروردگار عطا کرے گا یعنی جیسے تمہیں اس نے اپنے فضل وکرم سے یہ خواب دکھایا، اسی طرح عالم مشاہدہ میں بھی تمہیں امتیاز عطا کرے گا۔[1]

لَقَدۡ كَانَ فِىۡ يُوۡسُفَ وَاِخۡوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيۡنَ ۞

"بلاشبہ یوسفؑ اوران کے بھائیوں (کے حالات) میں نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لئے"۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

برادران یوسفؑ کا منصوبہ اور یوسفؑ کے ساتھ بدسلوکیاں

"نقل ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کچھ بتاؤ کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھیں سچ آزمانے کو کہا۔ پوچھو کہ ابراہیم علیہ السلام کا وطن شام ہے اس کی اولاد بنی اسرائیل مصر میں کیوں کرائی۔ فرمایا کہ پوچھنے والے کو نشانیاں ہیں قریش کی کہ یہ ایک بھائی کا حسد تھا کہ اطاعت قبول نہ کی۔ آخر اللہ نے اس کی طرف محتاج کیا اور اس طرح یہود حسد کر کے خراب ہوئے اور قریش نے بھائی کو وطن سے نکالا، وہیں اس کو عروج ہوا"۔ (موضح القرآن)

پھر یہ نشانی اس مثال عمل کے ساتھ بھی مطابق ہے کہ بھائیوں نے تو کس طرح ایذائیں پہنچائیں اور جناب یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف کیا اور درگزر سے کام لیا جو بلاشبہ ایک غیر معمولی کردار تھا[2] اسی طرح پیغمبر خداؐ نے قریش کی ایذاؤں کے باوجود جب ان پر فتح مکہ میں قابو پایا تو عام معافی کا اعلان فرمادیا۔

اِذۡ قَالُوۡا لَيُوۡسُفُ وَاَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيۡنَا مِنَّا وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنِ ۞ۚۖ اقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡهُ اَرۡضًا يَّخۡلُ لَـكُمۡ وَجۡهُ اَبِيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِيۡنَ ۞

"جب انہوں نے کہا کہ یوسفؑ اور ان کا بھائی، یہ ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں"۔ حالانکہ ہم اتنے ہیں طاقت ور یقیناً ہمارے باپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ قتل کردو یوسف کو یا کسی اور سرزمین پر لے جاکر ڈال دو کہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف ہوجائے اور تم اس کے بعد پھر نیک لوگ ہوجانا"۔

برادران یوسف کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ وہ بغض وحسد وغیرہ صفات ذمیمہ رکھنے کے علاوہ ایک نبیؑ خدا یعنی اپنے باپ کی نبوت پر ایمان بھی نہ رکھتے تھے ورنہ وہ انہیں گمراہ قرار نہ دیتے اور اس لئے علمائے شیعہ کو جمہور کے اس تصور سے کہ وہ برادران یوسف کی نبوت کے قائل ہیں

---

[1] ۔ كما اكرمك بان اراك فى منامك هٰذه الرّؤيا(تبيان)

[2] ۔ وكان ذٰلك خروجا عن العادات(تبيان)

شدید اختلاف ہے۔[1]

یہ سب کرلو پھر نیک لوگ ہوجانا یعنی بعد میں توبہ کرلینا۔[2]

یہ توبہ کا وہ عام تصور ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں ہے اور جس سے وہ بے باکانہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ توبہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ جب چاہے آدمی اسے کرلے بلکہ وہ صحیح احساس گناہ اور پشیمانی کا نام ہے اگر یہ صحیح احساس گناہ شروع سے ہے اس لئے آدمی توبہ کا واقعہ تصور رکھتا ہے، تو وہ ارتکاب گناہ ہی کیوں کرے گا۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿١٠﴾

’’ان میں سے ایک نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو اور اندھیرے کنویں میں انہیں ڈال دو تو مسافروں کے قافلوں میں سے کوئی انہیں اٹھالے جائے گا اگر ایسا کرنا چاہتے ہو‘‘۔

یعنی یہ تمہارا مقصد ہے کہ یوسفؑ کو باپ کی نظر سے اوجھل کردو تو یہ صورت اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔[3]

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿١١﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿١٢﴾ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿١٣﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿١٤﴾

’’ان لوگوں نے کہا اے ہمارے والد صاحب! کیا بات ہے کہ آپ یوسفؑ کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں کرتے حالانکہ ہم ان کے خیر خواہ ہیں، کل ہمارے ساتھ انہیں بھیج دیجئے کہ باغوں سے بہرہ اندوز ہوں[4] اور کھیل کود میں مصروف رہیں اور ہم سب ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، کہا مجھے اس سے صدمہ ہوگا کہ تم اسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا نہ کھالے دراں حالیکہ تم اس کی طرف سے غفلت میں رہو۔ انہوں نے کہا اگر بھیڑیا انہیں کھالے اس صورت میں کہ ہم ایک مضبوط جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں تو ہم یقیناً بڑے خسارے میں ہیں‘‘۔

یعنی اتنی تعداد اور اتنی قوت میں ہونے کے باوجود یہ ہو ہی کیوں کرسکتا ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا ہمارے بھائی کو کھا جائے۔

---

[1] ۔ هو مذهبنا لان الانبيآء لا يجوز ان يقع منهم القبائح (تبيان)

[2] ۔ بان تتربوا (جلالين)

[3] ۔ ان كنتم فاعلين ما اردتم من التفريق فاكتفوا بذلك (جلالين)

[4] ۔ ينال الملاذ و يتفرج (تبيان)

جناب یعقوبؑ نے یہ کیوں کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے؟ بعض کا خیال ہے کہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے دل کو خبر ہونا کہتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ان کو بھیڑیئے کا بہانہ کرنا تھا وہی ان کے دل میں خوف آیا''۔ (موضح القرآن)

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس سرزمین پر بھیڑیوں کی کثرت تھی اور یہ خطرہ عموماً رہتا تھا جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے

وکانت ارضا کثیرۃ الذئاب.

اس سرزمین پر بھیڑیوں کی کثرت تھی۔

یا جیسا شیخ الطائفہ نے تحریر فرمایا ہے:

لان الذئاب کانت ضاربۃ فی ذٰلك الوقت (تبیان)

ان دنوں میں عموماً بھیڑیے بچوں کو پھاڑ دیا کرتے تھے۔

یہ کہ ایسا کہنا کسی علم ربانی کا نتیجہ تھا اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں بھیڑیا یوسفؑ کو کھانے والا تھا ہی نہیں۔ وہ تو بھائیوں نے بعد میں جھوٹا بہانہ کیا تھا اور کوئی شخص تو ایسا کہہ سکتا ہے کہ ان کے لئے جناب یعقوبؑ کا یہ اندیشہ ظاہر کرنا، ''سرور بستان یادادن'' کا مصداق بن گیا کہ انہیں بہانہ بنانے کے لئے پھر کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مگر ہمارے ذہن میں تو اس کے خلاف یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ جناب یعقوبؑ کا بطور پیش بندی یہ کہہ دینا کہ ایسا اتمام حجت کا انداز ہے کہ ان کے لئے اس طرح کے بہانہ کا سدباب ہو جانا چاہیے جب کہ وہ یہ کہہ چکے تھے کہ ہماری اتنی تعداد ہے کہ اس خطرہ کا تصور ہی نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کے ایک فرد کو بھیڑیا کھا جائے اس کے بعد ان کی یہ سراسر مہملیت تھی کہ انہوں نے ایسی ہی بات تراشی جسے وہ خود ناممکن کہہ چکے تھے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۵

''تو وہ جب انہیں لے گئے اور اس پر متفق ہوئے کہ انہیں اندھیرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم انہیں بتلاؤ گے ان کی اس کارگزاری کو جب کہ انہیں اس کا شعور نہیں ہوگا''۔

جب وہ اس پر متفق ہوئے تو کیا ہوا؟ یہ واضح ہونے کی بنا پر محذوف ہے یعنی انہوں نے ایسا کر دیا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

آگے نہ فرمایا کہ کیا ہوا؟ اس واسطے کہ لائق بیان نہیں جو کچھ بھائیوں نے سلوک کیا'' (موضح القرآن)

اس کے بعد جو فرمایا ہے کہ ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی، یعنی یوسفؑ کو ہم نے یہ اطلاع دیدی بطور تسلی اور دل میں ڈال دیا کہ گھبرانا

نہیں۔اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا ہوگا اور انہیں آخر میں ناکامی ہوگی جس کا انہیں اس وقت احساس نہیں ہے۔[۱]
بعد کو جن واقعات کی تفصیل سامنے آئے گی کہ بار بار یوسفؑ کے دربار میں حاضر ہونے کے بعد ان بھائیوں نے یوسفؑ کو نہ پہچانا اور آخر میں جب موقع ہوا تو خود جناب یوسف علیہ السلام نے انہیں متنبہ کیا کہ تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور بتلایا کہ میں یوسفؑ ہوں، یہ سب اس وقت کی وحی کے اجمال میں کہ تم انہیں بتلاؤ گے ان کی اس کارگزاری کو اور انہیں اس کا شعور نہ ہوگا، مضمر ہے۔[۲]

وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿١٦﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾

''اور وہ اپنے باپ کے پاس شام کو روتے ہوئے آئے، کہنے لگے ''اے ہمارے باپ! ہم گئے دوڑ میں مقابلہ کرنے آپس میں اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے اور بھیڑیا آیا اور انہیں کھا گیا اور آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے، چاہے ہم سچے ہوں''۔اور لائے ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر، انہوں نے کہا بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے خیر میں صبر کرتا ہوں جو اچھا ہے اور اللہ ہی سے مدد حاصل کی جا سکتی ہے اس کے مقابلہ میں جو تم بیان کرتے ہو''۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿٢٠﴾

''اور ایک قافلہ آیا تو ان لوگوں نے اپنے پانی لانے والے کو[۳] بھیجا تو اس نے اپنا ڈول ڈالا، کہا ارے خوش خبری ہو یہ ایک لڑکا ہے اور ان لوگوں نے پوشیدہ رکھا اسے ایک سرمایہ قرار دے کر اور اللہ جاننے والا ہے اس کا جو وہ کرتے ہیں اور ان لوگوں نے انہیں بیچا بہت کم چند گنتی کے چاندی والے سکوں کی قیمت پر اور وہ ان کی ناقدری کرنے والے تھے''۔

---

[۱]۔اوحینا الیه فی الجب وحی حقیقة ... تطمینا لقلبه (جلالین)
[۲]۔فی روایة ابی جارود عن ابی جعفر علیه السلام --- یقول لا یشعرون انك انت یوسف۔(علی بن ابراهیم)
[۳]۔الذی یرد الماء لیستقی منه (جلالین)

یہ بیچنا جس کا ذکر ہے اس میں بیچنے والے وہی بھائی تھے۔[1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

بھائی وہاں گئے، کنویں میں نہ پایا، قافلہ پر دعویٰ کیا جب ثابت ہوا اٹھارہ درہم کو بیچ ڈالا۔ پھر آگے قافلہ والوں نے مصر میں جا کر بیچا۔ حق تعالیٰ نے صریحاً ایک بیچنا فرمایا''۔(موضح القرآن)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے پہلے جو ہے ان لوگوں نے پوشیدہ رکھا اسے ایک سرمایہ قرار دے کر یہ بھی برادران یوسف کا ذکر ہے

تفسیر جلالین میں ہے:

معلم به اخوته فاتو هم و اسرّوه ای اخضوا امره جا علیه بضاعة بان قالوا هو عبدنا ابق وسکت یوسف خوفاً ان یقتلوه.

ان کے بھائیوں کو یہ (قافلہ کا حال) معلوم ہو گیا تو وہ ان کے پاس آئے اور اسے چھپایا۔ یعنی ان کے اصل واقعہ کو چھپایا اسے اپنے لئے سرمایہ یعنی حصول مال کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اس طرح کہ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھاگ کر آیا ہے یہاں یوسف خاموش رہے اس ڈر سے کہ وہ انہیں قتل نہ کر ڈالیں۔

اس صورت میں انہی (برادران) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ان کی ناقدری کرنے والے تھے۔[2]

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ یَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ؗ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور جس نے مصر سے انہیں خریدا، اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے عزت کے ساتھ رکھنا ممکن ہے یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور اس طرح دنیا میں ہم نے یوسف کو اقتدار ملنے کا سامان کیا اور اس لئے کہ ہم انہیں خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کریں اور اللہ اپنے منشاء کے پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن زیادہ لوگ جانتے نہیں''۔

تذکرہ عزیز مصر و زلیخا

یہ قرآن مجید کا خاص انداز بیان ہے کہ یوسفؑ کی جو دو دفعہ بیع ہوئی ہے اور دو دفعہ ان کی خریداری ہوئی۔ پہلی دفعہ برادران یوسف نے بیچا اور اہل قافلہ نے خریدا اور دوسری دفعہ مصر میں جا کر اہل قافلہ نے بیچا اور عزیز مصر نے خریدا، ان میں پہلی جگہ قرآن نے بیچنے کا ذکر کیا خریداری کا نام نہیں لیا کہ اسے انسان اپنی عقل سے سمجھ لے اور دوسری جگہ خریداری کا ذکر کیا کسی کے فروخت کرنے کا نہیں اسے عقل پر چھوڑ دیا۔

[1] حکی اللہ تعالیٰ عن اخوۃ یوسف انہم باعوا یوسف (تبیان)

[2] کانوا ای اخوتہ (جلالین)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''مصر میں عزیز نے مول لیا، عزیز کہتے تھے بادشاہ کے مختار کو۔ اس نے ہوشیار دیکھ کر غلاموں کی طرح نہ رکھا، فرزند کی طرح رکھا کہ کاروبار میں نائب ہوگا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے اس ملک میں اس کا قدم جمایا'' (موضح القرآن)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور جب وہ پورے طور پر جوان ہوئے ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور یونہی ہم صلہ دیتے ہیں نیک اعمال اشخاص کو۔

بَلَغَ اَشُدَّهٗ عرب کا محاورہ ہے جو کس عمر سے شروع ہوتا ہے؟ اس میں اختلاف ہے مگر نتیجہ سب کا وہی ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''پورے طور پر جوان ہوئے''۔[1]

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْۤ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور ان پر ڈول ڈالنے لگی[2] وہ جس کے گھر میں وہ تھے اور اس نے دروازوں کو بند کر دیا اور کہا بس آ و[3] کہا اللہ کی پناہ۔ یہ میرے مالک ہیں جنہوں نے اچھی طرح مجھے اپنے مکان میں رکھا۔ یقیناً جو ظالم ہیں وہ بہتری نہیں پاسکتے''۔

واقعۂ یوسفؑ وزلیخا

یہ میرے مالک ہیں۔۔۔زیادہ مفسرین کے اقوال یہی ہیں کہ اس سے اشارہ زلیخا کے شوہر کی طرف ہے جس نے انہیں خریدا تھا اور اس طرح ظاہری حیثیت سے وہ ان کا مالک قرار پایا تھا۔[4]

یہ شاہد ہے اس کا کہ اصل حقیقت سے قطع نظر، عامۂ افراد کی زبان پر جو لقب یا وصف چڑھا ہوا ہے، اُس کا اطلاق اصل حقیقت پر کوئی ضرب نہیں ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ

---

[1] شدہ وھو کما لا لقوہ وقال قوم ھو من ثمانی عشرہ سنۃ الی سنین سنۃ وقال ابن عباس من عشرین وقال مجاھد من ثلاث و ثلاثین سنۃ والاشدّ جمع لا واحد لہ من لفظہ مستعمل (تبیان)

[2] المراودۃ المطالبۃ بامر للعمل بہ (تبیان)

[3] ای ھلم (جلالین)

[4] انہ ای الذی اشترانی ربی سیدی (جلالین)

السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اوراس نے قصد کیاان کی طرف اوروہ بھی قصد کرتے اس طرف اگرنہ دیکھتے اپنے پروردگار کی طرف کی دلیل [1] اس لئے کہ ہم ان سے برائی اورہوسنا کی دوررکھیں۔یقیناًوہ ہمارے خالص چنے ہوئے بندوں میں سے تھے''۔

ہم نے جوترجمہ کیا ہے اس میں یوسفؑ کی طرف سے قصد ثابت نہیں ہوتا مگرعلمائے اہل سنت جوعدل باری کی طرح عصمت انبیاء کوبھی صدمہ پہنچانے کے خوگر ہیں،وہ اگرنہ دیکھتے اپنے پروردگار کی دلیل کے فقرہ کوالگ کرکے پہلے جملہ کاترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ:

ہر آئینہ قصد کرد آن زن بسوئ یوسف عَلَیْہِ السَّلَام و قصد کرد بسوی وے یوسف عَلَیْہِ السَّلَام (شاہ ولی اللہ)

اوردوسرے فقرہ کوالگ کردیتے ہیں کہ:

''اگر نہ آں بودے کہ دیدے یوسف دلیل پروردگار خود رامی شد آنچہ می شد''اگرایسانہ ہوتا کہ دیکھتے یوسفؑ اپنے پروردگار کی دلیل توجوہوناتھا ہوجاتا۔

اس کانتیجہ یہ ہے کہ''اگر''والی شرف کی جزاءمحذوف ہےیعنی جس بات کاقصد کیاتھاوہ وقوع میں آجاتی۔

دلیل پروردگار کیاتھی؟اس کے لئے فرماتے ہیں:

''صورت یعقوب حاضر شد انگشت بدندان گرفتہ''

یعقوبؑ کی صورت نظرآئی۔اس طرح کہ انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے ہیں۔

شاہ رفیع الدین ترجمہ کرتے ہیں:

''قصد کیااس عورت نے ساتھ یوسفؑ کےاورقصد کیایوسفؑ نے ساتھ اس کے''۔

جلالین صاحبان بھی پہلے فقرہ کوالگ کردیتے ہیں اورلولاان رابرھان ربہ کے بعد کہتے ہیں:

جواب''لولا''لجامعھا:لولا''اگرایساہوتا''کاجواب یہ ہے کہ وہ اس سے مقاربت کرلیتے''

شاہ ولی اللہ نے فقط جناب یعقوبؑ کی صورت یوسفؑ کودکھائی تھی اورانہوں نے اس حکایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ:

فضرب صدرہ فخرجت شھوتہ من انا ملہ:۔یعقوبؑ نے ان کے سینہ پر ہاتھ ماراتوان کی خواہش ان کے ہاتھ کی انگلیوں کے راستے سے باہر نکل گئی۔

یہ ہے''ماروگھٹنا پھوٹے آنکھ''کامصداق۔

یہ سب باتیں علمائے حق کے نزدیک غلط ہیں [2] بلکہ اللہ کی طرف کی دلیل دیکھنے سے مقصودوہ بصیرت ہے [3] جواس فعل شنیع کے ارتکاب سے انہیں سدراہ ہو۔

---

[1]۔اما تقدم جواب لولا فجائز مستعمل (تبیان)

[2]۔ھذا الذی ذکروہ کلّہ غیر صحیح (تبیان)

[3]۔یجوز ان یکون الرویۃ بمعنی العلم (تبیان)

اس بصیرت کا مظاہرہ عین اس وقت جو ہوا وہ ہمارے یہاں اس طرح وارد ہوا ہے کہ زلیخا نے اس وقت جب وہ اپنے منصوبہ کو پورا کرنے پر تل گئی تھی، اس بت پر جس کی وہ پرستش کرتی تھی پردہ ڈال دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا یہ تم نے کیا کیا؟ کہا مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنے معبود کے سامنے اس فعل کا ارتکاب کروں۔ جناب یوسف علیہ السلام نے کہا تم اپنے اس معبود سے شرم کرتی ہو جو نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے نہ کانوں سے سنتا ہے اور میں اپنے اس معبود سے شرم نہ کروں جو حاضر و ناظر ہے۔ بس یہ کہہ کر وہ دروازہ کی طرف دوڑے کہ گھر سے باہر نکل جائیں [1] جس کے بعد کا حال قرآن مجید میں درج ہے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ
مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ
رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ
فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ
عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ
الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾ ع

”اور وہ دونوں ایک دوسرے سے پہلے دروازہ کی طرف پہنچنے کے لئے دوڑے اور اس نے ان کے کرتے کو پیچھے سے لمبان میں پھاڑ دیا [2] اور ان دونوں نے اس کے شوہر کو دروازہ پر پایا۔ وہ کہنے لگی نہیں ہے سزا اس کی جو آپ کے ناموس کے ساتھ بدی کرنا چاہے سوا اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا اور کوئی دردناک سزا۔ انہوں نے کہا کہ اس نے مجھ پر ڈول ڈالے اور اس کے گھرانے والوں میں سے [3] ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر ان کا کرتا آگے سے پھٹا ہو تو یہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہیں اور اگر ان کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو یہ جھوٹ بول رہی ہے اور وہ سچوں میں سے ہیں تو جب اس نے دیکھا ان کے کرتے کو پیچھے سے پھٹا ہوا تو کہنے لگا کہ یقیناً یہ تم عورتوں کی چال ہے یقیناً تمہاری چال بہت سخت ہوتی ہے اے یوسف! اس سے درگزر کرو اور تو اپنے جرم سے توبہ کر، یقیناً تو خطا کاروں میں سے ہے“۔

---

[1] ۔ حدثنی ابی عن بعض رجالہ دفعہ قال قال ابو عبداللہ علیہ السلام (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ القدّ شیق الشئی طولا (تبیان)

[3] ۔ گواھی از قبیلہ زن (شاہ ولی اللہ)

چاک دامانی دلیل پاک دامانی

گواہ جس نے گواہی دی کیسا تھا؟ اس کا بیان قرآن مجید میں نہیں ہے روایات میں ہے کہ وہ دودھ پیتا ہوا ایک بچہ تھا جو گہوارہ میں لیٹا ہوا تھا یہ فریقین کی کتب میں موجود ہے [1] مگر دوسرا قول اس کے خلاف یہ ہے کہ وہ اس کے گھرانے کا کوئی غیر معمولی دانش مند قسم کا آدمی تھا اور اس کا شاہد یہ ہے کہ اگر وہ گہوارہ کا بچہ ہوتا تو اس کا بول دینا خارق عادت ہونے کی بنا پر خود حقیقت کے اظہار کے لئے کافی تھا اس کے لئے براہ راست یہ کہہ دینا کافی تھا کہ زلیخا غلط کہہ رہی ہے اور یوسفؑ بے گناہ ہیں مگر یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ عقلی قرینہ پیش کیا جاتا ہے جو دونوں میں سے ایک کے قول کو درست ثابت کرتا ہے اس کی ضرورت دودھ پیتے ہوئے بچہ کے لئے کوئی نہ تھی۔ [2]

''اے یوسف! اس سے درگزر کرو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کا کوئی چرچا نہ کرنا تاکہ بات گھر کی گھر ہی میں رہے اور عام رسوائی نہ ہو۔ [3]

وَقَالَ نِسۡوَةٌ فِي الۡمَدِيۡنَةِ امۡرَاَتُ الۡعَزِيۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰٮهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ ۚ قَدۡ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰٮهَا فِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَكۡرِهِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَيۡهِنَّ وَاَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّكَـاً وَّاٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِكِّيۡنًا وَّقَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَيۡهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ ۫ وَقُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ ﴿۳۱﴾

''اور کہا اس شہر کی کچھ عورتوں نے کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے نوجوان پر ڈول ڈال رہی ہے، اس کی محبت نے اس کے دل کی گہرائیوں میں اثر کیا ہے [4] ہم اس کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں تو جب اس نے سنا ان کی ترکیب کو تو انہیں بلوا بھیجا اور ان سب کے لئے ایک ایک مسند بچھوادی اور ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری دے دی اور کہا نکلو ان کے سامنے تو جب ان سب نے انہیں دیکھا تو بہت بڑھا ہوا پایا انہیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہنے لگیں سبحان اللہ یہ آدمی نہیں ہے یہ تو نہیں ہے مگر کوئی بزرگ فرشتہ''۔

عورتوں نے آپس میں جو چرچا کیا تھا، اس کے لئے قرآن کے یہ لفظ کہ **فلما سمعت بمکرھن** جب اس نے ان کی ترکیب سنی بتلاتا ہے کہ ان کی زلیخا پر نکتہ چینیاں واقعی اس کے فعل کو ناپسند کرنے کی بنا پر نہ تھیں بلکہ اس طرح ان کا مقصد یہی تھا کہ زلیخا انہیں بھی حسن و جمال یوسفؑ

---

[1] قال لهم الله يوسف ان قال للملك سل هذا الصبى فى المهد فانطلق الله الصبى فى المهد ليوسف (على بن ابراهيم)

[2] ابن عمها روى انه كان فى المهد (جلالين) اس عورت کا رشتہ دار ایک لڑکا دودھ پیتا ہوا بول اٹھا (موضح القرآن)

[3] لا تذكره لئلا يشيع (جلالين)

[4] بلغ الحب شغاف قلبها وهو داخله (تبيان)

کا نظارہ کرا دے [1] جیسا کہ بعد میں ہوا جس کے بعد وہ گویا قائل ہوئیں کہ زلیخا ان پر وارفتگی میں مجبور و معذور ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ ۳۲

''اس نے کہا تو یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم لوگ مجھے ملامت کرتے تھے اور بے شک میں نے اس پر ڈول ڈالے تو اس نے اپنے کو بچائے رکھا اور اگر نہ کیا اس نے وہ جس کا میں اسے حکم دیتی ہوں تو وہ ضرور قید کر دیا جائے گا اور ضرور وہ ذلیل ہوگا''۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:

ان کے روبرو یہ بات کہی تا کہ وہ بھی سمجھا دیں اور حضرت یوسف علیہ السلام ڈر کر قبول کریں (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے: فقلن له اطع مولا تك مطلب یہ ہے کہ اب ان سب کو زلیخا سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور جناب یوسف علیہ السلام سے کہا اپنی مالکہ کا کہنا مانو۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ ۳۳ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ ۳۴

''وہ کہنے لگے اے میرے پروردگار! قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے جس کی طرف یہ سب مجھے تحریک کرتی ہیں اور اگر تو دور نہ کرے مجھ سے ان کی چال کو تو میں بھی جھک جاؤں ان کی طرف اور جاہلوں میں سے ہوں، تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی تو ان سے ان کی چال کو ناکام بنا کر ہٹا دیا، یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

ان کی چال کو دور کرنے کا مطلب ہے اس سے ان کا اثر پذیر نہ ہونے دینا اور جوان عورتوں کا اپنی چال سے مقصد تھا اس میں ناکام رہنا۔ [2]

یہاں یدعوننی کا لفظ جمع مونث حاضر کا صیغہ ہے اور اس لئے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''یہ سب مجھے تحریک کر رہی ہیں'' یہ یا تو اس وجہ سے ہے جیسا کہ قبل کی آیت کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ ان سب کو زلیخا سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور کہنے لگیں کہ اس کا کہنا مان لو جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے اور یا جیسا کہ ہماری قدیم تفسیر میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد اب جناب یوسف پر ان تمام عورتوں کے مطالبات کی یورش ہوگئی اور ہر ایک کا پیغام

---

[1] المکر االفتل بالحیلة الی مایراہ من الطلبة (تبیان)

[2] معناہ ضرر کیدھنّ لانّ کیدھنّ قدوقع. (تبیان)

جناب یوسف علیہ السلام کے پاس آیا کہ وہ ان سے تعلقات کی خواہش مند ہیں اس سے کبیدہ خاطر ہو کر جناب یوسف علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔[1]

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٣٥﴾

پھر قدرت کی نشانیاں[2] دیکھنے کے باوجود بعد میں ان کی رائے یہ ہوگئی کہ وہ انہیں ایک مدت تک لازمی طور پر قید رکھیں گے۔

جناب یوسفؑ قید خانہ میں

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

اگر چہ نشان سب دیکھ چکے کہ گناہ عورت کا ہے تو بھی ان کو قید کیا تا کہ بدنامی خلق میں عورت سے اترے یا اس واسطے کہ اس کی نظر سے دور رہیں''۔(موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

ينقطع فيه كلام للناس

یعنی اس لئے قید کیا تا کہ لوگوں میں جو چرچے رہتے ہیں، وہ کسی طرح ختم ہوں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٦﴾

''اور ان کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں انگور کا رس نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتایئے۔ ہم آپ کو نیک اعمال آدمیوں میں سے دیکھتے ہیں''۔

قرآن مجید میں اکثر درمیانی کڑیاں سننے والے کی عقل کے حوالے کر کے بنظر اختصار ترک کر دی جاتی ہیں چنانچہ اس ذکر کے بعد ''ان کی رائے یہ ہوگئی کہ وہ انہیں ایک مدت تک قید رکھیں گے''۔ درمیان کی لازمی کڑی یہ ہے کہ چنانچہ انہوں نے ان کو قید کر دیا[3] اب اس کے بعد کا ذکر یہ ہے کہ ان کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے۔

ہم نے المحسنین کے لفظ کا ''حسن عمل'' سے لے کر ''نیک اعمال'' تک کا ترجمہ کر دیا ہے مگر ایک معنی اس کے یہ کئے گئے ہیں کہ ہم

---

[1] فما امسٰى يوسف فى ذلك اليوم حتى بعث اليه كلّ امأة راته تدعوه الى نفسها فضجر يوسف فقال (على بن ابراهيم)

[2] فالآيات شهامة الصبى و القميص المنخرق من دبر استباقهما الباب حتى سمع مجاذبتها اياه على الباب. (على بن ابراهيم)

[3] فى الآية تقدير فسجن يوسف (تبيان)

سمجھتے ہیں کہ آپ تعبیر خواب کے فن کے ماہر ہیں۔ [1]

مگر میں سمجھتا ہوں کہ انہیں اس مہارت کا اندازہ بغیر تجربہ سابق کے ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ہاں نیکوکاری مشاہدہ سے متعلق ہے اور خواب نیک آدمیوں سے عموماً بیان ہی کیا جاتا ہے اس لئے میں اسی ترجمہ کو درست سمجھتا ہوں۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

انہوں نے کہا تم دونوں تک کوئی کھانا نہیں آئے گا جو تمہیں عطا کیا جائے مگر یہ کہ میں تم کو اس کا انجام بتا سکتا ہوں اس سے پہلے کہ وہ تمہارے پاس آئے۔ یہ اس کا ایک جزء ہے جو اللہ نے مجھے علم عطا کیا ہے میں نے چھوڑا ہے ایسے لوگوں کا مذہب کہ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور میں نے پیروی کی ہے اپنے باپ دادا، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی۔ ہمیں یہ زیب نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کریں۔ یہ اللہ کے فضل وکرم سے ہے ہم پر اور تمام لوگوں پر مگر زیادہ تر لوگ شکر ادا نہیں کرتے"۔

شروع میں جو ہے کہ کوئی کھانا نہیں آئے گا تمہارے سامنے جو تمہیں عطا کیا گیا ہو، اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ تم خواب ایسا دیکھو تو میں اس کی تعبیر بتا سکتا ہوں۔ [2]

یہ غالباً اس خیال سے ہے کہ سابق کے مضمون سے مناسبت پیدا ہو مگر یہ اس تصور پر مبنی ہے کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ آپ کو ہم محسنین میں دیکھتے ہیں اس کا مطلب یہ تھا کہ تعبیر خواب کا ماہر جانتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے اس خیال کی تصدیق بلکہ مزید تقویت کی کہ ہاں یہ علم مجھے اللہ کی طرف سے خاص طور پر عطا کیا گیا ہے مگر جب کہ ہم نے کہا کہ **محسنین** کا لفظ بظاہر حسن عمل سے ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد کیا وہ ان کے خیال میں مزید اضافہ ہے کہ تم نے صرف حسن عمل محسوس کیا ہے اس کے علاوہ یہ چیز ہے کہ اس نے مجھے خاص علوم عطا کئے ہیں، اس صورت میں اسے خواب سے متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہاں اس کے بعد جو الفاظ ہیں کہ میں اس کی تاویل تمہیں بتاؤں گا قبل اس کے کہ وہ سامنے آئے، اس سے یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ پہلے جو رزق سامنے آنے کا ذکر تھا، اس سے مراد خواب ہے مگر یہ تصور اس وقت صحیح ہوتا جب پہلے ماضی کا صیغہ ہوتا کہ ما اتٰکما جو تمہارے پاس آیا رزق، جو تمہیں دیا گیا ہو، پھر یہ جملہ کہ اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں اسکا انجام بتا دوں گا،

---

[1] ۔ ممّن یعرف تاویل الرؤیا من ذلک قول علی علیہ السلام کل امرئ ما یحسنہ ای ما یعرفہ (تبیان)

[2] ۔ فی منامکما (جلالین) یعنی در خواب (شاہ ولی اللہ)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے جو رزق دیا گیا تھا، وہ خواب میں تھا اور اس کے انجام بتانے کا مطلب اس کی تعبیر کا بتانا ہے مگر یہاں یا تیکما مضارع ہے تو یہ معنی کیوں نہ لئے جائیں کہ کہ اللہ نے مجھے مایکون یعنی آئندہ ہونے والی باتوں کا علم بھی عطا کیا ہے جو تمہیں رزق ملنے والا ہے اس کے ملنے سے پہلے اس کے انجام کی تمہیں خبر دے سکتا ہوں۔

اس سے مقصود معاذ اللہ خودستائی نہیں ہے بلکہ آئندہ جو موعظہ ونصیحت فرمائیں گے اس کے اثر کو بڑھانا ہے اور چونکہ ان کے حسن عمل کا ان کے دل پر اثر ہو چکا تھا، اس لئے ان کا آپ کی بات کو سچ سمجھنا لازمی تھا۔

اب جب کہ پہلے ہی ان کی زبان سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ آپ کے حسن کردار سے متاثر تھے اور اب آپ نے جو اپنے علم وہبی کا تذکرہ فرمایا، اس سے یقیناً وہ مزید متاثر ہو چکے ہیں اور ان کی ایک غرض بھی آپ سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے خواب کی تعبیر آپ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس پس منظر سے فائدہ اٹھا کر آپ نے چاہا کہ تعبیر خواب سے پہلے تبلیغ حق کے فریضہ کو جو بحیثیت ایک داعی حق کے آپ کے ذمہ تھا ادا کریں اور انہیں شرک کی رکاکت سمجھاتے ہوئے توحید کی دعوت دیں۔ کیونکہ وہ یوں اس طرح کی تبلیغ کرنے لگتے تو وہ شاید سننے کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے مگر اب تعبیر خواب کے اشتیاق میں انہیں وہ سب سننا پڑے گا۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام تعبیر بتانے سے پہلے ان کو سنائیں گے اور اس لئے اس تبلیغ کی بات شروع کرنے سے پہلے ابتدائی الفاظ میں انہیں یہ اطمینان دلا دیا کہ میں تمہارے خوابوں کی صحیح تعبیر اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بتا سکتا ہوں۔ یہ کہہ دینے کے بعد ان کی بعد کی گفتگو چاہے کتنی ہی طولانی ہو مگر انہیں یہ تصور ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہ ان باتوں میں الجھا کر ہمارے اصل سوال کو ٹال رہے ہیں اور جو ہمارا اصل مقصد ہے یعنی ہمارے خواب کی تعبیر، وہ ہمیں نہیں بتائیں گے۔

مذکورہ بالا صورت حال میں یہ تصور نہایت کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں جناب یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر بتانا نہیں چاہتے تھے اور بعد میں وہ آپ کے پیچھے ہی پڑ گئے تو مجبوراً بتا دی۔ [1]

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٠﴾

"اے دونوں قید خانہ والو! کیا متفرق خدا اچھے ہیں یا ایک اکیلا اللہ جو سب پر غالب ہے، تم لوگ نہیں پوجا کرتے اسے چھوڑ کر مگر ایسے ناموں کی جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے تجویز کئے ہیں اللہ نے اس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں اتاری ہے، نہیں ہے حکومت کا مالک مگر اللہ اس کا حکم ہے کہ نہ عبادت کرو سوا اس کے کسی کی۔ یہی سیدھا دین ہے مگر زیادہ تر لوگ علم نہیں رکھتے"۔

پہلے تو اپنے تعارف کے ذیل میں سچے دین کی ترجمانی کی تھی، اب صاف صاف ان کی ضمیر کو دعوت فکر و تامل دے رہے ہیں تا کہ وہ حق و

[1] ۔قال ابن جریج انہ کرہ ان یخبرھما بالتاویل۔۔فلم یترکاہ حتیٰ اخبرھما (تبیان)

باطل میں موازنہ کرکے اپنے غلط راستے کی غلطی محسوس کریں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱

”اے دونوں قید خانہ والو، تم دونوں میں سے ایک جو ہے تو وہ اپنے مالک کو شراب پلانے والا ہوگا اور دوسرا جو ہے اسے سولی دی جائے گی تو چڑیاں اس کے سر میں سے کھائیں گی، طے پا چکی ہے یہ بات جس کے بارے میں تم دونوں دریافت کرتے ہو“۔

آخر کا جو فقرہ ہے ”طے پا چکی ہے یہ بات“ اس کے لئے الفاظ میں بظاہر کوئی تشنگی معلوم نہیں ہوتی ہے کہ اس کے کہنے کا کوئی خاص سبب ہونا چاہیے بلکہ یہ اسی تعبیر کا تتمہ ہوسکتا ہے کہ جو میں نے تعبیر بتائی ہے یہ خالق کی مشیت میں گزری ہوئی ہے اور وہ ہوکر رہے گی مگر بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تعبیر بتانے کے بعد ان دونوں نے کہا کہ حقیقۃً ہم نے خواب دیکھے ہی نہ تھے فقط تمہارا امتحان منظور تھا[1] یا یہ کہ اس نے کہا جو تعبیر ناخوش گوار دی گئی تھی[2] اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا اب چاہے خواب دیکھے ہوں یا نہ دیکھے ہوں بہر حال جو تعبیر میں نے دی ہے وہ ظہور میں آ کر رہے گی مگر مجھے یہ خیال کچھ زیادہ دل کو لگتا ہوا محسوس نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر انہوں نے شرارتاً یہ خواب بیان کئے ہوتے اور ان کے دل پر جناب یوسف علیہ السلام کے حسن سیرت و کردار کا واقعہ کوئی اثر نہ ہوتا تو وہ اس صبر و سکون کے ساتھ آپ کے اس طولانی تبلیغ موعظہ کو اتنی دیر تک سن نہیں سکتے تھے بلکہ پہلے ہی مذاق اڑاتے ہوئے چلے جاتے۔

میں تو جناب یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف سمجھتا ہوں یہ تصور کہ آپ ان کے مسخرے پن کو نہ سمجھے اور ان سے سنجیدگی کے ساتھ اتنی طویل تقریر کر ڈالی۔

ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ خواب تو واقعی دونوں نے دیکھے تھے اور دونوں سنجیدگی کے ساتھ اس کی تعبیر کے طالب ہوئے تھے مگر جب ایک کو تعبیر بہت ہی ناخوش گوار ملی تو اپنی ناقص بشریت سے اب اس کو غصہ آیا اور ایک طرف اس غصہ کی بنا پر جناب یوسف علیہ السلام کے تپانے کو اور دوسری طرف اپنے ساتھی سے اپنی خفت کے مٹانے کے لئے اس نے یہ کہہ دیا کہ میں خواب واب کچھ دیکھا ہی نہ تھا بہر حال دونوں کے یہ کہنے کی ہم نے خواب نہیں دیکھا تھا یونہی کہہ دیا تھا کوئی وجہ وجیہ نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پہلو سے جو بھی میں لکھ دیا ہے کہ ایک نے غصہ وغیرہ سے یہ کہہ دیا ہوگا میں مطمئن نہیں ہوں اس لئے کہ یہ جملہ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿یوسف: ۴۱﴾ پہلے کلام کا بلا فاصلہ جزء ہے کوئی الگ آیت نہیں ہے جس سے ہمیں یہ سمجھنے کی گنجائش ہو کہ بیچ میں ان میں سے ایک نے یہ کہا میں نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا اور اس پر جناب یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ کہا لہٰذا میں تو اسے پہلے بیان کا تتمہ ہی سمجھتا ہوں۔ کسی بات کا الگ سے جواب نہیں سمجھتا۔

---

[1]۔ قالا ما رأینا شیئاً فقال قضی الامر الذی فیہ تستفتیان صدقتما ام کذبتما (جلالین)

[2]۔ روی ان صاحب الصلب قال ما رایت شیئا (تبیان)

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور کہا انہوں نے اس سے جس کے متعلق وہ سمجھے تھے کہ وہ نجات پانے والا ہے کہ میرا تذکرہ کردینا اپنے مالک سے یہاں تو شیطان نے اسے اپنے مالک والا تذکرہ بھلا دیا تو وہ قید خانہ میں رہے کئی سال۔

ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اس کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ نجات پانے والا ہے، اس میں ظن کا لفظ جو ہے اس کے عام معنی تو گمان کے ہوتے ہیں اور اس لئے شاہ عبدالقادر نے لکھ دیا ہے۔

اس کو اٹکلا کہ بچے گا۔ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب یقین نہیں، اٹکل ہے مگر پیغمبر اٹکل کرے، سو بے شک ہے (موضح القرآن)

مگر حقیقت یہ ہے کہ ظن کبھی یقین کے معنی میں آتا ہے یہاں ایسا ہی ہے کیوں کہ اس سے پہلے آچکا ہے کہ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿یوسف: ۴۱﴾ طے شدہ ہے یہ بات جس کے بارے میں تمہارا سوال ہے، تو اگر جناب یوسف علیہ السلام نے جو کچھ کہا تھا وہ گمان یا اٹکل کی حد میں ہوتا تو اس حتم وجزم کے ساتھ اس کا اظہار کیوں کرتے کہ یہ تو اب ہو کے رہے گا، ٹل نہیں سکتا۔ یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ فقط گمان نہیں بلکہ علم ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں بھی ہے۔ ظن ایقن (یعنی) "ظن کیا کے معنی ہیں یقین کیا"۔

اسے اپنے رب کا ذکر شیطان نے بلا دیا تو وہ قید خانہ میں رہے کئی سال۔ یہاں قبل کا سیاق ذہن میں اسی تصور کو لاتا ہے کہ یہ ضمیر اس قیدی کی طرف ہے جس نے نجات پائی۔ اس صورت میں بعض لوگوں نے اس دوسرے لفظ رب سے مراد لیا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو، شاید اس بنا پر کہ اُن کا احسان اس پر یہ تھا کہ انہوں نے اس کو نجات کا مژدہ دیا تو ایک طرح اس کے ولی نعمت ہوئے، اس لحاظ سے انہیں اس کا رب یعنی سرپرست کہا گیا ہے۔[1]

مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے دوسری تفسیر یہ ہے جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ ذِكْرَ رَبِّهٖ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے مالک کے یہاں ذکر کرنا یوسف علیہ السلام کا جس کی خواہش حضرت یوسف علیہ السلام نے کی تھی وہ بھول گیا۔[2]

بادشاہ مصر کا خواب اور یوسفؑ کی رہائی کا سامان

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

"اور بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھی ہیں سات گائیں موٹی جنہیں کھا رہی ہیں سات دبلی گائیں اور سات

[1] قال ابن اسحاق والحسن والجبائی یعود علی الساقی وتقدیرہ فانسی الساقی الشیطان ذکر یوسف علیہ السلام (تبیان)

[2] ذکر یوسف عند ربہ (جلالین) یاد کند پیش مولای خود (شاہ ولی اللہ) یا دکرنا خداوند اپنے کے پاس (رفیع الدین)

بالیاں ہری اور دوسری خشک، اے معزز لوگو! مجھے میرے خواب کے بارے میں بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر دیا کرتے ہو، ان لوگوں نے کہا کہ یہ خوابہائے پریشان ہیں اور ہم خوابہائے پریشان کی تعبیر نہیں جانتے"۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾
یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ
سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾
قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا
تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا
مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیْهِ
یَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

"اور اس نے کہا کہ جوان دونوں میں نجات پا گیا تھا اور ایک مدت کے بعد اب اسے یاد آیا تھا، کہا کہ میں تم لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا تو مجھے روانہ کرو۔ یوسف! اے بڑے سچے ہمیں تعبیر بتایئے سات موٹی گائیوں کی جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیوں اور دوسرے خشک کی۔ شاید میں ان لوگوں کے پاس جاؤں تو شاید انہیں علم ہو انہوں نے کہا کہ تم لوگ کھیتی کرو سات برس متواتر [۱] تو جو کھیتی کاٹو اسے رہنے دو اس کی بالیوں میں سوا تھوڑی سی مقدار کے جسے کھاؤ۔ پھر اس کے بعد سات برس آئیں گے سخت جو کھا جائیں گے اس سب کو جو تم نے ان کے ذخیرہ کیا تھا۔ سوا بہت کم کے اس میں سے جسے تم محفوظ رکھتے ہو، پھر اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے بارش ہوگی اور اس میں وہ پھلوں کا عرق نچوڑیں گے۔

بیچ کا جملہ کہ "ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں تو شاید انہیں علم ہو" کا ہے کا علم؟ خواب کی تعبیر کا یا آپ کے مرتبہ کا؟ یہ دونوں ہی احتمال ہیں [۲] ان میں سے بعض نے پہلے کو [۳] اور بعض نے دوسرے کو [۴] اختیار کیا۔ ہمارے نزدیک تیسرا احتمال بھی ہے اور غور کیا جائے "تو شاید وہ جانیں" میں شاید کا لفظ پہلے احتمال کے ساتھ سازگار نہیں ہے اس لئے کہ جب یہ تعبیر بتا دیں گے اور وہ جا کر انہیں اس تعبیر سے مطلع کرے گا تو تعبیر تو انہیں معلوم ہو ہی جائے گی۔ شاید کہنے کا کیا موقع ہے۔

---

[۱] ۔ الداب استمرار الشیء علی عادة (تبیان) دأبا متتابعة (جلالین)

[۲] ۔ یحتمل امرین احدهما لعلّهم یعلمون بمكانك و منزلك الثانی لعلّهم یعلمون تاویل الرؤیا (تبیان)

[۳] ۔ لعلّهم یعلمون تعبیرها (جلالین)

[۴] ۔ یعنی تیری قدر معلوم ہو (موضح القرآن)

ہاں! ایک اور احتمال یہ ہے کہ یہ مطلب ہو کہ شاید ان کی سمجھ میں آئے کہ یہی تعبیر حق ہے اور یہی صورتحال پیش آنے والی ہے۔

وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِىۡ بِهٖ‌ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوۡلُ قَالَ ارۡجِعۡ اِلٰى رَبِّكَ فَسۡـَٔلۡهُ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِىۡ قَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ‌ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ بِكَيۡدِهِنَّ عَلِيۡمٌ ﴿۵۰﴾

اور بادشاہ نے کہا کہ لاؤ انہیں میرے پاس تو جب ان کے پاس قاصد آیا تو انہوں نے کہا واپس جاؤ اپنے مالک کے پاس اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا واقعہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے یقیناً میرا پروردگار ان کی چال کو خوب جاننے والا ہے۔

بادشاہ سے پوچھو۔ بادشاہ کو کیا معلوم؟ مطلب یہ ہے کہ تم انہیں اس واقعہ کی طرف توجہ دلاؤ تو وہ خود پھر اس کے متعلق تحقیق کریں گے جس سے میری بے گناہی نمایاں ہوگی۔[1]

قَالَ مَا خَطۡبُكُنَّ اِذۡ رَاوَدْتُّنَّ يُوۡسُفَ عَنۡ نَّفۡسِهٖ‌ ؕ قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمۡنَا عَلَيۡهِ مِنۡ سُوۡٓءٍ‌ ؕ قَالَتِ امۡرَاَتُ الۡعَزِيۡزِ الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَـقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۵۱﴾

اس نے کہا کہ کیا واقعہ تھا تمہارا جب تم نے یوسف پر ڈول ڈالے تھے؟ ان عورتوں نے کہا کہ پاک ہے اللہ۔ ہمیں ان کی کوئی برائی ثابت نہیں ہوئی۔ عزیز مصر کی بیوی نے کہا کہ اب حق تو نمایاں ہو ہی گیا۔ میں نے ان پر ڈول ڈالے تھے اور وہ بلاشبہ سچے لوگوں میں سے ہیں۔

اس آدمی نے جا کر بادشاہ سے کہا کہ وہ یہ کہتی ہیں تو بادشاہ نے تحقیق کرنا شروع کیا اور ان عورتوں کو طلب کر کے ان سے واقعہ پوچھا۔[2]

ذٰلِكَ لِيَـعۡلَمَ اَنِّىۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ كَيۡدَ الۡخَـآئِنِيۡنَ ﴿۵۲﴾

"یہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہو کہ میں نے پیٹھ پیچھے ان کے ساتھ غداری نہیں کی اور یقیناً اللہ غداری کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا۔

اگر کوئی ثبوت قوی اس کے خلاف نہ ہو تو سیاق تو یہی بتلاتا ہے کہ یہ زلیخا کے کلام کا تتمہ ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس وقت یہ اقرار جو کیا ہے، وہ اس لئے ہے کہ یوسفؑ کو معلوم ہو کہ پیٹھ پیچھے ان کے بارے میں میں نے حق گوئی سے کام لیا ہے، پھر اس کے بعد کی آیت جو آئندہ پارہ کی پہلی آیت ہوگی وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ وہ بھی زلیخا کا کلام ہوگا۔ ہماری قدیم تفسیر جو زیادہ تر اقوال معصومینؑ پر مبنی ہے، اس کے

[1] فسئله ان يسأل (جلالين)

[2] حين رجع الرّسول الى الملك برسالة يوسف جمع النساء و قال لهنّ ما خطبكنّ اذ راودتنّ يوسف عن نفسه (تبيان)

مطابق ہے۔[1]

مگر چونکہ زلیخا کا خدا پرست اور موّحد ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے ان آیات کے مضمون سے مفسرین نے ایسا محسوس کیا ہے اور یہی تشریح کی ہے کہ یہ جناب یوسف علیہ السلام کا کلام ہے۔[2]

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو میں نے اس واقعہ کی تحقیق کرائی ہے اس لئے ہے کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے ناموس کے ساتھ اس کے پیٹھ پیچھے کوئی خیانت نہیں کی۔

ہمارے علماء میں سے بھی جناب شیخ الطائفہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔[3]

مگر مجھے اس میں کافی تردد کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اول تو یہ ہے کہ یہاں تحقیق بادشاہ سے کرائی گئی اور خیانت جس کا تصور ہو سکتا تھا اس کا تعلق بادشاہ کے ساتھ نہیں بلکہ عزیز مصر کے ساتھ تھا دوسرے یہ کہ عزیز کو تو اسی وقت پتہ چل گیا تھا کہ یوسفؑ بے گناہ ہیں اور خطا زلیخا ہی کی ہے مگر یہ جانتے ہوئے اس نے سیاسی مصلحت کی بنا پر یوسفؑ کو قید کر دیا تھا پھر اس تحقیق و تفتیش سے عزیز مصر کو معلوم کرانا تحصیل حاصل ہی ہوگا۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝53

"اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں۔ بلاشبہ نفس برائی پر آمادہ کیا ہی کرتا ہے مگر یہ کہ میرے پروردگار کا رحم و کرم شامل حال ہو۔ یقیناً میرا پروردگار بخشنے والا ہے، بڑا مہربان"۔

اگر گزشتہ آیات جناب یوسف علیہ السلام کی زبان کی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے تو یہ بھی اسی کا تتمہ ہے یعنی یہ کہنے کے بعد کہ یہ تحقیقات میں نے اس لئے کرائی ہیں کہ میں بے گناہ ہوں جیسے فوراً یہ خیال ہوا کہ کہیں اس میں غرور کا پہلو تو پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہا[4] کہ گناہ سے بچنا کوئی میرے نفس کا کارنامہ نہیں، نفس تو برائی پر آمادہ کرتا ہے مگر یہ میرے خالق کا رحم و کرم ہے جو گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝54 قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝55

"اور بادشاہ نے کہا کہ انہیں میرے پاس لاؤ کہ میں انہیں اپنا خاص مقرب بناؤں تو جب اس نے ان سے بات

---

[1] ای لا اکذب علیہ الاٰن کما کذبت علیہ من قبل ثمّ قالت: وما ابرئ نفسی الخ (علی بن ابراھیم)

[2] فاخبر یوسف بذٰلك فقال ذٰلك ای طلب البراءۃ لیعلم العزیز (جلالین) گفت یوسف این ھمہ برای آنست تا بداند عزیز (شاہ ولی اللہ) یہ تحقیقات اس واسطے ہے کہ جانے عزیز یعنی خاوند اس کا (رفیع الدین)

[3] اختلفوا فی من ھذا الکلام حکایۃ عنہ فقال اکثر المفسّرین انّہ حسن یوسف---- و قال الجبائی و البلخی انّہ من قول المرأۃ و کلا الامرین جائزان و الاوّل اشبہ (تبیان)

[4] اخبار عما قال یوسف علی وجہ التواضع للہ (تبیان)

چیت کی تو کہا کہ تم یقیناً اب ہمارے یہاں صاحب اقتدار، بھروسے کے آدمی ہو[1] انہوں نے کہا کہ مجھے اس سرزمین کے خزانوں پر مقرر کردیجئے، یقیناً میں حفاظت کرنے والا ہوں خوب جاننے والا"۔
حفاظت کرنے والا بے محل صرف ہونے سے اور خوب جاننے والا صحیح استعمال کا مواقع کا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۗ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝٥٦ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝٥٧

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو اس سرزمین پر اقتدار کا مالک بنایا کہ وہ اس میں جہاں چاہیں قیام کریں[2] ہم اپنی رحمت کو پہونچاتے ہیں جس تک چاہتے ہیں یقیناً ہم نہیں برباد کرتے صلہ نیک اعمال والوں کا اور بلاشبہ آخرت کا ثواب بہتر ہے ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہوں اور پرہیزگاری سے کام لیتے ہوں"۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝٥٨ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝٥٩ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ۝٦٠ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ۝٦١

"اور یوسفؑ کے بھائی ان کے پاس داخل ہوئے تو وہ ان لوگوں کو پہچان گئے اور وہ سب ان کو نہیں پہچان رہے تھے اور جب ان کا سامان سفر ان کی روانگی کے لئے تیار کیا تو کہا تم لوگ اب کی بار اپنے اس ایک علاتی بھائی کو بھی لیتے آنا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ناپ کردیتا ہوں اور بہترین طریقے پر میزبانی بھی کرتا ہوں، اب اگر تم اسے نہ لائے تو تمہارے لئے میرے پاس تولنے کے لئے غلہ نہ ہوگا اور تم میرے نزدیک نہ آنا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم اس کے باپ پر اس کے بھیجنے کے لئے ڈول ڈالیں گے اور یقیناً ہم ایسا کریں گے"۔

بھائیوں کی پہلی دفعہ حاضری اور جناب یوسف علیہ السلام کی فرمائش

ان کا نہ پہچاننا عام نظام اسباب کے ماتحت بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت جب ان سے جدا ہوئے تھے تو حضرت یوسف علیہ السلام بچہ تھے اور اب آپ کمال عمر کی منزل میں تھے اور پھر شاہانہ لباس میں تھے اور انہیں یہ سان گمان بالکل نہ تھا کہ جسے انہوں نے کنویں میں ڈالا تھا وہ مصر کی کرسی

[1] یقال لفلان مکانته عند الملك وهو مكين عنده واصله التمكن من الامر (تبيان)
[2] ينزل منها حيث يشاء بعد الضيق و الحبس (جلالين)

اقتدار پر ہوگا اس لئے وہ اس نظر سے دیکھ بھی نہیں رہے تھے جو اقتدار زمانہ کے بعد کسی ایسے گم گشتہ کے پہچاننے کا باعث ہوسکتی ہے اور لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ قدرت کی طرف کا کوئی خاص انتظام ہو چنانچہ اس بارے میں دو قول ہو گئے ہیں [1] بعد کو جناب یوسف علیہ السلام کی گفتگو واقعات کی ایک کڑی پر مبنی ہے جسے قرآن مجید نے بنظر اختصار ترک کر دیا ہے اور وہ عقل سے سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام ان سے اس کے پہلے کہ وہ انہیں رخصت کریں، گفتگو کے ذیل میں ان کے حالات مثلاً یہ کہ ان کے والد بوڑھے ہیں اور وہ سب اس پریشان حالی کے دور کرنے کے لئے ان سے رخصت ہو کر چلے آئے ہیں مگر اپنے ایک بھائی کو ان کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ یہ بھی باتوں باتوں میں صراحت ہوگئی کہ یہ سب ایک ماں سے ہے اور وہ چھوٹا بھائی ایک دوسری ماں سے ہے تو جناب یوسف علیہ السلام نے انہی کی بتلائی ہوئی معلومات کی بنا پر یہ کہا کہ اب کی بار آنا تو اپنے اس سوتیلے بھائی کو بھی لیتے آنا۔[2]

ہماری ایسی قدیم تفسیر میں جو احادیث پر مبنی ہے اس کو بطور واقعہ درج کیا ہے [3] یہ بھی قرین قیاس ہے کہ انہوں نے اس بھائی کے کچھ اوصاف بھی بیان کئے ہوں کہ وہ بڑا سمجھدار ہے اور باپ کا پیارا ہے، اس لیے باپ کو اسکی جدائی گوارا نہیں ہے۔ اور بظاہر ہر اسباب یہ جناب یوسفؑ کے اشتیاق کا باعث ہوسکتا ہے کہ وہ ان کے اس بھائی کو دیکھیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں۔[4]

اگر انہوں نے اپنی گفتگوؤں میں یہ نجی حالات اپنے بتائے نہ ہوتے تو وہ ضرور جناب یوسفؑ کے از خود کہنے پر کہ اپنے سوتیلے بھائی کو بھی لیتے آنا بھڑک اٹھتے کہ آخر اس میں کیا راز ہے؟

بے شک انہوں نے فطری طور پر یہ چیز بیان نہیں کی ہوگی، وہ اپنے اس ظلم کی روئداد جو خود یوسفؑ پر ڈھایا تھا، اسے جناب یوسف علیہ السلام نے بھی اس وقت اپنے دل میں رکھا اور اس کے بعد جب انہیں مقصد ہوا کہ وہ اپنی شخصیت کو نمایاں کریں جس کا ذکر بعد میں آئے گا تو اس وقت انہوں نے اسی کو چھیڑا کہ سب معلومات تو تم نے میرے لئے فراہم کیں، یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم نے یوسفؑ کے ساتھ سلوک کیا کیا تھا؟ چنانچہ اسی وقت وہ بھڑکے اور کہنے لگے، اچھا تو آپ یوسفؑ ہی ہیں؟

وَقَالَ لِفِتۡيٰنِهِ اجۡعَلُوۡا بِضَاعَتَهُمۡ فِىۡ رِحَالِهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَعۡرِفُوۡنَهَاۤ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا

اِلٰٓى اَهۡلِهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝٦٢

اور انہوں نے اپنے جوانوں سے کہا کہ ان کی پونجی ان کے سامان میں رکھ دو، ممکن ہے یہ اُسے پہچانیں اس وقت

---

[1]۔ قال الجبائی انّهم فارقوه وهو صبّی امرد فجاء وه قد التحی و کبر و تغيّرت حاله فلم يعرفوه وقال البلخی ان ذٰلك ممّا خرق الله فيه العادة لنبيّة (تبیان)

[2]۔ الذی اقتضی طلبه الاخ من ابیهم انّه فاوضهم و سألهم عن اخبارهم و احوالهم و اخبار اهلهم کما يتساءل الناس من مثل ذٰلك و دلّ الكلام علی ذٰلك (تبیان)

[3]۔ قال فما ابو کم قال اشبح ضعيف قال ذٰلكم اخ غيركم قالوا لنا اخ من ابينا لا من امتنا قال فاذا رجعتم الی فاتونی به۔(علی بن ابراهيم)

[4]۔ ذكروا انّ اباهم اٰثره عليهم بالمحبّة مع حكمة و فضله فاحبّ ان يّراه۔(تبیان)

جب وہ اپنے گھر بار میں جائیں، شاید پھر واپس آئیں۔

یہ لوگ تو قیمت دے کر غلہ خریدنے آئے تھے انہوں نے غلہ دیا تو چلتے وقت پھر وہ قیمت بھی جو انہوں نے دی تھی، ان کے سامان میں رکھ دی۔

اسے ''پونجی'' اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ اس سے خریداری غلہ کے کاروبار کو چلا رہے تھے۔[1]

''شاید پھر وہ واپس آئیں'' یعنی شاید اس احسان کی وجہ سے وہ دوبارہ آئیں اور اب جو آئیں گے تو حسب وعدہ ان کے سگے بھائی کو بھی ضرور اپنے ساتھ لائیں گے۔

فَلَمَّا رَجَعُوۡۤا اِلٰۤى اَبِيۡهِمۡ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الۡـكَيۡلُ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكۡتَلۡ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ۝۶۳

''تو جب وہ لوگ واپس گئے اپنے باپ کے پاس تو کہا اے ہمارے والد صاحب! روک دیا گیا ہم سے غلہ کا ناپ کر دیا جانا، اس لئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے تو نپوا کر اناج لے آئیں گے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کریں گے''۔

غلہ روک دیا گیا یعنی آئندہ کے لئے کہہ دیا گیا ہے کہ اگر اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو غلہ نپوا کر نہیں دیا جائے گا''۔[2]

قَالَ هَلۡ اٰمَنُكُمۡ عَلَيۡهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنۡتُكُمۡ عَلٰۤى اَخِيۡهِ مِنۡ قَبۡلُ‌ ؕ فَاللّٰهُ خَيۡرٌ حٰفِظًا‌ ۖ وَّهُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ۝۶۴

''کہا کیا تم پر اس کے بارے میں اطمینان کروں ویسے ہی جیسے اطمینان کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں پہلے، بہر حال اللہ سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ بہترین رحم کرنے والا ہے''۔

چونکہ انہوں نے حفاظت کی نسبت بڑے زور کے ساتھ اپنی طرف دی تھی وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ تو حضرت یعقوبؑ نے جواب میں کہا کہ تم کیا حفاظت کرو گے، تم نے اس سے پہلے یوسفؑ کی حفاظت کا بھی تو ذمہ لیا تھا، اس ذمہ داری کو کب تم نے پورا کیا اور اصل حفاظت کرنے والا تو اللہ ہے، اس کی حفاظت کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کیا چیز ہے۔[3]

وَلَمَّا فَتَحُوۡا مَتَاعَهُمۡ وَجَدُوۡا بِضَاعَتَهُمۡ رُدَّتۡ اِلَيۡهِمۡ‌ ؕ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا نَبۡغِىۡ‌ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتۡ اِلَيۡنَا‌ ۚ وَنَمِيۡرُ اَهۡلَنَا وَنَحۡفَظُ اَخَانَا وَنَزۡدَادُ كَيۡلَ بَعِيۡرٍ‌ ؕ

---

[1] البضاعة قطعة من المال التّی للتجارة (تبیان)

[2] منع منا الكيل ان لم نات باخينا ...وهو قول الحسن والزجاج والجبائی وهو الصحيح (تبيان)

[3] المعنی فالله خير حفظا من حفظكم الذی نسبتموه الی انفسكم (تبيان)

ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

"اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنی پونجی کو پایا کہ وہ انہیں واپس کردی گئی ہے کہنے لگے اور ہمیں کیا چاہیے، یہ ہماری پونجی بھی تو ہمیں واپس کردی گئی ہے اور اب ہم اپنے گھر والوں کے لئے پھر غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پھر اور زیادہ غلہ لائیں گے یہ تو تھوڑا غلہ ہے جو ہمیں ناپ کر ملا ہے"۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

انہوں نے کہا کہ میں کبھی نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ جب تک تم مجھ سے اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد و پیمان نہ کرو کہ تم اسے اپنے ساتھ ضرور لے آؤ گے سوا اس کے کہ تم سب گھیر لئے جاؤ تو جب ان سب نے ان سے عہد و پیمان کیا تو انہوں نے کہا کہ اللہ ہماری گفتگو پر گواہ ہے۔ [1]

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور انہوں نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے شہر کے اندر نہ جانا اور مختلف دروازوں سے جانا اور میں تم کو اللہ سے بچا تو نہیں سکتا، کچھ بھی فیصلہ نہیں ہے مگر اللہ کے قبضہ میں۔ اُسی پر میرا بھروسا ہے اور اسی پر بھروسا کرنا چاہیے بھروسا کرنے والوں کو۔

ایک دروازے سے نہ جانا، یہ اس لئے کہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے [2] بعض علمائے اہل سنت نے نظر کو عوامی چیز بنا کر اس کی اصلیت سے انکار کیا ہے لہٰذا ایک دوازے سے جانے کی ممانعت کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ کہیں مصر کے اقتدار سلطنت کو ان کے قدو قامت سے ان کی طاقت وری کا صحیح اندازہ ہو تو وہ اپنے لئے سیاسی طور پر ان سے خطرہ محسوس نہ کریں اور ان کی ضرر رسانی کے درپے نہ ہو مگر چونکہ نظر بد کی اصلیت شرعاً معتبر طریقہ پر ثابت ہے اس لئے پہلا ہی خیال جو مفسرین کی اکثرت کا ہے درست معلوم ہوتا ہے۔ [3]

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ

---

[1]۔ و کیل شهید (جلالین)

[2]۔ تا چشم زخم نرسد (فتح الرحمن)

[3]۔ الذی قال له غیر صحیح فی امر العین بل غیر منکر ان یکون ما قالا المفسرّون صحیحا (تبیان)

إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

اور جب وہ لوگ داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے انہیں حکم دیا تھا تو انہیں تقدیر الٰہی [1] سے کوئی چیز بچا تو سکتی نہ تھی مگر یعقوب کے دل کی ایک حسرت تھی جسے انہوں نے نکال لیا [2] اور یقیناً وہ علم رکھنے والے تھے اس کا کہ جس کا ہم نے انہیں علم عطا کیا تھا مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

یعنی یعقوبؑ بھی جانتے تھے کہ یہ بس ایک ظاہری بچاؤ کی تدبیر ہے ورنہ ہوگا وہی جو منظور خدا ہوگا۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾

اور جب وہ لوگ یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو کہا میں تمہارا سگا بھائی ہوں تو تم پریشان نہ ہونا اس سے جو یہ لوگ کریں، اس کے بعد جب ان کا سامان تیار کرایا تو پانی پینے کا کٹورا اپنے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے ندا دی کہ اے قافلہ والو! یقیناً تم لوگ چور ہو"۔

شاہی کٹورا یقیناً کوئی معمولی کٹورا نہیں ہوسکتا، ضرور جواہرات اس میں جڑے ہوئے ہوں گے۔ [3]

بھائیوں کی دوسری دفعہ حاضری اور یوسفؑ کی اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس رکھ لینے کے لئے ترکیب

قابل لحاظ یہ امر ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام کی ندا میں یہ نہیں ہے کہ یہ چور ہے یعنی ان کا بھائی بلکہ کہا گیا ہے تم چور ہو اس کے لئے ہمارے یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی یہ نہایت لطیف پہلو وارد ہوا ہے

کہ انہوں نے اس وقت نہ چوری کی ہو مگر ان کے چور ہونے میں شبہ ہی کیا ہے کہ انہوں نے خود یوسفؑ کو ان کے باپ سے چرایا۔ جو یقیناً بڑا جرم عظیم تھا۔ اس طرح یہ جملہ معاذ اللہ جھوٹ نہ تھا۔ جو شان انبیاء کے خلاف ہے بلکہ توریہ تھا جو معانی بیان کی ایک مستقل صنعت ہے اور فصیح کلام کا ایک جوہر ہے۔

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن جَاءَ

---

[1] من اللہ ای من قضائه (جلالین)

[2] سر انجام یعقوب علیہ السلام خطرہ راء کہ در ضمیر و بود (شاہ ولی اللہ) مگر ایک خطرہ تھا بیچ دل یعقوبؑ کے کہ کر ڈالا اس کو (شاہ رفیع الدین)

[3] هی صاع بالذهب مرصّع بالجواهر (جلالین) ایک پیالہ مرصّع پانی پینے کا (شاہ رفیع الدین)

بِهٖ حِمۡلُ بَعِيۡرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيۡمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا لِنُفۡسِدَ فِى الۡاَرۡضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيۡنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوۡا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ كٰذِبِيۡنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوۡا جَزَآؤُهٗ مَنۡ وُّجِدَ فِىۡ رَحۡلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۷۵﴾

انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ کیا چیز تمہاری کھوگئی؟ انہوں نے کہا کہ بادشاہ کے پینے کا پیالہ ہمیں نہیں مل رہاہے اور جو اسے لائے اسے اونٹ کے برابر بھر غلہ انعام میں ملے گا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم نہیں آئے ہیں اس لئے کہ اس سرزمین میں خرابی پھیلائیں اور ہم چور نہیں ہیں انہوں نے کہا تو کیا سزا ہے اس کی اگر تم جھوٹے ہو، انہوں نے کہا کہ سزا اس کی یہ ہے کہ جس کے سامان میں وہ مل جائے تو یہی آدمی اس کا معاوضہ ہے اس طرح سزا دیتے ہیں ہم مجرموں کو"۔

وہی آدمی معاوضہ ہے یعنی اس کو غلام بنا کر اپنے پاس روک لیا جائے گا۔

فَبَدَاَ بِاَوۡعِيَتِهِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِيۡهِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَهَا مِنۡ وِّعَآءِ اَخِيۡهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدۡنَا لِيُوۡسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاۡخُذَ اَخَاهُ فِىۡ دِيۡنِ الۡمَلِكِ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ وَفَوۡقَ كُلِّ ذِىۡ عِلۡمٍ عَلِيۡمٌ ﴿۷۶﴾

"تو اُنھوں نے اپنے بھائی کے برتن سے پہلے انکے برتنوں سے ابتداء کی، پھر اسے نکال لیا اپنے بھائی کے برتن سے۔ اس طرح ہم نے ترکیب کی یوسف کے لیے۔ وہ نہیں لے سکتے تھے اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے مطابق سوا اس کے کہ اللہ چاہے۔ ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلندی عطا کرتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے"

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔

"یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ چور کو غلام کرلو، اُس پر پکڑے گئے نہیں تو اس بادشاہ کا یہ حکم نہ تھا۔" (موضح القرآن)

فی دین الملك حکم ملك مصر لانّ جزاءہ عندہ الضّرب وتقویم مثل المسروق لاالا مسترقان الّا ان یشاء الله اخذہ بحکم ابیه ای لم یتمکن من اخذہ الّا بمشیة الله ای بألھامه سؤال اخوته وجوابه.

بادشاہ کے حکم میں یعنی بادشاہ مصر کے قانون میں کیونکہ ان کے یہاں اس کی سزا جسمانی تعزیر تھی اور جو چیز چرائی گئی ہو، ویسی چیز کی قیمت وصول کرنا، نہ یہ کہ چور کو غلام بنانا، سوا اس کے کہ اللہ چاہے۔ یعنی اسے چاہا کہ یہاں یوسفؑ کے باپ کے قانون کے مطابق عمل ہو اور وہ القائے ربانی سے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ سکیں کہ وہ خود بھائیوں سے پوچھیں اور وہ یہ جواب دیں۔

الّا ما شآء الله سوا اس کے کہ اللہ چاہے، اس کے بعد یہ ارشاد کہ ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلندی عطا کرتے ہیں، اس حقیقت

کا اظہار ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، یہ اللہ کی ہدایت خاص کا نتیجہ تھا[1] اس کے بعد کتنا غلط ہے یہ تصور کہ اسے جناب یوسف علیہ السلام کا ایک ترک اولیٰ سمجھا جائے کہ انہوں نے معاذ اللہ واقعہ کے خلاف ایک بات کہی۔

قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَاَسَرَّہَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِہٖ وَلَمۡ یُبۡدِہَا لَہُمۡ ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا ۚ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ﴿۷۷﴾

''انہوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی تو اسے یوسف نے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور نہیں ظاہر کیا ان کے لئے۔ کہا تم منزل کے لحاظ سے بدتر ہو اور اللہ خوب جانتا ہے اس کیفیت کو جو تم بیان کرتے ہو''۔

انہوں نے کس بنا پر کہا کہ اس کے ایک بھائی (یعنی یوسف علیہ السلام) نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی اس کے لئے مفسرین کا بیان مختلف ہے ایک یہ ہے کہ

حضرت یوسف بتی از طلا از جدّۂ مادری خود بدزدید تا از عبادت صنم باز ماند۔ مشابہ ایں قصہ چیزی کہ سبب تہمت او باشد بدزدی بوقوع آمدہ بود (فتح الرحمن)

جناب یوسف علیہ السلام نے سونے کی ایک مورتی اپنی نانی کے پاس سے چرالی تھی تا کہ وہ بت پرستی سے باز آجائے اسی طرح کا کوئی واقعہ ایسا تھا کہ چوری کا الزام ان پر عائد ہو گیا۔

تفسیر جلالین میں ہے:

کان سرق لابی امہ صنما من ذھب فکسرہ لئلا یعبدہ

انہوں نے اپنے نانا کی سونے کی ایک مورتی چرائی تھی جسے انہوں نے توڑ دیا تا کہ وہ اس کی عبادت نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ:

ان پر چوری کا طعن دیا، وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پھوپھی نے پالا، جب بڑے ہوئے تو باپ نے چاہا اپنے پاس رکھیں پھوپھی کو محبت تھی چھپا کر ایک پٹکا ان کی کمر سے باندھ دیا پھر اس کو ڈھونڈھنے لگی لوگوں میں چرچا ہوا آخر ان کی کمر سے نکلا موافق اس دین کے ایک برس پھوپھی کے پاس اور رہے (موضح القرآن)

جناب شیخ طوسیؒ نے ان دونوں اقوال کے علاوہ ایک تیسری بات یہ درج کی ہے کہ وہ دسترخوان پر سے مخفی طور پر کچھ کھانا بچا کر فقراء و مساکین کے لئے رکھ دیتے تھے[2] اس لئے گھر والوں نے یہ الزام ان پر عائد کیا۔

بہر حال وہ چیز کوئی ایسی ہے جو بجائے خود عند اللہ کوئی جرم نہ تھی لیکن برادرانِ یوسفؑ اسے چوری کے لفظ سے تعبیر کر رہے تھے اسے

---

[1] انما قال ذٰلك لانہ تعالیٰ کان امرہ بذٰلك (تبیان)

[2] قال قوم انہ کان یسرق من طعام المائدۃ للمساکین (تبیان)

یوسفؑ نے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے ظاہر نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جسے بعد میں قرآن نے کہا ہے کہ انہوں نے کہا: اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا تم منزل کے لحاظ سے بدتر ہو تو یہ انہوں نے زبان سے تھوڑی کہا، دل میں کہا۔[1]

''بدتر'' کا لفظ ان کی اس برائی کے تصور کے لحاظ سے ہے جو وہ جناب یوسف علیہ السلام کے لئے ذہن میں لئے ہوئے تھے اور بطور ابہام اس وقت کہہ رہے تھے ورنہ حقیقت میں تو کوئی برائی جناب یوسف علیہ السلام میں تھی ہی نہیں، برے یہی لوگ تھے جو ان کی نسبت برائی کا تصور کر رہے تھے اور اشارۃً ظاہر کر رہے تھے۔

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

''ان لوگوں نے کہا اے عزیز مصر! یقین مانیے کہ اس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے تو ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ پر رکھ لیجئے ہم تو آپ کو بڑے حسن کردار کا حامل دیکھتے ہیں انہوں نے کہا اللہ کی پناہ اس سے کہ ہم لیں کسی کو سوا اس کے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس صورت میں تو ہم ظالم قرار پائیں گے۔

یہ کہا کہ ''جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہیں۔ یہ نہیں کہ جس نے چوری کی ہے'' اس لیے کہ وہ جھوٹ ہوتا۔[2]

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

تو جب وہ لوگ ان کی طرف سے ناامید ہوئے تو تخلیہ میں جا کر آپس میں چپکے چپکے مشورہ کرنے لگے۔ اُن میں جو سب سے بڑا تھا، اس نے کہا، کیا تمہیں نہیں معلوم ہی کہ تمہارے باپ نے تم سے اللہ کی قسم دے کر عہد لیا تھا اور اس کے پہلے تم نے یوسف کے بارے میں تقصیر کی تھی، لہٰذا میں تو اس سرزمین سے ہٹوں گا نہیں جب تک کہ میرے

---

[1] ۔قال فی نفسہ (جلالین) گفت در دل خود (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔لم یقل من سرق تحرزا من الکذب (جلالین)

والد مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لئے اپنا کوئی فیصلہ صادر کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے واپس جاؤ اپنے والد کے پاس اور جا کران سے کہو کہ اے ہمارے والد صاحب آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم نہیں گواہی دیتے مگر وہی کہ جو ہمیں معلوم ہے اور غیب کی بات کی ہمیں خبر نہیں ہے اور اس بستی سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے کہ جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بلاشبہ سچے ہیں''۔

اس سلسلہ کے پہلے ٹکڑے فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا میں کچھ ایسی کیفیت ہے کہ اسے محسوس کر کے بعض قرآن کے مقابلہ کا ارادہ کرنے والے سپر انداختہ ہو کر بیٹھ گئے [1] مگر ترجمہ سے اس کیفیت کا اندازہ کرنا، ہمیں مشکل بلکہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

''انہوں نے کہا بلکہ تمہارے نفوس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے تو بہر حال میں صبر کرتا ہوں جو بہتر ہے ممکن ہے کہ اللہ اُن سب کو میرے پاس لائے، یقیناً وہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا''۔

جناب یعقوب علیہ السلام کو اس کی اطلاع اور ان کا تاثّر

ان سب کو یعنی تین بیٹے جو مصر میں رہ گئے ہیں، یوسفؑ اور ان کے حقیقی بھائی اور ان بھائیوں میں سب سے بڑا جس نے مصر سے ہٹنا اس صورت حال میں پسند نہیں کیا۔

اب یہاں ایک پہلو حل طلب یہ ہے کہ یوسف کے بارے میں بھائیوں کے جا کر کہنے سے کہ بھیڑیئے نے کھا لیا، یہی الفاظ حضرت یعقوبؑ نے کہے تھے کہ تمہارے نفوس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے بہر حال میں صبر کرتا ہوں۔ وہ تو بلا تکلف درست ہے، لیکن وہی الفاظ اب اس دفعہ بھی ان بھائیوں کی اطلاع رسانی پر کہے۔ حالانکہ اس دفعہ ان بھائیوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

پہلی بار کی بے اعتباری سے اب کی بار بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کا اعتبار نہ کیا لیکن نبی کا کلام جھوٹ نہیں بیٹوں کی بنائی بات تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی بیٹھے تھے (موضح القرآن)

اس میں سے صرف پہلا جزءِ تفسیر جلالین میں ہے:

انہم لما سبق منہم فی امر یوسف۔

انہوں نے ان پر اعتماد نہ کیا ان کے اس عمل کی وجہ سے جو یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہو چکا تھا۔

ہماری نظر میں شاہ صاحب نے جو اضافہ کیا ہے وہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے یعنی ان کا ضمیر اسلامی اسے گوارا نہیں کرتا کہ ایک نبی کی زبان سے سابق پر قیاس کی بنا پر کوئی خلاف واقعہ بات نکلے مگر اس صورت میں انہیں کسی ایسی حدیث کو بھی رد کر دینا چاہیے جو جناب یعقوبؑ سے بالاتر ذات یعنی ان کے جد امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے معاذ اللہ جھوٹوں کی فہرست مرتب کر کے پیش کر رہی ہو۔ چاہے وہ کسی بھی صحیح نام کی

---

[1] ھٰذا من عجیب فصاحۃ القراٰن الخارقۃ للعادۃ۔ (تبیان)

کتاب میں درج شدہ ہو، بہرحال اس حدیث کو غیر صحیح ہی ماننا چاہیے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

''اور اُن کی طرف سے انہوں نے منہ پھیر لیا اور پھر کہا ہائے افسوس یوسف پر اور ان کی دونوں آنکھیں رنج و غم سے سفید ہو گئیں تو ایک خاموش مرقع غم [۱] بن گئے۔ ان لوگوں نے کہا خدا کی قسم آپ برابر یوسف کو یاد کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ سخت بیمار پڑ جائیں [۲] یا ہلاک ہی ہو جائیں۔ انہوں نے کہا میں تو اپنے رنج و غم کی شکایت بس اللہ سے کرتا ہوں۔ اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ جو تم نہیں جانتے ہو''۔

جناب یعقوبؑ کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت

ان آیات سے جناب یعقوبؑ کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

یعنی تم کیا مجھ کو صبر سکھاؤ گے لیکن بے صبر وہ ہے جو خلق کے آگے شکایت کرے میں تو اس سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھوں وہ کس حد پر جا کر بس ہو (موضح القرآن)

مگر تفسیر جلالین میں ہے:

واعلم من اللہ مالا تعلمون من ان رؤیا یوسف صدق وھو حیّ

جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ جو تم نہیں جانتے ہو یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام کا خواب سچا تھا اور وہ زندہ ہیں۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

''اے میرے بیٹو! جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کی خبر لو [۳] اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ کی رحمت

---

[۱] مکروب مغموم لا یظھر کربہ (جلالین)

[۲] مشر فاعلی الھلاک لطول مرضك (جلالین)

[۳] التجسس طلب الشئی بالحا (تبیان)

سے ناامید نہیں ہوتے مگر کافر لوگ‘‘۔

بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اوران کی توبہ وانابت

ان آیات سے بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اوران کی توبہ وانابت کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَٰٓأَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ
مُّزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾
قَالَ هَلْ عَلِمْتُم مَّا فَعَلْتُم بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾ قَالُوٓا أَءِنَّكَ
لَأَنتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَآ أَخِي ۖ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ
وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾

‘‘جب وہ لوگ ان کے پاس داخل ہوئے تو کہنے لگے اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے تمام گھر والوں کو بڑی سختی درپیش ہوگئی ہے اور ہم تھوڑی سی پونجی لائے ہیں تو ہمیں پورا پیمانہ ناپ کر دلوا دیجئے اور ہم پر خیرات کیجئے یقیناً اللہ خیرات کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے انہوں نے کہا کچھ تمہیں خبر ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا جب کہ تم جہالت میں مبتلا تھے انہوں نے کہا سچ مچ تم یوسف ہو؟ کہا میں یوسف اور یہ میرا بھائی ہے ہم پر اللہ نے احسان کیا ہے یقیناً جو پرہیزگاری سے کام لیتا ہے اور صبر کرتا ہے تو بلا شبہ اللہ نیک اعمال والوں کے اجر وثواب کو برباد نہیں کرتا۔

درمیانی کڑی سننے والے کی سمجھ پر چھوڑی گئی ہے یعنی اس کے بعد پھر قحط سالی کی پریشانی سے مجبور ہو کر برادرانِ یوسف نے مصر کا رخ کیا اور وہاں پہونچے۔[1]

معاوضہ چونکہ ناکافی تھا، اس لئے اس عاجزی کے ساتھ غلہ کی خریداری کی درخواست کی اور کہا خیرات سے کام لیجئے، یعنی معاوضہ تو اتنا نہیں ہے مگر آپ اس کی کمی کو نظر انداز کیجئے اور ہمیں غلہ پورا دلوا دیجئے[2] اور یہی عاجزی تھی جس پر جناب یوسف علیہ السلام کو رحم آ گیا ہے[3] اور انہوں نے بتلا دیا کہ میں کوئی غیر نہیں ہوں وہی تمہارا بھائی ہوں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

قحط میں سب اسباب گھر کا بک گیا اب کی بار اون اور پنسیر اور ایسی چیزیں لائے تھے اناج خریدنے کو یہ حال سن کر یوسفؑ کو رحم آیا اور

[1] فانطلقوا نحو مصر ليوسف (جلالين)
[2] تصدّق علينا بالمسامحة عن رداءة بضاعتنا (جلالين)
[3] سألوه التصدق عليهم بإيفاء كيلهم فرق لهم (تبيان)

اپنے تیئں ظاہر کیا اور سارے گھر کو بلوا لیا۔ (موضح القرآن)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ۝٩١ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ
الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝٩٢ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ
عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٩٣

''ان لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم اللہ نے تم کو ہم پر مقدم کیا ہے اور ہم بے شک خطا وار تھے انہوں نے کہا اب آج تم کو کوئی لعنت ملامت کرنا نہیں ہے، اللہ تم کو بخش دے اور وہ تمام رحمت والوں میں سب سے زیادہ رحمت والا ہے۔ لے جاؤ میرے اس کرتے کو اور لے جا کر میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو۔ ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور میرے پاس اپنے تمام گھر والوں کو سب کو لے کر آؤ''۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝٩٤
قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۝٩٥ فَلَمَّآ اَنْ جَاۗءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰي وَجْهِهٖ
فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ڌ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٩٦

''اور جب قافلہ روانہ ہوا تو اُن کے باپ نے کہا میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، اگر تم لوگ مجھے بے وقوف نہ بناؤ، ان لوگوں نے کہا خدا کی قسم آپ اپنی پرانی گمراہی میں ہیں تو جب خوش خبری دینے والا آیا، اس نے اُسے اُن کے چہرہ پر ڈال دیا تو ان کی آنکھیں دوبارہ روشن ہو گئیں انہوں نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو''۔

جناب یوسف علیہ السلام کی خوشبو اور پیرہن کا جناب یعقوب علیہ السلام تک پہنچنا اور بینائی کا پلٹنا

یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹے ہی نہیں جو برادران یوسف تھے بلکہ گھر کے دوسرے لوگ بھی جناب یعقوبؑ کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے اور جناب یوسف علیہ السلام کو اتنا زیادہ یاد کرتے اور ان کے رونے پر طعن و تشنیع کرتے تھے کیونکہ وہ بھائی تو اس وقت مصر میں تھے تو یہ دوسرے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جن سے یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ [1]

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـــِٕيْنَ ۝٩٧ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ
رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝٩٨

[1]۔ انّما قال یعقوب ھذا القول لمن حضرہ من اھلہ و قرابۃ دون ولدہ لانّھم کانوا غیبا عنہ لم یصلوا الیہ۔ (تبیان)

’’انہوں نے کہا اے ہمارے والد! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے سفارش کیجئے، یقیناً ہم خطاوار تھے انہوں نے کہا میں تمہارے لئے پروردگار سے بخشش کی التجا کروں گا۔ یقیناً وہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان‘‘۔

یہ کس نے کہا؟ سیاق تو بتلاتا ہے کہ قمیص کے پہنچنے کے وقت ہی جب جناب یعقوبؑ نے کہا کہ میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اسی وقت یہ کہا گیا مگر اس وقت جناب یعقوبؑ کے وہ بیٹے ان کے پاس کہاں تھے جو وہ کہتے، معلوم ہوتا ہے کہ درمیان کی کڑیاں یہاں مذکور نہیں ہیں اس قمیص کے پہنچنے اور جناب یعقوبؑ کی بصارت واپس ہونے کے بعد برادران یوسفؑ بھی پھر یوسفؑ کی ہدایت کے مطابق کہ اپنے تمام گھر والوں کو میرے پاس لے کر آ و۔ کنعان میں اپنے والد کی خدمت میں گئے اور اس وقت انہوں نے یہ کہا۔ [1]

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰۤی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

’’تو جب وہ سب یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو جایئے جہاں انشاء اللہ امن و اطمینان سے رہیے گا اور اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ سب ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور انہوں نے کہا اے بابا! یہ میرے خواب کی جو پہلے دیکھا تھا تعبیر ہے جسے میرے پروردگار نے سچ کر دکھایا ہے اور اس نے مجھ پر احسان کیا جب کہ اس نے مجھے قید خانہ سے نکالا اور آپ لوگوں کو بیابان سے یہاں لایا جب کہ اس کے پہلے شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈالتی تھی یقیناً اللہ مہربانی کرنے والا ہے جس پر وہ چاہے یقیناً وہ جاننے والا ہے ٹھیک کام کرنے والا۔ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے ایک طرح کی سلطنت دی اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو میرا پروردگار ہے دنیا اور آخرت میں۔ مجھے دنیا سے مسلمان اٹھا اور مجھے نیک اعمال لوگوں میں محسوب فرما‘‘۔

---

[1] ۔ فی الکلام حذف لان تقدیرہ ان اخوۃ یوسف وصلوا الی ابیھم فلما راوہ قالوا لہ یا ابانا استغفر لنا ذنوبنا (تبیان)

بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہونا اور سب کا یوسفؑ کے سامنے سربسجود ہونا

یہ تذکرہ جہاں سے شروع ہوا ہے اس میں درمیان کی کڑیاں پھر محذوف ہیں یعنی یوسفؑ کی خواہش کے مطابق برادران یوسف کنعان گئے اور اب تمام گھر کے لوگوں سمیت دوبارہ مصر آئے۔[1]

یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔ حالانکہ ابھی مصر میں داخل نہیں ہوئے ہیں اس لئے کہ اس کے بعد ان کا یہ کہنا ہے کہ مصر میں داخل ہو جایئے۔

اس کی تشریح شاہ ولی اللہ اپنے ترجمہ میں یوں کرتے ہیں:

چوں درآمد از نزد یوسف یعن درخیمه اش و اوبرائ استقبال برآمده بود جائے داد بسوی خود پدر و مادر خودرا وگفت درآئید بمصر"۔

یعنی یوسفؑ ماں باپ وغیرہ کے استقبال کو شہر سے باہر آئے تو وہاں ان کے لئے ایک خیمہ لگایا گیا تھا جس میں فروکش تھے پہلے یہ لوگ ان کے پاس اس خیمہ میں داخل ہوئے۔ وہاں یہ باتیں ہوئیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے:

شاہ عبدالقادر نے مختصر طور پر یوں کہا ہے کہ:

باہر شہر سے استقبال کو نکلے وہاں یہ کہا (موضح القرآن)

وہ تفصیل اور یہ اجمال دونوں جلالین سے ماخوذ ہیں جنہوں نے لکھا ہے:

فلما دخلوا علی یوسف فی مضربه.

جب وہ یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے ان کے خیمہ میں۔

"وہ سب ان کے سجدہ میں گر گئے"۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

پہلے وقت میں سجدہ تعظیم تھی آپس کی۔ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو کیا ہے اس وقت اللہ نے وہ رواج موقوف کیا: وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (سورۂ جن۔۱۸) یہ اس وقت پہلے رواج پر چلنا ویسا ہے کہ کوئی بہن سے نکاح کرے کہ حضرت آدمؑ کے وقت ہوا ہے" (موضح القرآن)

یہ مثال جو دی ہے اس سے تو ہمیں اتفاق نہیں ہے ہمارے احادیث بتاتے ہیں کہ آدم کے وقت میں بھی بہن سے نکاح نہ تھا مگر اصولاً یہ بات درست ہے کہ سابق شریعت میں اگر کوئی حکم ہو تو اسلام میں منسوخ ہو جانے کے بعد اب اس پر عمل درست نہیں ہے مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ غیر خدا کے لئے ذاتاً شرک نہیں ہے اس لئے کہ اگر شرک ہوتا تو کسی دور میں بھی خالق کی طرف سے اس کا حکم نہ ہوتا حالانکہ باعتراف شاہ صاحب ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا۔ اسے رواج کہہ کر ہلکا نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ وہ بنص قرآن حکم الٰہی سے تھا اور یہ ظاہر ہے کہ خالق کی طرف سے کسی دور میں بھی اپنے ساتھ شرک کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اب سجدہ ممنوع بے شک ہے لیکن وہ ایک شرعی حکم ہے جس کی مخالفت سے انسان گنہگار ہوگا لیکن شرک کا حکم عائد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سجدہ بطور عبادت نہ ہو یعنی اس شے کو خدا سمجھ کے خود اس شے کی پرستش کے طور پر سجدہ

[1] فی الکلام حذف لانّ تقدیرہ ان یعقوب وبنیه واھلھم خلوا الی یوسف فلمّا وصلوا الیه (تبیان)

کرے اس صورت میں سجدہ نہیں بلکہ جو طریقہ اس سے کمتر درجہ کا بھی اختیار کرے گا تو وہ شرک ہوگا اور اگر اس شخص کی عبادت مقصود نہیں ہے تو سجدہ اس کے لئے معصیت ہی سمجھا جا سکتا ہے اس پر شرک کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

ہاں بس تفسیر جلالین کے اس محل پر جو صاحب قلم کا رہیں۔انہوں نے قرآن کی اس تصریح: خروا له سجدا کے معنی میں تبدیلی فرمادی ہے: وہ کہتے ہیں:

سجود انحناء لا وضع جبهة وكان تحيتهم فى ذلك الزمان

سجدہ بس خم ہوجانے کی حد تک نہ کہ پیشانی زمین پر رکھنا اور وہ یعنی خم ہونا اس زمانہ کے سلام وآداب کا طریقہ تھا۔

حالانکہ سجدہ کے جو اصل معنی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں ان میں اس تبدیلی کی کوئی سند ہونا چاہیے اور یہاں اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے بلکہ خرّوا کے ساتھ جو سجّدا ''گر گئے'' کا لفظ ہے وہ قطعی طور پر اس تشریح کی نفی کرتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ‌ۚ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

''یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی بھیجتے ہیں اور آپ خود ان کے پاس موجود نہ تھے جب انہوں نے طے کیا اپنے منصوبہ کو اور وہ سازش کر رہے تھے''۔

مطلب یہ ہے کہ اگر الٰہی تعلیم نہ ہوتی تو آپ کو ذاتاً ان تفصیلات کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یہ مذکورہ توریت میں اور پہلے کی کتابوں میں بھی نہیں''۔ (موضح القرآن)

وَمَاۤ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور چاہے آپ کتنے ہی خواہش مند ہوں، زیادہ تر لوگ ایمان نہیں لائیں گے''۔

قرآن مجید میں یہ مضمون بہت جگہ ہے اس کے بعد اگر فتح مکہ وغیرہ کے بعد یہ نظر آوے کہ اب زیادہ تر لوگ مسلمان ہوگئے اور مشرکین کی تعداد کم ہوگئی یا اس کا وجود ہی نہ رہا تو قرآن کی ان تصریحات پر ایمان رکھتے ہوئے یقین کرنا پڑے گا کہ ان میں سے زیادہ افراد کا ایمان نمائشی ہے اور انہوں نے حقیقت میں ایمان اختیار نہیں کیا ہے۔

وَمَا تَسۡـئَلُهُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ يَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهَا وَهُمۡ عَنۡهَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤۡمِنُ اَكۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمۡ مُّشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾

''اور آپ ان سے اس پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے وہ نہیں ہے مگر یاد دہانی تمام جہانوں کے لئے، اور کتنی ہی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں کہ وہ گزرتے ہیں ان کی طرف سے اس طرح کہ وہ ان سے بے اعتنائی اختیار

کئے ہوتے ہیں اوران میں سے زیادہ ترنہیں ایمان لاتے اللہ پر مگر یہ کہ شرک اختیار کئے ہوئے ہیں''۔

آخری فقرہ صریحی مشرکین سے متعلق تو ہوسکتا ہے بایں معنی کہ وہ اللہ کو مانتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ

اگران سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔(لقمان۔۲۵)

مگر اللہ کو ماننے کے ساتھ وہ دوسرے معبودوں کو مانتے ہیں اس طرح شرک کے مرتکب ہیں۔

عام مفسرین یہی معنی قرار دیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

یعنی منہ سے سب کہتے ہیں کہ خالق مالک سب کا وہی ہے پھراوروں کو پکڑتے ہیں''۔(موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

وما يؤمن اكثرهم بالله حيث يقرؤن بانه الخالق الرزاق الا وهم مشركون به بعبادة الاوثان

''اکثران میں سے جو اللہ پر اس طرح ایمان لاتے ہیں کہ اقرار کرتے ہیں اس کا خالق کرنے والا اور رزق دینے والا وہی ہے تو یہ ایمان نہیں ہے مگر اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ بت پرستی کرکے شرک کرتے ہیں''۔

مگر ہمیں اس معنی میں تامل یوں ہے کہ اس طرح کے اقرار کو قرآن نے ایمان نہیں مانا ہے ورنہ دعوت کیوں دی جاتی کہ اللہ پر ایمان لاؤ؟ اس لئے بعید نہیں ہے کہ یہ آیت اسی پہلو کو نمایاں کرتی ہو جسے اس سے قبل کی آیت میں ہم درج کر چکے ہیں یعنی ان میں سے زیادہ تر جب اللہ پر ایمان لائیں گے یعنی مسلمان ہونے کا اقرار کریں گے تب بھی دل میں وہ مشرک ہی ہوں گے اس لئے وہ منافق ہوں گے، حقیقی مومن نہ ہوں گے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اعتقادی طور پر اللہ کے مقر ہیں مگر عملاً ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، اس طرح کہ اس کے احکام کے خلاف دوسروں کے سامنے سرجھکاتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں اور گویا انہیں خداوندنعمت سمجھتے ہوئے خدا بنائے ہوئے ہیں جو ایک طرح کا شرک ہے چاہے قانون شرع میں احکام شرک کے ان پر مرتب نہ ہوں۔ ہماری قدیم تفسیر اس تشریح کی موید ہے۔[ا]

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٠٧﴾

''کیا وہ مطمئن ہیں اس خطرہ سے کہ ان پر کوئی چھا جانے والا عذاب اللہ کا اچانک یا ان کے سامنے قیامت آجائے درحالیکہ انہیں خبر نہ ہو''۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ

[ا]۔ شرك طاعة وليس شرك عبادة (علی بن ابراهيم)

اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾

''کہیے کہ یہ ہے میرا راستا میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں پوری طرح سمجھ کر میں بھی اور وہ بھی جو میرا پیرو ہے اور اللہ کی ذات ہر برائی سے پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں''۔

پوری طرح سمجھ کر یعنی تحقیقی طور پر جو ہمارے یہاں ایمان کی شرط لازمی ہے تقلیدی طور پر نہیں، تمہاری طرح نہیں کہ بس ہم نے باپ دادا کو ایک راستے پر چلتے دیکھا ہے لہٰذا ہم بھی اسی راستے پر چلے جائیں گے''۔

جس طرح دوسرے مقامات پر جہاں من اتبعك آیا ہے اس کی تفسیر فرد اکمل ہونے کے لحاظ سے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ ہوئی ہے اسی طرح یہاں بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی جو ارشاد ہوا ہے و من اتبعنی اس کے بھی معیاری مصداق جناب امیرؑ اور ان کے بعد اپنے اپنے دور کے معصومینؑ ہیں۔[1]

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى ؕ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا اسۡتَيۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّىَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۱۰﴾

''اور ہم نے آپ کے پہلے نہیں بھیجا مگر انہی بستیوں میں سے ایسے آدمیوں کو جن کی طرف ہم نے اپنی وحی بھیجی تو کیا وہ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان کے پہلے تھے اور ضرور آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگاری سے کام لیں تو کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ یہاں تک کہ جب بھی پیغمبر نا امید ہونے لگے اور سمجھنے لگے کہ ان سے جھوٹی باتیں کہی گئیں تھیں تو ان کے پاس ہماری مدد آ گئی تو جسے ہم نے چاہا، وہ نجات پا گیا، اور ہمارا عذاب ہٹایا نہیں جا سکتا ان لوگوں سے جو گنہگار رہیں''۔

وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا الفقرہ مفسرین کے لئے دشوار ثابت ہوا ہے چونکہ اس کے پہلے پیغمبروں کا ذکر ہے کہ وہ ناامید ہو گئے اب یہ جو کہا جا رہا ہے کہ وہ سمجھنے لگے کہ ان سے جھوٹی باتیں کہی گئیں تھیں تو اس سے سطحی نگاہ والے جو مفہوم سمجھ سکتے ہیں وہ مرسلین کی شان کے بالکل خلاف ہے اس لئے مفسرین کے درمیان اس کا مفہوم بتانے میں اختلاف ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:

''گماں کردند قوم ایشاں کہ بدروغ وعدہ کردہ شد با ایشاں''

اس کے برخلاف ان کے بیٹے شاہ محمد رفیع الدین نے پہلی ضمیر رسل ہی کی طرف پھیری ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''گمان کیا اُنہوں نے یہ کہ

[1] ۔ یعنی علی بن ابی طالب و آل محمد (علی بن ابراھیم)

اُن سے لوگوں نے تحقیق جھوٹ بولا''۔

اس میں بھی مرسلین کی شان کو محفوظ کیا گیا ہے کُذِبُوْا جو فعل مجہول ہے، اس کا فاعل مضمر، لوگوں کو قرار دیا ہے۔ معاذ اللہ خدا کے وعدوں کو نہیں۔ دوسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تقریباً اپنے والد شاہ ولی اللہ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''یعنی وعدۂ عذاب کو دیر لگی یہاں تک رسولؑ نا امید ہو گئے کہ شاید ہماری زندگی میں نہ آیا پیچھے آوے اور ان کے یار خیال کرنے لگے کہ شاید وعدہ خلاف تھا'' (موضح القرآن)

یہاں چونکہ بات یار یعنی ''اصحاب'' کی آ گئی تھی تو شاہ صاحب کو اس کے بعد دفع دخل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ:۔

''اتنے خیال سے آدمی کافر نہیں ہوتا، اگر جانتا ہے کہ یہ خیال بد ہے''

جلالین صاحبان نے پہلے تو کَذِبُوا کو کُذِّبُوا تشدید کے ساتھ قرار دے کر معنی لکھے ہیں:۔

ظنّوا ایقین الرّسل انّھم قد کُذّبوا بالتشدید تکذیبا لا ایمان بعدہ۔

اُنہوں نے گمان کیا یعنی پیغمبروں کو یقین ہو گیا کہ اُن کی تکذیب ہو گئی اب ایسی کہ جس کے بعد کسی کے ایمان لانے کا سوال نہیں۔

پھر کُذِبُوْا بغیر تشدید قرار دے کر اس کے معنی کہے ہیں:۔

ظنّ الامم انّ الرّسل اخلفوا ما وعدوا بہ من النّصر:

امتوں نے گمان کیا کہ پیغمبروں سے جو فتح وظفر کے وعدے ہوئے تھے غلط نکلے۔ ہماری تفاسیر بھی اس کے موافق ہیں ا؎

یعنی انّ قومھم ظنّوا انّ الرّسل کذبت فیھا اخبرت بہ (تبیان)

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

بلا شبہ ان کے واقعات میں سبق ہے صاحبانِ عقل کے لیے۔ وہ کوئی افسانہ نہیں ہے جسے گھڑ لیا گیا ہو بلکہ وہ تصدیق ہے اس کی جو پہلے موجود تھا اور ہر بات کی تشریح ہے اور ہدایت ہے اور رحمت ان کے لیے جو ایمان لائیں۔

سُوْرَةُ الرَّعْدِ

مکیّہ-----۴۱ آیات

عموماً اس کے سرنامہ پر مکیّہ ہی لکھا ہوتا ہے مگر جیسا کہ جناب شیخ الطائفہؒ نے تبیان میں تحریر فرمایا ہے، یہ متفق علیہ نہیں ہے، دوسرا ایک قول یہ ہے کہ اس میں سے بس ایک آیت مکی ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ--الخ باقی پورا سورہ مدنی ہے۔ اس سورہ کا نام یہ نام ''رعد'' کے تذکرہ کی وجہ سے ہوا ہے جس کا نام یعنی لفظ ''رعد'' اگرچہ ضمناً پہلے پارہ میں منافقین کی ایک تشبیہہ کے ذیل میں آیا ہے مگر اس سورہ میں رعد کا خاص طور پر اس کی ایک کیفیت کے اظہار کے لیے مستقل ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل امور کا بیان ہے:۔

سورۂ رعد کے خاص خاص مضامین:

۱---خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی کا پیدا نہ کرے:۔

۲---کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہے۔

۳---بقائے اصلح

۴---برائی کا مقابلہ بھلائی سے (عدم تشدد)

۵---یاد خدا سبب اطمینان دل

۶---لوح محفوظ اور لوح محو واثبات

۷---رسول کے گواہ دو: کتاب اور عالم کتاب وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے۔

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

الف۔لام۔میم۔را۔ یہ آیات ہیں کتاب کی اور جو اتارا گیا ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے مگر زیادہ تر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔

”کتاب سے مراد بظاہر قرآن ہی ہے اور اسی لیے تلك کا ترجمہ ہم نے ”یہ“ کے ساتھ کیا ہے جیسے سورہ بقرہ کے شروع میں ذلك الکتاب کا ترجمہ ”یہ کتاب“ اکثر کیا جاتا ہے مگر بعض لوگوں نے غالباً تلك کے اشارہ بعید کے لیے ہونے کی وجہ سے الکتاب سے انجیل مراد لی ہے، حالانکہ انجیل کا اس کے پہلے کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے ترجیح پہلے ہی قول کو ہے۔“[1]

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲

”اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر کسی اڑانوں کے جنہیں تم دیکھو، پھر وہ پورے اقتدار کے ساتھ عرش پر متمکن ہوا[2] اور سورج اور چاند کو پورے طور پر قابو میں رکھا کہ ہر ایک ایک مقررہ مدت تک رواں رہے۔ وہ انتظام کرتا ہے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ قدرت کی نشانیاں تشریح کے ساتھ پیش کرتا ہے، شاید تم اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین کرو۔“

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۴

”اور وہ وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور ہر طرح کے پھلوں سے اس میں دو دو قسمیں قرار دیں وہ ڈھانپتا ہے رات کو دن پر یقیناً نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں اور زمین میں مختلف طرح کے ٹکڑے پہلو بہ پہلو ہیں اور باغ ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں ایسے کہ ایک ہی جڑ سے کئی درخت نکلے ہیں اور کچھ ایسے نہیں ہیں[3] اور ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں اور ان میں بعض کو بعض پر ذائقہ میں ہم فوقیت دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو عقل سے کام لیں۔

---

[1]۔ الاول اصح (تبیان)

[2]۔ استولی بالاقتدار علیه و نفوذ السلطان (تبیان)

[3]۔ الصّنوان۔۔۔ ان یکون الاصل واحدا ثمّ ینشعب من الرؤس (تبیان)

وَاِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِىۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ؕ اُولٰٓٮِٕكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَاُولٰٓٮِٕكَ الۡاَغۡلٰلُ فِىۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَاُولٰٓٮِٕكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝۵

''اور اگر تعجب کرو تو قابل تعجب ان کا یہ کہنا ہے کہ کیا جب ہم خاک ہو جائیں گے تو ہم از سرنو پیدا ہوں گے؟ یہ وہ ہیں جنھوں نے کفر اختیار کیا اپنے پروردگار کے ساتھ اور یہ وہ ہیں کہ طوق ہوں گے ان کی گردنوں میں اور یہ لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ وَقَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلۡمِهِمۡ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۝۶

''اور وہ آپ سے بھلائی کے پہلے برائی کے لیے جلدی کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے خداوندی سزاؤں کے نمونے [۱] گزر چکے ہیں اور بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے لوگوں کو ان کے ظلم و تعدی کے باوجود اور بلاشبہ تمہارا پروردگار سخت سزا بھی دینے والا ہے۔''

''جلدی کرتے ہیں'' اس طرح کہ رسول کی خبروں کا جو عذاب کے متعلق ہوتی ہیں، انکار کرتے یا مذاق اڑاتے ہوئے اکثر یوں کہتے ہیں کہ پھر آخر یہ عذاب ہم پر آ ہی کیوں نہیں جاتا یا از خود کچھ صورتیں عذاب کی پیش کر کے کہتے ہیں کہ اگر ہماری بداعمالیاں اتنی ہی جتنی آپ کہتے ہیں تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر بجھوایئے اور کوئی دردناک عذاب ہم پر نازل کرایئے۔ [۲]

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ۝۷

''اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی ان کے پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اترتی! آپ تو بس عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوتا ہے۔''

آخری فقرہ ''وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ'' اس کی تشریح میں اختلاف ہے۔ ایک تصور یہ ہے کہ یہ الگ جملہ ہے جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے:۔

''اور ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے''۔۔۔۔شاہ ولی اللہ نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ ''و ہر قومی را رہ نمائی می باشد'' تفسیر جلالین میں ہے:

[۱] ۔ای عقوبات امثالھم من المکذّبین (جلالین)

[۲] ۔ کما قالوا: وامطر علینا من حجارۃ من السماء او أئتنا بعذاب الیم (تبیان)

ولکل قومه هادبی یدعوهم انی ربهم بما یعطعه من الأیات لا بما یفترحون:۔

ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے پیغمبر جو انہیں ان کے پروردگار کی طرف دعوت دیتا ہے ان نشانیوں کے ساتھ جو اسے عطا ہوتی ہیں، نہ کہ وہ جس کی وہ فرمائش کریں۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ قبل سے متعلق ہے یعنی آپ تو بس عذاب سے ڈرانے والے اور ہر قوم کے رہنما ہیں۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ اس کے مطابق ہے:

''تو ڈرانے والا ہے اور واسطے ہر قوم کے ہدایت کرنے والا۔''

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر پہلے قوم کے مطابق ہے اور اس کے لحاظ سے آیت میں یہ کہنے کے بعد کہ ''آپ عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔'' یہ کہا گیا ہے کہ ''ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد بھی ہر دور کے انسانوں کی رہنمائی کا خالق نے انتظام کیا ہے اور یہ رہنمائی کرنے والا آئمہ معصومینؑ ہیں۔[1]

اس کی تائید اہل سنت کی بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔

اَللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ كُلُّ اُنۡثٰى وَمَا تَغِيۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَمَا تَزۡدَادُ‌ؕ وَكُلُّ شَىۡءٍ عِنۡدَهٗ بِمِقۡدَارٍ‏ ﴿۸﴾ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡكَبِيۡرُ الۡمُتَعَالِ‏ ﴿۹﴾

''اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں لیے ہے کوئی عورت اور جو کمی ہوتی ہے پیٹ کے اندر اور جو زیادتی ہوتی ہے اور ہر چیز اس کے یہاں ایک مقررہ مقدار میں ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر تمام چیزوں کا جاننے والا بزرگ و بالا ہے۔''

پیٹ کے اندر کمی اور زیادتی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ خود بچہ کوئی تمام الخلقت پیدا ہوتا ہے اور کسی کے کوئی نقص ہوتا ہے[2] یہ سب علم الٰہی میں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے مدت حمل کی کمی وزیادتی مراد ہو[3] یعنی یہ بات کہ کون بچہ کتنے دن شکم مادر میں رہے گا، بس اللہ ہی کے علم میں ہوتی ہے اور کمی سے مراد قبل از وقت یعنی حمل ساقط ہونا بھی ہوسکتا ہے اور زیادتی یہ ہے کہ نومہینہ سے بھی زیادہ گزر جائے اور پھر بچہ پیدا ہو۔[4]

سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَمَنۡ جَهَرَ بِهٖ وَمَنۡ هُوَ مُسۡتَخۡفٍۢ بِالَّيۡلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ‏ ﴿۱۰﴾

---

[1] ۔عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ قال المنذر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ والهادی امیر المؤمنین وبعدہ الائمۃ (علی بن ابراهیم)
روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہؑ ان الهادی هو امام کل عصر معصوم یؤمن علیه الغلط و تعمد الباطل (تبیان)

[2] ۔آنچہ ناقص می کنند رحمہا وآنچہ زیادہ می گردانند (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ماتغیض تنقص الارحام من مدۃ الحمل وماتزداد منه (جلالین)

[4] ۔ماتفیض ای ماتسقط من قبل التمام و ماتزداد یعنی علی تسعۃ اشهر (علی بن ابراهیم)

یکساں ہے تم میں سے وہ جو چپکے چپکے باتیں کرے اور جو اونچی آواز سے بات کرے اور جو رات کے پردہ میں چھپا ہوا ور جو دن کو روانہ ہو۔

یعنی اللہ کو یکساں طور پر سب کا علم ہے۔[1]

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

"اس کے لیے پہرے دار ہیں اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے جو حکم خدا سے باری[2] باری اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ نہیں بدلتا اس حالت کو جو کسی قوم کی ہے جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کرے اور جب اللہ چاہے کسی قوم کے لیے برائی تو اس کا پلٹنا ممکن نہیں ہے اور نہیں ہے ان کے لیے اسے چھوڑ کر کوئی حامی و مددگار۔"

کسی قوم میں تبدیلی نہیں ہوتی بغیر اپنے نفوس کی تبدیلی کے

له کی ضمیر میں کافی اختلاف ہے کہ یہ خدا کی طرف راجع ہے یا رسولؐ کی طرف مگر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ آیت کی آیت میں جو تھا مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ "جو چپکے چپکے بات کرے اور جو اونچی آواز سے اور جو رات کے پردہ میں چھپا ہوا ور جو دن کی روانہ ہو" اسی کی طرف ضمیر ہے یعنی اللہ کا علم بھی اس پر حاوی ہے اور اس کی طرف کے فرشتے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔[3]

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَاۗءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

وہ، وہ ہے جو تمہیں بجلی چمکتی دکھلاتا ہے ڈرانے اور توقع پیدا کرنے کے لیے اور بوجھل گھٹائیں پیدا کرتا ہے اور بادل کی گرج تسبیح پڑھتی ہے اس کی تعریف کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اور وہ گرتی ہوئی بجلیاں روانہ کرتا ہے تو انہیں پہنچاتا ہے جس تک چاہتا ہے اور وہ لوگ تکرار کرتے ہیں اللہ کے بارے میں اور وہ سخت عذاب والا ہے۔"

---

[1]۔ انه يعلم على تصرف احواله (تبیان)

[2]۔ المعقّبات والمناويات التى يخلف على واحد منها صاحبه (تبیان)

[3]۔ فكانه قال للانسان معقبات وهو الاقوىٰ (تبیان)

”ڈرانے اور توقع پیدا کرنے کے لیے“۔۔۔ یہ دونوں کیفیات اس طرح بھی ڈر لگتا ہے کڑک اور چمک سے اور توقع ہوتی ہے اور باران رحمت کی، یوں بھی جنہیں مثلاً سفر درپیش ہے، انہیں بارش کا ڈر ہوتا ہے اور جو اطمینان سے کسی منزل پر ہیں یا زراعت کیے ہوئے ہیں، انہیں بارش بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے اور اس کا آسرا لگائے رہتے ہیں۔[1]

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

”اس کے لیے سچائی والی پکار اور اسے چھوڑ کر جنہیں وہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی صدا پر ذرا بھی لبیک نہیں کہتے مگر اس طرح جیسے کوئی دونوں ہاتھ پھیلائے ہو پانی کی طرف کہ وہ پہنچ جائے اس کے منہ تک حالانکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں ہے اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر لا حاصل۔“[2]

”اسی کے لیے ہے سچی پکار“ بعد کے جملہ کو دیکھتے ہوئے زیادہ قرین قیاس مفہوم اس کا یہ ہے کہ پکارے جانے کا حق اسی کو ہے[3] مگر ایک دوسرے معنی اس کے یہ بھی سمجھ میں آتے ہیں کہ ”اس کی طرف سے ہے سچائی کی طرف دعوت یعنی توحید کا پیغام بعض مفسرین نے اس کے لحاظ سے تفسیر کی ہے۔[4]

اس کے غیر یعنی اصنام کی پرستش اور ان سے التجاء جو کرتے ہیں، اس کی مثال جو دی گئی ہے وہ لا حاصل ہونے میں ہے کہ کوئی کنویں پر جا کے اور فصیل پر کھڑے ہو کے بس ہاتھ پھیلا دے کہ آ اے پانی میری پیاس بجھا دے تو ظاہر ہے کہ وہ پانی کہاں اس تک آ سکتا ہے۔ وہ تو خود اس کا محتاج ہے کہ کوئی اس کھینچے، تب وہ کہیں پہنچے بس یہی صورت ان لوگوں کے بتوں سے دہائی دینے کی ہے کہ وہ بت کہاں ان کی حاجت روائی کر سکتے ہیں؟[5] ہوسکتا ہے کہ یہ مثال ”نقش برآب“ کی طرح عرب میں ”سعی لا حاصل“ کے لیے عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔[6]

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة

---

[1] ۔قیل فی معنی قوله: خوفًا وطمعا قولان۔۔۔ خوفا من الصواعق التی تکون مع البرق و طمعا فی الغیث الذی یزیل الجدب۔۔۔ وخوفا للمسافرین من اذاه وطمعا للمقیم فی الرزق به (تبیان)

[2] ۔مگر در بے فاعدگی (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔یعنی اورا سجدہ کنند بجناب اونیاز کنند و مدعا طلبند و او اجابت فرماید (فتح الرحمن)

[4] ۔دعوة الحق ای کلمة وھی لا الہ الا اللہ (جلالین)

[5] ۔کباسط کفیه الی المآء علی سفیر البعیر یدعوه البیلغ فاه فارتفاعه من البیر الیه (جلالین)

[6] ۔العرب تضربه مثلا لمن سعی فیما لا یدرکه کالقابض علی المآء (تبیان)

''اور اللہ کے لیے سجدہ میں ہیں وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خوشی یا ناخوشی اور ان کے سائے [1] صبح اور شام۔''

کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز

ان آیات میں کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہونے کا ذکر ہے۔

قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلۡ اَفَاتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ لَا يَمۡلِكُوۡنَ لِاَنۡفُسِهِمۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ ۙ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ ۚ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

''کہیئے کہ کون مالک ہے آسمانوں اور زمین کا؟ کہہ دیجئے کہ اللہ کہیئے کہ کیا پھر تم نے اسے چھوڑ کر اور ایسے حوالی موالی بنا لیے ہیں جو خود اپنے لیے نہ نفع پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ نقصان پر؟ کہیئے کہ کیا یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا؟ یا یہ کہ کیا یکساں ہیں اندھیرے اور روشنی یا یہ کہ انہوں نے اللہ کے لیے ایسے شریک بنائے جنہوں نے اس کے خلق کرنے کی طرح خلق کیا تو یہ خلقت ان پر مشتبہ ہو گئی؟ کہیئے کہ اللہ ہر چیز کا خلق کرنے والا ہے اور وہ ایک اکیلا غالب ہونے والا ہے۔''

''کیا یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا'' یعنی جو بصیرت کی روشنی رکھتا ہے اور وہ مومن ہے اور جو نور بصیرت سے عاری ہے وہ کافر ہے اسی طرح ''اندھیرا'' گمراہی اور ''روشنی ہدایت۔ [2]

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ۚ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۱۷﴾

''اس نے آسمان سے پانی اتارا تو ندی نالے بہے اپنی مناسب مقدار کے مطابق تو بہتے ہوئے پانی نے اٹھا لیا پھین جو اس کے اوپر آ جاتا ہے اور اس سے کہ جسے آگ میں رکھ کر دہکاتے ہیں زیور یا اور کوئی چیز بنانے کے لیے

---

[1] ۔وسجدہ می کنند سایہ ہائے ایشاں (شاہ ولی اللہ) اور پرچھائیاں ان کی (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔الاعمیٰ والبصیر یعنی المؤمن والکافر۔۔۔اما الظلمات فالکفر و اما النور فھو الایمان (علی بن ابراھیم)

ایسا ہی پھین بلند ہوتا ہے اس طرح اللہ مثال دیتا ہے حق اور باطل کی تو جو پھین ہوتا ہے، وہ نیست و نابود ہو جاتا ہے اور وہ جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے تو زمین میں برقرار رہتا ہے۔ اس طرح اللہ مثالیں پیش کرتا ہے۔''

اس مثال کی تشریح شاہ ولی اللہ یوں کرتے ہیں:۔

بقائے اصلح

یعنی لا بداست کہ در ہر جنس خیر و شر باشد ہمچنیں لا بداست کہ در آدمیاں نیکو کاران و بدکاران باشند لیکن نیکو کاران را مستقر می سازد و کار ایشاں را پیش می برد و بدکاراں ہلاک می کند (فتح الرحمن)

یعنی لازم ہے کہ ہر جنس میں اچھی اور بری دو قسمیں ہوں اسی طرح خود انسانوں میں اچھے اعمال والے اور برے اعمال والے ہوں مگر اللہ نیکو کار افراد کو باقی رکھتا ہے اور اُن کے کارنامہ کو ترقی دیتا ہے اور برے اعمال والوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

مگر ان کے فرزند شاہ عبدالقادر اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''یعنی آسمان سے دین حق اترتا ہے تو ہر ایک اپنی استعداد کے موافق لیتا ہے، پھر حق اور باطل ٹھہرتا ہے تو میل ابھرتا ہے جیسے مینہ کا پانی زمین سے مل کر یا روپے تانبے کو دہکا کر میل ابھرتا ہے تو آخر جھاگ کو بنیاد نہیں اور کام کی چیز کی بنیاد ہے۔ یہ حق اور باطل ٹھہرنا دنیا کی لڑائی مراد ہے۔ آخر حق غالب ہے یا ہر ایک کے دل میں حق و باطل ٹھہرتا ہے۔ پھر حق اس باطل کو مٹا کر صاف حق رہتا ہے۔'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

كذٰلك الباطل يضمحل وينمحق وان على الحق بعض الاوقات و الحق ثابت باق

یونہی باطل کمزور ہو جاتا ہے اور بالآخر مٹ جاتا ہے چاہے بعض اوقات حق پر غالب بھی آجائے اور حق برقرار رہنے والی چیز ہے۔

ہماری تفاسیر بھی اس سے متفق ہیں چنانچہ جناب شیخ الطائفہ لکھتے ہیں:۔

فالحق ثابت.... والباطل.... يذهب لا منفعة فيه بعد ان يرى له حركة واضطراب

تو حق امر برقرار ہے اور باطل ختم ہونے والا ہے اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے جب کہ قبل میں وہ بہت متحرک نظر آتا ہے۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۚ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿18﴾

''ان کے لیے جو اپنے پروردگار کی دعوت پر لبیک کہیں اچھا نتیجہ ہے اور جنہوں نے اس کی دعوت پر لبیک نہیں کہی، اگر ان کے لیے جو کچھ روئے زمین پر ہے، وہ سب ہو یا اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تو اسے وہ اپنے معاوضہ میں دے دیں ان کے لیے حساب کی سختی ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔''

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا
الْاَلْبَابِ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ
يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ﴿۲۱﴾
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ
عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى
الدَّارِ ﴿۲۴﴾

تو کیا وہ جو جانتا ہو کہ جو آپ کے پاس آپ کے پروردگار کے پاس سے آیا ہے حق ہے وہ مثل اس کے ہے کہ جو اندھا ہو؟ نصیحت کا اثر تو بس وہ لیتے ہیں جو صاحبانِ عقل ہوں۔ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور پیمان شکنی نہیں کرتے اور جو ملاتے ہیں ان رشتوں کو جن کے ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور حساب کی سختی کا خوف رکھتے ہیں اور جنہوں نے صبر وتحمل سے کام لیا اپنے پروردگار کی خوشنودی کی طلب میں اور نماز کی پابندی کی اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس سے مخفی اور ظاہر بظاہر خیرات کی اور جو بھلائی کے ذریعے سے برائی کو دور کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لیے اس عالم کا اچھا انجام ہے، جاودانی زندگی والی جنتیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادا اور بیویوں اور بچوں میں سے جو اس لائق ہوں اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازہ سے داخل ہو رہے ہوں گے۔ سلام ہو تم پر اس بنا پر کہ تم نے صبر کیا تو کیا کہنا انجام کا اس دورِ آخرت کے۔"

دیکھ لیجیے یہاں بھی فرشتے سلام علیکم کہتے ہیں، السلام علیکم نہیں۔

ان آیات میں بُرائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴿۲۵﴾

"اور وہ جو توڑتے ہیں اللہ کا عہد اس کی مضبوطی کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے ملائے جانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور روئے زمین پر خرابیاں کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور اس گھر کی برائی ہے۔"

عہد الٰہی جس کا دونوں طرح کا ذکر ہے، قبل کی آیت میں تعریف کے سلسلہ میں ینقضون المیثاق اور اس آیت بصورت مذمت ینقضون عھد اللہ اس میں وہ عہد بھی داخل ہے جو بتقاضائے فطرت اور بحکم ضمیر ہر انسان کے ذمہ واجب الادا ہے اور وہ بھی پیمان جو انبیاء و مرسلین کے ذریعہ سے لیا گیا ہے اور اس میں وہ عہد و پیمان بھی داخل ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے کیے جاتے ہیں۔[1]

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

"اللہ وسعت دیتا ہے زرق میں جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگی بھی کرتا ہے اور وہ دنیوی زندگی سے خوش ہیں اور نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر ذراسی ناپائدار چیز۔"[2]

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتری ان پر کوئی نشانی ان کے پروردگار کی طرف سے کہئے؟ کہ اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف ہدایت کرتا ہے اس کی جو دل سے متوجہ ہو۔[3] جو ایمان لائیں[4] اور ان کے دل یاد الٰہی سے سکون پائیں۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔"

یاد خدا اسبابِ اطمینانِ دل

ان آیات میں یاد خدا اسبابِ اطمینانِ دل کا ذکر ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

وہ جنھوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کئے ان کے لیے خوشحالی ہے اور اچھا انجام۔"

"طوبیٰ" کے معنی میں یوں تو بہت سے قول ہیں[5] مگر زیادہ تعداد میں وہ ایسے ہیں جیسے ایک ہی چیز کی متعدد تعبیریں ہوں اور ان سب

---

[1] ۔العهد الذی جعله فی عقوله العباد ------- و قد یکون ایضا علی العهد الّذی علیه النّبی ﷺ و فی الأیة دلالة علی وجوب الوفاء بالعهد الّتی تنعقد بین الخلق.(تبیان)

[2] ۔قلیل ذاهب(تبیان)

[3] ۔الرجع الیه(جلالین)موضع الذین نصب لانه من صفة من اناب(تبیان)

[4] ۔قیل فی معناه عشرة اقوال(تبیان)

[5] ۔انما قال "بالرحمٰن" دون "الله" لانّ اهل الجاهلیة من قریش قالوا الله نعرفه والرّحمٰن لا نعرفه(تبیان)

کا نتیجہ وہ ہے جس کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے یعنی ''خوشحالی''

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝۳۰

''اسی طرح آپ کو ہم نے بھیجا ایک ایسی قوم میں جس کے پہلے بہت قومیں گزر چکی ہیں تا کہ آپ ان کے سامنے تلاوت کریں اس کی جو ہم نے بطور وحی آپ پر اتارا ہے اور وہ خدائے رحمٰن کا انکار کرتے ہیں کہیے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی خدا نہیں سوا اس کے اس پر میرا بھروسا ہے اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔''

رحمٰن کے انکار کا مطلب بظاہر وہی ہے جو دوسری جگہ قرآن مجید میں زیادہ صاف طور پر مذکور ہے کہ:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا

اور جب ان سے کہا جائے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا جس چیز کو بھی آپ کہیے ہم سجدہ کرنے لگیں؟ اور اس سے ان کی وحشت اور بڑھتی ہے۔ (فرقان۔۶۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی خدائی کا اقرار کرتے تھے مگر رحمٰن کے نام سے اسے یاد کرنا پسند نہ کرتے تھے۔[۱]

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ
لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ
جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا
مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۳۱

''اور کاش ہوتا کوئی ایسا قرآن جس سے پہاڑ حرکت میں لے آئے جاتے یا زمین اس سے ٹکڑے ٹکڑے کی جاتی یا اس کے ساتھ مردوں سے باتیں کی جاتیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تمام کام تو کیا ایمان لانے والے اس بنا پر ناامید تو نہیں ہوتے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت کر دیتا اور برابر کافروں پر ان کے اعمال کی سزا میں کوئی نہ کوئی آفت آتی رہے گی یا ان کے گھروں کے آس پاس آئے گی یہاں تک کہ آئے اللہ کا وعدہ یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

---

[۱]۔ انما قال "بالرحمٰن" دون "الله" لان اهل الجاهلية من قريش قالوا الله نعرفه والرّحمٰن لا نعرفه (تبیان)

''مسلمان چاہتے ہوں گے کہ ایک نشانی بڑی سی آوے تا کہ کافر مسلمان ہوجائیں۔ سو فرمایا کہ اگر کسی قرآن سے کام ہوتے ہوئے تو البتہ اس سے پہلے ہوتے۔'' (موضح القرآن)

اس پس منظر میں میرے نزدیک زیادہ مناسب یہی ہے کہ شروع میں جو ''لو'' ہے وہ ''لیت'' کے معنی میں ہو، اس کے لیے میں نے ترجمہ ''کاش'' کے لفظ کے ساتھ کیا ہے جس کی نظیریں قرآن مجید میں بہت جگہ موجود ہیں۔ جیسا کہ شاہ صاحب کی مذکورہ بالا تشریح سے بھی ظاہر ہے، یہ لوگ اسے ''اگر'' کے معنی میں لیتے ہیں تو اس ''اگر'' والی شرط کے جواب میں جو محذوف مانا جائے گا[١] تعبیریں مختلف ہوجاتی ہیں جیسے شاہ صاحب مذکور نے ''اگر'' کے جواب میں لکھا ہے ''تو البتہ اس سے پہلے ہوتے یا یوں کہ کوئی کتاب ہوتی جس کی خاصیت یہ ہوتی کہ اس سے یہ باتیں ہوں تو اس قرآن سے بھی یہ سب باتیں ظہور پذیر ہوتیں یا یہ کہ اگر کوئی کتاب دنیا میں اس طرح کی ہوتی تو بس یہی قرآن ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کتاب ایسی نہیں ہوسکتی تھی۔[٢]

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

''اور آپ سے پہلے بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے ڈھیل دی کافروں کو پھر اُنہیں گرفت میں لے لیا تو کیسا تھا میرا عذاب۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

''تو کیا وہ ذات جو ہر متنفس پر حاضر و ناظر ہے اس کے اعمال کے بارے میں (ان کو یونہی چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں) اور انہوں نے اللہ کے لیے بہت سے شریک بنا لیے۔ کہئے کہ نام لو ان کا یا تم اسے بتلاتے ہو ایسی چیز جس کا روئے زمین پر اسے علم نہیں ہے یا بے سمجھے رواروی میں بات کرتے ہو؟ بلکہ کافروں کی نظر میں ان کی چالیں بڑی خوب صورت معلوم ہوتی ہیں اور وہ سیدھے راستے سے ہٹ گئے ہیں اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو کوئی اس کا ہدایت کرنے والا نہیں ہے۔ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اور زیادہ پر

---

[١]۔ لم يجئ جواب لو لدلالة الكلام عليه (تبيان)

[٢]۔ لو كان شئى من القرآن كذلك لكان هذا (على بن ابراهيم)

مشقت ہے اور اللہ سے بچانے والا ان کا کوئی نہیں ہے۔"

شروع کے فقرہ "کیا وہ ذات" کے بعد کے خبر الفاظ میں بلکہ سننے والے کی سمجھ میں انداز کلام سے آتا ہے کہ کیا وہ کسی دوسرے کے برابر ہے؟[1]

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

"اس بہشت کی جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ ہوا ہے، یہ صفت ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، وہاں کی غذائیں ہمیشہ رہنے والی ہیں اور چھاؤں بھی۔ یہ انجام ہے ان کا جو پرہیزگار رہوں اور جو کافر ہیں، ان کا انجام آتش دوزخ ہے۔

چھاؤں اس لیے ہمیشہ ہے کہ وہاں آفتاب ہے نہیں جس کی دھوپ سایہ کو ختم کرے۔[2]

وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ یُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَیْهِ اَدْعُوْا وَاِلَیْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

"اور جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے، وہ خوش ہوتے ہیں اس سے جو آپ پر اتارا گیا ہے اور ان جماعتوں میں بعض ایسے ہیں جو اس میں سے کچھ پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہئے کہ میں تو اس پر مامور ہوں کہ اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شرک نہ کروں، اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔"

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

"اور اسی طرح اتارا ہے ہم نے اس کو عربی زبان کا حکم نامہ[3] اور اگر آپ ان کی خواہشات کی پیروی کریں گے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آگیا تو آپ کا اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی مددگار ہوسکتا ہے اور نہ بچانے والا۔"

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّیَّةً ؕ وَمَا كَانَ

---

[1] ۔ کمن لیس بهذه الصفة وحذف الخبر دلالة الكلام عليه (تبیان) کمن لیس کذلك من الاصنام (جلالین)
[2] ۔ ظلها دائم لا تنسخه شمس لعدمها فيه (جلالین)
[3] ۔ بلغة العرب تحكم به بين الناس (جلالین)

لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

''اور ہم نے بھیجے ہیں بہت سے پیغمبر آپ کے پہلے اور قرار دیئے ہم نے ان کے لیے بیوی بچے، اور کسی پیغمبر کے لیے یہ نہیں ممکن کہ وہ کوئی معجزہ پیش کرے مگر اللہ کے حکم سے ہر مدت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔''

معجزہ کا حکم الٰہی پر انحصار

چونکہ عیسائیوں میں رہبانیت معیار کمال روحانیت قرار پا گئی تھی، اس لیے وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تاہلی زندگی کو خلاف شان رسالت سمجھنے لگے لہٰذا یہاں گزشتہ انبیاء کا حوالہ دیا گیا ہے کہ سابق میں بس مستثنیات ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام جن کے بیوی بچے نہ تھے ورنہ دوسرے انبیاء برابر ایسے ہوتے رہے ہیں جن کے بیوی بچے سب تھے تو اسے تم خلاف شان نبوت کیوں کر قرار دے سکتے ہو۔[1]

اس کے ساتھ شاید یہ کہا گیا ہو کہ آپ وہی معجزے کیوں نہیں دکھاتے جو حضرت عیسیٰؑ دکھلاتے تھے یعنی کور مادرزاد کو بینا بنانا، اکمہ و ابرص کو شفا دینا اور مردوں کو زندہ کرنا تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہر نبی کو معجزے خالق کی طرف سے بنظر حکمت اس دور کے تقاضوں کے لحاظ سے دیے گئے یہی عیسیٰؑ کے زمانہ میں طب کا زور تھا، اس لیے ویسے معجزے عطا ہوئے اور اس وقت فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا اس لیے بطور معجزہ عمومی قرآن عطا ہوا۔

یوں آپ اور آپ کے اوصیاء علیہم السلام کے ہاتھوں کبھی بوقت ضرورت وہ معجزے بھی ظاہر ہو گئے جیسے بیمار کا صحت یاب ہونا، کور کا بینا ہونا اور مردہ کا زندہ ہونا جس کے واقعات کتب سیر و احادیث موجود ہیں مگر یہ چیزیں ان کے یہاں اہمیت کے ساتھ بطور معجزہ عمومی پیش نہیں ہوتیں کہ ان پر تحدی کی جاتی اور انہیں ثبوت رسالت کی دلیل قرار دیا جاتا۔ ویسا معجزہ بس قرآن تھا جس پر طرح طرح سے منکرین کو دعوت مقابلہ دی گئی اور ان کی لاجوابی نے اس کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

''اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور برقرار رکھتا ہے اور اس کے پاس اصل نوشتہ ہے۔''

محو و اثبات بداء

یہ آیت بداء سے متعلق ہے۔ بداء کے معنی یہ ہیں کہ بعض تقدیرات الٰہیہ مشروط طور پر ہیں لہٰذا اگر وہ شرائط پورے ہوئے تو تقدیر اس طرح رہتی ہے اور اگر شرائط پورے نہ ہوئے تو تقدیر بدل جاتی ہے لیکن علم الٰہی میں مختتم نتیجہ پہلے سے ہوتا ہے کہ بالآخر ہونے والا کیا ہے؟ تقدیروں کی یہ تبدیلی محو و اثبات کہلاتی ہے اور یہ مختتم نتیجہ کا علم وہ ہے جسے کہا ہے کہ ''اس کے پاس اصل نوشتہ ہے۔'' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ تقدیروں کی تبدیلی بالکل ویسی ہے جیسے مصالح کے لحاظ سے احکام شریعت کی تبدیلی جس کا نام نسخ ہے مگر اہل سنت چونکہ نسخ کے قائل ہیں اور بداء کے قائل نہیں لہٰذا اس آیت کی تفسیر میں جس جس طرح الجھے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

---

[1] ۔ لانهم كانوا انكروا تزويج النبي بالنساء فبين الله تعالى ان لانبياء وقد كان لهم ازواجا وذرية (تبيان)

شاہ ولی اللہ باوجود یہ کہ اس کے قبل کی آیت میں لکل اجل کتاب کا یہ ترجمہ کر چکے ہیں کہ ''ہر قضاء موت را نامہ است'' اور حاشیہ پر اس کی تشریح یوں کر چکے ہیں کہ:۔

چوں قضائے الٰہی بوجہی متحقق شود آن را در عالم ملکوت ثبت کنند

جب خدائی فیصلہ کسی صورت پر ہو جاتا ہے تو اس کو عالم ملکوت میں تحریر کر دیا جاتا ہے۔(فتح الرحمن)

جس سے ظاہر ہے کہ بعض وقت قضائے موقت ہوتی ہے تو وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس میں تبدیلی ہونا چاہیے اسی کا نام بدا ہوگا۔

اب اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:۔

نابود می ساز د خدا ہرچه می خواہد و ثابت کند ہرچه خواہد و نزدیک اوست ام الکتاب یعنی لوح محفوظ

نیست و نابود کر دیتا ہے خدا جو چاہتا ہے اور برقرار کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب یعنی لوح محفوظ ہے۔

حاشیہ پر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

مترجم گوید صورت حادثه در عالم ملکوت خلق می فرماید بعد از اں اگر خواہد محو کند و اگر خواہد ثابت وارد و شاید که معنی چنیں باشد ہر زمانی را شریعتی است نسخ می کند خدا تعالی آنچه می خواہد و ثابت می گزارد آنچه خواہد نزدیک اوست لوح محفوظ.(فتح الرحمٰن)

میں کہتا ہوں کہ واقعہ کی صورت خداوند عالم ملکوت میں خلق فرما دیتا ہے اور اس کے بعد اگر چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور اگر چاہتا ہے تو قائم رہنے دیتا ہے اور شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ہر زمانہ کے لیے ایک شریعت ہے۔ تو منسوخ کر دیتا ہے جو چاہتا ہے۔

دیکھ رہے ہیں آپ شاہ صاحب کس طرح کترا رہے ہیں پہلے جو تشریح کی، اس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وقوع میں آئے ہوئے حادثہ کی صورت میں خلق فرمائی جاتی ہے تو آخر اس کے خلق کرنے کا کیا مقصد ہوتا ہے، کیا بعد میں جو واقعہ ہوگا، اس واقعہ کی صورت میں پہلے سے خلق ہوتی ہے جیسا افلاطون کا ''مثل افلاطونیہ'' والا تصور ہے کہ تمام موجودات وواقعات کی صورتیں مادہ سے الگ ازل سے موجود ہیں مگر پھر یہ مٹتی کیوں ہیں؟ جب کہ وہ واقعہ بعد میں ہونے والا ہے تو ان کا مٹنا خلاف واقعہ ہوگا اور اگر ان کے مٹنے کے بعد وہ واقعہ رونما نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں تبدیلی ہوتی ہے مگر اس کے بعد انہوں نے ''شاید'' کہہ کر اسے نسخ احکام سے متعلق قرار دینا چاہا ہے جو متفق علیہ حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اس صورت میں وہ صورتیں حوادث کی خلق ہونے والی بات کی ہوئی اور نسخ احکام سے پھر اس جز کا کیا لگاؤ ہے کہ لوح محفوظ اللہ کے پاس موجود ہے۔ پھر جب کہ اس کے پہلے لکل اجل کتاب کا تعلق ''قضائے موقت'' سے تھا تو اس کے بعد والے جملہ کو آپ قضائے تکوینی سے ہٹا کر حکم تشریعی سے متعلق کیوں کر رہے ہیں؟

شاہ عبدالقادر بہت حد تک حقیقت کے قریب آ گئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے۔ بعضے اسباب ظاہر ہیں، بعض چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ ہے۔ جب اللہ چاہے اس کی تاثیر انداز سے کم زیادہ کر دے، جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے، وہ ہرگز نہیں بدلتا، انداز ے کو تقدیر کہتے ہیں۔ یہ دو تقدیریں ہیں، ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی۔''(موضح القرآن)

اس پہلے قسم کی تقدیر کے بدلنے ہی کا نام بدا ہے اور شاہ صاحب کے بیان سے ظاہر ہو گیا ہے کہ اس کی تبدیلی علم الٰہی میں نقص کی مستلزم نہیں ہے لہٰذا بدا پر یہ اعتراض غلط ہے کہ وہ اللہ کی طرف نسبت جہل کا مقتضی ہے۔

جلالین کو بھی مجمل اور مبہم الفاظ میں سہی، اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔لکل اجل کتاب کی اس طرح تشریح کرنے کے بعد کہ

لکل اجل مدۃ کتاب مکتوب فیه تحدیدہ

ہر اجل یعنی مدت کے لیے ایک نوشتہ ہے تحریر جس میں اس کی حد بندی ہے

اب یوں تشریح کرتے ہیں کہ:۔

یمحوا اللہ مایشآء ویثبت فیه مایشاء من الاحکام وغیرھا وعندہ ام الکتاب اصله الذی لا یفیر منه شی و ھوما کتبه فی الازل

اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے اس میں احکام وغیرہ اور اس کے پاس ام الکتاب ہے یعنی اصل نوشتہ جس میں کوئی چیز بدلتی نہیں اور وہ وہ ہے جسے اس نے ازل میں لکھا ہے۔

غرض یہ آیت بداء کے بارے میں اتنی صاف ہے کہ انکار بداء کرنے والوں کو یہاں کچھ بن نہیں پڑتا۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

”اور اگر ہم آپ کو آنکھوں سے دکھلا دیں کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ وعید کر رہے ہیں یا آپ کو ہم دنیا سے اٹھا لیں، بہر حال آپ پر تو بس پہنچا دینا ہے اور حساب کتاب بس ہمارے اوپر ہے۔“

”وعدہ وعید“ سے مراد یہاں وہ عذاب کی خبریں ہیں جو ان کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں دی جا رہی ہیں۔ [۱]

چونکہ گزشتہ انبیاء اللہ سے اکثر یہ خواہش کرتے رہے تھے کہ ان کی نافرمان قوم پر ان کی آنکھوں سامنے عذاب آ جائے، اس لیے حضرت پیغمبرؐ سے کہا گیا ہے کہ عذاب ہم کب نازل کریں گے؟ یہ ہم سے متعلق چیز ہے۔آپ کو اس سے بحث نہیں ہونا چاہیے [۲] آپ تو بس اپنا کام کرتے رہیے جو تبلیغ کرنا اور دعوت حق دیتے رہنا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

---

[۱]۔بعض الذی نعد الکفار من العقوبۃ علی کفرھم (تبیان)

[۲]۔فلا تنظر کو نه علی ذلك بان یکون فی ایامك (تبیان)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں گھٹاتے ہوئے زمین کو اس کے اطراف و جوانب سے اور اللہ فیصلہ کرتا ہے اس کے حکم کو ٹالنے والا کوئی نہیں اور وہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔''

شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ میں ''الارض'' کے معنی ''زمین'' کے بجائے قرار دیے ہیں کہ ''اس سرزمین کی طرف رخ کرتے ہیں [۱] اوراب اطراف وجوانب سے کم کرنے کی تشریح یوں کرتے ہیں:۔

''یعنی روز بروز شوکت اسلام بزمین عرب منتشر می شود ودار الحراب ناقص می گردد از اطراف آں عامه مفسرین ایں آیت رامد نیه دانندو نزدیک مترجم لازم نیست کو مدنی باشد و مراد از نقصان دار الحرب اسلام و غفار و جہینه و قبائل یمن است پیش از ہجرت (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ روز بروز اسلام کی شان وشوکت عرب کی زمین میں پھیلتی جا رہی ہے اور دار الحراب گھٹتا جا رہا ہے اپنے اطراف و جوانب سے۔ عام مفسرین اس آیت کو مدینہ نازل شدہ مانتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ مدینہ کی نازل شدہ ہو اور دار الحرب اسلام کی کمی سے (مراد قبائل اسلم وغفار وجہنیہ اور ہجرت سے قبل قبائل یمن مراد ہیں۔

اس کے قریب قریب شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:۔

''ہم چلے آتے ہیں زمین پر گھٹاتے کفر کو یعنی اسلام پھیلتا جاتا ہے عرب کے ملک میں اور کفر گھٹتا ہے۔'' (موضح القرآن)

جلالین کا مطلب بھی یہی ہے:

اولم یروا اھل مکه انا ناتی الارض نقصدا ارضھم نقصھا اطرافھا بالفتح علی النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم

کیا نہیں دیکھا انہوں نے یعنی اہل مکہ نے کہ ہم آتے ہیں زمین کی طرف یعنی ان کی سرزمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اسے گھٹاتے جاتے ہیں اس کے اطراف وجوانب سے رسولؐ کو کامیاب بنا کر۔

مگر خود الفاظ آیت اس تشریح کو بلا تکلف ذہن میں نہیں لائے۔ الارض کے معنی ''دار الحرب'' کس طرح ہیں؟ پھر کفر کا گھٹانا زمین کا گھٹانا کیوں کر ہے؟ وہ تو اس سرزمین کو ناپاک کرنا ہے، زندگی بخشنا ہے۔

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر ہے جو غالباً معصوم سے مروی ہے کہ زمین کے اطراف کو گھٹانے سے مراد صاحبان علم کی دنیا سے رحلت ہے [۲] یہ تاویلی مفہوم تو ہوسکتا ہے مگر نفس الفاظ سے سمجھ میں آنے والے معنی یہ بھی نہیں ہیں۔

وَقَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلِلّٰهِ الۡمَكۡرُ جَمِيۡعًا‌ ؕ يَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ‌ ؕ وَسَيَعۡلَمُ الۡكُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَى الدَّارِ ۝۴۲

---

[۱] قصد می کنیم بایں سرزمین (شاہ ولی اللہ)

[۲] بموت علماءھا (علی بن ابراھیم)

”اور ترکیبیں کر چکے ہیں وہ لوگ جو ان کے پہلے تھے تو سب ترکیبیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے اسے جو کرتا ہے ہر متنفس اور بہت جلد کافروں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم کا انجام کس کے حق میں ہے۔“

سب ترکیبیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں“ یعنی وہ ان کی ترکیبوں کے توڑ پر بھی قادر ہے اور ان ترکیبوں کی سزا بھی دینا اسی کے ہاتھ میں ہے [1] اور وہ ترکیبیں کتنی ہی خفیہ ہوں، اس کے علم کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتیں جسے بعد کا فقرہ بتاتا ہے کہ ”وہ جانتا ہے اسے جو کرتا ہے ہر متنفس۔“

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿٤٣﴾

”اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ تم رسول نہیں ہو، کہئے کہ اللہ گواہ ہونے کے لیے کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔“

رسولؐ کی حقانیت کے دو گواہ، کتاب اور عالم کتاب

مفسرین اہل سنت ”علم کتاب“ رکھنے والے سے مراد علمائے یہود ونصاریٰ یا ان میں سے نو مسلموں کو لیتے ہیں [2] مگر ہمارے یہاں کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے راسخین فی العلم یعنی معصومین علیہم السلام مراد ہیں جو کتاب الٰہی کے حقیقی عالم ہیں [3] اور ظاہر ہے کہ رسولؐ کے بعد ان کی فرد اوّل واکمل حضرت علی بن ابی طالبؑ کی ذات تھی۔ [4]

---

[1] معناہ اللہ جزاء مکرھم (تبیان)

[2] ومن عندہ علم الکتاب من ھو یعنی الیھود والنصاری (جلالین)

[3] قال ابو جعفر و ابو عبداللہ ھم ال محمد لانھم الذین عندھم علم الکتاب بجملۃ لا یشذ شئی من ذلک (تبیان)

[4] عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال: الذی عندہ علم الکتاب ھو امیر المومنین (علی بن ابراھیم)

سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ

مکیّہ-----۵۲ آیات

سورہ کا یہ نام ویسا ہی ہے جیسا سورہ ہود کا نام ہے، جس کی وجہ تسمیہ میں کوئی اختصاص کا پہلو نمایاں نہیں ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں، اس سورہ میں بھی آپ کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ خاص خاص مضامین اس سورہ کے حسب ذیل ہیں:-

سورۂ ابراہیم کے خاص خاص مضامین:

۱-----ہر قوم میں رسول اس کی زبان بولنے والا آیا ہے۔

۲-----اللہ کے دنوں کی یاد قائم رکھنے کا حکم

۳-----اچھے اور برے کلمات کی مثال

۴-----حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مناجات اور اپنی اولاد کے لیے بت پرستی سے الگ رہنے کی عرض داشت

۵-----ذریت ابراہیمی کے اندر ہر دور میں سچے مسلمانوں کے وجود کی ضمانت۔

۶-----حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت جس سے ظاہر ہے کہ آذر جس سے بنص قرآن انہوں نے برأت کر لی تھی، ان کا والد نہ تھا۔

۷-----قیامت میں آسمان اور زمین کی تبدیلی---وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ
رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ

الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ③

''الف۔لام۔را۔یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ پر اتاری ہے تا کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف نکالیں ان کے پروردگار کے حکم سے، اس عزت والے قابل تعریف اللہ کے راستے کی طرف۔جس کا وہ سب ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وائے ہو کافروں کے لیے سخت عذاب ہے۔جو ترجیح دیتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت پر اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اسے ٹیڑھا بنانے کے خواہاں ہیں یہ لوگ سخت گمراہی میں ہیں''۔

آخری آیت میں جو یصدون کا لفظ ہے، یہ کلام عرب اور نیز قرآن مجید میں وہ معنی میں مستعمل ہے۔ایک لازم ''روگردانی کرتے ہیں'' اور دوسرے متعدی ''روکتے ہیں''

بعض جگہ مفعول مذکور ہے تو دوسرے معنی تعین کے ساتھ قطعی ہو گئے ہیں مگر یہاں مفعول مذکور نہیں ہے لہٰذا یہاں دونوں احتمال ہیں ا ہمارے ذہن میں اس کے بعد کے فقرہ کی مناسبت سے متعدی معنی رجحان رکھتے ہیں، اس لیے ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

''اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی پیغمبر مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ تا کہ وہ ان کے لیے صاف صاف بیان کرے تو اللہ جسے چاہے گمراہ قرار دے اور جسے چاہے منزل تک پہنچائے اور وہ عزت والا ہے، بالکل ٹھیک کام کرنے والا''۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کے لئے واقف زبان ہونے کی ضرورت

''صاف صاف بیان کرے'' یعنی کسی دوسرے مترجم کی ضرورت نہ ہو [1] اس سے ظاہر ہے کہ مترجم کی صورت میں افادیت کم ہو جاتی ہے۔اس لیے بعد میں دوسری قوموں کے افراد جب اس پیغام کو قبول کریں تو پورا پورا فائدہ وہ اس کی تعلیمات سے اسی وقت اٹھا سکیں گے۔جب وہ اس زبان کو بھی حاصل کریں جس میں اس پیغمبر نے براہ راست مخاطب کیا تھا۔یہ وہ ضرورت ہے جو مسلمانوں کے لیے عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے گی۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ''اللہ جسے چاہے گمراہ قرار دے اور جسے چاہے منزل مقصود تک پہنچائے'' وہ اس تفسیر کے مطابق ہے [2] اور وہی ہمارے نزدیک قبل کے جملہ سے یہاں مرتبط ہے یعنی انہی کی زبان میں ہدایت ہونے سے حجت الٰہی تمام ہو جائے گی۔اب اس کے بعد جو اس راستے پر نہ آئے گا، وہ گمراہ قرار پائے گا اور جو آ جائے گا، وہ منزل مقصود تک جو نجات ہے پہنچے

---

[1]۔لا یحتاجون الی من یترجمه عنه (تبیان)

[2]۔یحکم بضلال من یشآء فاضلوا هم عن الطریق (تبیان)

گا اور اگر حجت ہی تمام نہ ہوتی تو اس کی تفریق کا محل نہ ہوتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ⑤

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ کہ نکالو اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی طرف اور انہیں اللہ کے تاریخی دن یاد دلاؤ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر بڑے صبر و تحمل والے، شکر گزار کے لیے۔

ایام الٰہی اور اوران کی یاد کی اہمیت

''اللہ کے تاریخی دن'' سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:۔

''وقائعی که از جانب او بودند'' (فتح الرحمن)

شاہ رفیع الدین کہتے ہیں:۔ ''ساتھ دنوں یعنی کاموں خدا کے''

جلالین فرماتے:۔ ایام الله بنعمه ''اللہ کے دن یعنی اس کی نعمتیں''

حالانکہ یوم کے معنی نہ واقعہ کے ہیں، نہ کام کے، نہ نعمت کے یوم کے معنی تو دن ہی کے ہیں اور اس کی اضافت اللہ کی طرف ہے، اس سے وہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے جو ان سب پر حاوی ہے کہ اللہ کے دن وہ ہیں جن میں اللہ کے دین کو تقویت پہنچانے والا کوئی اہم کارنامہ ہوا ہو۔ خواہ براست اللہ کی طرف سے جیسے وہ عذاب جو اس کی جانب سے امتوں پر نازل ہوئے ہیں یا اس کے حکم سے اس کے انبیاء و الیاء اور مقرب بندوں نے اس کی راہ میں جو قربانیاں پیش کی ہیں، وہ سب ایام اللہ میں داخل ہیں اور ان کی یاد آوری کا حکم خالق دے رہا ہے۔ ہماری قدیم تفسیر کا مضمون اس کے مطابق ہے۔ [1]

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ⑥ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ⑦

''اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہ یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر ہے، جب اس نے تمہیں چھڑایا فرعون والوں سے جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں آزمائش تھی تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی اور جب تمہارے پروردگار نے

[1] ایام الله ثلاثة یوم القائم و یوم الموت و یوم القیامة (علی بن ابراهیم)

اطلاع دی[1] کہ اگر شکر ادا کرو گے تو میں اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکرا پن کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔"

جو واقعات قوم موسیٰ علیہ السلام کو یاد دلائے جا رہے ہیں، ان کا ذکر سورہ بقرہ میں ہو چکا ہے لہٰذا مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ⑧ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ڛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ڔ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ⑨

"اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر کفر اختیار کرو تم اور وہ سب جو روئے زمین پر ہیں تو یقیناً اللہ بے نیاز ہے قابل تعریف۔ کیا تمہیں نہیں پہنچی خبران کی جو تمہارے پہلے تھے، نوح کی قوم والے اور عاد اور ثمود اور وہ جو ان کے پہلے تھے جنہیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا؟ ان کے پاس آئے ان کے پیغمبر معجزوں کے ساتھ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دبائے اور کہا ہم انکار کرتے ہیں اس کا جس کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے اور ہم شک میں ہیں اس سے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو جو پریشان کرنے والا ہے۔"

فردوا ايديهم فى افواههم کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے کہ "انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دبائے" یہ ایک تفسیر کے موافق ہے کہ ضمیریں سب اسی جماعت کی طرف راجع ہیں اور اس صورت میں ہاتھ منہ میں دبانے کے بھی دو مختلف مطلب کہے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس سے حیرت کا اظہار مقصود ہے جس کے لیے ہمارے یہاں محاورہ ہے "انگشت بدنداں ہونا"[2] اور دوسرے یہ کہ اس سے غیظ و غضب کا اظہار مقصود ہے جس کے لیے ہم کہتے ہیں "اپنی آپ بوٹیاں نوچتے ہیں یا کاٹتے ہیں"[3] اور اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں[4] جن میں سے ایک قول کی بنا پر جو قرین قیاس ہے، یہ ترجمہ ہوگا کہ "اپنے ہاتھ ان کے منہ میں دیئے" یعنی تکذیب اور تمسخر کے ساتھ ان کی زبان بندی کی کوشش کی۔ اس صورت میں آخری ضمیر فی افواههم والی انبیاء کی طرف راجع ہوگی۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ

---

[1] اعلم جلالين و قد ستعمل تفعل بمعنى افعل كقولهم اوعدته و توعدته (تبيان)
[2] يعني از نهايت تعجب و انكار انگشت بدندان گزيدند (فتح الرحمن)
[3] ليعضوا عليها من شدة الغيظ (جلالين)
[4] في معناه خمسة اقوال (تبيان)

لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾

''ان کے پیغمبروں نے کہا کہ کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے گناہوں سے درگزر کرے اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دے، انہوں نے کہا تم نہیں ہو مگر ہمارے ہی ایسے آدمی، چاہتے ہو کہ ہمیں روکو اس سے کہ جس کی عبادت کرتے آئے ہیں ہمارے باپ دادا تو لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل۔''

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ
وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

''کہا ان سے ان کے پیغمبروں نے کہ ہم نہیں ہیں مگر تمہاری ہی طرح ایک آدمی مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنے کرم سے نوازتا ہے اور ہمارے لیے یہ نہیں ممکن کہ ہم کوئی دلیل پیش کریں مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے ایمان والوں کو۔ اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں حالانکہ کہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں پر لگایا ہے اور ہم صبر و تحمل سے کام لیں گے، اس پر جو تم ہمیں ایذا پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے بھروسا کرنے والوں کو۔''

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ
فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ
بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

''اور کافروں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے اور نہیں تو ضرور تم ہمارے مذہب میں واپس آ و گے تو اللہ نے وحی بھیجی ان پر کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور تمہیں ساکن کر دیں گے اس سرزمین پر ان کے بعد یہ صلہ ہے اس کے لیے جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا [1] تصور رکھے اور وہ میری تہدید سے ڈرے۔''

---

[1] مقامی ای مقامہ بین یدی (جلالین)

کافروں کا اپنے پیغمبروں سے کہنا کہ "تم ہمارے مذہب میں واپس آ و گے۔" ان کے خیال ناقص کے مطابق ہے کہ جب تک وہ پیغمبر ان کے افعال پر نکتہ چینی شروع نہیں کرتا، انہیں محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کچھ الگ تصورات رکھتے ہیں اور جس دن سے وہ کار ہدایت شروع کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ آج یہ اپنے سابق دین سے منحرف ہوگئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبیؑ خدا کبھی بھی گمراہوں میں داخل نہیں ہوتا[1] یہ اور بات ہے کہ وہ ابھی گمراہی کے خلاف جہاد پر مامور نہ ہو۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

"اورانہوں نے فتح وظفر کی دعا کی[2] اور نا کام ہوا ہر سرکش عناد رکھنے والا۔ اس کے سامنے دوزخ ہے اور اسے پلا یا جائے گا پیپ کی قسم کا پانی۔ جسے وہ ایک ایک گھونٹ کر کے پیۓ گا اور بہت مشکل ہے کہ وہ اسے حلق سے اتار سکے[3] اور موت اس کی ہر طرف سے آ رہی ہوگی[4] اور پھر بھی وہ مرے گا نہیں اور اس کے سامنے سخت طرح کا عذاب ہے۔"

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

"وہ جو اپنے پروردگار کے ساتھ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے اعمال مثل اس خاکستر کے ہیں جس پر ایک جھکڑوں والے دن میں تیز ہوا چلے، وہ جو کچھ کر چکے ہیں اس میں سے کسی چیز پر قبضہ نہیں رکھتے، یہ ہے بڑی سخت گمراہی۔"

یعنی انہوں نے دنیا میں کچھ خیر خیرات وغیرہ کی طرح کام کیے تھے جو بجائے خود نیک کام ہیں اور انہیں ان کے نامہ اعمال میں درج ہونا چاہیے تھا مگر چونکہ ایمان شرط قبول اعمال ہے اور وہ اس سے محروم ہیں، اس لیے ان اعمال میں سے کچھ بھی ان کے پاس نہیں ہے اور وہ آخرت میں خالی ہاتھ ہی ہوں گے۔[5]

---

[1] تو هموا ذلك على غير حقيقة انهم كانوا على ملتهم (تبيان) اى دعوا (على بن ابراهيم)

[2] طلب فتح کردند پیغامبران (شاہ ولی اللہ)

[3] فلا يقارب ان يشوبه تكرها و هو يشوبه (تبيان)

[4] اسبابه المفيضته له من انواع العذاب (جلالين)

[5] اعمالهم الصالحة كصلة و صدقة فى عدم الانتفاع بها لعدم شرطه (جلالين) یعنی اعمال ایشاں همه حبط شدند بدان منتفع نگرند (فتح الرحمن)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ اگر وہ چاہے تو تم سب کو ختم کردے اور ایک نئی مخلوق کو لے آئے۔ اور یہ اللہ پر کوئی دشوار بات نہیں ہے۔''

یہاں دیکھنے سے مراد معلوم ہونا ہے، اس لیے کہ جو باتیں بعد میں درج ہیں، وہ از قبیل مشاہدات نہیں ہیں جن سے آنکھ کے دیکھنے کا تعلق ہو۔[1]

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ
اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ
سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾

''اور وہ ایک ساتھ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے تو اب کمزور لوگ کہہ رہے ہیں ان سے کہ جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ ہم تمہارے پیرو تھے تو کیا تم ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا سکتے ہو۔ انہوں نے کہا اگر اللہ ہمیں منزل تک پہنچا تا تو ہم بھی تمہیں منزل تک پہنچاتے۔ ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے ہم بے تاب ہوں، چاہے صبر وتحمل سے کام لیں۔ ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔''

''حاضر ہوئے'' کا لفظ ہے تو ماضی کے لیے مگر یہ منظر کشی کا ایک انداز ہے جو قرآن میں کئی جگہ ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مستقبل کا یہ واقعہ ایسا یقینی ہے کہ سمجھو جیسے تم دیکھ رہے ہو اور وہ وقوع میں آچکا ہے۔[2]

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ
فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ
لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ
اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

''اور کہے گا شیطان اس وقت کہ جب جو ہوتا ہے وہ ہو جائے گا کہ بے شبہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے

---

[1] الم تعلم لان الروية تكون بمعنى العلم كماتكون بمعنى الادراك بالبصر و ههنا لايمكن ان تكون بمعنى الرّوية بالبصر (تبيان)

[2] والتعبير فيه وفيما بعده بالماضى لتحقق وقوعه (جلالين) معناه مستقبل (على بن ابراهيم)

تمہیں سبز باغ دکھائے تھے تو وہ سب غلط ثابت ہو گئے اور مجھ کو تم پر کوئی جبری تسلط تو تھا نہیں سوا اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی تو تم نے میری آواز پر لبیک کہی تو مجھے لعنت ملامت نہ کرو اور خود اپنے کو لعنت ملامت کرو میں تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتا اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو میں انکار کرتا ہوں اس سے جو تم نے مجھے اس کے پہلے (خدا کا) شریک قرار دیا تھا[1] بلاشبہ جو ظالم ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

"اور داخل کیے جائیں گے وہ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کیے بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اپنے پروردگار کے حکم سے، ان کی صاحب سلامت[2] آپس میں سلامٌ کا لفظ ہوگا۔"

یہاں بھی سلامٌ ہی ہے، السَّلام نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"دنیا میں سلام دعا ہے سلامتی مانگنے پر وہاں سلام مبارک بادی سلامتی پر" (موضع القرآن)

اس طرح ان کے والد کا ترجمہ "دعائے خیرایشان" اور ان کے بھائی کا ترجمہ "دعا ملاقات ان کی، دونوں غلط ہو جاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

"کیا تم نے نہیں دیکھا کیسی مثال قرار دی ہے اللہ نے اچھے کلمہ کی؟ مثل اچھے درخت کے جس کی جڑ قائم ہو اور شاخ آسمان سے باتیں کر رہی ہو۔ جو اپنا میوہ ہر زمانہ میں دیتا ہوا اپنے پروردگار کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں پیش کرتا ہے، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں اور مثال خراب کلمہ کی مثل خراب درخت کے ہے جو اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر ہی سے۔ اس کے لیے پائیداری نہ ہو۔"

---

[1] بشرككم بالله وما تابعتكم لی قبل لهذا اليوم (تبیان)

[2] تحيتهم فيها من الله ومن الملئكة وفيها بينهم (جلالين)

اچھے اور بُرے کلموں کی مثال

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

یعنی شریعت حق در ملکوت ثابت ودر دنیا ہر روز رواجی تازہ می یابدو مردمان منتفع می شوند و ملت جاہلیت در ملکوت استقرار ندارد یکچند درمیان مردم شائع شودباز برہم کردہ آید (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ سچی شریعت عالم ملکوت میں قائم ہے اور دنیا میں روز بروز نئی مقبولیت حاصل کرتی ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جاہلیت والا دھرم عالم بالا میں قیام نہیں رکھتا اور تھوڑے دن آدمیوں میں پھیلتا ہے، پھر ختم ہو جاتا ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کچھ دوسری طرح مطلب رکھتے ہیں:۔

''مسلمانوں کا دعویٰ درست ہے جس کی دلیل صحیح ہے اور دل میں اثر رکھتا ہے اور روز بروز چڑھتا ہے اور کافروں کا دعویٰ جڑ نہیں رکھتا، تھوڑا دھیان کرنے سے غلط معلوم ہونے لگے دل میں اس سے کچھ نور نہیں۔'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں جو ہے، وہ ان دونوں سے الگ ہے:۔

كذلك كلمة الايمان ثابتة فى قلب المؤمن و عمله يصعد الى السماء ويناله بر كته وثوابه كل وقت و مثل كلمة خبيثة كشجرة خبيثة كذلك كلمة الكفر لا ثبات لها ولا فرح ولا بر كة

اسی طرح ایمان کا کلمہ مومن کے دل میں قرار پائے ہوئے ہوتا ہے اور اس کا عمل آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے اور اسے اس کے برکت و ثواب سے ہر وقت فائدہ پہنچتا ہے اور خبیث کلمہ کی مثال کفر کا کلمہ ہے جو مثل خبیث درخت کے ہے، اسی طرح کفر کا کلمہ، اس کو نا پائداری ہے، نہ اس سے خوشی ہوتی ہے اور نہ برکت۔

بہر حال الفاظ آیت میں ان سب پہلوؤں کی گنجائش ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ڐ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۟﴿٢٧﴾

''قائم رکھتا ہے اللہ ایمان لانے والوں کو اس بات پر جو پائدار ہے دینوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور گمراہ قرار دیتا ہے [1] اللہ ظالموں کو اور اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔''

''ایمان لانے والوں کو قائم رکھتا ہے۔'' اس کی تشریح میں شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

یعنی وقت مرگ توفیق شہادت می دہد و وقت سوال منکر و نکیر بقول حق گو یا سازد (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ مرنے کے وقت حق کی گواہی دینے کی توفیق دیتا ہے اور منکر و نکیر کے سوال کے وقت اس کی زبان پر حق کو لاتا ہے۔

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں جناب امیرؑ کی حدیث بھی یہی بتاتی ہے کہ یہ ''قول ثابت'' یعنی پائدار پر قیام قبر میں نمایاں ہوگا منکر و

[1] یحکم بضلال الظالمین (تبیان)

نکیر کے سوال کے وقت جب بندہ مومن ان کے سوال کا صحیح صحیح جواب دے گا اور وہ خوش ہو کر اسے دعا دیں گے کہ:۔

ثبتك الله بما تحب و ترضیٰ

اللہ تجھے برقرار رکھے اس طرح جو تجھے محبوب و دل پسند ہو

حضرتؒ نے فرمایا کہ اس آیت سے مراد یہی موقع ہے۔[1]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾
جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ
سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے نعمت الٰہی کے بدلے میں ناشکری سے کام لیا اور اپنی جماعت کو داخل کیا ہلاکت کے گھر میں، جو دوزخ ہے۔جس کی تپش میں وہ مبتلا ہوں گے اور کتنا برا ٹھکانا ہے وہ۔اور انہوں نے اللہ کے لیے برابردار بنائے تا کہ اس کے راستے سے بہکائیں، کہئے کہ ابھی فائدہ اٹھالو، یقیناً آخرت میں تو تمہیں آتش دوزخ کی طرف جانا ہے۔“

”نعمت الٰہی کے بدلے میں ناشکری“ کا مطلب یہ ہے کہ نعمت الٰہی کا جو تقاضا ہے اور وہ شکر نعمت ہے، اس کے بجائے کفران نعمت سے کام لیا۔[2]

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا
وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

”کہئے میرے ان بندوں سے جو ایمان رکھتے ہیں کہ نماز کی پابندی کریں اور خیرات کریں اس سے کہ جو ہم نے انہیں دیا ہے پوشیدہ طور پر اور ظاہر بظاہر، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جب نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ آپس میں دوستانہ ہوگا۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

”یعنی نیک عمل بکتے نہیں اور کوئی دوستی سے رعایت نہیں کرتا۔“ (موضح القرآن)

”دوستانہ“ سے کوئی آدمی بلا معاوضہ بھی کچھ مدد صرف حق دوستی کی بنا پر دیتا ہے یا ”کار خیر“ سمجھ کر، اس لیے ہماری قدیم تفسیر میں اس کی

[1] ۔ هو قول الله: يثبّت الله الذين اٰمنوا بالقول الثابت الاية (علی بن ابراهيم)
[2] ۔ لما جعلوا الكفر بالنعمة مكان شكرها كانوا قد بدلوا اقبح تبديل (تبيان)

تشریح صدقہ کے لفظ سے ہوئی ہے [1] مگر ہوسکتا ہے کہ صدقہ کے لفظ میں کتابت کی غلطی سے الف رہ گیا ہو اور وہ اصل میں صداقۃ ہو تو وہ لفظ خلال کی جو قرآن میں ہے بالکل لفظی تفسیر ہوگی یعنی دوستی یا دوستانہ جو ترجمہ میں پہلے ہی موجود ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ‌ ۚ وَسَخَّرَ لَـكُمُ الۡـفُلۡكَ لِتَجۡرِىَ فِى الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِهٖ‌ ۚ وَسَخَّرَ لَـكُمُ الۡاَنۡهٰرَ‌ۚ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَـكُمُ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ دَآٮِٕبَيۡنِ‌ ۚ وَسَخَّرَ لَـكُمُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ‌ ۚ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰٮكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡهُ‌ ؕ وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَـظَلُوۡمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

”اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا تو نکالا اس کے ذریعہ پھلوں سے تمہارا رزق اور تمہارے قابو میں دیں کشتیاں کہ وہ چلیں دریا میں اس کے حکم سے اور تمہارے قبضہ میں دیں نہریں۔ اور تمہارے قابو میں دیے سورج اور چاند جو ہمیشہ چلتے رہتے ہیں [2] اور قبضے میں کیے تمہارے رات اور دن۔ اور تمہیں دیا ہر چیز میں سے جو تم نے مانگا، اور اگر اللہ کی نعمت کا شمار کرو تو اس کا احاطہ تم نہیں کرو گے یقیناً انسان بڑا ظالم ہے، بڑا ناشکرا۔“

مانگ کے پورا کرنے میں من کا لفظ جو صرف کیا گیا جس کے مفہوم سے ”بعض“ کا پتہ لگتا ہے، اس لیے ہے کہ انسان تو اپنی غرض کا بندہ ہے، وہ کبھی ایسی چیز بھی مانگ لیتا ہے جو حکمت نظامِ عالمی کے خلاف ہے اس لیے ایسا سوال پورا نہیں کیا جاتا، ہاں وہ سوال جو کسی بڑے مقصد سے نہ ٹکراتا ہو، اسے بتقاضائے رحمت ورافت پورا کر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے من کے بعد **کل** کا لفظ لایا گیا ہے جو اقسام طلب کے لحاظ سے ہے یعنی یہ اس کی حاجت روائی کسی ایک قسم سے مخصوص نہیں بلکہ ہر ایک طرح کی چیز جو تم مانگتے ہو، وہ دیتا ہے [3] اس لیے ”میں سے“ کے ساتھ ہم نے ترجمہ میں ”ہر وہ چیز“ کہا ہے جس سے بعض اور کل دونوں کے مفہوم محفوظ ہو گئے۔

بہت قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ کشتیوں اور نہروں ہی کی طرح سورج اور چاند اور رات دن کے متعلق **سخر لکم** کا لفظ صرف کیا ہے جس کا ترجمہ سب جگہ ایک ہونا چاہیے اس بنا پر ہم نے یہاں بھی یہی ترجمہ کیا ہے کہ ”تمہارے قبضے“ یا ”تمہارے قابو“ میں دیئے مگر مشاہدہ اور وجدان ہر ایک کا یہ ہے کہ یہ چیزیں ہمارے قابو میں نہیں ہیں، اس صورت میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مستقبل کے کسی ایسے دور ارتقاء کی طرف انسانی ذہن کو تحریک ہے جب یہ سب چیزیں بھی اس کے قابو میں آجائیں اور اس وقت کے حال میں (جب قرآن اترا ہے) نوع انسانی ہی میں کچھ بلند ہستیاں

---

[1] ۔لا خلال ای صدقة (علی بن ابراهیم)

[2] ۔الدؤوب مرور الشئی فی العمل علی عادة جارية فيه (تبیان)

[3] ۔معناه ان الانسان قد یسأ له العافية فيعطى ويسأله النجاق فيعطى يساله الغنى فيعطى ويساله الملك فيعطى ويسأ له الولد فيعطى ويسأله الغرو تيسر ا الامور و شرح الصدر فيعطى... مالم يكن فيه مفسدة فی الدين عليه و علی غیره (تبیان)

ایسی موجودتھیں جن کے قبضے میں دیے گئے تھے سورج اور چانداوردن رات کیوں کہ خطاب مجموع ظرف زمان کی پوری نوع سے ہے ہر زمانہ کی ہر فرد سے نہیں ورنہ ایک دور میں تو جب تک انسانی ذہن نے اتنی بھی ترقی نہیں کی تھی کشیوں پر بھی قبضہ نہ تھا اور نہریں بھی قابو میں نہ تھیں اور اب اتنے ارتقاء کے بعد بھی انسانوں کی اکثریت جوان فنون سے واقف نہیں، وہ نہ کشتیوں پر قابو رکھنی ہے اور نہ نہروں پر۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٦﴾

''اور جب کہا ابرہیم نے اے میرے پروردگار! اس شہر کو محل امن قرار دے اور بچا مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔اے میرے پروردگار انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میرا کہا نہ مانے تو یقیناً تو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔''

حضرت ابراہیمؑ کی مناجات

''میری اولاد کی تشریح شاہ ولی اللہ کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ''یعنی پسران بلا واسطہ او'' (فتح الرحمن)

غالباً یہ اس مشاہدہ کی بنا پر ہے کہ اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بہت سے کافر ومشرک بھی نظر آتے ہیں مگر نہیں ہیں یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اولاد ابراہیم علیہ السلام ہر دور میں ایسے افراد رہے ہیں جن کی پیشانی کبھی کسی معبود باطل کے سامنے خم نہیں ہوئی اور بنی کے لفظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا تھی، اس کی قبولیت کا ظہور انہی افراد میں ہوا جسے منطقی ذوق رکھنے والے اپنی زبان میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ''مہملہ'' کا صدق مستقبل کے ہر دور میں بصورت جزئیہ رہا ہے جو اس قضیہ کا قدر متیقن کے طور پر تقاضا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٧﴾

''اے میرے پروردگار میں نے بسایا ہے اپنے بال بچوں میں سے کچھ کو[1] بغیر کھیتی والے ایک چٹیل میدان میں تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے مالک! اس غرض سے کہ وہ نماز کی بنیاد'' قائم کریں، اب تو کچھ انسانوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ وہ ان کی طرف جھکتے ہوں اور انہیں ہر طرح کے پھلوں سے رزق عطا فرما، شاید کہ وہ شکر گزار ثابت ہوں۔''

---

[1] ۔المراد بالذرية ههنا اسماعيل وامة (تبیان)

جناب ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں یہ لفظیں کہ ''تیرے محترم گھر کے پاس'' اس بنا پر ہیں کہ اگر چہ اس کے بعد خود جناب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیلؑ اس بیت کی تعمیر کریں گے مگر یہ تعمیر کسی نئے مکان کی نہیں بلکہ اسی قدیم مکان کی ہوگی جو پہلے یہیں پر موجود تھا اور پھر حوادث ارضی وسماوی [1] سے بے انشان ہو گیا تھا، اللہ کے دیے ہوئے علم سے جناب ابراہیم علیہ السلام اس گھر سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے یہ الفاظ استعمال کیے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِىۡ وَمَا نُعۡلِنُ‌ ؕ وَمَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

''اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو جانتا ہے اسے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور نہیں چھپتی اللہ پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔''

آخر کا فقرہ کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جز بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے کلام کا یہ فقرہ کہ ''تو جانتا آخر کا فقرہ کہ ''تو جانتا ہے اسے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں۔'' ختم ہونے کے بعد خود خالق متعال نے بطور تائید یہ کلام ارشاد فرمایا ہو۔ [2]

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ وَهَبَ لِىۡ عَلَى الۡكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ‌ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجۡعَلۡنِىۡ مُقِيۡمَ الصَّلٰوةِ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ‌ ‌ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِىۡ وَلِـوَالِدَىَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾

''شکر ہے اللہ کا جس نے مجھے باوجود کبر سنی کے اسماعیل اور اسحاق (ایسے بیٹے) عنایت فرمائے یقیناً میرا پروردگار دعا کا سننے والا ہے۔ پروردگار مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی اے ہمارے پروردگار! اور میری دعا کو قبول کر۔ ہمارے پروردگار مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور تمام ایمان والوں کو اس دن کہ جب حساب قائم ہوگا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اواخر عمر میں اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت

ظاہر ہے کہ دعا جناب ابراہیم علیہ السلام کی بالکل اواخر عمر کی ہے جب کہ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کی ولادت ہو چکی تھی اور پھر وہ استغفار میں اپنی مغفرت کے ساتھ اپنے والدین یعنی والد اور والدہ دونوں کی مغفرت کی التجا کر رہے ہیں، حالانکہ دوسرے مقامات پر قال لابیہ اپنے باپ سے کہا اور ایسے ہی الفاظ سے جس کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے اور اس سے تخاطب میں یہ مذکور ہے کہ سوف استغفرلك ربّى میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے طلب مغفرت کروں گا، اور اس کے لیے پھر استغفار کیا بھی، اس میں کہیں والد کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ ہیں کہ: ''واغفر لابی'' میرے باپ کو بخش دے، اور اس کے متعلق قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

---

[1] ۔خربة طسم واندرس وقيل انّه رفيع عند الطوفان الى السماء (تبیان)

[2] ۔فال قوم ان قوله "وما يخفى على الله من شئى فى الارض ولا فى السّماء" اخبار منه تعالىٰ بذٰلك دون الحكاية (تبیان)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ.(توبہ۔114)

نہیں تھا ابراہیمؑ کا طالب مغفرت ہوتا اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ کی بنا پر جو انہوں نے اس سے کیا تھا مگر جب ان پر ظاہر ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے برأت کرلی۔

ظاہر ہے کہ یہ اوائل عمر جناب ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا: ربنا اغفرلی ولوالدیّ کہنا آپ کے اواخر عمر کے الفاظ ہیں۔اس صورت میں جلالین کے یہ الفاظ کتنے بعید از حقیقت ہیں کہ:

هذا قبل ان یتبین عدو ا تهما لله:

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس وقت کی ہے جب انہیں پتہ نہ تھا کہ ان کے والدین اللہ کے دشمن ہیں:۔

اللہ اکبر: انبیاء ومرسلین کے آباؤ اجداد کو مشرک ثابت کرنے کا شوق ان لوگوں کی آنکھوں پر کس طرح پردے ڈال دیتا ہے۔

پوری عمر گزر گئی، خود جلالین صاحبان اس آیت کے شروع میں علی الکبر کے تحت میں لکھ چکے ہیں کہ جب جناب اسماعیلؑ پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر 99 برس کی تھی اور جناب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ایک سو بارہ برس کی اور ابھی تک ان کو اپنے والدین کے متعلق یہ علم نہ ہوا کہ وہ معاذ اللہ دشمن خدا تھے مگر جلالین کو اس کا علم ہوگیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت اس کی دلیل قوی ہے کہ آذر جسے ان آیت میں ''اَب'' باپ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، والدین کے لفظ سے نہیں، وہ درحقیقت جناب ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہ تھا۔[1]

یادرکھنا چاہیے کہ آب کا لفظ مجازی طور پر کسی مربی کے لیے استعمال ہوجاتا ہے مگر والد وہی ہوتا ہے جس کے نطفہ سے انسان پیدا ہو، وہ آذر نہیں تھا بلکہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بتایا ہے، والد جناب ابراہیم علیہ السلام کے تارخ تھے اور یہاں والدین سے مراد اصلی ماں باپ ہیں جو دونوں ہی مثل تمام مرسلین کے آباؤ اجداد کے اہل ایمان تھے۔

یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں جلالین باپ کے ساتھ ماں کو بھی دشمن خدا ظاہر کررہے ہیں کہتے ہیں کہ: قبل ان یتبیّن له عداو تهما لله یعنی اُس وقت تک ان دونوں کی عداوت اللہ سے ظاہر نہ ہوئی تھی، تو پھر قرآن میں دوسری جگہ جو جناب ابراہیم علیہ السلام کے استغفار پر ان کا عذر بیان کیا گیا ہے، اس میں فقط باپ کے لیے استغفار کا ذکر نہ ہونا چاہیے بلکہ ماں باپ دونوں کے لیے استغفار اور ماں سے بھی وعدہ استغفار کا تذکرہ ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس سے ظاہر ہے کہ نظر الٰہی میں یہ استغفار جناب ابراہیم علیہ السلام جو ربّنا اغفرلی ولوالدیّ کے الفاظ میں ہے، کسی معذرت کا محتاج نہیں ہے، ہاں وہ استغفار جو اغفر لابی کے الفاظ میں تھا اور وہاں ماں کا کوئی ذکر نہیں، اس کے لیے قرآن میں ضرورت محسوس کی گئی ہے یہ بتانے کی کہ اس کا کیا سبب تھا؟

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ

---

[1] ۔قدتنبّاان ابری ابراهیم لم یکونا کافرین و فی الاٰیة ولایة علیٰ ذٰلك لانّه سألالمغفرة لهما یوم القیمة... فدل ذٰلك علیٰ انّ باه الّذی کان کافر اجدّه لامه اوعمّه علی الخلاف (تبیان)

فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ
وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾ؕ

”اور اللہ کو ہرگز بے خبر نہ سمجھنا اس سے کہ جو ظالم یا ظلم کرتے ہیں، وہ تو بس انہیں ڈھیل دیتا ہے اس دن کے لیے جس میں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی [۱]۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے منہ اپنے اٹھائے ہوئے اس عالم میں کہ نگاہ ان کی ان کی طرف پلٹتی نہیں اور دل ان کے پریشان ہوں گے [۲]۔“

”یہ دن وہی جس کی ہولناکیوں کے مختلف رخ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر درج ہیں اور وہ وہی ہے جس کا زیادہ نمایاں اصطلاحی نام ”قیامت“ ہے۔ [۳]

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى
اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ
قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا
مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا
تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ؕ

”اور ڈرائیے لوگوں کو اس دن سے کہ جب ان پر عذاب آئے گا تو ظالم لوگ کہیں گے، اے ہمارے مالک! ہمیں مہلت دے ایک قریبی مدت تک تو ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور پیغمبروں کی پیروی کریں گے اور کیا تم نے پہلے سے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہمیں کوئی زوال نہیں ہوگا۔ اور تم بسے تھے بستیوں میں ان کی جو پہلے اپنے نفس پر ظلم کر چکے تھے اور تمہیں معلوم ہوا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا اور ان کے کیفیات ہم نے تم سے بیان کیے۔ اور انہوں نے اپنی ترکیبیں کیں اور اللہ کے پاس ان کی سب ترکیب ہے اور ان کی ترکیب ایسی تو نہ تھی کہ پہاڑ اس سے ہٹ جائیں۔ تو ہرگز نہ سمجھو اللہ کو کہ وہ ان وعدوں کے خلاف کرے گا جو اس نے اپنے پیغمبروں سے کیے ہیں یقیناً اللہ عزت والا ہے، بڑا سخت بدلہ لینے والا۔“

---

[۱]۔ یقال شخص دجرہ فلاں ای فتحہ فلمہ یغمضہ (جلالین)

[۲]۔ قلوبھم تتصدّع من الخفقان (علی بن ابراھیم)

[۳]۔ ھو یوم القیمۃ (تبیان)

يَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَيۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

وہ دن جب یہ زمین بدل کر دوسری زمین ہو جائے گی اور آسمان بھی اور وہ لوگ حاضر ہوں گے اللہ کے سامنے جو ایک اکیلا ہے، سب پر غالب۔

قیامت میں آسمان وزمین کی تبدیلی

ان آیات میں قیامت میں آسمان وزمین کی تبدیلی کا ذکر آیا ہے۔

وَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ مُّقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيۡلُهُمۡ مِّنۡ قَطِرَانٍ وَّتَغۡشٰى وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجۡزِىَ اللّٰهُ كُلَّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۵۱﴾

اور دیکھو گے مجرموں کو اس دن جکڑا ہوا زنجیروں میں۔ ان کے کرتے تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپے ہوئے ہوگی۔ تاکہ اللہ سزا دے ہر ایک کو اس کی جو اس نے کیا ہے، یقیناً اللہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنۡذَرُوۡا بِهٖ وَلِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۵۲﴾

یہ تبلیغ ہے تمام لوگوں کے لیے اور اس سے یہ مقصد ہے کہ انہیں تنبیہ ہو اس کے ذریعہ سے اور یہ کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ بس ایک خدا ہے اور اس لیے کہ صاحبان عقل اثر لیں۔

سُوۡرَةُ الۡحِجۡرِ

مکیّہ-----۹۹ آیات [1]

اس سورہ کا نام ''اصحاب حجر'' کے تذکرہ کی وجہ سے ہوا ہے جو خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہوا ہے۔

سورۂ حجر کے خاص خاص مضامین:

۱......قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ

۲......فرشتوں کو سجدہ آدمؑ کا حکم اور ابلیس کی سرتابی کا تفصیلی تذکرہ

۳......دوزخ کے ساتھ دروازے

۴......اہل بہشت سے دلوں سے کینہ وعداوت کا دور ہونا

۵......فرشتوں کا جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنا اور ولادت اسحاقؑ کی بشارت دینا

۶......قوم لوط علیہ السلام پر عذاب نازل کرنے کے لیے انہی فرشتوں کا جانا

۷......اصحاب ایکہ کا معذب ہونا

۸......سبع مثانی اور قرآن

۹......علانیہ تبلیغ اسلام کا ابتدائی حکم

۱۰......رسول کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کا انجام وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

الٓرٰ ۚ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ①

الف۔لام۔را۔یہ دستور خداوندی اور ایک بڑے روشن قرآن کی آیات ہیں۔

عام طور پر الکتاب سے مراد قرآن ہی لیا گیا ہے [2] اور پھر قرآن تو قرآن ہے ہی......اس صورت میں یہ ایک چیز کا دوسری چیز کا عطف

---

[1] مکیة فی قول قتادة و مجاهد وهی تسع و تسعون اٰیة بلا خلاف (تبیان)

[2] الکتاب القراٰن (جلالین)

نہیں ہے بلکہ ایک چیز کے دو وصف ہیں جن کو بطور عطف ظاہر کیا گیا ہے[1] مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظ ''کتاب'' کتابت یعنی تحریر سے جس طرح آتی ہے، اسی طرح کتب بمعنی فرض سے بھی، اس لیے قانون الٰہی جو اس کی طرف کے فرائض پر حاوی ہے ''کتاب'' کہلاتی ہے جو قرآن مجید کی بکثرت آیات میں آیا ہے اور اس لیے ہم نے ترجمہ اس کا ''دستور خداوندی'' کے ساتھ کیا ہے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۲

''بسا اوقات کافر لوگ اس کے آرزومند ہوں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔''

یہ تمنا دنیا میں بھی ہوسکتی ہے، جب مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئی ہیں اور اسلام کے برکات وفوائد محسوس ہوئے ہیں تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ہوسکتی ہے جب وہاں کے شدائد اور کفر وعصیان کے نتائج ان کی آنکھوں کے سامنے آئیں گے۔

بہر حال آخرت میں یہ خواہش تو بعد از وقت ہوگی کیوں کہ وہ جزا وسزا کا دن ہے، اس دن عمل کا دروازہ بند ہو چکا ہوگا مگر دنیا میں یہ خواہش اگر صدق دل سے ہو تو وہ سودمند ہوسکتی ہے کیوں کہ اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا موقع ابھی باقی ہے لیکن جو کافر ہیں، ان کے دل میں یہ خواہش چونکہ حقانیت کی تڑپ سے نہیں بلکہ وقتی منافع سے ایک وقتی تاثر کے طور پر ہے لہٰذا اکثر وہ چنگاری ''اندیشہ ہائے سود وزیاں'' کی خاکستر کے نیچے دب کر بجھ جایا کرتی ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۳

''چھوڑ دو انہیں کہ کھائیں اور لذائذ حیات سے بہرہ مند ہوں اور ہوس دنیا انہیں بے خبر بنائے رکھے تو کچھ ہی عرصہ میں انہیں معلوم ہو جائے گا۔''

وَمَآ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴

''اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم نے تباہ وبرباد کیا مگر یہ کہ اس کے لیے ایک جانا پہچانا نوشتہ موجود تھا۔''

یعنی دنیا اسے ناگہانی آفت سمجھتی ہے مگر حقیقت میں خالق کی جانب سے امت کی بقا وفنا ایک منضبط ومعلوم ضابطہ کے مطابق تھی جو خالق کی طرف سے مقرر ہے۔[2]

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُوْنَ ۝۵

''کوئی قوم اپنی مقررہ عمر کی مدت سے نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ وہ پیچھے رہتی ہے۔''

وَقَالُوْا يَآأَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ لَوْ مَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا إِذًا

---

[1] انما وصفوا بالکتاب و القراٰن لاختلاف اللفظین وما فیهما من الفائدین و ان کانا لموصوف وانه (تبیان)

[2] کتاب معلوم ای اجل مکتوب (علی بن ابراہیم)

مُّنْظَرِيْنَ۝۸

”اورانہوں نے کہا کہ اے وہ جس پر قرآن اتارا گیا ہے، یقینی تم تو دیوانے ہو۔ کیوں نہیں تم لے آتے خود ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تم سچے ہو۔“ ہم نہیں اتارتے فرشتوں کو مگر صحیح موقع پر اور انہیں اس وقت میں پھر کوئی مہلت نہ ہو گی۔“

بعد کے گستاخانہ جملہ سے ان کے کہ ”تم تو دیوانے ہو“ یہ ظاہر ہے کہ پہلے ان کا کہنا کہ ”اے وہ جس پر قرآن اتارا گیا ہے۔“ بطور تمسخر تھا۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو ایسا ادعاء رکھتے ہو کہ تم پر قرآن اتارا گیا ہے[1] مگر ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ تم دیوانے ہو، پھر ہٹ دھرمی والا انہوں نے یہ مطالبہ پیش کردیا کہ اگر تم سچے ہو تو خود ہمارے پاس فرشتوں کو بلا کر کیوں نہیں دکھا دیتے؟ خالق نے جواب دیا فرشتوں کا اتارا جانا کوئی ہنسی دل لگی کی بات نہیں ہے، وہ امتوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں تو عذاب لے کر بھیجے جاتے ہیں، اس وقت جب مہلت کا دور ختم ہوجاتا ہے اور اس امت کا قلع قمع کرنا منظور ہوتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹

”بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ

یہ آیت اس معرکہ آرا بحث خلق قرآن میں پیش ہوتی رہی ہے جو امت اسلامیہ میں ایک مدت تک ہیجان و اضطراب کی باعث رہی۔ اہل سنت کی اکثریت یعنی اشعری لوگ اس کے قائل ہیں کہ قرآن قدیم ہے اور اسے ”حادث“ کہنا کفر ہے حالانکہ قدیم کی لازمی صفت ہے ”لازوال“ اور جو شے ذاتاً لازوال ہو، اس کے لیے حفاظت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر خالق نے یہ کیوں کہا کہ ”ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔[2]

اس کے علاوہ اس آیت کو برابر قرآن مجید کی سالمیت یعنی تحریف و تغیر سے بری، ذمے ہونے کے ثبوت میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔[3]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ۝۱۰ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝۱۱ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۝۱۲ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ۝۱۳

”اور ہم نے آپ کے پہلے بھی پیغمبر بھیجے سابق زمانہ کی مختلف جماعتوں میں“۔ اور کوئی پیغمبر ان کے پاس نہیں آتا

---

[1] ۔ نزل علیك علیٰ قولك (تبیان)
[2] ۔ فی الاٰیة دلالة علیٰ حدوث القراٰن (تبیان)
[3] ۔ من التبدیل و التحریف و الزیادة و النقص (جلالین)

تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس طرح ہم اسے داخل کرتے ہیں ان گناہ گاروں کے دل میں۔ وہ ان پر ایمان نہیں لائیں گے اور رہا ہے یہی طریقہ اگلے زمانہ والوں کا"۔

"اسے داخل کرتے ہیں ان گناہگاروں کے دلوں میں۔" یہ "اسے" کی ضمیر کی طرف راجع ہے؟ مفسرین اہل سنت جنہیں کسی برائی کے انتساب میں اللہ کی طرف کوئی وحشت محسوس نہیں ہوتی، وہ بلا تکلف اسے مذاق اڑانے یا کفر اختیار کرنے کی طرف راجع کر دیتے ہیں [۱] اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان باتوں کا سبب اللہ ہے مگر ہمارے مفسرین اس کے خلاف ہیں۔ جناب شیخ الطائفہ نے اس کے لیے قدیم علمائے جمہور کا قول بھی نقل کیا ہے۔ بلخی اور جبائی کہتے ہیں کہ "اسے" کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور اس لیے بعد میں ہے "وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے" اگر پہلی جگہ "اسے" کی ضمیر کو کفر یا استہزا کی طرف راجع کیا جائے تو "اس پر ایمان نہیں لائیں گے" کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس کفر اور استہزا پر ایمان نہیں لائیں گے، یہ نمایاں طور پر غلط ہے۔ [۲]

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

"اور اگر ہم ان پر کھول دیں ایک دروازہ آسمان کا جس سے وہ اس میں چڑھنے لگیں تو وہ کہیں گے کہ یہ ہماری آنکھوں پر نشہ غالب کر دیا گیا ہے بلکہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر جادو ہو گیا ہے۔"

"آنکھوں پر نشہ غالب ہو گیا ہے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ نظریں صحیح کام نہیں کر رہی ہیں اور ان کی کیفیت غیر فطری ہو گئی ہے۔ [۳]

پورا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نہ ماننے والے کے لیے کوئی معجزہ کارگر نہیں ہے، وہ تو اتنا ہی کہہ رہے ہیں کہ فرشتے خود ہم سے آ کر باتیں کیوں نہیں کرتے؟ اگر اس سے بڑھ کر بھی ہو یعنی یہ خود آسمانوں کی طرف بلند ہوں، تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی واقعیت کو تسلیم کریں گے بلکہ اسے کسی جادو یا کرتب کا نتیجہ قرار دیں گے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں اور انہیں سجایا دیکھنے والوں کے لیے۔ انہیں محفوظ رکھا ہے ہر مردود شیطان سے۔ سوا اس کے کہ جو چوری چھپے سنے تو اس کا پیچھا کرے گا ایک ٹوٹنے والا تارا جو نمایاں ہوگا۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ

---

[۱] ای مثل ادخالنا التکذیب فی قلوب اولئك۔ (جلالین)

[۲] لو کان الرادانه یسلك الشرك فی قلوبهم یقول انهم لایؤمنون بالشرك (تبیان)

[۳] سکّرت الابصار فلاینفذنوها ولاتدرك الاشیاء علیٰ حقیقتها (تبیان)

مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ قائم کیے اور اس میں نپی تلی ہوئی ہر قسم کی چیزیں لگائیں۔ اور تمہارے لیے اس میں ذرائع معاش قرار دیے اور ایسے اشخاص جنہیں تم روزی پہنچانے والے نہیں ہو۔

یعنی نوکر، چاکر، عزیز واقارب، بال بچے سب سے فائدہ اٹھاتے ہو اور رزق پہنچانے والے انہیں حقیقۃً تم نہیں ہو، اللہ ہے۔[۱]

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

اور کوئی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ ہمارے پاس اس کے ذخائر ہیں اور ہم نہیں اتارتے مگر ایک معینہ مقدار پر۔

یعنی جتنی مصلحت متقاضی ہوتی ہے۔[۲]

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور ہم نے ہواؤں کو بھیجا جو بادلوں کو پانی سے بوجھل بناتی ہیں[۳] اس کے بعد ہم نے اتارا آسمان سے پانی تو اس سے ہم نے تمہیں سیراب کیا اور تم اس کے ذخائر پر قابو نہ رکھتے تھے۔''

آخر کے جملہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ ہم بار بار پانی نہ برساتے تو تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ ایک دفعہ کے برسے ہوئے پانی کو تم مستقل ذخیرہ کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھتے[۴] اور یہ بھی کہ تم اس ذخیرہ کہ مالک نہ تھے۔ یہ خدا کا فضل وکرم ہے کہ اسے تمہارے لیے برساتا ہے۔[۵]

یہاں جناب شیخ الطائفہؒ نے عجیب بات کی ہے جسے سوا ''مساهحه'' کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اصل آیت کے آخر میں ہے: وما انتم له بخازنین جس کا ترجمہ اور مطلب ابھی ہم نے لکھا مگر موصوف کے ذہن میں اس مقام پر آ گیا: واما انتم له برازقین اور انہوں نے شرح اس کی فرمادی۔[۶]

لطف یہ ہے کہ تبیان کا جدید ایڈیشن مطبوعہ دارالاندلس تحقیق وتصحیح احمد حبیب قصیر العالی کے ساتھ شائع ہوا مگر اس میں بھی حاشیہ پر اس مساهحه کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

---

[۱]۔ من العبید والدواب والانعام وانّما یرزقهم الله (جلالین)
[۲]۔ علی حسب المصالح (جلالین)
[۳]۔ تلقح السحاب فیمتلی ماء (جلالین)
[۴]۔ ذای لاتقدرون ان تخزنوه (علی بن ابراهیم)
[۵]۔ ای لیست خزائنه بایدیکم (جلالین)
[۶]۔ ''وما انتم له برازقین'' ای لستم تقدرون ان ترزقوا احد ذلك الماء (تبیان)

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

بلا شبہ ہم زندہ کرتے ہیں اور ہم مارتے ہیں اور ہم ورثہ پانے والے ہیں۔

یعنی سب کی فنا کے بعد ذات الٰہی باقی رہنے والی ہے یہی باختلاف الفاظ تمام مفسرین کے تشریحات کا مطلب ہے۔[1]

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور ہم جانتے ہیں تم میں سے آگے والوں کو اور جانتے ہیں پیچھے والوں کو۔ اور یقیناً تمہارا پروردگار وہی انہیں حشر میں اٹھائے گا بلاشبہ وہ بالکل ٹھیک کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

''آگے والوں کو'' اور ''پیچھے والوں کو''......اس کے مفہوم میں جناب شیخ الطائفہؒ نے چار قول بیان کیے ہیں:۔

ایک آگے والے جو گزر گئے اور پیچھے والے جو باقی ہیں۔

دوسرے خلقت کا اول حصہ اور آخری حصہ

یہ دونوں باتیں قریب ہی قریب ہیں اور اہل سنت کی تفسیر جلالین اس کے موافق ہے کہ:

المستقدمین منکم ای من تقدم من الخلق من لدن ادم و لقد علمنا المستاخرین المتأخرین الی یوم القیامة

''تم میں آگے والوں کو'' یعنی جو مخلوق آدم کے بعد سے اب تک تھی اور ''ہم جانتے ہیں پیچھے والوں کو یعنی اب سے لے کر قیامت تک کی مخلوق''

تیسرا قول ان دونوں سے الگ ہے کہ ''آگے والو'' کے معنی نیک کاموں میں آگے رہنے والے اور پیچھے والے'' نیک کاموں میں پیچھے رہنے والے، اور چوتھا جسے شان نزول کے طور پر بیان کیا گیا ہے، یہ ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جماعت میں پہلی صف میں رہنے کی جو تاکید فرمائی تو بعض مسلمانوں نے جو کسی دور دراز مقام پر رہتے تھے یہ ارادہ کیا کہ وہ اپنا گھر فروخت کر کے کہیں قریب کی جگہ پر آ کر بس جائیں تا کہ پہلی صف میں شریک ہو سکیں تو یہ آیت نازل ہوئی مطلب یہ ہے کہ اللہ آگے والوں اور پیچھے والوں کی نیتوں کے لحاظ سے انہیں جزا عطا کرے گا بعد میں جو حشر میں اٹھانے کا ذکر ہے، وہ ان میں سے ہر قول کے ساتھ مرتبط ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَاۗنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

---

[1] الوارثون الباقون نرث جمیع الخلق (جلالین) اذا افنی الخلق ولم یبین احد کانت الاشیاء کلھا راجعة الیه ینفرد بالتصرف فیھا و کان ھو الوارث الجمیع الاملاك (تبیان) یعنی ہر کوئی مرتا جاتا ہے اور اس کی کمائی اللہ کے ہاتھ میں رہتی ہے (موضح القرآن)

اور ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو گندھی ہوئی مٹی سے جو سوکھ کر کھنکھڑ ہوگئی۔ اور قوم جن کو اس سے پہلے پیدا کیا ہم نے انتہائی تپتی ہوئی جان لیوا آگ سے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٨﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٢٩﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿٣٠﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٣١﴾

''اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں پیدا کرنے والا ہوں ایک انسان کو گندھی ہوئی کھنکھڑ مٹی سے۔ تو جب میں اسے ٹھیک کرلوں اور اس میں اپنی خاص روح پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدہ میں۔ تو فرشتوں میں سے سب نے سجدہ کیا۔ سوا ابلیس کے اس نے اس بات سے کہ وہ سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دے، انکار کیا۔''

فرشتوں کو سجدۂ آدمؑ کا حکم اور شیطان کی سرتابی

روح کی نسبت اللہ کی طرف کہ ''اس میں اپنی روح خاص پھونک دوں'' اس روح کے امتیاز خاص کا اظہار ہے کہ یہ روح صفات الٰہی کی حد امکان میں جلوہ ہے [۱] اور اسی کی بنا پر اسے امتیازی عظمت بھی حاصل ہے [۲]۔

باقی امور کہ یہ سجدہ کیسا تھا اور ملائکہ سے ابلیس کا استثناء کیا نوعیت رکھتا ہے؟ پہلے پارے میں اس واقعہ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٣٣﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿٣٤﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٣٥﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿٣٦﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿٣٨﴾

''ارشاد ہوا اے ابلیس! تجھے کیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا؟۔ اس نے کہا میں سجدہ کرنے کا نہیں ایک آدمی کو جسے تو نے کھنکھڑ مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ارشاد ہوا تو پھر تو اس میں سے نکل، تو اب راندہ گیا ہے۔ اور یقیناً تجھ پر لعنت ہے روز قیامت تک۔ اس نے کہا اے میرے مالک! تو پھر مجھے تو ڈھیل دیدے اس دن تک کہ جب

[۱]۔ اپنی جان یعنی خاص جس میں نمونہ ہے اللہ کے صفات کا حکم اور تدبیر اور یاد حق کی اور لگاؤ اللہ سے (موضح القرآن)

[۲]۔ اضاف روح ادم الی نفسه تکرمة له (تبیان)

لوگ قبروں سے اٹھیں گے۔کہاتوان میں سے ہے جنہیں ڈھیل دی گئی ہے۔مقررہ وقت والے دن تک''۔

اس کے اس سوال پر کہ اسے قیامت تک کی مہلت دی جائے جو قدرت کا جواب ہے اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ایک خیال یہ ہے کہ جو اس نے التجا کی تھی، وہ قبول کی گئی اور یوم الوقت المعلوم سے قیامت ہی مراد ہے۔اس صورت میں جواب قدرت گویا یہ ہے کہ اچھا جا تجھے اس دن تک مہلت دی گئی۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس کی التجاء بجنسہ قبول نہیں ہوئی۔اس نے قیامت تک باقی رہنے کے لیے کہا تھا مگر خالق نے وقت معلوم والے دن ہی تک باقی رکھنے کا اقرار کیا تھا اس سے وہ دن مراد ہے جس کے بعد عام بندوں پر تکالیف شرعیہ کا دور ختم ہوجاتا ہے یعنی جب پہلا دور حیات آخری نسل انسانی کا ختم ہوجائے گا اور اب ہدایت پانے اور گمراہ ہونے کا سوال نہیں رہے گا تو اس کے بعد ابلیس کو بھی موت آجائے گی، پھر جس طرح سب پاداش عمل کے لیے دوبارہ زندہ ہوں گے، اسی طرح ابلیس بھی، اس طرح خالق کا جواب گویا اس کے معروضہ پر یہ ہے کہ نہیں۔تجھے بس یوم وقت معلوم تک کی مہلت دی جاتی ہے [1]۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَلَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَۙ ۝٣٩ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝٤٠ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَىَّ مُسۡتَقِيۡمٌ ۝٤١ اِنَّ عِبَادِىۡ لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ ۝٤٢ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوۡعِدُهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝٤٣ۙ لَهَا سَبۡعَةُ اَبۡوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنۡهُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ ۝٤٤

''اس نے کہا اے میرے مالک! اب جب تو نے مجھے گمراہ قرار دے دیا تو میں بھی ضرور ان لوگوں کے لیے روئے زمین میں گناہوں کو آراستہ بنا کر پیش کروں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا۔سوا ان میں سے تیرے خالص قرار دیے ہوئے بندوں کے۔ارشاد ہوا کہ یہ سیدھا راستہ ہے مجھ پر لازم و ضروری۔یقیناً میرے خاص بندے تجھے ان پر کوئی قابو نہ ہوگا سوا گمراہوں کے جو تیری پیروی کریں اور یقیناً دوزخ وہ جگہ ہے جس کا ان سب سے وعدہ ہے۔اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ کے لیے ان میں سے ایک حصہ مقرر ہے۔''

قیامت تک سلسلۂ معصومین علیہ السلام کی بقاء کی ضمانت

بما اغویتنی کے ترجمہ میں باختلاف عقائد فرق ہے ہم جو عدل کے قائل ہیں اور غلط کاموں کا انتساب خالق کی طرف اس کی شان جلال و کمال کے منافی سمجھتے ہیں، اس طرح کے ترجمہ پر مجبور ہیں جو میں نے کیا ہے کہ ''جب تو نے مجھے گمراہ قرار دے دیا'' یا اسی طرح کا مفہوم جس

[1] ۔الذی ھو اٰخر ایام التکلیف (تبیان)

سے خالق کا سبب گمراہی ہونا ظاہر نہ ہو[1] مگر دوسرے جو عدل کے قائل نہیں ہیں اور قبائح و شرور کی نسبت خدا کی طرف درست سمجھتی ہیں، وہ بے جھجک اس کا ترجمہ یوں کر دیتے ہیں کہ ”تو نے مجھے گمراہ کیا۔“[2]

بے شک ایک پہلو اس ترجمہ کی صحت کا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تو ابلیس کا قول ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اس غلط عقیدہ کا بھی خالق سے شر کا صدور ہو سکتا ہے، آغاز ابلیس سے ہوا ہو اور اس کا مطلب یہ ہو کہ تو نے مجھے گمراہ کیا تو اب میں تیزی مخلوق کو گمراہ کروں گا جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک شاعر صاحب نے جو اپنے اشعار میں دہریت و الحاد کے علمبردار رہے ہیں، اپنے ایک شعر میں یہ سوال اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ:۔

”شیطان کو گمراہ کیا ہے کس نے؟“

تو شاعر سے پہلے اس تصور کے ایجاد کا سہرا بھی خود ابلیس کے سر ہو، تو کیا تعجب ہے؟!

اس پہلو کو بھی جناب شیخ طوسیؒ نے تحریر فرمایا ہے۔[3]

اس صورت میں بما اغویتنی میں جو ”ب“ ہے، جسے کسی نے قسم کا اور کسی نے سببیت کا قرار دیا ہے، اس کا ایک تیسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ وہ عوضیہ ہو یعنی اس عوض میں کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، اب میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا، ممکن ہے کسی وقت اس پہلو کو میری نظر میں اتنی قوت پہنچ جائے کہ میں ترجمہ آیت کا اس کے مطابق کروں۔

دوزخ کے سات دروازے

دوزخ کے لیے کہا جا رہا ہے کہ ”اس کے سات دروازے ہیں“ شاہ عبدالقادر کہتے ہیں کہ:۔

”جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے، ویسے ہی دوزخ کے سات دروازے ہیں بدعمل والوں پر بانٹے ہوئے، شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ ہے کہ بعض لوگ اس کے تفضّل سے جائیں گے بغیر عمل، باقی عمل میں دروازے برابر ہیں“ (موضح القرآن)

”شاید“ کے ساتھ بلا ثبوت اگر توجیہ کا دروازہ کھولا جائے تو شاید زیادہ قرین عقل اور مطابق حقائق دینیہ یہ ہے کہ سات دروازے بہشت کے عام نیکوکاروں کے لیے ہیں جو حساب و کتاب کے بعد مستحق بہشت قرار پائیں اور ایک دروازہ ان بلند مرتبہ نفوس کے لیے ہے جن کے یہاں حساب کتاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ خود دوسروں کے لیے ”موازین اعمال“ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کی محبت و اطاعت معیار استحقاق جنت ہے۔“

دوزخ کے ساتھ دروازوں کے متعلق ایک تصور یہ ہے کہ ان کا تعلق سات طبقوں سے ہو سکتا ہے جو کہ شدت عذاب میں ایک دوسرے

---

[1] ۔بما اغویتنی ای فیما خیّتبنی من رّحمتك لانّ الغیّ الخیة وقال قوم معناہ بما نسبتنی الیٰ الغیّ و حکمت علےّ بالغیّ وقال البلخی معناہ فیما کلقتنی السجود لاٰدم الذی غویت عندہ کما قال فزادتهم رجسا الیٰ رجسهم المازدادوا عندها (تبیان)

[2] ۔ای باغرائك لی والباء للقسم (جلالین) بسبب آن کہ گمراہ کردی مرا (شاہ ولی اللہ) بسبب اس کے گمراہ کیا تو نے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔علی ان هذا اقول ابلیس ویجوز ان یکون اعتقد ان اللہ خلق فیه الغوایة فکفر بذٰلك کما کفر بالامتناع عن السجود (تبیان)

سے بڑھے ہوئے ہیں۔اس روایت کی نسبت امیر المومنین کی طرف بھی ہے۔[1]

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

بلاشبہ پرہیز گار لوگ بہشتوں اور چشموں کے اندر ہیں، داخل ہوں گے ان میں سلامتی کے ساتھ امن واطمینان رکھتے ہوئے۔اور ہم نے دور کر دیا اسے جو ان کے سینوں میں کینہ تھا۔اب وہ آپس کے بھائی بھائی ہیں، تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے۔نہ ان کو چھو جائے گی ان میں کوئی زحمت اور نہ وہ ان سے نکالے جانے والے ہیں۔

اہل بہشت کے دلوں سے کینہ وعداوت کا دور ہونا

اس سے کہ ''ہم نے دور کر دیا اسے جو ان کے سینہ میں کینہ تھا، اب وہ آپس کے بھائی ہیں'' اہل سنت نے اپنے اس تصور میں سہارا لیا ہے کہ بعد رسولؐ صحابہ میں جو آپس میں اختلافات ہوئے، ان میں دونوں فریق آخرت میں رستگار ہوں گے چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یعنی دنیا میں جو کچھ آپس میں خفگی تھی، جی صاف ہو گئے، اس لیے معلوم ہوا کہ کبھی دو آدمیوں میں خفگی ہوئی ہے اور دونوں بہشتی ہیں جیسے حضرت کے اصحاب'' (موضح القرآن)

''لیکن غور کیجئے تو یہ خفگی اور باہمی ناراضگی جس کا ذکر یہاں ہے، وہ باہمی خفگی ہو سکتی ہے جس کا دینی نظریات سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن جہاں اختلاف حق وباطل کا ہو، یا ایسے افراد سے اس خفگی کا تعلق ہو جن کے رضا وغضب کو معیار نجات وہلاکت قرار دیا گیا ہو، کسی کے لیے رسولؐ کا ارشاد ہو:

حُبُّكَ اِيْمَانٌ وَبُغْضُكَ كُفْرٌ وَّنِفَاقٌ

(یعنی) تمہاری محبت ایمان ہے اور تم سے عداوت کفر ونفاق ہے۔

اور

حَرْبُكَ حَرْبِيْ وَسِلْمُكَ سِلْمِيْ

تم سے برسر جنگ ہونا مجھ سے برسر جنگ ہونا اور تم سے مصالحت رکھنا مجھ سے میل رکھنا ہے۔

اور کسی کے لیے پیغمبرؐ کا ارشاد ہو:

مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِيْ

---

[1] قال علی علیہ السلام والحسن وقتادۃ وابن جریج: اطباق بعضها فوق بعض (تبیان)

''جس نے اسے اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور جس نے اسے غضبناک کیا، اس نے مجھے غضبناک کیا۔''
تو ایسے افراد سے مخالفت و کینہ پروری بلکہ جنگ اور ظلم و تعدی اس حکم قرآنی میں کیوں کر داخل ہو سکتی ہے؟!

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

''میرے بندوں کو اطلاع دے دو کہ میں بڑا بخشنے والا، مہربان ہوں۔ اور یہ بھی کہ میرا عذاب بڑا تکلیف دہ عذاب ہے۔''

''امید و بیم'' کا اجتماع ہی ایمان کا جوہر ہے اور اس اعلان کے دونوں جز اس کی تکمیل ہیں [۱]۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

''اور ان لوگوں سے بیان کیجئے واقعہ ابراہیم کے مہمانوں کا۔ جب کہ وہ ان کے پاس داخل ہوئے اور سلام کیا، انہوں نے کہا، ہمیں تو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈریئے نہیں۔ ہم آپ کو ایک بڑے صاحب علم بچہ کی خوش خبری دیتے ہیں۔ کہا کیا تم مجھے اس کی خوش خبری دیتے ہو اس عالم میں کہ کبرسنی مجھ پر چھا چکی ہے تو یہ کیا خوش خبری ہے جو تم مجھے دیتے ہو؟۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو سچائی کے ساتھ خوش خبری دی ہے تو نہ ہو جایئے نا امید ہونے والوں میں۔ انہوں نے کہا اور اپنے پروردگار کی رحمت سے ناامید کون ہوگا سوا گمراہ لوگوں کے۔ کہا اچھا تمہاری اصل مہم کیا ہے؟ اے بھیجے جانے والو۔ انہوں نے کہا ہم بھیجے گئے ہیں ایک گنہگار جماعت کی طرف۔ سوا لوط کے گھر والوں کے، بلاشبہ ہم ان سب کو چھٹکارا دیں گے۔ سوا ان کی بیوی کے، ہم نے طے کرلیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ سے چھوٹ جانے والوں میں سے ہوگی [۲]۔''

فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں آنا اور ولادت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت

---

[۱]۔ فلا تعوّلوا علی محض غفرانی و خافوا عقابی و کونوا علیٰ حذر بأجتناب و معاصی و العمل بطاعتی (تبیان)
[۲]۔ الباقین فی العذاب لکفرھا (جلالین)

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈر کیوں محسوس ہوا؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں :۔

''ظاہراً'' کچھ سبب نہ تھا ڈر کا، پر ان کے ساتھ جو حکم تھا عذاب، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اس کا اثر پڑا، دل کی صفائی سے یہ ہوتا ہے''(موضح القرآن)

جلالین نے ایک دوسرے مقام پر جو قرآن میں تذکرہ ہے، اس سے اسے مرتبط کیا ہے جو بعید نہیں ہے کہ صاحب سلامت کے بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غذا پیش کی اور انہوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا، تب انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں تو تم سے خوف محسوس ہوتا ہے۔[1]

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ضعف پیری کی بنا پر تعجب، اس پر شاہ صاحب لکھتے ہیں :۔

''معلوم ہوا کہ کامل بھی ظاہر اسباب پر بولتے ہیں۔''(موضح القرآن)

یہ جملہ حقیقت کے لحاظ سے صحیح بلکہ نا قابل انکار ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿٦٦﴾

''تو جب وہ بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو انہوں نے کہا کہ تم لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ بلکہ ہم آئے ہیں اس (عذاب) کو لے کر جس میں یہ لوگ شک کرتے تھے۔ اور آپ کے پاس ہم حق کے ساتھ آئے ہیں اور بلاشبہ ہم سچے ہیں۔ تو نکل جایئے گا آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے ایک حصہ میں اور آپ ان کے پیچھے پیچھے چلئے گا اور آپ میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جایئے گا جہاں آپ کو حکم ہو گا۔ اور ہم نے انہیں اس فیصلہ کی اطلاع دے دی کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی اصل نسل ختم ہو جائے گی''۔

قوم لوط علیہ السلام پر عذاب کے لئے اُنہی فرشتوں کا جانا

''کوئی مڑ کر پیچھے نہ دیکھے''...... قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے کہ زوجہ لوط علیہ السلام نے اس حکم کی خلاف ورزی کی جس کے بعد وہ بھی عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں :۔''عورت دل سے منافق تھی لیکن حق تعالیٰ بغیر تقصیر ظاہر کے عذاب نہیں کرتا، ایک حکم ایسا بھیجا کہ اس سے نہ ہو سکا، وہ یہ کہ پیٹھ پھیر کر نہ دیکھو، پھر اس گناہ پر عذاب میں پکڑا۔''(موضح القرآن)''مڑ کر پیچھے دیکھنے کا'' ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کوئی دل چسپی اور لگاؤ اس قوم سے ثابت نہ ہو۔ اگر انسان کو ان سے تعلق خاطر ہو تو ان کے انجام کے متعلق فکر لگی رہے گی کہ ان پر کیا گزری یا ان کے مفارقت شاق ہو گی تو فطری طور سے مڑ کر دیکھے گا حسرت سے کہ اب ان سے جدائی ہو رہی ہے لیکن نہ ان کی کوئی فکر ہے، نہ ان سے کوئی وابستگی تو

---

[1] قال ابراھیم لما عرض علیھم الاکل فلم یاکل (جلالین)

مڑکر دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ ''پیچھے مڑکر نہ دیکھے'' کوئی مستقل حکم نہیں ہے بلکہ یہ حکم الٰہی پر بلا تامل روانہ ہونے اور سفر کے جاری رکھنے کی تاکیدی تعبیر ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ ادھر ادھر نہ دیکھو، بس آگے بڑھتے رہو۔[۱]

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْۤا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۷۱﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۷﴾

''اور آئے اس شہر والے خوش ہوتے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں تو مجھے رسوا نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ ان لوگوں نے کہا کیا ہم نے تم کو تمام دنیا (کے لوگوں کو مہمان کرنے) سے منع نہیں کیا تھا؟۔ کہا یہ میری لڑکیاں موجود ہیں اگر تم کچھ کرنے والے ہو۔ قسم آپ کی جان کی وہ اپنے نشہ میں اندھا دھند مبتلا ہیں۔ تو انہیں سورج نکلتے نکلتے ایک دھماکے نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ تو ہم نے اس کو تہہ و بالا کر دیا اور برسائے ان پر کنکروں کی قسم کے پتھر۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں غور سے دیکھنے والوں کے لیے۔ اور وہ ایک راستے پر ہے جو اب تک برقرار ہے۔ بلاشبہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لیے''۔

درمیان میں جو یہ فقرہ ہے کہ قسم آپ کی جان کی، وہ اپنے نشہ میں اندھا دھند مبتلا ہیں۔'' یہ اسی قوم لوط سے متعلق ہے اور ہمارے رسول ﷺ سے خطاب کر کے[۲] انہی کے حال پر تبصرہ کیا گیا ہے جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ حضرتؐ کو فرماتا ہے قسم تیری جان کی، وہ قوم لوط اپنی مستی میں ان کی بات نہیں سنتے'' (موضح القرآن) یا یہ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر خود خاتم الانبیاء ﷺ کے دور کے مشرکین کی حالت کا بیان ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: ''ایں کلمہ در وسط قصہ حضرت لوطؑ یاد کردہ شد تا تنبیہ باشد بر تطبیق حال مشرکین مکہ بر حال قوم لوط و امثال ایشاں'' (فتح الرحمن) بہر صورت پیغمبرؐ سے خطاب کر کے یہ لفظ لعمرك قسم آپ کی جان کی، وہ مخصوص انداز تخاطب ہے جو ہمارے رسولؐ کے سوا کسی پیغمبر کو حاصل نہیں، اور وہ آپ کی شان حبیب اللہ ہی کا ترجمان ہے۔[۳]

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ لَظٰلِمِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ

---

[۱] ۔ کمایقول القائل امض لشانك ولا تعرج علی شئی (تبیان)
[۲] ۔ خطاب للنبی ﷺ ای و حیاتك (جلالین)
[۳] ۔ فهذه فضیلة لرسول اللّٰه ﷺ علی الانبیآء (علی بن ابراهیم)

مُّبِيۡنٍ﴿۷۹﴾

''اور بے شک ایکہ والے ظالم لوگ تھے۔ تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور یہ دونوں شاہراہ عام پر ہیں جو نمایاں ہے''۔

اصحاب ایکہ کا معذّب ہونا

''دونوں'' یعنی قوم لوط اور اصحاب ایکہ کے شہر گزرگاہ عام پر ہیں جس طرف سے برابر مشرکین، مکہ سے شام جانے میں گزرتے رہتے ہیں تو یہ ان سے عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے۔[1] اصحاب ایکہ کون تھے؟ اس کے متعلق شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔''ایکہ کے رہنے والے یعنی قوم شعیب مدین میں رہتے تھے اور پاس اس شہر کے درختوں کا بن تھا، وہاں بھی رہتے تھے'' (موضح القرآن)

یہ جلالین سے ماخوذ ہے: الایکة هي غيضة شجرت بقرب مدين وهم قوم شعيب۔

ہماری قدیم تفسیر بھی اس سے متفق ہے۔[2] ایک خیال یہ ہے کہ جناب شعیبؑ دو گروہوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ایک اہل مدین وہ صیحہ آسمانی سے ہلاک ہوئے اور دوسرے اہل ایکہ، یہ آتشیں بگولے میں گرفتار ہوئے۔[3]

وَلَقَدۡ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ﴿۸۰﴾ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ اٰيٰتِنَا فَكَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ﴿۸۱﴾ وَكَانُوۡا يَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا اٰمِنِيۡنَ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُصۡبِحِيۡنَ﴿۸۳﴾ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ﴿۸۴﴾

''اور حجر والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں عطا کیں تو وہ ان سے روگردانی کرنے والے ثابت ہوئے۔ اور وہ پہاڑوں کو تراش کر اطمینان کے ساتھ گھر بناتے تھے۔ تو ان کو صبح ہوتے ہوتے ایک دھماکے نے گرفت میں لے لیا۔ تو نہیں فائدہ دیا ان کو اس نے جو وہ حاصل کرتے تھے''۔

اصحابِ حجر کا تذکرہ

''حجر'' والوں سے قوم ثمود مراد ہے حجر اس جگہ کا نام ہے جہاں وہ آباد تھے۔[4] دوسرے مقامات پر قوم ثمود کی جانب صرف جناب صالح علیہ السلام کے مبعوث ہونے کا ذکر ہے مگر یہاں کہا جا رہا ہے کہ ''پیغمبروں کو جھٹلایا'' ممکن ہے کہ ان کے پاس برابر پیغمبر آتے رہے ہوں جن کی وہ تکذیب کرتے رہے اور آخری پیغمبر جن کی تکذیب کے بعد عذاب نازل ہوا، جناب صالح علیہ السلام ہوں اور ممکن ہے جناب صالح علیہ السلام ہی کی جو

---

[1]۔ انهما اى قوم لوط والايكة لبامام طريق مبين واضح افلا يعتبر بهم اهل مكة (جلالين)

[2]۔ اصحاب الغيطة وهم قوم شعيب (علی بن ابراهيم)

[3]۔ ارسل الى اهل مدين فاهلكوا بالصّيحة و اصحاب الايكة فاهلكوا بالظلة التى احترقوا ابنارها (تبيان)

[4]۔ الحجر واديين المدينة والشام وهم ثمود (جلالين)

تکذیب انہوں نے کی اسے ''پیغمبروں کی تکذیب کہا گیا اس اعتبار سے کہ پیغام سب پیغمبروں کا ایک ہی ہے۔[1] ''جو وہ حاصل کرتے تھے'' اس سے مراد مال و دولت بھی ہوسکتا ہے[2] اور سیاہ کاریاں اور ہوس رانیاں بھی جو وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔[3]

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾

''اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو مگر بالکل درست اور یقیناً قیامت آنے والی ہے تو آپ اچھے عنوان سے درگزر کرتے رہیے۔ یقیناً آپ کا پروردگار پیدا کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾

''اور بلاشبہ ہم نے آپ کو عطا کی ہیں سات دہرائی جانے والی آیات اور عظیم قرآن''۔

سبعہ مثانی اور قرآن

''سبع مثانی'' کی تفسیر میں اختلاف ہے مگر جس قول کی تائید میں حدیث رسول بھی وارد ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ''سات دہرائی جانے والی آیات'' سے مراد سورۂ حمد ہے۔[4] جس کی آیات کی تعداد سات ہے اور اس کا پڑھنا ہر ایک پر لازم ہے[5]۔ اس کا بلحاظ خصوصیت و اہمیت تمام قرآن سے پہلے امتیازی طور پر ذکر کیا گیا ہے بلکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ اسی سورہ حمد کو ''قرآن عظیم'' بھی کہا گیا ہے، اس لیے کہ لفظ قرآن جس طرح کل کتاب کا نام ہے، اسی طرح ہر جز پر بھی صادق ہے۔[6] مگر زیادہ رجحان اسی کو ہے کہ قرآن عظیم سے سورہ حمد کے علاوہ پورا قرآن مراد ہے۔[7]

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾

''نہ بڑھائیے اپنی آنکھوں کو ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے بہرہ مند کیا ہے ان میں سے مختلف طرح کے

---

[1] بتکذیبھم صالحا لانّہ تکذیب لباقی الرّسل لاشتراکھم فی المجیئی بالتوحید (جلالین)
[2] ما کانوا یکسبون من نبآء الحصون و جمع الاموال (جلالین)
[3] ما کانوا یکسبون من الملاذ القبیحۃ (تبیان)
[4] فاتحۃ الکتاب (علی بن ابراھیم) روی عن النبی ﷺ قال: السمیع المثانی ام القرآن (تبیان)
[5] ھی سبع اٰیات بلا خلاف فی جملتھا و انا سمیت مثانی لانھا شئی فی صلوۃ و قراۃ (تبیان)
[6] سات آیات مکرر کہا سورہ فاتحہ کو اور بڑا قرآن بھی اسی کو کہا۔ ہر سورہ قرآن ہے، یہ سب سے بڑا ہے، درجہ میں (موضح القرآن)
[7] تقدیرہ و اٰتیناک القراٰن العظیم سوی الحمد (تبیان)

لوگوں کو[1] اور نہ ان پر رنج کیجئے اور جھک کر ملئے ایمان والوں سے۔ اور کہئے کہ میں تو کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں''۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَۙ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَۙ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۹۳﴾

''جس طرح ہم نے نازل کیا تقسیم کرنے والوں پر۔ جنہوں نے کتاب الٰہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تو قسم تمہارے پروردگار کی، ہم ان سے جواب طلب کریں گے۔ اس کے متعلق جو وہ کرتے تھے'' ''ہم نے نازل کیا'' یعنی عذاب۔

''تقسیم'' سے کیا مراد ہے؟ وہی جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ ''نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ'' کسی جز پر ایمان لاتے ہیں یا اس پر عمل کرتے ہیں اور کسی جز کا انکار کرتے ہیں یا اس پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔[2] اب چونکہ یہ اہل کتاب کا ذکر ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ یہاں قرآن سے مراد خود ان کی کتاب یعنی توریت ہے[3] مگر توریت کی تعبیر کے لیے لفظ ''قرآن'' سے مجھے کوئی نظیر قرآن مجید میں معلوم نہیں ہے۔ دوسرے معنی تقسیم کے یہ کہے گئے ہیں کہ مشرکین نے مکہ معظّمہ کے راستوں کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا کہ وہ وہاں گردش کر کے لوگوں کو اسلام سے روکتے تھے، اب ''مقتسمین'' کا لفظ تو اس طرح کچھ بن جاتا ہے مگر یہ لوگ قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کس طرح کرتے تھے؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ قرآن کے بارے میں وہ تقسیم ہو گئے ہیں، کوئی سحر کہتا ہے اور کوئی کہانت اور کوئی شعر۔

یہ دونوں قول بھی جلالین نے درج کیے ہیں۔ جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ اس قوم ثمود کے لوگ مراد ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ ہے کہ انہوں نے آپس میں قسمیں کھا کر جناب صالح علیہ السلام کی مخالفت اور ان کی جان لینے کا منصوبہ بنایا۔[4] اس میں بھی المقتسمین کے ساتھ دوسرا ٹکڑا چسپاں نہیں ہوتا مشکل یہ ہے کہ ان اقوال میں سے کوئی بھی قول کسی معصومؑ سے مروی نہیں ہے، اس لیے الفاظ آیت بجائے خود محکم ہوں بھی تو ہمارے لیے از قسم متشابہات ہو گئے ہیں جن کے معنی کو وثوق کے ساتھ معین کرنے سے ہم قاصر ہیں۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴿۹۴﴾

''تو ظاہر کیجئے آپ اسے جس پر آپ مامور ہیں اور مشرکین کا کوئی خیال نہ کیجئے''۔

یعنی اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ اس اعلان کے بعد مشرکین کیا کیا کہیں گے اور کیا کریں گے۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَۙ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ

---

[1] ۔اضافامنھم (جلالین)

[2] ۔یعنی بر اھل کتاب کہ بر بعض آیات عمل می کردند و بر بعض نہ (فتح الرحمن)

[3] ۔المقتسمین الیھود و النصارٰی الذین جعلوا القرآن ای کتبھم المنزلۃ عضین اجزاء حیث اٰمنوا ببعض و کفروا ببعض (جلالین)

[4] ۔قال ابن زید ھم قوم صالح تقاسموا لنبیتنہ واھلہ (تبیان)

يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

''ہم نے آپ کی طرف سے نپٹ لیا ہے ان تمسخر کرنے والوں سے۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرا خدا قرار دیتے ہیں تو ان کو بہت جلد انجام کا حال معلوم ہوگا''۔

''تفاسیر بتلاتی ہیں کہ یہ کچھ خاص مشرکین تھے [۱] جو طرح طرح کی بلاؤں میں گرفتار ہوکر ختم ہوگئے اور عذاب آخرت کے پہلے عقوبت میں گرفتار ہوئے۔[۲] ''معلوم ہوگا'' یہ ان کے عمل کی اخروی پاداش پر تنبیہ ہے بلکہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی سزا ان آفتوں سے جو اس دنیا میں ان پر پڑیں مل گئی۔ انہیں بلکہ آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے جس کا حال انہیں بعد میں معلوم ہوگا۔[۳]

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

''اور ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو دل تنگی ہوتی ہے اس سے جو وہ باتیں کرتے ہیں۔ تو آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے رہیے۔ اور عبادت کیجئے اپنے پروردگار کی جب تک کہ موت والی یقینی ساعت سامنے آئے''۔

مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے فرائض عبودیت کو آخر نفس تک انجام دیتے رہیے، پھر خلق خدا کی پرواہ نہ کیجیے کہ وہ آپ کے لیے کیا کیا کہتی ہے۔ اسی کو سورہ کوثر میں یوں کہا گیا ہے کہ:۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ: آپ نمازیں پڑھتے رہیے اور قربانی کا فرض ادا کیجیے، جو آپ کا دشمن ہے، اسی کی نسل قطع ہوگی

موت کو یقین اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ بالکل یقینی چیز ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

جمہور علمائے امت اس کی یہی معنی سمجھتے اور کہتے ہیں۔[۴]

---

[۱]۔ المستھزء ون برسول اللہ خمسة (على بن ابراهيم) خمسة نفر من قريش: الوليد بن المغيرة والعاص بن وائل و ابو زصعة والاسود بن عبد الغوث والحرث بن عطيلة. (تبيان)

[۲]۔ اهلكنا كلّا منهم بأفة (جلالين)

[۳]۔ يعلمون وبال ذٰلك يوم القيمة (تبيان)

[۴]۔ معناه حتى ياتيه الموت (تبيان) اليقين الموت (جلالين)

سُوۡرَةُ النَّحۡلِ

مکیّہ-----۱۲۸ آیات [ا]

چونکہ اس سورہ میں شہد کی مکھی کا خاص طور پر ذکر ہے، اس لیے اس کا یہ نام ہوا، اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل مضامین ہیں:-

سورۂ نحل کے خاص خاص مضامین:

۱......مخلوقات الٰہی مختلف قسم کے حیوانات اور اجرام سماویہ وغیرہ کے ذکر کے ساتھ یہ اعلان کی نعمات الٰہیہ کے شمار سے تمام انسان مل کر بھی قاصر ہیں۔

۲......یہ کہ انسان اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے عذاب میں بھی شریک ہوگا جنہیں اس نے گمراہ کیا ہے۔

۳......ملائکہ اور اہل بہشت کے الفاظ سلام۔

۴......ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متحد ہونا۔

۵......آسمان و زمین کی ہر شے اللہ کے لیے سر بسجود۔

۶......لڑکیوں کی ولادت پر لوگوں کا رنجیدہ ہونا اہل جاہلیت کا طریقہ

۷......خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت۔

۸......ہر امت کا ایک گواہ اور رسولؐ ان گواہوں کے گواہ۔

۹......وہ آیت جو اچھائیوں اور برائیوں کے تمام اقسام پر ہمہ گیر حیثیت سے حاوی ہے۔

۱۰......نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمہ دار

۱۱......تلاوت قرآن کے موقع پر اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ کہنے کا حکم۔

۱۲......ضرورت کے موقع پر تقیہ کا صریحی حکم۔

۱۳......حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عبادت گزار امت

۱۴......اتباع ملت ابراہیم کا حکم

۱۵......دعوت و تبلیغ کے لیے حکیمانہ انداز کی ہدایت

۱۶......ضبط و تحمل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید وغیرہ وغیرہ

[ا] مائة و ثمان وعشرون اٰیة لیس فیها خلاف (تبیان)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ①

"اللہ کا حکم آ گیا ہے تو تم اس کے متعلق جلدی نہ کرو، پاک ہے وہ اور برتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں"۔

"اللہ کا حکم" یعنی اسلام کے غلبہ اور اشاعت دین کے متعلق قدرت کا جو فیصلہ ہے، وہ اب ظہور پذیر ہوا ہی چاہتا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مشرکین عذاب الٰہی کا جو تقاضا کرتے تھے، انہیں یہ جواب دیا گیا ہے۔[2]

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ③

وہ فرشتوں کو اتارتا ہے اپنے حکم خاص کی روح کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کہ متنبہ کرو کہ کوئی خدا نہیں سوا میرے تو تم میری ناراضگی سے اپنے بچاؤ کا سامان کرو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ جو وہ لوگ شرک کرتے ہیں۔

بعد میں انبیاء کے جس پیغام کا ذکر ہے کہ "کوئی خدا نہیں سوا میرے" یہی وہ ہے جسے اپنے حکم خاص کی روح کہا گیا ہے۔[3]

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ④

"اس نے انسان کو ایک قطرہ گندیدہ سے پیدا کیا، اب ایک دم وہ ہے کہ کھلا ہوا جھگڑالو نظر آ رہا ہے"۔

یعنی یہ انسان اگر اپنی اصلیت پر غور کرے تو تفاخر بےمحل سے کام نہ لے مگر وہ اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے اور خواہ مخواہ سینہ تانے ہوئے فخر و مباہات پر نظر آتا ہے۔

یا یہ کہ اپنی ابتدائے خلقت پر نظر رکھتا تو دوسری دفعہ کی زندگی پر جو جزا و سزا کے لیے ہوگی بحث و انکار کے لیے آمادہ نہ ہوتا مگر اس قادر مطلق نے جس طرح اسے پہلی دفعہ پیدا کیا، اسے یہ بھول جاتا ہے اور اس لیے آخرت میں دوبارہ زندہ کیے جانے کو سن کر بحث کرنے اور لڑنے پر تیار ہو جاتا ہے۔[4]

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ⑤ وَلَكُمْ فِیْهَا

---

[1] ۔اتی بصیغة الماضی التحقیق وقوعه ای قرب (جلالین)

[2] ۔امر اللہ یراد به العذاب فی قول الحسن و ابن جریج وغیرهما (تبیان)

[3] ۔فسر ذلك یقوله: "ان انذروا" وهو یدل من الروح (تبیان)

[4] ۔خصیم شدید الخصومة... قائلا من یحیی العظام وهی رمیم (جلالین)

جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝٦ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝٧ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٨

''اور چوپائے اس نے پیدا کیے کہ تمہارے لیے ان میں جڑاول ہے اور دوسرے فائدے اور انہی سے تم غذا حاصل کرتے ہو۔ اور تمہارے لیے ان میں تزک و احتشام کا سامان ہے جبکہ شام کو واپس لاتے ہو اور جب چراگاہوں کی طرف روانہ کرتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھوں کو اٹھاتے ہیں شہر کی طرف جہاں تک تم پہنچ نہیں سکتے تھے مگر جانکاہ زحمت و مشقت کے ساتھ، بے شک تمہارا پروردگار بڑا شفیق ہے، بہت مہربان۔ اور گھوڑے، خچر اور گدھے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور آرائش کے لیے اور پیدا کرے گا وہ وہ چیزیں جنہیں تم ابھی جانتے بھی نہیں ہو''۔

غور کیا جائے تو اس وقت اور اس کے بعد بھی آئندہ جو جو تیز رفتار ذرائع نقل و حرکت ظہور میں آ رہے ہیں، سب قرآن کے اس مجمل اعلان يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ''پیدا کرے گا وہ وہ چیزیں جو تم ابھی جانتے نہیں۔'' کی تفصیل ہیں جو سامنے آتی رہتی ہیں۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٩

''اور اللہ پر ہے سیدھے راستے کا دکھانا اور بعض ان میں سے کج ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا''۔

''اللہ پر ہے سیدھے راستے کا دکھانا'' یعنی اس حد تک رہنمائی جو جبر کی حد تک نہ پہنچے اس کے ذمہ ہے۔

اس طرح یہ علیٰ کا لفظ ذمہ داری کے اظہار کے لیے ہے اور اس سے مذہب امامیہ کا یہ مسئلہ علم کلام کا ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ پر واجب ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قسم کا لطف ہر حال میں واجب ہے بلکہ لطف وہی جو اتمام حجت کے لیے ضروری ہے۔

جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے:۔

وعلى الله قصد السبيل اى بيان الطريق المستقيم

اللہ پر ہے سیدھا راستہ یعنی سیدھے راستے کا بیان کرنا۔

جناب ابن عباس کی تشریح اس کے مطابق ہے [1] مگر شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان نے اس کے معنی یہ قرار دیے ہیں کہ ''اللہ تک پہنچتا ہے اور سیدھا راستہ۔ [2]

میرے خیال میں آیت کے بعد والے مضمون سے پہلے مفہوم کا تعلق زیادہ ہے۔ بعد میں جو ہے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے

---

[1]۔ قال ابن عباس على الله قصد السبيل (تبيان)

[2]۔ بر خدا می رسد راه میانه (شاہ ولی اللہ) اور اوپر اللہ کے پہنچتی ہے سیدھی راہ (شاہ رفیع الدین) یعنی اس کی قدرتیں دیکھ کر صاف معلوم ہوتی ہیں اس کی خوبیاں اور جس کی عقل سیدھی نہیں وہ بہکتا ہے۔ (موضح القرآن)

راستے پر لگا دیتا یعنی جبری طور پر[1] مگر اس کی حکمت کاملہ جبر کی متقاضی نہیں ہے اس لیے کچھ لوگ اپنے سوءِ اختیار سے غلط راستے پر لگ جاتے ہیں۔

اب پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بحدِ اتمام حجت سب کو سیدھا راستہ دکھائے، وہ اپنی ذمہ داری کو بہر حال پورا کرتا ہے مگر کچھ لوگ اس کی رہنمائی کا اثر قبول نہیں کرتے، وہ غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں اور اگر اللہ جبر سے کام لیتا تو سب ہی منزل مقصد تک پہنچ جاتے پھر جائز کوئی نہ ہوتا مگر جبر سے کام لینا اس کے عدل و حکمت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ⑩
يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ⑪

''وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا تمہارے لیے اس میں سے پینے کا بھی ہوتا ہے اور اسی سے وہ پودے بھی ہوتے ہیں جن سے تم چراگاہ بناتے ہو۔ تمہارے لیے اگاتا ہے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور طرح طرح کے پھلوں میں سے، یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں''۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ⑫ۙ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ⑬

''اور تمہارے قبضے میں دیئے رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستارے سب قبضے میں ہیں اس کے حکم سے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔ اور جو کچھ رنگ برنگ کی چیزیں پیدا کیں تمہارے لیے زمین میں یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو سبق لیں''۔

اب دنیا اس پر غور کرے کہ رات اور دن، اور سورج وغیرہ اس کے قبضے میں کہا ہیں؟ اور اگر نہیں ہیں واقعاً نہیں ہی تو سمجھنا چاہیے کہ ہم ابھی اس انسانی ترقی کے نقطہ پر نہیں ہیں جن کی نشان دہی قرآن کر رہا ہے اور اب اگر کچھ بلند ہستیاں ایسی سننے میں آئیں کہ رات اور دن اور سورج وغیرہ پر ان کا قبضہ تھا تو اس کے انکار پر تل نہ جائے بلکہ سمجھے کہ قرآنی آیت کی روشنی میں ایسی ہستیوں کا وجود ہر دور میں ممکن ہے بلکہ ہونا چاہیے جن کے قبضہ میں یہ سب چیزیں ہوں۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً

[1]۔ قال الحسن و البلخي لو شاء لهٰدكم بالالجاء لانّه قادر علىٰ ذٰلك (تبيان)

تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٤﴾

''اور وہی ہے جس نے قابو میں کیا ہے دریا کو کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور نکالو اس میں سے زیور جنہیں تم پہنو اور دیکھو گے تم کشتیوں کو اس میں چلتے ہوئے اور اس لیے کہ تم لوگ اس کے فضل و کرم سے نفع کماؤ اور شاید تم شکر گزار ثابت ہو''۔

''تازہ گوشت'' یعنی مچھلی [1] اور زیور یعنی موتی مونگا [2] جو دریا سے برآمد ہوتے ہیں اور نفع کماؤ یعنی تجارت کرو جو منافع حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔[3]

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥﴾ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿١٦﴾

''اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیئے کہ وہ تمہیں لیے ہوئے ڈانوا ڈول نہ ہو [4] اور نہریں اور سڑکیں شاید کہ تم راستا پاؤ۔ اور طرح طرح کے نشان اور ستاروں [5] سے وہ لوگ راستا پاتے ہیں''۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٧﴾

''کیا جو خالق ہو، وہ اس کے مثل ہے کہ جو خالق نہ ہو؟ کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے''۔

اس میں بت پرستوں کے لیے انتباہ ہے کہ آخر ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جو کسی چیز کے خلق کرنے پر قادر نہیں ہیں۔[6]

اس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہوتے ہیں یا نہیں جو جبر و اختیار کے موضوع میں شیعہ سنی کا ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨﴾

''اور اگر شمار کرنا چاہو اللہ کی نعمتوں کو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

یعنی باوجود گناہوں کے بھی اس کی نعمت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس سے بڑھ کر بخشش و ترحم اور کیا ہوگا؟!

---

[1]۔ فتصطادون منه انواع السمك فتاكلون لحماً طريّا (تبيان)

[2]۔ ما يخرج من البحر من انواع الجواهر (علی بن ابراهيم)

[3]۔ تطلبوا من فضله تعالىٰ بالتجارة (جلالين)

[4]۔ ای لئلا تميد بكم الارض (تبيان)

[5]۔ بالنجم بمعنى النجوم (جلالين) فاخبر بالواحد عن الجميع كما قال: اذا الطفل الذين لم يظهروا على عورات النسآء (تبيان)

[6]۔ فی هذه الآية وعلى عبادا الاصنام والاوثان (تبيان)

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿١٩﴾ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿٢٠﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٢١﴾

"اور اللہ جانتا ہے اسے جو تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو۔ اور جنہیں وہ پکارتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے۔ وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں اور انہیں خبر نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے"۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

"شاید یہ ان کو فرمایا جو مرے بزرگوں کو پوجتے ہیں" (موضح القرآن)

اس کے خلاف جلالین نے اسے صاف اصنام سے متعلق کیا ہے[1] ہماری بھی قدیم تفسیر اسی سے متعلق ہے۔[2]

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿٢٣﴾

تمہارا خدا ایک خدا ہے تو وہ لوگ جو آخرت پر ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں، ان کے دل انکار کرتے ہیں اور وہ تکبر سے کام لیتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ جانتا ہے اسے کہ جو وہ چھپاتے ہیں اور (اسے بھی کہ) جو وہ ظاہر کرتے ہیں، یقیناً وہ دوست نہیں رکھتا تکبر کرنے والوں کو۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿٢٥﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا اتارا ہے تمہارے پروردگار نے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اگلے لوگوں کی بے بنیاد

[1] ما یشعرون ای الاصنام ایان یوم یبعثون ای اخلق فیکف یعبدون اذلا یکون الھا الا الخالق الحی العالم بالبعث (جلالین)
[2] ردعلی عبدۃ الاصنام (علی بن ابراھیم)

داستانیں ہیں[1]۔جس کا انجام یہ ہے[2] کہ وہ اپنے بھی بوجھ پورے اٹھائیں گے قیامت کے دن اور کچھ ان کے بھی بوجھ جنہیں یہ ناواقفیت میں گمراہ کرتے ہیں، آگاہ رہو کہ کتنا برا ہے وہ بوجھ جو وہ اٹھا رہے ہیں۔

اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ جنہیں گمراہ کیا ہے

دوسروں کے بوجھ بھی ان کے سر پر ہیں، اس لیے کہ یہ ان کے لیے معاصی کے ارتکاب کا باعث رہے ہیں، اگرچہ وہ خود بھی اپنے ارادہ واختیار سے ان کے کہنے میں آنے کی وجہ سے بحیثیت مرتکب گناہ کے ان بوجھوں سے آسودہ نہیں ہیں جیسا کہ حدیث رسولؐ میں ہے:

ایما داع دعا الی الھدٰی فاتّبع فلہ مثل اجورھم. من غیر ان ینقص من اجورھم شئی و ایما داع دعا الی الضّلالۃ فانّ علیہ مثل اوزار من اتبعہ من غیر ان ینقص من اوزارھم شئی (تبیان)

جو رہنما راہ راست کی طرف دعوت دے اور اس کی پیروی ہو تو اسے ان تمام لوگوں کے ثواب کے برابر ملے گا، بغیر اس کے کہ خود ان پیروؤں کے ثواب میں کچھ کمی ہو اور جو راستہ بتانے والا گمراہی کی دعوت دے، اس پر ان تمام لوگوں کے بوجھوں کے برابر بوجھ ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی بغیر اس کے کہ ان پیروؤں کے بوجھ میں کچھ کمی ہو۔

قَدۡ مَكَرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتَى اللّٰهُ بُنۡيَانَهُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيۡهِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَاَتٰٮهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

”جو ان کے پہلے تھے، اُنہوں نے بھی ایسی ہی ترکیبیں کی تھیں تو اللہ آیا اُن کی عمارت پر بنیادوں کی طرف سے تو اُن پر گر پڑی چھت اُن کے اوپر سے اور آ گیا اُن پر عذاب اس صورت سے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی“۔

بعض لوگوں نے بنیاد اور چھت وغیرہ کا نام دیکھ کر کہا ہے کہ یہ نمرود کا ذکر ہے جس نے بڑی عالیشان ایک عمارت بنوائی تھی کہ اس کی چھت پر چڑھ کر خدائے آسمانی سے جنگ کرے اور یہ اس عمارت کے گرنے کا ذکر ہے۔[3] مگر دوسرا خیال یہ ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمثیلی طور پر ان کے منصوبوں کے شکست کھانے کا ذکر ہے جو اس پیرایہ میں کہا گیا ہے۔[4]

ثُمَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُخۡزِيۡهِمۡ وَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تُشَآقُّوۡنَ فِيۡهِمۡ‌ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اِنَّ الۡخِزۡىَ الۡيَوۡمَ وَالسُّوۡۤءَ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۙ﴿۲۷﴾

---

[1]۔اکاذیب الاوّلین (علی بن ابراھیم و جلالین)

[2]۔اللّام لام العاقبۃ لانّھم لم یقصدوا بما فعلوہ لیتحملوا اوزارھم (تبیان)

[3]۔ھو نمرود بنٰی صرحا طویلا لیصور منہ الی السّماء فیقاتل اھلھا (جلالین)

[4]۔قال الزجاج و ابوبکر الانیاری... وھٰذا الّذی ذکرہ یلیق بکلام العرب ویشبھہ (تبیان) این تمثیل است فساد مکر ایشان را بابلغ وجوہ (فتح الرحمٰن)

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

''پھر قیامت کے دن وہ انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم لڑا کرتے تھے؟ کہا ان لوگوں نے کہ جنہیں علم عطا ہوا تھا کہ بلاشبہ رسوائی آج کے دن اور برائی ان کافروں پر ہے۔جن کی قبض روح کریں گے فرشتے اس عالم میں کہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے، ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے کیوں نہیں، یقیناً اللہ جانتا ہے اسے جو تم اعمال کرتے تھے۔تو اب داخل ہو دوزخ کے دروازوں میں۔اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے تو کیا برا ٹھکانا ہے وہ سرکشی کرنے والوں کا''۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اور کہا گیا ان سے جو بچے رہے تھے [1] کہ کیا تھا وہ جو تمہارے پروردگار نے اتارا؟ انہوں نے کہا اچھا ہی اچھا، ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اس دنیا میں اچھائی کی، اچھائی ہی ہے اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیا کہنا پرہیزگاروں کے گھر کا۔ہمیشہ رہنے والے بہشت جن میں وہ داخل ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے ان میں وہ سب ہوگا جو وہ چاہتے ہوں۔یقیناً اس طرح صلہ دیتے ہیں ہم پرہیزگاروں کو۔جن کی قبض روح کرتے ہیں فرشتے اس عالم میں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں، کہتے ہیں سلام تم پر، داخل ہو بہشت میں ان اعمال کی بدولت جو تم کرتے تھے''۔

یعنی اہل ایمان کو جو جزا ملے گی، وہ صرف ایمان کی بنا پر نہیں، بلکہ ایمان کے ساتھ ان اعمال خیر کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ

[1] ۔اتقوا الشرك (جلالین)

مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۴﴾

''کیا وہ انتظار کرتے ہیں سوا اس کے کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا تمہارے پروردگار کا حکم آئے، ایسا ہی کیا تھا ان لوگوں نے کہ جو ان کے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ تو پہنچیں ان کو برائیاں اُنہی اعمال کی جو انہوں نے کیے تھے اور نازل ہوا ان پر وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے''۔

''جب تک حکم پروردگار آئے'' اس حکم میں عذاب کا نازل ہونا بھی ہے اور موت کا ہنگام بھی اور امام آخر الزمان کا ظہور بھی۔[1]

وَقَالَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ نَّحۡنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ فَهَلۡ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۳۵﴾

''اور کہا ان لوگوں نے جو مشرک ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہ بناتے، ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے، ایسا ہی کیا ان لوگوں نے جو ان کے پہلے تھے تو پیغمبروں کا فرض کیا واضح طور پر تبلیغ کے سوا کچھ اور ہے''۔

مشرکین کا استدلال بظاہر تصور جبر پر مبنی ہے یعنی جب بغیر ارادہ باری تعالٰی پتی نہیں ہلتی تو ہمارے شرک کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے اور جو آپ ہم پر معترض ہیں کہ ہم نے احکام ایجاد کیے ہیں تو وہ بھی اللہ ہی کے ارادہ سے ہیں[2] پھر ہمیں اس کی سزا کیوں کر مل سکتی ہے؟ مگر شاہ ولی اللہ نے کچھ عجیب طرح اسے مسئلہ اجماع سے مرتبط کیا ہے وہ فرماتے ہیں:-

یعنی سلف ما اجماع کردہ اند و آں بدون رضائے خدا منعقد نمی شود (فتح الرحمن)

یعنی ہمارے اسلاف نے اس پر اجماع کیا ہے اور وہ بغیر رضائے الٰہی نہیں ہوا کرتا۔

حالانکہ اگر آیت کا یہ مطلب ہو اور یہ آیت کے انداز سے بالکل ظاہر ہے کہ مشرکین کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے غلط ہے تو اس سے اجماع کا بطلان ثابت ہوگا جس طرح مشرکین کا یہ استدلال باطل تھا، اور نہ ان کی بت پرستی اور بدعت آفرینی حق ہوتی، اسی طرح کبھی بھی کوئی جماعت صرف اجماع سلف کو اپنی دلیل قرار دے لے تو وہ استدلال باطل ہی ہوگا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس آیت قرآن کے الفاظ سے یہ اجماع والا استدلال ظاہر نہیں ہوتا بلکہ وہی جبر والا تصور سمجھ میں آتا ہے اور چونکہ جبر کا تصور باطل ہے، اس لیے ان کا استدلال بھی غلط ہے۔ شاہ عبدالقادر نے جو تشریح کی ہے، اس سے ظاہر مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ وہ اسے جبر سے متعلق سمجھتے ہیں مگر چونکہ مسئلہ جبر میں خود ان کا ذہن صاف نہیں ہے، اس لیے انہوں نے

---

[1] امر ربك من العذاب والموت وخروج القائم (علی بن ابراهیم)

[2] اراد الله ذٰلك منّا فلذٰلك فعلنا كما يقول المجبرة الضلال (تبیان)

مشرکین کی رد میں قرآن کے جواب کی جو تشریح کی ہے، اس سے تقریباً ان مشرکین کی تائید ہی ہوگئی، رد نہیں ہوئی وہ فرماتے ہیں:۔

''یہ نادانوں کے کلام ہیں کہ اللہ کو یہ کام برا لگتا تو کیوں کرنے دیتا مگر ہر فرقے کے نزدیک بعض کام برے ہیں۔ پھر وہ کیوں کرتے ہیں؟ یہاں جواب مجمل فرمایا کہ ہمیشہ رسول منع کرتے آئے ہیں اس سے، جس کی قسمت تھی ہدایت پائی، جو خراب ہونے والا تھا، خراب ہوا۔ اللہ کو یہی منظور ہے۔'' (موضح القرآن)

صحیح یہ ہے کہ انسان فاعل مختار ہے اور جبر سے کام لینا اس کی وجہ تخلیق اور اللہ کی حکمت کا مسئلہ کے خلاف ہے لہٰذا گمراہی اپنے ہاتھوں ہے اور اسے قسمت سے وابستہ کرنا غلط ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٦﴾

اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا کہ عبادت کرو اللہ کی اور داعیان باطل سے بچتے رہو تو ان میں سے کوئی وہ تھا جسے اللہ نے منزل تک پہنچا دیا اور کوئی وہ تھا جس کے گمراہی شامل حال رہی تو زمین پر چل پھر کر ذرا دیکھو کہ کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متّحد ہونا

طاغوت کی تشریح جو شاہ عبدالقادر نے کی ہے، وہ یہ ہے:۔

''ہر ڈنگا میں جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے، کچھ سند نہ رکھے، اسی کو طاغوت کہتے ہیں، بت اور شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں۔'' (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین میں جناب شیخ الطائفہ نے یہ معنی لکھے ہیں:

اجتنبوا اغوآء الشیطان بکل داع یدعوا الی الفساد (تبیان)

بچنے کی کوشش کرو شیطان کی کوشش سے ہر ایسے دعوت دینے والے کے ذریعے سے جو خرابی کی دعوت دیتا ہے۔

إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٣٧﴾

''اگر آپ ان کے صحیح راستے پر آنے کی بڑی آرزو رکھتے ہیں تو (کیا ہوتا ہے) یقیناً اللہ منزل تک نہیں پہنچاتا اسے جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہیں''۔

یہ گمراہی میں اس کا چھوڑ دینا یعنی توفیقات کا سلب کر لینا نتیجہ ہوتا ہے ان کے سوء اختیار کا کہ وہ راہ راست پر آنا نہیں چاہتے تو اللہ نے بھی ان سے ہاتھ اٹھا لیا، پھر آپ کی آرزو سے کیا نتیجہ نکلے گا۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِىْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾

''اورانہوں نے قسم کھائی اللہ کی انتہائی سخت قسمیں کہ اللہ دوبارہ زندہ نہیں کرے گا اسے کہ جو مر جائے، کیوں نہیں؟ یہ اس کے ذمہ دعدہ ہے سچا لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں۔ تا کہ ظاہر کرے ان پر وہ کہ جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور تا کہ جانیں وہ جو کافر ہیں کہ وہ جھوٹے تھے''۔

یعنی دنیا میں تو کوئی باز پرس نہیں، اکثر باطل پرست عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں، اس سے وہ دوسروں کو اس فریب میں مبتلا کرتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں۔ اگر حق پر نہ ہوتے تو ہمیں اللہ طاقت و اقتدار کیوں عطا کرتا؟ ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازتا کیوں؟ ضرورت ہے کہ ایک دوسرا دورِ حیات ہو جس میں جو جس قابل ہے، اس کا ویسا ہی انجام سامنے آئے، اس طرح حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور کافروں کو بھی جو اپنے سچے ہونے کا زعم باطل ہے، وہ ختم ہو جائے، وہ جان لیں یعنی ماننے پر مجبور ہوں کہ وہ جھوٹے تھے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَىْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

''ہمارا کہنا ہوتا ہے بس کسی چیز کے لیے جب ہم اس کا ارادہ کریں یہ کہ ہم کہیں اسے ہو جا اور بس بلا توقف وہ ہو جاتی ہے''۔

یہ مضمون تو متعدد مقامات پر قرآن مجید میں آیا ہے مگر اس جگہ اس کا مطلب بشرطیکہ وہ محل تنزیل میں اسی جگہ کی آیت ہو، یہ ہوگا کہ یہ دوبارہ زندہ کیا جانا ہماری قدرت قاہرہ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور وہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، اس کے بعد کہ ان پر ظلم ہوئے، انہیں ہم دنیا میں بھی اچھی جگہ دیں گے اور آخرت کا ثواب اس سے بھی بڑا ہوگا، کاش کہ وہ جانیں۔ انہیں جنہوں نے صبر کیا اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے تھے''۔

چونکہ یعلمون پر وقف نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اتصال بعد والے الفاظ کے ساتھ ہے لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ ''کاش کہ وہ جانیں'' کا تعلق ان کے ساتھ ہے جن کا ذکر بعد کو ہے کہ ''جنہوں نے صبر کیا اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے تھے۔'' انہیں جاننے کا مطلب یہ ہے

کہ ان کی منزل سمجھیں کہ انہیں آخرت میں کتنا بڑا اجر ملتا ہے تو پھر اس کردار کو اختیار کریں جو بہترین کردار ہے اور بہترین اجر کا ذمہ دار ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٣﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٤﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کے پہلے مگر آدمیوں ہی کو جن کی جانب ہم وحی بھیجتے تو پوچھ لو یادداشت رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے۔ کھلی ہوئی دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ اور آپ کی طرف ہم نے یہ یادداشت اتاری ہے تاکہ آپ بیان کریں لوگوں کے سامنے وہ جو ان کی جانب احکام اتارے گئے ہیں اور شاید وہ غور وفکر سے کام لیں''۔

اہل ذکر سے سوال کا حکم

اھل الذّکر کا ترجمہ ''یادداشت رکھنے والے'' لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہے لیکن مراد اس سے کون ہیں؟

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد علمائے اہل کتاب ہیں چونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ الذکر کے لفظ سے توریت مراد لی گئی ہے:- وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ(انبیاء ۱۰۵)

مگر اہل بیت معصومینؑ کی تفسیر یہ ہے کہ الذکر سے مراد قرآن ہے جیسا کہ ذکر ہوا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ(حجر...۹)

بلاشبہ ہم نے یہ ذکر اتارا ہے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اور ذکر رسولا سے مراد قرآن کے حقیقی عالم یعنی اہل بیت طاہرین علیہم السلام ہیں [1] جب کہ خود ہمارے رسول کو اھل الذکر کہہ کر ذکر کا مصداق قرار دیا گیا ہے تو اس لحاظ سے بھی اھل الذکر آل رسولؐ ہوئے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰي تَخَوُّفٍ ۭ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤٧﴾

''تو کیا مطمئن ہیں وہ جنہوں نے بری بری ترکیبیں کیں اس سے کہ اللہ زمین کو ان کے ساتھ دھنسا دے یا ان پر عذاب آئے ایسی صورت میں جس کی انہیں خبر بھی نہ ہو۔ یا وہ انہیں گرفت میں لے لے ان کی نقل وحرکت کے عالم

[1] روی جابر عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال: نحن اھل الذکر (علی بن ابراھیم)

میں تو وہ اسے روک نہیں سکتے۔ یا ان کو گرفت میں لے لے خوف و دہشت کے عالم میں مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار بخشنے والا ہے بڑا مہربان''۔

''نقل وحرکت کے عالم میں'' یعنی جب وہ خرید وفروخت کے سلسلہ میں یا دوسرے کاموں کے لیے ادھر ادھر جاتے ہیں۔[1]

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

''کیا نہیں دیکھا انہوں نے کسی چیز کو جو اللہ نے پیدا کی ہے کہ اس کی پرچھائیاں پلٹتی ہیں دائیں اور بائیں سمتوں سے اللہ کو سجدہ کرتی ہوئی اور وہ تذلل کے عالم میں ہیں''۔

''ہر چیز ٹھیک دوپہر میں کھڑی ہے، اس کا سایہ بھی کھڑا ہے، جب دن ڈھلا سایہ جھکا، پھر جھکتے جھکتے شام تک زمین پر پڑ گیا جیسے نماز میں کھڑے سے رکوع، رکوع سے سجدہ، اسی طرح ہر چیز آپ کھڑی ہے، اپنے سایہ سے نماز کرتی ہے، کسی ملک میں کسی موسم میں داہنی طرف جھکتا ہے کبھی بائیں طرف۔'' (موضح القرآن)

اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے سایہ کی ظاہری شکل سے جو اس میں رکوع وسجود کی شکل پیدا ہوتی ہے، عوامی ذہن کو رکوع وسجود کی کیفیت کی طرف منتقل کیا ہے کہ پرچھائیوں میں تو یہ بات، اسباب طبیع کے تغیرات سے قہری طور پر ہوتی ہے، تم اسے ارادی طور پر اختیار کرو۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ السجدة

''اور اللہ کے لیے سربسجود ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے چلنے پھرنے والی مخلوق اور فرشتے اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔ وہ اپنے پروردگار سے جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور وہ کرتے ہیں وہی کہ جس پر مامور ہوتے ہیں''۔

آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود

ان آیات بیان کیا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور اللہ نے کہا کہ دو خدا نہ مانو، وہ بس ایک خدا ہے تو مجھ سے بس ڈرتے رہو۔ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور

---

[1] اذا جاء وا وذهبوا في التجارات وفي اعمالهم ناخذهم في تلك الحالة (علي بن ابراهيم)

زمین میں ہے اور اس کی عبادت بہرحال لازم ہے[1] تو کیا اللہ کے سوا دوسرے سے ڈرو گے"۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۟ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اور جو تمہارے پاس نعمت ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تم پر مصیبت آتی ہے تو اسی کی طرف تم چیختے چلاتے ہو۔ پھر جب تم سے مصیبت کو وہ دور کر دیتا ہے تو ایک دم تم میں ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ تاکہ وہ کفران نعمت کریں، اس پر جو ہم نے انہیں عطا کیا تو فائدہ اٹھا لو، اس کے بعد بہت جلد تمہیں قدر و عافیت معلوم ہوگی"۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"اور ایسی چیزوں کا جنہیں وہ جانتے نہیں، حصہ قرار دیتے ہیں اس میں جو ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے۔ خدا کی قسم ضرور تم سے جواب دہی ہوگی اس کی جو تم من گھڑت باتیں بناتے ہو"۔

شاہ ولی اللہ نے تو اپنے ترجمہ میں اس کی تشریح "یعنی بتان" کے لفظ کے ساتھ کر دی ہے یعنی یہ مشرکین کا ذکر ہے جلالین نے بھی لمالایعلمون کی تشریح یہی کی ہے کہ:۔

لمالایعلمون انّھا لاتضرّ ولاتنفع وھی الاصنام.

جن کے متعلق انہیں یہ خبر نہیں کہ وہ نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ فائدہ اور وہ بت ہیں۔

ہماری قدیم تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔[2]

مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے اسے مطلق نذر و نیاز پر حاوی کر کے "وہابیت نوازی" کا ثبوت دیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ ان کو فرمایا ہے جو اپنے کھیت میں، مویشی میں، تجارت میں اللہ کے سوا کسی کی نیاز ٹھہراتے ہیں، سب مال اللہ کا ہے اور کسی کا حق نہیں مگر اللہ کی راہ میں دے اپنے ثواب پھر اپنے بدلے ثواب کسی کو دیوے" (موضح القرآن)

نذر و نیاز کا طریقہ "مذہب حق" کے پرستاروں میں یہی ہے کہ ابدائے ثواب کیا جاتا ہے اسے جس کی نیاز لازم دلانا ہے پھر معلوم نہیں اسے شاہ صاحب اس کو آیت قرآن کے تحت میں کیوں لاتے ہیں؟"

---

[1] واصبا ای واجبا (علی بن ابراھیم) قال ابن عباس دائما ای طاعته واجبه علی الدوام (تبیان)

[2] یجعلون للاصنام نصیبا فی زرعھم وابلھم وغنمھم فرد اللہ علیھم (علی بن ابراھیم)

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ
اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور وہ اللہ کے لیے پاک ہے اس کی ذات، لڑکیاں قرار دیتے ہیں اور خود ان کے لیے وہ ہے جس کے وہ خواہشمند ہیں۔ اور جب ان میں کسی ایک کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ رنج سے بھر جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ جاتا ہے اس خوش خبری کی برائی سے جو اسے دی گئی ہے۔ اب کیا وہ اسے حقارت کے ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں توپ ہی دے گا، آگاہ ہو کہ کتنا برا ہے وہ جو یہ حکم لگاتے ہیں''۔

لڑکیوں کی ولادت پر رنجیدہ ہونا اہل جاہلیّت کا طریقہ

ان کے مزعومہ کے ساتھ جو کہا گیا ''پاک ہے اس کی ذات'' وہ اس لیے نہیں کہ خاص لڑکی واقعاً کوئی بری چیز ہے بلکہ اس لیے کہ اولاد کی نسبت ہی اس کی شان کے خلاف ہے۔ اب یہ ان کے مزعومہ کی مزید کمزوری اور رکاکت ہے کہ وہ ایک تو اولاد کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں جو واقعاً اس کی شان الوہیت کے خلاف ہے اور پھر یہ خود اپنے لیے لڑکی کو بہت برا جانتے ہیں۔ مگر جسے وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس طرح کہ یہ فرض کر لیا ہے کہ ملائکہ صنف اناث میں ہیں اور یہ اس کی بیٹیاں ہیں، جس کے دونوں جز غلط ہیں۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

''ان کی جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، بری حالت ہے [1] اور اللہ کے لیے بلند ترین اوصاف ہیں اور وہ زبردست ہے، ہر کام ٹھیک انجام دینے والا''۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى
اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور اگر اللہ تمام لوگوں کو ان کی زیادتیوں کی بنا پر گرفت میں لیتا رہے تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو چھوڑے ہی نہیں مگر وہ تو انہیں ڈھیل دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک تو جب ان کی مدت آ جائے گی تو پھر ایک گھڑی نہ پیچھے ہوں گے اور نہ آگے بڑھیں گے''۔

[1] ۔ای لهم بذلك وصف سوء ولله الوصف الاعلیٰ من اخلاص التوحيد (تبيان)

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور اللہ کے لیے قرار دیتے ہیں وہ جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں غلط بات بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے کوئی شک نہیں کہ ان کے لیے آگ ہے اور وہ آگے بھیجے جانے والے ہیں''[1]۔

پہلے جز کے متعلق ایک خیال ہے کہ اس سے قبل کی آیات میں جو مضمون تھا، اس سے متعلق ہے یعنی وہ خود تو لڑکیاں ناپسند کرتے ہیں اور اللہ کے لیے لڑکیاں قرار دیتے ہیں چنانچہ شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:۔

یعنی یضیفون الی اللہ البنات مع کراھیۃ ذٰلك لنفوسھم (تبیان)

یعنی وہ لڑکیوں کی نسبت اللہ کی طرف دیتے ہیں باوجود یہ کہ خود اپنے لیے اسے ناپسند کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اس ترجمہ پر کہ ''آنچہ ناپسندی دارند'' حاشیہ دیا ہے ''یعنی دختران'' ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے اسے ایک دوسری بات سے متعلق قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

''یہ ان کو فرمایا جو ناکارہ چیزیں اللہ کے نام دیں اور اس پر یقین کریں کہ ہم کو بہشت ملے اور روز بروز دوزخ میں بڑھتے ہیں۔'' (موضح القرآن)

اسی آیت کے بعد والے الفاظ سے مجھے یہ مفہوم زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

''اللہ کی قسم ہم نے پیغمبر بھیجے بہت سی قوموں کی طرف آپ سے پہلے تو شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال سنوار کر پیش کیے جس کے بعد وہی آج ان کا سرپرست ہو سکتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

''اور ہم نے نازل نہیں کی آپ پر یہ کتاب مگر اس لیے کہ آپ ان کے لیے واضح طور پر بیان کر دیں اسے جس میں وہ باہم اختلاف رکھتے تھے اور ہدایت اور رحمت بنا کر ان کے لیے جو ایمان لائے ہیں''۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

---

[1] متروکون فیھا او مقدمون علیھا (جلالین) ای معذبون (علی بن ابراھیم)

لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۝۶۵

''اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی تو اس سے زمین کو اس کی موت کی حالت کے بعد زندگی بخشی، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے ان کے لیے جو سننے کے لیے تیار ہوں''۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۝۶۶ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۝۶۷

''اور بلا شبہ تمہارے لیے چوپایوں میں غور و فکر کا سرمایہ ہے۔ ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں اس سے کہ جوان کے شکم میں فضلہ اور خون کے بیچ میں سے نرا کھرا دودھ ہوتا ہے جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔ اور کھجوروں کے درخت اور انگور کے پھلوں سے کہ جن سے تم شراب اور اچھا رزق تیار کرتے ہو۔ یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو عقل سے کام لیں''۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''شراب'' کا ذکر اس آیت میں اس لیے ہے کہ اس وقت تک اس کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی[1] مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے ہی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کو خدا کی قدرت کی نمود کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے، اس لیے انہیں ان انتفاعات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو صنائع الٰہی سے حاصل کرتے ہیں اس میں شریعت کے حلال اور حرام سے بحث نہیں ہے، پھر یہ کہ انگور وغیرہ سے بنائی جانے والی چیزوں میں شراب کے ذکر کے بعد ''اور اچھا رزق'' کہنے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شراب اچھا رزق ''نہیں ہے ورنہ اسے'' ''رزق حسن'' سے الگ کر کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ اللہ نے یہ سب چیزیں تمہارے فائدہ کے لیے پیدا کی ہیں، اب یہ تمہارا سوء اختیار ہے کہ تم اس سے شراب تیار کرتے ہو جو تمہارے لیے اچھی چیز نہیں ہے۔[2]

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ۝۶۸ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝۶۹

''اور تمہارے پروردگار نے حکم پہنچایا شہد کی مکھی کی طرف کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور ان میں

[1] ۔ هذا قبل تحريمها (جلالين)

[2] ۔ فاتخذتم انتم منها ما هو محرّم عليكم و تركتم ما هو رزق حسن (تبيان)

جنہیں لوگ اونچا کرتے ہیں۔ پھر تو ہر طرح کے پھلوں سے کھا اور اپنے پروردگار کے مقرر کردہ راستوں پر جو آسان ہیں، چلتی رہ تو اس کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا وہ شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو غور وفکر سے کام لیں''۔

شہد کی مکھّی کا ذکر

جنہیں لوگ اونچا کرتے ہیں' اس کے ایک معنی لیے گئے ہیں عمارتیں جو بناتے ہیں اور دوسرے انگور وغیرہ کی بیلیں جنہیں کسی بلند چیز پر چڑھایا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی کی طرف حکم پہنچانے سے مراد اس کی فطرت میں اسے مضمر قرار دینا ہے جسے حکم تکوینی سمجھنا چاہیے، نہ کہ تشریعی۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝70

''اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں دنیا سے اٹھا لے گا اور تم میں سے بعض انتہائی لمبی عمر تک پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ دانائی کے بعد ایسے ہو جاتے ہیں کہ کچھ جانتے سمجھتے نہیں، یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، قدرت والا''۔

خالق نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ اتنی عمر تک جس میں یہ کیفیت ہو، بعض ہی لوگ پہنچتے ہیں اور وہ عمر کتنی ہے جس میں یہ بات پیدا ہو جائے، یہ بتایا نہیں ہے تو اب کسی بھی عمر کے بعد لازماً نہیں سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ کیفیت پیدا ہوگئی، پھر یہ ایک عام طبعی تقاضا ہے۔ زیادتی عمر کا جس میں مستثنیات ہو سکتے ہیں، خصوصاً جب کہ امتدادِ عمر بقدرت الٰہی بصورت اعجاز ہو تو قوائے عقل وشعور کا بحد کمال باقی رکھنا بھی بصورت اعجاز ہو سکتا ہے بلکہ ہونا چاہیے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝71

''اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض سے زیادہ رزق دیا ہے تو وہ جنہیں زیادہ ملا ہے، اپنے رزق کو پلٹا نہیں دیتے ان پر کہ جو ان کے دست نگر ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، کیا وہ اللہ کی نعمت کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں''۔

خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم کبھی اپنے غلاموں کو اپنے برابر نہیں لاتے تو پھر اللہ کیوں کر اسے گوارا کرے گا

کہ اس کی مخلوق چیزوں کو اس کے برابر قرار دیا جائے۔[1]

مگر ہماری قدیم تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ "اپنے رزق کو پلٹا نہیں دیتے" بطور مذمت ہے اور آمادہ کرنا ہے اس پر کہ تمہیں اپنے گھر والوں کے ساتھ مساوات برتنا چاہیے اور اپنا حصہ ان سے زیادہ نہیں رکھنا چاہیے۔[2]

آخر کا فقرہ آیت کا اس مفہوم کو تقویت دیتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید نے اس معاشی یکسائی کا تصور پیش کیا ہے جسے اشتراکیت جبری طور پر نافذ کرنے کی حامی ہے۔ اسلام ضمیر کی تحریک سے اسے اختیاری طور پر جاری کرنے کا علمبردار ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

"اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے نفوس سے بیویاں قرار دیں اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے، پوتے عنایت کیے اور تمہیں پاک صاف غذاؤں سے رزق عطا کیا تو کیا وہ باطل کو مانتے رہیں گے اور اللہ کی نعمتوں سے ناشکرا پن کریں گے؟ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسے کی عبادت کرتے رہیں گے جو آسمان اور زمین سے ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا اور نہ وہ قدرت ہی رکھتے ہیں"۔

یعنی ملکیت میں بھی ان کے کچھ نہیں ہے، وہ تہی دست ہیں اور توانائی بھی نہیں کہ وہ اپنے دست و بازو سے کچھ کر سکیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو روزی موجود ہے، وہ ان کی ملکیت میں نہیں اور جو روزی نہیں ہے، اس کا پیدا کرنا ان کی قدرت میں نہیں۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

"تو اللہ کے لیے مثالیں تجویز نہ کرو، یقیناً اللہ جانتا ہے اور تم جانتے نہیں ہو"۔

"ضرب مثل" کے جو معنی ہیں، اس کے لحاظ سے معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ خداوند عالم کے بارے میں مثالوں کے طور پر کچھ رائے زنی کرتے تھے۔[3]

اب وہ کیا تھا جو وہ کہتے تھے؟ اس کا پتہ نہیں، اس لیے بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ دوسری اشیاء کو اس کے مثل قرار نہ دو یعنی شرک نہ کرو۔[4]

---

[1] یعنی هیچ کس نمی خواهد که مملوکان خود را برابر خود سازد (فتح الرحمن) فکیف یجعلون بعض ممالیك الله شرکاء (جلالین)
[2] لایجوز للرجل ان یخص نفسه بشئی من الماکول دون عیاله (علی بن ابراهیم)
[3] مت بیان کرو واسطے اللہ کے مثالیں (شاہ رفیع الدین)
[4] معناه لاتجعلوا لله الاشیاء والامثال فانه لاشبه له ولامثل (تبیان)

شاہ عبدالقادر نے شرک کی ''ضرب مثل'' کے معنی کے تحت میں تشریح کی ہے:۔

''مشرک کہتے ہیں مالک اللہ ہی ہے، بزرگ اس کی سرکار ہیں مختار ہیں اس واسطے ان کو پوجیں، سو یہ غلط مثال ہے، اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے کسی پر سپرد نہیں رکھا اور اگر صحیح مثال چاہو تو آ گے دو (۲) مثالیں فرمائیں'' (موضح القرآن)

صراحت تو نہیں ہے مگر مجھے موصوف کی تشریح کے بین السطور میں وہابیت جھلکتی نظر آتی ہے اور دیکھا جائے تو ان کا یہ کہنا کہ ''اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے، کسی پر سپرد نہیں رکھتا۔'' کلیۃً درست نہیں ہے ورنہ ملک الموت اور انزال وحی کے لیے جبرائیل کا تقرر اور کاتبان اعمال ان سب کا انکار کرنا پڑے گا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اللہ مثال پیش کرتا ہے ایک حلقہ بگوش غلام کی جو کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا اور اس کی جسے ہم نے اچھی روزی عطا کی ہے تو وہ اس سے خفیہ اور اعلانیہ خیرات کرتا ہے، کیا وہ سب برابر ہیں؟ شکر اللہ کا (کہ تم نے اسے مان تو لیا) بلکہ ان میں زیادہ تر لوگ واقف نہیں ہیں''۔

مطلق توسل کا انکار کرنے والے اس مثال کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ''حلقہ بگوش غلام'' جو کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا، مثال اصنام کی ہے اور جسے ہم نے اچھی روزی عطا کی ہے تو وہ اس سے خفیہ اور علانیہ خیرات کرتا ہے، مثال خود اللہ کی ہے [۱] یعنی جس طرح وہ غلام اور آزاد صاحب ثروت برابر نہیں، اسی طرح یہ اصنام اور اللہ برابر نہیں، مگر ہمارے نزدیک قرآن کی مثال کو اس مفہوم پر منطبق کرنا بالکل درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ حلقہ بگوش غلام کے مقابلے میں جو دوسرا ہے، وہ ذاتی قدرت کا مالک نہیں ہے بلکہ وہاں خالق نے اپنی بالادستی کو نمایاں کیا ہے، یہ کہہ کر کہ ہم نے اسے اچھی روزی عطا کی ہے تو اسے خود خالق پر منطبق کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

ہم اس آیت کو مشرکین کی رد اس لحاظ سے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے انتخاب ''وسیلہ'' میں غلطی کی ہے یعنی اپنے دل سے ایسوں کو وسیلہ بنالیا ہے جنہیں خالق نے کسی قسم کا اختیار عطا نہیں کیا ہے۔ لازم تھا کہ وہ توسل کے لیے خود منشاء قدرت کو دیکھتے کہ اس نے کنھیں خلق کے لیے وسیلہ قرار دیا ہے؟ جسے اس کی طرف سے یہ اختیار عطا ہو، اس کے ساتھ توسل صحیح ہے یہ کہ ''وہ جو بالکل بے بس ہیں'' ان کے مثل نہیں ہیں جنہیں اللہ نے قدرت و اختیار عطا کیا ہے، خود اس کی دلیل ہے کہ کچھ ایسے ہیں جنہیں اللہ نے اپنی عطا سے ایسے اختیارات عنایت کیے ہیں کہ وہ اس کی دی ہوئی قدرت سے خلق خدا کی مدد کرتے ہیں۔

یہ مفہوم دور اول کے مفسرین کی تفسیر کے موافق ہے۔[۲]

---

[۱]۔ الاول مثل الاصنام و الثانی مثل تعالیٰ (جلالین)

[۲]۔ انه مثل ضرب الکافر الذی الاخیر عنده و المؤمن الذی یکسب الخیر... هو قول ابن عباس و قتادة (تبیان)

اس کے بعد جب یہ پیش نظر ہے کہ ان کو قدرت ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کی دی ہوئی ہے تو شرک یعنی اللہ کے مدمقابل قرار دینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس مثال کے بعد جو الحمدللہ ہے اور ایسا ہی بعض دوسرے مقامات پر کسی سوال و جواب کے بعد جو "الحمدللہ" ہے جیسے:

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ (القمان ۲۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں یا اس مثال کے پیش کیے جانے پر مخاطبین عاجزی سے خاموش رہے یا اعتراف جوحق پر مجبور ہوئے تو قدرت نے فاتحانہ انداز میں کہا: الحمدللہ یعنی شکر خدا کہ تم نے اسے تسلیم تو کیا اور پھر گویا خالق نے ان کی طرف سے ایک عذر پیش کیا ہے کہ اگر سمجھ میں آ جائے تو بہت سے حقیقت کا اعتراف کر لیں مگر اصل یہ ہے کہ وہ جاہل ہیں، جانتے نہیں ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ ۙ اَيۡنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَ ۙ وَمَنۡ يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝٧٦

"اور اللہ ایک مثال پیش کرتا ہے دو آدمیوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے کہ کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ بنا ہوا ہے، جدھر وہ اسے بھیجتا ہے کوئی اچھا نتیجہ اس کے ہاتھ سے برآمد نہیں ہوتا تو کیا برابر ہے وہ اور وہ جو عدالت کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر قائم ہو"۔

بعض مفسرین نے اسے بھی بتوں اور خدا کی مثال قرار دیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

حاصل ایں دو مثل آنست کہ آنچہ در عالم تصرف ندارد یا خدا برابر نیست چنانکہ مملوک ناتواں با مالک توانا برابر نیست و چنانچہ گنگ بے تمیز با صاحب ہدایت دہندہ برابر نیست (فتح الرحمن)

ان دونوں مثالوں کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی چیز دنیا میں تصرف نہیں رکھتی، خدا کے برابر نہیں ہے، جس طرح کمزور غلام صاحب اقتدار مالک کے برابر نہیں ہے اور جس طرح بے عقل و تمیز گونگا ہدایت کنندہ و ہدایت یافتہ شخص کے برابر ہے۔

مگر ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کے ضمیر نے یہاں اس تشریح کو گوارا نہیں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"یعنی خدا کے دو بندے: ایک بہت نکما نہ ہل سکے، نہ چل سکے جیسے گونگا یا غلام، دوسرا رسول جو اللہ کی راہ بتا دے ہزاروں کو اور آپ بندگی پر قائم ہے، اس کے تابع بہتر یا اس کے" (موضح القرآن)

جلالین نے اور تیسری بات کہی: گونگا ہے، کوئی خیر نہیں ظاہر کرتا، وہ کہتے ہیں:

ھذا مثل الکافر "یہ کافر کی مثال ہے" اور جو عدالت کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے راستے پر قائم ہے، کہتے ہیں: وھو مثل المومن "یہ مومن کی مثال ہے" اس کے بعد انہوں نے کہا ہے:۔

"وقیل ھٰذا مثل اللہ تعالیٰ والابکم الاصنام والذی قبلہ فی المؤمن والکافر۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مثال اللہ کی ہے اور گونگا مثال ہے بتوں کی اور جو اس کے قبل والی آیت میں مثال تھی، وہ مومن اور کافر کی ہے۔
ہمارے نزدیک نہ وہ پہلی مثال اللہ اور اصنام کی تھی اور نہ یہ دوسری اللہ اور اصنام کی ہے بلکہ پہلی مثل انتخاب وسیلہ کے متعلق تھی اور یہ دوسری مثل انتخاب رہنما سے متعلق ہے۔
ایسے وسیلہ بنانے کے قابل نہیں، جنہیں اللہ نے ذرہ بھر بھی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ وسیلہ بنانے کے قابل وہ ہیں جنہیں خالق نے وسیلہ بننے ہی کے لیے پیدا کیا ہے اور اس لیے اپنی جانب سے انہیں بہت سے خاص اختیارات کا مالک بنایا ہے۔ اسی طرح رہ نمائی کے قابل وہ نہیں جو علم وبصیرت سے محروم ہیں، اور مثل گونگے کے نہ صحیح راستا دوسروں کو بتا سکتے ہیں اور نہ خود ہی جس کام پر مامور کیے جائیں، اسے صحیح طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں بلکہ وہ رہ نمائی کے قابل ہیں جو اللہ کی جانب سے علم وبصیرت کے حامل قرار دیے گئے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہیں۔
کلیۃً عملی حیثیت سے ''صراط مستقیم'' پر قیام ہی وہ ''عصمت'' ہے جو منجانب اللہ رہ نمائی کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾

''اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کا غیب ہے اور قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر مثل چشم زدن کے یا اس سے بھی جلد، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

''اللہ کے لیے غیب ہے'' اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس غیب کا علم صرف اسے ہے [1] اور یہ بھی کہ یہ غیب کی چیزیں تمام اس کی ملکیت میں ہیں [2] اور ''مثل چشم زدن یا اس سے کم'' کہنا حقیقت امر کے لحاظ سے کسی شک کا اظہار نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اس کے انتہائی نزدیک ہونے کے لیے جو تعبیر کرو وہ درست ہوگی، خواہ مثل چشم زدن کہو، خواہ اس سے کم تر کہو، بہر حال اسے بالکل دور نہ سمجھو۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

''اور اللہ نے نکالا تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے ایسے عالم میں کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل قرار دیے تاکہ تم شکر گزار رہو''۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا پرندوں کو جو فضائے آسمان میں قانون قدرت کے پابند رکھے گئے ہیں، نہیں نہیں

---

[1] ۔ علم پنہاں آسمانہا وزمین (شاہ ولی اللہ) علم غیب آسمانوں کا اور زمین کا (شاہ رفیع الدین)
[2] ۔ قال الجبائی: یحتمل ان یکون المعنی: وللہ ملک ما غاب (تبیان)

تھامے رکھتا مگر اللہ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں''۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا
تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا
وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ
تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور اللہ نے کیا تمہارے لیے تمہارے گھروں میں سکونت کا سامان اور بنائے تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے ایسے گھر جو تمہیں ہلکے معلوم ہوتے ہیں تمہارے سفر کے دن اور تمہارے قیام کے دن اور ان کے اُونوں اور رونگٹوں اور بالوں سے تمہارے لیے سامان خانہ داری اور اسباب مہیا کیے ایک مقررہ مدت تک کے لیے۔ اور اللہ نے بنائے تمہارے لیے اپنی ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کیں سائے اور قرار دیئے تمہارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کے مقامات اور قرار دیئے تمہارے لیے لباس جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس جو تمہیں تمہارے حملہ سے بچاتے ہیں، اس طرح وہ اپنی نعمت تم پر مکمل کرتا ہے، شاید کہ تم سر اطاعت خم کردو۔ اب اگر وہ روگردانی کریں تو آپ پر تو بس صاف صاف تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کافر ہیں۔

چوپایوں کی کھالوں سے جو گھر کہے گئے ہیں، اس سے خیمے اور چھولداریاں مراد ہیں [1] اور ایسے لباس جو تمہیں تمہارے حملہ سے بچاتے رہیں، اس سے زرہیں [2] مراد ہیں جو عموماً تو لوہے کی ہوتی تھیں،

مگر معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں اتنی استطاعت نہ ہو یا اتنا بوجھ برداشت نہ کر سکیں ان کے لیے چمڑے وغیرہ کے بھی خول تیار ہوتے تھے جو تلوار وغیرہ سے ایک حد تک بچاؤ کا ذریعہ ہوتے تھے اور شاید وہ افراد کم ہی ہوتے تھے جو لوہے کی زرہیں خریدیں اور پہنیں، زیادہ تر فوجی لوگ ایسے ہی لباس استعمال کرتے تھے اس لیے یہاں خالق نے اسے بطور اپنے انعام واحسان کے پیش فرمایا ہے۔

---

[1] یعنی الخیم والمضارب (علی بن ابراھیم)
[2] لڑائی کا بچاؤ زرہیں (موضح القرآن)

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ﴿۸۴﴾

''اوراس دن کہ جب ہم ہرامت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے پھر کافروں کواجازت نہ دی جائے گی اور نہ اب خوشنودی حاصل کرنے کا انہیں موقع ہوگا''۔

یہ ہرامت کا گواہ اس کا پیغمبر ہوتا ہے جو قیامت کے دن اس امت کے اچھے اور برے اعمال پر گواہ کی حیثیت سے پیش ہوگا[1]

''اجازت نہ دی جائے گی'' یعنی اصلاح عمل اور توبہ وانابت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔[2]

''نہ اب خوش نودی حاصل کرنے کا انہیں موقع ہوگا، یعنی اب رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کی ان کے لیے کوئی صورت نہیں ہوگی[3]۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴿۸۵﴾

''اور جب ظالم لوگ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو پھر نہ اس میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی''۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴿۸۶﴾ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴿۸۷﴾

''اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے پروردگار! یہ ہمارے وہ شریک ہیں جن کی ہم تجھے چھوڑ کر دہائی دیتے تھے تو وہ انہیں جواب دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔اور وہ اللہ کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں گے اور جو وہ غلط باتیں منڈھتے تھے، وہ سب ان سے غائب ہوگئی ہوں گی''۔

جنہیں وہ شریک خدا قرار دیتے تھے، انہوں نے کسی معنی سے کہا کہ تم جھوٹے ہو؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جو لوگ پوجتے ہیں بزرگوں کو، وہ بزرگ بے گناہ ہیں، ایک شیطان اپنا وہی نام رکھ کر پجواتا ہے۔اس سے ان کو کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔'' جلالین نے لکھا ہے:۔

انکم لکاذبون فی قولکم انکم عبدتمونا کمافی اٰیۃ اخری ما کانوا ایانا یعبدون سیکفرون بعبادتھم

تم جھوٹے ہو اس کہنے میں کہ تم نے ہماری عبادت کی تھی جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے اور یہ کہ

---

[1]۔شھید کل امۃ رسولہ (تبیان)

[2]۔تاعذر خود کنند (فتح الرحمٰن)

[3]۔لا تطلب منھم العتبی ای الرجوع الی ما یرضی اللہ (جلالین)

عنقریب وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔

اَلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ زِدۡنٰهُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ بِمَا كَانُوۡا يُفۡسِدُوۡنَ ﴿۸۸﴾

''وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ان کو عام عذاب سے بالاتر ہم نے عذاب میں اضافہ کیا اس بناء پر کہ وہ فساد پیدا کرتے تھے''۔

وَيَوۡمَ نَبۡعَثُ فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَجِئۡنَا بِكَ شَهِيۡدًا عَلٰى هٰٓؤُلَۤاءِ ؕ وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً وَّبُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۸۹﴾

''اور وہ دن جب اٹھائیں گے ہم ہر امت سے ایک گواہ ان پر خود ان میں سے اور آپ کو لائیں گے گواہ بنا کر ان سب کے اوپر اور ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہر چیز کا واضح بیان اور ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر سر اطاعت خم کرنے والوں کے لیے''۔

ہر امّت کا ایک گواہ اور ہمارے رسولؐ ان گواہوں کے گواہ

یہ مضمون دوسری جگہ بھی آ چکا ہے کہ ہر امت کا ایک گواہ ہوگا اور وہ اس کا رسول یا اس دور کا امام ہوگا[1] اور ان تمام گواہوں کے گواہ ہمارے رسولؐ ہوں گے[2] اور اس سے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت تمام مرسلین اور ائمہ معصومین علیہم السلام پر اس درجہ ثابت ہوتی ہے کہ جو نسبت امتوں کو انبیاء کے ساتھ ہے، وہ نسبت انبیاء وائمہ کو ہمارے رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہے۔

مگر بعض مفسرین نے جو تشریح کی ہے، وہ اس فضیلت کو ختم کر دیتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ھؤلآء سے مراد یہ امت ہے یعنی ہم ہر امت کا ایک گواہ لائیں گے اور اس امت کا گواہ بنا کر آپ کو لائیں گے۔

جلالین لکھتے ہیں:

وجئنابك یا محمّد شهيدا علىٰ ھؤلآء ای قومك:-

آپ کو اے محمدؐ! ہم گواہ بنا کر ان لوگوں پر لائیں گے یعنی آپ کے قوم والوں پر

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے:-

وبیاریم ترا گواہ برایں کافران.

---

[1] لکلّ زمان و امّة امام یبعث کل امّة مع امامها۔ (علی بن ابراھیم)

[2] شهيدًا علىٰ ھؤلآء یعنی علی الآئمه فرسول الله شهيدًا علی الائمه وھم شهداء علی الناس. (علی بن ابراھیم)

آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کافروں پر۔

مگر اس صورت میں اس کہنے کو قرآن کے حاصل ہی کیا ہوا؟ وہ تو ظاہر ہے کہ جب ہر نبی اپنی امت کا گواہ ہے تو یہ رسول اس امت کا گواہ ہوگا یہ "دندان تو جمله دردہان اند چشمان تو زیر ابروان اند" کا ایسا جملہ کیا بلاغت قرآنی کے شایان شان ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝٩٠

"بلا شبہ اللہ عدالت، حسن سلوک اور صاحبان قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے شرمی، برائی اور ظلم و تعدی سے منع کرتا ہے، تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم اثر قبول کرو"۔

وہ آیت جو تمام اچھائیوں اور برائیوں کے احکام پر حاوی ہے

اہل نظر کا فیصلہ ہے کہ کردار کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر حاوی اور انتہائی جامع یہ آیت ہے جس میں مختصر الفاظ میں نیکی اور بدی کے تمام شعبوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔[1]

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝٩١

"اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم معاہدہ کرو اور قسموں کو توڑو نہیں ان کی مضبوطی کے بعد درحالیکہ تم نے خدا کو اپنے او پر ضامن بنایا ہے، یقیناً اللہ جانتا ہے اسے جو تم کرتے ہو"۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝٩٢

"اور مثل اس عورت کے نہ ہو جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت کو اس کی مضبوطی کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکر و فریب کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ جائے، اس کے ذریعہ سے تو اللہ صرف تمہاری آزمائش کرتا ہے اور وہ تمہارے لیے روز قیامت ظاہر کر دے گا اسے جس میں تم اختلاف کرتے تھے"۔

"اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے یعنی یہ جھوٹی قسمیں صرف اس لیے کھاتے ہو کر کچھ مال و دولت زیادہ مل جائے اور دنیا

---

[1] عن ابن مسعود دھٰذہ اجمع اٰیۃ فی القرآن للخیر والشر (جلالین)

کی کامیابی دوسروں سے زیادہ نصیب ہوجائے [۱] یا یہ کہ یہ مکروفریب اس لیے ہوتا ہے کہ تم اکثریت میں ہو یا وہ اکثریت میں ہیں تو چاہتے ہوں ان میں کمی ہوجائے [۲] کاتے ہوئے سوت کا توڑ دینا خود اپنی قسموں کی مخالفت بھی ہوسکتی ہے مگر دوسرا مفہوم اس کا یہ لیا گیا ہے کہ ان قسموں کی مخالفت سے تمہارے کیے کرائے نیک اعمال سب رائیگاں چلے جائیں گے [۳] تیسرا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ ان قسموں کے توڑنے سے نقصان خود اپنا ہی ہوگا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''اپنے ہی کام کو خراب کرتا ہے جیسے ایک عورت دیوانی تھی سارے برس سوت کتواتی کہ جڑاول دوں گی اقربا کو جب جاڑا شروع ہوتا سوت کتر کے بوٹے بوٹے سب کو باٹتی'' (موضح القرآن)

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ يُّضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَلَـتُسۡـئَلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾

''اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک دین پر کر دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور بے شک تم سے سوال ہوگا اس کا جو تم اعمال کرتے تھے''۔

اس مضمون کی آیات دوسرے مقامات پر بھی آچکی ہیں اور اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ اللہ جبری طاقت سے کام نہیں لیتا ورنہ تمام دنیا راہ ہدایت پر اور ایک دین مناسب پر جو مذہب حق ہے، ہوتی اور کافر کا وجود ہی نہ ہوتا۔ [۴]

وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَيۡنَكُمۡ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعۡدَ ثُبُوۡتِهَا وَتَذُوۡقُوا السُّۤوۡءَ بِمَا صَدَدۡتُّمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ۚ وَلَـكُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۹۴﴾

''اور تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکروفریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ پیر جمے ہونے کے بعد اکھڑ جائیں اور تم برائی کا مزہ چکھو اس سزا میں کہ تم نے اللہ کے راستے سے روکا اور تمہارے لیے بڑا عذاب ہے''۔

پیر جمے ہونے کے بعد اکھڑ جائیں'' اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے تمہیں شکست ہوگی اور تمہارا قدم میدان جنگ سے اکھڑ جائے گا اور راہ حق سے ہٹ جائے گا [۵] اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ تمہاری قسموں سے دوسرے لوگ جواب تک شکوک وشبہات میں مبتلا نہیں

---

[۱] یعنی برای منفعت دنیا تامال و منال زیادہ تر بدست آرو (فتح الرحمن)

[۲] لانکم اکثر عددا منهم اولان غیرکم اکثر عددا منکم (تبیان)

[۳] حاصل مثل آنست کہ اعمال خودرا حبط مکیند چنانکہ ایں زن عمل خودرا تباہ کرد (فتح الرحمن)

[۴] لوشآء لاکرهھم علیٰ ان یکونوا امة واحدة (تبیان)

[۵] یضل بعد ان کان علی الهدیٰ (تبیان)

ہے، وہ بھی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائیں گے [1]۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کچھ عجیب مطلب لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

یعنی درجہاد عہد کردہ و قسم خوردہ دغا کردن بسبب آنست کافران من بعد قول ایشاں رامعتبر ندانند و باایشاں راصحبت ندارند بلکہ مسلمانان در شبہہ افتند۔ (فتح الرحمن)

یعنی جہاد میں عہد کرکے اور قسم کھاکے دغا کرنا اس سبب سے ہے کہ کافر اس کے بعد ان کے قول کو معتبر نہ جانیں اور ان کے ساتھ رفاقت نہ کریں بلکہ مسلمان شبہ میں پڑ جائیں۔

میری سمجھ میں اس عبادت کا مطلب کچھ نہیں آیا، بہرحال یہ اس معزز جماعت (صحابہ کرام) کے کردار کا کوئی ایسا ہی پہلو ہے جس پر قرآن مجید تنبیہ کر رہا ہے۔

بماصددتم عن سبیل اللہ صد کے معنی روگردان ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو روکنے کے بھی پہلی صورت میں معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''اس سزا میں کہ تم اللہ کے راستے سے روگردان ہوئے'' اور دوسری صورت میں یہ کہ ''تم نے اللہ کے راستے سے روکا'' جو ہم نے ترجمہ کیا ہے اور دونوں صورتوں میں ''اللہ کے راستے'' سے مراد مطلق دین حق بھی ہوسکتا ہے اور بتقاضائے محل خود یہ قسم کا پورا کرنا بھی ہوسکتا ہے اور اس صورت میں دوسروں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ایک غلط مثال قائم کرکے دوسروں کے لیے بھی یہ دروازہ کھول دیا کہ وہ جھوٹی قسمیں کھائیں اور عہد شکنی سے کام لیں۔ [2]

وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۝۹۵ مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ۝۹۶

''اور اللہ کے عہد کے مقابلہ میں تھوڑی سی قیمت حاصل نہ کرو، جو اللہ کے یہاں ہے وہی بس تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے یہاں ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے یہاں ہو، وہ باقی رہنے والا ہے اور بے شک ہم انہیں کہ جنہوں نے صبر و برداشت سے کام لیا، ان کا صلہ عطا کریں گے ان کے بہترین اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے''۔

پرہیزگار لوگ جو بھی کام کرتے ہیں، وہ جائز تو ضروری ہوں گے لہٰذا ایک حد تک حسن تو ان کے ہر کام میں ہوگا لیکن جو خاص رضائے الٰہی کے لیے کام ہوں گے اور بہ قصد اطاعت وہ یقیناً ان کے اعمال کی بہترین قسم ہے جن کے لحاظ سے آخرت میں انہیں صلہ عنایت ہوگا۔ [3]

---

[1] یعنی مسلمانوں کو بدنام نہ کرو کہ یقین لانے والے شک میں پڑیں اور تم پر گناہ چڑھے (موضح القرآن)

[2] ای بصدکم عن الوفاء بالعھد او بصدکم غیرکم عنہ لانہ مسیر بکم (جلالین)

[3] انما قال باحسن ما کانوا یعملون لان احسن اعمالھم ھو الطاعۃ للہ تعالیٰ وما عداہ من الحسن مباح لیس بطاعۃ (تبیان)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

''جو نیک اعمال کرے خواہ مرد ہو یا عورت درآنحالیکہ وہ باایمان ہو تو ہم اسے ایک پاک و پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور بلاشبہ ہم ان کا صلہ دیں گے ان کے بہترین اعمال کے مطابق''۔

نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمّہ دار

''پاکیزہ زندگی دیں گے'' اس کے متعلق شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

''یعنی در دنیا نعمت دہیم'' (فتح الرحمٰن) مگر ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کا جو کہنا ہے، اس کی عبارت عجیب ہے:۔

''یعنی زندگی حیات کی جلا دیں گے یا دنیا میں اللہ کی محبت میں اور لذت میں'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:۔

قیل ھی حیوۃ الجنۃ وقیل فی الدنیا بالقناعۃ او الرزق الحلال

کہا گیا ہے کہ یہ بہشت کی زندگی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ دنیا میں قناعت یا حلال روزی۔

ہماری قدیم تفسیر نے اسی کو بتایا ہے کہ پاکیزہ زندگی سے مراد اللہ کے عطا کردہ رزق پر قناعت ہے۔[1]

یہی گزشتہ سیاق کلام کے بھی مطابق ہے، اس لیے کہ اس کے پہلے مال دنیا میں ہوس کی مذمت تھی اور حیات طیبہ کی ضمانت ہر نیک اعمال مومن کے لیے ہوئی ہے لیکن رزق میں فراوانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے، جو چیز سب میں مشترک ہو سکتی ہے، وہ رزق الٰہی پر چاہے جتنا ملے قناعت ہی ہے[2] اور آخرت کی جزا کا ذکر صراحۃً بعد کو ہے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

''تو جب تم قرآن پڑھو تو اللہ سے پناہ مانگو اس شیطان کے شر سے جو راندہ ہوا ہے''۔

قرآن مجید کے آداب تلاوت میں سے یہ ہے کہ پہلے "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" کہے۔ یہ اسی آیت کے حکم کی ظاہری تعمیل ہے۔

تلاوت قرآن کے موقع پر اعوذ باللہ کہنے کا حکم

اور یہ جو ارشاد ہوا کہ ''جب تم قرآن پڑھو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھو یعنی قرآن پڑھنے لگو، نہ یہ کہ

---

[1] ۔التضوع بما رزقه الله (علی بن ابراهيم)

[2] ۔قال قوم الاولى ان يكون المراد به القناعة فى الدنيا لانّه عقيب ما توعد غير هم به من العقوبة فيها مع ان اكثر المؤمنين ليسوا يمنعي الرزق فيها (تبيان)

پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ کہو۔[1]

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطَٰنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾

''بلاشبہ اس کا کوئی قابو نہیں ہے ان پر جو ایمان لائے ہوں اور اپنے پروردگار پر بھروسا کریں۔ اس کا قابو تو بس انہیں پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور جو اس کے ساتھ شرک اختیار کیے ہوئے ہیں''۔

''اسے دوست رکھتے ہیں'' یعنی شیطان کو اور ''اس کے ساتھ شرک اختیار کیے ہوئے ہیں۔'' یعنی خدا کے ساتھ۔[2] اس آیت میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان جو اپنی بداعمالیوں کا ذمہ دار شیطان اور بس شیطان کو بنا دیتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، شیطان کا سہارا دینے والا تو خود انسان ہوتا ہے۔ اس کی ذہنیت خود جب تک شیطانی نہ ہو، شیطان اس پر قابو نہیں پا سکتا، اس کا اظہار دوسری جگہ آخرت کے موقع پر خود شیطان کی زبان سے قرآن میں ہے کہ وہ کہے گا:

فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُم ۖ

مجھے ملامت نہ کرو، خود اپنے ہی کو ملامت کرو۔ (ابراہیم۔ ۲۲)

اس لیے شیطان کا آلہ کار بننے پر خود انسان بازپرس سے بچ نہیں سکتا۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿١٠٢﴾

''اور جب بدل کر لے آتے ہیں ہم ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اسے جو وہ اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو بس اپنے دل سے گھڑتے ہو بلکہ ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے۔ کہئے کہ اسے روح القدس نے اتارا ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ تاکہ وہ انہیں جو ایمان لائے ہیں، ثابت قدمی عطا فرمائے اور ہدایت اور خوش خبری دینے کو سراطاعت جھکانے والوں کے لیے''۔

کتب الٰہیہ میں نسخ کے ہونے پر عیسائی آج تک معترض ہیں، بس اسی طرح ناسمجھی سے اس وقت والے بھی آیات کی منسوخی پر نکتہ چینی کرتے تھے، اللہ خوب جانتا ہے یعنی وہ مصالح سے واقف ہے کہ اسے کون سا حکم دائمی طور پر نازل کرنا چاہیے اور کون سا وقتی طور پر جس کا مصلحت کے بدلنے سے بدلنا لازمی ہے۔

---

[1] کما قال اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا والمعنی اذا اردتم القیام بہا (تبیان)

[2] بہ ای اللہ تعالٰی (جلالین)

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

''اور بے شک وقتاً فوقتاً ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بس ایک آدمی ہے جو سکھا تا ہے جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں، اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف سلیس عربی زبان ہے''۔

یہ کون شخص تھا جس کی طرف وہ نسبت دیتے تھے کہ وہ حضرت کو سکھا تا ہے؟

ایک قول یہ ہے کہ:

''ایک شخص غلام رومی نصرانی مکہ میں تھا، حضرتؐ کے پاس بیٹھتا محبت سے اللہ کا کلام اور پیغمبروں کا احوال سننے کو، کافر کہتے وہی سکھا جاتا ہے''(موضح القرآن)

دوسرا قول:

هو قين نصرانی كان النبی ﷺ يدخل عليه (جلالين)

وہ ایک عیسائی تلواریں بنانے والا تھا جس کے پاس حضرت پیغمبرؐ خدا جایا کرتے تھے۔

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں اس نام ابوفکیہ ہے۔ یہ ابن حضرمی کا غلام تھا جو یہودی یا عیسائی تھا، پھر مسلمان ہو گیا تو قریش نے اپنے عناد کے جذبہ میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہی ہے جو رسولؐ کو یہ سب باتیں بتاتا ہے (تفسیر علی بن ابراہیم قمیؒ)

شیخ الطائفہؒ نے کہا ہے:۔

قال الضحاك ارادوا به سلمان الفارسی (تبيان)

ضحاک کا قول ہے کہ ان کا خیال سلمان فارسیؒ کے متعلق تھا۔

اگر قرآن کی اہمیت صرف بحیثیت مضامین ہوتی تو ان کے اس تصور کا جواب اس طرح نہ ہو سکتا، جس طرح قرآن نے دیا ہے کیوں کہ بہت ممکن ہے کہ مضامین کسی غیر زبان کے آدمی سے معلوم کر کے انہیں اپنی زبان میں منتقل کر لیا جائے مگر چونکہ قرآن کی اہمیت بحیثیت فصاحت و بلاغت بھی ہے جس میں مضامین کے ساتھ اسلوب بیان اور خصوصی عبادات کا دخل ہے۔ اس لیے غیر زبان کے کسی آدمی کی طرف منسوب کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔

اس سے اعجاز قرآن کے متعلق اس تصور کا غلط ہونا ثابت ہوتا ہے جو جناب سید المرتضیٰ علم الہدیٰؒ کی طرف نسبت رکھتا کہ قرآن کا اعجاز اس اعتبار سے ہے کہ مقابلہ کرنے والوں کی طاقت کو اللہ سلب کر لیتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انہیں یوں اس کلام کو سن کر حیرت نہ ہوتی اور وہ اسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقدور سے خارج قرار دے کر اس کے لیے کسی دوسرے مصنف کی تلاش نہ کرتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

”بلاشبہ وہ جو آیات الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے، انہیں اللہ منزل مقصود تک نہیں پہنچائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹ بس وہی گھڑتے ہیں جو آیات الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں“۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

”جس نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلیا، سوا اس کے کہ جو مجبور کیا جائے اور دل اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بے شک جو کشادہ دلی سے کفر اختیار کرے تو ان پر اللہ کی طرف کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے“۔

ضرورت کے وقت تقیّہ کا صریحی حکم

اس آیت میں کافروں کے عذاب سے جو استثناء کیا گیا ہے: **الامن اکرہ وقلبه مطمن بالایمان** یہ حکم تقیہ کا بیان ہے جو فطری طور پر تو تمام فرق اسلامیہ نے کیا، عالم انسان کے عقلاء میں متفق علیہ مگر ”سخن“ گسترانہ بحث اور مناظرانہ نوک جھوک“ کے طور پر اسے فرقہ شیعہ کے مقابلہ میں بطور ایک جرم کے پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایک دفعہ تیسرے پارہ میں: **الآّ ان تتّقوا منهم تقٰة** کہہ کر صراحۃ بطور استثناء اس کا ذکر کیا گیا ہے اور یہاں **الّامن اکرہ و قبله مطمئن بالایمان** کہہ کر اس کا استثناء کیا گیا ہے۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ یہ آیت جناب عمار بن یاسرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انہیں مکہ والوں نے جب پکڑا تو انہوں نے ان کے جبر و تشدد سے کچھ الفاظ ان کی مرضی کے مطابق زبان سے کہہ دیئے مگر اس سے ان کے ضمیر میں ایک ہلچل تھی جو ان کے ایمان قلبی کا نتیجہ تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”ظالم زبردستی سے اگر منہ سے کفر کا لفظ نکلوا دے، دل میں ایمان ہو تو اس کو گناہ نہیں“ (موضح القرآن)

یہاں تک تو آیت قرآن کی تشریح ہے مگر اس کے بعد وہ اضافہ فرماتے ہیں:۔

”لیکن اگر مرنا قبول کرے اور لفظ بھی منہ سے نہ کہے تو شہید اکبر ہے۔“

یہ اضافہ قرآن مجید کی آیت میں تو ہے نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کلیۃً درست بھی نہیں ہے اس کا باعتبار موارد حکم مختلف ہوتا ہے، جہاں تقیہ بس جائز ہو، وہاں یہ بات ٹھیک ہے لیکن بعض صورتوں میں تقیہ واجب ہوتا ہے۔ اس وقت مخالفت کرنے والا گناہگار اور ”شہید اکبر“ ہونا کیسا، ہلاکت ابدی میں گرفتار ہوگا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠٧﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ

---

[1] ۔ عمار بن یاسر اخذته قریش بمکة یقذبوه بالنار حتی اعطاهم بلسانه ما ارادوه و قلبه مطمئن بالایمان (علی بن ابراهیم)

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

''یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے دینوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور یہ کہ اللہ کافر جماعت کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یہ وہ ہیں کہ اللہ نے مہر لگادی ان کے دلوں پر اور ان کے سننے کی طاقت اور ان کی نگاہوں پر اور یہی وہ ہیں جو مدہوش ہیں۔ وہ بلاشبہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والے ہیں''۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾

''پھر یقیناً تمہارا پروردگار ان کے لیے جنہوں نے تکلیفیں پہنچائے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، یقیناً تمہارا پروردگار اس سب کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو تقیہ والی آیت سے مرتبط کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تقیہ کے ساتھ اظہار کفر کرنا تھا تو گناہ مگر اللہ اسے بخش دے گا اور اس کا ہمارے بعد مفسرین نے یہ جواب دیا ہے مغفرت کے اصل معنی پردہ پوشی کے ہیں چونکہ ان کے الفاظ سے ظاہراً ان کے متعلقہ گمراہی اور جرم کا خیال قائم ہوتا تھا لیکن اللہ نے ان کی نیت کی صفائی اور ضمیر کے استحکام کو نمایاں کر کے ان سے برائی کے تصور کو دور کر دیا تو اسی کو مغفرت سے تعبیر کیا گیا ہے [۱] مگر ہمیں اس پورے سوال و جواب کی بنیاد ہی سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ آیت حکم تقیہ کے بعد بلا فاصلہ تو ہے نہیں بلکہ تقیہ کے استثناء کے بعد ان کا ذکر شروع ہو گیا جنہوں نے خود اپنے سوء اختیار سے یعنی بلا جبر واکراہ کفر اختیار کیا ان کے عذاب کا ذکر ہوا، اب اس کے بعد کہا جا رہا ہے کہ دباؤ میں آ کر واقعی جو کافر ہو گئے یہ بھی اس کے بعد اگر اعتقاد اپنے درست کر کے اس ماحول سے نکل آئیں اور مستقبل کی زندگی سے اس کی تصدیق ہو کہ اب وہ حق کے راستے پر ہیں اس لئے راہ حق میں جہاد کرتے ہیں اور پھر ثابت قدم بھی رہتے ہیں تو وہ جو درمیان میں ان کا کفر تھا اس پر اللہ پر مواخذہ نہ کرے گا کہ وہ غفور و رحیم ہے اس کا حکم تقیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''جس دن ہر ایک متنفس آئے گا خود اپنی طرف سے لڑتا ہوا اور ہر متنفس کو جو اس نے کیا ہوگا، اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی زیادتی نہ ہوگی''۔

یعنی اس دن نفسا نفسی کا عالم ہوگا ہر ایک کو بس اپنی فکر ہوگی کسی دوسرے کی فکر نہ ہوگی [۲] اس سے مستثنیٰ وہی افراد ہوں گے جنہیں خالق کی طرف سے شفاعت کا منصب عطا کیا گیا ہے۔

---

[۱] ۔فلما کشف اللہ عن باطن امرھم و اخبر انھم کانوا مطمئنین بالایمان کان فی ذلک مستر علیھم (تبیان)

[۲] ۔لا یھمھا غیرھا (جلالین)

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرۡيَةً كَانَتۡ اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً يَّاۡتِيۡهَا رِزۡقُهَا رَغَدًا مِّنۡ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ بِمَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ﴿۱۱۲﴾

''اور اللہ نے ایک مثال پیش کی ہے اس بستی کی جو امن و اطمینان کے عالم میں تھی تو اس کے پاس اس کی روزی فراغت کے ساتھ آ رہی تھی ہر طرف سے مگر اس نے اللہ کی نعمتوں کے مقابلہ میں ناشکرے پن سے کام لیا تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف و دہشت کے غلبہ کا مزہ چکھایا اس کی سزا میں جو وہ کرتے تھے''۔

بعض اہل تفسیر لکھتے ہیں کہ اس بستی سے مراد خود مکہ معظّمہ ہے۔[1]

اور شاہ ولی اللہ اسے ایک عام مثال قرار دیتے ہیں اور حقیقۃً یہ دونوں ہی قول قدیم مفسرین کے یہاں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعد کسی نے ایک لے لیا اور کسی نے دوسرا۔

وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡهُمۡ فَكَذَّبُوۡهُ فَاَخَذَهُمُ الۡعَذَابُ وَهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ﴿۱۱۳﴾

''اور ان کے پاس آیا ہے ایک پیغمبر انہی میں سے تو انہوں نے اسے جھٹلایا تو انہیں گرفت میں لے لیا عذاب نے درحالیکہ وہ ظالم تھے''۔

یہ آیت تنزیل میں اگر گذشتہ آیت سے متعلق ہو تو وہ اسی بستی کا ذکر ہوگا مگر یہ اس تفسیر کی بناء پر دشوار ہے جس میں اس بستی سے مراد مکہ معظّمہ لیا گیا ہے اس لئے پھر رسول سے مراد یہ حضرت ختمی مرتبتؐ ہونگے اور یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ اپنی قوم کے لئے کبھی بر بنائے تکذیب بددعا نہیں کی اس لئے آپ کی قوم پر اس دنیا میں عذاب استیصال نہیں آیا۔

چونکہ ترتیب موجود مطابق تنزیل نہیں ہے اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیت گزشتہ آیت کے ساتھ اتصال رکھتی ہے اور اس بناء پر میں نے اس آیت کو الگ خارج کر کے اس کا ترجمہ کیا اور اس صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس آیت میں کس قوم کا ذکر ہے بہرحال وہ کوئی ایسی قوم ہے جس پر تکذیب رسول کی وجہ سے من حیث القوم عذاب نازل ہوا۔

فَكُلُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴿۱۱۵﴾

''کھاؤ پیو اس سے جو اللہ نے تمہیں پاک، حلال رزق دیا ہے اور اللہ کی نعمت کے شکر گزار رہو۔ اگر تم صرف اس کی

[1] مکة والمراد اهلها (جلالین) یہ احوال فرمایا مکہ یا کسی کا (موضح القرآن)

عبادت کرتے ہو، اس نے بس تم پر حرام کیا ہے مردار اور خون اور سور کے گوشت کو اور اسے جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، ہاں جس شخص کو اضطراری صورت پیش آئے اور نہ وہ باغی ہو، نہ تعدی کرنے والا تو یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

اس مضمون کی آیت پہلے آ چکی ہے اور وہاں اس پر تبصرہ ہو چکا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

''اور جن چیزوں پر تمہاری زبانیں غلط طور پر حکم لگاتی ہیں، ان کے لیے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اس طرح تم اللہ پر تہمت لگاتے ہو، یقیناً وہ جو اللہ پر جھوٹ منڈھتے ہیں وہ دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے۔ بہت تھوڑا فائدہ اور ان کے لیے عذاب دردناک ہے''۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور ان پر جو یہودی ہیں، ہم نے وہ چیزیں جو آپ کے سامنے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، حرام کر دیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے''۔

جماعت یہود کے لئے خصوصی طور پر جو چیزیں ممنوع قرار دی گئی تھیں ان کا سورہ انعام میں ذکر ہوا ہے کہ:

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ (انعام۔146)

اس آیت میں بھی آخر میں کہا گیا ہے کہ یہ پابندیاں ان پر بطور سزا عائد کی گئی تھیں اور یہاں بھی آخر میں کہا جا رہا ہے کہ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہماری طرف سے جو ہوا وہ ان کے ظلم و تعدی کی بناء پر سزا کی حیثیت رکھتا تھا۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

''پھر بلاشبہ تمہارا پروردگار ان کے لیے جو نادانی میں برائی کا ارتکاب کر لیں، پھر اس کے بعد توبہ کر لیں اور عمل درست کر لیں تو یقیناً تمہارا پروردگار اس کے بعد ضرور بالضرور بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

گذشتہ کے ربط سے اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ:

یعنی حلال اور حرام میں جھوٹ بنانے والے جب مسلمان ہوئے تو بخش دیئے گئے (موضح القرآن)

لیکن اگر آیت کا حکم عام لیا جائے جیسا کہ باعتبار معنی واقعی وہ عام ہے تو گزشتہ سے ربط قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٢١﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿١٢٢﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٣﴾

''بلا شبہ ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے جو خالص اللہ سے لو لگانے والے، غلط راستے سے ہٹے ہوئے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہوئے۔ اس نے انہیں منتخب کیا اور انہیں سیدھے راستے پر لگایا۔ اور ہم نے انہیں دنیا میں بھی بھلائی دی اور بلاشبہ وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہیں۔ پھر ہم نے آپ کو بھی پیغام دیا کہ آپ ابراہیم کی ملت کی پیروی کیجئے باطل سے علیحدہ رہتے ہوئے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عبادت گزار اُمت، اتباعِ ملّتِ ابراہیمؑ کا حکم

ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ کا ایسا مجموعہ تھے کہ ایک پوری قوم میں جتنے الگ الگ اوصاف کثیر التعداد افراد میں پھیلے ہوئے تھے وہ سب ان میں اکٹھا تھے اور یہ بھی مطلب لیا گیا ہے کہ وہ امام یعنی مرکز اقتدار تھے یا ایک پوری امت کے لئے مثالی نمونہ تھے۔ [1]

بعض مفسرین نے ان تمام باتوں کو سمو کر مطلب لیا ہے [2] اور بعض نے امت کو مجموعی قوم کے معنی میں لے کر درمیان میں حذف و تقدیر مان کر یہ مطلب لیا ہے کہ ایک بڑی تعداد نوع انسانی کی ان کی امت تھی۔ [3]

اس کے بعد یہ قابل بحث بات ہے کہ ہمارے رسول ﷺ کو ملت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ مقتدائے کل ہیں مقتدی نہیں ہیں یہاں پر ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ ملّة ابراہیم علیہ السلام سے مراد وہ دس (۱۰) سنن ابراہیمی میں ختنہ وغیرہ

[1] ۔ تھا پیشوا (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔ اماما قدوة جامعا لخیال الخیر (جلالین)

[3] ۔ قال بعضهم کان ذا امة (تبیان)

جنہیں شریعت اسلام کا جز بنالیا گیا ہے۔[1]

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٢٤﴾

’ہفتے والے حکم کی پابندیاں تو ان لوگوں پر عائد کی گئی تھیں جنہوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تھا، اور بلاشبہ تمہارا پروردگار ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن اس بارے میں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے“۔

چونکہ قوم یہود میں سبت کا حکم تھا مگر اسلام میں یہ حکم نہیں ہے اور پھر گذشتہ آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقوں پر چلنے کی ہدایت کی گئی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم تو قوم یہود کے بھی مورث اعلیٰ ہیں۔

جب دونوں ہی حضرت ابراہیمؑ کے ورثہ دار ہیں تو یہ اختلاف کیوں ہے کہ سبت کے احکام وہاں ہیں اور یہاں نہیں اس کا جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ احکام ملت ابراہیمی میں تو موجود نہ تھے بلکہ یہ تو یہود کے لئے ان کے باہمی اختلاف کی سزا میں عائد کئے گئے لہٰذا اب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو براہ راست ملت ابراہیمی کی پیروی کے ذمہ دار ہیں اس حکم کی پابندی کیوں کریں؟[2]

یہ اس صورت میں ہے کہ جب کہ اس آیت کو گذشتہ آیات کے ساتھ نازل شدہ مانا جائے اور اگر یہ آیت علیحدہ نازل ہوئی تو پھر اس سے بس یہ نتیجہ سمجھ میں آتا ہے کہ باہمی اختلاف اللہ کو ہمیشہ سے ناپسند رہا ہے۔[3]

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ
أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾
وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ
لِلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ
مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾

”اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے حکمت اور اچھے عنوان سے وعظ و نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجئے بہتر سے بہتر ذریعہ سے۔ آپ کا پروردگار خوب واقف ہے کہ کون اس کی راہ سے ہٹا ہوا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ان کو جو سیدھی راہ پر قائم ہیں۔ اور اگر تم لوگ سزا دو تو ویسی ہی جیسی تمہیں سزا دی گئی تھی اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ اور آپ تو صبر ہی کیجئے اور نہیں آپ کا صبر و تحمل مگر اللہ کی مدد سے اور ان پر رنج

---

[1] ۔ هي الحنيفية العشر التي جاء بها ابرهيم (علی بن ابراهیم)
[2] ۔ یعنی اصل ملت ابراہیم میں ہفتہ کا کچھ حکم نہ تھا اس امت میں بھی نہیں (موضح القرآن)
[3] ۔ حذر عن الاختلاف (تبیان)

نہ کیجئے اور دل تنگ نہ ہو جایئے اس سے جو وہ ترکیبیں کرتے رہتے ہیں۔"

دعوت و تبلیغ کے لئے حکیمانہ انداز کی ہدایت، ضبط و تحمّل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید

اگر ایک ہی سلسلہ کی یہ آیات ہیں اور یہاں کچھ اور نہیں ہے کہ ایسا ہی ہو تو ان میں مجموعی طور پر ایک عجیب شان پیدا ہو گئی ہے۔

شروع میں "واحد مذکر حاضر" کے صیغوں کے ساتھ تخاطب تو خود حضرت ﷺ سے ہے [1] اور ان میں آپ کو یہ ہدایت ہے کہ آپ نے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے علم و حکمت اور اچھے موعظ و نصیحت کے ساتھ اور بحث کیجئے تو ایسے انداز میں جو بہتر سے بہتر ہو اس میں نہ کسی جارحانہ عمل کا ذکر ہے نہ ان کی ایذا رسانی پر بطور سزا کسی سختی کا تذکرہ ہے پھر صیغے جمع مذکر حاضر کے ہیں ان میں مسلمانوں سے گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی تو یہ شان ہی نہیں ہے کہ آپ بدلہ لینے یا سزا دینے کا ارادہ بھی کریں لیکن تم اگر گذشتہ تکالیف کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو اس کا خیال رکھنا کہ یہ بدلہ اس عمل سے بڑھنے نہ پائے جو انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے بس اسی حد تک تشدد کا تمہیں حق ہے جتنا تمہارے ساتھ تشدد ہو چکا ہے اور اتنا بھی کرنا تمہارے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہے اگر صبر و برداشت سے کام لو تو وہ بہتر ہے۔

یاد رہے کہ یہ مکافاۃ بالمثل کی اجازت بتا رہی ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے بارے میں نہیں ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں کیوں کہ وہاں تو اصول یہ ہے کہ الاسلام یجب ما قبلہ (یعنی) جو کچھ بھی وہ شخص پہلے کر چکا ہوا اسلام لانے کے بعد وہ کالعدم ہو جاتا ہے اور اب اس کی مکافات کا کبھی بھی سوال پیدا نہیں ہوتا لہٰذا یہ صبر و برداشت اور عفو و درگزر کی تعلیم اس غیر قوم کے ان افراد سے متعلق ہے جو اب تک اپنوں کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔

پھر یہ کہ صبر و برداشت کی دعوت بے بسی کے عالم میں نہیں ہے اس لئے اس دور میں جب مسلمان بے بسی کے عالم میں ہوں یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں کہ اگر بدلہ لینا ہو گا تو بس اتنا ہی کرنا جتنا تمہارے ساتھ ہوا ہے جب بدلہ لینے پر قدرت ہی نہیں تو بدلہ لینے کا تصور ہی کہاں پیدا ہو گا یہ کہنے سے کہ "اگر بدلہ لینا چاہو تو بس اتنا ہی کرو" صاف ظاہر ہے کہ اب طاقتور اتنے ہیں کہ جتنا پہلے ہوا تھا اس سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں پھر کہا جا رہا ہے کہ صبر و برداشت سے کام لو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ عاجزی کی تعلیم نہیں ہے بلکہ جزبہ انتقام سے کام نہ لے کر اپنے جی کو مارنے کی تعلیم ہے۔

اس کے پہلے عنوان خطاب کے بدلنے ہی سے پتہ چل گیا تھا کہ بدلہ لینے کا تصور خود رسول ﷺ تو کریں گے ہی نہیں مگر اب صراحۃً متکلم قرآنی نے پھر پیغمبر خدا کو بصیغۂ واحد مذکر حاضر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ تو بہر حال صبر ہی سے کام لیجئے اور یہ صبر ایک ایسا کارنامہ ہو گا جو عام انسانی قوت برداشت کی حد اور ان کے مظالم کو دیکھتے ہوئے عام انسانی حدود و امکان سے باہر ہے یہ صبر آپ کا بس خداوند عالم کی طرف کی تائید اور اس خصوصی ضبط نفس کے درجہ سے ہے جو آپ کو مبداء فیاض سے عطا ہوا ہے۔

پھر فقط یہی نہیں کہ عملی طور پر ان کے مظالم کا بدلہ نہ لیجئے بلکہ ان کی بدسلوکیوں پر جو وہ کرتے رہے اور پھر اب آپ ان کا کچھ بدلہ بھی

---

[1] ادع الناس یا محمد ﷺ (جلالین)

نہیں لیتے اپنے دل میں کڑھیئے بھی نہیں اور اس کی فکر نہ کیجئے کہ اب وہ آپ کے خلاف کیا کیا منصوبے بناتے ہیں اس طرح حزن جس سے منع کیا جاتا ہے وہ ماضی کی یاد سے متعلق ہے اور یہ دل تنگی جس سے روکا جارہا ہے حال اور مستقبل میں ان کی ترکیبوں سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ اسلام کی فراخ حوصلگی کی کتنی اہم دستاویز ہے جو قران میں موجود ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض جمہوری تصور کے مفسرین جو ذہنی طور پر حقیقۃً اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ اسلام تلوار کا مذہب ہے اس حکم کے لئے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے حکمت اور اچھے وعظ ونصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجئے ایسے انداز سے جو بہتر سے بہتر ہو۔ یہ لکھ دیتے ہیں کہ:

ھٰذا قبل الامر بالقتال (جلالین) یہ جنگ کا حکم آنے سے پہلے کی بات تھی۔

یعنی ان کے نزدیک جنگ کا حکم آنے کے بعد نہ دعوت وتبلیغ کوئی چیز رہی اور نہ بطریق احسن بحث مباحثہ کی بات رہی اب تو تلوار رہ گئی اور بس تلوار!لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

پہلی آیت کو اس کی بلند سطح سے اپنے ذہن کی پست سطح پر لانے کے بعد وہ دوسری آیت کو باوجود پہلی آیت سے متصل ہونے سے نظم قرآنی کے ان پرجوش حامیوں نے پہلی آیت سے بالکل غیر متعلق قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک وہ آیت تو حکم جہاد سے آنے سے قبل کی ہے اور اس دوسری آیت جو جب کہ اُس میں جمع مذکر حاضر کے صیغے ہیں جو عام مسلمانوں سے تخاطب کی صاف دلیل ہیں خود رسول ﷺ سے متعلق کر کے ایک غلط حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ جناب حمزہؓ کی لاش کی جو بے حرمتی ہوئی تھی اس پر رسول ﷺ نے قسم کھالی تھی کہ اب میں ان کافروں کو جب قتل کروں گا تو ان کے ساتھ یہی سلوک کرونگا اس پر یہ آیت اتری ہے۔

ہمارے نزدیک نہ یہ حدیث درست ہے اور نہ الفاظ قرآنی یہاں براہ راست رسول ﷺ سے متعلق ہیں ہمارے نزدیک یہ تینوں آیات یہاں کی ایک ڈال ہیں اور ان سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس پر اللہ کی دی ہوئی بصیرت قرآنی سے ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ (واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم)

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

'یقیناً اللہ ان کے ساتھ ہے جو (غلط کاری سے) بچتے رہیں اور جو اچھا کردار قائم رکھیں'۔

یہ آیت بھی مقام تنزیل میں گذشتہ آیات سے متصل ہو تو بعید نہیں ہے تو جس سابقہ کردار کا حکم دیا گیا تھا اس پر ایک عام اصول اور کلیہ کے طور پر اس آیت کا مضمون بالکل چسپاں ہے۔

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

مکیّہ [1] ------ ۱۱۱۔آیات

ہر شب جمعہ اس سورہ کو پڑھنے کی تاکید ہوئی ہے۔

چونکہ اس سورہ کی پہلی آیت میں ''اسراء'' یعنی معراج کا ذکر ہے اس لئے حق بجانت طور پر اس سورہ کو سورۃ الاسراء کہنا درست ہے مگر اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر اوران کے ساتھ تخاطب ہے اس لئے عموماً پیشانی پر جو نام لکھا ہوا ملتا ہے وہ بنی اسرائیل ہے حالانکہ بنی اسرائیل کا ذکر دوسرے بعض سوروں میں سے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے مگر سوروں کے ناموں میں اس کی مثالیں اکثر موجود ہیں جس پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے اس حدیث میں بھی جو اس کے پڑھنے کی فضیلت میں وارد ہوئی ہے اس سورہ کا یہی نام ہے۔ [2]

ان دو چیزوں کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل مضامین آئے ہیں:۔

سورۂ بنی اسرائیل کے خاص خاص مضامین:

۱-----بنی اسرائیل کی دو مرتبہ خراب کاری اور اس کی پاداش

۲-----نامہ اعمال

۳-----ہلاکت اقوام کا نظام عام

۴-----حقوق والدین

۵-----فضول خرچی کی مذمت

۶-----خرچ میں میانہ روی کی ضرورت

۷-----قانون قصاص

۸-----ناپ تول میں انصاف کا حکم

۹-----منکرین معاد کی رد

۱۰-----مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم

۱۱-----شجرہ ملعونہ

---

[1] ۔ بعض مفسرین نے پانچ آیتوں کو مستثنیٰ کہا ہے کہ وہ مدینہ کی نازل شدہ ہیں (مجمع البیان)

[2] ۔عن الصادق قال: من قرء اسورۂ بنی اسرائیل فی کل لیلۃ جمعۃ لم یمت حتی یدرك القائم ویکون من اصحابہ (مجمع البیان)

۱۲-----اوقات نماز کا بیان

۱۳-----پیغمبروں کی بشریت

۱۴-----جناب موسیٰؑ کے معجزات

۱۵-----گریہ کی تعریف

۱۶-----جہر واخفات کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

"پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندہ کو ایک رات مسجد حرام سے انتہائی اونچے سجدہ کے مقام تک جس کے گردو پیش ہم نے برکت ہی برکت قرار دی ہے تاکہ ہم انہیں دکھائیں اپنی کچھ نشانیاں یقیناً وہ سننے والا ہے، بڑا دیکھنے والا"۔

معراج پیغمبر اسلامؐ

یہ مشہور ومعروف آیت واقعہ معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعلق ہے چونکہ کہ زمانہ بنی امیہ میں "المسجد الاقصیٰ" نام رکھ لیا گیا فلسطین کی مسجد بیت المقدس کا اس لئے اہل سنت نے اس آیت میں جو المسجد اقصیٰ کا لفظ ہے اسے بیت المقدس ہی پر محمول کیا ہے۔[1]

زیادہ سے زیادہ یہ کہا ہے کہ یہ سفر معراج کی پہلی قسط تھی جس کا یہاں قرآن مجید نے ذکر کیا ہے یعنی پہلے آپ کے لئے مکہ سے شام تک کی مسافت طے ہوئی اور پھر آپ آسمان پر تشریف لے گئے جس کا سورہ النجم کی آیات میں ذکر ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں۔

یعنی خدا تعالیٰ در شب معراج پیش از صعود بر آسمانہا آں حضرت را بمسجد بیت المقدس رسانید (فتح الرحمٰن)

یعنی معراج کی رات خداوند عالم نے آسمان پر بلند ہونے سے پہلے آنحضرت کی بیت المقدس کی طرف پہنچایا۔

"حق تعالیٰ اپنے رسول کو معراج کی رات لے گیا مکہ سے بیت المقدس براق پر اور آگے لے گیا آسمانوں پر یہاں اتنا ذکر ہے باقی سورہ نجم میں ہے" (موضح القرآن)

ہمارے بھی مفسرین نے جمہور کی اس تفسیر کی جو مسجد اقصیٰ کے لفظ کے متعلق ہے رد نہیں کی ہے مگر اس کی تائید میں معصومینؑ کی روایت بیان نہیں کی ہے بلکہ اسکی نسبت انہی راویوں کی طرف دی ہے جو اہل سنت کے یہاں مقبول ہیں لیکن اعتبار سند کے لئے ہمارے نقطہ نظر سے وہ

---

[1]۔ المسجد الاقصیٰ ھو بیت المقدس وھو مسجد سلیمان بن داؤد فی قول الحسن وغیرہ من المفسرین (تبیان)

معیار نہیں بن سکتے اور اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ بن امیہ کے زمانہ کی اس اصطلاح کا وجود عہد تنزیل قرآن میں ثابت نہیں ہے لہٰذا ہم نے ترجمہ میں مسجد اقصیٰ کا لفظ بطور نام کے نہیں لکھا بلکہ توصیفی حیثیت سے اس کا جو مفہوم ہے اور جو عالم بالا کے بلند ترین نقطہ پر منطبق ہے تحریر کیا ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے متفقہ شیعی نقطہ نظر تو یہ پیش کر دیا ہے کہ معراج آسمان کی طرف ہوئی مگر مسجد اقصیٰ کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھ کر یہ کہہ دیا ہے کہ بیت المقدس تک سفر قرآن سے ظاہر ہے اور اس کے آگے احادیث سے ثابت ہے [1] مگر ہمیں یہاں جناب شیخ سے شدید اختلاف ہی نہیں بلکہ شکایت ہے کہ انہوں نے اس سے آگے کے لئے صرف احادیث کا حوالہ دیا جب کہ مفسرین اہل سنت بھی جو اس آیت سے صرف بیت المقدس تک جانے کا استفادہ کرتے ہیں آگے کے سفر کے ثبت کو صرف احادیث پر محمول نہیں کرتے بلکہ قرآن مجید ہی کے دوسرے محل یعنی سورہ والنجم کا حوالہ دیتے ہیں۔

علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر چہ اکثر جگہ صرف جناب شیخ طوسی کی تفسیر تبیان کا تتبع کیا ہے مگر یہاں انہوں نے اپنی جانب سے کافی بسط و تفصیل کے ساتھ محققانہ انداز میں بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ معراج کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں ان کے مضامین میں بہت اختلافات پایا جاتا ہے لہٰذا معراج کے متعلق جو نقطہ نظر ہے اور ہونا چاہئے اسے ہم چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اوّل جس حد تک قطعی ہے اور ہر مسلمان کو بتقاضائے اسلام اسے ماننا ضروری ہے وہ مجملاً یہ ہے کہ خالق اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیر معمولی طور پر لے گیا اور معجزانہ طور پر آپ کو مشاہدات کرائے اس سے قطع نظر کہ کہاں تک لے گیا اور آپ نے کیا کیا دیکھا؟ ''غیر معمولی'' اور ''معجزانہ'' سے یہ نتیجہ طور پر نکلتا ہے کہ جہاں تک بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ لے گیا یقیناً عالم بیداری میں تھا خواب نہ تھا۔ [2]

دوسرے وہ ہے جو اخبار میں آحاد میں ہے اور کسی اصول عقلی یا ضرورت دین کے خلاف نہیں ہے اسے بس ہر ممکن الوقوع سمجھتے ہیں اور ان کے درجہ اعتبار کے لحاظ سے ان کے متعلق گمان غالب یا غیر غالب ہوسکتا ہے۔

تیسرے وہ جن کا ظاہری مفہوم قابل قبول نہیں ہے مگر ان کی معقول تاویل ہوسکتی ہے ان میں درصورت اعتبار روایت کوئی تاویل ضروری ہے جو منطقی دلیل اور ضرورت دین کے موافق ہو اس میں وہ روایات داخل ہیں جن میں یہ ہے کہ حضرت نے کچھ خاص اچھے کام کرنے والوں کو بہشت میں دیکھا کہ وہ نعم الٰہی سے بہرہ ور ہو رہے ہیں اور کچھ خاص گناہوں کے مرتکب افراد کا انجام دیکھ کہ دوزخ میں ان پر طرح طرح کا عذاب ہو رہا ہے چونکہ ثواب بہشت اور عذاب دوزخ کا اصل ہنگامہ بعد قیامت ہے اس لئے ہم اسکی تاویل یہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو تمثیلی طور پر یہ مناظر دکھلائے گئے جو بعد میں حقیقی طور پر رونما ہونگے۔

چوتھی قسم وہ ہے جس کا ظاہری مفہوم خلاف مسلمات عقلیہ وضروریات دین ہے اور ان کی زبردستی کے بغیر کوئی صحیح توجیہ و تاویل نہیں ہوسکتی ان باتوں کا رد ضروری ہے جیسے حضرت کا خالق کو عرش پر دیکھنا اور اس کے پہلو میں بیٹھنا اور منہ در منہ ہم کلام ہو تو یہ باتیں شان الوہیت کے خلاف ہیں۔

اس طرح یہ خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ کو چاک کیا گیا اور آپؐ کے دل کو معاذ اللہ آلائشوں سے پاک کیا گیا یہ شان رسالت کے خلاف

---

[1] ۔الّذی یشھدبه القراٰن الاسراء من المسجد الحرام الی المسجد الاقصٰی والباقی یعلم بالخبر۔(تبیان)

[2] ۔ماقال بعضھم ان ذٰلك کان فی النوم فظاھر البطلان اذلا معجز یکون فیه ولا برھان (مجمع البیان)

ہے ایسی تمام روایتوں کا رد کرنا ضروری ہے۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ
وَكِيْلًا ۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۳

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دیا کہ نہ قرار دے مجھے چھوڑ کر کسی کو کارساز۔[1] اے اس نسل کے لوگو جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا! بلا شبہ وہ شکر گزار بندہ تھا''۔

اسلامی روایت کے لحاظ سے نسل نوح سے خطاب مثل یا ایہا الناس اور یا بنی آدم ہے کہ تمام نوع انسانی کو عام ہے کہ کیونکہ نوح ہمارے نزدیک آدم ثانی ہیں اب موجودہ نسل انسانی سب نوح کی اولاد سے ہے [2]

بلا شبہ وہ شکر گزار بندہ تھا کون؟ اس ضمیر کو غالبا قرب لفظی کی وجہ سے نوح علیہ السلام کی طرف راجع کیا گیا ہے یعنی نوح علیہ السلام شکر گزار انسان تھا۔[3] اور یہ اس لحاظ سے درست سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ مستقل آیت ہے لہٰذا اس کا اتصال مقام تنزیل میں اس کے قبل کی آیت سے یقینی سمجھا جا سکتا ہے۔ ورنہ اسے موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہونا زیادہ نمایاں ہے جن کا ذکر پہلے کی آیت کے سلسلہ کو دیکھتے ہوئے مرکزی طور پر ہے اور اگر یہ آیت اسی سے متصل مانی جائے تو جناب نوح علیہ السلام کا ذکر ضمناً بضمن خطاب ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۴ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ
شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ
عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ
اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا
وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا
تَتْبِيْرًا ۷ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ
لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۸

---

[1] ۔ یا ذرّیۃ من حملنا مع نوح (جلالین) اے فرزندان قومی کہ بر داشتیم آں را نوح علیہ السلام یعنی بر کشتی (شاہ ولی اللہ)
[2] ۔ ہو خطاب لجمیع الخلق لانّ الخلق کلّہ من نسل نوح من بنیہ الثلٰثۃ (تبیان)
[3] ۔ معناہ انّ نوحا کان عبداللہ کثیر الشّکر (مجمع البیان)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو اطلاع دی [۱] اس کتاب میں [۲] کہ تم ضرور ضرور دنیا میں دو مرتبہ خرابی کرو گے اور ضرور تم تکبر سے کام لو گے۔ تو جب ان میں سے پہلی بات کا وقت آئے گا تو ہم تم پر بھیجیں گے اپنے ایسے بندے جو بڑی سخت لڑائی لڑنے والے ہوں گے تو وہ گھروں کے اندر داخل ہو جائیں گے اور یہ وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔ پھر ہم تمہیں ان کے مقابلہ میں غلبہ دیں گے اور تمہیں مال و اولاد کے ساتھ تقویت پہنچائیں گے اور تمہیں تعداد میں بڑی اکثریت دیں گے۔ اگر تم بھلائی کرو گے تو خود اپنے ہی نفس کے لیے بھلائی کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو وہ بھی اسی کے لیے ہو گی۔ تو جب دوسری بات کا وقت آئے گا تو یہ نتیجہ ہو گا کہ پھر ویسے ہی لوگ آئیں گے کہ تمہارا حلیہ بگاڑ دیں گے [۳] اور اس مسجد میں اسی طرح داخل ہو جائیں گے جیسے پہلی دفعہ داخل ہوئے تھے۔ اور جس جس چیز پر کہ ان کا قابو ہو گا وہ اسے ملیا میٹ کر دیں گے۔ ممکن ہے کہ اللہ تم پر رحم کرے اور اگر تم نے پھر ایسا کیا تو ہم بھی پھر ایسا ہی کریں گے اور دوزخ کو ہم نے کافروں کے گھیرنے کے لیے قرار دے ہی رکھا ہے''۔

بنی اسرائیل کی دو مرتبہ خراب کاری اور اس کی پاداش

یہ تمام تذکرہ ہے ان انقلابات کا جو بنی اسرائیل کو پیش آئے جس کی خبر پہلے سے کتب سابقہ میں دی جا چکی تھی۔

دو دفعہ بنی اسرائیل نے سرکشی اور نافرمانی سے کام لیا اور اس کے نتیجہ میں ان پر دوسرے طاقتور لوگ غالب آ گئے۔

پہلی دفعہ جالوت کا تسلط ہوا اور عرصہ دراز تک بنی اسرائیل اس کے قہر و غلبہ میں مبتلا رہے جس کے بعد طالوت کی سرکردگی میں اس سے مقابلہ ہوا تو جناب داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا اور اب جناب داؤدؑ اور جناب سلیمانؑ کو اقتدار حاصل ہوا یہ وہ درمیانی دور ہے جس کا قرآن نے حوالہ دیا ہے کہ ہم نے تم کو پھر ان پر غلبہ دیا اور تمہیں اموال و اولاد میں فراوانی عطا کی اس کے بعد دوسری مرتبہ جب ان کی بداعمالیاں زیادہ ہوئیں تو بخت نصر نے ان پر تسلط قائم کیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا یہ وہ دوسری بار ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ ایک تشریح ان دو دفعہ کی ہے مگر اس کے علاوہ بعض دوسرے اقوال بھی ہیں جن کا ذکر علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں کیا ہے اور بعض مفسرین نے کہہ دیا ہے تاریخ بنی اسرائیل کے گوناگوں انقلابات میں سے کون دو انقلاب ہیں جنہیں خاص طور پر قرآن مجید نے یاد دلایا ہے؟ اس کا بیان خود قرآن مجید میں ہے نہیں، نہ مستند احادیث موجود ہیں تو ہم یقینی طور پر ان کی تعیین نہیں کر سکتے نہ اس کے جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ [۴]

اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ يَهۡدِىۡ لِلَّتِىۡ هِىَ اَقۡوَمُ وَيُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ

---

[۱]۔ اعلمناهم (علی بن ابراهیم)

[۲]۔ در توریت (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ بعثناهم لیسوءوا (جلالین)

[۴]۔ فلا نقطع علیٰ شیء مما ذکر عن ابی علی الجبائی (مجمع البیان)

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا كَبِيۡرًا ۙ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۰﴾

''بلاشبہ یہ قرآن ہدایت کرتا ہے ایسے راستے کی جو انتہائی درست ہے اور خوش خبری دیتا ہے ان اہل ایمان کو جو اچھے اعمال کرتے ہیں کہ ان کے لئے بہت بڑا صلہ ہے اور یہ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے دردناک عذاب بھی مومنین کے لئے جزء بشارت قرار دیا گیا ہے۔[1] معلوم ہوتا ہے کہ فضائل پر مدح کی تکمیل مخالف پہلو کی مذمت کے ساتھ ہوتی ہے۔

وَيَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالۡخَيۡرِ‌ ؕ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ﴿۱۱﴾

''اور انسان تو بُرائی کی بھی دعا کرتا ہے۔ اسی طرح جیسے وہ بھلائی کی دعا کرتا ہے اور انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے''۔

چونکہ انسانی علم محدود ہے اس لئے بسا اوقات وہ بھلائی اور برائی میں امتیاز نہیں کرتا لہٰذا قبولیت دعا بالکل انسان کی خواہش سے وابستہ نہیں رکھی گئی بلکہ خالق اپنی حکمت کے معیار پر جب مناسب سمجھتا ہے اس وقت اس کی دعا قبول کرتا ہے۔

یہی ایک دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ:۔

وَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ (البقرہ)

بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم دوست رکھتے ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو بات یہ ہے کہ اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔

آخری فقرہ کہ انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بہت سی بھلائیاں اور برائیاں ایسی برائیاں ہوتی ہیں کہ اگر انسان خود ہی کچھ دن حالات کا مطالعہ کرتا تو ان کا خود اسے علم ہو جاتا تا مگر وہ جلد بازی کی وجہ سے اکثر اتنا انتظار نہیں کرتا اور بس جذبات کی رو میں بہہ کر جو جس وقت جی چاہا اسے خالق سے مانگ بیٹھتا ہے اب بھلا خالق حکیم اس کی ہر دعا کو کیوں کر قبول کرے؟

پھر ایک اور صورت بھی ہے کہ انسان جیسے جذبات سے مغلوب اور حالات سے تنگ ہو کر خودکشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے ویسے ہی وہ کسی وقتی ناگواری کی بناء پر صریحاً جن چیزوں کو خود برا سمجھتا ہے انہیں اللہ سے مانگنے لگتا ہے جیسے اپنی موت یا بچوں پر غصہ آیا اور انہیں کوسنے لگا تو یہ کوسنا بھی اللہ سے دعا ہی ہے خود اس سے صبر و سکون کے لمحات میں پوچھئے کہ وہ چاہتا کیا ہے کہ اللہ اس کی ایسی دعاؤں کو فوراً قبول کر لیا کرے وہ کہے گا کہ

---

[1] یبشرھم ایضا بانّ الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ الخ (تبیان و مجمع البیان)

ہرگز نہیں۔[1]

پھر جلد بازی اس اعتبار سے بھی ہے کہ دعا کی قبولیت ممکن ہے مناسب موقع کے انتظار میں رکی ہوئی ہو مگر یہ ادھر کچھ دیر ہوئی اور بس شکوہ کرنے لگا کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی یہ اس کی جلد بازی نہیں تو اور کیا ہے؟[2]

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے رات اور دن کو بنایا دو نشانیاں تو مٹا ہوا بنایا رات والی نشانی کو اور دن والی نشانی کو روشن قرار دیا۔ تاکہ تم اپنے پروردگار کے فضل وکرم کو (کمائی کرکے) حاصل کرنے کی کوشش کرو اور تاکہ تمہیں برسوں کی تعداد اور حساب معلوم ہو اور ہر چیز کو ہم نے پوری طرح کھول کھول کر بیان کر دیا ہے''۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾

''اور ہر آدمی ہم نے اس کے نامہ اعمال[3] کو اس کی گردن سے وابستہ کر دیا ہے اور اس کے لئے قیامت کے دن نکالیں گے نوشتہ جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ پڑھ لے تو اپنے نوشتہ کو، تو خود کافی ہے اپنے خلاف آج جانچ پڑتال کرنے کے لئے''۔

نامۂ اعمال

اعمال نامہ کے گردن سے وابستہ کرنے کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ نامہ عمل جو ایک نوشتہ کی صورت رکھتا ہے ہر انسان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور بطور محاورہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ذمہ داری اس کی گردن پر ہے جس سے اسے عہدہ برآ ہونا ہے[4] اور قیامت میں وہ اسے نامہ اعمال کی صورت میں سامنے نظر آئے گا بلکہ بنص قرآن اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

''اعمال نامہ'' کو ''طائر'' کہنا عرب کے اس تصور کے لحاظ سے ہے کہ وہ پرندہ کے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جانے کو شگون

---

[1] ۔ ویدع الانسان بالشرّ علی نفسه واهله اذا ضجر (جلالین) در حالت تنگدلی بر خود و اولاد خود دعای بد می کند (فتح الرحمن) فلو اجاب الله دعاءه لاهلك لكنّه لا یجیب بفضله ورحمته (مجمع البیان)

[2] ۔ گھبراتا ہے کہ میری دعا شتاب کیوں قبول نہیں ہوتی (موضح القرآن)

[3] ۔ طائره عمله والزم الله طائره فی عنقه الحکم علیه بما یستحقه من ثواب او عقاب (تبیان)

[4] ۔ فی عرف النّاس ویقولون هذا فی رقتبك (تبیان)

نیک وبد کے طور پر سعادت اورنحوست کی نشان قرار دیتے تھے چونکہ اس کا تعلق مستقبل کے ساتھ ہوتا تھا لہٰذا قرآن نے حسن وانجام وبدانجامی کی جو آخرت سے وابستہ ہے اور وہ ''اعمال نامہ کی بناء پر ہے، طائر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔[۱]

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ⑮

''جو ہدایت حاصل کرے وہ ہدایت حاصل کرے گا خود اپنے ہی فائدہ کے لئے اور جو گمراہ ہو وہ گمراہ ہو کے خود اپنا ہی نقصان کرے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہم عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کوئی پیغام پہنچانے والا بھیج نہ دیں''۔

یعنی بغیر اپنی ارادی کوتاہی کے لاعلمی کی وجہ سے اگر انسان غلطیوں میں مبتلا ہو تو سزا دینا عدل الٰہی کے خلاف ہے اس لئے جب تک وہ پیغمبر بھیج نہیں دیتا جو اس کے احکام پہنچائے اس وقت تک مورد سزا قرار نہیں دیتا، چونکہ زیادہ تر اُس کا منشا پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے لیکن جس حد تک ضمیر انسان کا قطعی طور پر بتادے کہ یہ باتیں بری ہیں ان میں خود انسان کا ضمیر ہی اللہ کی ترجمانی کے لئے کافی ہے اس لئے انسان ان احکام میں خلاف ورزی کر کے باز پرس سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔[۲]

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ⑯

''اور جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو وہاں دولت مندوں کی تعداد بڑھا دیتے ہیں۔ تو وہ اس میں فسق وفجور کا ارتکاب کرتے ہیں، تو اس پر فیصلہ قدرت نافذ ہوجاتا ہے تو ہم اسے جیسا چاہتے ہیں تہس نہس کر دیتے ہیں''۔

ہلاکت اقوام کا عام نظام

یہ آیت مشکلات قرآن میں سمجھی گئی ہے ہمارے اصول کی بناء پر خالق کے تمام کام بر بنائے عدل ہوتے ہیں۔

''جب ہم چاہتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنا'' یہ ارادہ ہلاک کرنے کا بلا جواز نہیں ہوسکتا ضرور ہے ان سے ایسی بداعمالیاں سرزد ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہلاکت کے مستحق ہوتے ہیں اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ انہیں بداعمالیوں کا خمیازہ ہے اور اب جو ان کے لئے دولت اور سامان

---

[۱]۔ قیل للعمل وطائر علیٰ عادۃ العرب فی قولھم: جزی طائرہ بکذا و مثلہ قولہ بسبحانہ قالوا طائر کم معکم وقولہ: انّما طائرہ عنداللہ (مجمع البیان)

[۲]۔ فتکون الاٰیۃ خاصّۃ فیما یتعلّق بالسّمع من الشرعیات فاقاما کانت الحجّۃ فیہ من جھۃ العقل فانّہ یحقّ العقاب بترکہ (مجمع البیان)

عیش کی فراہمی وفروانی ہورہی ہے وہ بھی ان پر بر بنائے مہربانی نہیں بلکہ تمام حجت کے طور پر ان کی مکمل ہلاکت کے استحقاق کی تکمیل ہے۔

پھر یہ فقرہ کہ امرنا مترفیھا اس میں امرنا کا جو لفظ ہے اسے اس امر سے لیا جائے جس کے معنی حکم ہوتے ہیں تو اس کے لئے متعلق کی ضرورت ہے کہ کاہے کا حکم؟ اب ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے دولتمندوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں فسق وفجور کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ شاہ رفیع الدین کے ترجمہ میں ہے:

"بس حکم کرتے ہیں کہ ہم دولت مندوں کو پس نافرمانی کرتے ہیں بیچ اس کے"

تو کیا خالق کی طرف سے معاذ اللہ اسی فسق وفجور کرنے کا انہیں حکم ہوتا ہے اسے کسی منکر عدل کا بھی ضمیر گوارا نہیں کرتا چنانچہ شاہ ولی اللہ ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

می فرمائیم سرکشاں آنجا یعنی آنچہ می خواہیم پس نافرمانی کردند آنجا

ہم وہاں کے سرکشوں کو حکم دیتے ہیں یعنی ان باتوں کا جو ہمیں مطلوب ہیں تو وہ وہاں نافرمانی سے کام لیتے ہیں

امرنا مترفیھا منعیھا بمعنی رؤساءھا بالطاعۃ علیٰ لسان رسلنا ففسقو اخرجو اعن امرنا

ہم وہاں کے مترفین منعموں یعنی ان کے سرغنہ افراد کو اطاعت کا حکم دیتے ہیں اپنے پیغمبروں کی زبانی تو وہ فسق سے کام لیتے ہیں یعنی ہماری عدل وحکمی کرتے ہیں

مگر احکام تو عمومی ہوا کرتے ہیں یہ خاص طور پر دولت مندوں یا سرغنہ اشخاص کو حکم دینے کے کیا معنی؟ لیکن جب امرنا کو امر بمعنی کثرت سے لے لیا جائے جس کے نظائر کلام عرب میں موجود ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے تو کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔

ہماری قدیم تفسیر بھی اس معنی کو بتاتی ہے [1] اور علامہ طبرسی نے الحجۃ کے زیر عنوان صدر اول کے بعض ائمہ عربیت کا قول اس کی تائید میں پیش کیا ہے [2] جس کے بعد اس کے ماننے میں کسی عذر نہ ہونا چاہئے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ⑰

"اور کتنی ہی [3] قومیں [4] ہم نے ہلاک کردیں نوح کے بعد سے اور تمہارے پروردگار سے بڑھ کر اپنے بندوں کے گناہوں کا دیکھنے والا واقف کار کون ہوگا"۔

یہ آیت مضمون کے لحاظ سے قبل والی آیت سے دست وگریباں ہے اس لئے بعید نہیں کہ مقام تنزیل میں بھی اس سے متصل ہو اور اب اس آیت کے آخری فقرہ کو ملا کر دیکھئے قبل والی آیت کے ابتدائی مضمون سے تو صاف سمجھ میں آئے گا کہ اقوام کی ہلاکت کا ارادہ ان کے گناہوں کی

---

[1] ای کثرنا جبار برتھا (علی بن ابراھیم)

[2] قال ابو عبیدۃ امرنا اکثر من قولھم امر بنو فلاں ای کثروا (مجمع البیان)

[3] کم یفید التکثیر ضد "رُبَّ" الذی یفید التقلیل (تبیان)

[4] من القرون ای من الامم الکثیرۃ المکذبۃ (مجمع البیان)

کثرت کی بناء پر ہوا کرتا ہے نہ کہ بلا وجہ جو کہ عدل وحکمت باری تعالیٰ کے خلاف ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

”جو اس دنیا کا طالب ہوا سے ہم اسی دنیا میں دے دیتے ہیں جتنا جسے ہمیں دینا ہوتا ہے پھر اس کے لیے دوزخ قرار دیتے ہیں جس کی گرمی اور وہ مذمت اور لعنت میں گرفتار ہونے کے عالم میں برداشت کرے گا اور جو آخرت کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے اُس کی سی کوشش کرتا ہے اس صورت میں کہ وہ باایمان ہے تو یہ وہ ہیں جن کی کوشش کی قدر سمجھی جائے گی اور ہر ایک کو ہم مدد پہنچاتے ہیں انہیں اور انہیں تمہارے پروردگار کے عطا وکرم سے اور تمہارے پروردگار کی عطا پر پابندی نہیں ہے“۔

دنیاوی عطا خالق کی بمقتضائے ربوبیت ہے اور آخرت کی عطا بمقتضائے عدالت ہے ربوبیت اس کی عام ہے اس لئے دنیا کی عطا بھی عام ہے اور عدالت خود مقتضی امتیاز ہے لہٰذا آخرت کی عطا ایمان واطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔

بے شک دنیاوی عطا بھی ہر شخص کے لئے بلا قید اس کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ بلند تر نظام عالمی کے تقاضوں کے اعتبار سے جو ارادہ الٰہی ہوتا ہے اس کے مطابق ملتی ہے۔[1]

دنیا والوں کو عطائے دنیا سے سرفراز کرنے میں بس یریدں عاجلۃ کہا کہ وہ دنیا کا طلب گار رہے تو بس دنیا اسے مل جاتی ہے لیکن آخرت کی عطا کے لئے بس یہ نہیں کہا کہ وہ طالب آخرت کی کامیابی کے لئے ضروری ساتھ قیود عائد کئے کہ ویسی کوشش بھی کرے یعنی ان اعمال کو بجا لائے جو آخرت کی کامیابی کیلئے ضروری ہیں اور اس کے ساتھ مومن بھی ہو پھر نتیجہ کو بھی اس سعی سے وابستہ کیا گیا ہے اس کی کوشش کی قدر کی جائے گی یعنی بقدر کوشش نتیجہ عطا کیا جائے گا۔

اس سے آنکھیں کھلنی چاہئیں ان کی جو آخرت کو بھی بس تصورات یا تمناؤں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

”دیکھو، ہم نے کس طرح ایک کو دوسرے سے بڑھا ہوا قرار دیا ہے اور بلاشبہ آخرت درجوں کے اعتبار سے کہیں

[1] یعنی فی الدنیا القدر الذی نریدہ لمن نرید الاعلیٰ قدر ما یریدون (تبیان) العبد ما لا یشاء اللہ فلا یعطیہ لکونہ مفسدۃ (مجمع البیان)

زیادہ اور بڑھاوے کے اعتبار سے کہیں زیادہ ہے“۔

دنیا میں روزی اور تمام نعمتیں سب کو یکساں نہیں ملی ہیں بلکہ ایک دوسرے سے زیادہ عطا ہوئی ہیں جس کے بلحاظ حکمت بہت سے وجوہ ہوتی ہیں۔[1] یہاں تک قرآن وحدیث بتلاتی ہیں کہ کبھی نعمت دنیا کی عطااور زیادتی بطور سزا بھی ہوتی ہے نعوذ باللہ من ذلک

اسی طرح آخرت بھی درجات مختلف ہیں مگر ان کا سبب بر بنائے عدالت ایمان واطاعت کے مراتب کا فرق ہوتا ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿٢٢﴾

”اس کے سوا کوئی خدا قرار نہ دو، نہیں تو مذمت میں گرفتار، بے بس اور بے کس ہو کر بیٹھو گے“۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿٢٣﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿٢٤﴾

”اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم نافذ کیا ہے کہ عبادت نہ کرو سوا اس کے کسی کی اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اگر تمہارے پاس کبرسنی کی منزل تک پہنچ گیا ان میں سے ایک یا وہ دونوں تو ان سے اف بھی نہ کرو اور نہ ان کو جھڑکی دو اور ان سے اعزاز کے انداز میں بات کرو۔ اور ان دونوں کے لیے تذلیل کے ساتھ اپنے بازو کو جھکائے رہو مہربانی سے اور کہو کہ پروردگار! اپنی رحمت ان دونوں کے شامل حال فرما جس طرح انہوں نے چھٹ پن میں میری پرورش کی“۔

حقوق والدین

اُف کہنے سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی قسم کی اذیت نہ پہنچاؤ، اس کے لئے سب سے ادنیٰ درجہ جو ہو سکتا ہے وہ اُف ہے کہ اس میں کوئی ایذا پہنچانا نہیں ہے بلکہ اپنے احساس اذیت کا اظہار ہے تو جب اتنے تک سے منع کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے آگے جو ایذا رسانی کے درجے ہیں وہ باختلاف مراتب کس قدر اللہ کی ناراضگی کا باعث ہونگے؟

چونکہ ایذا رسانی کی ممانعت میں ایک کم سے کم چیز کو عنوان حکم بنایا گیا ہے اس لئے معصومؑ نے ارشاد فرمایا کہ اُف کہنے سے کم درجہ کی کوئی چیز ہوتی جو ایذا رسانی کے معنی پیدا کرے تو اللہ اسی کو ارشاد فرماتا، اُف کہنے سے ممانعت اس کا ثبوت ہے کہ اس سے کم تر کوئی چیز دائرۂ تصوّر میں

---

[1]. بان جعلنا بعضھم اغنیاء و بعضھم فقراء بعضھم موالی و بعضھم عبیدا و بعضھم اصحّآء و بعضھم مرضٰی بحسب ما علمنا من مصالحھم (تبیان) علیٰ حسب ما علمناہ من المصالح (مجمع البیان)

نہیں ہے۔[1]

اس حکم میں کبرسنی کا ذکر بطور قید نہیں ہے کہ اگر والدین اکبرالسن نہ ہوں تو ان کا احترام واجب نہ ہو بلکہ یہ اس لئے ہے کہ اس عمر میں زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑیں بلاوجہ خفا ہونے لگیں یا تکلیف دہ باتیں کہیں یا کریں مگر ان کے حقوق کی بناء پر ان کی کسی بات پر اف کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا پھر یہ کہ اس عمر میں انہیں اولاد سے خدمت لینے کی ضرورت ہوتی ہے اس پر امکان ہے کہ اولاد جز بز ہو کر اف یا ہماری زبان میں افوہ کہے جیسا کہ اکثر ایسا دیکھا اور سنا جاتا ہے لہٰذا خالق نے خاص طور پر اسے مورد ممانعت قرار دیا ہے۔[2]

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿٢٥﴾

"تمہارا پروردگار تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم نیک ہو تو وہ لولگانے والوں کو بخشنے والا ہے"۔

بجائے خود اس آیات کا مفہوم واضح ہے[3] لیکن سیاق کلام کے ساتھ مرتبط کرتے ہوئے درصورتیکہ گذشتہ آیت کے ساتھ مقام تنزیل میں متصل ہو مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ماں باپ کبرسنی کے تقاضے سے یا کسی اور وجہ سے مثلاً سوتیلی ماں بلاوجہ لگائی بجھائی کرتی ہے اور غلط طور پر باپ کے کان بھرا کرتی ہو جیسا کہ کبھی کبھی مشاہدہ میں آتا ہے اولاد سے کلیۃً ایسے خفا ہو جائیں ناحق کہ یہ لاکھ ان کی رضا مندی کی کوشش کرے مگر کامیاب نہ ہو تو قرآن اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ تمہارے ضمیر کو مطمئن ہونا چاہئے کہ تمہارا کردار ٹھیک ہے اب اگر اس کے بعد بلاوجہ تم سے وہ ناراض ہیں تو خدا کے یہاں تم مواخذہ وار نہ ہو گے۔

شاہ عبدالقادر کا ذہن بظاہر ایک دوسرے پہلو کی طرف گیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

یعنی دل میں آوے کہ بوڑھے ماں باپ سے معاملت نباہنی مشکل ہے تو فرمایا کہ جس کی نیت نیکی پر ہے اگر خفا کرے اور پھر رجوع لاوے تو اللہ بخشنے والا ہے۔ (موضح القرآن)

مگر ہم نے جو مطلب لکھا ہے، وہ ہمارے نزدیک الفاظ قرآنی سے زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٦﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾

---

[1] ۔قال لوعلم انّ شيأ اقلّ من انّ لقاله (علی بن ابراهیم) عن جعفر بن محمّد علیہ السلام انّه قال: لوعلم الله لفظا ارجز فی ترك عقوق الوالدين من اُفّ لقاله (تبیان) وفی رواية اخرىٰ عنه علیہ السلام قال: ادنى العقوف افّ ولو علم الله شيئا ايسو منه واهرن لنهى عنه و فی خبر اٰخر: فليعمل العاقّ ماشآء ان يعمل فلن يدخل الجنّة (مجمع البيان)

[2] ۔انما خصّ الكبر لان وقت كبر الوالدين ممّا يفطرّ فيه الوالدان الى الخدمة (تبيان)

[3] ۔معناه انّ معلوماته اكثر من معلوماتكم وقيل معناه انّه اعلم بجميع ما فى ضمائركم وهٰذا اوجه (مجمع البيان)

''اور قرابت دار کو اس کا حق عطا کرو اور مسکین اور مسافر کو اور بہت زیادہ بے جا خرچ نہ کرو۔ بلا شبہ بیجا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہی تو تھا''۔

فضول خرچی کی مذمّت

آیہ مودّت اور حکم خمس کی طرح اس آیت میں بھی ''ذوالقربیٰ'' کی تفسیر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحباب قرابت سے ہوئی ہے[1] اور فریقین کے طرف سے وارد ہوا ہے کہ اسی آیت کے نازل ہونے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فدک اپنی بیٹی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو ہبہ فرمایا۔

اس کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ اٰت ذاالقربیٰ کا مخاطب رسول ہی کو قرار دیا جائے بلکہ خطاب عمومی ہو تب بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی تعمیل میں پیش پیش ہونا چاہئے بلکہ اس خطاب کی عمومیت اور لفظ ذاالقربیٰ کی قربتداروں رسولؐ سے خصوصیّت کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خمس میں ذاالقربیٰ کا جو حق ہے اور جو قیامت تک تمام مسلمانوں پر از روئے قرآن واجب الادا ہے، وہ بھی اس اٰت ذاالقربیٰ کے تحت میں خالق کے منظور نظر ہو سکتا ہے۔

صرف بے جا کرنے کی ممانعت اس آیت میں ''تبذیر'' کے لفظ سے ہوئی ہے بعض مترجمین و مفسرین نے تبذیر کو ''اسراف'' کا ہم معنی قرار دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے۔

''و اسراف مکن اسراف کردنی ہر آئینہ اسراف کنندگان ہستند برادران شیاطین''

لیکن بعض اہل نظر اسراف اور تبذیر میں فرق قرار دیتے ہیں کہ اسراف کہتے ہیں ''حد سے زیادہ خرچ'' کو اور تبذیر ''بے محل صرف'' کو یعنی صحیح مصرف میں صرف کیا مگر اندھا دھند افراط کے ساتھ تو وہ اسراف ہے اور زیادہ نہ سہی کم ہی صرف کیا ہو مگر غلط مصرف میں تو وہ تبذیر ہے۔[2]

وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾

''اور اگر تم ان کی طرف سے بے توجہی اختیار کرنا چاہو اپنے پروردگار کی رحمت کی طلب میں جس کے تم امیدوار ہو تو ان سے ملائم انداز میں گفتگو کرو''۔

اس سے قبل بلا فاصلہ تو مبذرین یعنی بے جا صرف کرنے والوں کا ذکر تھا مگر اس سے مرتبط کر کے اس آیت کا مطلب کچھ نکلتا نہیں لہٰذا اس کا ربط اُس کے پہلے کی آیت سے قائم کیا جاتا ہے جس میں ذی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین کو دینے کا حکم تھا اور اس صورت میں یہ ضمیر ''اگر ان سے بے توجہی اختیار کرو'' انہی کی طرف پھرتی ہے[3] اور مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وقت تمہارے پاس نہیں ہے اور تم ان کی حاجت

---

[1] ۔ھو الذی رواہ اصحابنا رضی اللہ عنہم عن الصادقین علیہما السلام (مجمع البیان)

[2] ۔فلا تبذّر تبذیرا بالاتفاق فی غیر طاعۃ اللہ تعالیٰ (جلالین) قال مجاھد: لو انفق صدّا فی باطل کان مبذّرا ولو انفق جمیع مالہ فی الحق لم یکن مبذرا (مجمع البیان)

[3] ۔عنھم ای الذکورین من ذی القربیٰ و ما بعدہ۔(جلالین)

براری نہ کرسکو، تب بھی سخت کلامی سے پیش نہ آؤ، نرم وملائم الفاظ میں معذرت کرو۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔

یعنی جو کوئی ہمیشہ سخاوت کرتا ہے اور ایک وقت اس کے پاس نہیں ہے تو اللہ کے ہاں امید کا محروم ہوجانا خوش نہیں آتا اس محتاج کی قسمت سے اللہ نعمتوں کو بھیج دیتا ہے سو اس واسطے اگر ایک دفعہ نہ دے تو میٹھے جواب کہے۔ (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین بھی اس کے موافق تشریح کرتے ہیں۔[1]

مگر شاہ صاحب کی اردو تشریح کے الفاظ میں الجھاؤ محسوس ہوتا ہے سلجھی ہوئی تشریح کے لئے شاید الفاظ موزوں ہوں کہ ''بے توجہی اختیار کرو اللہ کی رحمت کی طلب میں جس کی تمہیں امید ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہارے پاس نہیں ہے اس لئے اس کی حاجت براری سے مجبور ہو مگر اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ عنقریب تمہیں کشائش عطا کرے گا تم اس وقت اس کا سوال پورا کرسکو گے اس بناء پر اس سوال پر بے توجہی اختیار کرتے ہو یعنی بے توجہی ظاہر کرتے ہو اس طرح کہ سکوت کرتے ہو اور سنی کو ان سنی بناتے ہو تو یہ طرز عمل بھی وجہ بے اعتنائی کا پتہ دے، اُس لئے تکلیف دہ ہوگا لہٰذا ایسا نہ کرنا چاہیے اس امید کے ہوتے ہوئے اللہ کشائش دے گا[2] خاموش کیوں رہو اور بے اعتنائی کا انداز کیوں اختیار کرو بلکہ اسی امید اور سہارے کی بناء پر اُس سے آئندہ امکانی کوشش کا وعدہ کرلو[3] کہ اُس کے دل کو ڈھارس ہوجائے اور تمہارے طرز عمل سے اُس کی دل شکنی نہ ہو۔

ہم نے ''بے توجہی اختیار کرتے ہو'' کے معنی جو یہ لئے کہ بے توجہی اختیار کرنا چاہتے ہو، وہ اس بناء پر نہیں کہ اگر بے توجہی کرہی لی اور وہ دل شکستہ مایوس ہوکر چلا گیا تو اس کا محل ہی کیا ہے کہ ان سے ملائم انداز میں گفتگو کرو اس کی نظیریں قرآن مجید میں تلاش سے مل جائیں گی کہ مثلاً ''ایمان لاتے ہو'' کا مطلب ''ایمان لانا چاہتے ہو''۔

یہ سب اس صورت میں ہے جب اس آیت کو مقام تنزیل میں گذشتہ آیت سے متصل سمجھا جائے لیکن اگر یہ آیت سی اور محل پر نازل ہوئی تھی اور کسی دوسرے موقع سے تعلق رکھتی ہے تو شاید اس کے معلوم ہوجانے کے بعد ہم بلا تکلف اس آیت کا مفہوم سمجھ لیں اور اس کا مطلب بیان کرنے میں ہمیں کچھ پاپڑ بیلنے نہ پڑیں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

''اور نہ رکھو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن سے اور نہ اسے بالکل پھیلا ہی دو، کہ اس صورت میں بیٹھو گے لعنت ملامت میں گرفتار، رنج وغم، پریشانی میں مبتلا''۔

خرچ میں میانہ روی کی ضرورت

---

[1] متی ما صرفت وجهك عنهم يعنى عن الذين امروا باعطائهم حقوقهم ممّن تقدّم ذكره.(تبیان)

[2] ای لتبغی الفضل من الله والسعة التی تمكنك من البذل(مجمع البیان)

[3] فقل لهم قولا حسنا ای عدهم عن جمیلة(تبیان)

''ہاتھ کو گردن سے بندھا ہوا نہ رکھو''یعنی بخل سے کام نہ لو اور''بالکل پھیلا نہ دو''یعنی اسراف نہ کرو۔

آخر کے فقرہ کے دو جز بالترتیب ان دونوں احکام سے متعلق ہو سکتے ہیں یعنی بخل سے کام لو گے تو لعنت و ملامت میں گرفتار ہو گے اور اسراف سے کام لو گے نتیجتاً رنج و حسرت میں مبتلا ہو گے [۱] اور ممکن ہے دونوں ٹکڑے دوسرے جزء یعنی اسراف ہی سے متعلق ہیں کہ اسراف کی صورت میں بھی جب بعد میں پریشان حالی میں مبتلا ہوتا ہے تو لوگوں کے تیر ہائے ملامت کا نشانہ بنتا ہے اور''نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ''میں گرفتار ہوتا ہے۔[۲]

اس غلط ذہنیت کے ماتحت کہ جہاں واحد مذکر حاضر کے صیغے کے ساتھ خطاب ہو وہاں مخاطب رسول اللہؐ ہی ہیں یہاں بھی ایسی روایات آ گئیں کہ حضرتؐ ہی نے ایسا کیا تھا کہ کپڑے اتار کر سائل کو دیدیئے یہاں تک کہ اب اتنا لباس نہ رہ گیا کہ گھر سے باہر نکلیں اور اس لئے کئی وقت مسجد میں نماز کو نہ جا سکے جس پر کافروں نے کہنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ معاذ اللہ اب سوتے رہتے تھے اور تفریحات میں مشغول رہتے ہیں اتنے کہ نماز کے لئے نکلنا چھوڑ دیا ہے۔اس پر یہ آیت اتری۔

ہمارے نزدیک وہ ذہنیت بھی کہ ایسے موقعوں پر ہر جگہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو مخاطب قرار دیا جائے تو غلط ہے اور یہ روایت بھی درست نہیں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرًاۢ بَصِيۡرًا ﴿۳۰﴾

''یقیناً تمہارا پروردگار کشائش دیتا ہے روزی میں جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگی میں مبتلا کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے خوب واقف ہے، نظر رکھنے والا''۔

آخر کا فقرہ کہ''وہ خوب واقف ہے اپنی بندوں سے نظر رکھنے والا''اس کا پتہ دیتا ہے کہ یہ رزق کی کشائش اور تنگی بلا وجہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں خود انسان کی کیفیت مثلاً وہ محنتی ہے یا سہل انگار، باعمل ہے یا بےعمل اور شکر گزار ہے یا ناشکرا؟ اس سب کو دخل ہے پھر اس کو مال و دولت عطا ہونے کے جو نتائج اُس کی ذہنی کیفیتوں اور ارادی استعدادات کے لحاظ سے ہو سکتے ہیں، ان سب کا علم بھی اللہ کے عمل میں دخیل ہوتا ہے۔[۳]

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا ﴿۳۱﴾

''اور اپنے بچوں کی فقر و فاقہ کے خوف سے جان نہ لو۔ہم انہیں اور تمہیں روزی عطا کرتے ہیں، یقیناً ان کی جان لینا بہت بڑی غلطی ہی ہے''۔

یہی فقر و فاقہ کا ڈر تو وہ ہے جو آج بھی خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے نام سے آنیوالے بچوں کا راستہ روک رہا ہے خالق مذکورہ بالا اعلان

---

[۱]۔ان امسکت قعدت ملوما عند العقلاء مذموما وان اسرفت بقت محسورا ای مغموما فتحسرا (تبیان) ان امسکت قعدت ملوما مذموما وان اسرفت بقیت فتحسر امغموما عن الجبائی (مجمع البیان)

[۲]۔یعنی سب الزام دیں کہ اتنا کیوں دیا کہ اب محتاج ہو گئے (موضح القرآن)

[۳]۔خبیرا بصیرا ای عالما باحوالھم بصیرا بمصالحھم (مجمع البیان)

جس طرح اس جاہلیت قدیم کے خلاف تھا اس طرح اس جاہلیت جدید کے مقابلہ میں بھی ہے۔
پہلے جو ہوتا تھا یعنی زمانہ قبل اسلام میں بہت بڑی غلطی تھی تو اب بھی جب ایسا ہو تو وہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔ [1]

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ﴿۳۲﴾

''اور حرام کاری کے پاس بھی نہ جانا، یقیناً وہ شرمناک گناہ ہے اور بہت برا طریقہ ہے''۔

"کان فاحشة" کے لفظی معنی ہیں ''شرمناک گناہ تھا'' یہاں اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے جیسا کہ سابقہ آیت میں ہم نے کہا کہ اب تک جو ہو رہا تھا وہ برا تھا لہٰذا اب بھی وہ برا ہے، اب تم اس کے قریب بھی نہ جانا لیکن "کان" کا لفظ ''ہے'' کے معنی بھی قرآن میں بھی بکثرت موجود ہے لہٰذا بہت ممکن ہے ان تمام آیات میں ایسا ہی ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

''اور نہ لو وہ جان جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے مگر کسی حق کی بنا پر اور جو مظلومیت کے ساتھ قتل ہو، ہم نے اس کے وارث کو قابو [2] عطا کیا ہے تو وہ جان لینے میں حد سے آگے نہ بڑھے یقیناً ان کی مدد ہوگی''۔

قانون قصاص

''نہ لو وہ جان۔۔۔مگر کسی حق کی بناء پر'' یعنی سوا اس صورت کے جو بطور قصاص وغیرہ قانون الٰہی نے اس کو مستحق قتل قرار دیا ہو۔ [3]
حد سے آگے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جاہلیت میں ہوتا تھا کہ بڑے آدمی کے عوض میں اس دوسرے قبیلہ کے کسی بڑے آدمی کو قتل کرتے تھے حالانکہ وہ بے گناہ ہوتا تھا، قاتل کوئی اور ہوتا تھا یا کہ کسی بڑے آدمی کے عوض میں ایک آدمی کا قتل کرنا نا کافی سمجھا جاتا تھا بلکہ بہت سے آدمیوں کی جان لی جاتی تھی تب سمجھا جاتا تھا کہ بدلا ہوا، ان باتوں کی اب اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔
اس کی مدد ہوگی کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس صورت میں اللہ اس کی مدد کرے گا اور یہ بھی کہ اس کی مدد ہونا چاہئے یعنی دوسرے لوگوں کو لازم ہے کہ اس کی مدد کریں۔ [4]

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

---

[1] ۔یعنی ان قتلھم فی الجاھلیة کان اثما عظیما عنداللہ وھو الیوم کذٰلک (مجمع البیان)
[2] ۔ای سلطانا علے القتل (علی بن ابراھیم)
[3] ۔بالحق وھو ان یجب علیه القتل امّا لکفرہ او ردتهٗ او لانّهٗ قتل نفسا بغیر حق او زنٰی وھو محصن (مجمع البیان)
[4] ۔یعنی ہر کسی کو لازم ہے کہ ان کا بدلہ دلانے میں مدد کرے نہ الٹا قاتل کی حمایت کرے (موضح القرآن)

”اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن تمیز کو پہنچے اور عہد کو پورا کرو۔ عہد کے متعلق یقیناً جواب دہی ہوگی“۔[1]

یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بالغ کے مال میں بلاحق تصرف درست ہے بلکہ چونکہ عموماً یتیموں ہی کے اموال میں لاوارث سمجھ کر اس قسم کی دست درازیاں ہوتی تھیں اس لئے انہیں مورد کلام قرار دیا گیا۔[2]

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۳۵

”اور جب ناپو تو ناپ پوری کرو اور ٹھیک ترازو سے تولو، یہ بہتر اور نتیجہ کے اعتبار سے زیادہ اچھی بات ہے“

ان آیات میں ناپ تول میں انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۶

”اور ایسی بات کے پیچھے نہ جاؤ جس کے متعلق تمہیں علم نہیں، یقیناً کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر چیز کے متعلق جواب دہی ہوگی“۔

چونکہ اس آیت میں نہی بصیغۂ مفرد کی گئی ہے اس لئے اس سے مخاطب رسول ﷺ کو سمجھا گیا ہے لیکن بہر صورت حکم اس کا عام ہے۔[3] اور ہم سمجھتے ہیں کہ گذشتہ آیات ہی کی طرح مخاطب بھی سب ہی لوگ ہیں صرف انداز میں تنوع کی خاطر جمع کے صیغہ کو واحد سے بدل دیا گیا ہے جس سے مراد ایک ایک کو مخاطب کرکے بات کہنا مفاد اس جمع اور اس واحد کے صیغہ کا ایک ہی ہے۔

”اس بات کے پیچھے نہ جاؤ جس کے متعلق تمہیں علم نہیں“ اسم کے تحت میں یہ بھی ہے کہ بغیر علم کے کوئی بات نہ کہو اور یہ بھی کہ بلا علم کوئی چیز مانو نہیں اور یہ بھی کہ لاعلمی کے ساتھ کوئی اقدام نہ کرو، غرض کہ قول عمل اور اعتقاد، سب کی بنیاد ضمیر کے اطمینان پر ہونا چاہیے۔[4]

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝۳۷ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝۳۸

---

[1]۔ کان مسئولا عنه للجزاء علیه فحذف عنه لانّه مفهوم (مجمع البیان)

[2]۔ انما خصّ الیتیم بذٰلك وان کان التصرّف فی مال البالغ لا یجوز ایضًا لانّ الیتیم الی ذلك اخوج والطمع فی ماله اکثر (تبیان)

[3]۔ هو متوجه الی جمیع المکلّفین (تبیان)

[4]۔ الاصل انّه عام فی کلّ قول و فعل و عزم یکون علی غیر علم فکانّه سبحانه قال: لا تقل الّا یعلم انّه یجوز ان یقال و لا تفعل الّا یعلم انّه یجوز ان یفعل و لا تعتقد الّا ما تعلم انّه یجوز ان یعتقد (مجمع البیان)

''اور نہ چلو زمین میں اٹھلاتے ہوئے، بلا شبہ تم ہرگز زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور ہرگز لمبائی میں پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی برائی اللہ کو ناپسند ہے''۔

اٹھلانا غرور و تکبر سے بھی ہوسکتا ہے اور اپنے کسی کارنامہ پر خوش ہو کر بے جا فخر سے بھی جسے ''اترانا'' کہہ سکتے ہیں۔ مفسرین نے دونوں پہلو اختیار کئے ہیں۔[1]

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ‌ ؕ وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰى فِىۡ جَهَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹﴾

''یہ سب اس میں سے ہے جو ہم نے آپ کی طرف حکمت کا ذخیرہ اتارا ہے اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا قرار نہ دو، ورنہ دوزخ میں ڈال دیئے جاؤ گے ملامت میں گرفتار، راندے ہوئے''۔

یہ سب یعنی سابق میں جو جو احکام نافذ کئے گئے ہیں اور جو جو ہدایات ہوئی ہیں[2] اسے حکمت کا ذخیرہ کہنے میں ایک بڑی بحث کا فیصلہ مضمر ہے۔ اگر ذاتاً اشیاء میں بھلائی اور برائی نہ مانی جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ بھلائی اور برائی صرف شریعت کے امرونہی سے پیدا ہوئی ہے یعنی جس بات کا حکم دے دیا وہ اچھی ہوگی اور جس سے منع کردیا وہ بری تو اتنا کہنا کافی تھا کہ ذلك مما اوحیٰ الیك ربّك یہ وہ ہے جو آپ کے پروردگار نے آپ پر وحی بھیجی ہے۔ من الحکمة کہنا اس کا ثبوت ہے کہ یہ احکام بلا وجہ نہیں ہیں بلکہ حکیمانہ طور پر مصالح و مفاسد کی بناء پر ہیں جنہیں انسان اپنی نادانی سے سمجھتا نہیں تھا خالق نے اپنے احکام کے ذریعہ سے اُن سے پردہ ہٹایا ہے۔[3]

اَفَاَصۡفٰٮكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰۤـئِكَةِ اِنَاثًا‌ ؕ اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾

''کیا تمہیں تمہارے پروردگار نے بیٹوں کے ساتھ امتیاز عطا کیا ہے[4] اور خود اس نے فرشتوں کی جنس سے لڑکیاں اختیار کی ہیں؟ تم بڑی بات زبان سے نکالتے ہو''۔

یہ مشرکین کا تصور تھا کہ ملائکہ خالق کریم کی بیٹیاں ہیں ان کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر وہ اپنے لئے بیٹیوں کو بہت برا سمجھتے تھے، رد کی جا رہی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ بیٹیاں واقعی بری چیز ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں دونوں بری ہیں یعنی اس کی شان الوہیت کے خلاف ہیں۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِيَذَّكَّرُوۡا ؕ وَمَا يَزِيۡدُهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا ﴿۴۱﴾

---

[1] ۔معناه لا تمش علٰی وجه الاشر و البطر و الخیلاء و الکبر----و قیل المرح شدة الفرح بالباطل (مجمع البیان)

[2] ۔الّذی تقدّم ذکره من الاوامر و النّواهی (مجمع البیان)

[3] ۔من الحکمة المؤدّیة الی المعرفة بالحسن و القبیح و الفرق بینهما (مجمع)

[4] ۔اخلص لکم البنین و اختار الکم صفوة الشئی دونه (تبیان)

’’اور ہم نے اس قرآن میں پلٹا پلٹا کر طرح طرح کی باتیں کہی ہیں تا کہ وہ نصیحت قبول کریں، حالانکہ وہ نہیں بڑھاتا ان کو مگر وحشت کے ساتھ بھڑکنا‘‘۔

پلٹا پلٹا کر یعنی بار بار ایک ایک بات کو دہرایا ہے[1] تا کہ ایک دفعہ نظر تغافل ہو جائے تو شاید دوسری مرتبہ مورد توجہ بن جائے اتمام حجت کے لئے[2] مگر نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو آخر میں ہے کہ بجائے مانوس ہونے کے ان کی وحشت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

’’کہئے کہ اگر اُس کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو وہ ضرور عرش والے تک پہنچنے کا راستا تلاش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بالا ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں بڑی برتری کے ساتھ‘‘۔

’’عرش والے‘‘ یعنی اللہ تک جو خدائے حقیقی ہے، پہنچنے کا راستہ تلاش کرتے‘‘ یعنی اس کے مقابلہ میں فوج کشی کر کے اسے تخت حکومت سے اتارنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح یہ آیت بھی ایک طرح ’’برہان تمانع‘‘ ہی کے مفاد پر مشتمل ہے جیسے: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا[3] وغیرہ (انبیاء ۲۱)

اس کے بالمقابل ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اگر ان کے خیال کے مطابق اور خدا ہوتے تو وہ بھی عرش والے خدا کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔[4]

اسے علامہ طبرسیؒ نے بعض قدیم مفسرین کی زبانی نقل کیا ہے مگر پہلے معنی کو کہا ہے کہ اس کے قائل زیادہ مفسرین ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

’’اس کی تسبیح کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں، بلاشبہ وہ بڑا برداشت کرنے والا ہے، بخشنے والا‘‘۔

کائنات تمام و کمال اس کی کمال ذات کو گواہ ہے اور کمال ذات ہی نقائص سے اس کے بری ہونے کا ضامن ہے، اس لیے یہ گواہی اس

---

[1]۔ ای کررنا الدلائل وفصلنا المعانی والامثال (مجمع البیان)

[2]۔ الحکمة فیه الزام الحجة و قطع المعذرة (مجمع البیان)

[3]۔ قال الحسن والجبائی: لابتغوا سبیلا الی مغالبته و مضادة کما قال: لو کان فیهما الهة الا الله لفسدت (تبیان)

[4]۔ ای لطلبوا طریقا تقربهم الی مالك العرش والتمسوا لزلفة عنده لعلمهم بعلوه علیهم و عظمة عن مجاهد وقتادة (مجمع البیان)

کی تسبیح ہے جس میں تمام کائنات یک زبان ہے [۱] مگر انسان کو ان دلائل حقانیت پر توجہ نہیں ہوتی یہی توجہ نہ ہونا کائنات کی تسبیح کا نہ سمجھنا ہے [۲]
اور یہ نہ سمجھنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس غافل انسان کو ایک دم اس کے فیض کرم سے محروم ہو جانا چاہیے جس کے بعد اس کا نیست و نابود ہو جانا لازم ہے مگر
یہ اس کا علم و مغفرت ہے کہ وہ اپنے منکروں کو بھی دنیا میں جینے کا موقع دیتا ہے اور انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے اور جب بھی ان کی آنکھ کھلے
اور وہ اپنے رویہ کو تبدیل کریں تو وہ ان کی خطا سے درگزر بھی کر دیتا ہے۔ [۳]

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

''اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے درمیان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے چھپا ہوا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اور ہم ان کے دلوں پر پوششیں چڑھا دیتے ہیں کہ وہ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن کہ نہ سنیں اور جب آپ قرآن میں اپنے پروردگار کا اکیلے ذکر کرتے ہیں تو وہ بھڑک کر اپنے پیچھے پلٹ جاتے ہیں''۔

مستورا کے لفظ کو بعض مفسرین نے ساترا کے معنی میں قرار دیا ہے اب ترجمہ یہ ہوگا کہ ''چھپانے والا پردہ'' مگر پردہ کا تو کام ہی چھپانا ہوتا ہے، اس لیے یہ قید تاکید سے زیادہ کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اس کے برخلاف دوسری صورت میں مستور کے لفظ میں اس کے اصل مفہوم کے لحاظ سے کوئی تصرف نہیں ہوگا بلکہ مستور کے معنی وہی ہوں گے جو اس کی اصل شکل تصریفی کا عام تقاضا ہیں اور پھر مزید افادیت بھی ہو جائے گی۔ یعنی معنی یہ سمجھے جائیں کہ یہ ایسا پردہ ہے جو آنکھوں کو نظر نہیں آتا۔ اس کے آثار غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتے ہیں، میں نے اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور بعض مترجمین و مفسرین اس کے موافق ہیں۔ [۴]

اس آیت سے بہت آسانی کے ساتھ مدعیان جبر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خالق ہی کی طرف سے انہیں فہم قرآن اور اس کے ذریعہ سے ہدایت قبول کرنے سے روک دیا گیا ہے مگر غنیمت ہے کہ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ:

''ایں ہر دو آیت کنایت است از عدم انتفاع ایشان بقرآن و مواعظ'' (فتح الرحمٰن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا حقیقۃً نہیں ہے کہ اللہ پردے ڈال دیتا ہو یا انہیں بہرا بنا دیتا ہو بلکہ ان کا باختیار خود جو اعراض ہے، اس سے جو دیر پا محرومی ان میں پیدا ہو گئی ہے، اس کے لاعلاج ہونے کا بطور کنایہ یہ اظہار ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب ان میں قدرتی مجبوریاں

---

[۱] ۔ تنزیه السّمٰوٰت والارض هو ما فیها من الدّلالة علیٰ توحیده وعدله (تبیان)
[۲] ۔ لستم تفقهون تسبیح هٰذا الاشیاء حیث لم تنظروا فیها فتعلموا کیفیة دلالتها (تبیان)
[۳] ۔ حلیمًا یهلکم لایعاجلکم بالعقوبة علیٰ کفرکم
غفورًا لکم اذا تبتم وانبتم الیه (مجمع البیان)
[۴] ۔ پردہ پوشیدہ (شاہ ولی اللہ) پردہ چھپا ہوا (رفیع الدین) قیل حجابًا مستورًا عن الاعین لایبصر انّما هو من قدرة الله تعالیٰ (مجمع البیان)

پیدا ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے اب یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ہدایت کا اثر قبول کریں۔

”شاہ عبدالقادر کے الفاظ یہ ہیں:

”یعنی اس قرآن میں ایسی تاثیر ہے اور کافروں پر اثر نہیں آتا یہی واسطے کی اوٹ میں ہیں، آفتاب سے جہاں روشن ہے اور جس کی اس طرف پیٹھ ہے، اس کے حساب میں کہیں نہیں۔“ (موضح القرآن)

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

”ہم خوب جانتے ہیں جس لیے وہ غور سے سنتے ہیں، جب وہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور جب وہ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ جب وہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کرتے مگر ایسے آدمی کی جو جادو کا شکار ہے۔ دیکھیے وہ کس طرح آپ کے لیے طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں تو وہ گمراہ ہوگئے ہیں ایسے کہ راستہ پا ہی نہیں سکتے“۔

”جس لیے وہ غور سے سنتے ہیں“ یعنی استفادہ کی غرض سے نہیں بلکہ نکتہ چینی کے مطلب سے اور تمسخر کے پہلوؤں کی تلاش میں [۱] جس کے بعد کتنے ہی فوائد و فیوض کا سرمایہ ہو مگر غور سے سننے کے باوجود وہ سننے والا اپنی نیت کی خباثت سے ان فیوض سے بہرہ مند نہیں ہوتا بلکہ عناد کی وجہ سے اس میں اعتراض کے پہلو تلاش کرتا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر کے ان پر استفادہ کی راہیں بند کرتا ہے۔

”طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں“ کبھی دیوانہ کہتے ہیں، کبھی شاعر، کبھی جادوگر اور اب یہ کہ یہ خود جادو کا شکار ہے۔ [۲]

اس سے خود ظاہر ہے کہ ایک بات کہہ کر وہ خود مطمئن نہیں ہوتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ بات بنی نہیں، اس لیے بدل کر دوسری بات کہتے ہیں اور پھر تیسری۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

”اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیوں اور بوسیدہ اعضاء کی شکل میں ہوں گے تو کیا ایک نئی تخلیق کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دیجئے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔ یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے ذہن میں بہت بڑی ہو تو اس پر وہ یہی

---

[۱] یعنی بقصد استہزا و عیب جوئی (فتح الرحمٰن)

[۲] شبّہوا لك الاشیآء فقالوا مجنون وساحر وشاعر (مجمع البیان)

کہیں گے کہ کون ہمیں دوبارہ لائے گا؟ کہیے کہ وہی جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔اب وہ آپ کی بات پر اپنے سر ہلانے لگیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ کہیے بہت ممکن ہے کہ وہ نزدیک ہی ہو‘‘۔

منکرین معاد کی رد

’’پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور مخلوق‘‘ مطلب یہ ہے کہ تم تو ہڈیوں اور بوسیدہ اعضاء ہی کے زندہ ہونے پر حیرت کرتے ہو۔ارے یہ چیزیں تو وہ ہیں جن سے ایک وقت میں تعلق حیات تھا نہیں، بالکل بے جان چیزوں سے جن سے زندگی کا کوئی لگاؤ ہی نہیں، جیسے پتھر اور لوہا وغیرہ، یہ بھی تم ہو جاؤ تو خدا جب چاہے گا تم میں روح پھونک دے گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے۔‘‘

وہ یہ سن کر ’’سر ہلانے لگیں گے‘‘ سر ہلانے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، قائل ہو کر اقراری طور پر بھی سر ہلایا جا سکتا ہے، بطور تعجب بھی اور بطور تمسخر بھی اس لیے اس کی تشریح میں اقوال مختلف ہو گئے ہیں۔ [1]

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّونَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

’’جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اس کی حمد و ثنا کے ساتھ لبیک کہو گے اور ایسا خیال کرو گے کہ تم نہیں رہے مگر بہت کم‘‘۔

فتستجيبون بحمده جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ’’اس کے حمد و ثنا کے ساتھ لبیک کہو گے‘‘ اس کی ایک تشریح یہ ہے کہ حمد و ثنا کرتے ہوئے لبیک کہو گے [2] لیکن دوسری تشریح یہ ہے کہ جیسے کسی ایسے شخص کو جو بڑا سرکش ہو، حالات نے سر جھکانے پر مجبور کر دیا ہو تو اس سے طنزیہ طور پر کہیں کہ اب تو بحمداللہ تم بڑے ہی اطاعت گزار ہو، ویسے ہی کہا گیا ہے کہ اس وقت بحمدہٖ تم صدائے حق پر لبیک کہو گے۔ [3]

’’ایسا خیال کرو گے کہ نہیں رہے مگر بہت کم‘‘ یعنی مرنے کے بعد سے قیامت تک کے وقفہ کا کوئی احساس ہی نہیں ہوگا، سمجھو گے تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ ہم دنیا میں تھے اور جلد ہی دوبارہ اٹھائے گئے ہو۔

شاہ عبدالقادر نے ایک دوسرے معنی کہے ہیں:

’’یعنی اب شتابی کرتے ہو، تعجب جانو گے کہ دنیا میں کچھ دیر نہ رہے تھے پچاس برس ان ہزاروں برس کے سامنے کیا معلوم ہوں۔‘‘ (موضح القرآن)

مگر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جو تشریحات ہیں، وہ پہلے مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔

---

[1] یعنی ملزم خواہند شد (فتح الرحمٰن) ینقضون الیك رءوسهم تعجبا (جلالین) حرّکوا رءوسهم مستبعدین لذٰلك وقال ابن عباس یحرّکون رءوسهم مستهزءین (تبیان)

[2] قال سعید بن جبیر: یخرجون من قبورهم یقولون سبحانك و بحمدك ولا تنفعهم فی ذٰلك الیوم لانّهم حمدوا حین لا ینفعهم الحمد (مجمع البیان)

[3] قیل وله الحمد (جلالین)

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾

''اور میرے بندوں سے کہیے کہ وہ ایسی بات کہیں جو بہت اچھی ہے یقیناً شیطان ان کے درمیان جھگڑے ڈال دیتا ہے بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔تمہارا پروردگار تم سے خوب واقف ہے چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے اور اگر چاہے تمہیں سزا دے اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر''۔

مخالفین حق سے رواداران گفتگو کی تعلیم

دونوں آیات کا ایک سلسلہ قرار دے کر مفسرین نے یہی مطلب نکالا ہے کہ مسلمان کافروں سے اس طرح روادارانہ بات کہیں جو بہت اچھی ہے۔وہ یہ ہے کہ اللہ تم سے خوب واقف ہے۔اگر چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے۔[1] یہ اللہ سے متعلق چیز ہے، پیغمبر کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

''اور تمہارا پروردگار بہت خوب جانتا ہے۔ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے کچھ نبیوں کو کچھ پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی''۔

اس آیت کا ارتباط گزشتہ آیت کے ساتھ ضروری نہیں ہے، مستقل طور پر اس کے تمام اجزاء پر نظر ڈالنے سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے انبیاء میں جو آپس میں فرق مراتب ہے جیسا کہ تیسرے بارہ کی ابتداء میں ہے! تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وہ بلا وجہ نہیں ہے بلکہ خالق جو ظاہر و باطن پر حاوی ہے، وہ تمام نفوس کا جائزہ لے کر ان میں ذاتاً جو صفات کا فرق پاتا ہے، اسی لحاظ سے ان کے مراتب مقرر فرماتا ہے۔[2]

شاہ عبدالقادر نے اسے بھی گزشتہ آیت سے مرتبط کیا ہے وہاں آخر میں تھا ''ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔'' اس کی تشریح میں موصوف نے لکھا تھا:۔

---

[1] یقولو الکفار...ا لکلمة الّتی ھی احسن ھی: ربّکم اعلم بکم (جلالین) بگویند کلمۂ کہ آن بہتر است یعنی با کفّار... و مراد از این کلمه این است کہ پروردگار شما دانا تر است بحال شما الخ (شاہ ولی اللہ)

[2] انّما قال ذلك لیدل علی ان تفضیل الانبیآء بعضھم علی بعض وقع موقع الحکمة لانّه من عالم بباطن الامور (تبیان) بیّن سبحانه بھذا انّه لم یختر الملئکة والانبیآء للمیل الیھم او انّما اختارھم لعلمه بباطنھم (مجمع البیان)

"ندا کرنے میں حق والا جھوٹھلا تا ہے کہ دوسرا صریح حق کو نہیں مانتا، سو فرما دیا کہ تم پر ان کا ذمہ نہیں ہے، اللہ بہتر جانے، جس کو چاہے راہ سجھا دے"

اس کے بعد اس آیت کے تحت میں لکھتے ہیں:۔

"یعنی بعض نبی تھے جھوٹھلا گئے، تیرا حوصلہ اُس سے زیادہ رکھا ہے" (موضح القرآن)

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

"کہیے کہ بلاؤ اُنہیں جن کو اللہ کے سوا تم سمجھتے ہو تو (دیکھنا کہ) وہ نہیں قدرت رکھتے سختی کے دور کرنے پر تم سے اور نہ کسی تبدیلی پر، جنہیں وہ پکارتے ہیں خود ہی اپنے پروردگار کی طرف ذریعہ ڈھونڈتے ہیں کہ کون زیادہ تقرّب رکھنے والا ہے اور وہ اُس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، یقیناً تمہارے پروردگار کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے"۔

اس آیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن اصل وسیلہ اور توسّل کی نفی نہیں کرتا۔ ہاں غلط وسائل جنہیں مشرکین اختیار کرتے ہیں، اُن پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وسائل تو خود دوسرے وسیلوں کی تلاش میں ہیں تو تم کو تو انہی وسائل کا دامن تھامنا چاہیے جن کے سبب ہی محتاج ہیں اور سب کو ان سے توسّل کرنا ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

"یعنی جن کو کافر پوجتے ہیں، وہ آپ ہی اللہ کی جناب میں وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ جو بندہ بہت نزدیک ہو اسی کا وسیلہ پکڑیں اور وسیلہ سب کا پیغمبر ہے، آخرت میں انہی کی شفاعت ہوگی" (موضح القرآن)

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

"اور کوئی بستی نہیں مگر یہ کہ ہم اسے ہلاک کر دیں گے قیامت کے دن سے پہلے یا اسے سخت عذاب میں مبتلا کریں گے یہ کتاب میں لکھی ہوئی بات ہے"............کتاب سے یہاں مراد بقرینہ مقام لوح محفوظ ہے"۔ا۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

"اور ہمیں ان معجزات کے بھیجنے سے مانع نہیں ہے مگر یہ چیز کہ پہلے لوگ انہیں جھٹلاتے رہے اور ہم نے قبیلہ ثمود کو

اونٹنی عطا کی جو بصیرت عطا کرنے والی تھی تو ان لوگوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نہیں بھیجتے معجزوں کو مگر خوف دلانے کے لئے''۔

پیغمبر خداؐ کو معجزات خالق کی طرف سے عطا کئے گئے تھے، اس کا ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے مگر کفار طرح طرح کی فرمائشیں کرتے تھے جن میں ایک بات یہ تھی کہ آپ وہی معجزے کیوں نہیں دکھاتے جو گزشتہ انبیاء نے دکھائے تھے؟ اس پر ارشاد ہو رہا ہے کہ اس لئے وہ معجزے اب نہیں دکھلائے جاتے[1] کہ پہلے جب وہ معجزے دکھائے گئے تو وہ امتیں کب ایمان لائیں جو تم ایمان لاتے اور جب ایسے معجزے دکھائے جاتے تھے تو پھر انکار کی صورت میں عذاب بھی ضرور آجاتا تھا جیسے قبیلہ ثمود کے لئے ہوا، اسی طرح تمہاری فرمائش کے مطابق اگر معجزے آئیں تو پھر انکار پر عذاب الٰہی آنا لازم ہے اور اس رسولؐ کی قوم کے لئے جو رحمۃ اللعالمین ہے، اللہ کو یہ منظور نہیں ہے۔[2]

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿٦٠﴾

''اور جب ہم نے آپ سے کہا کہ آپ کا پروردگار تمام انسانوں کو گھیرے ہوئے ہے اور ہم نے نہیں قرار دیا اس منظر کو جو ہم نے آپ کو دکھایا تھا مگر آزمائش کا ذریعہ اور اسی طرح اس درخت کو جو قرآن میں مورد لعنت ہے اور ہم انہیں خوف دلاتے ہیں مگر وہ ان میں اضافہ نہیں کرتا۔ سوا بڑی سرکشی کے''۔

شجرۂ ملعونہ

عامۂ مفسرین نے اس کو معراج سے متعلق قرار دیا ہے اور درخت سے مراد شجرۃ الزقوم لیا ہے جس کا دوسری جگہ قرآن مجید میں ذکر ہے اور وہ دوزخ میں اہل دوزخ کے لئے ہے چنانچہ جلالین لکھتے ہیں:

الرؤیاالتی اریناك عیانا لیلة الاسراء والشجرة الملعونة فی القراٰن وھی الزقوم التی تبت فی اصل الجحیم

وہ منظر جو ہم نے آپ کو ظاہر بظاہر دکھایا شب معراج اور وہ درخت جو قرآن میں مورد لعنت ہے، زقوم کا درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اُگتا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

یعنی چوں کافران قصه معراج شنید ندو آیت انّ شجرة الزّقوم طعام الاثیم بایشان رسید متبعاد کردند و

---

[1] ۔یعنی الایات للّتی اقترحتھا قریش (تبیان)
[2] ۔ کنا اذا ارسلنا الیٰ قریة ایة فلم یومنوا بھا اھلکنا ھم ولذٰلك اخرناعن قومك الأیات (علی بن ابراھیم)

محل طعن سا ختند (فتح الرحمٰن)

یعنی جب کافروں نے معراج کا واقعہ سنا اور یہ آیت جس کا مضمون یہ ہے کہ یقیناً زقوم کا درخت گناہ گار آدمی کی غذا ہے ان تک پہنچی تو انہوں نے اسے دوراز قیاس سمجھا اور مرکز اعتراض بنایا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

وہ دکھاوا معراج ہے اور درخت پھٹکارا۔ یعنی درخت زقوم قرآن میں فرمایا کہ دوزخ والے کھاویں گے"۔(موضح القرآن)

غالباً اسی بنا پر شاہ ولی اللہ نے الرّؤیا کا ترجمہ خواب سے نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے: "نمائشی کہ نمودیم بتو" اور ہم نے بھی ترجمہ میں اس کی رعایت کی ہے اب شاہ رفیع الدین جو ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ: "نہیں کیا ہم نے وہ نمود یعنی خواب" جو دکھلائی تجھ کو تو یا وہ معراج کو خواب ہی کی بات سمجھتے ہیں وہ اس شان نزول ہی کے قائل نہیں ہیں چنانچہ دوسری روایت جو جناب ابن عباسؓ سے منقول ہے یہ ہے کہ اس خواب سے مراد وہ خواب ہے جو حضرتؐ نے داخلہ مکہ کے متعلق دیکھا تھا جس کے بعد آپ زیارت مکہ معظّمہ کے لئے روانہ ہوئے تھے پھر مشرکین سدراہ ہوئے اور حضرت بغیر عمرہ ادا کئے ہوئے واپس تشریف لے گئے۔ اس صورت میں آزمائش سے مراد یہی ہے کہ اس خواب دیکھنے کے باوجود بغیر نیت پوری کئے ہوئے واپس ہوئے تو بہت سے مسلمانوں پر حقانیت پیغمبر میں شک غالب آگیا۔ کہ اگر یہ سچے رسول ہیں تو ان کی بات پوری کیوں نہ ہوئی اور آپ نے یہ جواب دیا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ داخلہ اسی سال ہوگا۔ اگر غیب پر ایمان ہے تو وعدہ کی تکمیل کے لئے آئندہ کے منتظر رہو۔ اس شان نزول کے بعد رویا کے معنی خواب قرار پائیں گے۔ مگر اس شانِ نزول سے اس شجرۃ الزقوم کا کوئی ربط سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تو اس شجرہ سے کوئی اور شجرہ مراد ہونا چاہیے جو مورد لعنت پروردگار ہے۔

تیسری شان نزول جو تفسیر اہل سنت میں وارد ہے اس سے خواب کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس شجرہ ملعونہ کی بھی نشان دہی ہوجاتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے منبر پر بندر جست وخیز کررہے ہیں حضرتؐ کو اس سے بہت صدمہ ہوا یہ اشارہ تھا بنی امیہ کے ان صاحبان اقتدار کی طرف جو بنام خلافت رسول حکمرانی کرنے اور آپ کے منبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھنے والے تھے۔[1]

علامہ طبرسیؒ نے اپنی تفسیر میں ہماری ہی طرح ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے مذکورہ بالا تمام اقوال نقل کردیئے ہیں اور پھر آخری قول کی تائید میں کلمات آئمہ معصومینؑ درج کئے ہیں اور واقعات سے اسکے شواہد بھی وارد کئے ہیں۔

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ قَالَ ءَاَسۡجُدُ لِمَنۡ خَلَقۡتَ طِيۡنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيۡتَكَ هٰذَا الَّذِىۡ كَرَّمۡتَ عَلَىَّ لَـئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَاَحۡتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذۡهَبۡ فَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمۡ جَزَآءً مَّوۡفُوۡرًا ﴿۶۳﴾

---

[1] ۔بنو امیہ(علی بن ابراھیم) روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہؑ و روی مثل ذٰلک عن سھل بن سعد السّاعدی من ابیہ----ومثلہ عن سعد بن بشار.(تبیان)

''اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدمؑ کو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے کہا کیا میں سجدہ کروں اسے جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے[1] کیا تو دیکھتا ہے اسے[2] کہ جس کو مجھ پر تو نے فضیلت دی ہے، اگر تو نے مجھے روز قیامت تک رکھا تو میں جڑ سے اکھاڑ دوں گا اس کی اولاد کو مگر کم، اس نے کہا کہ اچھا جا! تو جو تیری پیروی کرے گا ان میں سے تو یقیناً دوزخ تم سب کی سزا ہوگی پوری پوری سزا''۔

لا حتکن کے لفظ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے میں جڑ سے اکھاڑ دوں گا یہ اس کے ایک لغوی معنی کے مطابق ہے جسے اکثر مترجمین نے اختیار کیا ہے[3] مگر ایک معنی اس لفظ کے سواری کے منہ میں لگا دینے کے ہیں[4] بعض نے اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔[5]

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

''اور ورغلا اُن میں سے جس پر تیرا قابو چلے اپنی آواز سے اور بزن بول ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ اور حصہ دار ہو جا اُن کے ساتھ ان کے مال اور اولاد میں اور اُنہیں سبز باغ دکھا اور انہیں شیطان سبز باغ نہیں دکھاتا مگر دھوکے اور فریب کے طور پر، بلا شبہ میرے جو خاص بندے ہیں، تجھے ان پر کوئی دسترس نہیں ہوگا اور تیرے پروردگار سے بڑھ کر کون کارساز ہوگا''۔

''ورغلا'' اور ''بزن بول'' اور حصہ دار ہو جا یہ صیغے امر کے ہیں جس کے معنی حکم کے ہوتے ہیں، مگر نوعیت اس کی اس محل پر زجر و توبیخ کی ہے جس کا نتیجہ بعد کو بتایا گیا ہے یعنی لاکھ تو یہ سب کچھ کرے مگر میرے جو خاص بندے ہیں وہ تیرے کہنے میں کبھی نہیں آئیں گے۔ شیطان کے جواب میں خالق کا حتمی اعلان جو قرآن میں متعدد جگہ ہے، نوع انسانی میں ہر دور میں کچھ معصوم ہستیوں کے وجود کا قطعی ثبوت ہے۔

''بزن بول'' جو ہم نے ترجمہ کیا ہے، یہ اجلب علیہم کے ایک لغوی معنی کے اعتبار سے ہے[6] اور ایک دوسرے معنی اس لفظ کے ہیں، اس کے لحاظ سے بامحاورہ ترجمہ یہ ہوگا کہ ہلا بول دے ان پر[7]۔

---

[1]۔ نصب ینزع الخافض ای من طین (جلالین)

[2]۔ الکاف فی قوله: ارایتك لا موضع لها من الاعراب لانّها ذکرت فی الخاطبة توکیدا وھٰذا نصب بارایتك (تبیان)

[3]۔ از بیخ بر کنم (شاہ ولی اللہ) ہلاک کروں گا (رفیع الدین)

[4]۔ قیل انّه من قولهم حنك الدابّة بحنکها اذا جعل فی حنکها الاسفل حبلا یقودها به (مجمع البیان)

[5]۔ یعنی اپنا مسخر کروں جیسے گھوڑے کا لگام دیا (موضح القرآن)

[6]۔ اصل الجلبة شدّة الصوت (تبیان) آواز بکن بر ھلاك ایشان (شاہ ولی اللہ)

[7]۔ ای اجمع علیهم ما قدرت علیه (مجمع البیان) کھینچ لا اوپر ان کے (شاہ رفیع الدین)

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ
رَحِيْمًا ﴿٦٦﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ
اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿٦٧﴾

”تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں رواں کرتا ہے تا کہ تم اس کے فضل و کرم سے کسب معاش کرو، یقیناً وہ تم پر بڑا مہربان ہے اور جب تمہیں سمندر میں سختی پڑتی ہے تو اس کے سوا جس جس کو پکارتے ہو، سب غائب ہو جاتے ہیں مگر جب وہ تمہیں چھٹکارا دے کر خشکی میں پہنچاتا ہے تو تم روگردانی کرتے وہ اور انسان بڑا ناشکرا ہے“۔

چونکہ قدیم زمانہ میں سمندر کا سفر عموماً بسلسلہ تجارت ہوتا تھا اور اسی لئے بادِ موافق کو تجارتی ہوا سے تعبیر کیا جاتا تھا اسی لئے قرآن مجید میں بھی اکثر جگہ کشتیوں کے ذکر کے ساتھ معاشی منفعت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

کشتیوں کو وہ رواں کرتا ہے یعنی اگر ہوا موافق ہی نہ ہو تو تم کشتی کیوں کر چلاؤ اور ہوا اس کے قبضہ میں ہے اس لئے روانی کشتی کی اس کی کارفرمائی سے وابستہ ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا
تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿٦٨﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ
عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا
بِهٖ تَبِيْعًا ﴿٦٩﴾

”تو کیا تم بے کھٹکے ہو اس سے کہ کہیں وہ خشکی ہی میں تمہیں دھنسا نہ دے یا تم پر کوئی آندھی بھیج دے، پھر تم کوئی محافظ اپنے لئے نہ پاؤ، کیا تم اس سے بے کھٹکے ہو کہ وہ دوبارہ تم کو اسی (دریا) میں پلٹائے اور اس کے بعد ایک تیز جھکڑ کی ہوا تم پر بھیج دے اور اس ناشکرے پن کے عوض میں تمہیں ڈبو دے، پھر تم اپنے لئے ہم سے اس سبب سے کوئی باز پرس کرنے والا[1] نہیں پاؤ گے“۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿٧٠﴾ ع

”اور ضرور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور انہیں خشکی اور تری کے لئے سواریاں دیں اور انہیں اچھی اچھی

---

[1] ۔ای من یتبع اھلاککم للمطالبة بدھائکم او یاخذ ثارکم (تبیان)

غذاؤں سے روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات سے زیادہ انہیں عطا کیا“۔

آیت کے آخری جملہ سے انسان کا اشرف المخلوقات ہونا برقرار رہتا ہے یا نہیں؟ مترجمین نے عموماً جو ترجمہ کیا ہے ”بہت سوں پر فضیلت دی ہے“ اس سے عمومی افضلیت قائم نہیں رہتی بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ ایسے ہیں جن پر فضیلت نہیں ہے، جلالین نے لکھا ہے:

كثير ممن خلقنا كالبهم والوحوش۔

بہت سے اپنے مخلوقات پر جیسے چوپائے اور وحشی جانور۔

مگر اس کے بعد لکھ دیا ہے: و تشمل الملائكة اس میں ملائکہ بھی داخل ہیں یہ سمجھ میں نہیں آیا وہاں جب عموم ہے ہی نہیں تو شمول کیسا؟

جناب شیخ الطائفہ کے نکتہ رس ذہن نے اس مشکل کو حل کیا ہے اور اسی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے وہ حل یہ ہے کہ اس آیت میں فضیلت بحیثیت درجہ ومرتبہ کا ذکر ہے ہی نہیں بلکہ اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہے اور وہ انسان کو اتنی ملی ہیں جتنی زیادہ تر مخلوقات کو نہیں ملی ہیں اور اس کی نظیر پہلے پارہ میں آ چکی ہے جب بنی اسرائیل کے لئے فضلنا کا لفظ صرف کیا گیا ہے اور اس میں صرف نعمتوں کا زیادہ عطا ہونا مراد ہے جو بغرض امتحان بھی ہو سکتا ہے نہ کہ مرتبہ میں بلند ہونا تو یہی فضلنا کے معنی یہاں بھی ہیں۔

رہ گیا انسان کا اشرف المخلوقات ہونا تو وہ خود اس آیت کے پہلے جملہ سے ثابت ہے کہ لقد کرمنا بنی آدم ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی جس میں اسکے مقابل کی کسی نوع کا استثناء نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ کرامت و بزرگی میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں ہے۔[1]

اس کے علاوہ: لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ہم نے انسان کو بہترین درستی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی تخلیق کے ذکر کے بعد اپنے کو احسن الخالقین کہنا یہ تمام چیزیں قطعی طور پر اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہیں۔

یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِہِمۡ ۚ فَمَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیۡنِہٖ فَاُولٰٓئِکَ یَقۡرَءُوۡنَ کِتٰبَہُمۡ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۷۱﴾ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۷۲﴾

”جس دن ہم ہر دور کے لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے تو جسے نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو یہ لوگ (اطمینان کے ساتھ) اپنے نامۂ عمل کو پڑھیں گے اور ذرہ بھر بھی ان پر زیادتی نہ ہوگی اور جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا اور زیادہ کھویا ہوا ہوگا“۔

ہر دور کے لئے ایک امام کا وجود

[1] ۔ کرمنا بنی اٰدم ای فضلنا هم عن ابن عباس و اجویت الصنقه علیٰ جمیعهم من اجل من کان فیهم علیٰ هٰذا الصفة کقوله: کنتم خیر امة اخرجت للناس (مجمع البیان)

مفسرین اہل سنت نے امام کے لفظ کو حق اور ناحق دونوں طرح کے اماموں کے معنی میں لیا ہے، اس لئے یہ ترجمہ کیا ہے کہ:

بخوانیم ہر فرقہ را با پیشوائے ایشاں (شاہ ولی اللہ)

بلاویں گے ہم سب لوگوں کو ساتھی پیشواؤں ان کے کے (شاہ رفیع الدین)

ہمارے نزدیک جس طرح نبی کا لفظ جب بلاقرینہ بولا جائے تو اس میں جھوٹے مدعیان نبوت داخل نہیں ہوتے، اسی طرح امام کا لفظ بھی بلاقرینہ امام حق پر ہی صادق آسکتا ہے اور اس لئے یہ آیت ہر دور میں ایک امام کے موجود ہونے کی دلیل ہے جس پر اصلی اور نقلی دلائل دوسرے بھی ہیں اور ان دلائل میں سے ایک یہ آیت بھی ہوگی جس کی تائید میں امام رضاؑ کی مستند حدیث بھی ہے۔[1]

جلالین نے ندعوا لفظ کے معنی ہی بدل دیے ہیں اور جو تفسیر کی ہے، اس کی بنا پر یہ ترجمہ ہوتا ہے کہ ہم ہر جماعت کو اس کے امام کی طرف منسوب کر کے پکاریں گے اور امام کی تفسیر نبی کے ساتھ کی ہے لکھا ہے:

باماٖمھم نبیھم فیقال یا امۃ فلان: ان کے امام کے ساتھ یعنی ان کے نبی کے ساتھ تو کہا جائے گا اے فلاں کی امت۔

اور پھر دوسرے معنی امام کے لکھے ہیں:

اوبکتاب اعمالھم فیقال یا صاحب الخیر یا صاحب الشر : یا ان کے اعمال کے نوشتہ کے ساتھ تو کہا جائے گا اے نیک اعمال والے یا اے برے اعمال والے۔

حالانکہ امام کے معنی جو یا متبادل ہیں وہ تو پیشوا ہی کے ہیں۔ یہ نامہ اعمال کو امام قرار دینا تو بالکل ہی خلاف تبادر ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

''اور بلاشبہ وہ اس منزل سے قریب معلوم ہوتے تھے کہ آپ کو بہلا پھسلا کر الگ کر دیں اس سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے کہ آپ اس کے خلاف باتیں ہمارے سر منڈھ دیں اور اس وقت وہ آپ کو دوست جانی بنالیں اور اگر ہم آپ کو ثبات قدم عطا نہ کرتے تو نزدیک ہوتا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا جھک جائیں اس وقت ہم آپ کو دونادوں سختیوں میں مبتلا کرتے زندگی کی بھی اور دونادوں سختیوں میں موت کی بھی، پھر آپ اپنے لئے ہمارے سامنے کوئی مددگار نہ پاتے''۔

پہلی جگہ نزدیک ہونے کی نسبت مشرکین کی طرف ہے، رسولؐ کی طرف نہیں یعنی کوششیں انہوں نے ہر ہر دفعہ ایسی کی تھیں کہ وہ اس

[1] عن الرضا علی بن موسیٰ بالاسانید الصحیۃ انہ روی عن اٰباء عن النبی ﷺ انہ قال فیہ یدعیٰ کل الناس بامام زمانھم و کتاب وبھم والسنۃ نبیھم (مجمع البیان)

منزل سے قریب معلوم ہوتے تھے اس کے بعد پیغمبرؐ کے ان کوششوں سے جہاں تک متاثر ہونے کا تعلق ہے اسے فرض محال کے طور پر کہا ہے کہ اگر توفیق ربانی آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو نزدیک ہوتا کہ آپ بھی ان کی طرف جھک جائیں یعنی وہ کوششیں اتنی زبردست تھیں کہ ایک عام بشر کا ان سے کچھ متاثر ہونا لایعنی تھا مگر آپ تو عام بشر کے درجہ سے بالاتر ہیں اور لطف وخاص ربانی آپ کے شامل حال ہے، اس لئے آپ ان کوششوں سے متاثر نہیں ہوسکتے۔ یہاں جلالین نے بھی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے چنانچہ لکھا ہے:

لولا ان ثبتناك على الحق بالعصمة لقد كدت قاربت تركن تحليل اليهم شيئا ركونا قليلا لشدة احتيالهم الحاحهم وهو صريح فى انّه لم يركن ولا قارب (جلالين)

اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے حق پر عصمت کے ذریعے سے تو قریب ہوتا۔ کہ آپ مائل ہوجائیں ان کی طرف ذرا سا کیونکہ ان کی حیلہ گری اور ضد اتنی سخت تھی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نہ جھکے اور نہ قریب تھا کہ آپ جھکیں۔

قرآن مجید کی اس طرح کی آیات ان علماء کے قول کی تائید کرتی ہیں جو عصمت کو خداوند عالم کا لطف خاص قرار دیتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کردار میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارادہ واختیار کا دخل نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عصمت کے مقابلہ میں جو تاریک پہلو ہیں ان میں ایک گناہ ہے۔ یہ ارادۃً عدول حکمی اور مخالفت قانون ربانی کا نام ہے۔ اور دوسرے سہو ونسیان اور خطا ہیں جو بصورت وقوع غیر ارادی چیز ہوتے ہیں عصمت ان سب باتوں سے بری ہوتی ہے اب جہاں فعل ارادی ہوتا ہے وہاں ترک بھی ارادی ہوگا۔ اور وہ رسولؐ کا اختیاری کارنامہ ہوگا اور جہاں فعل بصورت وقوع غیر اختیار ہوگا وہاں ترک ارادہ نہیں ہوسکتا۔ وہ لطف خاص ربانی کا نتیجہ ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید نے جہاں جہاں پیغمبرؐ کے حسن کردار کو لطف ربانی کا نتیجہ قرار دیا ہے وہ سب اس قسم کی غلطیوں سے بچنا ہے اور اس لئے یہاں بھی دیکھئے کہ لطف ربانی نہ ہونے کی صورت میں یہ کہا گیا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہوجاتے۔ یہ "تھوڑا سا" آخر کیوں؟ پورے طور پر کیوں نہیں، ہم تو اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ لطف خاص بھی نہ ہوتا، تب بھی جہاں تک ارادی حیثیت کا تعلق ہے آپ ان کے ہم نوا پھر بھی نہیں ہوسکتے تھے مگر انکے فریبوں سے متاثر ہوکر دھوکا کھا کر غیر ارادی طور پر کچھ ان سے متاثر ہوجاتے اور یہی وہ چیز ہے جس سے بچانا لطف خاص کا کام ہے اور اس کے **ضعف الحيوٰة و ضعف المماة** سے عذاب کے معنی کا پیدا کرنا غلط ہے۔ اگر عذاب ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا کہ حیات اور ممات کے بجائے دنیا اور آخرت ہوتا۔ آخرت موت تھوڑی ہے، وہ تو موت کے بعد کی منزل ہے اس لئے **ضعف الحيوٰة و ضعف المماة** سے مراد ہم غلط روی کے وہ نتائج سمجھتے ہیں جو قہراً ایک غلط کام پر مرتب ہوتے ہیں اور وہ ارادہ واختیار سے وابستہ نہیں ہوتے۔

یہاں آکر جلالین ٹھوکر کھا گئے جو انہوں نے لکھ دیا:

ضعف عذاب الحيوٰة و ضعف عذاب الممات اى مثل ما يعذّب غيرك فى الدّنيا والأخرة.

زندگی کے عذاب کا دونا اور موت کے عذاب کا دونا یعنی جتنا آپ کے سوا دوسرے کو عذاب ہو اس کا دونا دنیا اور آخرت دونوں میں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ یہاں نہ عذاب کا ذکر ہے اور نہ دنیا و آخرت کا نام ہے اس لئے یہ تشریح حقیقت سے دور ہے۔

افسوس یہ ہے کہ چونکہ ان آیات کے بارے میں حدیث معصومؑ کو دستیاب نہیں ہوئی، اس لئے ہمارے مفسرین نے بھی جیسے علامہ طبری، وغیرہ بس جمہوری مفسرین کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کی جو ایسے مقامات پر عموماً حقیقت سے دور ہوتے ہیں اور خود ان پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں فرمایا سوا حبر الامۃ جناب ابن عباسؓ کے ایک قول کو نقل کرنے کی جو کافی قیمت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ:

رسول اللہ معصوم و مهکن هذا تخویف الامة لئلا یر کن احد من المومنین الیٰ احد من المشرکین فی شیء من احکام اللہ و شرائعہ (مجمع البیان)

پیغمبرؐ خدا تو معصوم ہیں مگر یہ خوف دلانا ہے آپ کی امت کو کہ اہل ایمان میں سے کوئی شخص مشرکین میں سے کسی کی طرف نہ جھکے خالق کے احکام وقوانین کسی جزء میں بھی۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾

''اور بلاشبہ وہ نزدیک تھے اس سے آپ کو متزلزل کردیں اس سرزمین سے کہ نکال دیں آپ کو اس میں سے، اس صورت میں وہ نہ رہتے آپ کی بعد مگر بہت کم اس طریقہ کے مطابق جو رہا آپ کے پہلے والے رسولوں کے بارے میں اور آپ نہ پائیے گا ہمارے طریقہ کار میں تبدیلی''۔

الارض سے کون سرزمین مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض نے مکہ مراد لیا ہے یعنی ان کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو یہاں سے جلاوطن کردیں اور کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت کی نازل شدہ ہے جب ابھی ان کا بس ارادہ ہی تھا انہوں نے جلاوطن کرنے کا سامان نہیں کیا تھا اور پھر جو کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے بعد رہیں گے یعنی وہ سب مبتلائے عذاب ہوں گے اور ختم کردیئے جائیں گے چنانچہ یہ بات جنگ بدر میں وقوع میں آئی کہ وہ سب قتل ہوئے اور بعض مفسرین آیت کو بعد ہجرت کا نازل شدہ قرار دیتے ہیں اور اس صورت میں الارض سے مراد مدینہ ہے[۱] اور منصوبہ بنانے والے اس وقت کے یہودی ہیں جنہوں نے مدینہ میں ہر طرح حضرتؐ کے خلاف منصوبہ سازی کی کہ آپ یہاں نہ رہ سکیں۔

ایک تیسرا قول یہ ہے کہ اس سرزمین سے مراد مکہ ہے اور ان کا پہلا منصوبہ تھا کہ وہ آپ کو مکہ سے باہر نکال دیں جو عمل میں نہیں آیا بعد میں انہوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کرکے آپ کو وہیں قتل کرنا چاہا جس پر آپ کو ہجرت کا حکم ہوا[۲] مگر حقیقت امر یہ ہے کہ ہجرت کا منصوبہ مدینہ منورہ کے لوگوں کی دعوت پر طے پا گیا تھا اور اس غرض سے کہ آپ مدینہ پہنچنے نہ پائیں تا کہ آپ کی جان لینے کا منصوبہ بنا کر گھر کا محاصرہ کرلیا

---

[۱] ۔ الارض ارض المدینة (جلالین)

[۲] ۔ الصحیح ان المعنیین فی الآیة مشرکوا مکة وانهم لم یخرجوهن مکة ولکنهم هموا باخراجه ثم خرج لما امر بالهجرة اخرجوا الا ستوصلوا بالعذاب (مجمع البیان)

جائے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

''نماز برپا کروزوال آفتاب سے [۱] رات ڈھلنے تک [۲] اور صبح کو پڑھے [۳] یقیناً صبح کا پڑھنا وہ موقع ہے کہ جب مشاہدہ کرنے والوں کی حضوری ہوتی ہے''۔ [۴]

اوقاتِ نماز

اس آیت میں نماز فریضہ کے اوقات بیان کئے گئے ہیں جس میں الگ الگ صرف دو وقت نظر آتے ہیں، ایک زوال آفتاب سے رات ڈھلنے یعنی نصف شب تک اور دوسرا اس سے الگ نماز صبح کا وقت حالانکہ نماز کے اوقات پانچ ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت صاف صاف فقہ امامیہ کے مسئلہ پر منطبق ہے فقہ امامیہ کی رو سے صرف نماز صبح کا وہ وقت ہے جس کے پہلے اور بعد کسی نماز فریضہ کا وقت نہیں ہے اس لئے اس نماز کو الگ کر کے ذکر کرنا ضروری تھا اس کے علاوہ جتنی نمازیں ہیں وہ زوال آفتاب کے بعد سے نصف شب تک ہیں [۵] اس طرح کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں کسی نہ کسی نماز کا وقت نہ ہو۔ بے شک وہ چار نمازوں پر تقسیم ہے یوں کہ زوال سے غروب آفتاب تک ظہر اور عصر دونوں نمازوں کا وقت ہے ترتیب کے ساتھ کہ پہلے ظہر پڑھنا لازم ہے اور اس کے بعد عصر اور اس بنا پر عقلی طور سے زوال کے بعد شروع کی چار رکعت کا وقت ظہر سے مخصوص ہو گیا ہے اور آخر کی چار رکعتوں کا وقت عصر سے مخصوص ہو گیا ہے باقی درمیان کا پورا وقت۔ دونوں نمازوں میں مشترک ہے اور پھر غروب سے نصف شب تک مغرب وعشاء کا وقت ہے جس میں اسی طرح ترتیب چونکہ لازم ہے اس لئے عقلی طور پر شروع کا وقت مغرب سے مخصوص ہوا اور آخر کا عشاء سے مخصوص ہو گیا بیچ کا وقت مشترک ہے جس میں مغرب بھی ہو سکتی ہے اور عشاء بھی۔ اس طرح زوال سے لے کر نصف شب تک پورا چار نمازوں کا وقت ہے جس کا قرآن مجید نے ایک ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ کہ کس نماز کا کون سا وقت ہے اسے مجمل چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح سنت نبوی و احادیث معصومین علیہم السلام سے ہو گئی اور صبح کی نماز کا جو اس سلسلہ سے جدا تھی الگ ذکر کیا ہے۔ [۶]

---

[۱]۔ وقت زوال آفتاب (شاہ ولی اللہ) وھو المروی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہما السلام (تبیان)

[۲]۔ غسق اللیل انتصافه (علی بن ابراھیم)

[۳]۔ صلوٰۃ الصبح (جلالین)

[۴]۔ تشھدہ ملائکة اللیل و ملائکة النھار (علی بن ابراھیم) حاضر می شوند فرشتگان (شاہ ولی اللہ)

[۵]۔ ای الظھر و العصر و المغرب و العشاء (جلالین)

[۶]۔ لزوالها صلوٰۃ الظھر و صلوٰۃ العصر و الی غسق اللیل صلوٰۃ المغرب و العشاء الاخرة ثم صلوٰۃ الفجر فی فردت بالذکر (تبیان)

یہ فقہ امامیہ کا مسلک ہے جو قرآن کی اس آیت سے صاف نمودار ہے [1] لیکن سواد اعظم کے نقطہ نظر سے ہر نماز کے بعد ایک وقفہ ہے جس میں دوسری نماز کا وقت داخل نہیں ہوتا یعنی ظہر اور عصر کے بیچ میں ایک وقفہ ہے مغرب اور عشاء کے بیچ میں ایک وقفہ ہے اس لحاظ سے قرآن کے لئے ضروری تھا کہ جیسے صبح کی نماز االگ کرکے ذکر کیا گیا ہے ویسے ہی تمام نمازوں کا وقت الگ الگ بیان کرے مثلاً یہ کہ نماز قائم کرو زوال آفتاب کے وقت، پھر آفتاب کی کرنیں زرد ہونے کے وقت، پھر سورج غروب ہونے کے وقت، پھر مغرب کی طرف کی سرخی دور ہونے کے بعد۔ اس طرح پانچ وقت بیان ہوتے یا پھر مجملاً کہ دیا جاتا کہ شب وروز میں پانچ نمازیں ہیں لیکن صبح کی نماز کو الگ نام لے کر کہنا اور پھر زوال سے لے کر نصف شب تک الگ کہنا فقہ اہل سنت کے لحاظ سے کسی طرح نہیں بنتا اور صرف فقہ امامیہ ہے جس کے لحاظ سے صحیح و مناسب قرار پاتا ہے جو درحقیقت فقہ اسلامی کی حقیقی تعلیم ہے اور اہل بیت معصومین علیہم السلام نے اس کی ترجمانی فرمائی ہے۔

آخر آیت میں نماز صبح کے لئے خاص طور پر یہ ارشاد کہ:

اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا

یقیناً صبح کا پڑھنا وہ موقعہ ہے کہ جب مشاہدہ کرنے والوں کی حاضری ہوتی ہے صرف تمام نماز ہائے پنج گانہ نماز صبح کے بروقت ادا کرنے کی تاکید واہتمام کا مظہر ہے کہ اس میں عبودیت اور ذوق عبادت کی آزمائش زیادہ ہے اور اسی لے بہت سے پابند نماز بھی نماز صبح کے وقت سوتے اور بعد میں قضا پڑھتے نظر آتے ہیں جو بربنائے کرم خالق کی جانب سے معاف سہی مگر ذوق عبودیت کے نقص کا ثبوت ضرور ہے۔

مفسرین نے کان مشہودا کی تشریح یہ کی ہے کہ اس وقت پر رات والے فرشتے اور دن والے فرشتے دونوں یکجا ہوتے اور بندہ الٰہی کے ادائے فرض اور مظاہرہ عبودت کے گواہ بنتے ہیں۔ اس کے لئے صحیح بخاری کی حدیث میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہوا ہے کہ:

یجتمع ملائکۃ والنہار فی صلوٰۃ الفجر۔

صبح کی نماز کے وقت شب و روز کے فرشتے اکٹھا ہوتے ہیں۔

اسے ہمارے بعض علماء نے بھی نقل کیا ہے۔ [2]

وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾
وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِىۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِىۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّىۡ مِنۡ
لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلۡ جَآءَ الۡحَـقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ

---

[1] ۔یریک ذٰلک ماروٰہ العیاشی بالا سناد عن عبید بن زرارۃ عن ابی عبداللہ فی ھٰذہ الاٰیۃ قال: ان اللہ افترض اربع صلوات اول وقتہا من زوال الشمس الیٰ انتصاب اللیل منہا صلوٰۃ تان اول وقتہا من عند زوال الشمس الیٰ غروبہا الا ان ھٰذہ قبل ھٰذہ و منہا صلوتان اول وقتہا من عند زوال الشمس الیٰ غروبہا الّا انّ ھٰذہ قبل ھٰذہ ومنہا صلوٰتان اول وقتہا من غروب الشمس الیٰ انتصاف اللیل الا ان ھٰذہ قبل ھٰذہ (مجمع البیان)

[2] ۔اوردہ البخاری فی الصحیح (مجمع البیان)

زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

''اور رات کے کچھ حصہ میں آپ نماز تہجد پڑھئے۔ جو آپ کے لئے ایک اضافہ ہے نزدیک ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! میرا داخلہ کر سچائی کا داخلہ اور نکال بھی مجھے سچائی کے ساتھ اور میرے لئے قرار دے اپنی جانب سے ایسی قوت جو سہارا دینے والی ہے اور کہیے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل تو مٹنے والا ہی ہے''۔

بہت سے دوسرے مفسرین کی طرح ہمارا تصور یہ نہیں ہے کہ جہاں بھی واحد مذکر حاضر کا تخاطب ہو وہاں ہم مخاطب خاص رسولؐ کو قرار دیں بلکہ اکثر جگہ ہم اس خطاب کا مخاطب عام سمجھتے ہیں یعنی کوئی بھی جو سنے وہ اس کا مخاطب ہوسکتا ہے مثلاً: الم تر کیف فعل ربك با صحاب الفیل کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا؟ ارء یت الذی یکذب بالدین کیا تم نے دیکھا اسے جو روز قیامت کو جھٹلاتا ہے قل ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین تمہارا قول یہ ہو کہ میری نماز اور میری تمام عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے سبح اسم ربك الاعلی تسبیح کرو اپنے پروردگار کے نام کی جو بلند و برتر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مقامات پر ہم یہ درست نہیں سمجھتے کہ ترجمہ میں بریکٹ کے اندر اے رسول! کا اضافہ کیا جائے اور ہم ایسے مقامات پر ترجمہ ''تم''، ''تم'' کے تخاطب کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ اس کی علامت ہے کہ ہم وہاں مخاطب عام سمجھتے ہیں خاص رسولؐ کو مخاطب نہیں سمجھتے مگر بعض مقامات قرآن مجید میں اس واحد حاضر کے لفظ کے ساتھ تخاطب کے ایسے ہوتے ہیں جن کا مضمون پتہ دیتا ہے کہ یہاں ذاتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں جیسے: الم نشرح لك صدرك ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك و رفعنا لك ذكرك کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کیا اور آپ سے اس بوجھ کو نہیں اتارا جو آپ کی پشت کو توڑے جا رہا تھا۔ اور کیا ہم نے آپ کے ذکر کو اونچا نہیں کیا؟ ما ودعك ربك وما قلی نہ آپ کو آپ کے پروردگار نے چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے انك لمن المرسلین بلاشبہ آپ ضرور پیغمبروں میں سے ہیں قد نرٰی تقلب وجهك فی السمآء ہم آپ کے چہرے کی گردش کو آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مقامات پر ضمیر مخاطب کے ترجمہ میں اپنے دور کے معیار تہذیب کے مطابق آپ کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔

اس کے پہلے کی آیت اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ کا ترجمہ میں نے کیا نماز برپا کرو زوال آفتاب سے نصف شب تک اس لئے کہ وہ احکام رسولؐ سے مخصوص نہیں ہیں یہاں اس آیت میں بھی اگر فقط ومن الیل فتهجد به ہوتا تو ہم اسکو عام حکم سمجھتے کہ رات کے کچھ حصہ میں نماز تہجد ادا کرو مگر یہاں آخر میں عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا امید ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے گا۔ اور مقام محمود کی تفسیر مقامات شفاعت سے ہوئی ہے[1] یہ جز ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم اس کا مخاطب رسول اللہ کو مانیں اور اس لئے اس آیت کے ترجمہ میں میں نے آپ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اگر یہ آخر کار جملہ نہ ہوتا تو نماز تہجد کے ساتھ اس فقرہ کا کہ ''نافلة لك'' یہ مطلب ہوسکتا تھا کہ وہ نمازیں جن کا پہلے حکم تھا کہ زوال آفتاب سے نصف شب تک اور پھر صبح کر برپا کرو، وہ تو نماز ہائے فریضہ ہیں اور یہ نماز تہجد فرض نہیں ہے بلکہ نفل ہے کہ اس کا ترک کرنا باعث

---

[1] شفاعت (فتح الرحمن) اجمع المفسرون علی انّ المقام المحمود ھو مقام الشّفاعة (مجمع البیان)

عذاب اُخروی نہیں ہے لیکن جب مخاطب رسولؐ کی ذات ہوگئی تو اب نافلة لك کے یہ معنی ہو گئے کہ اور سب نمازیں تو آپ کے علاوہ اور تمام مسلمانوں پر بھی فرض ہیں لیکن یہ نماز تہجد اور مسلمانوں کے لئے مستحب ہے اور آپ کے لئے خصوصی طور پر یہ مزید اضافہ ہے کہ آپ کو اس سے بھی ضرور انجام دینا ہے اور ترک نہیں کرنا ہے[1] اور یہ رہ نمایان دنیا سے خالق کی طرف کے باعظمت رہنما کا امتیاز ہے کہ دوسرے بڑے افراد اپنے لئے مراعات زیادہ قرار دیتے ہیں اور رسولؐ اسلام وہ ہیں جن کا حصہ فرائض میں اور ذمہ داریوں میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے چنانچہ نماز شب دوسروں کے لئے سنت ہے اور پیغمبرؐ کے لئے یہ بھی ایک فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے جسے آپ ترک نہیں فرماتے تھے۔

اس انتباہ کے ساتھ کہ یہ آپ پر ایک مزید فریضہ ہے پھر یہ کہ نزدیک ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ''جن کے رتبے ہیں سوا، ان کو سوا مشکل ہے''۔ یعنی چونکہ آپ کو اللہ کی طرف سے شفاعت کا بلند مرتبہ ملنے والا ہے، اس لئے آپ کے عمل کا معیار دوسروں سے بلند ہونا چاہیے۔

اس کے بعد کی آیات چونکہ انداز کلام یعنی عنوان تخاطب میں ان دونوں آیات سے متحد ہیں، اس لئے وہ ایک ڈال معلوم ہوتی ہیں اور ہم نے بھی ان کا ترجمہ ایک ساتھ کیا ہے اور اگر تفاسیر کو سامنے نہ رکھا جائے تو ہم کہیں کہ وہ سب ایک ہی موقع یعنی فتح مکہ کے قبل کی نازل شدہ ہیں اور داخلہ سے مراد مکہ میں داخلہ ہے اور نکلنے سے مراد فتح کے بعد وہیں سے مدینہ کی طرف واپسی کے لئے نکلنا ہے اور حق کے آنے اور باطل کے مٹنے کا اعلان بھی اسی فتح کا نتیجہ ہے مگر کیا کیا جائے کہ وہ جو ترتیب قرآن کے مطابق منشاء قدرت ہونے کے بڑے منادی ہیں ان آیات کو شان نزول کے اعتبار سے اتنا پشیمان و پریشان کر رہے ہیں کہ ان میں آپس میں بڑا فاصلہ ہوتا ہے چنانچہ رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ کو جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے میرا داخلہ کر سچائی کا داخلہ اور نکال بھی سچائی کے ساتھ اسے کہتے ہیں کہ یہ ہجرت کے موقع پر مکہ سے نکلنا اور مدینہ میں داخل ہونا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور ہجرت سے قبل کی ہے[2] حالانکہ ذوق سلیم کا فیصلہ ہے کہ اس صورت میں اخرجنی پہلے ہوتا اور ادخلنی بعد کو ہوتا پھر اس کے بعد کی آیت: وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ کو کہتے ہیں کہ وہ فتح مکہ سے متعلق ہے۔[3]

علامہ طبرسیؒ نے بس چار قول بلا تبصرہ نقل کر دیئے ہیں جو کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتے۔

بیچ کا فقرہ:

وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا

اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ یہ کرتے ہیں کہ:

ساز برای من از نزدیک خود قوتی یاری دہندہ

بنا میرے لئے اپنی طرف سے ایک طاقت مدد کرنے والی

اب اگر یہ طاقت کسی ایسی شخصیت کے لباس میں نمایاں ہو جو رسولؐ کی نصرت میں ہر جگہ اس طرح کا کارنمایاں انجام دے کہ فرشتہ سے

---

[1] روی انّها فرضت علیه ولم تفرض علی غیره و کانت فضیلة له (تبیان)

[2] ادخلنی المدینة (جلالین)

[3] و قل عند دخول مکّة (جلالین)

لافتی الاعلی کاکلمہ پڑھوالے تو اس روایت کو بالکل درست ماننا چاہیے جو بتاتی ہے کہ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا سے مراد یہی شخصیت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دعائے رسولؐ کی قبولیت اس شخص میں نمایاں ہوئی۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

''اور ہم اتارتے ہیں اس قرآن کو جو شفا[1] اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے اور ظالموں کے لئے اضافہ نہیں کرتا مگر خسارے میں''۔

وہ شفا اور رحمت سب کے لئے ہوسکتا ہے مگر اس وقت جب وہ اس سے نیک نیتی کے ساتھ یہ فوائد حاصل کرنا چاہیں لیکن جو اسے فائدہ اٹھانے کے لئے پڑھتے اور سنتے ہی نہیں بلکہ صرف نکتہ چینی کرنا ان کا مقصد ہے اور اسی لئے انہیں ظالم کہا گیا ہے کہ وہ اپنے سوءِ اختیار سے اس کے فوائد سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے کفر و عناد میں اور اضافہ ہی ہوتا ہے جو دین و دنیا میں ان کی تباہی کا سبب ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان کے لئے تو اور وہ خسارے ہی کا باعث ہوتا ہے[2] اور اسی لئے سورہ بقرہ کے شروع میں اسے کہا گیا ہے کہ ھدی للمتقین وہ فکر نجات رکھنے والوں کے لئے باعث ہدایت ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جاچکی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے فائدہ یہی لوگ اٹھاتے ہیں''۔ دوسرے اس سے باختیار خود محروم رہتے ہیں جس میں اس کا کوئی قصور نہیں خود ان کی تقصیر ہے۔ دوسرا رخ اس کا اور ہے کہ قرآن کی آیات ان کے غلط منصوبوں کی پردہ دری کرکے انہیں رسوا کرتی ہیں۔ اس طرح انہیں خسارہ ہوتا ہے۔[3]

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

''اور جب ہم انسان کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ روگردانی اختیار کرتا اور پہلو تہی کرتا ہے اور جب اس کے لئے کوئی خرابی ہوتی ہے تو بے آس ہوجاتا ہے کہ دیجئے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے تو تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ درست راستے پر چلنے والا ہے''۔

پہلا کردار ان انسانوں کا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اس کے بعد خود سے ذہن میں صاحب ان ایمان کا کردار آجاتا ہے کہ جب وہ نعمت ملتی ہے تو شکر الٰہی ادا کرتے ہیں اور جب مصیبت آتی ہے تو بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی طرف سے کشائش کے امیدوار رہتے ہیں اس

---

[1] ۔من البیان (جلالین)

[2] ۔لا یزوا دون من عندہ الا خسارا یخسر ثوابھم ویستحقون العقاب لکفرھم بہ وحرمان انفسھم تلك المنافع التی فیہ (تبیان)

[3] ۔یحتمل ان یرید ان القرآن یظھر خبث سرائرھم وما یاتمرون بہ من الکید والمکر بالنبی فیفتضھون بذلك (مجمع البیان)

کے بعد یہ فقرہ آیت کا چسپاں ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے یعنی کافر کا رویہ وہ ہے اور مومن کا رویّہ یہ ہے۔[1]

یہ اس وقت ہے جب یہ آیت نمبر ۸۴ مقام تنزیل میں ۸۳ سے متصل ہی ہو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵

''اور وہ لوگ آپ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تمہیں علم نہیں دیا گیا ہے مگر بہت کم''۔

یعنی روح کی حقیقت کو معلوم کرنا نہ تمہارے ظرف ذہن کو وسعت کے مطابق ہے اور نہ تمہارے لئے کارآمد۔ مگر اتنا سمجھنا تمہارے لئے ضروری ہے کہ یہ روح ازخود نہیں بلکہ پروردگار کے ارادہ کا نتیجہ ہے اس لئے اس کی راہ میں صرف ہونا اور اس کے کام آنا چاہیے۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ روح سے مراد قرآن ہے جس کے متعلق آئندہ کی آیت میں اشارہ آئے گا۔

وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝۸۶ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝۸۷

''اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے، اسے بھی سلب کر لیں۔ پھر آپ ہمارے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی کام بنانے والا نہ پائیں گے، سوا اپنے پروردگار کی طرف سے ایک فضل و کرم کے، یقیناً اس کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے''۔

یعنی علم آپ کا ذاتی نہیں ہے، اللہ کے فیض و عطا سے ہے پھر اس کا علم کا تحفظ سہو و نسیاں سے امر اختیاری نہیں ہے بلکہ اللہ کے لطف خاص کا نتیجہ ہے جس پر اس کے پہلے ایک جگہ تفصیل سے تبصرہ ہو چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عصمت کے دو پہلو ہیں: ایک ہے ارادہ اور وہ ہے گناہوں سے بچنا اور ایک ہے یہ لطف ربانی اور وہ سہو و نسیان و خطا سے بری ہوتا ہے اور چونکہ عصمت میں یہ دونوں جزء دخیل ہیں اس لئے بحیثیت مجموعی جیسا بعض علماء کا قول ہے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ عصمت لطف خاص کا نام ہے لیکن اس سے پیغمبر کے ارادہ کا رنامہ کی عظمت کو نظر انداز کرنا بھی درست نہیں ہے پھر یہ لطف خاص بھی ہر کس و ناکس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے علم الٰہی میں صلاحیت نہیں ہے پھر یہ لطف خاص بھی ہر کس و ناکس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے علم الٰہی میں صلاحیت ظرف کی ضرورت ہے جو اس آیت سے ثابت ہے کہ:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام: ۱۲۴)

اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کا منصب کہاں رکھے۔

اس آیت کو مقام تنزیل میں اگر گزشتہ آیت سے متصل مانا جائے تو یہ ایک قرینہ اس کا ہو سکتا ہے کہ سابق آیت میں روح سے مراد قرآن

---

[1] ۔ای کل واحد من المؤمن والکافر یعمل علیٰ طبیعتہ و خلیقتہ التی تخلق بہا عن ابن عباس (مجمع البیان)

ہی ہے۔[1]

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

”کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب مل کر کوشش کریں کہ اس قرآن کا جواب لے آئیں تو وہ اس کا جواب نہیں لائیں گے، چاہے وہ کیسے ہی ایک دوسرے کے پشت پناہ بن جائیں“۔

تمام انس وجن مل کر بھی قرآن کا جواب نہیں لا سکتے

یہ قرآن مجید کے تمام مطالبات ”ایسا قرآن لے آؤ“ دس سورے ایسے لے آؤ۔ (ارے) ایک سورہ ہی لے آؤ اور اس سب کے جواب میں دنیا کی عاجزانہ خاموشی کے بعد کا نتیجہ ہے جسے یہاں اس عظیم پر جوش انداز کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے اور جس کی تصدیق اس کے بعد بھی دنیا کی خاموشی اور بے بسی آج تک کرتی رہی ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

”اور بے شک ہم نے رخ بدل بدل کر لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں پیش کر دی ہیں تو زیادہ تر لوگوں نے انکار کیا سوا ناشکرے پن کے“۔

یعنی ناشکرے پن کے سوا کسی اور راہ کے اختیار کرنے پر عملی طور سے تیار نہ ہونا تھے نہ ہوئے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

”اور ان لوگوں نے کہا کہ ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکالیں یا آپ کے لئے ایک باغ ہو کھجور اور انگور کا تو اس کے بیچ بیچ ایسا کیجئے کہ نہریں پھوٹ کر بہنے

[1] قیل معناہ: ولو شئنا لمحونا ھذا القراٰن من صدرك وصدر امتك وفی ھذا دلالة علی ان السوال دفع عن القراٰن (مجمع البیان)

لگیں یا جیسا کہ آپ کو زعم ہے آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کرکے گرا دیجئے یا اللہ اور ملائکہ کی ایک فوج بنا کر لے آیئے یا آپ کا ایک گھر ہوطلائے خالص کا یا آسمان پر چڑھ جائے اور ہم آپ کے چڑھ جانے کا بھی یقین نہیں کریں گے جب تک کہ ہم پر لکھی لکھائی ایک کتاب نہ اتارے جسے ہم خود پڑھیں، کہہ دیجئے کہ پاک ہے میرا پروردگار میں کیا ایک بشر کے علاوہ جو بھیجا گیا ہے اور کچھ ہوں''؟

یعنی میرا ذاتی اختیار ان باتوں میں کچھ بھی نہیں ہے میں تو خالق کی حکمت و مصلحت کا پابند ہوں، اور کوئی بھی پیغمبر اپنی طرف سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا بلکہ جتنے اللہ تصدیق و رسالت کے لئے بر بنائے اتمام حجت از روئے حکمت ضروری سمجھتا ہے، اسے معجزات عطا فرماتا ہے۔[1] اس سے اور ایسی ہی دوسری آیات سے معجزات کی نفی کس طرح ثابت نہیں ہوتی جس پر ہم نے مقدمہ تفسیر میں کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾

''اور نہیں مانع ہوا لوگوں کو ایمان سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آئی مگر یہ کہ انہوں نے کہا کیا اللہ نے ایک بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو سکون و وقار کے ساتھ چلتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے''

پیغمبروں کی بشریّت

یعنی قدرت کا اصول بر بنائے حکمت یہ ہے کہ وہ پیغمبر انہی کے ہم جنس کو بنایا کرتا ہے۔

بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین اور ہمارے آئمہ معصوم علیہم السلام صورۃ بشر تھے لیکن حقیقت ان کی اس سے مختلف تھی۔ وہ غور کریں کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ عامہ خلائق کے لئے بہت بڑی رکاوٹ بن گیا، ایمان سے یہ امر کہ پیغمبر بشر کیوں ہیں؟ اگر واقعہ یہ ہوتا کہ وہ در حقیقت بشر کے سوا کچھ اور ہوں تو اس رکاوٹ کو دور کرنا کتنا آسان تھا یہ کہہ کر کہ تمہارا یہ سمجھنا کہ وہ بشر ہیں غلط ہے، یہ تو بس صورۃً بشر ہیں حقیقۃً بشر تھوڑی ہیں مگر قرآن ان تمام دشواریوں کو جو نہیں ایمان کی راہ میں اس تصور کی بناء پر ہیں کہ انگیز کرتا ہے اور ان کو قائل معقول کرنے کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرتا ہے مگر یہ کسی طرح نہیں کہتا کہ یہ بشر نہیں ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح مشرکین کا وہ تصور غلط تھا کہ رسول کو بشر نہیں ہونا چاہیے اسی طرح ان مسلمانوں کو یہ تصور بھی غلط ہے کہ یہ حضرات بشر نہیں تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس تصور میں ذہنیت وہی کار فرما ہے جو مشرکین کے اس تصور میں تھی کہ رسالت یا امامت بشریت کے ساتھ یکجا نہیں ہوسکتی۔ فرق اتنا ہے کہ انہوں نے بشریت کو تسلیم کیا اور رسالت کا انکار کیا اور یہ

---

[1] ۔المعنی انکم تفرحون علی الأیات ولیس امرھا الی وانا امرھا الی الذی ارسلنی (تبیان)

لوگ رسالت یا امامت کو تسلیم کر کے بشریت کا انکار کر رہے ہیں، مگر قرآن نے اصل اس ذہنیت کے خلاف جو دونوں میں مشترک ہے حقیقت پروری کی بنا پر مسلسل جہاد اپنا ایک اہم فریضہ قرار دیا ہے لہٰذا ہر ایمان بالقرآن رکھنے والے کو اس کی مخالفت ہی کو اپنا نصب العین بنانا درست ہے موافقت اس کی کسی طرح بھی درست نہ ہوگی۔

ہاں ایک سوال یہاں پر جناب شیخ الطائفہؒ نے اٹھایا اور وہ یہ ہے کہ اگر عامہ خلائق کی طرف ملک بھیجنا حکمت الٰہی کے تقاضے کے خلاف ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول کو ان کا ہم جنس ہونا چاہیے جس کی طرف وہ بھیجا جا رہا ہے تو پیغمبروں کی طرف اللہ فرشتوں کو رسول بنا کر کیوں بھیجتا ہے جیسا کہ تاریخ انبیاء سے بدیہی طور پر ثابت ہے اور قرآن مجید میں ہے:

اَللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰۤٮِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ‌ؕ (حج ۔ ۷۵)

اللہ فرشتوں میں سے بھی رسولوں کو منتخب کرتا ہے، اور آدمیوں میں سے بھی۔

اس کا جواب جناب شیخ الطائفہؒ نے یہ دیا ہے کہ پیغمبر چونکہ عامہ خلائق سے اپنی صفات کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اور معجزات کا حامل ہونے سے ایک خاص شخصیت رکھتا ہے اس لئے اس کو ایک طرح کی ہم جنسی ملائکہ سے بھی حاصل ہوتی ہے جو طبیعت نوعیہ کے لحاظ سے تو نہیں ہے مگر صفات شخصیہ کے لحاظ سے ہے۔[1]

اس سوال و جواب کو بعینہٖ طور پر ملخص کے جناب طبرسی علیہ الرحمہ نے مجمع البیان مین درج فرمایا ہے جس میں الفاظ بھی جناب شیخ طوسیؒ کے لئے ہیں اور اس پر کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے مگر ہم سمجھتے ہیں ملک کی نوعیت رسالت اس رسالت سے مختلف ہے جو پیغمبروں کو حاصل ہوتی ہے ملک کی رسالت نوعیت قاصد ہی کی طرح کی ہے اور پیغمبروں کی حیثیت مرشد اور رہ نمائی کی ہوتی ہے اس لئے ہم ملائکہ کو مرسلین سے افضل نہیں جانتے مگر مرسلین کا افراد امت سے افضل ہونا لازم سمجھتے ہیں یہ مرشد اور رہ نما ہونے کا مقصد وجوب اطاعت و اتباع سے پورا ہوتا ہے اور وہ بغیر ہم جنسی کے غیر معقول ہے۔

ایک بڑا اہم سوال یہاں میرے برادر بجان برادر رئیس العلماء سید کاظم صاحب نقوی نے آپس کی گفتگو میں اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ اصول ہے کہ رسول کو مرسل الیھم کا ہم جنس ہونا چاہیے تو ہمارے رسولؐ کی رسالت انسانوں کے علاوہ جنات کے لئے بھی کس طرح ہے؟

اس سوال کے بعد مجھے پورے مسئلہ پر از سر نو غائر نظر ڈالنا پڑی کیوں کہ نہ وہ اصول ہمارا طبع زاد ہے کہ اس سے دست برداری ممکن ہو بلکہ وہ صاف قرآن مجید سے مستفاد ہے اور نہ یہ حقیقت کہ رسولؐ کے عموم بعثت میں جنات بھی داخل ہیں۔ قابل انکار ہے کیونکہ اس کا پتہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے چلتا ہے۔

اب اس نظر کا جو نتیجہ ہے اس کی تفصیل کے لئے تو کتاب درکار ہے، مجمل یہ ہے کہ فرائض رسالت کے دو جز ہیں ایک قولی ہدایت اور دوسرے عملی مثالیں قائم کرنا۔

یہ دوسرا پہلو وہ ہے جس کے ہم جنسی ہی نہیں بلکہ ہم صنفی بھی درکار ہے اور اسی لئے طبقہ خواتین میں وقتاً فوقتاً ایسی معصوم ہستیوں کی ضرورت عقلاً ثابت ہوتی ہے جو اس طبقہ کے لئے نمونہ عمل بن سکیں اور عموم رسالت جو ہے وہ پہلے پہلو کے لحاظ سے ہے یعنی وہ دین جسے رسولؐ نے پیش کیا وہ

---

[1] ۔ لانّہ صاحب معجزۃ و قد اختیر للھدایۃ فصارت حالہ بذلک مقاربۃ لحال الملک (تبیان)

بلاتفرق صنف تمام نوع انسانی ہی نہیں بلکہ بلا امتیاز جنس وانس سب کے لئے ہے لیکن نمونہ عمل آپ انہی کے لئے ہو سکتے ہیں جو جنس میں ہی نہیں بلکہ صنف میں بھی آپ کے ساتھ متحد ہوں۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۝٩٦

”کہہ دیجئے کہ اللہ کافی ہے گواہ ہونے کے لئے میرے اور تمہارے بیچ میں ۔ وہ اپنے بندوں سے واقف ہے خوب دیکھنے والا“۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝٩٧

”اور جس کی اللہ ہدایت کرے تو وہ ہے ہدایت پانے والا اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو ہرگز ہرگز اسے چھوڑ کر تم اس شخص کے حوالی موالی کوئی نہیں پاؤ گے اور ہم انہیں اٹھائیں گے قیامت کے دن اس طرح کہ منہ اٹھائے ہوئے جاتے ہوں گے اندھے، گونگے اور بہرے، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، جب وہ بجھنے لگتا ہے تو ہم اُن کے لئے اس کی تپش میں اضافہ کر دیتے ہیں“۔

علی وجوھھم کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ”منہ اٹھائے ہوئے جاتے ہوں گے“ بعض مفسرین ومترجمین کے قول کے مطابق [1] مگر ایک دوسری تفسیر کے مطابق ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ وہ منہ کے بھل کھینچے جا رہے ہوں گے اس کی تائید میں ایک حدیث بھی منقول ہے جو ہمارے طرق سے نہیں ہے اور اس کا ظاہر کھینچا جانا نہیں ہے بلکہ یہ کہ قدرت کی طرف سے کچھ ایسا ہوگا کہ وہ خود منہ کے بھل چل رہے ہوں گے۔ [2]

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝٩٨ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝٩٩

”یہ ان کی سزا ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کے ساتھ کفر اختیار کیا اور کہا کہ کیا جب ہم کچھ ہڈیوں اور

---

[1] ما شین علی وجوھھم (جلالین) روان شدہ بر روی خویش (شاہ ولی اللہ)

[2] روی انس بن مالك انّ برجلا قال یا نبیّ الله كیف یحشر الكافر علی وجهه یوم القیامة؟ قال: انّ الذی امشاره علی رجلیه فی الدنیا قادر علی ان یمشیه علی وجهه یوم القیامة اورده البخاری و مسلم و الصحیح (مجمع البیان)

بکھرے ہوئے اجزاء کی شکل میں ہوں گے تو کیا ہم از سرنو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ قادر ہے اس پر کہ ان کو ایسا پھر پیدا کر دے اور اسی نے ان کے لئے ایک مدت مقرر کی ہے جس میں کچھ شک نہیں تو ظالم لوگ نہیں مانتے سوا انکار کے''۔

قُلۡ لَّوۡ اَنۡتُمۡ تَمۡلِكُوۡنَ خَزَآٮِٕنَ رَحۡمَةِ رَبِّىۡۤ اِذًا لَّاَمۡسَكۡتُمۡ خَشۡيَةَ الۡاِنۡفَاقِ‌ؕ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا ۝۱۰۰

'' کہیے کہ اگر تم لوگ میرے پروردگار کی رحمت کے خزانوں کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہوتے تو خرچ ہونے کے ڈر سے روک لیتے اور انسان بڑا کنجوس ہے''۔

اس مقدس آیت کے مضمون کی تصدیق آج سے بڑھ کے شاید کبھی ہوئی ہو۔ جب ضروریات حیات قدرت کی طرف سے اکثر فراواں ہوتی ہیں مگر بیوپاری اور سرمایہ دار انہیں اپنے پاس بند کر دیتے ہیں اس طرح لوگوں کو نہیں مل سکتیں اور دانہ دانہ کو ترستے ہیں۔

ہم نے آیت کا جو مفہوم لکھا ہے وہ حدیث معصومؑ کے مطابق ہے۔ [۱]

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى تِسۡعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسۡـَٔلۡ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِذۡ جَآءَهُمۡ فَقَالَ لَهٗ فِرۡعَوۡنُ اِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰمُوۡسٰى مَسۡحُوۡرًا ۝۱۰۱ قَالَ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَاۤ اَنۡزَلَ هٰٓؤُلَۤاءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ بَصَآٮِٕرَ‌ۚ وَاِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰفِرۡعَوۡنُ مَثۡبُوۡرًا ۝۱۰۲ فَاَرَادَ اَنۡ يَّسۡتَفِزَّهُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ فَاَغۡرَقۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ جَمِيۡعًا ۝۱۰۳ وَّقُلۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ لِبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اسۡكُنُوا الۡاَرۡضَ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِيۡفًا ۝۱۰۴

'' اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو (۹) کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں تو بنی اسرائیل سے پوچھو جب وہ ان کے پاس آئے تو فرعون نے ان سے کہا کہ میں تو اے موسیٰ! ایسا سمجھتا ہوں کہ تم کسی آسیب میں مبتلا ہو گئے ہو، انہوں نے کہا، تجھے معلوم ہے کہ یہ سب نہیں اتارا ہے، مگر آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے روشن نشانیوں کی صورت میں اور میں تجھے اے فرعون، سمجھتا ہوں کہ تو ہلاک ہونے والا ہے تو اس نے چاہا کہ ان لوگوں کو اس سرزمین سے ہٹائے تو ہم نے اسے اور ان سب کو جو اس کے ساتھ تھے ڈبو دیا اور کہا ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہ قیام کرو اس سرزمین پر تو جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کریں گے''۔

جناب موسیٰؑ کے معجزات

[۱] قال: لو كانت الاموال بيد الناس لما اعطوا الناس شيئا يخافته النفاد (علی بن ابراھیم)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''شاید نو نشانیاں نو معجزے ہوں، وہ جو فرعون کے مقابلے میں اللہ نے بھیجے اور شاید نو ۹ حکم ہوں کہ توریت کے سرے پر لکھے جاتے تھے وہ بھی کبیرہ گناہوں سے منع تھا۔(موضح القرآن)

نو ۹ معجزات کی فہرست جلالین نے حسب ذیل لکھی ہے:

۱۔الید ۲۔والعصا ۳۔والطوفان ۴۔والجراد ۵۔والقمل ۶۔والضفادع ۷۔والدّم ۸۔والطمس ۹۔والسنین و النقص الثمرات

ہمارے قدیم مفسر علی بن ابراہیم نے لکھا ہے:

۱۔الطوفان ۲۔والجراد ۳۔والقمل ۴۔والضفادع ۵۔والدم ۶۔والحجر ۷۔والعصا ۸۔ویدہ ۹۔والبحر

ان میں سات چیزیں تو مشترک ہیں اور دو چیزیں پہلی فہرست میں خاص ہیں طمس جس کا مفہوم واضح نہیں ہے اور قحط سالی جسے دو الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔السنین و نقص من الثمرات اور دو چیزیں دوسری فہرست میں خاص ہیں حجر اور بحر۔ یہ دونوں معجزے نصوص قرآنی میں متعدد جگہ درج ہیں:

جناب شیخ طوسیؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نو معجزوں کی فہرست میں اختلاف صدر اول ہی کے مفسرین میں پیدا ہو گیا تھا[1] چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں کئی قول نقل کئے ہیں لیکن کسی معصومؑ کی طرف ایک بھی ان میں سے منسوب نہیں ہے۔

علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان اقوال کو نقل کیا ہے، اور پھر اس قول کی تائید میں کہ اس سے نو ۹ حکم مراد ہیں، ایک روایت درج کی ہے جو غالباً طرق اہل سنت سے وارد ہوئی ہے کہ ایک یہودی نے اپنے ساتھ والے سے کہا کہ آؤ چلیں اس پیغمبر کے پاس اس سے ان نو ۹ چیزوں کے بارے میں دریافت کریں دیکھیں کیا جواب ملتا ہے چنانچہ وہ دونوں آئے اور حضرتؐ سے سوال کیا۔حضرتؐ نے فرمایا، وہ یہ باتیں ہیں:

۱۔اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ ۲۔چوری نہ کرو۔ ۳۔زنا نہ کرو (ناحق خون نہ کرو)۔ ۴۔کسی بے گناہ کو حکومت وقت سے شکایت کر کے قتل نہ کراؤ۔ ۶۔سود نہ کھاؤ۔ ۷۔کسی عورت پر بلا وجہ بدکاری کی تہمت عائد نہ کرو۔ ۸۔میدان جنگ سے فرار نہ کرو۔ ۹۔ان کے علاقہ خاص تم یہودیوں کے لئے یہ ہے کہ سبت کے بارے میں قانون الٰہی کی مخالفت نہ کرو۔ یہ سن کر سوال کرنے والے نے حضرتؐ کے ہاتھوں کا بوسہ لیا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے نبی ہیں (مجمع البیان)

فرعون کا کہنا کہ ''میں تمہیں ایسا سمجھتا ہوں کہ تم کسی آسیب میں مبتلا ہو گئے'' ہو اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی آسیب کی وجہ سے تمہارا دل الٹ گیا اور دماغ پلٹ گیا ہے[2] جیسا کہ دوسری جگہوں میں کافروں کا رسولؐ کو مجنوں یعنی دیوانہ کہنا مذکور ہے یہاں اس دیوانگی کے سبب کا اظہار ہے کہ وہ کسی جادو یا آسیب کا نتیجہ ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۱۰۵ وَقُرْاٰنًا

---

[1] ۔اختلفوا فی ھٰذہ التسع (تبیان)

[2] ۔مغلوباً علی عقلك (جلالین)

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

’’اور حق کے ساتھ ہم نے اسے اتارا ہے اور حق ہی کے ساتھ وہ اترا ہے اور نہیں بھیجا ہے کہ ہم نے آپ کو مگر خوش خبری دینے والا اور عذاب سے متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور اس قرآن کو ہم نے الگ الگ حصوں میں اتارا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھیں اور ہم نے اسے تدریجی طور پر نازل کیا ہے‘‘۔

فرقنا کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ہم نے الگ الگ حصوں میں اتارا ہے یہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [1] لیکن اس لفظ کی اس کے علاوہ اور تفاسیر بھی آئی ہیں [2] جن کی بنا پر ترجمہ مختلف ہوگا۔ اور ایک تفسیر کے لحاظ سے اس کا ترجمہ بالکل وہ ہوگا جو ہم نے آخری جملہ کا کیا کہ ہم نے اس کو تدریجی طور پر اتارا ہے۔ [3]

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۩﴿۱۰۹﴾

’’کہیے کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، یقیناً جنہیں اس کا علم پہلے عطا ہو چکا ہے، ان کے سامنے جب یہ پڑھا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے اور منہ کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور وہ ان کے قلبی تاثرات میں اضافہ کرتا ہے‘‘۔

گریہ کی تعریف

یخرون للا ذقان جو دو جگہ ہے اس کے لفظی معنی تو ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں مگر یہ محاورہ سے متعلق چیز ہے اس مفہوم کو ہماری اردو میں منہ کے بھل گرنے سے ادا کیا جاتا ہے اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا۔ شاہ ولی اللہ نے فارسی میں اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے می افتند بر روئے خود۔

ہماری قدیم تفسیر بھی جو کلام معصومین علیہم السلام سے ماخوذ ہے اسی کے موافق ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

یخرون علی الا ذقان سجدا قال علی الوجه (علی بن ابراھیم)

---

[1] نزلنا و شیئا بعد شئی اٰیة بعد اٰیة و قصة بعد قصة (تبیان) جدا جدا کیا ہم نے اس کو (شاہ رفیع الدین)

[2] قیل معناہ فرقنا به الحق عن الباطل عن الحسن و قیل معناہ بعضه خبرا و بعضه امرا و بعضه نهیا و بعضه وعدا و بعضه وعیدا (مجمع البیان)

[3] نزلناہ متفرقا فی عشرین سنة او ثلث (جلالین)

وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں (کیا مطلب؟) انہوں نے فرمایا منہ کے بل۔

جناب ابن عباسؓ سے بھی یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔ [۱]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''نماز میں سجدہ دوبار ہوتا ہے اس واسطے دوبار فرمایا، پہلی بار اس کلام کی تاثیر سے تعجب آتا ہے اور دوسری بار عاجزی (موضح القرآن)

یہ کوئی الفاظ قرآنی کی تشریح نہیں ہے بلکہ ایک نکتہ ہے جو اپنے ذہن سے پیدا کیا گیا ہے حالانکہ جو سجدے ہماری نماز میں ہیں وہ تو حکم الٰہی سے ترکیب نماز کا جزء ہیں، نہ وہ تعجب سے ہوتے ہیں نہ عاجزی سے، پھر الفاظ قرآنی سے جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سجدوں کی تعداد بیان ہی نہیں ہو رہی ہے کہ وہ آیات الٰہی کو سن کر دو دفعہ سجدہ کرتے ہیں بلکہ آیات الٰہی سے ان کا تاثر کا اظہار ہے کہ کبھی انہیں سن کر، وہ سجدے میں گرتے ہیں اور یہ الفاظ زبان پر جاری کرتے ہیں اور ان میں بھی الفاظ کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ کسی بھی الفاظ میں اس مضمون کا اظہار کہ بے شک جو اللہ نے وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا اور کبھی وہ سجدہ میں گرتے ہیں اس طرح کہ گریہ کا ان پر غلبہ ہوتا ہے۔

یہاں پر ایک بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کی ہنسی سے یہ مطلب نہیں جو نعمات الٰہیہ کو دیکھ کر یا کفار و منافقین کے انجام پر ہوگی، قرآن میں کسی وقت بھی اس دار دنیا میں ہنسی کی تعریف نہیں ہوئی ہے لیکن گریہ کا مورد مدح الٰہی ہونا ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وہ منہ کے بل سجدے میں گر کر کہتے ہیں کہ سبحان اللہ ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے یعنی کتب سماویہ میں جیسے نبی کے بھیجنے کا اس نے اعلان کیا تھا، یہ ویسا ہی نبی ہے۔ [۲]

یہ سب تعریفیں و توصیف بظاہر تو اہل کتاب کے ایک طبقہ کی ہے مگر یہ طبقہ جس کے یہ اعترافات و تاثرات ہوں، ناممکن ہے کہ مسلمان ہو گیا ہو، اس لئے حقیقۃً یہ ان نومسلموں کی تعریف ہے جو سچے دل سے ایمان لے آئے۔ [۳]

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

''کہیے کہ اللہ کہہ کے پکارو یا رحمٰن کہہ کے پکارو، جسے بھی پکارو تو اسی کے ہیں سب اچھے اچھے نام اور نہ اپنی نماز زور زور سے ہی پڑھو اور نہ اسے چپکے چپکے ہی پڑھو، اور اختیار کرو اس کے درمیان ایک راستا''۔

جہر و اخفاء کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم

عرب عموماً لفظ اللہ سے واقف تھے مگر الرحمٰن کے لفظ سے واقف نہ تھے اس لئے اس پر وحشت محسوس کرتے تھے چنانچہ دوسری جگہ ہے:

---

[۱]۔ ای یسقطون علی الوجوہ مساجدین عن ابن عباس وقتادۃ (مجمع البیان)

[۲]۔ وعد بنا بنزولہ وبعث النبی ﷺ (جلالین)

[۳]۔ ھم قوم من اھل الکتاب اٰمنوا (علی بن ابراھیم)

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا﴾ (الفرقان: ۶۰)

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں یہ رحمان کیا چیز ہے؟ کیا جو آپ ہم سے کہیں ہم اس کو سجدہ کرلیں اور وہ اس سے زیادہ بھڑکتے ہیں''۔

اس وحشت کو دور کرنے کے لئے قرآن میں بسم اللہ کی آیت میں اللہ اور رحمن و رحیم سب الفاظ جمع کردیئے گئے اور اسی کو یہاں سمجھایا جارہا ہے کہ اللہ اور رحمن کوئی الگ الگ شخصیتوں کے نام نہیں ہیں یہ دونوں ایک ہی ذات کے نام ہیں اور یہ کیا بلکہ اور نام جو صفات کمال کا پتہ دیتے ہیں جیسے علیم، قدیر، سمیع، بصیر وہ سب بھی کہے جائیں تو اس سے مقصود ایک ہی ذات ہوگی اور وہ خدائے واحد ہے۔

آخر میں جو کہا جارہا ہے کہ نہ زور زور ہی سے نماز پڑھو اور نہ چپکے ہی، اسے ہر ہر نماز سے متعلق لیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ نہ بہت بلند آواز سے چیخ کر ہی نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ درمیان کی کیفیت ہونا چاہیے [۱] مگر ہمارے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز کو زور ہی سے پڑھنے کا حکم ہوا اور نہ یہ کہ آہستہ ہی پڑھنے کا حکم ہو بلکہ اس کے درمیان راستا اختیار کرو کہ بعض نمازیں جہر سے پڑھو اور بعض اخفات سے جس کی تفصیل از روئے سنت ثابت ہوگئی ہے کہ صبح اور مغربین میں قرأت جہر سے ہونا چاہیے اور ظہر و عصر میں قرأت اخفات کے ساتھ ہونا چاہیے [۲] یہ تفریق ہی دونوں کے درمیان کا راستا ہے جس کے اختیار کرنے کا حکم ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

''اور کہیے کہ سب تعریف اللہ کیلئے جس نے نہ اپنی اولاد قرار دی ہے اور نہ اس کا سلطنت میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کا عاجزی کی بنا پر کوئی یار و مددگار ہے، اور اس کی بڑائی کا اعتراف کیجئے جیسا بڑائی کا اعتراف کرنا چاہیے''۔

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو اختیاری کارناموں پر ہو، اس لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس آیت حمد کے ساتھ جن اوصاف کا تذکرہ ہے وہ ذات الٰہی کے کمال و جلال کے تعارف کیلئے ہیں نہ یہ کہ حمد اس کی ان باتوں پر ہے بلکہ حمد اس کے اعطاف و الطاف اور نظام عالم میں اس کے افعال حکیمانہ پر ہے جو سراسر خیر ہیں اور ان میں شر کا گزر نہیں ہے۔ [۳]

---

[۱]۔ نماز میں بہت چلانا بھی نہیں اور بہت دبی آواز بھی نہیں بیچ کی چال پسند ہے (موضح القرآن)

[۲]۔ قال الطبری: یحتمل ان یکون للراد لا تجهر بصلاتك صلوٰة النّهار و لا تخافت بها یعنی صلوٰة اللیل الّتی یجهر فیها بالقرأة قال و هٰذا یحتمل غیر انّه لم یقل به احد من اهل التاویل (تبیان) بان تجهر بصلاة اللّیل و تخافت بصلوٰة النّهار عن ابی مسلم (مجمع البیان)

[۳]۔ انّ الحمد فی الأیة لیس هو علی ان لّم یفعل ذٰلك و انّما هو علی افعاله المحمودة و وجّه الی من هٰذه صفته لا من اجل انّ ذٰلك صفته (تبیان) کما یقال ان اشکر فلانا الجمیل و لا یشکره علی جماله بل علی افعاله. (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ

مکیّہ۔۔۔۔۱۱۰ آیات

چونکہ کہ اس سورہ میں الکھف یعنی پہاڑ کے ایک خاص غار اور اصحاب کہف یعنی اس غار میں پناہ لینے والے کچھ دیندار افراد کا تذکرہ ہے۔اور وہ کسی دوسری جگہ قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے اس لئے اس سورہ کا نام یہ ہوا۔

اس کے علاوہ اس سورہ میں جو مضامین ہیں،وہ حسب ذیل ہیں:۔

سورۂ کہف کے خاص خاص مضامین:

۱۔۔۔۔۔آئندہ کے کسی کام کا وعدہ کرتے وقت انشاءاللہ کہنے کا حکم

۲۔۔۔۔۔دو آدمیوں کی گفتگو جن میں ایک مالدار تھا خدا فراموش اور دوسرا غریب مگر اللہ پر توکل رکھنے والا جس کے ذیل میں یہ سبق ہے کہ خدا کو بھول کر اسباب ظاہری پر تکیہ کرنا غلط ہے۔

۳۔۔۔۔۔مال اور اولاد سے زندگانی دنیا کی رونق ہے لیکن مال کا دارومدار حسن عمل پر ہے۔

۴۔۔۔۔۔شیطان کا جنات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود۔

۵۔۔۔۔۔حضرت موسیٰؑ اور جناب خضرؑ کی ملاقات اور اس سے متعلق واقعات۔

۶۔۔۔۔۔ذوالقرنین

۷۔۔۔۔۔یاجوج وماجوج

۸۔۔۔۔۔کلمات الٰہی کی وسعت بلانہایت

۹۔۔۔۔۔حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام بشریت۔وغیرہ وغیرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ
بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَیُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ
اَجۡرًا حَسَنًا ﴿۲﴾ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ﴿۳﴾ وَّیُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا

لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

''سب تعریف اللہ کے لئے جس نے اتارا اپنے بندہ پر اس کتاب کو اور نہیں رکھی اس میں کجی، بالکل ٹھیک تا کہ وہ متنبہ کریں اس کی طرف سخت عذاب سے [۱] اور خوش خبری دیں ان ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لئے اچھا صلہ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور عذاب سے متنبہ کریں انہیں جن کا قول یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لئے اولاد قرار دی ہے انہیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے اور نہ ان کے باپ داداؤں کو، بہت بڑا ہے یہ جملہ جو ان کے منہ سے نکلتا ہے نہیں کہتے وہ بجز جھوٹ کے''۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝

''تو شاید آپ جان دے دیجئے گا [۲] رنج و افسوس سے ان کے پیچھے اگر وہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں''۔

یہ اپنے پیغمبرؐ سے جو اس کے ساتھ حبیب ہونے کا بھی رشتہ رکھتا ہے ایسا بظاہر غصہ میں بھرا ہوا تخاطب ہے جس میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ کرنا ہے وہ آپ کر رہے ہیں اب وہ نہیں مانتے اور راہ راست پر نہیں آتے تو آپ ان کے غم میں گھل گھل کر اپنی جان کیوں دیتے ہیں۔ [۳]

اس غم اور فکر کو جو خلق خدا کی ہمدردی کی بناء پر تھا۔ دوسری جگہ قرآن میں رسول کے اوصاف میں بطور مدح پیش کیا ہے ان الفاظ میں کہ:

عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم (توبہ: ۱۲۸)

''ان پر شاق ہے تمہارا ابتلائے زحمت ہونا اور انہیں انتہائی طلب تمہاری ہے (کہ کسی طرح تم راہ راست پر آ جاؤ)

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

''بے شک یہ سب جو زمین پر ہے، اسے ہم نے اس کی سجاوٹ کا ذریعہ بنایا ہے تا کہ انہیں آزمائیں کہ ان میں اعمال کے لحاظ سے بہتر کون ہے؟ اور بلا شبہ ہم بنانے والے ہیں اسے جو اس پر ہے ایک وقت میں چٹیل میدان۔ [۴]

---

[۱]۔ تقديره: لينذركم باسا كما قال يخوّف اولياء(تبيان) معناه: ليخوّف العبد الذى انزل عليه الكتاب الناس عذابا شديدا.(مجمع البيان)

[۲]۔ فی رواية ابی الجاود عن ابی جعفر ... يقول قاتل نفسك على اثارهم (على بن ابراهيم)

[۳]۔ هٰذا معاتبة من الله سبحانه لرسوله على شدة وجده و كثرة عرصه على ايمان قومه (مجمع البيان)

[۴]۔ الجرز الذى لا نبات عليه ولا زرع ولا غرس (تبيان)

یعنی زمین کا تمام ساز و سامان انسان کی عملی آزمائش کے لئے ہے کہ وہ ان نعمتوں کا کس حد تک شکر ادا کرتا ہے یا جیسا شاہ عبد القادر لکھتے ہیں کہ:

اس کی طرف دوڑتا ہے یا اس کو چھوڑ کر آخرت کو پکڑتا ہے (موضح القرآن)

بہر صورت یہ آزمائش اس وقت درست ہے جب انسان کے افعال و اعمال کو خود انسان کے ارادہ و اختیار کا نتیجہ سمجھا جائے نہ کہ خالق کے جبر یا اس کی تخلیق کا نتیجہ۔ [۱]

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ⑨

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف و رقیم ہماری نشانیوں میں سے کوئی بڑی انوکھی چیز تھے"؟

واقعۂ اصحاب کہف کا آغاز

یعنی قدرت کی کارگزاریاں تو اس سے بہت بڑی انوکھی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں، ان کے لحاظ سے اصحاف کہف کا واقعہ کوئی خاص ندرت نہیں رکھتا ہے اس کے بعد اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

کہف کے معنی ہیں پہاڑ کا غار اور رقیم کے معنی ہیں لوح یعنی تختی۔ ان لوگوں نے جیسا کہ بعد میں بیان ہوگا، ایک غار میں جا کر پناہ لی تھی جہاں خالق نے ان پر ایک طویل نیند طاری کر دی جس کا سلسلہ کئی سو برس تک جاری رہا اور تختی کے لئے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اس پر ان لوگوں کے نام لکھ کر بعد میں اسے غار کے دہانے پر آویزاں کر دیا گیا دیوار پر نام لکھ دیئے گئے، اس لئے ان کا پتہ دینے میں قرآن مجید نے کہف کے ساتھ رقیم کو یاد دلایا ہے [۲] اور کئی قول اس کے ہیں کہ رقیم اس جگہ کا نام ہے جہاں وہ غار واقع تھا۔ [۳]

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ⑩ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۙ⑪ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ⑫

"جب کہ ان جوانوں نے غار کی طرف پناہ لے کر کہا اے ہمارے پروردگار! ہمیں عطا کر اپنی طرف سے خاص لطف و کرم اور سامان کر ہمارے لئے ہمارے معاملہ میں صحیح راستے پر قائم رہنے کا، تو ہم نے ان کے کانوں پر پردے ڈال دیئے اس غار میں گنتی کے کچھ برسوں کے لئے، پھر ہم نے انہیں اٹھایا، تاکہ ہم جانیں کہ دو گروہوں

---

[۱]۔ فی قوله: "ایّهم احسن عملا" دلالة علی ان الله سبحانه اراد من الخلق العمل الصالح و علی ان افعالهم الصادرة منهم حادثة من جهتهم (مجمع البیان)

[۲]۔ الرقیم اللوح المكتوب فیه اسماءهم وانسابهم (جلالین) نوشتۂ کہ بر دیوار آر غار بود (فتح الرحمن)

[۳]۔ قال قوم هو اسم قریة ذهب الیه ابن عباس وفی روایة اخرىٰ عنه انه واد بین غضبان وایلة وقال عطبة: الرقیم واد وقال وقتادة: اسم الوادی الذی فیه اصحاب الكهف (تبیان)

میں کون زیادہ صحیح طور پر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت تک یوں رہے"۔

اصحاب کہف کا غار میں داخل ہونا اور اس کا پس منظر

ان کے کانوں پر پردے ڈال دیئے۔یعنی نیند غالب کردی چونکہ خواب سے بیدار ہونے کی سب سے بڑی علامت کان میں آواز پہنچنا ہے اس لئے نیند کے استعارۃ قرآن مجید میں کانوں پر پردہ ڈالنے کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ضمناً یہ پتہ بھی چل جاتا ہے کہ یہ نیند ہی تھی ،موت نہیں تھی اس محل پر قرآن مجید کی یہ تعبیر وہ ہے جس میں عربی کے ماہر علماء نے خاص امتیازی طور پر فصاحت کا جوہر محسوس کیا ہے۔

دو گروہوں میں کون زیادہ صحیح طور پر جانتا ہے اس کے تحت شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں :

دو فرقے یا تاریخ لکھنے والوں میں ہیں کہ کوئی کتنے برس لکھتے ہیں اور کوئی کتنے یا وے اصحاب کہف جاگ کر بعضے تجویز کرنے لگے کہ ہم ایک دن سوئے ،بعض کہنے لگے اس سے کم (موضح القرآن)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

"ہم آپ کے سامنے ان کے واقعہ کو حقیقت کے مطابق بیان کرتے ہیں ،بلا شبہ وہ کچھ جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی مزید ہدایت کی اور ان کے دلوں کو مضبوط کیا جب وہ کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا مالک وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ہم نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی خدا کو کہ ہم اس وقت بیہودہ بکواس کرتے ہوں گے یہ ہماری قوم والے ،انہوں نے اس کے سوا دوسرے خدا بنا لئے ہیں کیوں نہیں ان کی خدائی پر وہ کوئی کھلا ثبوت پیش کرتے ؟ تو کون زیادہ ظالم ہو گا اس سے جو اللہ پر جھوٹ تہمت عائد کرے اور جب کہ تم نے علیحدگی اختیار کی ہے ان سے اور ان چیزوں سے جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں تو پناہ لو اس غار کی طرف پھیلائے گا تمہارے لئے تمہارا پروردگار اپنی رحمت سے اور سامان کرے گا تمہارے لئے تمہارے معاملہ میں نفع پہنچانے کا"۔

اصحاب کہف کے وصف کے آغاز میں جوان کہنا نوعمری کا اظہار تو کرتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ اس میں ان کی عزت نفس ،ثابت قدمی اور

جرأت وہمت مردانہ کے اوصاف بھی مضمر ہیں جن پر مفسرین کی توبہ مبذول ہوئی ہے۔[1]

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾

''اور تم دیکھو گے سورج کو کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو مڑ جاتا ہے ان کے غار سے داہنی طرف اور جب وہ ڈوبتا ہے تو کترا جاتا ہے ان سے بائیں طرف اور وہ ایک کھلی جگہ پر ہیں اس غار میں سے۔ یہ اللہ نشانیوں میں سے ہے جس کی ہدایت اللہ کر دے، وہ ہدایت پائے ہوئے ہوگا اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو ہرگز نہیں پاؤ گے اس کے لئے کوئی یار و مددگار جو صحیح راستا بتانے والا ہو''۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

بخاطر فاتر می رسد کہ دیوار جنوبی کہف آن قدر بلند است کہ سایہ اصلی اودر تمام سال محل خفتن ایشاں رامی پوشاند و دیوار شرقی و غربی آں متصل و دیوار جنوبی بلند تراست و پایہ بپایہ منحط شدہ و این جماعہ سر بجانب شمال و پا بجانب جنوب کردہ خفتہ اندپس وقتیکہ آفتاب طلوع کند ضوء آفتاب بر دیوار غربی و بعضی صحن غار افتدہ ہر چند ارتفاع زیادہ گیرد و بلندی دیوار شرقی از وصول ضوء باالیشان مانع آیدو ضوء از جانب راست ایشاں منتقل شود بجانب سرکہ جہت شمال است دروقت استواء بجز سایہ اصلی دیوار جنوبی نمی ماند و چوں آفتاب مائل بغروب شود ضوء آفتاب بر دیوار شرقی افتد و آہستہ و آہستہ بر سر دیوار مرتفع گرد وآں جانب چپ ایشانست (فتح الرحمن)

غار میں ان کے محلّ قیام کی خاص خصوصیّت

ذہن قاصر میں ایسا آتا ہے کہ اس غار کی جنوب کی طرف کی دیوار اتنی اونچی ہے کہ اس کا اصل سایہ پورے سال ان کے سونے کی جگہ کو چھپائے رکھتا ہے اور مشرق اور مغرب کی طرف کی دیوار اُس کی جنوب والی دیوار سے ملی ہوئی ہے اس سے بھی زیادہ اونچی ہے اور پھر رفتہ رفتہ نیچی ہوئی ہے اور یہ لوگ اس طرح سوئے ہوئے ہیں کہ سر ان کا شمال کی طرف ہے اور پیر جنوب کی طرف ہیں تو جب سورج نکلتا ہے تو سورج کی دھوپ مغربی دیوار پر اور غار کے صحن کے کچھ حصہ پر پڑتی ہے اور جتنا جتنا آفتاب بلند ہوتا ہے مشرقی دیوار کی بلندی ان تک دھوپ کے پہنچنے سے مانع ہوتی ہے اور دھوپ ان کے دائیں جانب سے ہٹ جاتی ہے سر کی طرف جو شمال کی طرف ہے جب آفتاب وسط آسمان میں ہوتا ہے تو سوا جنوب کی دیوار کے اصلی سایہ کے کچھ چھاؤں نہیں رہ جاتی اور جب سورج غروب کی طرف جھکتا ہے تو دھوپ مشرقی دیوار پر پڑتی ہے اور آہستہ آہستہ دیوار کے اوپر

[1] حکم لهم سبحانه بأنقوةلانّ راس الفتوة الایمان و قیل الفتوة بذل النّدٰی و ترك الاذٰی و ترك الشكری عن مجاهدو قیل هی اجتناب المحارم و استعمال المكارم.(مجمع البیان)

بلند ہوتی ہے اور وہ ان کی داہنی سمت ہوتی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

حق تعالٰی کی قدرت سے نہ اس مکان میں ان پر دھوپ آوے، نہ مینہ نہ برف اور کھلی جگہ ہے تنگ حصہ نہیں ہے (موضح القرآن)

دیکھا جائے تو باپ بیٹے کے تصور میں بہت بڑا فرق ہے والد یعنی جناب شاہ ولی اللہ قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ کو طبیعی اسباب پر مبنی قرار دینا چاہتے ہیں اور وہ انجینئری کے اصول سے اس پہاڑی کی ساخت ایسی بتا رہے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دھوپ ان پر نہ پڑے اور ان کے صاحبزادے اسے اسباب طبعیہ سے الگ کر کے صرف قدرت الٰہی کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن کا انداز و بیان دوسرے تصور سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے یعنی بظاہر تو دھوپ ان پر پڑنے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے مگر یہ اللہ کی قدرت ہے کہ ان پر بہت سایہ رہتا ہے اور کبھی دھوپ ان پر نہیں پڑتی۔

ہمارے مفسرین میں علامہ طبرسیؒ کا رجحان بھی پہلے ہی رخ کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوپ کا نہ پڑنا ان کی آرام گاہ کے محل وقوع کا خاصہ ہے وہ فرماتے ہیں:

اخبر سبحانہ عن لطفہ بھم و حفظہ ایا ھم فی مضجعھم باختیارہ لھم اصلح المواضع لو قاء ھم فبوا ھم مکانا من الکھف مستقبلا نبات النعش تمیل الشمس عنھم طالعة و غاربة کی لا یؤذبھم حرھا او تغیر الوانھم اویبلی ثبابھم وھم فی متسع ینا لھم فیہ روح الریح وکان باب الغار مقابلا لقطب الشمالی (مجمع البیان)

خداوند عالم نے اپنی خاص مہربانی اور ان کی حفاظت کی صورت ان کی خوابگاہ میں بنائی ہے اور ان کے لئے انتخاب سونے کے لئے بہترین جگہ کا اس طرح کہ غار میں نہیں ایسے مقام پر رکھا جو بنات النعش کے رخ پر ہے اس لئے ان سے طلوع اور غروب دونوں میں سورج مڑا رہتا ہے تاکہ انہیں اس کی گرمی اذیت نہ دے یا ایسا نہ ہو کہ ان کی رنگت میں تغیر ہو یا ان کے لباس بوسیدہ ہوں اور وہ کھلی ہوئی جگہ پر رہیں تاکہ ان تک ہوا کا آرام وسکون پہنچتا ہے اور اس غار کا دروازہ قطب شمالی کے مقابل میں تھا۔

مگر کیا کیا جائے کہ الفاظ قرآنی کو دیکھتے ہوئے میرا دل کسی طرح اس تشریح کو قبول نہیں کرتا۔ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں اس تذکرہ کے بعد ذٰلك من فضل الله ہوتا ذلك من نعمة الله ہوتا ذٰلك من رحمة الله ہوتا وغیرہ وغیرہ لیکن ذٰلك من اٰيات الله یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہنا بتلاتا ہے کہ یہ کسی جغرافیائی محل وقوع کا لازمی تقاضا نہیں ہے جہاں ریاضی کے اصول سے دھوپ کو پہنچنا ہی نہیں چاہیے بلکہ وہ اللہ کی خاص قدرت کا کرشمہ ہے۔

وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ‌ۖ وَّنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ‌ ‌ۖ وَكَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَيۡهِ بِالۡوَصِيۡدِ‌ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا ﴿۱۸﴾

''اورتم انہیں جاگتا ہوا سمجھو گے حالانکہ وہ سوتے ہوئے ہیں اور ہم انہیں دائیں اور بائیں کروٹ بدلوا لیتے ہیں اور ان کا کتا غار کے دہانے پر اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے، اگر تم جھانک کر انہیں دیکھو تو پیٹھ پھرا کر ان سے بھاگو گے اور ان کا رعب تم میں بھر جائے گا''۔

ان آیات میں سگ اصحاب کہف کا ذکر آیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

''اور یوں ہی ہم نے انہیں اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال و جواب کریں ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنا تم لوگ رہے؟ انہوں نے کہا ہم رہے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم کتنا رہے؟ اچھا تو اپنے میں سے ایک کو بھیجو اپنے اس چاندی کے سکے کے ساتھ اس شہر کی جانب تو وہ دیکھے کہ کون یہاں کا کھانا زیادہ اچھا ہے تو لے آئے تمہارے پاس اس میں سے کچھ غذا اور لازم ہے کہ مناسب رویہ اختیار کرے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ یقیناً اگر وہ لوگ تم پر قابو پا گئے تو تمہیں سنسار کریں گے یا تمہیں اپنے مذہب میں واپس لے جائیں گے اور اس صورت میں تم کبھی بھی دونوں جہاں کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے''۔

صدیوں کی نیند کے بعد ان کی بیداری

یونہی ہم نے انہیں اٹھایا یعنی جس طرح ان کی یہ طولانی نیند صرف قدرت الٰہی کا کرشمہ تھی، ویسے ہی اس کے بعد ان کی بیداری بھی بس اللہ کی قدرت کا نمونہ تھی[۱]

کہ وہ آپس میں سوال و جواب کریں یعنی ان کے اٹھنے پر یہ صورت پیدا ہوئی[۲] نہ یہ کہ ان کے اٹھانے کا مقصد یہی تھا مگر دوسرا رجحان یہی ہے کہ وہ اس حیرت ناک صورتحال پر مطلع ہو کر اور زیادہ معرفت الٰہی کے درجہ میں ارتقاء حاصل کریں۔[۳]

---

[۱]۔ ای کما حفظنا احوالھم تلك المدّة بعثنا ھم من تلك الرّقدة لانّ احدلا مرین کالاٰخرنی انّہ لا یقدر علیہ الّا اللہ تعالیٰ (تبیان)

[۲]۔ عاقبت بایکدیگر سوال کنند (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ ای لیکون بینھم تساؤل و تنازع اختلاف فی مدة لبثھم فینتبھوا ذٰلك علیٰ معرفة صانعھم ویزدادوا یقیناً الیٰ یقینھم (مجمع البیان)

جہاں تک دیکھا جاتا ہے قرآن میں جہاں جہاں موت کے بعد اٹھانے کا ذکر ہے وہاں یہی ہے کہ بعد میں ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنے عرصہ تک اس عالم میں رہے۔ یہاں جو طویل خواب ہے، اس کے بعد بھی یہی کیفیت ہے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

سینکڑوں برس رہنا ان کو ایک دن معلوم ہوا مردہ اور سوتا برابر ہے (موضح القرآن)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق جو حیات عنصری میں ہوتا ہے شرط ادراک ہے اور اس سے بھی آخرت میں معاد جسمانی کی ضرورت ثابت ہوتی ہے ورنہ جزء وسزا کا مقصد پورا نہ ہوگا۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾

''اور اسی طرح ہم نے مطلع کیا ان پر تا کہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں ہے وہ موقع جب لوگ آپس میں ان کے معاملے میں بحث کر رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ ان پر ایک عمارت تعمیر کرو، اللہ ہی ان سے خوب واقف ہے کہا انہوں نے جو ان پر غالب آئے تھے تو ہم تو بالضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے''۔

لوگوں کا ان کے محلّ قیام پر مطلع اور باہمی اختلاف کے بعد وہاں مسجد بنانے کا فیصلہ

''تا کہ انہیں معلوم ہو'' یعنی دوسرے جواب تک حیات بعد الموت کے قائل نہیں تھے، وہ ان کی اس کیفیت کا مشاہدہ کر کے سمجھیں کہ جس طرح اتنی طویل موت کے طاری ہونے پر وہ قادر ہے، اسی طرح وہ موت کے بعد زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔[۱]

آخر میں اس فیصلہ کے بعد کہ عمارت ان پر بنائی جائے جو لوگ غالب آئے اور انہوں نے مسجد قائم کرنا طے کیا، وہ بلاشبہ کچھ دیندار لوگ تھے[۲] اور قرآن مجید کا انداز بیان بتاتا ہے کہ وہ ان کے اس منصوبہ کو قابل تعریف سمجھتا ہے اور اس پر معترض نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صالحین کے مستقر پر جو قبر کی نوعیت سے ہو، بطور یادگار عمارت قائم کرنا کوئی قابل اعتراض امر نہیں ہے اور یہ عمارت مسجد کی قسم سے بھی ہو سکتی ہے جس میں نمازیں پڑھیں جائیں۔[۳]

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا

---

[۱] ۔ليعلم الّذين يكذّبون بالبعث (تبيان)

[۲] ۔هم المؤمنون (جلالين)

[۳] ۔مسجداً يصلي فيه (جلالين) يتعبّد النّاس فيه ببركاتهم ودلّ ذٰلك على انّ لغلبة كانت للمؤمنين. (مجمع البيان)

يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

''جلد ہی لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے جن کا چوتھا کتا تھا اور کہیں گے کہ پانچ تھے جن کا چھٹا کتا تھا اٹکل پچو، غیب کی باتیں بتانے کے طور پر اور کہیں گے کہ سات تھے اور ان کا آٹھواں کتا تھا کہیے کہ میرا پروردگار ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے ان کی تعداد کا علم کوئی نہیں رکھتا سوا کم لوگوں کے تو ان کے بارے میں بحث نہ کیجئے سوا اس بحث کے جو بالکل صاف ہو اور ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے دریافت نہ کیجئے''۔

تعداد میں اختلاف اور حقیقت کی طرف اشارہ

چونکہ پہلی دو باتوں کے ساتھ رجماً بالغیب ''اٹکل پچو'' کا لفظ کہا گیا ہے اور تیسری بات کے بعد کوئی اس طرح کا تعریضی جملہ نہیں ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دونوں قول غلط ہیں اور تیسرا صحیح ہے چنانچہ جلالین نے دونوں اقوال کو کہا ہے کہ وہ نصارائے نجران کے تھے اور تیسرے قول کو کہا ہے کہ وہ مومنین کا تھا اور اسی تیسرے قول کو جناب ابن عباسؓ نے ذمہ داران طور پر موافق حقیقت کہا ہے [1] اور ظاہر ہے کہ انہیں اس کا علم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا [2] مگر اس پر بحث کرنے سے منع کیا گیا ہے اس لئے کہ کوئی غلط بات کہہ رہا ہو اور آپ کو اصل بات معلوم ہو مگر اس کی بات کو غلط اور اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس نہ ہو تو ایسی صورت میں اس سے الجھنا اور اس کی غلط بات کو رد کرنے کی کوشش کرنا لا حاصل ہے اس بحث سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

''اور کسی چیز کو کبھی نہ کہو کہ میں کل کروں گا مگر (اس شرط کے ساتھ کہ) اللہ چاہے اور اپنے پروردگار کو یاد کرو جب بھول جاؤ اور کہو کہ ممکن ہے میرا پروردگار میری رہنمائی کرے اس سے زیادہ صحیح طریقہ کار کے لئے''۔

انشاء اللہ کہنے کا حکم

آئندہ کے وعدہ کے ساتھ ہمیشہ انشاء اللہ کہنا اس آیت کی تعمیل ہے مگر صحیح محل اس کا یہی ہے کہ انسان خود اس کام کو کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ پھر اس کے ساتھ انشاء اللہ کہے لیکن کرنے کا ارادہ نہ ہو اور صرف مصلحۃً یا غلط معنی میں اخلاقاً وعدہ کرتا ہے اور پھر وعدہ خلافی کے الزام سے بچاؤ کے لئے بہانہ کی صورت سے انشاء اللہ کہتا ہے، یہ منشائے قرآنی کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں نے اسے قصہ اصحاب کہف سے متعلق قرار دیتے ہوئے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں

[1] قال ابن عباس: انا من القليل الذی يعلمون ذلك كانوا سبعة و ثامنهم كلبهم (تبيان)

[2] الاظهر ان يكون عوف ذلك من جهة النبی ﷺ (مجمع البيان)

نے آ کر اصحاب کہف کا واقعہ دریافت کیا تھا آپ نے فرمایا کہ کل بتاؤں گا مگر انشاء اللہ نہیں کہا تو دوسرے دن وحی اتری ہی نہیں اور اس لئے آپ اس وعدہ کو پورا نہیں فرما سکے۔

ہمارے نزدیک یہ روایت درست نہیں ہے اور اس آیت کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اسی قصہ اصحاب کہف سے متعلق ہے بلکہ اس کا قرینہ موجود ہے کہ وہ اس واقعہ سے تعلق نہیں رکھتی اور وہ یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق اس واقعہ سے ہوا تو بالکل شروع ہی میں یہ آیت آتی اور اگر شروع میں نہ آتی تو پورے واقعہ کے بیان کرنے کے بعد آتی بیچوں بیچ میں اس آیت کا آنا تو صاف بتلاتا ہے کہ جیسے بہت سی بے جوڑ آیات ترتیب قرآن میں اپنے محل سے ہٹا کر رکھ دی گئی ہیں، ویسے ہی یہ آیت بھی یہاں بے جوڑ رکھ دی گئی جس کے متعلق پتہ نہیں کہ وہ کس موقع کی نازل شدہ ہے۔

پھر سورہ کے آغاز پر نظر کیجئے، جہاں کسی سوال کا جواب دیا گیا ہے، وہاں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں کہ یستفتنوك لیفتنوك یسالونك وغیرہ وغیرہ مگر یہ اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرتے وقت اس قسم کا کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ انداز بیان بتاتا ہے کہ خالق از خود اس واقعہ کی پوری حقیقت بیان کر رہا ہے جس کے ذیل میں ان غلطیوں کی اصلاح ہے جو عام طور پر اہل کتاب کے درمیان ہیں یا ان کے اختلاف اقوال کی طرف اشارہ ہے ہرگز اس سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی سوال کا جواب یا کسی فرمائش کی تعمیل ہے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾

”اور وہ لوگ اپنے غار میں رہے تین سو برس اور بڑھ گئے اس پر نو ۹ کہیے کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنا رہے؟ اس کو آسمانوں اور زمین کی غیب کی خبر ہے وہ کتنا دیکھنے والا اور سننے والا ہے نہیں ان کے لئے اسے چھوڑ کر کرئی سرپرست اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے فیصلہ میں کسی کو“۔

تین سو کہنے کے بعد نو برس کی زیادتی کا جو الگ سے بیان ہوا ہے اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ شمسی حساب سے تین سو برس تھے اور قمری حساب سے ۳۰۹ برس ہوتے تھے۔[١]

اس کی تائید میں ہمارے یہاں جناب امیرؑ کا ارشاد بھی وارد ہوا ہے[٢] اس تعداد کے بتانے کے بعد یہ ارشاد کہ ”اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنا رہے؟ اس کے لئے آسمانوں اور زمین کی خبر ہے وہ کتنا دیکھنے والا اور سننے والا ہے“۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل کتاب کی جماعت کو اس کے ماننے میں تامل تھا اس لئے یہ کہا گیا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے کہہ رہے ہیں جو غیب کے علم کا مالک ہے۔

---

[١]۔ فلثلاثمائة الشمسية ثلث مائة وتسع قمرية (جلالين)

[٢]۔ روی ان یہود یا سائل علی بن ابی طالب عن مدة لبثهم فاخبر بما فی القرآن فقال: انا نجد فی کتابنا ثلاثمائة فقال ذٰلك لبنی الشمس وھٰذا البنی القمر (مجمع البیان)

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

''اور پڑھیے اسے جو آپ پر وحی بھیجی گئی ہے آپ کے پروردگار کی کتاب میں سے، اس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں اور نہیں پائے گا بجز اس کے کوئی جائے پناہ''۔

ملتحدا کے معنی میں قدیم مفسرین سے اختلافی طور پر کئی لفظ وارد ہیں مگر مطلب سب کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی جائے پناہ[1] جو ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور صبر و تحمل سے کام لے کر اپنے کو رکھئے ان کے ساتھ جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں کہ اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنی نظروں کو ان سے آگے نہ بڑھائیے اس طرح کہ زندگانی دنیا کی آرائش کو نصب العین بنایا اور کہا نہ مانیے اس کا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے بے خبر چھوڑ رکھا ہے اور جو اپنی نفسانی خواہش کا پیرو ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے''۔

رؤسائے نجد میں سے ایک عینیہ بن حصن تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے اور اس کے کچھ ہمرائیوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دفعہ کہا کہ یہ غریب، پریشان حال افراد کو آپ اپنے پاس کیوں بیٹھنے دیتے ہیں؟ اس پر یہ آیت اتری اور اس سے کہ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے بے خبر چھوڑ رکھا ہے'' وہی مراد ہے۔[2]

ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ وہ خاص غریب مسلمان جن کا رسولؐ کے پاس بیٹھنا ان رؤسا کو ناگوار تھا، جناب سلمان فارسیؓ تھے انہی کے بارے میں یہ آیت اتری[3] جناب شیخ الطائفہؒ نے بھی اس کو بطور ایک قول کے نقل کیا ہے[4] اس طرح یہ آیت جناب سلمانؓ اور ان کے ساتھیوں سے متعلق ہے علامہ طبرسیؒ نے ساتھیوں کے لفظ کے اجمال کو تفصیل سے بدلا ہے اور ابوذرؓ و عمارؓ وغیرہ کے نام لئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ نادار

---

[1] ملجأً عن مجاهد و قیل حوزا عن ابن عباس و قیل مرئلا عن قتادة و قیل معدلا و محیصا عن زجاج وابی مسلم والا قوال متقاربة فی المعنٰی (مجمع البیان)

[2] هو عینیة بن حصن و اصحابه (جلالین)

[3] نزلت فی سلمان الفارسی کان علیه کساء فیه یکون طعامه و هو دثاره ورداؤه کان کسائه من صوف (علی بن ابراهیم)

[4] قیل انّها نزلت فی سلمان و اصحابه (تبیان)

صحابہ تھے، اس لئے رئیسوں کو ان کا صحبت رسول ؐ میں رہنا ناپسند تھا۔[1]

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

''اور کہیے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے، بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لئے تیار کر رکھی ہے وہ آگ جسکا سرپردہ انہیں گھیرے ہوئے ہے اور اگر فریاد رکیں تو ان کی فریاد رسی ہوا یسے پانی سے جو مثل پگھلے ہوئے تانبے کے ہو کہ چہروں کو بھون دے، کیا بُرا پینے کا پانی ہے اور کیا بری وہ آرام گاہ ہے''۔

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے یہ تکلیفی طور پر اختیار دینا یعنی دونوں باتوں کی اجزت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ تہدیدی انداز میں ہے[2] اسی لئے اس کے بعد فوراً ظالموں کے لئے عذاب کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفر اختیار کرنا بڑا ظلم ہے جس کی سزا یہ ہے۔[3]

اس اعلان اختیار کے ساتھ ساتھ سزا کا بیان کرنا اس کا اظہار ہے کہ طاعت و معصیت دونوں کی زمہ داری تم پر ہے اور تمہارے ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے اگر اطاعت کروگے تو نجات پاؤگے اور مخالفت کروگے تو عذاب میں مبتلا ہوگے، یہ اختیار کا اظہار عقیدہ جبر کے بالمقابل ہے۔

آخر میں دوزخ کو آرام گاہ کہنا اس کے بعد والی آیت کے جوڑ پر ہے جس میں جنت کے لئے کہا گیا ہے حسنت مرتفقاً بہت اچھی ہے یہ آرام گاہ ورنہ ظاہر ہے کہ دوزخ آرام کی نہیں بلکہ تکلیف کی جگہ ہے[4]۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ إِنَّا لَا نُضِيْعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا عَلَى الْأَرَآئِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾

---

[1] ۔نزلت فی سلمان و ابی ذر و صہیب و عمّار و خباب و غیرھم من فقراء اصحاب النبی ﷺ (مجمع البیان)

[2] ۔صورته صورة الامر و المراد به التهديد (تبیان)

[3] ۔وعید من الله سبحانه و انذار لذلك عقبه بقوله: انا اعتدنا (مجمع البیان)

[4] ۔مرتفقا تمیز منقول من الفاعل ای قبح مرتفقا وهو مقابل لقوله الاتی فی الجنة : حسنت مرتفقا والا فایّ ارتفاق فی النار (جلالین)

''بلا شبہ وہ ایمان لائے اور نیک اعمال کے پابند رہے تو یقیناً ہم اکارت نہیں کریں گے اجر و ثواب کو اس کے جو اچھے اعمال کرے۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے ہمیشہ کی زندگی والے بہشتی ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی، اُنہیں پہنائے جائیں گے ان میں سونے کے کنگن اور سبز کپڑے سندس اور استبرق کے۔ ان میں مسندوں پر گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ہوں گے۔ کیا کہنا اس ثواب کا اور کتنی اچھی ہے یہ آرام گاہ''۔

بوقت نزولِ قرآن ملک عرب میں جو کپڑے بہت قیمتی تھے انہی کا نام لیا گیا ہے جس میں انتہائی دیدہ زیب لباس کی طرف ذہن کو منتقل کرنا منظور ہے۔

سندس اور استبرق کی تشریحات جو ہوئی ہیں [1] اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مختلف قسم کے باریک اور موٹے ریشم کے کپڑے ہوتے تھے اور اُن کی بناوٹ میں سونے کے تار بھی ہوتے تھے۔

چونکہ قرآن میں صراحت ہے بہشت ہر وہ چیز ہوگی جس کی خواہش ہو، اس لیے نعمات جنت کو نہ جنس طعام و شراب میں اُن چیزوں میں محدود سمجھنا چاہیے جن کے نام قرآن میں ہیں اور نہ ملبوسات میں اُن سے مخصوص سمجھنا چاہیے بلکہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے باشندوں کے لحاظ سے جس قسم کی طلب ہو، اسے مہیا کیا جانا لازمی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا
بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ
شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا
اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ
اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ
خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾

''اور پیش کیجیے ان کے سامنے مثال دو ۲ آدمیوں کی جن میں سے ایک کے ہم نے دو باغ قرار دیئے انگور کے اور ان دونوں کو گھیر دیا کھجوروں سے اور ان دونوں باغوں نے اپنے پھل دیئے اور اس میں کچھ بھی کمی نہیں کی اور ہم نے ان کے بیچ بیچ نہریں جاری کیں اور اس کی ملکیت میں بہت مقدار پھلوں کی تھی تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا جب کہ وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا کہ میں تم سے مال میں زیادہ اور آدمیوں کی تعداد میں بھی بڑھا ہوا ہوں اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اس حال میں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا تھا، اُس نے کہا مجھے نہیں گمان کہ یہ کبھی بھی مٹ جائے

[1] سندمارق من الدیبا ج واستبرق ما غلط منه وفی اٰیة الرحمن: بطا ئنها من استبرق (جلالین) من سندس واستبرق ای من الدیبا ج الرقیق والغلیظ وقیل انّ الاستبرق فارسی معرب وقیل هو الدیبا ج المنسوج من الذهب (مجمع البیان)

اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف پلٹایا گیا تو انجام کار اس سے بہتر پاؤں گا،،

ایک مالدار اور ایک غریب دو ساتھیوں کی باہم گفتگو

اس طرح کا تمثیلی انداز انجیل وغیرہ قدیم آسمانی کتب میں بہت زیادہ ہے قرآن مجید نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا ہے جو حقیقتوں کے ذہن نشین کرنے کا عمدہ ذریعہ ہے [۱] مگر جناب عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے دو ۲ شاہزادوں کی سرگزشت ہے جو وقوع میں آئی تھی اور تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے کہ وہ ایک مالدار صاحب جائداد اور اس کے غریب پڑوسی کا ذکر ہے۔ بہر حال جو مقصد تمثیل ہے، اس میں اس اختلاف نوعیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرۡتَ بِالَّذِىۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰٮكَ رَجُلًا ؕ﴿۳۷﴾ لٰـكِنَّا۟ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَكَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنۡ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنۡكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّىۡۤ اَنۡ يُّؤۡتِيَنِ خَيۡرًا مِّنۡ جَنَّتِكَ وَيُرۡسِلَ عَلَيۡهَا حُسۡبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصۡبِحَ صَعِيۡدًا زَلَقًا ۙ﴿۴۰﴾ اَوۡ يُصۡبِحَ مَآؤُهَا غَوۡرًا فَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

”کہا اس سے کے ساتھی نے اُس سے گفتگو کے دوران میں کیا تم کفر اختیار کرتے ہو اُس ذات کے ساتھ جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر تمہیں مرد کی صورت میں بنایا، رہا میں، تو وہ اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ شریک نہیں رہتا، اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو کہتے جو اللہ چاہے وہ ہوتا ہے، نہیں طاقت کسی کو سوا اللہ کے سہارے کے۔ اگر تم مجھے دیکھتے ہو کہ میں تم سے مال اور اولاد میں کم ہوں تو بہت ممکن ہے کہ میرا پروردگار مجھے تمہارے باغ سے بہتر عطا کردے اور اس (باغ) پر آسمان سے بجلیاں [۲] بھیج دے جس سے یہ صاف چکنی زمین [۳] ہو جائے یا اس کا پانی خشک ہو جائے تو پھر تم کسی طرح اُسے حاصل نہ کرسکو،،

---

[۱]۔ ضرب اللہ لعبادہ مثلا یستفیئہم بہ الی طاعتہ و یزجرھم عن معصیۃ و کفران نعمتہ (مجمع البیان)

[۲]۔ حسبانا جمع حسبانۃ ای صواعق (جلالین)

[۳]۔ زمین بے گیا لغزا انندہٴ پائے (شاہ ولی اللہ) زمین پھسلنی (شاہ رفیع الدین)

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

''اور گھیرے میں لے لیا گیا اُس کے پھلوں کو تو ہو گیا وہ اس عالم میں کہ ہاتھ ملتا تھا اُس دولت پر جو اُس نے اس باغ میں صرف کی اور وہ اپنی چھتوں کے ساتھ گرا ہوا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ شریک قرار نہ دیتا اور نہ تھی اُس کے لیے کوئی جماعت جو اُس کی مدد کرے اللہ کو چھوڑ کر اور نہ خود مدد حاصل کرنے کے قابل تھا۔ اب اس وقت ثابت ہو گیا کہ اختیار فقط اللہ کے لیے ہے جو ایک ثابت حقیقت ہے، وہی بہتر ہے باعتبار ثواب کے اور وہی بہتر ہے بلحاظ انجام کے،،

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''آخر اس کے باغ پر وہی ہوا جو اس نیک کی زبان سے نکلا تھا۔ رات کو آگ لگ گئی آسمان سے سب جل کر ڈھیر ہو گیا۔ مال خرچ کیا پونجی بڑھانے کو وہ اصل بھی کھو بیٹھا'' (موضح القرآن)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

''اور ان کے سامنے پیش کیجئے مثال دنیا والی زندگی کی کہ جیسے وہ پانی جسے ہم نے اوپر سے اتارا تو اس کے سبب سے زمین کے نباتات (کثرت کی وجہ سے) ایک دوسرے میں کلابتو ہو گئے [۱] اس کے بعد وہ چورا چورا ہو گئے کہ ہوائیں انہیں ادھرادھر اڑا رہی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

''مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تمہارے پروردگار کے یہاں ثواب لے لحاظ سے اور بہتر ہیں آسرے کی حیثیت سے''۔

---

[۱]۔ فالتفّ بعضه ببعض حسنا و غضاضة (تبیان و مجمع البیان)

ان آیات میں مال اور اولاد زندگی کی رونق لیکن مآل کی اُمید اعمال سے کا ذکر آیا ہے

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿٤٧﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾

''اور وہ دن کہ جب ہم پہاڑوں کو متحرک بنا دیں گے اور دیکھو گے زمین کو کھلا ہوا صاف اور ان سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑا نہیں ہوگا اور وہ پیش کئے گئے ہوں گے تمہارے پروردگار کے سامنے قطار باندھے ہوئے تم ہمارے پاس آئے ہو اسی طرح جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ہاں تم نے گمان ایسا کیا تھا کہ ہم ہرگز تمہارے لئے کوئی وعدہ گاہ قرار نہ دیں گے''۔

دیکھو گے زمین کو کھلا ہوا صاف یعنی نہ اس پر کوئی عمارت ہوگی نہ درخت نہ پہاڑ[1] دوسری ان الفاظ میں ارشاد کیا ہے کہ: ''فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ '' چٹیل میدان جس میں کوئی کجی اور ابھار کہیں نظر نہ آتا ہوگا (طٰہٰ:۱۰۶۔۱۰۷)

اس طرح جیسے پہلے پیدا کیا تھا یعنی بالکل بے کسی اور بے بسی کے عالم میں[2] اور پھر لباس اور سامان زینت سے بالکل بے بہرہ[3] جیسے اس دن تھے کہ جب پہلی دفعہ دنیا میں آئے تھے۔

علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں دونوں مفہوم دو اقوال کی صورت میں درج کئے ہیں۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾

''اور زمانہ عمل[4] رکھ دیا گیا ہوگا تو گناہگاروں کو پاؤ گے خوف زدہ اس سے کہ جو اس کے اندر ہے اور کہتے ہوں گے وائے برحال ما، یہ کسی تحریر ہے کہ جو چھوٹی اور بڑی کسی بات کو نہیں چھوڑتی بغیر اس کے کہ اس پر حاوی ہو اور انہوں نے جو کچھ عمل کیا تھا اسے سامنے موجود پایا اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا''۔

قرآن مجید نے طرح طرح اللہ کے افعال میں عدل کے لازمی ہونے کا اعلان کیا ہے مگر اہل سنت کی اکثریت نے بلا وجہ سے اصول

---

[1] ۔ای ظاھرۃ لیس علیہا شیء من جبل او بناء او شجر یترھا عن عیون الناظرین (مجمع البیان)
[2] ۔یعنی جئتم الی الوضع الذی لا یملك الامر فیہ الا اللہ کما خلقنا کم اول مرۃ لا تملکون شیئا (تبیان)
[3] ۔ای فرادیٰ صفاۃ عراۃ عزلاء (جلالین)
[4] ۔یعنی الکتب التی فیہا اعمالھم مثبتۃ (تبیان)

دین سے خارج کررکھا ہے اس لئے ان آیات کی تشریح میں بڑی زحمت ومشقت اٹھانا پڑتی ہے ایک طرف اپنے تصورات کا دباؤ ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے وہ جو چاہے کرے اور دوسری طرف خداوند عالم جزاء وغیرہ کو بقدر عمل دینے میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ ظلم نہیں کیا کرتا اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ظلم ہوتا۔ مثلاً نیکوکاروں کو جزاء کے بجائے، سزا دیتا تو ظلم ہوتا، بداعمالوں کو ان کے استحقاق سے زیادہ سزا دیتا توظلم ہوتا، بغیر کسی جرم کے کسی کو سزا دیتا تو ظلم ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ قرآن مجید کے آیات اصول اشعریت کو منہدم کرنے والے ہیں مگر انہیں تو اپنی بات نباہنا ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

رب جو کرے ظلم نہیں سب اس کا مال ہے ہر ظاہر میں جو ظلم نظر آتا ہے وہ بھی نہیں کرتا، بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا اور جو کوئی کہے گناہ میں ہمارا کیا اختیار۔ سو یہ بات نہیں، اپنے دل سے پوچھ لے، جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے اور جو کوئی کہے قصد بھی اسی نے دیا۔ سو قصد دونوں طرف لگ سکتا ہے اور جو کہے اس نے ایک طرف لگایا۔

سو بندے کی دریافت سے باہر ہے بندے سے معاملت ہے، اس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑے گا اسے جو اس سے بدی کرے نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور؟ اللہ نے کروایا (موضح القرآن) دیکھتے ہیں آپ اس ژولیدہ بیانی کو؟

قرآن تو بعض باتوں کو صاف کہتا ہے کہ ایسا ہو تو ظلم ہوتا خدا ظلم قرار پاتا اور خدا ظلم سے بری ہے اس لئے وہ ایسا نہیں کرتا اور آپ کہتے ہیں جی نہیں جو بھی وہ کرے وہ حقیقت میں ظلم نہیں ہوگا لیکن ظاہر میں ظلم نظر آئے گا یعنی غلط طور پر اس لئے خدا وہ بھی نہیں کرتا۔

پھر وہاں آ کر قصد کو خدا ہی تو ایک طرف لگاتا ہے آپ کہتے ہیں کہ ہے تو ایسا ہی مگر یہ بندے کی دریافت سے باہر ہے اس لئے بندے سے معاملت ہے اس کی سمجھ پر گویا اس بندے کی بے وقوفی سے اللہ فائدہ اٹھاتا ہے کہ تو اپنے کو غلط طور پر ذمہ دار سمجھتا ہے تو لے، میں تجھے سزا بھی دیئے دیتا ہو حالانکہ واقعاً تو بے قصور ہے وہ تو سب میرا کیا ہوا ہے۔

افسوس اپنی بات نباہنے کے لئے کتنے صاحبانِ علم بے علمی سے اور کیسے سمجھدار لوگ ناسمجھی سے کام لیتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝٥٠

”اور جب کہا ہم نے فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوا ابلیس کے۔ وہ جنات میں سے تھا تو اس نے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی تو کیا تم لوگ اسے اور اس کی اولاد کو حوالی موالی بناؤ گے مجھے چھوڑ کر؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں، کیا بُرا بدل ہے یہ ظالموں کے لئے“۔

شیطان کا جنّات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود

یہ آدم کا قصہ حکم سجدہ اور ملائکہ کی اطاعت اور ابلیس کی نافرمانی یہ سب تو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مذکور ہے مگر یہاں جو ایک بڑا

اہم اضافہ ہے وہ یہ ہے کہ:

کان من الجن ففسق عن امر ربہ۔

وہ جنات میں سے تھا تو اس نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔

بعض لوگوں نے خواہ مخواہ جن کے لفظ کو معنی لغوی ''پوشیدہ'' یعنی آنکھ سے چھپی ہوئی مخلوق کے معنی میں قرار دے کر فرشتوں پر بھی حاوی کر دیا ہے مگر میرے خیال میں یہاں فرشتوں کے ذکر کے بعد خصوصیت کے ساتھ ابلیس کو کہنا کہ وہ جن سے تھا اور پھر ''ف'' کے ساتھ جس کے معنی فارسی اور پرانی اردو میں پس کے کہے جاتے تھے اور اب ہم اس کا ترجمہ تو کے ساتھ کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ جن ملائکہ سے علیحدہ ایک خاص نوع ہے اور قرآن مجید کا درمیان میں یہ صراحت کرنا، درحقیقت اس شبہ کے دفعیہ کے لئے ہے کہ فرشتے تو ہواؤ وہوس سے بری ہونے کی وجہ سے طبعاً معصوم ہوتے ہیں۔ پھر ابلیس سے یہ سرطابی ہوئی ہی کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ درحقیقت فرشتہ تھا ہی نہیں بلکہ جنات میں سے تھا اور اسی بنا پر اس سے یہ نافرمانی سرزد ہوئی اور اس بنا پر پہلے پارے میں جو اس واقعہ کے ذکر میں ابی واستکبر کے ساتھ **وکان من الکفرین** ہے اس کا مطلب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ ''اس نے انکار کیا اور تکبّر سے کام لیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے'' یعنی اس جماعت میں سے تھا کہ جو پہلے زمین میں کفر اور سرکشی کر چکی تھی اور یہ ایک اپنے انفرادی نیکوکاری کے حق کی بنا پر اس عذاب سے بچ گیا تھا جو اس جماعت پر نازل ہوا۔ اب سجدہ آدم کے سوال پر اس کی وہ طبیعت کفر وسرکشی ابھر آئی اور سجدہ آدم سے انکار کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

''کیا برا بدل ہے ظالموں کے لئے'' کہ وہ اطاعت خالق کے بدلے پیروی شیطان کرتے ہیں۔ [۱]

مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ اَنۡفُسِهِمۡ‌ ۖ وَمَا كُنۡتُ مُتَّخِذَ الۡمُضِلِّيۡنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

''میں نے انہیں سامنے کھڑا نہیں کیا تھا آسمان اور زمین کے پیدا کرتے وقت اور نہ خود ان کی خلقت کے وقت اور میں ایسا نہیں ہوں کہ گمراہوں کو اپنا دست وباز و بناؤں''۔

سامنے کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں ضرورت نہیں تھی کہ ہم اپنے کاموں میں مدد کے واسطے انہیں بلائیں [۲] اور ہوسکتا ہے کہ صرف اسرار کائنات سے ان کی ناواقفیت کا اظہار ہو مگر آیت کا تتمہ پہلے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ [۳]

وَيَوۡمَ يَقُوۡلُ نَادُوۡا شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ فَدَعَوۡهُمۡ فَلَمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَهُمۡ وَجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّوۡبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ النَّارَ فَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ مُّوَاقِعُوۡهَا وَلَمۡ

---

[۱] معناہ بئس ما لستبدلوا بعبادہ ربّھم و اطاعوا ابلیس عن الحسن و قیل بئس البدل طاعۃ الشیطان من طاعۃ الرّحمٰن عن قتادۃ (مجمع البیان)

[۲] قیل معناہ ما اشھدتھم مستغنا بھم (تبیان)

[۳] ھٰذا اخبار عن کمال قدرتہ و استغنائہ عن الاعوان و الانصار و یدل علیہ قولہ و ما کنت متّخذ الضلّین عضدا (مجمع البیان)

يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

''اور وہ دن جب وہ کہے گا کہ پکارو میرے ان شریکوں کو جو تمہارے زعم ناقص میں تھے اس پر انہوں نے پکارا تو انہوں نے ان کی صدا پر لبیک نہ کہی اور ہم نے قرار دیا ان کے درمیان تباہی کا سامان اور دیکھا گنہگاروں نے آگ کو تو اب جانا کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہیں پایا انہوں نے اس سے دوری کا کوئی طریقہ''۔

موبقا کے لفظ کے معنی بعض تفاسیر میں جہنم کی ایک وادی کے نام کے طور پر کہے گئے ہیں[1] مگر اس کے ثبوت کے لئے حدیث کی ضرورت ہے، اس لئے لغوی معنی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے تباہی کا سامان جو بعض تفاسیر کے مطابق ہے۔[2]

تیسری تشریح یہ ہے کہ خندق آگ سے بھری'' (موضح القرآن)

مگر اس کے لئے بھی ثبوت کی ضرورت ہے۔

ایک چوتھی تفسیر اس کی جو ہماری قدیم تفسیر نے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے معنی پردہ کے ہیں۔[3]

یہ معنی الفاظ قرآنی سے کچھ زیادہ سمجھ میں آتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین اور ان شرکاء کے درمیان ہم نے ایک بڑا پردہ قرار دیا ہے کہ نہ وہ ان کی بات سنتے ہیں اور نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

فَظَنُّوْٓا کے لفظی معنی تو ہیں گمان کیا مگر قرآن میں بہت جگہ ظن کا لفظ علم کے معنی میں آیا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔[4]

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

''اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے طرح طرح سے ہر چیز کی مثال پیش کیا اور انسان جھگڑا کرنے میں ہر چیز سے زیادہ ہے۔

پہلا جملہ تھوڑا سے فرق الفاظ کے ساتھ یا بالکل ایسے ہی الفاظ میں متعدد جگہ قرآن میں آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہم نے ایک ہی بات کو بار بار مختلف طریقوں اور گونا گوں مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے[5] اب یہاں آخری فقرہ کا مطلب یہ ہوگا کہ باوجود اتنے انتظام و اہتمام کے آدمی ہے کہ کسی طرح نہیں مانتا اور طرح طرح کی مین میخیں نکالتا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ

---

[1] ۔ واديا من اودية جهنّم يهلكون فيها جميعا (جلالين) یعني وادی از وادیهائے دوزخ تا بکی بدیگری نتواند رسید (فتح الرحمٰن)

[2] ۔ مهلكا (تبيان) کریں گے ہم درمیان ان کے جائے ہلاکت (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ موبقا ای سترا (علی بن ابراهيم)

[4] ۔ ای علموا فهذا ظن يقين (علی بن ابراهيم) ای ايقنوا (جلالين)

[5] ۔ فقال المعانی فی الجهات المختلفة فی هٰذا القراٰن فتصريف المثل فيه تنقيله فی وجوه البيان علٰی تمكين الافهام (تبيان)

تَأۡتِيَهُمۡ سُنَّةُ الۡاَوَّلِيۡنَ اَوۡ يَاۡتِيَهُمُ الۡعَذَابُ قُبُلًا ۝۵۵ وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِيُدۡحِضُوۡا بِهِ الۡحَقَّ وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَمَاۤ اُنۡذِرُوۡا هُزُوًا ۝۵۶

''اور نہیں مانع ہوا ان لوگوں کو اس سے کہ وہ ایمان لائیں جب کہ ان کے پاس ہدایت آئی اور طلب مغفرت کریں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سوا اس انتظار کے کہ آئے ان کے سامنے اگلے لوگوں کا طریقہ یا ان کے پاس منہ در منہ عذاب آئے اور ہم نہیں بھیجتے پیغمبروں کو سوا خوش خبری دینے والے اور (عذاب سے) ڈرانے والے کے اور جو کافر ہیں وہ غلط دلائل سے بحث کرتے ہیں تا کہ ان سے حق کو شکست دیں اور انہوں نے بنا لیا میری آیات کو اور جو انہیں ڈرایا گیا مذاق''۔

اگلے لوگوں کا طریقہ کیا مطلب؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

یعنی کچھ اور انتظار نہیں مگر یہ کہ پہلوں کی طرح ہلاک ہوویں یا قیامت کا عذاب آنکھوں سے دیکھیں (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

هی الا هلاك المقدّر علیهم

یعنی وہ ہلاکت جو ان کی تقدیر میں لکھی ہے۔

شیخ الطائفہ تحریر فرماتے ہیں:

من مجیئ العذاب من حیث لا یشعرون او مقابلة من حیث یرون (تبیان)

یعنی پہلوں کے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ عذاب اچانک آئے اس طرح کہ انہیں خبر نہ ہو یا اس طرح سامنے آئے کہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

علامہ طبرسیؒ تقریباً یہی الفاظ لکھتے ہیں۔[1]

اب یہ کہ انہیں ایمان سے مانع صرف یہ انتظار ہے کہ ان پر عذاب ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک سے آئے اس کی تشریح میں علامہ طبرسی فرماتے ہیں کہ:

یہ بطور استعارہ کے ہے یعنی وہ ایمان نہ لانے میں ایسے ہیں جیسے کسی کو انتظار ہو کہ عذاب آئے خواہ اس طرح یا اس طرح، دوسری جگہ کہا گیا ہے:

لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ۝۲۰۱ (شعراء)

---

[1] من تأتیهم العادة فی الاوّلین من عذاب الاستیصال حیث اتاهم العذاب من حیث لا یشعرون او طلب ان یأتیهم العذاب عیانا مقابلة من حیث یرونها (مجمع البیان)

وہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

حالانکہ یہ وقت وہ ہوتا ہے کہ پھر ایمان لانا سودمند نہیں ہوتا۔

اور پھر مشرکین نے جیسا کہ قرآن مجید میں اور جگہ ہے فرمائشیں بھی ایسی کی تھیں مثلاً

اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٢﴾ (انفال)

خداوندا! اگر یہ تیری طرف سے آئی ہوئی واقعی حقیقت ہے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے یا ہماری طرف لا کوئی (اور) بڑا دردناک عذاب۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٥٧﴾

"اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جسے نصیحت کی جائے اس کے پروردگار کی آیات کے ساتھ تو وہ ان سے رو گردانی کرے اور بھول جائے اسے کہ جو اس کے ہاتھوں ہو چکا ہے، بلاشبہ ہم نے ان کے دلوں پر ڈال دیے ہیں پردے اس سے کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی کر دی ہے اور اگر نہیں ہدایت کی طرف بلایئے تو اس وقت میں وہ ہدایت قبول نہ کریں گے کبھی"۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿٥٨﴾

"اور آپ کا پروردگار بڑا بخشنے والا ہے، رحمت والا اگر وہ انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں گرفت کے اندر لے تو ابھی بھیج دے ان پر عذاب مگر ان کے لئے ایک وعدہ کا دن مقرر ہے کہ نہیں پائیں گے اس سے اور کوئی جائے پناہ"۔

"وعدہ کا دن" یعنی قیامت کہ اصل مکافات عمل کا دن وہ ہے۔[1]

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿٥٩﴾

"اور یہ ہیں وہ بستیاں جنہیں ہم نے تہس نہس کر دیا جب کہ ان لوگوں نے ظلم وستم سے کام لیا اور قرار دی ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے ایک مقررہ معیاد"۔

ظاہر ہے کہ ظلم کا ارتکاب بستیوں کے باشندے کرتے ہیں اور ہلاک بھی وہی کئے جاتے ہیں نہ کہ وہ بستیاں۔ اس لئے بعد میں ضمیریں

---

[1] ـ هو يوم القيامة والبعث (مجمع البيان)

سب جمع مذکر غائب کی لائی گئی ہیں جوان بستیوں کے باشندوں کی طرف راجع ہیں۔[1]

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾

''اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان (ساتھی) سے کہ میں سفر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ پہونچوں اس جگہ جہاں دوسمندر اکٹھا ہوتے ہیں یا مجھے مدتیں گزر جائیں اس سفر میں''۔

حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد

یہاں سے جناب موسیٰ اور خضرؑ کا واقعہ شروع ہوتا ہے۔ یہ سفر کیوں شروع ہوا تھا؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں کہہ دیا کہ میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ صاحب علم ہوں یہ ایک طرح کا ترک اولیٰ تھا جس پر ان کی تنبیہ کے لئے انہیں جناب خضرؑ کے محل قیام کے طرف بھیجا گیا۔[2]

یہ جوان کون تھے؟ تفسیر جلالین میں ہے:

یوشع بن نون و کان تبعه و یخدمه ویأخذ منه العلم

یہ یوشع بن نون تھے جوان کے پیچھے پیچھے رہتے تھے اور خدمت کرتے تھے اور ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

مگر جناب شیخ الطائفہ نے فرمایا ہے کہ اس میں دو ۲ قول ہیں، ایک تو یہی ہے کہ وہ یوشع بن نون تھے اور دوسرا یہ ہے کہ یوشع کے فرزند تھے (تبیان)

مگر زیادہ تر مفسرین پہلے قول سے متفق ہیں۔[3]

شاہ عبد القادر نے لکھا:۔

''یہ جوان فرمایا یوشعؑ کو۔ حضرت موسیٰ کے خادم خاص تھے، پیچھے، ان کے روبرو پیغمبر ہوئے اور ان کے بعد خلیفہ ہوئے،، (موضع القرآن)

کاش شاہ صاحب موصوف یہ بھی بتادیتے کہ خلافت خدا اور رسول ﷺ کے تقرر سے ہوئی تھی، یا جمہوریت کے اجماع یا شوریٰ سے؟

دونوں دریا کون تھے؟ اس لیے تفسیر جلالین میں ہے:۔

ملتقی بحر الروم وبحر فارس فیما یلی المشرق

مشرق کی سمت سے متصل جہاں دریائے روم اور فارس کا سنگم ہے۔

---

[1]۔ لانّ القریة هی المسکن نحو المدینة و البلدة و هی لا تستحق الهلاك و انّما یستحقّ الهلاك اهلها۔ (مجمع البیان)

[2]۔ سعید بن جبیر عن ابن عباس قال اخبرنی ابی بن کعب قال خطبنا رسول الله ﷺ فقال انّ موسیٰ قام خطیبا فی بنی اسرائیل فسئل ایّ النّاس اعلم فقال انا فغضب الله علیه (مجمع البیان)

[3]۔ اکثر المفسرین علیٰ انه موسیٰ بن عمران و فتاه یوشع بن نون (مجمع البیان)

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا
جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ
اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ
اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا
عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

''تو جب دونوں ان دونوں سمندروں کے یکجا ہونے کی جگہ پر پہونچے تو وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے تو اس نے دریا میں ایک سرنگ کی صورت سے اپنا راستا بنا لیا۔ اب جب وہ دونوں آگے بڑھے تو اُنہوں نے اپنے ساتھ والے جوان سے کہا کہ لاؤ ہمارا ناشتہ۔ ہمیں تو اپنے سفر میں بڑی مشقت اٹھانا پڑی۔ اُنہوں نے کہا کیا آپ نے دیکھا تھا جب ہم ایک چٹان کی پناہ لیے ہوئے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا اور نہیں بھولایا مجھے اس کے ذکر کو مگر شیطان نے اور اس نے عجیب طریقہ سے راستا دریا میں بنالیا، کہا یہ ہی تو منزل ہے وہ جس کے طلب گار تھے تو وہ پلٹے اپنے نقشِ قدم کو ڈھونڈتے ہوئے تو اُن دونوں نے پایا ہمارا بندوں میں سے ایک بندہ کو جسے ہم نے اپنی طرف سے خاص رحمت کے ساتھ نوازا اور اُسے ہم نے اپنی طرف سے علم عطا کیا،،

حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد

جو لوگ مظاہر قدرت کی اعجوبہ آفرینی کے منکر ہیں، وہ معلوم نہیں ان آیات کے کیا معنی کہتے ہیں؟ لیکن قرآن صاف طور پر اس واقعہ کو عجیب کہہ کے بیان کر رہا ہے۔ اس لیے اُسے عجیب تو ماننا ہی پڑے گا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''وہاں پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سورہے اور یوشع دریا سے وضو کرنے لگے۔ انکی مچھلی زندہ ہوکر دریا میں نکل پڑی اور پانی میں بیٹھ گئی۔ وہاں طاق سا کھلا رہ گیا، ان کو دیکھ کر تعجب ہوا، چاہا کہ جب موسیٰؑ جاگیں تب ان سے کہیں۔ وہ جاگے تو دونوں آگے چل کھڑے ہوئے۔ یہ کہنا بھول گئی،، (موضح القرآن)

صورت واقعہ میں اصل بھول جناب یوشعؑ کی ظاہر ہوتی ہے۔ معیت کی بنا پر اُس کی نسبت دونوں کی طرف دی گئی:

آخر میں جناب موسیٰؑ کا یہ کہنا ہے کہ 'یہی تو وہ منزل ہے جس کے ہم طلب گار تھے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ خالق کی طرف سے اس ہستی کے جائے قیام کا جس سے ملاقات کے لیے حضرت موسیٰؑ کے لیے جارہے تھے، پتہ یہی دیا تھا اور شاید یہ علامت بتائی گئی تھی کہ جس جگہ کو چیز تمہاری

نذرطاقِ نسیاں ہوجائے، وہیں وہ شخص ملے گا جس کی طلب میں ہم تم کو بھیج رہے ہیں۔[1]

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْــَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾

''ان سے موسیٰ نے کہ کہا کہ کیا میں آپ کا پیرو ہوں اس اقرار پر کہ آپ اُس علم سے جو آپ کو ملا ہے مجھے بھی صحیح راستے کی تعلیم دیجئے انہوں نے کہا تم میرے ساتھ صبر و برداشت سے کام نہیں لے سکو گے اور کیوں کر تم صبر و تحمل سے کام لو گے اس چیز پر جو تمہارے اطلاع کے دائرہ میں نہیں ہے انہوں نے کہا عنقریب اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر و تحمل کرنے والوں میں پائیے گا۔ اور میں کسی بات میں آپ کی عدول حکمی نہ کروں گا۔ انہوں نے کہا اچھا اگر تم میرے پیرو بنتے ہو تو مجھ سے کسی بات کا پوچھنا نہیں۔ جب تک میں خود اس کا تذکرہ تم سے نہ چھیڑوں۔

حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی ابتدائی گفتگو

حضرت خضرؑ کا قول کہ ''صبر و برداشت سے کام نہ لے سکو گے'' قدرت کی نفی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ان افعال کی تہہ تک نہ پہنچنے کی بنا پر انہیں غلط سمجھ کر بالارادہ ان پر اعتراض کرنا ان کا جناب خضرؑ کے نزدیک یقینی تھا جیسا کہ بعد میں وقوع میں آیا اور یہ اس بنا پر تھا کہ حضرت موسیٰؑ اسباب ظاہری پر عمل کرنے ہی کا منصب رکھتے تھے اور جناب خضرؑ خاص طور پر اللہ کی جانب سے باطنی حقیقتوں کے علم کے حامل اور اس کے تقاضا پر عمل کے پابند بنائے گئے تھے۔[2]

غالباً یہی اس حدیث کا مقصد ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی وارد ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا معیار علم وہ تھا جو الواح توریت میں قلم بند تھا اور جناب خضرؑ کو وہ علم عطا ہوا تھا جو توریت میں نہیں تھا۔[3]

آغاز سفر اور خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینا

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ

---

[1]۔ قال قتادة قیل لموسیٰ علیہ السلام ایة لقیاك ایاه ان تنسیٰ بعض متاعك (تبیان)

[2]۔ انّما قال له ذٰلك لانّ موسیٰ کان یاخذ الامر علیٰ ظواهرها و الخضر کان یحکم بها علمه الله من بواطن الامر فلا یسهل علیٰ موسیٰ مشاهدة ذٰلك (تبیان)

[3]۔ قال الصّادق علیہ السلام کان عنده علم لم یکتب فی الالواح و کان موسیٰ یظنّ انّ جمیع الاشیاء الّتی یحتاج الیها فی تابوته و انّ جمیع العلم ما کتب له فی الالواح. (مجمع البیان)

لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا
تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا
غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

تو وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب کشتی پر بیٹھے تو انہوں نے اس میں سوراخ کر دیا انہوں نے کہا کیا آپ نے اس میں سوراخ کر دیا اس لئے کہ آپ اس کے بیٹھنے والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے بڑی سنگین بات کی انہوں نے کہا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر و تحمل سے کام نہیں لو گے۔ مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے ایسی بات پر جو مجھ سے بھولے سے ہوا اور نہ کیجے مجھ پر میری اس بات پر زیادہ سختی اس کے بعد پھر دونوں آگے بڑھے یہاں تک کہ جب ان دونوں کو ایک لڑکا ملا تو ان صاحب نے اسے قتل کر دیا۔ انہوں نے کہا کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی دوسری جان کے بدلے قتل کر دیا آپ نے بہت بُرا کام کیا۔

پھر دونوں آگے بڑھے یعنی کشتی سے اترے اور اب خشکی پر روانہ ہوئے۔ [ا]

ان آیات میں آغاز سفر اور خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینے کا ذکر آیا ہے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ
شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

''انہوں نے کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر و تحمل نہیں کر سکو گے؟ یہ کہنے لگے کہ اگر اس کے بعد اب میں کسی چیز کے متعلق آپ سے پوچھوں تو مجھے اپنی صحبت میں نہ رکھیے گا، بے شک آپ پہنچ گئے ہیں میری طرف سے معذوری کی حد تک؟

باتیں جو آنکھوں کے سامنے آتی تھیں، وہ تاب صبر باقی نہیں رکھتی تھیں اور بے ساختہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اٹھتے تھے۔ پہلی مرتبہ انہوں نے بھول کا عذر کیا اور ایک دفعہ کی بھول پر معافی کی درخواست کی کہ اگر اس دفعہ آپ نے مجھے اپنی صحبت سے جدا کر دیا تو یہ بڑی سختی ہوگی۔ گویا اس دفعہ کی معافی کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے مگر جب پھر ایسا ہی ہوا تو اب لجاجت کا انداز پیدا ہو گیا اور اب یہ اقرار کر لیا کہ بس اس دفعہ اور معاف کر دیجئے۔ اس کے بعد پھر اگر ایسا ہو تو آپ مجھ سے علیحدگی اختیار کر لیجئے گا۔'' آپ معذوری کی حد تک پہنچ جائیں گے یعنی میرے لئے عذر کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں جن سے مقصود ممکن ہے یہی ہو مگر یہ الفاظ بظاہر ادائے مطلب سے قاصر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''پوچھنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھول کر ہوا اور دوسرا اقرار کرنے کو اور تیسرا رُخصت کو'' (موضح القرآن)

[ا] ۔معناہ فخرجا من البحر فانطلقا یمشیان فی البرّ (مجمع البیان)

ان الفاظ سے ایسا پتہ چلتا ہے جیسے دوسرا اور تیسرا پوچھنا بھول کر نہیں بلکہ ارادۃً تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جان کر ایسی صورت پیدا کر رہے تھے کہ انہیں ساتھ چھوڑنا پڑے مگر ظاہر ہے کہ قرآنی انداز بیان اس کے مطابق نہیں ہے جب کہ اتنی زحمت ومشقت کے ساتھ وہ انتہائی ذوق سے جناب خضر علیہ السلام سے استفادہ علمی کرنے کے آئے تھے اور اس کے لئے اقرار کیا تھا کہ وہ کچھ پوچھیں گے نہیں تو پھر وہ اب جان کر ایسی صورت کیوں پیدا کرتے کہ ان کا ساتھ چھوٹ جائے؟

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۷۸

”اس کے بعد دونوں آگے بڑھے یہاں تک کہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے جہاں کے باشندوں سے انہوں نے کچھ کھانے کے لئے مانگا تو انہوں نے انکار کیا اس سے کہ وہ اُن کی مہمان داری کریں تو انہوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرا چاہتی تھی .... اُسے بنا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ چاہتے تو اس کام کا کچھ معاوضہ لے لیتے، انہوں نے کا بس اب میری اور تمہاری جدائی ہے۔ اب میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر وتحمل سے کام نہ لے سکے“۔

جنہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا ان کے یہاں کی دیوار کی بلا معاوضہ تعمیر:

سابق میں شاہ عبدالقادر کے کلام سے ضمنی طور پر جو مفہوم پیدا ہوا تھا، اُسے اُنہوں نے یہاں صاف ظاہر کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

”اب کے موسیٰ علیہ السلام نے جان کر پوچھا رخصت ہونے کو، یہ سمجھ لیا کہ یہ عالم میرے ڈھب کا نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم وہ تھا جس میں پیروی کرے خلق تو اُن کا بھلا ہو۔ حضرت خضر علیہ السلام کا علم وہ کہ دوسرے کو اُس کی پیروی ہی نہ آوے“۔ (موضح القرآن)

حالانکہ وہ اگر اس ارادہ سے پوچھتے تو وہ یہ کہتے کہ بس جناب! اب مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا ہے لیکن ایسا نہیں ہے، انہوں نے تو جیسے پہلے اعتراض کیا تھا، حسب عادت اب بھی ساختہ اعتراض کر دیا۔ اس پر اُن کے اس سے پہلے اس اقرار کے مطابق کہ اگر اب ایسا ہو تو مجھ الگ کر دیجیے گا، جناب خضر علیہ السلام نے کہا کہ بس اب میری اور تمہاری جدائی ہے۔

پھر یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ان افعال کو ایک بلا وجہ کا یا غلط کام سمجھ رہے تھے چنانچہ پہلی دفعہ صاف کہا: لقد جئت شیئاً امراً ”یہ آپ نے برا کام کیا“ دوسری دفعہ کہا: لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ”آپ نے بری بات کی ہے“ تیسری دفعہ اُن کے عمل کو بلا وجہ کی زحمت سمجھ رہے تھے تو ابھی ان افعال کے علمی پہلوؤں کا اندازہ کہاں ہوا تھا جو وہ سمجھتے کہ یہ علم ان کے ڈھب کا نہیں ہے۔ علم کا پہلو تو اُس کے بعد نمایاں ہوا ہوا ہے جب حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ان تمام افعال کے وجوہ واسباب بتائے۔ اس کے بعد جناب موسیٰ علیہ السلام یہ طے کر سکتے تھے کہ یہ علم اُن کے ڈھب کا

ہے یا نہیں۔

پھر اگر وہ اس علم کو اپنے لئے بے کار سمجھ لیتے تو خالق کا وہ مقصد جو اس سفر کے کرانے سے تھا کہ اُنہیں محسوس ہو کہ مجھ سے بڑھ کر عالم اس روئے زمین پر موجود ہیں، پورا کیوں کر ہوتا۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ
وَرَاءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ
فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ
زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ
تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا
وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۚ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ
مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

''وہ کشتی تھی، وہ کچھ غریبوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے تو میں نے چاہا کہ اُسے ناقص بنا دوں اور اُدھر ایک بادشاہ ہے جو ہر (ثابت) کشتی پر زبردستی قبضہ کر لیتا ہے اور وہ جو لڑکا تھا اس کے ماں باپ مومن ہیں تو ہمیں خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اُن دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا تو ہم نے چاہا کہ اُن کا پروردگار انہیں بدلے میں اس کے عطا کرے ایک ایسا لڑکا جو اس سے بہتر ہو پاکیزگی میں اور اس سے بڑھ کر صبر و محبت میں اور وہ دیوار جو تھی تو وہ اس شہر کے دو ۲ یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ایک دفینہ تھا اُن دونوں کے لئے اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔ تو تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی منزل تک پہنچیں اور خود نکالیں اپنے دفینہ کو، تمہارے پروردگار کی مہربانی سے اور یہ میں نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ ہے وضاحت اُس کی جس پر صبر و تحمل نہ کر سکے''۔

جناب خضر علیہ السلام کی طرف سے حقیقتوں کا اظہار

''یہ میں نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا'' گزشتہ تمام باتوں سے متعلق ہو سکتا ہے۔[1] یعنی یہ تمام اعمال میرے بحکم الٰہی تھے اور اس کے بعد یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کی جان کیوں لی؟ میں نے کبھی کبھی اُس کے جواب میں کہا کہ ملک الموت تو ہر لحظہ کتنوں کی جان لے لیا کرتے ہیں۔

[1] ای ما ذکر من خرق السفینۃ وقتل الغلام واقامۃ الجدار (جلالین)

اصل یہ ہے کہ جو خالق جان ہے، وہ اپنی حکمت و مصلحت کی بناء اس جان کا علاقہ اس جسم سے قطع کرتا ہے تو کسی کو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے، جیسے ملک الموت اُس کی مشیت کی تکمیل کا ذریعہ ہوتے ہیں ویسے ہی جناب خضر علیہ السلام مشیت الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ تھے اس میں کسی کو چوں و چرا کا کیا حق ہے!

اور اگر یہ فقرہ بس آدمی جزیعنی دیوار بنانے سے متعلق ہو تو اس فقرہ کا مطلب یہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے:

''یعنی جو کام خدا کے حکم سے ہو اور اس کا کرنا ضروری ہو، اُس پر مزدوری نہیں ملتی'' (موضح القرآن)

قرآن مجید کی لفظ موسیٰ علیہ السلام سے عام معلومات کی بناء پر تصور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام ہی کا ہوتا ہے مگر جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ بن عمران نہیں بلکہ بنی اسرائیل میں ایک اور بزرگ موسیٰ بن میشا تھے۔ یہ واقعہ ان سے متعلق ہے۔ اس قول کے نقل کے بعد لکھا ہے: واللہ اعلم بذلك۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قول ایسا نہیں ہے جو بالکل نا قابل لحاظ ہو بلکہ اس کی وجہ سے شخصیت کسی حد تک مشتبہ ہو جاتی ہے مگر علامہ طبرسیؒ نے ابن اسحاق کے حوالہ سے اس کی نسبت اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی طرف دی ہے اور خود اس سے اختلاف کیا ہے اُسی تبادر کی بناء پر جسے ہم نے لکھا ہے۔[1]

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۸۳

''اور وہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرتے ہیں، کہیے کہ میں ابھی ان کا کچھ تذکرہ تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں''۔

قصۂ ذوالقرنین کی ابتداء:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''یہ بھی یہود کے سکھانے سے مکّہ کے لوگ پوچھتے تھے پیغمبر کے آزمانے کو جیسے اصحاب کہف کا احوال۔ اس بادشاہ کو ذوالقرنین کہتے ہیں، اس واسطے کہ دنیا کے دونوں سروں پر پھر گیا تھا مشرق اور مغرب پر بعضے کہتے ہیں یہ لقب سکندر کا ہے، بعضے کہتے ہیں کہ کوئی بادشاہ پہلے گزرا ہے'' (موضح القرآن) تفسیر جلالین میں ہے: اسمه الا سکندر ولم یکن نبیا: اس کا نام سکندر ہے اور پیغمبر نہ تھا۔

''ذوالقرنین کے ساتھ وجہ تسمیہ میں شاہ صاحب نے جو لکھا ہے، یہ ایک قول ہے جسے جناب شیخ الطائفہؒ نے پانچ قولوں کے آخر میں درج کیا ہے، پہلے چار قول یہ ہیں:

(۱) ان کے سر پر دو سینگوں کی شکل والی ایک چیز تھی۔

(۲) ان کے سر پر دونوں جانب تلوار پڑی تھی۔

(۳) ان کے دو گیسو تھے۔

(۴) قرنی الشمس یعنی آفتاب کے طلوع و غروب کے نقطوں کا انہوں نے مشاہدہ کیا جس کا ذکر یہیں پر قرآن مجید میں موجود ہے۔

---

[1] الذی علیه الجمهور انّه موسیٰ بن عمران وان اطلاقه یو جب صرفه الیٰ موسیٰ ابن عمران کما ان اطلاق محمّد ینصرف الیٰ نبینا ﷺ (مجمع البیان)

علّامہ طبرسیؒ نے ان کے علاوہ بھی کچھ اقوال نقل کیے ہیں، ان کے یہاں ایک بیش قیمت اضافہ ہے کہ انہوں نے اس قول کی تائید میں کہ ان کے سر پر دو مرتبہ ضرب پڑی تھی، حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی طرف منسوب ایک حدیث بھی درج کی ہے۔[1]

ان کا نبی ہونا ہمارے یہاں بھی کوئی طے شدہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس علوی حدیث کا ظاہری یہی ہے کہ وہ پیغمبر نہ تھے، صرف اللہ کے ایک نیک بندے تھے مگر آئندہ الفاظ قرآنی سے ہمارا یہ رجحان ظاہر ہوگا کہ اُن سے جناب ذوالقرنین کے نبی ہونے کا ہی استفادہ ہوتا ہے۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾

”ہم نے اُسے زمین میں اقتدار عطا کیا، اور اسے ہر چیز کے لئے ذریعہ عطا کیا، تو اُس نے ایک ذریعہ سے کام لیا یہاں تک کہ جب وہ پہنچا سورج کے ڈوبنے کی جگہ تو پایا اُسے کہ وہ ڈوبتا ہے ایک مٹیالے چشمے میں اور اس کے پاس ایک قوم کو پایا۔ ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین! یا تو تم سزا دو اور یا اُن سے حسن سلوک کا طریقہ اختیار کرو۔ اس نے کہا کہ جو کوئی ظالم ہوگا اور جو ایمان لائے گا اور نیک اعمال کرے گا اسے اچھا صلہ ملے گا اور اپنے معاملہ میں ہم اس کے لئے آسانی کریں گے“۔

سبب کے لفظی معنی رسّی کے بھی ہوتے ہیں اور جس پر کوئی اثر مرتب ہو، اسے بھی سبب کہتے ہیں۔ بہرصورت ذریعہ کی لفظ کے ساتھ اس کا ترجمہ درست ہے جس پر سب تفسیریں منطبق ہوتی ہیں۔[2]

”زمین میں اقتدار عطا کیا اور ہر چیز کا ذریعہ دیا“۔ یہاں تک تو صرف بادشاہت ہی سمجھ میں آتی ہے لیکن بعد کے الفاظ کہ ہم نے ان سے یوں کہا اور انہوں نے یہ جواب دیا، ان سے بظاہر نبوت ثابت ہوتی ہے۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب نبوت کے منکر ہیں۔ اس لئے انہوں نے اسے تخاطب اور اس کے جواب پر محمول کرنے کے بجائے یہ کہا ہے کہ: ”ایں کنایت است از قدرت او بریں دو کار“ (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ارشاد کہ ”ہم نے کہا کہ خواہ تم سزا دو یا معاف کرو“ یہ کہنا زبان حال سے ہے یعنی اس کے ہاتھ میں یہ دونوں

---

[1] عن علی بن ابی طالب علیہ السلام انه كان عبد اصالحا احبت الله واحبته الله وناصح الله وناصحه الله امر قومه بتقوى الله فضربوه على قرنه ضربة بالسيف فغاب عنهم ما يشاء الله ثمّ رجع اليهم فدعاهم الى الله فضربوا على قرنة الاٰخر بالسيف فذلك قرناه (مجمع البيان)

[2] سببا طريقا يوصل الى مراده (جلالين) يقال للطريق الى الشئ سبب وللحبل سبب وللباب سبب (تبيان) از هر چيز سامانى (شاه ولى الله) ہر چیز سے راہ (شاه رفيع الدين)

باتیں تھیں تو گویا اس سے کہہ رہی تھی کہ چاہے یوں کرو یا یوں کرو۔اس صورت میں وہ جواب بھی لفظی نہیں ہوگا بلکہ عملی ہوگا یعنی اس نے رویہ ایسا اختیار کیا کہ جو مجرم اور گنہگار ہوتا تھا، اس کے ساتھ وہ سختی کرتا تھا لیکن جو مومن اور نیکوکار ہوتے تھے، ان کے ساتھ وہ حسن سلوک کرتا تھا۔الفاظ قرآنی کا ظاہری مفہوم یہ نہیں لیکن اگر دلائل عقلی یا نقلی مجبور کریں تو تاویل کی جاسکتی ہے اور چونکہ ہمارے علم میں کوئی عقلی ونقلی دلیل نبوت ذوالقرنین کے خلاف نہیں ہے، اس لئے بلاضرورت تاویل کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ عبدالقادر بھی یہاں اپنے والد ہی کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔چنانچہ وہ لکھتے ہے کہ:

''اس کو یہ کہا یعنی دونوں بات کی قدرت دی۔ہر بادشاہ کو ہر حاکم کو قدرت ملتی ہے، چاہے خلق کو ستاوے، چاہے اپنی خوبی کا ذکر جاری رکھے''۔(موضح القرآن)۔لیکن جلالین نے قلنا یا ذوالقرنین کے ساتھ لکھا ہے: بالھام یعنی یہ پیغام الہام کے ذریعہ سے پہنچایا۔اس کے بعد بھی نبوت ضروری نہیں ہے، ہاں ایک مردصالح ہونا ان کا ظاہر ہوگا، جو ان کے کردار سے بھی، جو قرآن نے اس آیت کے آخر میں پیش کیا ہے، ظاہر ہے۔علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نبوت کے قائل ہیں، وہ ارشاد ربانی کو اس وحی کی طرح مانتے ہیں جو انبیاء پر ہوتی ہے اور منکر نبوت ہیں، وہ وحی کے معنی الہام کے سمجھتے ہیں، جیسا کہ مادرِ موسیٰ کے لئے آیا ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى ہم نے مادرِ موسیٰ کی طرف بھیجی''۔(قصص۔۷) بہرصورت ہم اپنا خیال پہلے لکھ چکے ہیں کہ الفاظِ قرآنی اُسی طرح کی گفتگو کو بتاتے ہیں جو انبیاء سے ہوتی ہیں اور نفی نبوت ذوالقرنین کی اب تک کوئی دلیل میری نظر سے نہیں گزری۔اس لئے ظاہر قرآن سے عدول کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

ہاں اب ارشادِ الٰہی کی نوعیت پر غور کرنا ہے۔یہ ارشاد کہ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا حکم تکلیفی تو ہو نہیں سکتا کہ خالق کی طرف سے دونوں باتیں جائز قرار دی جارہی ہوں کیوں کہ مطلق تعذیب کسی قوم کی بلاتفریق گنہ گار و بے گنا خالق کی جانب سے جائز نہیں ہوسکتی۔اب اگر اس کے معنی صرف خبر کے سمجھے جائیں کہ تم کو دونوں باتوں کی قدرت حاصل ہے تو اس میں کوئی افادیت نہ ہوگی جب تک ایک کڑی مضمر نہ مانیں جو میرے خیال میں ظاہر ہے۔اس لئے اس کے اضمات میں کوئی حرج نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کہنے کے ساتھ کہ ان دونوں باتوں کی تمہیں قدرت حاصل ہے، خالق انتباہ فرماتا ہے کہ اب تمہارا امتحان ہے اور دیکھنا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔جنابِ ذوالقرنین علیہ السلام کا جواب بھی اس سے بالکل مرتبط ہے۔''آفتاب مٹیالے چشمے میں ڈوبتا ہے، یہ سائنس اور فن ہیت وریاضی کے لحاظ سے مشکل چیز ہے۔اس لئے شاہ ولی اللہ نے اس کے تحت میں یہ فقرہ لکھا ہے''یعنی بحسب نظر مردمان''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی حقیقت واقعہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ سورج کے ڈوبنے کی جو شکل آنکھوں کو نظر آتی ہے، وہ یہی ہے کہ پانی میں ڈوبتا ہے جس کا سمندر کا سفر کرنے والے جہاز پر سے برابر مشاہدہ کرتے ہیں۔تفسیر جلالین میں بھی یہی ہے کہ:

غروبھا فی العین فی رأی العین، والّا فھی اعظم من الدّنیا

پانی میں اس کا ڈوبنا آنکھ کے مشاہدہ مین ہے ورنہ حقیقت میں تو وہ اس دنیا سے بڑا ہے۔جناب شیخ الطائفہؒ نے بس دو قول نقل کردیئے ہیں، خود کچھ نہیں فرمایا ہے، مگر شاہ عبدالقادر صاحب جو لکھ رہے ہیں، اس کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ فرماتے ہیں: مغرب کی طرف اُس جگہ پہنچا کہ دلدل تھی۔نہ گزر آدمی کا، نہ کشتی، اللہ کے ملک کی حد نہ پاسکا'' (موضح القرآن) مگر قرآن تو یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ وہ مٹیالے چشمے تک پہنچ کر رہ گئے ہیں۔وہ تو کہہ رہا ہے کہ اُنہوں نے سورج کو پایا مٹیالے چشمے میں ڈوبتا ہوا۔اس پر شاہ صاحب کی تفسیر کہاں منطبق ہوتی ہے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

''پھراس نے دوسرا راستہ اختیار کیا، یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کی جگہ تک پہنچا تو پایا اُسے کہ وہ نکلتا ہے ایک ایسی قوم پر کہ نہیں رکھا ہے ہم نے اُن کے لئے اس سے کوئی پردہ۔ ایسا ہی تھا اور ہم جو کچھ اُس کے پاس ہے، اُس پر حاوی ہیں''۔

''نہیں رکھا ہے ہم نے اُن کے لئے اُس سے کوئی پردہ'' اس کے ذیل میں شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''شاید وہ لوگ جنگلی سے ہوں گے کہ گھر بنانا اور چھت ڈالنا ان میں دستور نہ ہوگا'' (موضح القرآن) تفسیر جلالین میں ہے:

هم الزنج............... ارضهم لاتحمل بناء ولهم سروب يغيبون فيها عند طلوع الشمس و يظهرون عند ارتقاعها۔

یہ قومِ زنج کے لوگ تھے۔ ان کی سرزمین کسی عمارت کو برداشت نہیں کرسکتی اور اُن کے یہاں سرنگیں ہوتی تھیں کہ سورج نکلنے کے وقت وہ اُن میں داخل ہوجاتے تھے اور جب سورج بلند ہوتا تھا تو وہ نکل آتے تھے۔ تبیان میں شیخ طوسیؒ کا بیان بھی اسی کے مطابق ہے، حالانکہ یہ الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر تمازت آفتاب سے بچنا ہے تو سورج اونچے ہونے کے بعد سرنگوں میں داخل ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پہلے جس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے اس نے غلطی سے عندغروبها کے بجائے عند ارتقاعها لکھ دیا، پھر یہ غلطی رواں ہوگئی۔ علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں:

معناه انه لم يكن بها جبل ولاشجرولابناء لانّ ارضهم لم يكن يثبت عليها بناء فكانوا اذا طلعت الشمس يغورون فی المياه والاسراب واذاغربت تصرفوا فی امورهم. (مجمع البيان)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سرزمین پر پہاڑ نہ تھے اور نہ کوئی درخت اور نہ کوئی عمارت، اس لئے کہ اُن کی زمین پر کوئی عمارت قائم نہیں ہوسکتی تھی تو جب آفتاب نکلتا تھا تو وہ پانیوں میں اور سرنگوں کے اندر چلے جاتے تھے اور جب ڈوبتا تھا تو اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تھے۔

اس کے بعد ابوبصیر کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے درج کی ہے کہ انہیں گھر بنانے کا فن نہیں آتا تھا چنانچہ ہماری قدیم تفسیر میں بھی یہی ہے کہ لم يعلمو اصنعه البنا یعنی اُنہیں تعمیر کا کام آتا نہیں تھا (علی ابن ابراہیم)

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

''پھر ایک اور راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ جب وہ اُن دونوں رکاوٹ والی دیواروں کے بیچ میں پہنچا تو اُن دنوں کے اُدھر ایک قوم کو پایا جو تقریباً کوئی بات سمجھتے ہی نہیں تھے۔ اُنہوں نے کہا اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج

دنیا میں فساد کرنے والے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ رقم مقرر کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور اُن کے بیچ میں ایک رکاوٹ کی دیوار بنا دیجئے''۔

یاجوج وماجوج کا ذکر:

پہلی جو رکاوٹ والی دیواروں کا ذکر ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی مصنوعی قسم کی دیواریں نہیں بلکہ وہ ''دو آڑ دو پہاڑ تھے اُس ملک میں'' (موضح القرآن) یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے کہ اُس میں لکھا ہے:

جبلان بمنقطع بلاد الترك سدّ الاسكندر ما بينهما (جلالين)

یہ دو پہاڑ تھے ترکوں کے شہر کے ختم ہونے پر جن کے بیچ کے راستے کو سکندر نے بند کر دیا

جناب شیخ الطائفہ کا بیان بھی اس کے مطابق ہے جس کے لئے صدرِ اسلام کے مفسرین کا انہوں نے حوالہ دیا ہے۔

هما الجبلان الذّان جعل الرّدما بينهما في قول ابن عباس وقتادة والضحاك (تبيان)

وہ دو پہاڑ تھے جن کے درمیان دیوار اٹھائی گئی، یہ ابن عباس، قتادہ اور ضحاک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ رکاوٹیں اُس وقت وجود نہیں رکھتی تھیں بلکہ ان رکاوٹوں کا ذکر اس جگہ کے تعارف کے طور پر ہے یعنی اُس جگہ پہنچے جہاں اس کے بعد رکاوٹ کے لئے دو دیواروں کی تعمیر ہوئی، اگر یہ رکاوٹ اُس وقت موجود ہوتی تو وہ یہ خواہش ہی کیوں کرتے کہ رکاوٹ کے لئے دیوار بنا دیجئے۔[1]

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾

''اُنہوں نے کہا جو مجھے اللہ نے وسعت عطا کی ہے وہ بہتر ہے، بس تم جسمانی طاقت کے ساتھ میری مدد کرو تو میں تمہارے اور اُن کے درمیان ایک موٹی دیوار بنا دوں گا۔ لاؤ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے یہاں تک کہ جب اُنہوں نے دونوں پہاڑوں کے درمیانی حصّہ کو برابر کر لیا، کہا کہ پھونکو اس میں یہاں تک کہ جب اُسے آگ بنا دیا تو کہا کہ لاؤ میں اس پر ڈالوں پگھلا تانبا تو وہ اس پر چڑھ نہیں سکے اور نہ اُس میں سوراخ کر سکے''۔

دیوار کے بنانے کی ترکیب جو قرآن نے بتائی ہے، اس کی تشریح شاہ عبدالقادر یوں لکھتے ہیں:

''اوّل لوہے کے بڑے بڑے تختے بنائے، ایک پر ایک دھرتا گیا کہ دونوں پہاڑوں کے برابر ملا دیا، پھر تانبا پگھلا کر اس کے اوپر سے ڈالا اور وہ درزوں میں بیٹھ کر جم گیا، سب مل کر ایک پہاڑ سا ہو گیا'' (موضح القرآن)

---

[1] قيل اراه بالسّدّين الموضع الّذي فيه السّدان اليوم لانّه لو كان هناك سد لم لم يكن لطلبهم السّدّ معنى (مجمع البيان)

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

''انہوں نے کہا یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے تو جب میرے پروردگار کی طرف مقرر کردہ میعاد ہو جائے گی تو وہ اسے صاف چٹیل میدان [۱] کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ سچّا ہے''۔

مقرر کردہ میعاد کے معنی یہی سمجھے گئے کہ اس سے قیامت مراد ہے اور اس دیوار کا ٹوٹنا یاجوج وماجوج کا نکلنا علاماتِ قیامت میں سے قرار پا گیا ہے، ترتیب بیان قرآن کے لحاظ سے اس کے بعد نفخ صور کا ذکر اس خیال کی تقویت کا باعث ہے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

''اور اس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے ایک دوسرے کے ساتھ تھپیڑے مارتے ہوئے اور صور پھونک دیا جائے گا تو اُن سب کو پورے طور پر ہم اکٹھا کر دیں گے اور اُس دن دوزخ کو کافروں کے سامنے پورے طور پر لے آیا جائے گا، جن کی آنکھیں میری یاد سے پردہ میں رہیں اور وہ سن نہیں سکتے تھے''۔

''اُس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے تھپیڑے مارتے ہوئے''۔ اس میں دو احتمال ہیں یہ بھی کہ وہ بیچ کی رکاوٹ دور ہو جائے گی، تو یاجوج وماجوج اپنی کثرت تعداد کے ساتھ تھپیڑے مارتی ہوئی سمندر کی لہروں کی طرح چاروں طرف پھیل جائیں گے اور یہ بھی کہ تمام دوسری مخلوق باہمی اختلافات وتصادمات سے اُس وقت اس عالم میں ہوگی۔ [۲]

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

''تو کیا انہوں نے کہ جو کافر ہیں ایسا ہی سمجھتا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو سرپرست بنائیں؟ بلاشبہ ہم نے کافروں کی مہمانی کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے''۔

ایک تفسیر کے لحاظ سے ''نُزُلًا'' کے معنی ''مُنزل'' کے ہوتے ہیں۔ [۳] مگر دوسری تفسیر وہ ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے [۴]

---

[۱] ای مدکوکا... ترابالارض من قولھم ناقۃ دکآء لاسنام لھا (تبیان)

[۲] ترکنا یاجوج وماجوج یوم القضآء امر السّدّ یموجون فی الدّنیا مخلّطین لکثرتھم وقیل انّھا ارادسائر الخلق۔ (مجمع البیان)

[۳] ای ماوی ومنزلا (تبیان)

[۴] ای ھی معدّۃ لھم کالنزّل المعدّ للضّعیف (جلالین)

اسے علامہ طبرسیؒ نے بطور نقلِ قول کے درج کیا ہے۔[1] مگر میرے نزدیک وہ محاورۂ عرب سے زیادہ قریب ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾

”کہیے کیا ہم تم لوگوں کو بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت گئی حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے اعمال کر رہے ہیں، یہ وہ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اُس کی بارگاہ میں حاضری کا انکار کیا تو اُن کے اعمال اکارت گئے۔ اب ہم روزِ قیامت اُن کا کوئی وزن نہ سمجھیں گے۔ یہ ان کی سزا ہے۔ دوزخ، اس کی وجہ سے کہ اُنہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے پیغمبروں کا مذاق اڑایا“۔

اس زمانہ کے بعض مفکّرین کے اس تصور کا جو کافی پھیلتا جاتا ہے کہ نجات کے لئے اعمال کافی ہیں عقائد چاہے جو بھی ہوں، ذرا ان آیات کو سامنے رکھ کر جائزہ لیجئے۔ یہ اعمال جن کے اکارت ہونے کا ذکر قرآن کر رہا ہے، کیا فسق وفجور کی قسم کے برے اعمال ہیں؟ یہ تو ہیں باعث سزا۔ ان کے اکارت ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ جی یہ اعمال جن کا ذکر قرآن کر رہا ہے، بڑے اچھے اچھے کام ہیں اور اس لئے ان کے کرنے والے ان پر حسن انجام اور جزاء کے امیدوار ہیں مگر کفر وانکار کی بنا پر قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ان اعمال کی کوئی جزاء نہیں ہوگی بلکہ انجام عذاب دوزخ کی صورت میں سامنے آئے گا اور اس لئے ان کو سب سے زیادہ خسارے میں کہا جا رہا ہے۔ اگر اعمال نیک کیے ہی نہیں تو خسارہ کا ہے کا؟ سرمایہ فراہم کیا ہی نہیں، خسارہ تو یہ ہے کہ پوری عمر ریاضت اور بخیالِ خود عبادات اور خدمت خلق وغیرہ میں گزاری مگر نتیجہ میں وہ سب بے کار ہوا اور اس کا ثمرہ کچھ نہیں ملا۔

اُمم سابقہ میں اس کی مثال میں یہود ونصاریٰ کے تارک الدّنیا عابدوں کو کہا گیا ہے اور اس امّت میں اس کی نمایاں مثالِ خوارجِ نہروان تھے جن زہدہ تقویٰ اور عبادت وریاضت کو شہرہ آفاق مثالی حقیقت حاصل تھی مگر نص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ان کا اسلام سے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔[2] مگر یہ حکم ان جماعتوں سے مخصوص نہیں ہے، ہر شخص کو اپنے گردوپیش میں بخیال خود عبادت میں غیر معمولی مشقتیں اٹھانے والے ملیں گے۔ آپ کو ان پر کتنا ہی ترس آئے کہ افوہ، اتنی محنت یہ کرتے ہیں اور یہ بربادی ہوگی، مگر کیا کیا جائے کہ جو ثواب عطا کرنے والا ہے، اُس نے

---

[1] قیل معناہ انّا جعلنا جھنم معدّۃ مھیّا للکافرین عندنا کما یھیا النزّل للضّعیف (مجمع البیان)

[2] قیل انّھم الیھود والنّصاری و قیل انّھم الرّھبان منھم وروی عن امیر المؤمنین علیہ السلام انہ قال ھم اھل حروراء من الخوارج فسالہ ابن الکواء عن ذلک فقالا بنت و اصحابك منھم (تبیان) روی العیاشی باسنادۃ قال قام ابن الکواء الی امیر المؤمنین علیہ السلام سالھہ عن اھل ھذہ الایۃ فقال اولٓئك اھل الکتاب کفروا بربّھم و ابتدعوا فی دینھم فحبطت اعمالھم وما اھل النّھر منھم ببعید یعنی الخوارج (مجمع البیان)

اپنے ثواب کو جس شرط کے ساتھ مقید کر دیا ہے وہ ان میں مفقود ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

''یقیناً وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، اُن کے لئے سامان مہمانی میں فردوس کے بہشت ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے''۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ
وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾

''کہیے کہ اگر سمندر روشنائی ہو جائے تو میرے پروردگار کے کلموں کے لئے تو سمندر ختم ہو جائے قبل اس کے کہ میرے پروردگار کے کلمے ختم ہوں، چاہے ہم ویسا ہی ایک اضافہ کے لے آئیں''۔

یعنی ایک سمندر کے ختم ہونے پر دوسرے سمندر کا اُس میں اضافہ بھی کر دیا جائے تو وہ کلمات رب کے لکھنے کے لئے کافی نہ ہوگا۔

کلماتِ الٰہی سے کیا مراد ہے؟ اس کے لئے علّامہ طبرسیؒ نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں مگر کوئی بھی معصوم کی طرف مستند نہیں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا
لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

''کہیے کہ میں تو بس تمہاری طرح ایک انسان ہوں (ہاں ایسا) جس کی طرف یہ پیغام آئے کہ تمہارا خدا ایک اکیلا خدا ہے، تو جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھتا ہوا سے چاہیے کہ وہ نیک اعمال انجام دیتا رہے اور اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے''۔

اس آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام بشریت کو بیان کیا گیا ہے۔

سُوْرَۃُمَرْیَمِ

مکیّہ......۹۸......آیات

اگرچہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کا تذکرہ قرآن مجید کے دوسرے سوروں میں بھی آیا ہے مگر جتنی تفصیل کے ساتھ اس سورہ میں ذکر ہوا ہے کہیں نہیں ہے۔اس لئے اس سورہ کا نام ان خاتونِ معصومہ کی طرف نسبت کے ساتھ ہوگیا۔اس کے علاوہ اس سورہ میں جو مضامین درج ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ مریم کے خاص خاص مضامین:

۱......جناب زکریا علیہ السلام کی دعا، اس کی قبولیت اور جناب یحییٰ علیہ السلام کی ولادت۔

۲......حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوصاف وکمالات کے تذکرہ کے ساتھ ان کے ابن اللہ ہونے کی رو۔

۳......حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو

۴......حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر

۵......جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا ذکر جو اس سورہ کے مختصات میں سے ہے۔

۶......جناب ادریس علیہ السلام کا ذکر اور ان کی عالم بالا میں رفعت کا ذکر، یہ بھی بس اسی سورہ میں ہے۔

۷......باغہائے بہشت کے اوصاف

۸......اثبات معاد

۹......دوزخ کی طرف سے عمومی طور پر گزر۔یہ بھی اسی سورہ میں ہے۔

۱۰......ثبوت شفاعت

۱۱......یہ کہ اللہ کے لئے اولاد کا تصوّر شان الوہیت کے خلاف ہے۔

۱۲......ایک خاص اوصاف بلند رکھنے والی جماعت کی محبت فرض قرار دیے جانے کا پیشگی اعلان، جس کا نفاذ آیۂ مودّت سے ہوا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

کٓھٰیٰعٓصٓ ۝۱ ذِکۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّکَ عَبۡدَہٗ زَکَرِیَّا ۝۲ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ۝۳ قَالَ

رَبِّ اِنِّیۡ وَہَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَ اشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَیۡبًا وَّ لَمۡ اَکُنۡۢ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا ﴿۴﴾ وَ اِنِّیۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِیَ مِنۡ وَّرَآءِیۡ وَ کَانَتِ امۡرَاَتِیۡ عَاقِرًا فَہَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا ﴿۵﴾ یَّرِثُنِیۡ وَ یَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ ٭ۖ وَ اجۡعَلۡہُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿۶﴾

''کاف۔ہا۔یا۔عین۔صاد۔ ذکر ہے آپ کے پروردگار کی رحمت کا اپنے بندے زکریّا پر، جب کہ انہوں نے اپنے پروردگار کو چپکے چپکے پکارا۔ کہا اے میرے پروردگار! یقیناً میرا عالم یہ ہے کہ میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں اور سر میں بڑھاپے سے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور میں تجھ سے اے میرے پروردگار! دعا کر کے بے نصیب تو (کبھی) نہیں رہا ہوں، اور بلاشبہ میں اپنے عزیزوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اب تو ہی عطا کر مجھے اپنی طرف سے ایک وارث جو میرا ترکہ پائے اور یعقوب کی اولاد کا ترکہ پائے اور اسے اے میرے پروردگار! اپنی پسند کے قابل بنا؟''

جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور میراث انبیاء کا ثبوت:

آخری فقرہ آیت کا انہیں یاد رکھنا چاہیے جو ایک ساختہ و پرداختہ حدیث کے معتقد ہیں کہ:

نحن معاشر الانبیآء لانرث ولا نورث: ہم گروہ انبیاء نہ کسی کا ورثہ پاتے ہیں اور ہمارا ورثہ کسی کو ملتا ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو حضرت زکریّا علیہ السلام اپنی دعا میں ترکہ کا ذکر زبان پر کیوں لاتے؟ اور کہا جائے کہ ترکہ سے مراد علم ہے [1] تو علم کیا چرانے یا غصب کرنے کی چیز ہے جو اس کے متعلق دور کے عزیزوں سے کوئی اندیشہ ہو؟ یہ اندیشہ صاف اس کا ثبوت ہے کہ وہ ترکہ از قبیل اموال اور اگر کہا جائے کہ یہ اندیشہ تخریب دین کا ہے [2] تو دین کی حفاظت کے لئے انہی کے ہاں اولاد ہونے کی کیا ضرورت ہے؟! اسکے لئے کوئی شخص اس نبی سے خاندانی تعلق نہ رکھتا ہو اور نظرِ خالق میں ان اوصاف کا حامل ہو، مبعوث ہو سکتا ہے اور دین کی حفاظت کر سکتا ہے۔

چونکہ جناب زکریّا خود بھی نبی ہیں اور جس فرزند کے پیدا ہونے کے لئے دعا ہے، وہ بھی نبی ہوگا، تو یہ آیت دونوں جزوؤں کو خود ساختہ حدیث کے باطل کر دیتی ہے یعنی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی وارث ہوتا بھی ہے اور دوسرے کو اس کی میراث پہنچتی بھی ہے اور چونکہ جو سچی حدیث ہو وہ قرآن کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتی، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ حدیث غلط ہے جو صرف دخترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باپ کی میراث سے محروم کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔

ہمارے قدیم اکابر علماء و مفسرین نے بھی اس آیت کو اس باب میں مرکز استدلال قرار دیا ہے،

چنانچہ شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:

---

[1] العلم و النبوۃ (جلالین)

[2] خفت الموالی علی الدّین ان یضیعوہ (جلالین)

فی الآیة دلالة علیٰ انّ الانبیآء یورثون المال بخلاف ما یقول من خالفنا انّهم لایورثون لان زکریّا صرّح بدعائه و طلب من یرثه و یحجب بنی عمّه و عصبته من الولد و حقیقة المیراث انتقال ملك المورث الیٰ ورثه بعد موته بحکم الله و حمل ذٰلك علی العلم و النبوّة علیٰ خلاف الظّاهر لانّ النّبوة والعلم لا یورثان لانّ النّبوّة تابعة للمصلحة لامدخل النّسب فیها و العلم موقوف علی من یتعرض لهه و یتعلمه علی انّ زکریا انّما سأل ولیّا من ولده یحجب موالیه من بنی عمّه من المیراث و ذٰلك لایلیق الّا بالمال لانّ النبوة و العلم لا یحجب الولد غیره بحال علی ان اشتراطه ان یجعله رضیّا لا یلیق بالنبوة لان النّبیّ لایکون الّا مرضیّا معصوما فلا معنی لمسئلته ذٰلك و لیس کذلك المال لانّه یرثه الرضی و غیر الرضی. (تبیان ج۔۵ص۱۰۶)

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء کی میراث مال میں ورثہ کوملتی ہے برخلاف ہمارے مخالفین کے جن کا قول یہ ہے کہ ان کی میراث ورثہ کو نہیں ملتی، اس لئے کہ جناب زکریا نے اپنی دعا میں صراحت کی ہے اور خواہش کی ہے ایسے فرزند کی جوان کا وارث ہو اور چچازاد بھائیوں اور دوسرے ان کے عزیزوں کو محجوب کردے۔ اور میراث کی حقیقت مورث کے مال کا منتقل ہونا ہے اس کے ورثہ کی طرف، اس کے مرنے کے بعد حکم الٰہی سے اور اسے محمول کرنا علم اور نبوت پر ظاہر الفاظ قرآنی کے خلاف ہے اس لئے کہ نبوت اور علم میں میراث نہیں ہوتی کیونکہ نبوت تو مصلحت کی پابند ہے، اس میں کسی رشتہ کا دخل نہیں ہے اور علم مخصوص ہوتا ہے، اس شخص سے جو اس کا درپے ہو اور حاصل کرے۔ اس کے علاوہ زکرّیا نے طلب کیا ہے ایک وارث اپنی اولاد میں سے جوان کے دور کے عزیزوں کو جو بنی اعمام میں سے ہیں، میراث سے محروم کردے اور یہ بات مال ہی کے لئے ہوسکتی ہے کیوں کہ نبوّت اور علم میں اولاد کو دوسروں کو محجوب نہیں کرتی کسی صورت میں بھی پھر اُن کا شرف لگانا کہ اللہ اُسے پسند کے لائق بنائے، نبّوت کے ساتھ سازگار نہیں ہے، اس لئے کہ نبی تو ہوتا وہی ہے جو پسندیدۂ خالق اور معصوم ہو تو اس کے طلب کرنے کے کوئی معنی نہیں لیکن مال ایسی چیز نہیں ہے، اس کا وارث پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر ایک ہوسکتا ہے۔

اس کو ذرا بدلے ہوئے الفاظ میں علامہ طبرسیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجمع البیان میں لکھا ہے۔

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ یَحْیٰی لا لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۝۷ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا ۝۸ قَالَ کَذٰلِكَ ج قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْئًا ۝۹ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ط قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝۱۰

”اے زکریا علیہ السلام ہم تمہیں خوش خبری دیتے ایک لڑکے کی جس کا نام یحیٰی علیہ السلام ہے جس کا ہم نے اس کے پہلے کوئی ہمنام قرار نہیں دیا ہے، کہا اے میرے پروردگار! لڑکا میرے کہاں ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہائی حد تک پہنچ چکا ہوں؟ کہا یوں ہی ہوگا تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے

اور میں نے تمہیں اس کے پہلے پیدا کیا جب کہ تم کچھ تھے ہی نہیں۔ کہا پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے۔ کہا تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن بات نہ کرو گے''۔

ولادت جناب یحییٰ علیہ السلام کی بشارت:

ان آیات میں جو مضمون ہے، وہ پہلے آچکا ہے اور وہاں ہم نے انسانی نفسیات کی اس بوقلمونی پر روشنی ڈالی ہے کہ خود ہی تو جناب زکریا علیہ السلام دعا کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کو خدا کی قدرت کے لحاظ سے امر ممکن سمجھتے ہیں اور جب خدا کی طرف سے بشارت ملتی ہے تو اظہارِ تعجب کرنے لگتے ہیں کہ یہ کیوں کر ہوگا اور پھر اطمینان قلب کے لئے اللہ سے نشانی چاہتے ہیں کہ یہ امر خارقِ عادت یعنی استقرارِ عمل ہو تو میں اس نشانی سے سمجھ سکوں اور خالق نشانی یہ قرار دیتا ہے کہ اُس وقت تین دن تم ذکر الٰہی کے سوا کوئی بات نہ کر سکو گے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾

''تو وہ عبادت گاہ سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہا کرو''۔

یعنی جب استقرار حمل ہوا تو وہ آیت الٰہی ظاہر ہوئی اور اب اُنہوں نے قوم سے جو گفتگو کی تو زبان سے نہیں بلکہ بس اشارہ سے بعض مفسرین کا قول ہے کہ انہوں نے زمین پر لکھ کر اس بات کو پہنچایا۔[1] میں اسے اس لئے قابل قبول سمجھتا ہوں کہ یہ پوری بات فقط اشاروں میں ادا نہیں ہوسکتی۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے یہاں عجیب وغریب بات لکھی ہے کہ:

چوں یحییٰ متولد شد و دو سالہ گشت (فتح الرحمٰن) جب یحییٰ پیدا ہوئے اور ان کی عمر دو برس کی ہوئی، یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ بچہ کی دو سال عمر ہونے کے بعد یہ بات کیوں پیدا ہوئی؟ میرا خیال یہ ہے کہ یہ حاشیہ غلطی سے اس آیت کے ساتھ درج ہو گیا ہے۔ وہ حقیقتاً اس کے بعد کی آیت سے متعلق جیسا کہ تفسیر جلالین میں زیر تحریر آیت کے تحت میں تو یہ لکھا ہے کہ:

فعلم منعه من کلامهم حملها بیحییٰ

کلام سے قدرتی طور پر روک دیئے جانے سے وہ سمجھے کہ اُن کی زوجہ کے شکم میں یحییٰ کا حمل قائم ہو گیا ہے۔

اور اس کے بعد آئندہ آیت کی تمہید کے طور پر لکھا ہے:

وبعد ولادته بسنتین قال تعالیٰ یا یحییٰ خذ الکتاب------ الخ

اور ان کی ولادت کے دو برس کے بعد ارشاد الٰہی ہوا، اے یحییٰ! لو قانون خداوندی کو-------

اب تو دل یہ کہتا ہے کہ وہ کتاب کی غلطی نہ تھی بلکہ جناب شاہ صاحب نے جلالین کو سامنے رکھ کر یہ حاشیہ لکھا ہے بغیر عقل و ذہن سے کام لئے ہوئے صرف ترجمہ کے طور پر تو جلالین کے اس فقرہ کو جو کہ آیندہ آیت سے متعلق تھا، انہوں نے آنکھ بند کر کے قبل کی آیت سے مرتبط قرار دے دیا۔ اس صورت میں اسے ''خطائے بزرگان'' کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

---

[1] اشار الیهم واولیٰ بیده وقیل کتب لهم فی الارض عن مجاهد (مجمع البیان)

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

''اے یحییٰ! لو قانون خداوندی کو[1] طاقت کے ساتھ اور ہم نے اسے بچپنے ہی میں علم وحکمت عطا کیا اور مہر ومحبت اپنی طرف سے اور نیک نامی اور وہ پرہیزگار تھا اور نیک سلوک کرنے والا اپنے ماں باپ کے ساتھ اور وہ نافرمان سرکش نہیں تھا اور سلام ہے اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ دنیا سے اٹھے گا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا''۔

جناب یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف:

اس کے قبل والی آیت کے ذیل میں بعض مفسرین کی یہ تشریح آ چکی ہے کہ جب یحییٰ علیہ السلام دو برس کے تھے، اس وقت وہ منصب نبوت پر مامور ہوئے بعض نے تین برس لکھے ہیں۔[2]

اس کے برخلاف شاہ عبدالقادر رکھتے ہیں: ''یعنی باپ ضعیف تھے اور یہ جوان تھی'' (موضح القرآن)

مگر جوان کو عربی میں صبی نہیں کہا جاتا۔

یا یحییٰ کے لفظ کے ساتھ جو خطاب ہے، وہ بوقت تخاطب کوئی لفظی خطاب نہیں تھا بلکہ حکم کُنْ کی طرح ارادہ الٰہی کی لفظی تعبیر ہے اور اس لئے اس کے ساتھ کسی لفظ کے مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین یا مترجمین قرآنی الفاظ میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں۔[3]

حنانًا مّن لّدُنّا ''مہر ومحبت ہماری طرف سے ''وزکوٰۃ'' اس لفظ کے معنی میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اُس کی تفسیر طہارت و پاکیزگی کے ساتھ کی ہے۔[4] اور بعض نے اسے اس زکوٰۃ سے لیا ہے جو خیرات کی قبیل سے ہوتی ہے یعنی ان کی ذات اللہ کی طرف سے بندوں پر ایک خیرات کی حیثیت رکھتی تھی[5] اور تیسری تشریح یہ ہے کہ اس کا مفہوم وہ ہے جس کے لحاظ سے قرآن میں ہے: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی اپنے آپ کو سراہو نہیں[6] (نجم: ۳۲)

---

[1] یعنی التورٰۃ الّتی انزلتہا علی موسیٰ (تبیان)
[2] صبیًا ابن ثلث سنین (جلالین)
[3] گفتیم اے یحییٰ (شاہ ولی اللہ)
[4] طہارت نفس (شاہ ولی اللہ) پاکیزگی (شاہ رفیع الدین)
[5] صدقۃ علیہم (جلالین)
[6] ای اٰتاز کّیناہ بحسن الثناء علیہ کما یزکّی الشہود الانسان (تبیان)

ہم نے جو "نیک نامی" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، وہ اس تشریح کے لحاظ سے ہے۔
علّامہ طبرسیؒ نے اس بارے میں متعقدمین کے پانچ قول نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

"اور یاد کرو کتاب میں سے مریم علیہا السلام کو جب انہوں نے اپنے گھر والوں سے الگ مشرق کی جانب ایک گوشہ میں جا کر اُن کی طرف سے پردہ ڈال لیا تو ہم نے ان کی طرف اپنی جانب سے روح (فرشتے) کو بھیجا تو وہ ان کے سامنے بالکل آدمی کی صورت میں نمودار ہوا۔ انہوں نے کہا میں خدائے رحمٰن سے مانگتی ہوں پناہ تجھ سے اگر تو خوف خدا رکھتا ہو۔ اس نے کہا میں کوئی اور نہیں، تمہارے پروردگار کی طرف کا بھیجا ہوا ہوں کہ تمہیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ انہوں نے کہا میرے فرزند کہاں سے ہوگا حالاں کہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے اور میں بدکار نہیں ہوں۔ اس نے کہا ہاں یونہی ہوگا۔ تمہارے پروردگار نے کہا کہ وہ میرے لئے آسان ہے اور یہ اس لئے کہ ہم اُسے لوگوں کے لئے ایک معجزہ قرار دیں، اور اپنی طرف کی رحمت کا ثبوت اور یہ بالکل طے شدہ چیز ہے۔"

تذکرہ جناب مریم سلام اللہ علیہا اور ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی حال:

فرشتے کے آنے کے موقع پر جلالین نے اچھا حاشیہ دیا ہے: بعد لبسها ثيابها "جب وہ اپنے کپڑے پہن چکیں"۔
یہ فرشتوں کی شان پارسائی کے بھی لائق ہے اور جناب مریم علیہا السلام کی شان احترام کے بھی مطابق۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

"تو وہ حاملہ ہو گئیں اُس (بچہ) کے ساتھ تو وہ اس کے سبب سے ایک دور جگہ پر گوشہ نشین ہو گئیں۔ اس کے بعد دردزہ انہیں کھجور کے درخت کے تنہ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے کہا کاش میں مرجاتی اس کے پہلے اور بالکل نیست و نابود ہو گئی ہوتی"۔

عام طور پر موت کو ''باب نَصَرَ يَنْصُرُ'' سے لیا جاتا ہے اس طرح اس کا ماضی ومضارع مات یموت ہوتا ہے اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس طرح کئی جگہ موجود ہے مثلاً: وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ (سورہ آل عمران۔ ۱۵۸)۔ اس کے اعتبار سے یہاں جناب مریم علیہا السلام کے قول میں یالیتنی کے ساتھ مُتُّ کا لفظ ہونا چاہیے تھا مگر یہاں بغیر کسی اختلاف قرأت کے مِتُّ (میم کے کسرہ کے ساتھ) ہے۔ تعجب ہے کہ مفسرین جو لغت ونحو وصرف پر خاص توجہ رکھتے ہیں، یہاں پر خاموش ہیں۔ بہرحال قرآن مجید کے دو طرح استعمال کرنے سے لازماً پتہ چلتا ہے کہ کلامِ عرب میں یہ لفظ دونوں طرح استعمال ہوا کرتے تھے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

تو اس نے انہیں آواز دی اُن کے نیچے سے کہ رنجیدہ نہ ہویئے آپ کے پروردگار نے آپ کے نیچے ایک نہر پیدا کی ہے اور اپنی طرف کر کے حرکت دیجیے کھجور کی شاخ کو تو وہ گرانے لگے گی آپ پر تروتازہ کھجوریں''۔

''اُس نے انہیں آواز دی'' کس نے؟ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں: ''طفل یا جبرئیل واللہ اعلم''

ان کے بیٹے شاہ عبدالقادر نے تعیین کے ساتھ لکھا ہے: ''یہ آواز دی فرشتے نے'' (موضح القرآن)

جلالین نے بھی یہی لکھا ہے: ای جبرئیل کان اسفل منها: یعنی جبرئیل، جو اس جگہ سے جہاں وہ تھیں، نیچے تھے''

مگر ہماری قدیم تفسیر پہلے خیال کی مؤید ہے[ا] اور شیخ الطائفہؒ نیز علامہ طبرسیؒ نے بغیر ترجیح دونوں قول نقل کر دیے ہیں۔

فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْٓ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

''تو کھایئے، پیجئے اور آنکھیں خنک رکھیے، اس کے بعد اگر کسی آدمی کو دیکھیے تو کہیے کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لئے چپ رہنے کی منّت مانی ہے تو میں آج کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی''۔

''آنکھیں خنک رکھیے'' عربی کا محاورہ ہے جس کا ترجمہ لفظی تو یہی ہوگا مگر مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ خوش دل اور بے فکر رہیے۔ اس کے بعد ہدایت یہ ہوتی ہے کہ ''کسی آدمی سے بات نہ کیجیے اور یوں کہیے'' تو بغیر بات کیے ہوئے کہنے کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اشارہ سے ایسا ظاہر کیجیے کہ آپ نے چپ کا روزہ رکھا ہے۔ یہ روزہ اُمم سابقہ میں رائج تھا جیسا کہ ہندوؤں میں بھی اب موجود ہے اور گاندھی جی رکھا کرتے تھے۔ مگر اسلام میں اس قسم کے روزہ کا حکم منسوخ ہو گیا ہے، اس لئے شریعت اسلام میں اس طرح کی منّت بھی جائز نہیں ہے اس میں فرق اسلامی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر بھی لکھتے ہیں کہ:

''اُن کے دین میں یہ منّت درست تھی کہ بولنے کا بھی روزہ رکھتے۔ ہمارے دین میں یہ منّت درست نہیں'' (موضح القرآن)

[ا] فنادٰاھا عیسٰی (علی بن ابراھیم)

بے شک ایک سوال یہاں حل طلب یہ ہے کہ صورت حال سے ظاہر ہے کہ جناب مریم سلام اللہ علیہا نے ایسی کوئی منّت مانی نہیں تھی۔ اگر مانی ہوتی تو وہ خود ہی ایسا کہتیں۔ اس ہدایت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر ان کی یہ ہدایت کہ یوں کہنا کیا خلافِ واقعہ ایک بات اظہار کی ہدایت نہ ہو گی؟

اس صورت میں یا یہ سمجھا جائے کہ ان کو یہ ہدایت ضمناً اس بات کی ہدایت بھی ہے کہ اس طرح نذر ابھی کر لو[1] اور یا یہ سمجھا جائے کہ خطرات میں جیسے جناب مریم علیہا السلام کو درپیش تھے، اس طرح کے ''مصلحت امیز'' اظہار کی اجازت کی ہے جو اصول تقیہ کے مطابق بالکل درست ہے۔

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـًٔـا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّمَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ۖۚ ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰٮنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۙ ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِىۡ مُبٰرَكًا اَيۡنَ مَا كُنۡتُ وَاَوۡصٰنِىۡ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمۡتُ حَيًّا ۖ ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِىۡ وَلَمۡ يَجۡعَلۡنِىۡ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوۡمَ وُلِدْتُّ وَيَوۡمَ اَمُوۡتُ وَيَوۡمَ اُبۡعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

''تو وہ اس (بچہ) کو گود میں اٹھائے اپنی قوم کی طرف لائیں۔ انہوں نے کہا اے مریم علیہا السلام! یہ تم نے بہت بُرا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! تمہارے باپ برے آدمی نہ تھے اور نہ تمہاری ماں ہی بدکار تھیں۔ اس پر انہوں نے اُس بچہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ انہوں نے کہا ہم اُس سے کس طرح بات کریں جو ابھی گہوارے میں ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے برکت والا قرار دیا ہے جہاں بھی میں ہوں اور مجھے مامور کیا ہے نماز اور زکوۃ پر، جب تک کہ میں زندہ رہوں اور نیک سلوک رکھنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور مجھے اس نے بدنصیب، سرکش نہیں بنایا ہے اور اسلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں دنیا سے اٹھوں گا اور جس دن میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابن اللہ ہونے کی رد:

''اے ہارون کی بہن''۔ اس تخاطب میں اختلاف ہے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہارون سے مراد وہی حضرت ہارون علیہ السلام یعنی حضرت

---

[1] قال الجبائی: کان اللہ تعالیٰ امر بانّ تنذر تہ تعالیٰ الصّمت فاذا کلمها احد قومی بأنّها نذرت صوما صمنا لانّه لا یجوزان بأمر ها بانّها نذرت ولم تنذر لانّ ذلك کذب (تبیان)

موسیٰ علیہ السلام کے بھائی مراد ہیں اور جناب مریم سلام اللہ علیہا انہی جناب ہارون سلام اللہ علیہا کی اولاد سے تھیں اور اُخت ھٰرون کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قبیلۂ ہارون کی ایک خاتون چونکہ عرب میں بنی تمیم کو تمیم اور بنی جرہم کو جرہم کہا جاتا ہے اسی طرح بنی ہارون کو ہارون کہا گیا ہے۔[1]
اور بعض کے خیال میں یہ ہارون کوئی اور شخص ہے۔اب وہ شخص کیسا تھا؟ ایک خیال یہ ہے کہ وہ کوئی بہت نیک آدمی تھا اور اُس کی طرف نسبت دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم جواب تک نیکی میں ہارون کی ایسی تھیں[2] اور تمہارے باپ ماں بھی اچھے اور پارسا لوگ تھے، اب تم نے یہ کیا کیا ہے؟ اور بعض کا تصور یہ ہے کہ یہ ہارون بہت برا آدمی تھا اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کو انہوں نے اخت ھٰرون بزعم خود ان کے اس عمل کی برائی کے لحاظ سے کہا ہے۔ ہماری قدیم تفسیر اس کے مواقع ہے۔[3]
علّامہ طبرسیؒ نے بھی یہ تمام اقوال بغیر کسی تصفیہ کے درج کر دیے ہیں اور جب کوئی مستند تشریح اسکی معصومین علیہم السلام سے ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے؟

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

”یہ ہیں مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام، سچی بات میں وہ خواہ مخواہ شک کرتے ہیں۔ اللہ کیلئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ بیٹا اختیار کرے۔ پاک ہے اُس کی ذات، جب وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو وہ بس اس کیلئے کہتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے اور یقیناً میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے تو بس اُسی کی عبادت کرو۔ یہ صاف سیدھا راستہ ہے۔ اس پر ان جماعتوں نے اختلاف کر رکھا ہے تو وائے ہوں گے اور یہ سننے والے اُس دن جب ہمارے پاس آئیں گے مگر ظالم لوگ آج کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔“

اس پر ان جماعتوں نے آپس میں اختلاف کر رکھا ہے“ یعنی عیسائیوں کے مختلف فرقے اور مسلمان، سب کی الگ الگ باتیں ہیں۔ کوئی خدا کہتا ہے، کوئی خدا کا بیٹا، کوئی تین میں ایک اور اس سب کے برخلاف مسلمانوں کا قول ہے کہ وہ اللہ کے ایک خاص بندے ہیں اور بس۔[4]

---

[1] قال السدی نسبت الیٰ ھارون اخی موسیٰ علیہ السلام لانّھا کانت من ولدہ کما یقال یا اخا بنی فلان (تبیان)
[2] ھو رجل صالح ای یا شبیھتہ فی العفّۃ (جلالین)
[3] انّ ھٰرون کان رجلا فاسقازانیا فشتموھا بہ (علی بن ابراھیم)
[4] قال قوم ھو اللہ وھم العقوبتہ وقال آخرون ھو ابن اللہ وھم النسطوریۃ وقال قوم ھو ثالث ثلٰثۃ وھم الاسرأیلیۃ وقال قوم ھو عبداللہ وھم المسلمون (تبیان)

''اس دن کتنے دیکھنے اور سننے والے ہوں گے''چونکہ غیب کی باتیں عالم آخرت میں سب منظرِ شہود پر آجائیں گی تو اب نہ ان کی نگاہوں میں کوئی دھندلا پن ہوگا اور نہ کانوں پر کوئی پردہ کیوں کہ نظریات نے اس وقت مشاہدات کا لباس پہنا ہوگا' جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾

ہم نے تیری آنکھ سے پردے ہٹادیے ہیں، تو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔(سورۂ ق)

مگر اس دارِ دنیا میں وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں یعنی اس دن وہ یقین لائیں گے جب اُس یقین کی کوئی قیمت نہیں ہوگی لیکن آج جب کہ وہ باتیں ابھی پردۂ غیب میں ہیں، رسول خدا ﷺ پر ایمان کے تقاضے سے وہ انہیں مان لیتے تو یہ ایمان معتبر ہوتا اور وہ ہدایت یافتہ قرار پاتے۔[1]

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٩﴾

''اور انہیں متنبہ کیجیے اُس رنج وحسرت کے دن سے جب کہ جو ہونا ہے وہ ہوجائے گا اور وہ ہیں کہ بے خبری میں مبتلا ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے''۔

''رنج وحسرت کے دن سے''یعنی جب گمراہ اور بے عمل افراد اعتقاد وعمل میں اپنی کوتاہی پر دستِ حسرت مل رہے ہوں گے۔[2]

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٤٠﴾

''یقیناً ہم ہیں جو تمام زمین کے آخری مالک ہیں اور اُن کے جو اس پر بستے ہیں اور ہماری ہی طرف وہ بالآخر پلٹنے والے ہیں''۔

''وارث''وہ ہوتا ہے جو دوسرے کے مرنے کے بعد اس کی املاک کا حقدار ہو، یہاں جتنے ہیں وہ فنا ہونے والے ہیں اور اس پر رہنے والی ذات صرف پروردگار عالم کی ہے[3] اس لئے کہا گیا ہے کہ ہم ہیں جو زمین اور اس پر رہنے والوں کے وارث ہیں اور اسی کا مفہوم ادا کرتے ہوئے ہم نے اس کا ترجمہ ''آخری مالک'' کی لفظوں میں کیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿٤٢﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ

---

[1] یعنی ان الکافرین فی الدّنیا اٰثروا الهدٰی علی الهدٰی فهم فی ذهاب عن الدین وعدول عن الحق والمراد انهّم فی الدّنیا جاهلون وفی الاٰخرة عارفون حیث لا تنفعهم المعرفة (مجمع البیان)

[2] الیوم الّذی یتحسّر فیه الناس علی ما فرطوا فیه من طاعته الله وعلیٰ ما ارتکبوا من معاصیة (تبیان)

[3] ای یعود الینا التصرّف فی الارض وفی من علیها من العقلا وغیرهم لا یبقیٰ لاحد ملك (مجمع البیان)

الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

''اور ذکر کیجیے کتاب میں ابراہیم کا، بلا شبہ وہ ایک پیغمبر بڑے سچے تھے۔ جب انہوں نے کہا اپنے باپ سے کہ اے باپ! کیوں عبادت کرتے ہیں ایسی چیز کی جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور آپ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اے باپ! یقین مانیے کہ مجھے وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کیجیے میں آپ کو سیدھے راستے پر لگاؤں گا۔ اے باپ! شیطان کو نہ پوجیے، یقیناً شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ثابت ہوا ہے۔ اے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو پہنچ جائے خدائے رحمٰن کا عذاب تو آپ شیطان کے شریک حال ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو:

لغت میں آپ میں ''اَب'' کے معنی باپ ہیں، اس لئے ترجمہ تو یہی لفظ لکھنا پڑے گا مگر ہر زبان میں ''باپ'' کا اطلاق صلبی باپ کے علاوہ بنظر احترام اور قسم کے بزرگوں پر بھی ہوا کرتا ہے اور چچا نانا پر باپ کا اطلاق تو خود قرآن مجید سے ثابت ہے جس پر اس تفسیر میں پہلے متنبیہ کیا جا چکا ہے، اس لئے احادیث اہلِ بیت علیہم السلام سے جو ثابت ہوا ہے کہ یہ شخص جس سے تخاطب ہے ابراہیم علیہ السلام کا صلبی باپ نہ تھا بلکہ چچا یا جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے، نانا تھا[1] اسے قرآن کے خلاف سمجھا نہیں جا سکتا۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾

''اس نے کہا کیا تم میرے خداؤں سے اے ابراہیم! روگردانی کیے ہوئے ہو؟ اگر تم نے نہ مانا تو میں تمہیں سنگسار کروں گا اور پھر تمہیں مجھ سے مدّتوں کے لئے چھوٹنا ہوگا۔ انہوں نے کہا خُدا حافظ میں بہر حال آپ کے لئے اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں گا۔ یقیناً وہ مجھ پر بڑا شفیق ہے اور میں خود آپ لوگوں سے اور جس کی آپ لوگ اللہ کے سوا دہائی دیتے ہیں علیحدگی اختیار کرلوں گا اور بس اپنے پروردگار سے دعا کرتا رہوں گا۔ غالباً میں اپنے پروردگار کی دعا سے بدنصیب نہیں رہوں گا''۔

---

[1] الذی یقوله اصحابنا انّه کان جدّه لامّة لانّ اٰباء النبی ﷺ کلّهم کانوا مسلمین الیٰ اٰدم (تبیان) انّ الّذی یقوله اصحابنا انّ هذا الخطاب من ابراهیم علیه السلام انّما توجه الی من سمّاه الله ابا له لانّه کان جدّ ابراهیم لامة وانّ اباه الذی ولده کان اسمه تارخ (مجمع البیان)

آذر کے اتنے سخت تخاطب کے بعد جناب ابراہیم علیہ السلام کا جواب رواداری اور بزرگ کی بزرگداشت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ان کا کہنا سلامٌ علیک، اس کا ترجمہ جو ہم نے کیا ''خدا حافظ'' اس تصور پر مبنی ہے کہ یہ سلام وداع ہے۔ [1]

دوسرا خیال یہ ہے کہ سلام علیک کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری طرف سے اطمینان رکھیے میں آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ [2]

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ آپ کے لئے میری طرف سے آداب وتسلیمات کا سلسلہ قائم رہے گا، کیوں کہ آپ کا مجھ پر تربیت وبزرگی کا حق ہے۔ [3]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وعدہ کو کہ ''میں اپنے پروردگار سے آپ کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کروں گا، پورا کیا جس کا سورۂ شعراء میں ذکر ہے:

إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ ۔ میرے باپ کی بخشش کردے، وہ یقیناً گمکردہ راہوں میں سے تھا۔ (شعراء)

اور قرآن مجید میں دوسری کفار ومشرکین کے لئے طلبِ مغفرت کی مخالف میں رفع دخل کے طور پر اس کا حوالہ بھی دیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ؕ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿۱۱۴﴾ (سورۂ توبہ)

اور ابراہیم علیہ السلام کا طلب مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے وہ نہ تھا مگر ایک وعدہ کی بنا پر جو انہوں نے اس سے کرلیا تھا مگر جب اُن پر بالکل ثابت ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری اختیار کرلی یقیناً ابراہیم اللہ سے لولگانے والے بڑے متحمل آدمی تھے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

''تو جب وہ اُن لوگوں سے علیحدگی اختیار کر چکے، اور اُس سے کہ جن کی وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کو پرستش کرتے تھے تو ہم نے انہیں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام ایسی اولاد عنایت کی اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا اور اُن لوگوں کو اپنی رحمت سے حصّہ عطا کیا اور ان کے آوازۂ شہرت کو حق بجانب طور پر بلند کیا''۔

علیحدگی ذہنی اور عملی پہلے ہی تھی اس لئے کہ انبیاء ومرسلین اپنی قوم کے عقائدِ فاسدہ اور اعمال سیۂ سے بری ہوتے ہیں، یہاں جس علیحدگی کا ذکر ہے، وہ جسمانی علیحدگی ہے یعنی اس کے بعد وہ وہاں سے ہجرت کرکے سرزمینِ شام کی طرف چلے گئے۔ [4]

---

[1] سلام توديع وهجر على الطف الوجوه وهو سلام متاركة و مباعدة (مجمع البيان) تیری سلامتی رہے، یہ رخصت کا سلام ہے (موضح القرآن)

[2] سلام عليك يعنى انّى لا اصيبك بمكروه (جلالين)

[3] اى اكرام وبرّ بحقّ الابوة وشكر التربية (تبيان)

[4] بان ذهب الى الارض المقدّسة (جلالين) قيل انّه اعتزلهم بان خرج الى ناحية الشام (تبيان) اى فارقهم و هاجر هم الى الارض المقدسة (مجمع البيان)

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ کا لغوی مفہوم کے لحاظ سے ترجمہ درج ہو چکا ہے جو عام مفسرین کی تفسیروں کے موافق ہے جس کی تشریح علامہ طبرسیؒ نے یہ فرمائی ہے کہ مختلف مذاہب کے افراد جناب ابراہیم علیہ السلام کی جلالت وعظمت پر متفق ہیں اور یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ ان کے دین پر ہیں اور اسلام میں ان کی یاد اس طرح قائم کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو مفصّل درود کے الفاظ ہیں ان کا جزء ہے:

"كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى اِبْرَاهِيمَ وَ اٰلِ اِبْرَاهِيمَ" (مجمع البیان)

یہ درود نماز جنازہ میں دوسری تکبیر کے بعد ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے۔

مگر ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر جو بسند عالی معصوم علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ "ہم نے اپنی رحمت کا ایک حصّہ انہیں عطا کیا۔ اس سے مراد علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔[۱]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

"اور ذکر کیجئے اس کتاب میں موسیٰ کا۔ یقیناً وہ بڑے کھرے بنائے گئے تھے[۲] اور نبی تھے بھیجے ہوئے۔ اور ہم نے انہیں طور کے دائیں جانب سے صدا دی اور ہم کلامی شرف دیتے ہوئے تقرّب عطا کیا اور انہیں اپنی رحمت سے ہارون ایسا بھائی نبی بناتے ہوئے عطا کیا۔"

ان آیات میں جناب موسیٰ وہارون علیہما السلام کا ذکر آیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

"اور ذکر کیجئے اس کتاب میں اسماعیل کا، بلا شبہ وہ وعدے کے سچے تھے اور وہ بھیجے ہوئے نبی تھے اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے"۔

جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا تذکرہ:

عام خیال یہ ہے کہ یہ جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ ایک دوسرے بزرگوار تھے۔ جلالین نے لکھا ہے:

---

[۱] حدثنی بذٰلك ابی عن الحسن بن علی العسکری علیہ السلام (مجمع البیان)

[۲] ان الله اخلصه لطاعته (تبیان) بفتح اللّام یکون معناه اخلصه الله بالنبوّة واختاره للرّسالة (مجمع البیان) خالص کردہ شدہ (شاہ ولی اللہ)

رَسُوۡلًا اِلٰی جرھم: وہ قبیلہ جرہم کی طرف بحیثیت پیغمبر مبعوث ہوئے تھے۔

اس سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ وہ جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل تھے یا کوئی اور؟ اس لئے کہ جناب ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کے خانۂ کعبہ کے پاس آباد ہونے کے بعد قبیلہ جرہم ہی تھا۔ جس نے آ کر مکہ میں بودوباش اختیار کی تو ممکن ہے وہی جناب اسماعیل جو ذبیح اللہ ہیں، اس قبیلہ کی طرف مبعوث شدہ نبی ہوں جن کا ذکر ہو رہا ہے۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے صراحۃً اس تذکرہ کو انہی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق کیا ہے[1] مگر ہماری قدیم تفسیر جو علی بن ابراہیم قمی کی ہے، پہلے خیال سے متفق ہے۔

علاّمہ طبرسیؒ نے پہلے تو صاف اسے جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل علیہ السلام کے بارے میں بتایا ہے اور دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ دوسرے اسماعیل فرزند حزقیل ہیں اور اس کے متعلق امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث نقل کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ امام علیہ السلام کی طرف منسوب حدیث دونوں طرف موجود ہے، اس لئے تعارض کی بناء پر اس سے کسی قول کو ترجیح حاصل نہیں ہوتی۔

وَاذۡكُرۡ فِی الۡكِتٰبِ اِدۡرِيۡسَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

"اور ذکر کیجئے اس کتاب میں ادریس علیہ السلام کا۔ وہ بلاشبہ بہت سچے نبی تھے اور ہم نے اُنہیں اونچے مقام پر بلند کیا"۔

جناب ادریس علیہ السلام اور ان کی رفعت جسمانی:

یعنی انہیں آسمان کی سیر کرائی جو ایک محدود درجہ تک کی معراج تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے بھی ترجمہ میں لکھا ہے: "بمکانی بلند یعنی برآسمان"

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: "بہشت کی سیر مانگی، پھر وہاں رہ گئے اللہ کے حکم سے" (موضح القرآن)

اب جب انبیاء ماسلف میں آسمان کی طرف معراج کی مثال مسلّم طور پر موجود ہے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہل سنّت میں سے ایک طبقہ معراج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیت المقدس تک محدود کر کے افضل المرسلین کی منزل جو جناب ادریس علیہ السلام کی منزل سے بھی کم تر قرار دیتا ہے۔ رفعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقاضا جواز روئے قرآن ثابت بھی ہے، یہ ہے کہ آپ کی منزل معراج کو جناب ادریس علیہ السلام سے بالاتر مانا جائے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنۡ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۚ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ۚ وَّمِنۡ ذُرِّيَّةِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡرَآءِيۡلَ ۚ وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَاجۡتَبَيۡنَا ؕ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ السجدۃ

"یہ ہیں پیغمبروں میں سے وہ جنہیں اللہ نے اپنی خاص نعمت سے نوازا ہے آدم کی اولاد میں سے اور اُن میں سے

[1] اسماعیل ابن ابراھیم (تبیان)

جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے اور اُن میں سے جن کو ہم نے رہنمائی کی اور منتخب کیا، جب اُن کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت ہوتی تھی تو وہ گر پڑتے تھے سجدہ میں اور روتے ہوئے''۔

ان آیات کو گزشتہ آیات کے ساتھ دیکھا جائے تو لف ونشرِ غیر مرتّب کی صورت ہے۔ وہاں ادریس علیہ السلام کا سب سے آخر میں ذکر تھا، یہاں سب سے پہلے ہے: مِنۡ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ''آدم کی اولاد میں سے'' اور جناب ادریس علیہ السلام صرف اس کے تحت میں آتے ہیں اس لئے کہ اُنہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جناب نوح علیہ السلام سے مقدم اوران کے اجداد میں سے تھے۔ [۱]

اس کے بعد ہے کہ اُن کی نسل کا ذکر جو جناب نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی پر سوار تھے اس میں جناب ابراہیم علیہ السلام ہیں اور پھر ذریّت ابراہیم کا ذکر ہے اس میں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب ہیں اور پھر اسرائیل کا ذکر ہے، اس میں جناب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام ہیں جن کا ذکر وسط میں ہے اور زکریا یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں جن کا ذکر اس سورہ میں گزشتہ انبیاء سے مقدم ہے۔

اب اس کے بعد از سرِ نو آغاز کلام کر کے جس جماعت کا ذکر ہو رہا ہے کہ ''اور اُن میں سے جنہیں ہم نے رہنمائی کے لئے منتخب کیا''۔ یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ جماعت پہلے لوگوں سے الگ ہے جس کے خوف وخشیّت الٰہی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں کی حدیث میں ہے کہ اس سے محمد وآل محمد علیہم السلام مراد ہیں۔ [۲]

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدۡنِ ِۨالَّتِىۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِيًّا ﴿۶۱﴾

''اب اُن کے بعد اُن کی جگہ پر آئے ایسے ناخلف جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور خواہشوں کی پیروی کی، تو یہ اس گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے، سوا اُس کے جو توبہ کرے اور ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے تو یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی، جاودانی زندگی والے باغ جن کا وعدہ خدائے رحمٰن نے غیب کے طور پر اپنے بندوں سے کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ سامنے آنے والا ہے''۔

باغہائے بہشت کی اوصاف:

نماز کو برباد کرنے کا مطلب ترک نماز بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ بعض افراد کا خیال ہے مگر اس سے زیادہ مفہوم لفظ سے قریب تر وہ ہے جس

---

[۱] فکان لادریس شرف القرب من اٰدم لانّہ جدّ نوح (تبیان)

[۲] روی عن علی بن الحسین علیہ السلام انہ قال نحن عنینا بھا (مجمع البیان)

کی تائید ہمارے رہنمایانِ دین کے ارشاد سے ہوتی ہے کہ اس سے مراد اوقاتِ فضیلت نماز کا لحاظ نہ کرنا اور اس کی ادائیگی میں تساہلی برتنا ہے۔
غیّ کے عام معنی تو گمراہی کے ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے جس میں ہم تنہا نہیں ہیں[1] اور اُس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے، دوسری جگہ:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۔ اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے گناہ سے دوچار ہوگا، (یعنی گناہ کے انجام سے) فرقان۔ ۶۸
مگر دوسرا قول اس آیت میں ہے کہ غیّ آخرت کے کسی ہولناک مقام کا نام ہے، اس صورت میں اسے ترجمہ میں تبدیل نہ ہونا چاہیے بلکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ ''وہ غیّ سے دوچار ہوں گے۔''[2]

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝۶۲ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝۶۳

''نہیں سنیں وہاں کوئی مہمل بات، ہاں بس سلام کی صدا ہوگی اور اُن کے لئے ان کی مقررّہ روزی ہے وہاں صبح اور شام یہ ہے وہ بہشت جس کا ورثہ بنائیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اُسے جو پرہیز گار ہو۔''

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝۶۴ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝۶۵

''اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے پروردگار کے حکم سے اُس کے قبضہ میں ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے اور آپ کا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے، پروردگار آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا، تو اُس کی عبادت کیجئے اور اُس کی عبادت کے لئے مشکلات کو برداشت کیجئے۔ کیا اُس کا کوئی دوسرا ہم نام آپ کو معلوم ہے؟!''

موجودہ نظم قرآنی اور سلسلہ آیات کو اہمیت دینے والے بھی ان آیات کا ربط گزشتہ سلسلہ کلام سے قائم نہیں کر سکے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جبرئیل علیہ السلام ایک مدت دراز تک وحی نہیں لائے، اُس کے بعد آئے تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے عرصہ تک نہ آنے کی شکایت کی اُس کے جواب میں اُنہوں نے یہ کہا۔
ہمارے مفسرین میں سے جناب شیخ الطائفہؒ نے قیل کہہ کر (بطور قوم ضعیف کے) درج کیا ہے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے ایک دفعہ فرمایا کہ آخر تم اتنا کم کیوں آتے ہو؟ زیادہ کیوں نہیں آتے! اس پر انہوں نے یہ جواب دیا۔ یہ قول ابن عباس، قتادہ

---

[1] خواھند یافت جزائے گمراھی (شاہ ولی اللہ) قیل معناہ یلقون مجازاۃ غیّھم (تبیان)
[2] ملاقات کریں گے غیّ کی (شاہ رفیع الدین) ھو وادفی جھنم (جلالین) قال عبداللہ بن مسعود الغیّ وادفی جھنم (تبیان)

ضحاک، مجاہد اور ابراہیم کا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کا جزء بنا کر لکھ دیا ہے: ''فرشتگان گفتند''

شیخ الطائفہؒ نے اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس کے مقابل میں دوسرا قول کیا ہے جو قوت رکھتا ہے اور جب متقدمین کو کوئی چیز دست یاب نہیں ہوئی تو آج چودہ سو برس کے بعد ہم کہاں سے اُسے لا سکتے ہیں؟ بہرحال صورت حال یہ ہے کہ اس شان نزول سے ضمیر مطمئن نہیں ہے اور صحیح شان نزول کی تشنگی شدت سے محسوس ہوتی ہے جس کی سیرابی کا ابھی کوئی ذریعہ نہیں نکلا ہے۔

''اُس کے قبضہ میں ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے''۔ اسے شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں ''قیامت'' اور جو ہمارے پیچھے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''یعنی از ابتدائے خلق آسمان وزمین'' (فتح القرآن)

یہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے۔ اس میں کچھ اضافہ کے ساتھ ہے:

مابین ایدینا ای امامنا من الامور الاخرۃ وما خلفنا من امور الدّنیا وما بین ذلك ای مایکون من هذا الوقت الیٰ قیام الساعة ای له علم ذلك جمیعا۔

اس کے برخلاف شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ہمارے آگے پیچھے کہا آسمان وزمین کو۔ اترتے ہوئے زمین آگے، آسمان پیچھے چڑھتے ہوئے وہ پیچھے، یہ آگے (موضح القرآن)

ایک تفسیری پیچیدگی جو اُس شان نزول کے لحاظ سے ہے، یہ ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے پوچھا اور فرشتہ نے یہ جواب دیا تو یہ جواب جزء قرآن کیوں کر ہو گیا؟ قرآن تو وہ کلام ہے جس کا ملک کو حامل بنایا جاتا ہے نہ کہ خود ملک کی بات چیت جو رسول ﷺ سے ہو، اس کا حل شاہ عبدالقادر نے یوں کیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے یہ کلام سکھایا جبرئیل علیہ السلام کو کہ جواب یوں کہو کلام ہے اللہ کا جبرئیل کی طرف سے جیسا: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہم کو سکھایا ہے''

مگر جیسا کہ ہم نے پارۂ اول میں سورۂ حمد کی تفسیر کے شروع میں تحریر کیا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ جس سلسلہ کا جزء ہے، یعنی سورہ الحمد، اس کے پہلے اقراء تھا جو کلام عبد کو کلام الٰہی میں منسلک کرتا ہے۔ یہاں اُس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔

بہرحال جیسا کہ پہلے میں اپنی بے اطمینانی ظاہر کر چکا ہوں، میں اس شان نزول سے مطمئن نہیں ہوں مگر جب ہمارے متقدّمین اس آیت کے محلِ تنزیل کا صحیح طور پر پتہ نہیں لگا سکے تو ہم اب کیوں کر پتہ لگا سکتے ہیں۔

''اللہ کے نام سے سب اُس کی صفت ہیں۔ یعنی کوئی ہے اُس صفت کا'' (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین بھی اس سے متفق ہیں[1] اور یہ سوال کیا کہ ''کیا تمہیں اس کا ہم نام معلوم ہے''؟ صورۃً سوال ہے مگر حقیقۃً نفی مقصود ہے کہ اُس کا ہم نام کوئی نہیں ہے یعنی اُس کے صفات وکمالات، دوسری لفظوں میں اُلوہیت میں اُس کا شریک کوئی نہیں ہے۔[2]

---

[1] سمیّا ای مثلا وشبها (تبیان)

[2] هذا استفهام بمعنی النّفی ای لانعلم من یسمی بلفظة الله (مجمع البیان)

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾

''اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مرجاؤں تو پھر مستقبل میں زندہ ہوکر باہر لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں ہے کہ ہم نے اُس کو پیدا کیا اس کے پہلے جب کہ وہ کچھ تھا ہی نہیں تو قسم ہے تمہارے پروردگار کی ہم انہیں شیطانوں کے ساتھ ساتھ حشر میں لائیں گے، پھر اُن کو دوزخ کے اردگرد گھٹنوں کے بل گرتی ہوئی شکل میں حاضر کریں گے۔ پھر ہم ہر پارٹی میں سے الگ کریں گے کہ کون ان میں سے زیادہ خدائے رحمٰن کے مقابلہ میں سرکشی کرنے والا تھا؟ پھر ہم خوب واقف ہیں کہ ان میں کے کون اُس میں داخل ہونے کے زیادہ سزاوار ہیں''۔

اثبات معاد:

مذکورہ بالا آیات میں معاد کو ثابت کیا گیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

''اور کوئی تم میں ایسا نہیں ہے، جو اُس کی طرف جائے نہیں، یہ تمہارے پروردگار کا یقینی طور پر طے شدہ فیصلہ ہے، پھر جو پرہیز گار ہوں گے، انہیں ہم نجات دیدیں گے اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے اس عالم میں وہ گھٹنوں کے بل گئے ہوئے ہوں گے''۔

دوزخ کی طرف سے عمومی گزر:

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسّرین کا تصور ہے کہ داخل جہنم سب ہی ہوں گے چاہے مومنین ہوں [1] مگر دوسرے معنی یہ ہیں اور وہی درست معلوم ہوتے ہیں کہ گزریں گے اُدھر سے سب لیکن جو اہل ایمان میں وہ گزرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے [2] اور جو کافر ہی یا منافق، وہ اُس میں گر جائیں گے، ہماری قدیم تفسیر جو معصوم علیہ السلام سے وارد ہے اس کے موافق ہے۔[3] اور دوسرے آیات قرآن بھی اسے تقویت دیتے ہیں جیسے:

---

[1] ای داخل جهنم (جلالین)

[2] قال قوم و هو الصّحیح انّ ورودهم هو وصولهم الیها و اشرافهم علیها من غیر دخول منهم فیها (تبیان)۔

[3] عن ابی عبدالله علیہ السلام قال ماتسمع الرّجل یقول وردنا ماء بنی فلاں فهو الورود ولم یدخلها (علی بن ابراهیم)

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ ۔(انبیاء)

جن پر ہمارا احسان پہلے سے ہے، یہ اُس سے دور رہیں گے ۔[۱]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِى الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾

''اور جب اُن کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کافر لوگ اُن سے کہ ایمان لائے، کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون بہتر ہے، مکان کے لحاظ سے اور کون زیادہ اچھا ہے رونقِ محفل کے اعتبار سے، حالانکہ کتنی نسلیں ہم نے ان کے پہلے ہلاک کی ہیں جو ساز و سامان اور دکھاوے میں ان سے بہتر تھیں، کہیے کہ جو گمراہی میں ہوتا ہے تو بالکل ٹھیک ہے کہ سب کو فیض پہنچانے والا اُسے زیادہ عطا کرتا رہے، یہاں تک کہ جب آنکھوں سے دیکھیں گے وہ جس کا وعدہ وعید اُن سے ہوا ہے، خواہ یہیں کا عذاب اور خواہ قیامت، تب اُنہیں معلوم ہوگا کہ کون زیادہ بُرا ہے مکان کے اعتبار سے اور زیادہ کمزور ہے لاؤ لشکر کے لحاظ سے''۔

یہ کفّار کی ذہنیت جو ان آیات میں اُن کے عمل سے نمایاں کی گئی ہے، اس کوتاہ اندیشی پر مبنی ہے کہ یہی دنیا سب کچھ ہے، لہٰذا جس کے پاس ساز و سامان دنیا زیادہ ہے، وہی کامیاب و کامران ہے[۲] اس کے بالمقابل آخرت کا تصور اس ساز و سامان دنیا کو بے اعتبار قرار دیتا ہے جس کی تصدیق کے لئے ان آیات میں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں گزشتہ امتوں کے انجام کی طرف ان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ساز و سامان دنیا تو ان کے پاس اس سے زیادہ تھا۔ پھر انجام کیا ہوا؟

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

''اور جنھوں نے ہدایت حاصل کی، اللہ ان کی اور زیادہ ہدایت کا سامان کرتا ہے اور باقی رہنے والے نیک کام تمہارے پروردگار کے یہاں بہتر ہیں ثواب کے لحاظ سے اور بہتر ہیں مآل کے اعتبار سے''۔

---

[۱] كيف يكون مبعوا عنها مع انّه يدخلها وذٰلك متناقض (تبيان)

[۲] انّما تفاخروا بالمال وزينة الدّنيا ولم يتفكّروا فى العاقبة (مجمع البيان)

الفاظ سے ظاہر ہے کہ پہلا حصولِ ہدایت باختیار خود ہے جس کے صلہ میں مزید توفیقات ان کے شامل حال ہوتے ہیں۔[۱]

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

''کیا دیکھا آپ نے اُسے جس نے ہماری آیات کے ساتھ کفر اختیار کیا اور کہا مجھے مال اور اولاد کی نعمت ضرور مل جائے گی۔ کیا اسے غیب کی خبر معلوم ہوئی ہے۔ اس سے اللہ کے یہاں سے کوئی عہد و پیمان حاصل کر لیا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہم جو وہ کہتا ہے، اسے لکھ لیں گے اور اس کے عذاب میں پورے طور اضافہ کریں گے اور جو کچھ وہ کہتا ہے، اس کے بعد ہم اس کے وارث ہوں گے اور وہ ہمارے پاس ایک اکیلا آئے گا۔''

کافر کے اس کہنے کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ اگر اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے تو اس زندگی میں بھی اسی طرح میری اولاد ہوگی اور مال و دولت حاصل ہوگا[۲] اس کی رد کی گئی ہے کہ یہ مال و اولاد تو بس اس دنیا سے رخصت ہونے تک ہے۔ وہاں یہ کچھ نہیں ہوگا، وہاں تو ہر ایک اکیلا آئے گا۔

دوسرا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ کافر کہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں ایمان لا کر کیا کروں، اپنے کفر پر قائم ہوں تب بھی مال اور اولاد جو میرا مطمح نظر ہیں، وہ تو میرے لئے اس حالت کفر میں بھی حاصل رہیں گے۔[۳]

آخر کا فقرہ: نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ اس تشریح کے زیادہ مطابق ہے یعنی یہ مال اولاد جنہیں وہ کہتا ہے اس کے پاس ''تا کَے'' رہیں گے؟ اگر ان سب نے اس کی زندگی میں ساتھ بھی دیا تو وہ خود بیٹھا نہیں رہے گا۔ آخر میں وہ چلا جائے گا اور اس کے بعد نتیجہ میں تو وہ مال اور اولاد سب ہمارے ہی قبضہ میں ہوگا، جب تک چاہیں رکھیں اور جب چاہیں ختم کر دیں۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''وارث کریں گے ہم اُس چیز کا جو کہتا ہے''۔

یہ ترجمہ نُوْرِثُهٗ کے لفظ کا ہے جو قرآن میں نہیں ہے، نُوْرِثُهٗ کا نہیں جو قرآن میں ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾

اور انہوں نے بنائے ہیں اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا کہ وہ ان کے لئے شان و شوکت کا باعث ہوں ہرگز ایسا نہ ہوگا

---

[۱] ان یفعل بهم الالطاف یستکشرون عندها الطاعات (تبیان)

[۲] لا تیّن علی تقدیر البعث مالا وّولدا (جلالین) اگر پھر جیوں گا تو یہی مال اور اولاد وہاں بھی ہوگا۔ (موضح القرآن)

[۳] قیل اعطی فی الدّنیا اذا اقمت علی دین اٰبائی وعبادۃ الھی اعطی امالا وّولدا (مجمع البیان)

وہ عنقریب اُن کی عبادت سے انکاری ہوں گے''۔

کون؟ کس سے؟ اس میں دو قول ہیں [1] ایک قول یہ ہے کہ یہ کافر لوگ احوالِ قیامت دیکھنے کے بعد ان معبودان باطل سے انکاری ہوں گے [2] اور دوسرے یہ کہ وہ معبودان باطل ان سے انکاری ہوں گے۔ [3]

قرآن مجید کی دوسری آیات سے دونوں باتوں کا وقوع ثابت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کا کافروں تک بھیجا کہ وہ اُنہیں شدّت سے جنبش میں لاتے ہیں، تو جلدی نہ کرو ان پر تو گن گن کر اُن کی عمر کے دن پورے کر رہے ہیں جس دن پر ہیزگاروں کو محشر کے دن خدائے رحمٰن کی طرف ہم سواریوں پر لائیں گے اور گنہ گاروں کو دوزخ کی طرف داخلہ کے لئے تشنگی کے عالم میں ہنکا کر لے جائیں گے۔ اُنہیں شفاعت کا کوئی اختیار نہ ہوگا مگر جس کے لئے اللہ کی طرف سے یہ منصب حاصل ہو گیا ہو''۔

ثبوت شفاعت:

''ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا''۔ یعنی اُنہیں اُن کی طرف جانے سے راستے میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ [4]

قرآن مجید میں جہاں بھی نفی شفاعت ہے، وہاں اکثر کسی طرح کا استثناء موجود ہے۔ اس آیت میں جو استثناء ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہر کوئی ہستی یا کچھ ہستیاں ایسی ضرور ہیں جنہیں خالق نے شفاعت کا منصب عطا کیا ہے۔ ایک دوسرے معنی اس کے یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ بس اُس کی شفاعت ہو سکے گی جس نے اللہ کے یہاں سے وعدۂ مغفرت لے لیا ہو یعنی شہادتین کا قرار رکھتا ہوا اسلام کی بنیاد ہے۔ [5]

اس صورت میں بھی چاہے شفاعت کرنے والے کے وصف پر کوئی روشنی نہ پڑے لیکن اجمالی طور پر اصل شفاعت کا ثبوت تو ہو ہی جاتا

---

[1] قیل فی معناہ قولان (تبیان)

[2] منکر خواھند شد پرستش کنندگان معبودان خود را (شاہ ولی اللہ)

[3] سیکفرون ای الآلھة بعبادتھم ای یقرنہا (جلالین)

[4] ای خلّینا بینھم وبین الشیاطین اذا وسوسوا بینھم ودعوھم الی الضّلال (مجمع البیان)

[5] عھدا ای شھادۃ ان لا الہ الّا اللہ (جلالین) یعنی مسلمان شدہ (شاہ ولی اللہ)

ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

''اورانہوں نے یہ کہا کہ خدائے رحمٰن نے بیٹا قرار دیا ہے،ارے تم نے ایسی بری بات کہی ہے کہ جس سے عجب نہیں آسماں شگافتہ ہو جائیں اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جائیں کہ انہوں نے خدائے رحمٰن کیلئے بیٹا تجویز کیا حالانکہ خدائے رحمٰن کیلئے سزاوار نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔آسمانوں اور زمین میں کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ خدائے رحمٰن کی بارگاہ میں ایک بندہ کی صورت میں آنے والا ہے۔وہ ان کے احاطہ کئے ہوئے ہے اور اُس نے پوری طرح اُن کا جائزہ لیا ہے اور ہر ایک ان میں سے اس کے پاس قیامت کے دن اکیلا آئے گا''۔

خالق کے لئے تصورِ اولاد کے جرم کی اہمیت:

اس کے پہلے جب یہ الفاظ آئے تھے کہ اللہ نے بیٹا قرار دیا ہے تو بعض اہل نظر کی رائے اسکے مفہوم پر نظر کرتے ہوئے یہ درج کی گی تھی اور ہم نے بھی اس کے موافق رجحان ظاہر کیا تھا کہ اس کے معنی متبنیٰ بنانے کے ہیں جس کی تائید میں تلاش سے عیسائیوں کے ایک طبقہ کا خیال مل گیا تھا کہ وہ جناب عیسیٰ کو حقیقی بیٹا نہیں مانتے بلکہ متبنی سمجھتے ہیں مگر یہاں شروع کے الفاظ وہی کرتے ہوئے کہ :اتّخذ الرحمٰن ولدًا ''اللہ نے بیٹا قرار دیا ہے''بعد میں جس ہولناک انداز میں اس قول کے شدید طور پر غلط ہونے کا اظہار کیا گیا ہے،وہ متبنی بنانے کے تصور پر منطبق نہیں کیوں کہ یہ بات غلط سہی مگر اسی شدّت سے عظمت الٰہی کو صدمہ نہیں پہنچاتی کہ اُس کے نتیجہ کو اتنے شدید انداز میں پیش کیا جائے۔یہ تو ایسے ہی تصور کے ساتھ سازگار ہے کہ واقعی کسی کو اس کا بیٹا کہا جائے۔اس سے نتیجہ الوہیت حضرت باری تعالیٰ اور اس کے جلال کو شدید صدمہ پہنچتا ہے جسے اس انداز میں پیش کرنا درست ہے جو یہاں قرآن مجید نے اختیار کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

''بلا شبہ وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے،اُن کے لئے خدائے رحمٰن محبت قرار دینے والا ہے''۔

ایک خاص جماعت کی محبت کے فرض قرار دیئے جانے کا پیشگی اعلان:

"قرار دینے والا ہے"، یعنی فطری طور پر دلوں کو ان کی جانب مائل کرنے والا اور ان کی محبت دلوں میں ڈالنے والا ہے [ا] یا حکمی طور پر ان کی محبت کا فریضہ عائد کرنے والا ہے۔

الفاظ قرآن یہی بتاتے ہیں اور مزید نگاہ دوڑائی جائے تو خلیل علیہ السلام کی دعا اپنی ذریت کے لئے اسی قرآن میں ملے گی کہ:

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ: قرار دے انسانوں کے دلوں کو کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں۔ (ابراہیم۔ ۳۷)

پھر متفق علیہ احادیث کی روشنی میں اس کا مصداق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود بھی ہے جن کی محبت فریضہ ایمانی کی حیثیت رکھتی ہے مگر معلوم نہیں جلالین نے کس بنیاد پر یہ معنی دیئے ہیں کہ:

ودّفیما بینهم یتوآدون ویتاحابّون و یحبّهم الله تعالیٰ: محبت آپس میں وہ کہ ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھیں اور خداوند عالم ان سے محبت رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے بھی حاشیہ میں یہ غیر متبادر لکھے ہیں کہ:

"یعنی بایکدیگر دوست باشند" (فتح الرحمٰن)

ان سے اچھے ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر ہیں جنہوں نے بڑے شک اور تذبذب کیساتھ سہی مگر جو اصل آیت سے معنی سمجھ میں آتے ہیں اور جو دوسرے دلائل کے مطابق ہیں، وہ بھی درج کر دیے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یعنی ان سے محبت کرے گا یا ان کے دل میں اپنی محبت پیدا کرے گا یا خلق کے دل میں ان کے محبت" (موضح القرآن)

قدیم مفسرین میں سے ربیع بن انس کا قول ہے جسے جناب شیخ طوسیؒ نے نقل کیا ہے:

اذا احبّ الله عبداً طرح محبته فی قلوب اهل السمآء و فی قلوب اهل الارض (تبیان)۔

"جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کی محبت ڈال دیتا ہے اہلِ آسمان کو دلوں میں اور اہل زمین کے دلوں میں۔

علّامہ طبرسیؒ نے متعدد احادیث درج کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے بارے میں ہے، جن کے گل سرسید حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ ایک روایت جناب ابن عباسؓ سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ہے۔

فما من مؤمن الّا و فی قلبه محبه لعلیّ:

کوئی بھی مومن نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے دل میں علی علیہ السلام کی محبت ہے۔

دوسری ابوحمزہ ثمالی کی روایت ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا تم اللہ سے دعا کرو کہ:

اللّٰهم اجعل لی عندك عهدا واجعل لی فی قلوب المومنین ودّا:

خداوند! مجھے اپنے یہاں ایک خاص منصب عطا کر اور میرے لئے مومنین کے دل میں محبت قرار دے۔

[ا] پیدا خواهد کرد برائے ایشان دوستی (شاہ ولی اللہ) کرے گا واسطے ان کے رحمٰن محبّت (شاہ رفیع الدّین)

حسب ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں یہ مناجات کی اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس طرح کا مضمون جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی روایت میں بھی وارد ہے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾

"اور ہم نے اُسے آپکی زبان کے ذریعے اس لئے آسان بنادیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ سے پرہیزگاروں کو خوش خبری سنائیں اور اس کے ساتھ اہل عناد کو عذاب سے متنبہ کریں اور کتنی ہی ہم نے ان کے پہلے نسلیں ہلاک کیں، کیا اُن سے کسی کو بھی اب تم دیکھتے ہو یا اُن کی کوئی ہلکی سی بھی آواز سنتے ہو؟

قرآن کو "آسان" کہہ کے تفسیر سے بے نیازی کا دعوٰی کرنے والے دیکھیں کہ قرآن نے اس آسانی کو زبان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ کیا ہے [1] اسلئے اس زبان کے بیان کو چھوڑ کر اگر قرآن کو بطور خود دیکھیے تو اُسے آپ کا آسان سمجھنا غلط ہوگا اور اسے بطور خود سمجھ کر نتائج آپ نکالیں گے، وہ بھی غلط ہوں گے۔

[1] آسان ساختیم قرآن را بزبان تو (شاہ ولی اللہ) آسان کیا اس قرآن کو ساتھ زبان تیری کے (شاہ رفیع الدین)

سُوْرَةُ طٰهٰ

مکی ----۱۳۵---- آیات

نام اس سورہ کا پہلے ہی لفظ پر ہو گیا ہے جس سے سورۃ کا آغاز ہوا ہے۔

سورۂ طٰہٰ کے خاص مضامین:

اس میں خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مبعوث برسالت ہونا، ان کا دربار فرعون میں جانا، ساحروں سے مقابلہ ہونا اور اس کا انجام بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے جس میں دوسرے مقامات پر جو بیان ہوا ہے اس پر خاص اضافے ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جناب ہارون علیہ السلام کے لئے دعا، ولادت کے بعد ان کا تابوت میں رکھ کر سپرد دریا کیا جانا اور اس کا نتیجہ فرعون ایسے سرکش سے جناب موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو معجزہ کا عقلی معیار جس پر ہم نے مقدمہ تفسیر میں کافی روشنی ڈالی ہے۔ سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام، اس کے علاوہ نفئ شفاعت سے استثناء جس سے ثبوت شفاعت مستفاد ہوتا ہے۔ جناب آدم علیہ السلام کو جنت میں رکھتے وقت وہاں کے فوائد کا بیان کرنا اور شیطان کی ضرر رسانی سے یہ کہہ کر ڈرانا کہ کہیں یہ اس جنت سے تمہارے نکلنے کا باعث نہ ہو جائے جو اس کی دلیل ہے کہ درخت کے پاس جانے سے ممانعت جس کی خلاف ورزی شیطان کے کہنے سے ہوئی، یہ نہی ارشادی تھی، نہ کہ مولوی جس کی مخالفت منافی عصمت ہو۔ اوقات نماز کی طرف اشارہ--------وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے"

طٰہٰ ① مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ② اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ③ تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ④

"طا۔ ہا۔ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا ہے کہ آپ زحمت و مشقت اٹھائیں بلکہ نصیحت کے لئے اس کے واسطے جو ڈرے۔ اتارا جانا اُس کی طرف سے جس نے زمین اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا"۔

لفظ "طہٰ" جس سے آغاز سورہ ہوا ہے، وہ مثل الٓمّٓ اور حٰمٓ اور کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ کے ہے جنہیں مقطعات قرآنیہ کہتے ہیں اور جن کے متعلق پہلے پارہ میں بحث آ چکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ رازہائے سربستہ ہیں جن کے معنی ہماری سمجھ سے باہر ہیں اور ان کے معنی سمجھنے کے ہم مکلّف بھی نہیں ہے۔ اس طرح لفظ طٰہٰ کو بھی قدرت کا ایک راز سمجھنا چاہیے، مگر معلوم نہیں کیوں اسے خاص طور پر حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک نام سمجھ لیا گیا ہے اور اس لئے اہل بیت معصومین علیہم السلام کے لئے آل طٰہٰ و یٰس کی ترکیب مستعمل ہے اور طٰہٰ کے معنی اکثر طیب و طاہر کے لئے جاتے ہیں،

ابھی تک میرا ذہن اس کے ماخذ کی دریافت سے قاصر ہے۔

شان نزول میں وارد ہوا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سورہ کے اترنے سے پہلے عبادت خدا بڑی مشقّت اٹھاتے تھے۔ اِسی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ قرآن اس لئے آپ پر نہیں اتارا گیا ہے کہ آپ اس قدر زحمت ومشقّت برداشت کریں یعنی عبادت میں زحمت شاقّہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

اس سے مختلف دوسری شان نزول بھی آئی ہے مگر وہ کسی معصوم علیہ السلام کی زبانی وارد نہیں ہے۔[2] جب کہ پہلی شان نزول کے لئے معصومین علیہم السلام کی زبانی روایت موجود ہے۔[3]

اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۝۵

''وہ سب کو فیض پہنچانے والا ہے[4] اُس کا عرش پر اقتدار قائم ہے''۔

چونکہ پہلے پارہ میں ثمّ استوی علی العرش آچکا ہے، اس لئے اس کی تشریح جتنی ممکن ہے، وہ ہو چکی ہے۔ بہر حال وہ عرش پر قائم ہے مگر ایسا قائم ہونا۔ جو اس کی ذاتِ لامکان کے شایان شان ہو[5] اور جس سے جسمیت لازم نہ آتی ہو، اس لئے کہ وہ جسم وجسمانیت سے بری ہے۔[6]

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ۝۷ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۝۸

''اُس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو زمین کے نیچے ہے اور اگر تم زور سے زور بات کہتے ہو تو (خیر کہو) یقیناً اللہ چپکی کی بات اور اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے۔ کوئی خدا نہیں سوائے اس اللہ کے۔ اُسی کے ہیں تمام اچھے نام''۔

''چپکے کی بات'' سے بھی زیادہ چھپی چیز، دل ہی دل میں یادالٰہی کرنا اُس کی نیّت ہے، خدا اس سب سے واقف۔[7] اور جب وہ اس

---

[1] لتتعب بما فعلت بعد نزوله من طول قيامك لصلوٰة اللّيل اى خفّف عن نفسك.(جلالين)

[2] قال الحسن هو جواب للمشركين حين قالو انّه شقّى (مجمع البيان)

[3] عن ابى عبدالله وابى جعفر عليهما السلام قالا كان رسول الله ﷺ اذا صلىٰ قام على اصابع رجليه حتىٰ تورما فانزل الله (على ابن ابراهيم)

[4] اى هوا الرّحمن (مجمع البيان)

[5] استواء يليق به (جلالين)

[6] امّا الاستواء بمعنى الجلوس على الشئ فلا يجوز عليه تعالىٰ لانّه من صفة الاجسام والاجسام كلها محدثة (تبيان)

[7] اخفىٰ منه اى ماحدّثت به النفّس وما خطر ولم تحدث به (جلالين)

سب سے واقف ہے تو اسے پکارنے میں آواز زیادہ بلند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔[1]

چونکہ اس سے پہلے خالق کا ذکر ''الرحمٰن'' سے ہوا ہے اور اس رحمٰن کی لفظ سے مشرکین وحشت محسوس کرتے تھے جس کا کئی جگہ قرآن مجید میں تذکرہ ہے تو اسی وحشت کو دور کرنے کے لئے سمجھایا گیا ہے کہ رحمٰن ایک اچھی صفت کی حامل لفظ ہے اور جتنے اچھے صفات ہیں، وہ خالق کی ذات میں ہیں، اس لئے رحمٰن بھی وہی اللہ ہے۔

اس میں وحشت کی کونسی بات ہے؟[2]

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝٩ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝١١ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٢ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝١٣ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝١٤ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝١٥ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝١٦

''اور کیا پہنچا ہے تم تک واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا؟ جب اُنہوں نے ایک آگ دیکھی تو اپنے بال بچّوں سے کہا کہ تم ٹھہرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے، بہت ممکن ہے کہ میں تمہارے پاس اُس میں سے کچھ آگ لے آؤں یا اُس آگ پر کوئی رہنمائی حاصل کروں، تو جب اس کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے صدا دی گئی کہ اے موسیٰ علیہ السلام ! میں تمہارا پروردگار ہوں تو اپنی دونوں جوتیاں اتار دو۔ بلاشبہ تم مقدّس و محترم وادی طویٰ میں ہو اور میں نے تمہیں منتخب کیا ہے تو غور سے سُنو اُسے جو وحی ہوتی ہے، بلاشبہ میں اللہ ہوں، کوئی خدا نہیں سوا میرے تو میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز ادا کرو، یقیناً قیامت آنے والی ہے، چاہتا ہوں کہ پوشیدہ رکھوں اُسے تاکہ ہر نفس کو معاوضہ ملے اس کا جو وہ کوشش کرے تو تمہیں اُس سے روکے نہ کوئی جو اُس پر ایمان نہیں رکھتا اور جو اپنی نفسانی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے''۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تفصیلی بیان ---- آگ لینے کو جانا اور پیغمبری پانا:

[1] فلا تجهر نفسك يرفع الصّوت (مجمع البيان)

[2] کافر جب رحمٰن سنتے تو کہتے تم ایک کو ٹھہراؤ، کبھی کسی کو پکارتے ہو، کبھی کسی کو (موضح القرآن)

آگ کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلّقین سے دو باتیں کہیں، اس لئے کہ جاڑا شدّت سے تھا اور راستہ بھی بھول گئے تھے [1]
یہاں پر ایک شاعر کا شعر بطور عوامی مثل کے اردو زبان والوں کے زبان زد ہے کہ:

خدا کے فضل کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ جائیں آگ کو لینے پیمبری مل جائے

اس کا مضمون زیادہ مکمل طور پر حدیث معصوم علیہ السلام میں وارد ہوا ہے:

قال الصّادق علیہ السلام حدثنی ابی عن جدّی عن امیر المومنین علیہ السلام قال: کن لما ترجو ارجی منك لما ترجوا فان موسیٰ بن عمران خرج تقتبس لاهله نارا فکلّم الله عزّوجلّ فرجع نبیّا و خرجت ملكة سبا کافرة فاسلمت مع سلیمان و خرج سحرة فرعون یطلبون الغرّة لفرعون فرجعوا مؤمنین. (مجمع البیان)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہا مجھ سے میرے والد نے میرے دادا کی زبانی امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ فرمایا جس کی (بظاہر اسباب) تمہیں امید نہ ہو اُسکے حصول کے اس زیادہ امیدوار جتنے اس کے جس کی بظاہر امید ہو، دیکھو موسیٰ بن عمران گئے اپنے گھر والوں کے لئے آگ لینے تو اللہ نے ان سے کلام کیا اور وہ نبی ہو کر پلٹے اور ملک سبا کی ملکہ نکلی اس عالم میں کہ وہ کافر تھی اور سلیمان علیہ السلام کے ساتھ وہ درجۂ اسلام پر فائز ہوگئی اور فرعون کے یہاں کے جادوگر نکلے تھے فرعون کے غلبہ کی خاطر اور نتیجہ میں ایمان قبول کیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿١٨﴾ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿١٩﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿٢١﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۤءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۤءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾

"اور یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ! ؟ کہا وہ میرا عصا ہے جس کا میں سہارا لیتا ہوں اور اُس سے اپنی بکریوں پر درخت سے پتے گراتا ہوں اور میرے لئے اس میں اور دوسرے فائدے بھی ہیں۔ کہا اسے پھینک دو اے موسیٰ! اس پر انہوں نے اُسے پھینک دیا تو ایک دم وہ ایک سانپ ہو گیا جو دوڑ رہا تھا۔ اس نے کہا پکڑ لو اُسے ڈرو نہیں۔ ہم ابھی اُسے پہلی صورت پر پلٹا دیں گے اور اپنا ہاتھ اپنے بازو کی طرف سمیٹو۔ وہ باہر آئے گا چمکتا ہوا بغیر کسی برائی کے جو دوسرا معجزہ ہوگا تا کہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے کچھ۔ جاؤ فرعون کی طرف کہ اس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

[1] وکان فی شتآء وقد امنع علیه القدح وضلّ عن الطریق (تبیان)

عصا اور ید بیضاء:

''بغیر کسی برائی کے''اس کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ جسم میں سفید کا نمودار ہونا مرض ہوتا ہے جس سے پناہ مانگی جاتی ہے تو یہ ظاہر کر دیا گیا کہ یہ ہاتھ کی سفیدی ضیاء و نور کی حیثیت سے ہوگی جس سے کسی قسم کے (معاذ اللہ) عارضہ کا تصور پیدا نہ ہوگا۔[1]

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾

''کہا انہوں نے پروردگار! میرا سینہ کو کشادہ کر دے اور میرے لئے میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان سے گرہ کھول دے کہ وہ لوگ میری بات سمجھ لیں اور میرے لئے میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو قرار دے دے۔ ان کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط بنا اور انہیں میرے کام میں شریک کر دے کہ ہم بہت زیادہ تیری تسبیح کریں اور بہت زیادہ تجھے یاد کریں یقیناً تو ہمارے حالات کا دیکھنے والا ہے''۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور ہارون کو اپنا وزیر اور شریک کار بنانے کی التجا:

احادیث سے ثابت ہے کہ ایسے ہی الفاظ میں دعاء ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی اور اپنے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام کیلئے اپنے ساتھ وزیر اور شریک کار بنائے جانے کی دعاء فرمائی جس کا جواب سمجھنا چاہیے اللہ سبحانہ کی طرف سے ان الفاظ میں کہ:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿١﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿٤﴾ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٥﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٦﴾

کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کیا اور آپ کے اُس بوجھ کو جو آپ کی پشت کو شکستہ کیے دے رہا تھا، آپ سے اتارا نہیں اور آپ کے ذکر کو بلند نہیں کیا؟ یقیناً مشکلوں کے ساتھ ہی آسانی ہوتی ہے یقیناً مشکلوں کے ساتھ ہی آسانی ہوتی ہے''۔

(یعنی یہ سب باتیں تو بغیر آپ کی دعا کے پہلے ہی آپ کیلئے حاصل ہو چکی ہیں، اب رہا آخری جزء، وہ بھی خالق کی طرف سے تو مقرر ہو چکا ہے، اس کا اعلان عام ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿٧﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿٨﴾ اب جب حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر پلٹے تو بعد کا انتظام حسب منشائے پروردگار کر دینے کی زحمت کیجیے اور اپنے جانشین کے تقرر کا اعلان کر دیجیے اور پھر بارگاہِ پروردگار کا رخ کرتے ہوئے دنیا سے اٹھ جایئے، اسی فرمانِ اعلان کی تجدید تھی جو پیغمبر پر حکم تاکیدی يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (مائدہ ٦٧) کے الفاظ میں آئی جس

[1] من غیر سوء ای من غیر برص (تبیان) فی قول الجمیع (مجمع البیان)

کی تعمیل میں رسول نے غدیر خم کا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اور آخر میں یہ اعلان کیا کہ :من کنت مو لاہ فھٰذا علیؑ مو لاہ جس پر یہ آیت اتری کہ :اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (سورہ مائدہ۔۳)

یہ پورا واقعات کا حلقہ بحلقہ ایک سلسلہ ہے جس کی ہر کڑی کے ثبوت کیلئے کتبِ فریقین میں شہادتیں کر کے ایک دم یعنی بلا کسی تشبیب کے آیت کے ذیل میں ''آمدم برسرمطلب'' کے طور پر قیدیوں قصیدہ شروع فرما دیتے ہیں جس کا ابتداء میں بیان کیا ہوا فلسفہ بھی عجیب وغریب ہے کہ:

''ایسے بڑے پیغمبر اُن کو خالق کی طرف سے خیال نہیں ہوتا۔ایک پیش کار چاہیے کہ خلق کو بیچ میں سمجھاوے۔ہمارے پیغمبر کے آگے ابو بکر تھے۔اوّل پیغمبر کے وقت سب لوگ انکے سمجھانے سے ایمان میں آئے (موضح القرآن)

واہ واہ، جناب شاہ صاحب! واہ واہ۔دعائے موسوی میں من اھلی اور اخی دو دو نسبتوں کے بعد اُسی کی مطابقت کرتے ہوئے اہل بیتؑ اور اخ (بھائی) کی خصوصیت کو نظر انداز کرنا۔سرکار والا ہی کا کام ہو سکتا ہے۔گو یا خداوند عالم اور قرآن دونوں غیر جمہوری مزاج رکھتے ہیں کہ خاندانی خصوصیت کو سامنے لاتے ہیں اور آپ جمہوریت نواز ہیں کہ خاندان کو نظر انداز فرمانا چاہتے ہیں۔چاہے اس کے ساتھ اہلبیت بھی نظر انداز ہو جائے۔بے شک ''ہمارے پیغمبر ﷺ کے آگے ابو بکر تھے'' کے فقرہ میں اس ''تھے'' کی تعریف نہیں ہو سکتی یعنی یہاں دعا وعا اور بارگاہ الٰہی سے تقرر وقرّر کا سوال نہ تھا۔یہ شروع سے یہاں ہو گئے تھے لیکن یہ بات اگر ''تھے'' اور ''ہو گئے'' سے ہو جایا کرتی تو بچارے حضرت موسیٰ کو بارگاہ الٰہی میں التجا کی کیا ضرورت تھی؟

حضرت ہارون علیہ السلام کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگے نہ تھے؟ یہ التجا تو بتاتی ہے کہ یہ منصب خود ''ہو جانے'' سے کیا پیغمبر ﷺ کے اختیار وانتخاب سے بھی وابستہ نہیں ہے۔وہ خود نہ اپنا وزیر مقرر کر سکتے ہیں، نہ جانشین، جب تک خالق کی طرف سے اس کی نامزدگی نہ ہو۔یہ تو سوادِ اعظم کے جمہوری تصور کے بالکل خلاف وہ نص والا تصور ہے جسے تنزیل قرآن کے وقت سے اس وقت تک شیعہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو دنیا کی نظر میں اُن کا سب سے بڑا قصور ہے مگر کیا کیا جائے کہ سنّتِ انبیاء اور قرآن مجید کے تصریحات اسی کے آئینہ دار ہیں۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ڬ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ڛ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ڜ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ڏ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾

''ارشاد ہوا کہ تمہاری مانگ تمہیں عطا ہوئی اے موسیٰ! اور ہم نے تم پر ایک دفعہ اور بڑا کرم کیا ہے جب ہم نے

تمہاری ماں کی طرف جو وحی بھیجنا تھی، وہ بھیجی یہ کہ تم اس صندوق میں ڈال کر اُسے دریا میں ڈال دو تو دریا اُسے پھینک دے ساحل پر کہ اُسے اٹھا لے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے اور میں نے تمہارے لئے اپنی طرف سے محبت والفت پیدا کی، اور اس لئے کہ تم خاص میری نگرانی میں پروان چڑھو، جب تمہاری بہن چلیں اور جا کر کہا کہ کیا میں تم لوگوں کو ایسی شخصیت بتاؤں جو اس کی پرورش کرے، اس طرح ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف واپس بھیج دیا تاکہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور تم نے ایک آدمی کو جان سے مار ڈالا تو ہم نے تم کو رنج وملال سے چھٹکارا دیا اور تمہارا پورے طور پر امتحان لیا تو تم کئی برس مدین والوں میں رہے، پھر ایک خاص تقدیر کے فیصلہ پر ادھر آئے۔ اے موسیٰ علیہ السلام!''

جناب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور مدین جانا اور مراجعت:

یہاں پوری تاریخ ماضی ہے جو بطور خطاب جناب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے دہرائی گئی ہے، پہلے ولادت کے بعد تابوت میں سپرد دریا کیا جانا اور نتیجہ بیان کیا گیا ہے اور پھر جناب موسیٰ علیہ السلام کا مدین جانا اور پھر مراجعت ان واقعات کی کڑیاں اور بہت سے تفصیلات قرآن مجید میں دوسرے مقام پر مذکور ہیں۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾
اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾
قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ
مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ
الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾

''اور میں نے تمہیں خود اپنے لئے تیار کیا ہے، جاؤ تم اور تمہارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ اور مجھے یاد کرنے میں سستی نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کی طرف! یقیناً اُس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے تو اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا کہ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے، ان دونوں نے کہا کہ پروردگار! ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں پیش قدمی کرے[1] یا یہ کہ سرکشی سے کام لے۔ ارشاد ہوا کہ ڈرو نہیں۔ میں تم دونوں کے ساتھ سنتا ہوں گا اور دیکھتا ہوں گا تو جانا اس کے پاس۔ جا کر کہنا کہ ہم دونوں تمہارے پروردگار کے پیغمبر ہیں تو ہمارے ساتھ بنی

[1] الفرط التقدّم امام القوم الی الماء......فالاصل فیہ التقدّم (تبیان)

اسرائیل کو روانہ کر دو اور انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ ہم تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف کا معجزہ لے کر آئے ہیں [۱] اور سلام ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ ہماری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ عذاب ہے اُس پر جھٹلائے اور روگردانی کرے"۔

فرعون سے گفتگو میں نرمی اور رواداری برتنے کا حکم:

دعوت و تبلیغ کے لئے اس خاص ہدایت کے ساتھ کہ "نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا" یہ ارشاد کہ لعلّه یتذ کّر او یخشٰی شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے، عالم الغیب کی طرف سے اُس امید کا اظہار نہیں ہے جو پوری ہونے والی نہ تھی بلکہ اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ سخت کلامی اور درشت انداز میں گفتگو خود اکثر قبول حق میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ اگر وہ نصیحت قبول کرنے والا ہوتا تو بھی اب قبول نہیں کرتا جس کی بنا پر اب اُس کی گمراہی یا گمراہی میں شدّت اختیار کرنے کی ذمہ داری اس داعی حق کی غلط انداز سے گفتگو پر ہوتی ہے لہٰذا عموماً انداز گفتگو ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے امکان اس کے اثر پذیر ہونے کا ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ امکان اُس کے عناد کی وجہ سے وقوع میں نہ آئے جیسا کہ فرعون کے بارے میں علم الٰہی میں یہی تھا کہ وہ اثر قبول نہ کرے گا جو بعد میں ظہور میں آیا۔ مگر داعی حق کا عمل ایسا ہونا چاہیے جیسے وہ اس شخص کے راہ راست پر آنے سے مایوس نہیں ہے، اس لئے وہ ممکن حد تک اُس سے نرمی برتتا ہے۔ [۲]

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى ۝٤٩ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝٥٠
قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰى ۝٥١ قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ فِىۡ كِتٰبٍ‌ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىۡ
وَلَا يَنۡسَى ۝٥٢ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّسَلَكَ لَـكُمۡ فِيۡهَا سُبُلًا وَّاَنۡزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰى‏ ۝٥٣ كُلُوۡا وَارۡعَوۡا
اَنۡعَامَكُمۡ‌ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى النُّهٰى ۝٥٤ مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ
وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى‏ ۝٥٥

"اُس نے کہا تو کون ہے پروردگار تم دونوں کا اے موسیٰ علیہ السلام! اُنہوں نے کہا ہمارا پروردگار وہی وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کا وجود عطا کیا ہے، پھر منزل تک پہنچانے کا سامان کیا ہے، کہا تو گزشتہ نسلوں کا کیا ہے؟ انہوں نے کہا ان کا علم میرے پروردگار کے یہاں ہے ایک نوشتہ میں۔ نہ میرا پروردگار بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ وہ وہ ہے

[۱] بأية من ربك اى بمعجزة ظاهرة (تبیان)
[۲] اى كون على الرّجآء والطمع لا على الياس من فلاحه فوقع التعبّد لهما على هذا الوجه لانّه ابلغ لهما فى دعائه الى الحقّ (مجمع البيان)

جس نے قرار دیا تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور چلائیں تمہارے لئے اُس میں راہیں اور آسمان سے پانی اتارا تو ہم نے اُس سے مختلف نباتات کے جوڑے نکالے۔ کھاؤ خود بھی اور چراؤ اپنے مویشیوں کو، یقیناً اس میں نشانیاں صاحبان عقل کے لیے، اِسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اُسی میں پلٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے“

جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو:

آیات کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کو جو خطاب فرعون سے تھا، اسے نقل کرتے ہوئے ان کے کلام کو کہ ”وہ وہ ہے جس نے قرار دیا تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور تمہارے لئے اُس میں راستے بنائے اور آسمان سے پانی اتارا“، یہاں تک اس بات کو پہنچا کر خالق نے خود اپنی زبان سے اپنی قدرت کا اظہار وقت نزول قرآن کے آدمیوں کو مخاطب کر کے فرمانا شروع کر دیا ہے[1] اور اسی سلسلہ میں آیندہ آیت سے تذکرۂ فرعون یوں شروع ہوا ہے کہ:

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى۔

ہم نے اسے اپنی تمام قدرت کی نشانیاں دکھائیں مگر اُس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔

اور اُس کے بعد پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے فرعون کا مکالمہ شروع ہو گیا۔

رب کے متعلق پوچھنے اور یہ سننے کے بعد کہ وہ وہ ہے جس نے ہر شے کی صورت گری کی ہے، فرعون کا یہ سوال کہ:

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى: تو گزشتہ نسلوں کا کیا حال ہے؟

اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اس نے ایسا تصور کیا کہ جب وہ رب ہے تو جن کو اس نے پیدا کیا، ان سب کو باقی رہنا چاہیے، وہ آخر ختم کیوں ہو گئے؟ اس کا جواب جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیا کہ ان کا علم میرے پروردگار کو ہے نہ وہ بھٹکتا ہے، نہ تو وہ بھولتا ہے یعنی یہ باتیں حکمت الٰہی سے متعلق ہیں اور ”خالق نے بعد کے تتمّہ میں جو اس نے اب کے لوگوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے، آخر تک اس کا جواب ذرا تفصیل سے دیا ہے کہ وہ سب بالکل ختم تھوڑی ہو گئے ہیں۔ ہم نے نظام یہی مقرّر کیا ہے کہ اس زمین سے یعنی خاک سے جو جزءِ زمین ہے پیدا کرتے ہیں اور پھر اسی زمین کے اندر لے جاتے ہیں اور پھر قیامت میں اُن کو اسی زمین سے دوبارہ برآمد کریں گے جو اس سفر کی آخری منزل ہوگی۔

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿٥٦﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾

”اور ہم نے اپنی قدرت کی سب نشانیاں دکھائیں، اس پر بھی اُس نے جھٹلایا، اور انکار کیا، اس نے کہا کیا تم اے

---

[1] قال تعالیٰ تتمیما لما وصفه به موسیٰ خطابا لاهل مکّته (جلالین)

موسیٰ! ہمارے پاس آئے ہو اس لئے کہ ہمیں اپنے جادو کے زور سے ہماری سرزمین سے نکال دو تو ضرور تمہارے مقابلہ میں ویسا ہی جادو ہم بھی لائیں گے، تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ کا وقت قرار دو جس کے خلاف نہ ہم کریں اور نہ تم، ایسی جگہ جو بیچ میں ہو، انہوں نے تمہارے لئے وعدہ کا دن آرائش والا دن ہے اور یہ کہ تمام لوگ دھوپ چڑھے جمع کر لئے جائیں تو فرعون پلٹا اور پلٹ کر اُس نے اپنے منصوبہ کا پورا انتظام کیا اور پھر آیا"۔

ساحروں کے مقابلہ کا اہتمام:

"سب نشانیاں دکھائیں" یعنی وہ معجزات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تک عطا ہوئے تھے، وہ سب دکھلا دیے گئے، نہ یہ کہ جو اللہ کی نشانیاں ازل سے ابد تک ظاہر ہوتی رہیں یا رہیں گی، وہ سب فرعون کو دکھا دی گئیں۔ ایسا نہیں بلکہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کچھ معجزات اس کے بعد ظاہر ہوئے، وہ بھی اس وقت فرعون کو دکھائے گئے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ
خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ
هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا
بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ
مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

"کہا اُن لوگوں سے موسیٰ علیہ السلام نے کہ ارے وائے ہو تم پر، بہتان نہ باندھو اللہ پر جھوٹا کہ قلع قمع کر دے وہ تمہارا عذاب سے اور بے شک ناکام ہوا وہ جس نے بہتان باندھا تو اُن لوگوں میں آپس میں بحث ہونے لگی اور کچھ چپکے چپکے باتیں کیں۔ کہا یہ دونوں جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تم لوگوں کو تمہاری سرزمین سے نکال دیں اور تمہارے مذہب کو تباہ کر دیں تو اپنی تمام تیاریاں مکمل کر لو۔ پھر صف بندی کر کے آ جاؤ اور یقیناً بہتری آج وہی حاصل کرے گا جو غلبہ حاصل کر لے"۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ
فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ
نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ
تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝

’’اُن لوگوں نے کہا اے موسیٰ علیہ السلام! یا تم پھینکو یا ہم ہوں پہلے پھینکنے والے، انہوں نے کہا نہیں بلکہ تم ہی پھینکو تو ایک دم ان کی رسیاں اور لکڑیاں ان کے آگے ایسی معلوم ہونے لگیں ان کے جادوں سے کہ وہ دوڑ رہی ہیں، تو اپنے دل میں موسیٰ علیہ السلام نے ذرا محسوس کیا۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں، بلاشبہ غالب آنے والے تم ہی ہو اور تکلیف اور پھینک دو جو تمہارے سیدھے ہاتھ میں ہے۔ وہ نگل جائے گا اُسے جو انہوں نے بنایا ہے وہ ایک جادوگر والی ترکیب ہے اور جادوگر نتیجہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا جب بھی وہ آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر‘‘۔

معجزہ کا عقلی معیار:

’’ایسی معلوم ہونے لگیں ان کے جادوں سے‘‘۔ اس سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حقیقت میں وہ سانپ کی طرح دوڑ نہیں رہی تھیں بلکہ یہ کوئی کرتب تھا کہ نظر ایسا آ رہا تھا جیسے ’’ڈھٹ بندی‘‘ میں ہوتا ہے۔[1]

موسیٰ علیہ السلام کو ڈر کس بات کا ہوا؟ امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

لَمْ يُوجِسْ مُوسٰى خِيفَةً عَلٰى نَفْسِهِ. اَشْفَقَ مِنْ غَلَبَةِ الْجُهَّالِ وَدُوَلِ الضَّلَالِ (خطبہ نمبر ۴)

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جان کے لئے خطرہ محسوس نہیں کیا بلکہ انہیں خوف ہوا گمراہی کے تسلّط اور جاہلوں کے غالب آنے کا۔

اسی کو شیخ الطائفہؒ نے اس طرح لکھا ہے کہ:

انّما خاف دخول الشّبهة على قومه۔

انہیں خوف بس اس کا ہوا کہ ان کی قوم شبہ میں نہ پڑ جائے۔

اور پھر اسی کو جلالین نے بھی لکھ دیا ہے:

اى خاف من جهة انّ سحر هم من جنس معجزته ان يلبتس امره على النّاس فلا يؤ منوا به

یعنی اُنہیں خوف ہوا اس وجہ سے کہ اُن کا جادو نوعیت میں اُن کے معجزہ کی قسم کا ہے تو کہیں لوگوں پر معاملہ مشتبہ نہ ہو جائے۔ جس سے وہ ان پر ایمان نہ لائیں۔

خالق نے جن الفاظ میں انہیں بعد میں اطمینان دلایا ہے، وہ بھی اس توجیہ کے بالکل مطابق ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ

[1] انّما قال يخيّل لانّها لم تكن تسعى حقيقة وانما تحركت لانّه قبل انه كان جعل داخلها زيبق فلمّا حميت بالشمس طلب الزّيبق الصّعود فتحركت العصّى والحبال (تبيان)

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ
النَّخْلِ ز وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا
مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ط اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ط
وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾

”کہا اُس نے کہ تم لوگ اُس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یقیناً یہی تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے تو میں ضرور اب تمہارے ہاتھوں اور پیروں کو قلم کراؤں گا مختلف سمتوں سے اور ضرور تمہیں سولی دوں گا کھجور کے درختوں پر اور ضرور تم جانو گے کہ ہم میں سے کس کا عذاب سخت اور پائدار ہے۔ اُن لوگوں نے کہا کہ ہم ہرگز تجھے مقدّم نہیں کریں گے اُس پر جو ہمارے پاس آ گیا کھلے دلائل میں سے اور اُس ذات پر جس نے کہ ہمیں پیدا کیا ہے، تو کر ڈال جو تجھے کرنا۔ تو بس اسی دنیوی زندگی کو ختم کرے گا۔ بلاشبہ ہم ایمان لائے ہیں اپنے پروردگار پر تا کہ وہ ہماری خطاؤں کو اُس جادوگری کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، بخش دے اور اللہ بہتر اور بہت زیادہ پائدار ہے“۔

ساحروں کی فرعون سے گفتگو:

فرعون نے کہا کہ ”تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے“ اس سے پہلی ہی نگاہ میں جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ان سے کہہ رہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں یہ تم لوگوں کی ملی بھگت تھی اور موسیٰ علیہ السلام کوئی اور نہیں۔ تمہارے ہی گروہ کے تھے جنہوں نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اس لئے اتنی جلدی تم اُن کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے یہی ہمارے مستند مفسرین کی تفسیر بھی ہے۔ [1] مگر شاہ عبدالقادر معلوم نہیں کیوں لکھ رہے ہیں کہ:

”یہ شاید رب کو کہنے لگا“ (موضح القرآن)

بے شک جادوگروں کا یہ کہنا کہ ”اللہ ہماری خطاؤں کو معاف کرے اور اُس جادو کرنے کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے جو شاہ صاحب نے ان لفظوں میں لکھا ہے کہ:

”جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نشان دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ وہ جادو نہیں مقابلہ نہ کرتے پھر فرعون کی خاطر سے کیا“ (موضح القرآن)

---

[1] انه یعنی موسیٰ لکبیرکم ای رئیسکم و مقدّمکم (تبیان) معناہ انّه استاذکم و انتم تلامذته وقد یعجز التلمیذ عما یفعله الاستاذ (مجمع البیان)

إِنَّهُ مَنْ يَّأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ ۖ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿٧٤﴾ وَمَنْ يَّأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿٧٥﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۖ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿٧٦﴾

''بلاشبہ جو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں مجرم ہونے کی حالت میں آئیں تو یقیناً اُسے استحقاق ہوگا دوزخ کا جس میں نہ وہ مرتا ہوگا اور نہ وہ زندہ رہتا ہوگا اور جو اُس کے پاس مومن ہونے کی حالت میں آئے کہ نیک اعمال انجام دیے ہوں تو یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں، زندگی جاویدوالے بہشت جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، یہ صلہ ہے اُس کا جو پاک باز رہا ہے''۔

مجرم کے مقابلہ میں ''مومن'' کا لفظ ہوتا تو ہم کہتے کہ پہلے مجرم سے مراد کافر ہے مگر یہاں اس کے مقابلہ میں مومنا قد عمل الصّالحات ہے لہٰذا اُس کے مقابلہ میں جو مجرم ہے، اُس میں دونوں داخل ہیں، کافر بھی اور وہ مسلمان بھی جس نے اعمال صالحہ کی پابندی نہ کی ہے اور اسی لئے ہم نے ''له جهنم'' کا ترجمہ یہ کیا جو واقعاً اس لفظ کے معنی ہیں کہ ''اُسے استحقاق ہوگا دوزخ کا''۔

اس استحقاق کے ساتھ اب دوصورتیں ہیں کہ ایک یہ کہ وہ بخشا نہ جائے اور داخل جہنم ہو ہی جائے جیسا کہ کفّار کے لئے ہے اور ان گناہوں کے مرتکبین کے لئے جن کی شفاعت نہ ہو اور کسی طرح بھی مغفرت نہ ہو اور یہ بھی کہ وہ شفاعت کے ساتھ یا کسی عمل خیر کے صلہ میں یا صرف تفضّل ربّانی سے بخش دیا جائے۔ یہ اُن کے لئے ہے جو اصولِ عقائد کے اقرار کے ساتھ کسی حد تک بداعمال ہیں اور ان کی بداعمالی اُس درجہ پر نہ ہو جو شفاعت وغیرہ سے محروم کردیتا ہے۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوْسٰٓى ۙ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿٧٧﴾ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهِ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدٰى ﴿٧٩﴾

''اور جو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر روانہ ہو تو طے کرنا ان کے لئے ایک راستہ دریا کے اندر خشک کہ نہ ڈر ہوگا تم کو کسی نقصان کا اور نہ کوئی خطرہ تمہیں ہوگا تو پیچھا کیا اُن لوگوں کا فرعون نے اپنی افواج کے ساتھ تو ڈھانپ لیا اُسے سمندر نے جیسا اُسے ڈھانپنا تھا اور گمراہ کیا فرعون نے اپنی قوم کو اور انہیں صحیح راہ نہیں دکھائی''۔

فرعون اور اس کی فوج کا غرق دریا ہونا:

ضرب کے معنی راستہ طے کرنے کے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ (نساء ۱۰۱) اسی لئے ہم نے

طریقہ کے ساتھ "فاضرب" کا لفظ ہے، اُس کا ترجمہ کیا "طے کرنا" مگر ضرب کے معنی مارنے کے بھی ہیں اور یہاں واقعہ یہ تھا کہ حکم ہوا دریا پر عصا سے ضرب لگاؤ۔ وَ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ، اسی ضرب سے راستا بنا تھا تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ضرب لگا کہ بنی اسرائیل کے لئے خشک راستہ بناؤ [۱] مگر الفاظ قرآنی میں ضرب یعنی مارنے کا تعلق دریا کے ساتھ نہیں بلکہ راستے کے ساتھ ہے، اس لئے علامہ طبرسیؒ نے اس کے ساتھ اس مفہوم کا اضافہ کیا کہ ضرب عربی میں سکہ ڈھالنے کے لئے بھی آتا ہے تو حکم یہ ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سمندر میں ایک راستہ بنا دو۔ [۲]

آخری الفاظ: اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى "گمراہ کیا فرعون نے اپنی قوم کو اور صحیح راہ نہیں دکھائی" ناظر ہیں فرعون کے اُس قول کی طرف جو اس نے اپنی قوم والوں سے کہے تھے کہ اَهْدِيَكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ "میں تم کو صحیح راہ دکھاؤں گا"۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝٨٠ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝٨١ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝٨٢

"اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو نجات دی تمہارے دشمن سے قول و قرار کیا تم سے طور پر کے دائیں پہلو کا اور اتارا تم پر من و سلویٰ کہ کھاؤ ان اچھی غذاؤں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس کے بارے میں زیادتی نہ کرو کہ نازل ہو گا تم پر غضب میرا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہوا اور بلاشبہ میں بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرے اور ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے، پھر راہ راست پر قائم رہے"۔

ان واقعات کی تفصیل دوسرے مقامات پر جہاں جہاں ان امور کا ذکر ہے درج ہوئی ہے، "کھاؤ ان اچھی غذاؤں سے"، یعنی اگر کھانا چاہو تو کھاؤ، کوئی ممانعت نہیں ہے۔ [۳]

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝٨٣ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝٨٤ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝٨٥ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ

[۱] المعنی واضرب بعصاك البحر يجعل طريقا فكانّه قيل اجعل طريقاً بالضرب بالعصا (تبیان)
[۲] كانه قد ضرب الطريق كما يضرب الدّينار (مجمع البيان)
[۳] صورته صورة والمراد به الاباحة (تبيان و مجمع البيان)

رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ ﴿٨٦﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ
اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِىُّ ﴿٨٧﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ
عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِىَ ﴿٨٨﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا
يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ
مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِىْ وَاَطِيْعُوْٓا
اَمْرِىْ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿٩١﴾

''اور کیا بات ہوئی اے موسیٰ علیہ السلام کہ تم جلد بازی سے کام لے کر اپنی قوم کو چھوڑ آئے تو اُنہوں نے کہا وہ میرے پیچھے ہی ہیں اور میں جلدی تیری بارگاہ میں حاضر ہوگیا کہ تو خوشنود ہو۔ ارشاد ہوا تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے بعد تمہاری قوم کو ہم نے آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے اُنہیں گمراہ کر دیا ہے تو واپس آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصّہ میں افسوس کرتے ہوئے کہا ارے میری قوم والو! کیا اللہ نے تم سے بہت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا مدّت تم پر بہت طولانی ہوگئی یا ارادۃً تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب نازل ہو تو تم نے مجھ سے وعدہ خلافی نہیں کی مگر ہمیں اس جماعت کے بہت سے زیور اکٹھا کر کے لانے پر آمادہ کیا گیا اور یہ طرح ڈالی سامری نے تو اُس نے نکالا ان لوگوں کے لئے ایک مجسّمہ بچھڑے کا جس میں سے گائے کی آواز پیدا ہوتی تھی تو ان لوگوں نے کہا یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا ہے جسے وہ بھول گئے تو کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ اُن سے ہارون نے اس کے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم والو! تم اس کی وجہ سے آزمائش میں پڑے ہو اور یقیناً تمہارا پروردگار وہ ہے جو سب کو فیض پہنچانے والا ہے تو تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی تعمیل کرو، اُنہوں نے کہا ہم اس کی عبادت میں برابر لگے ہیں یہاں تک کہ موسیٰ ہماری طرف واپس آئیں''۔

سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام:

ابتدائی الفاظ: وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ''کیا بات ہے اے موسیٰ علیہ السلام کہ تم جلد بازی سے کام لے کر اپنی قوم کو چھوڑ آئے''(سورۂ طٰہٰ۔ ۸۳)

اس تشریح کا پتہ دیتے ہیں کہ دراصل جناب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جب بلایا گیا ہے تو یہ حکم ہوا تھا کہ تم اپنی قوم کے ساتھ آنا لیکن یہ محسوس کر کے کہ پوری قوم کے تیار ہونے میں بہت دیر لگے گی، وہ اُن سے یہ کہہ کر میں جاتا ہوں تم میرے پیچھے آؤ، خود چلے گئے اور یہاں قوم سامری

کے جال میں پھنس کر رہ گئی۔[1]

قَالَ يٰهٰرُوۡنُ مَا مَنَعَكَ اِذۡ رَاَيۡتَهُمۡ ضَلُّوۡۤا ۙ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيۡتَ اَمۡرِىۡ ﴿۹۳﴾
قَالَ يَبۡنَؤُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡيَتِىۡ وَلَا بِرَاۡسِىۡ ۚ اِنِّىۡ خَشِيۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَيۡنَ
بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَلَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِىۡ ﴿۹۴﴾

"انہوں نے کہا اے ہارون! تمہیں کون امر مانع تھا کہ جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے تو تم میرے پیچھے نہ چلے آئے۔ تو کیا تم نے میرے حکم کی مخالفت کی؟ انہوں نے کہا اے میرے ماں جائے! میری داڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑیئے، مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا خیال نہ کیا"۔

اس کا ایک مطلب جو جناب ہارون علیہ السلام کے جواب سے مرتبط ہے، یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ رہے تھے کہ تم اُن ثابت قدم افراد کو جو گوسالہ پرستی سے الگ رہے تھے، لے کر میرے پاس کیوں نہ آ گئے۔[2]

اس پر جناب ہارون علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ آپ کہیں گے تم نے جماعت میں انتشار پیدا کر دیا، شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"چلتے وقت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کو نصیحت کر گئے تھے کہ سب کو متفق رکھیو۔ اس واسطے انہوں نے بچھڑا پوجنے والوں کا مقابلہ نہ کیا، زبان سے سمجھایا، وہ نہ سمجھے" (موضح القرآن)

قَالَ فَمَا خَطۡبُكَ يٰسَامِرِىُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ يَبۡصُرُوۡا بِهٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً
مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِىۡ نَفۡسِىۡ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ
فِى الۡحَيٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ ۚ وَانۡظُرۡ اِلٰٓى اِلٰهِكَ
الَّذِىۡ ظَلۡتَ عَلَيۡهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِى الۡيَمِّ نَسۡفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَاۤ
اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا ﴿۹۸﴾

"کہا اچھا، تیرا معاملہ ہے اے سامری! اس نے کہا میں نے ایسی چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی تو میں نے ایک مٹھی خاک لے لی (خدا کے) بھیجے ہوئے (فرشتہ) کے قدم کے نیچے سے تو اس کو میں نے ڈال دیا اور ایسا میرے نفس نے مجھے آمادہ کیا۔ انہوں نے کہا اچھا جا۔ اب تیرے لئے اس زندگی میں یہ ہے کہ تو کہتا رہے کہ کوئی چھوئے نہیں اور یقیناً تیرے لئے ایک وعدہ کا دن ہے اور وہ جس کے خلاف تو جا نہیں سکتا اور دیکھ اپنے خدا کو جس

[1] تعجل موسیٰ بینهم شوقا الیٰ ربّه وخلفهم لیحلقوا به (مجمع البیان)
[2] قال ابن عباس: معناه بمن اقام علیٰ ایمانه (تبیان)

کی عبادت میں تو لگا رہا کہ ہم اسے جلائیں گے، پھر اس کی خاک کو دریا میں بہا دیں گے، تم لوگوں کا اصل خدا تو بس اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ ہر شے پر علم کے اعتبار سے حاوی ہے"۔

اس گوسالہ کے لئے سامری سے یہ تخاطب کہ **وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ** "دیکھ اپنے اس خدا کو، حالانکہ سب کا خدا اللہ ہے اور وہی سامری کا بھی حقیقت میں خدا ہے، اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اسے خدا بنایا تھا۔[1]

اسے مخاطب کر کے متوجہ کرنا کہ جو تیرا معبود تھا، دیکھ اسے آگ میں جلائیں گے، پھر اس کی خاک کو دریا میں بہا دیں گے" ظاہر ہے کہ اس گوسالہ کو کوئی زمین سزا دینا نہیں ہے کیوں کہ وہ بے جان اور بے شعور ہونے کی بنا پر بے خطاب ہے بلکہ یہ اس کے عبادت گزار کے لئے ایک سخت سرزنش اور بہت بڑی سزا ہے اس کے اس آیت پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے جو پہلے پارے میں آ چکی ہے کہ دوزخ کے لئے کہا گیا ہے: **وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ**" اس کا ایندھن آدمی ہیں اور پتھر جس کی قوی تفسیر یہی ہے کہ وہی پتھر جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان کے ساتھ ساتھ آتش کیے جائیں گے، اس کے علاوہ یہ جلانا اور اس کا جل جانا اور دریا میں بہانا اور اس کا بہہ جانا اس کی دلیل بھی ہے کہ وہ مجبور اور بے بس ہے اور اسے خدا سمجھنا غلط تھا۔[2]

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝٩٩ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝١٠٠ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝١٠١ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝١٠٢ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝١٠٣ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝١٠٤

"اس طرح ہم بیان کرتے ہیں آپ کے سامنے خبروں میں سے اور ہم نے عطا کی ہے آپ کو اپنی طرف سے یاد داشت جو اس سے روگردانی کرے گا تو وہ برداشت کرے گا قیامت کے دن ایک بوجھ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور بہت برا ہوگا ان کے لئے قیامت کے دن یہ بار جس دن صور پھونکا جائے گا اور مجرموں کو محشر میں لائیں گے ہم اس دن اس عالم میں کہ آنکھیں ان کی نیلی ہوں گی، چپکے چپکے آپس میں کہتے ہوں گے کہ تم نہیں رہے ہو مگر دس ۱۰ دن۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں، جب کہ ان میں کا سب سے زیادہ سمجھدار آدمی یہ کہتا ہوگا کہ تم نہیں رہے ہو مگر ایک دن"۔

"آنکھیں نیلی ہوں گی" پیاس سے یا یہ کہ بے نور ہوں گی، ان میں چمک نہ رہے گی۔ نیلا ہٹ ہی نیلا ہٹ محسوس ہوگی یا کہ یہ اس سے

---

[1] الهك يعنى معبودك فى نفسك (تبيان)

[2] نبّه بذلك على انّه ما يمكن سحقه واحراقه لا يصلح العبادة (مجمع البيان)

بس بدشکل ہونے کا اظہار ہے کہ سیاہ ہوں گے اور آنکھیں نیلی۔ یہ تینوں احتمال ہیں جنہیں جناب شیخ الطائفہ نے تبیان میں درج کیا ہے

وَ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡجِبَالِ فَقُلۡ يَنۡسِفُهَا رَبِّىۡ نَسۡفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفۡصَفًا ﴿۱۰۶﴾
لَّا تَرٰى فِيۡهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوۡمَـئِذٍ يَّتَّبِعُوۡنَ الدَّاعِىَ لَا عِوَجَ لَهٗ‌ ۚ وَخَشَعَتِ
الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا هَمۡسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوۡمَـئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنۡ
اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَرَضِىَ لَهٗ قَوۡلًا ﴿۱۰۹﴾

''اور وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ انہیں میرا پروردگار بالکل سرمہ کر کے چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تمہیں کجی نظر نہ آئے گی اور نہ بلندی۔ اس دن وہ لوگ پکارنے والے کی آواز کے پیچھے خوب آئیں گے جس میں ذرا بھی انحراف نہ ہوگا اور تمام آوازیں خدائے رحمٰن کے سامنے مدّھم پڑ جائیں گی تو سنو گے سوا قدموں کی چاپ کے۔ اس دن سفارش کوئی فائدہ نہ دے گی سوا اس کے جس کو خدائے رحمٰن کی اجازت اور اس کے کہنے سے راضی ہو''۔

ثبوت شفاعت:

پہلے کئی جگہ توجہ دلائی گئی ہے۔ یہاں پھر دیکھیے۔نفی شفاعت میں استثناء ہوگیا[۱] جس کے بعد مستثنیٰ میں ثبوتِ شفاعت ظاہر ہے۔[۲]
اس کے بعد مطلق طور پر یہ کہنا کہ اسلام میں شفاعت کوئی چیز نہیں، از روئے قرآن صراحتاً غلط ہے۔

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ بِهٖ عِلۡمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الۡوُجُوۡهُ
لِلۡحَىِّ الۡقَيُّوۡمِ‌ ؕ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ
وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلۡمًا وَّلَا هَضۡمًا ﴿۱۱۲﴾

''وہ جانتا ہے اسے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور ان کا علم اس پر حاوی نہیں ہے اور چہرے جھک گئے ہوں گے اس زندہ نظام عالم کو قائم رکھنے والے کے سامنے اور ناکام ہوا وہ جس نے ظلم کا بوجھ اٹھایا اور جو نیک کام کرے اس حالت میں کہ وہ باایمان ہو تو وہ نہیں ڈرے گا زیادتی سے اور نہ کمی سے''۔

''اسے جو ان کے آگے ہے یعنی مستقبل خواہ امور دنیا ہوں جو بعد میں ہوں گے اور خواہ قیامت اور جو ان کے پیچھے ہے یعنی ماضی''[۳]

---

[۱] الّا شفاعة من اذن الله له ان یشفع ورضی قوله فیها من الانبیآء والاولیاء الصالحین والشهدآء (مجمع البیان)۔
[۲] یعنی اس کی سفارش چلے گی (موضح القرآن)
[۳] ای یعلم ما بین ایدی الخلائق من امور القیامة واحوالهم ویعلم ما سبق فی ما تقدمهم (تبیان)

بعض نے یوں کہا ہے "جوان کے آگے ہے، وہ آخرت ہے اور اس کے احوال واہوال اور جو پیچھے ہے، وہ یہ دنیا ہے۔[۱]

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

"اوراسی طرح اتارا ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنا کر اور اس میں طرح طرح سے عذاب کی خبریں دیں، شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں یا یہ ان میں کچھ نصیحت کا اثر کریں"۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

"تو وہ بلند و برتر ہے۔ اللہ جو سلطنت کا حقیقی مالک ہے اور جلدی نہ کیا کیجیے قرآن میں قبل اس کے پہنچائیں کی طرف اس کی وحی اور کہیے کہ پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما"۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"جبرئیل علیہ السلام جب قرآن لاتے، حضرت ان کے پڑھنے کے ساتھ خود بھی پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جاوٴں اس کو پہلے منع فرمایا تھا، سورۃ قیامت میں اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں تک پہنچوانا ذمّہ ہمارا ہے۔ پھر تقید کیا"۔ (موضح القرآن)

مگر یہ روایت ہمارے طرق سے وارد نہیں ہوئی ہے اور عدم امکان سہو نسیان پیغمبر خدا ئے کے لئے اس کے منافی ہے۔

ہماری تفسیر میں اس جملہ کے دو معنی اور ہیں: ایک یہ کہ وحی کے اترنے میں دیر ہو تو اس کے لئے جلدی نہ کیا کیجیے۔

دوسرے یہ کہ جب خالق کی طرف سے مکمل تشریح نہ آجائے، لوگوں تک اس حصۂ قرآن کے پہنچانے میں جو اترا ہے، جلدی نہ کیا کیجیے۔[۲]

علّامہ طبرسیؒ نے بلاتبصرہ تینوں قول نقل کر دیے ہیں۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ

---

[۱] ما بین ایدیھم من امور الآخرۃ وما خلفھم من احوال الدّنیا (مجمع البیان)

[۲] ای لا تسئال انزالہ قبل ان یاتیك وحیہ وقبل معناہ لا تلقہ الی الناس قبل ان یاتیك بیان تاویلہ (تبیان)

يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿١٢٠﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿١٢١﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿١٢٢﴾

''اوراس کے پہلے آدم علیہ السلام سے ہم نے عہدو پیمان لیا تو وہ بھول گئے اور انہیں پایا ہم نے ان میں مضبوط ارادہ اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم علیہ السلام کو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا تو ہم نے کہا اے آدم! بلا شبہ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو بہشت سے نکلوا دے تو تم زحمت ومشقت میں ہو۔ بلا شبہ اس میں تمہارے لئے یہ کہ تم بھوکے نہیں ہوتے اور نہ برہنہ ہوتے اور نہ دھوپ کھاتے ہو تو شیطان نے وسوسہ انگیزی کی۔ کہا اے آدم! کیا میں تمہیں بتاؤں ہمیشہ کی زندگی والا درخت اور ایسی سلطنت کا ذریعہ جو کبھی بوسیدہ نہ ہو تو اُن دونوں نے اُس میں سے کھالیا تو ظاہر ہو گئے ان کے لئے اُن کے وہ اعضاء جو چھپانے کے ہیں اور وہ دونوں جوڑنے لگے اپنے اوپر بہشت کے درختوں کے پتے اور کہا نہ مانا آدم نے اپنے پروردگار کا، تو بہک گئے، پھر اللہ نے انہیں عزّت دی تو اُن کی توبہ قبول کی، اور انہیں صحیح راستہ دکھایا''۔

جناب آدم علیہ السلام کا ترک اولیٰ:

مذکورہ بالا جنّت میں رہنے کے جو فوائد اور وہاں سے نکلنے میں جو نقصان دکھائے گئے ہیں، وہ امر کی دلیل واقی ہیں کہ انہیں جو حکم ہوا تھا، وہ مولوی نہ تھا، ارشادی تھا جیسا کہ پہلے پارے میں تشریح کی گئی ہے یعنی اس کی تعمیل دنیوی فوائد ہیں اور ترک میں مضرتیں ہیں جن کی فہرست یہاں ان کے سامنے پیش کی گئی ہے اس طرح کہ:

(۱) فتشقٰی یعنی تمہیں زحمت ومشقّت برداشت کرنا پڑے گی کہ یہاں تو بعطائے الٰہی مفت میں تمہیں ہر طرح کی نعمت ملی ہوئی ہے اور زمین کی دنیا جو عالم اسباب ہے، وہاں جب تک محنت ومشقّت نہ کرو گے دانہ مُنہ تک نہ جائے گا۔

اس ذیل میں خاص طور پر حضرت آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا کہ تم مشقّت میں پڑ جاؤ گے، حالانکہ درخت کے قریب جانے، جنّت سے نکالے جانے اور زمین پر اتارے جانے میں جناب حوّا بھی شریک تھیں، یہ اس نظام فطری کی بناء پر ہے جس کے مطابق شریعت اسلام کا حکم ہے کہ تحصیل معاش کا تعلق مرد سے ہے اور زوجہ کی کفالت اس کے ذمّہ ہے۔[1]

(۲) یہاں بھوک نہیں لگتی

[1] فتشقٰی معناہ تتعب بانّ تاکل من کدّ یمینك وما تکسبه لنفسك وقیل فتشقٰی علی خطاب الواحد والمعنی فتشقٰی انت وزوجك وقیل خصّ بالشقآء لانّ الرّجل یکدّ علیٰ زوجته (تبیان)

(۳) یہاں پیاس نہیں لگتی
(۴) یہاں مفت میں جسم پر لباس ہے۔
(۵) دھوپ کی تکلیف اٹھانا نہیں پڑتی۔
دنیا میں یہ سب برکتیں ختم ہوجائیں گی۔

اب جب کہ وہ حکم ارشادی تھا تو نافرمانی کا لفظ تو بالکل درست ہے کیوں کہ حکم پر عمل نہ کرنے ہی کو نافرمانی کہتے ہیں [۱] مگر اس نافرمانی میں وہ بات نہیں رہتی جو منافی عصمت قرار پائے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ
فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ
كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ
تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ
اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

”ارشاد ہوا کہ دونوں اترو اس میں سے ایک ساتھ تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ اب اگر تمہارے پاس میری طرف کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریگا، وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ زحمت اٹھائے گا اور جو میری نصیحت سے روگردانی کرے گا تو اس کے لئے سخت زندگی ہوگی اور اسے ہم حشر میں روز قیامت اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: پروردگار! کے کیوں تو نے مجھے حشر میں اندھا اٹھایا حالانکہ میں آنکھوں والا تھا؟ ارشاد ہوگا اسی طرح ہماری نشانیاں تیرے پاس آئیں تو تو نے انہیں بھلاوے میں ڈالا اور اسی طرح اب آج تو بھلایا جارہا ہے اور یوں ہی ہم سزا دیں گے اسے جو حد سے تجاوز کرے اور ایمان نہ لائے اپنے پروردگار کی نشانیوں پر اور بلا شبہ آخرت کا عذاب سخت تر اور زیادہ دیرپا ہے۔“

یہ ارشاد جمع کے عنوان سے کہ ”تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو گے“ حالانکہ اس کے پہلے خطاب تثنیہ آدم اور حوّا علیہما السلام سے تھا، ابلیس کی شرکت سے ہے جو آپ مستقل طور پر نکال دیا گیا تھا۔ [۲]

اب جب کہ ان تینوں سے خطاب ہو تو اس کے لئے یہ کافی ہے کہ ابلیس اور اس کی اولاد، آدم وحوّا علیہما السلام اور ان کی اولاد آدم وحوّا اور ان

---

[۱] المعصیۃ مخالفۃ الامر سواء کان واجبا او ندبا (تبیان مجمع البیان)
[۲] یعنی اٰدم و حوا و ابلیس وذرّیۃ (تبیان)

کی اولاد کی دشمن ہے جس کی صراحت دوسری جگہ موجود ہے کہ: "انّ ھذا عدوّ لکما"۔ یہ (ابلیس) تم دونوں (یعنی آدم وحواء) کا دشمن ہے۔
بعض کا خیال ہے کہ خود آدم اور حوا علیہاالسلام کی اولاد میں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں، وہ مراد ہیں۔ [۱]

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

''کیا ان کے لئے رہ نمائی کا سرمایہ نہیں ہے یہ کہ کتنی ہلاک کردیں ہم نے ان کے پہلے والی نسلیں کہ یہ چلتے پھرتے ہیں ان کے رہنے کے گھروں میں یقیناً اس میں نشانیاں ہیں صاحبانِ عقل کے لیے''۔

ہمارے مفسرین اس یھدِ کی لفظ کو ہدایت ہی سے قرار دیتے ہیں [۲] جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے بعض علمائے اہل سنّت کے تشریحات بھی اس کے مطابق ہیں [۳] مگر بعض لمہ یھد کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ان پر امر ظاہر نہیں ہوا [۴] اس کے لئے لغت سے ثبوت کی ضرورت ہے کہ یھد کے لفظ کے معنی نمایاں ہونے کے آئے ہیں یا نہیں؟

''یہ چلتے پھرتے ہیں اُن کے گھروں میں'' یعنی وہ تباہ شدہ بستیاں ان کے سفیروں میں ان کی راہ میں پڑتی ہیں۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ؕ

''اور اگر نہ ہوتا ایک قول جو تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہو چکا اور ایک مدّت مقرر نہ ہوتی تو عذاب لازمی طور پر آ کے رہتا''۔

یعنی اس اُمّت کے بھی اعمال تو ویسے ہی ہیں جیسے اعمال کی وجہ سے اُمم سابقہ پر عذاب نازل ہوتا رہا ہے مگر خالق نے قول دے دیا ہے کہ اس رحمۃ اللّعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر دنیا میں بحیثیت مجموعی عذاب نازل نہ ہوگا۔ اور ان کے لئے قیامت کی میعاد مقرر کردی ہے، اس لئے عذاب نازل نہیں ہوتا۔ [۵]

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

''تو آپ صبر کیجئے اُس پر کہ جو وہ کہتے ہیں اور اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ نماز پڑھیے، سورج نکلنے سے پہلے اور

---

[۱] بعضکم بعض الدرۃ (جلالین) بعض اولاد شما بعض را دشمن باشند (شاہ ولی اللہ)
[۲] فاعل یھد مضمر یفسّرہ کم اھلکنا و المعنیٰ ولم یھد لھم اھلکنا من قبلھم من القرون (تبیان) المعنی افلم یبّین لھم طریق الاعتبار کثرۃ اھلاکنا القرون (مجمع البیان)
[۳] آیا راہ نمود ایشاں را (شاہ ولی اللہ) کیا پس راہ نہیں دکھاتا ان کو (شاہ رفیع الدین)
[۴] افلھم یھد یتبّین (جلالین) فی سفرھم الی الشام وغیرھا (جلالین)
[۵] لو لا کلمۃ سبقت من ربک تاخیر العذاب عن ھوء لاء الکفار الی یوم القیمٰۃ (مجمع البیان)

غروب سے پہلے اور رات کے کچھ اوقات میں بھی نماز پڑھیے، اور دن کے حصول میں شاید کہ آپ خوش ہوجائیں''۔

اوقات نماز کی طرف اشارہ:

اس آیت میں اجمالی طور پر اوقات نماز کا ذکر ہے جس میں ایک دفعہ قبل طلوع وغروب نمازیں بتائی ہیں۔ یہ نماز صبح ہے جو قبل طلوع آفتاب ہوتی ہیں اور قبل غروب متفق علیہ طور پر نماز عصر ہے اور رات کے کچھ حصوں میں یہ۔ یہ بلا اختلاف مشترک طور پر مغرب اور عشاء کا وقت ہے جو فقہ امامیہ ہی پر منطبق ہے جو مغرب کے بعد سے نصف شب تک دونوں نمازوں کا وقت قرار دیتی ہے۔

ہاں اس کے بعد جو اطراف النھار کی لفظ ہے اس کے لئے مفسرین اہلِ سنت کہتے ہیں کہ اس سے ظہر کا وقت مراد ہے کہ وہ نصف اوّل کا آخر اور نصف دوم کے شروع کا حصّہ ہے[1] مگر ہر صاحب زبان سمجھ سکتا ہے کہ دن کے دونوں طرف دونوں کنارے ہوتے ہیں۔ نصف اوّل اور آخر کے کنارے اگر طرف ہوا کریں تو وسط اور طرف کا فرق ختم ہوجائے۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

''دن کی حدوں پر یعنی پہر پہر پر وقت ہیں نماز کے سوائے پہلے پہر کے''۔ (موضح القرآن)

اوّل تو دن اور رات کی پہروں کی طرف تقسیم کوئی من جانب اللہ نہیں ہے بلکہ ہمارے ہندوستان کے عرف عام کی چیز ہے۔ پھر یہ کہ اطراف کے معنی پہروں کے کس لغت میں ہیں؟ جب کہ ان میں کا دوسرا پہر طرف میں واقع نہیں ہوتا اور پہلا پہر واقعی طرف کہا جا سکتا ہے، اسے آپ خارج کیے دیتے ہیں۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہاں اوقات الگ الگ بیان ہو ہی نہیں رہے ہیں بلکہ تفنن فی التعبیر کے طور پر ایک ادبی انداز میں دو مقابل ٹکڑوں میں اجمالی طور پر ان اوقات کو بیان کیا گیا ہے جن میں نمازیں ہوتی ہیں۔

پہلا ٹکڑا (قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا) ''طلوع آفتاب کے پہلے اور غروب کے پہلے'' اس کے انداز تین نمازوں کا وقت آ گیا۔ نماز صبح طلوع آفتاب کے پہلے اور ظہرین غروب کے پہلے۔ پھر دوسرا ٹکڑا یہ کہ اوقات شب میں اور اطراف روز میں نمازیں پڑھو اس میں مغرب اور عشاء اوقات شب میں ہوتی ہیں۔ اور صبح اور ظہرین اطراف نہار میں ہیں اور اس طرح کہ آغاز نہار طلوع صبح سے لیا جائے جو نہار شرعی اور مدّتِ امتدادِ صوم ہے اور اسی طرح بئر یعنی کنویں سے پانی کھینچنے میں دفع نجاست کے لئے جب تَرَاوُح کا حکم ہوتا ہے جس میں نھاراً کا ملاً یعنی پورے دن چار آدمیوں کے پانی کھینچنے کا حکم ہے، اسے طلوع فجر سے لیا جاتا ہے۔ طلوعِ آفتاب سے نہیں اس طرح ایک طرف نہار میں نماز فجر ہوتی ہے اور دوسری طرف نہار میں زوال کے بعد سے مغرب تک ہے ظہر وعصر واقع ہے۔ اس طرح اس ٹکڑے میں سب نمازیں آجاتی ہیں جس میں کوئی زحمت نہیں ہے۔

یہ دونوں الگ الگ فقرے ہیں جن میں وقت کا دو حیثیتوں سے بیان ہے۔ نہ یہ کہ دوسرا جزء تتمہ ہو پہلے فقرہ کا اور کوئی مضا ئقہ نہیں کہ صبح

---

[1] ای صلّ الظهر لانّ وقتها دخل بزوال الشمس فی طرف النصف الاول وطرف النصف الثانی (جلالین)

کا پہلا قبل الشمس میں بھی اظہار ہو اور پھر اطراف النھار کے تحت میں بھی وہ درج ہو جائے۔ اسی طرح ظہرین کا قبل غروبھا کی لفظ سے بھی بیان ہو، پھر اسی اطراف النھار کی لفظ کے تحت میں بھی ہو جائے۔

ادبی طور پر تفنن تعبیر میں اس طرح کی تکرار کوئی قابل انکار چیز نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِٱلصَّلَوٰةِ وَٱصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَٱلْعَٰقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿١٣٢﴾

''اور نہ ڈالو اپنی نگاہ اُس پر جس سے ہم نے ان میں سے بہت سوں کو بہرہ مند کیا ہے دنیوی زندگی کی زیب وزینت سے تاکہ اس سے ان کی آزمائش کریں اور تمہارے پروردگار والا رزق بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے اور اپنے والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر صبر و برداشت کے ساتھ برقرار ہو۔ہم تم سے نہیں مانگتے ہم ہی تمھیں روزی پہنچاتے ہیں اور انجام کی بہتری پرہیز گاری سے وابستہ ہے''۔

اگر خاص طور پر خطاب رسولؐ سے بھی جیسا کہ اس مبینہ شان نزول سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ اناج بطور قرض طلب فرمایا۔ اس نے کہا کچھ گروی رکھیے تو دوں گا۔ اس پر رسولؐ کو بہت رنج ہوا، تو یہ آیت بطور تسلّی نازل ہوئی۔ پھر بھی مقصود اس سے خاص رسولؐ کی ذات نہیں ہے بلکہ سب ہی افراد ہیں جو قرآنی تعلیم کو سننا اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہوں۔[1]

طرق اہل سنت سے ابی بن کعبؓ کی طرف نسبت ہے کہ انہوں نے اس آیت کے سلسلہ میں کہا:

فمن لم یتعزّبعزآء اللہ تقطّعت نفسه حسرات علی الدّنیا ومن یتبع بصرہ ما فی ایدی النّاس یطل حزنه ولا یشفیٰ غیظه ومن لم یر اللہ علیه نعمة الّا فی مطعمه و مشربه نقص علمه ودنا عذابه۔

جو اللہ کی دی ہوئی تسلّی سے دلاسا قبول نہ کرے اس کا دنیا پر غم وغصّہ سے کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگا اور جس کی نگاہ درپے رہے گی اس کی جو دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہے، اس کا رنج وملال طولانی ہوگا اور اسے سکون نہیں مل سکتا اور جو اللہ کی نعمت کا تصور صرف سامان اکل وشرب میں رکھتا ہو، اس کا علم ناقص ہوگا اور عذاب اس سے قریب ہوگا۔

ہمارے یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو خود پیغمبر خدا ﷺ نے اس کی تشریح میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے (مجمع البیان)

آخر میں جو آیا ہے کہ ''اپنے والوں کو نماز کا حکم دو'' اگر حکم عام بھی ہو جیسا کہ وہ حقیقۃً ہے، تب بھی رسول ﷺ سب سے اولیٰ ہیں کہ اس کی تکمیل فرمائیں، حالانکہ آپ کے اہل بیت وہ تھے جن کے لئے اس کی ضرورت نہ تھی مگر فرمان رب کے احترام میں ابوسعید خدریؓ کی مشہور و

---

[1] نھی اللہ تعالیٰ نبیه محمّد اوالمراد به جمع المکلّفین (تبیان)

معروف روایت ہے کہ اس آیت کے اترنے کے ۹ مہینے ہر نماز کے وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی و فاطمہ علیہما السلام کے دروازہ پر تشریف لے جاتے اور فرماتے تھے: الصّلوٰۃ رحمکم اللہ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا۔
اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ آپ کے اہل اور اہل بیت کا اس گھر والوں میں انحصار ہے، کسی دوسرے گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ کے اہل اور اہل بیت کا مصداق ہو۔

وَقَالُوْا لَوْلَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ﴿۱۳۳﴾

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں لاتے ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے پروردگار کی طرف سے! اور کیا آیا نہیں ان کے پاس کھلا ہوا ثبوت گزشتہ کتابوں میں ہے''۔

''کوئی نشانی'' یعنی جوان کی فرمائش ہو، ورنہ نشانیاں یعنی معجزات تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابر پیش کرتے ہی رہے تھے[1] اور قرآن ہی کیا کم حقیقت کی نشانی تھا مگر وہ صرف دھاندلی کے طور پر اور کبھی بطور تمسخر نئی نئی قسم کے معجزوں کی فرمائش کرتے تھے تو اُس کی جا بجا قرآن مجید میں ایک خاص انداز میں روکی گئی ہے یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہیں ایمان لانا ہوتا تو گزشتہ دور کے انبیاء کے بیانات ہی جو اس پیغمبر کے بارے میں موجود ہیں، اُن کے ایمان کے لئے کافی تھے، وہ انبیاء تو اسی قسم کے معجزات لائے تھے جس کی یہ فرمائش کرتے ہیں تو اُن پر یہ کب ایمان لائے ہوئے ہیں جو ایسے ہی معجزات کی فرمائش اب اس رسول پر ایمان لانے کے لئے وہ کر رہے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی ﴿۱۳۴﴾

''اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس کے پہلے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں نہ تو نے کوئی پیغمبر ہمارے پاس بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پیروی کرتے قبل اس کے کہ ذلیل اور رسوا ہوں''۔

یعنی خلق کو ہمارے مقابلے میں عذر پیش کرنے کا موقع ہوتا اور ہماری حجّت ان کے مقابلہ میں تمام نہ ہوتی، مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کے آنے کا مقصد اتمام حجّت ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ارشاد ہو چکا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ

ہم نے پیغمبر بھیجے ثواب اور عذاب کی خبریں دیتے ہوئے کہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجّت ان پیغمبروں کے بعد نہ رہے۔ (نساء۔۱۶۵)

اور اس آیت سے مثل بہت سی دوسری آیات کے صاف پتہ چلتا ہے کہ خالق فول قبیح سے جس پر کوئی اعتراض یا اس کی جائز شکایت کر سکے، منزّہ ومبرّا ہے یہی وہ وجوب عدل ہے جس یک اعتقاد کو شیعہ فرقہ کے خصوصی جرائم میں سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] یریدون الآیة الّتی یقترحونها لانّه اتی بالآیات (تبیان)

قُلۡ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوۡا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهۡتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

''کہہ دیجئے کہ ہر ایک انتظار کرنے والا ہے لہٰذا تم بھی منتظر رہو تو تمہیں عنقریب معلوم ہوگا کہ کون سیدھی راہ والے ہیں اور کون وہ ہیں جنہوں نے صحیح راستہ پالیا ہے''۔

''ہر ایک انتظار کرنے والا یعنی ہم بھی اور تم بھی''[1] منتظر ہیں کہ ہم سے جو اللہ کے وعدے ہیں کہ دین اسلام کا غلبہ ہوگا، اُن کے پورے ہونے کا وقت آئے اور تم اس کے منتظر ہو کہ ہماری اصل نسل قطع ہو جائے اور تمہیں دنیا میں پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اب دیکھنا ہے کہ کس کی توقّع پوری ہوتی ہے؟!

یاد رہے کہ یہ آیت امام منتظر عجل اللہ فرجہ الشریف کے انتظار کا سنگ بنیاد ہے۔ اب جو جماعت اس انتظار کو چھوڑ بیٹھی ہے وہ گویا قرآن کے چیلنج کی شکست تسلیم کرتی ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے کفّار و مشرکین یا منافقین کی توقع کے پورے ہونے کی قائل ہے جو قرآن کے منشاء کے صریحی خلاف ہے۔

[1] ای کلّ واحد منّا ومنکم (تبیان)

سُوۡرَۃُ الۡاَنۡبِیَآءِ

مکیّہ...... ۱۱۲......آیات

اس سورہ کا نام ویسا ہی ہے جیسے اس سے پہلے سورۂ ہود اور سورۂ ابراہیم کے نام ہو چکے ہیں، بایں معنی کہ متعدّد انبیاء کا ذکر مسلسل اور بھی سوروں میں آیا ہے جیسے سورۂ صآفّات اور صٓ وغیرہ مگر یہ نام اسی سورہ کا قرار پایا ہے۔ اِس سورہ میں حسب ذیل خصوصی مضامین ہیں

سورۂ انبیاء کے خاص مضامین:

۱------خدا کے افعال کھیل یعنی عبث نہیں جو حکمت الٰہی کا تقاضا ہے۔

۲------حق اور باطل کے ٹکراؤ میں نتیجتاً حق غالب اور باطل پاش پاش ہوتا ہے۔

۳------فرشتوں کے اوصاف۔

۴------اگر کوئی خدا ہوتے تو آپس میں کش مکش ہوتی جو علم کلام کی زبان میں ''برہان تمانع'' کہلاتا ہے۔

۵------توحید الٰہی انبیاء کا متفقہ پیغام ہے۔

۶------ہر ذی حیات کی زندگی پانی سے۔

۷------آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے بلکہ سیّال مادّہ کی نوعیت سے ہونے کی طرف اشارہ۔

۸------ہر متنفّس کے لئے موت کا ذائقہ چکھنا لازمی۔

۹------قیامت میں میزانِ اعمال۔

۱۰------حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور قوم سے گفتگو۔

۱۱------حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں پھینکا جانا اور اُس کا سرد ہو جانا۔

۱۲------زراعت کے بارے میں حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے فیصلے۔

۱۳------حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تمام چیزوں کا تسبیح الٰہی میں مصروف ہو جانا۔

۱۴------حضرت سلیمان علیہ السلام کی دوش ہوا پرواز۔

۱۵------جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور اُن کا صبر۔

۱۶------حضرت یونس علیہ السلام کی تسبیح۔

۱۷------جناب زکریا علیہ السلام کی دعا۔

۱۸------یاجوج اور ماجوج کا ذکر۔

۱۹------انجام کار میں نیکوکاروں کا مکمل اقتدار۔

۲۰------خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا............وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡہُ وَ ہُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ لَاہِیَۃً قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ ہَلۡ ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳﴾ قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۫ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۴﴾

''قریب آگیا ہے لوگوں کے لئے اُن کے حساب کتاب کا وقت اور وہ ہیں کہ بے خبری میں مبتلا ہیں، بے اعتنائی کرنے والے نہیں آتی اُن کے پاس کوئی تازہ بتازہ یاددہانی مگر یہ کہ وہ اسے سنتے ہیں اس طرح کہ وہ کھیل کود میں مصروف ہیں اس عالم میں کہ ان کے دل غفلت میں مبتلا ہیں اور وہ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں، وہ ظالم لوگ کہ کیا یہ ہے کہ سوا ایک آدمی کے جو تمہارا ہی ایسا ہے۔ کیا تم جادو کی طرف متوجّہ ہوتے ہو، حالانکہ تم دیکھتے ہو؟'' اُس نے کہا کہ میرا پروردگار جانتا ہے ہر بات کو جو آسمان اور زمین میں ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

قال ربّی یعلم القول میں قاَلَ کے بجائے دوسری قرأت قُل ہوئی ہے[1] جس کی بنا پر آخری آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''کہیے میرا پروردگار جانتا ہے''۔

تعجب ہے کہ جناب شیخ الطائفہؒ نے متن میں قاَل لکھا ہے مگر تشریح قُل کے لحاظ سے کی ہے اور لطف یہ ہے کہ علّامہ طبرسیؒ نے اس تضاد میں بھی اُن کی پیروی کی ہے۔[2]

بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىہُ بَلۡ ہُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلۡیَاۡتِنَا بِاٰیَۃٍ کَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۵﴾ مَاۤ اٰمَنَتۡ قَبۡلَہُمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا ۚ اَفَہُمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾

---

[1] قرأ اھل الکرفۃ الّا ابابکر وخلفاء قال ربّی علیٰ وجہ الخبر والباقون قل ربّی علیٰ وجہ الامر (تبیان)

[2] قل یا محمّد ربّی الخ (تبیان و مجمع البیان)

’’بلکہ کہا اُنہوں نے کہ یہ خوابہائے پریشان ہیں، بلکہ اس نے غلط تہمت لگائی ہے، بلکہ وہ شاعر ہے، اچھا تو وہ ہمارے سامنے کوئی معجزہ پیش کردے جس طرح اگلے پیغمبر بھیجے گئے۔ان کے پہلے بھی وہ بستیاں جنہیں ہم نے ہلاک کردیا ایمان نہیں لائی تھیں تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے‘‘؟ اُن کا بدل بدل باتیں کہنا، پہلے یہ کہ خوابہائے پریشان ہیں، پھر یہ کہ اس نے غلط تہمت لگائی ہے، پھر اس کے بجائے یہ کہ وہ شاعر ہے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ اس غیر معمولی کلام سے حیرت میں مبتلا تھے کہ گھبرا کے ایک بات کہتے ہیں، پھر خود محسوس کرتے ہیں کہ بات بنی نہیں تو اس کے بجائے دوسری بات کہتے ہیں، اُس کے بھی غلط ہونے کا احساس ہوتا ہے تو تیسری بات کہتے ہیں[1] چونکہ جو اصل حقیقت ہے کہ وہ خالقِ بشر کا نازل کیا ہوا کلام ہے، اُس کے ماننے اور ظاہر کرنے کے لئے وہ تیّار نہیں ہیں تو پریشان ہو ہو کے وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے غلط ہونے کا خود اُنہیں احساس ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝۷ وَمَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا لَّا يَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوۡا خٰلِدِيۡنَ ۝۸ ثُمَّ صَدَقۡنٰهُمُ الۡوَعۡدَ فَاَنۡجَيۡنٰهُمۡ وَمَنۡ نَّشَآءُ وَاَهۡلَكۡنَا الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۝۹

’’اور ہم نے آپ کے پہلے نہیں بھیجے مگر آدمی ہی جن کی طرف ہم وحی بھیجیں تو دریافت کرو صاحبانِ علم سے اگر تم نہیں جانتے اور نہیں بنایا تھا ہم نے انہیں ایسے مجسّے جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔ پھر ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا، اسے سچ کر دکھایا تو اُنہیں اور جن کو ہم نے چاہا چھٹکارا دیا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کردیا‘‘۔

اہلِ ذکر سے سوال کا حکم:

’’ان سے جو وعدہ تھا، اسے ہم نے سچ کر دکھایا، یعنی نصرت کا جو وعدہ اور اُسی وعدے کا پورا کرنا ہے جس کا بعد کو بیان ہے۔[2]

’’چھٹکارا دیا انہیں‘‘ یعنی خود اُن پیغمبروں کو ’’اور جن کو ہم نے چاہا‘‘ یہ ان پیغمبروں پر ایمان لانے والے افراد ہوسکتے ہیں جو اُن کے ساتھ تھے۔[3]

اس کے لئے اھل الذّکر کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے، جہاں جہاں اھل الذّکر کی لفظ قرآن میں آئی ہے کہ اُن سے پوچھو، وہاں اُس کے مفہوم میں اختلاف ہوا ہے اور ہر جگہ قریب بتحقیقت یہ تفسیر ہے کہ ہیں اھل الذّکر کے معنی ہیں اھل العلم اور ظاہر ہے کہ

[1] بل الانتقال من غرض الی اٰخرفی المراضع الثلٰثة (جلالین) قول متحيّر قد يهره ماسمع فمرّة يقول ساحر و مرّة يقول شاعر ولا يجزم علٰی امر واحد (تبیان و مجمع البیان)

[2] صدقناهم الوعد يعنی الانبيآء الماضين ماوعدناهم به من النصر ة النّجاة (تبیان)

[3] ای المصدّقين لهم (جلالین)

مصداق اتم اس کا اسلام کے حقیقی رہنمایاں معصومین علیہم السلام ہیں اور اس لئے ہمارے آئمہ علیہم السلام نے اکثر فرمایا ہے کہ ہم اھل الذّ کر ہیں پھر جب کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خود قرآن میں ذکر کا لقب موجود ہے تو اس لحاظ سے بھی آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اھل الذّ کر ہوئے [1] اور قرآن کو الذّ کر کہا گیا ہے، اس طرح بھی اھل الذّ کر وہی ہستیاں ہیں جنہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستقل طور پر قرآن کا ساتھی بتایا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠﴾

''ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری نصیحت ہے تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے''۔

فيه ذكركم کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے، وہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [2] لیکن ایک معنی اس کے یہ کیے گئے ہیں کہ اس میں تمہاری عزّت ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے کہ:

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ: وہ ضرور آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے ایک بہت بڑا اشرف ہے۔ (زخرف۔ ۴۴)

علامہ طبرسیؒ نے اسی تفسیر کو مقدّم قرار دیا ہے۔ [3]

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿١١﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿١٢﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿١٣﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿١٤﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿١٥﴾

''اور کتنی ہی ہم نے قلع قمع کر دیں بستیاں جو ظالم تھیں اور اُن کے بعد دوسری قوم پیدا کی اور جب اُنہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو ایک دم وہ اس سے (بچنے کے لیے) دوڑ بھاگ کرنے لگے۔ اب دوڑ بھاگ نہ کرو اور رہو اُسی عیش وعشرت میں جو اَب تک رہا ہے اور اپنے اُنہیں محلّات میں، شاید تمہاری پوچھ گچھ ہو۔ اُنہوں نے کہا ہائے غضب! بلاشبہ ہم ظالم تھے تو یونہی وہ دُہائی مچاتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے ان کو کٹا چھٹا، خاموش وافسردہ کیا''۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿١٦﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ

---

[1] اختلف فی المعنی بأهل الذّكر علیٰ اقوال فروی عن علی علیہ السلام انه قال نحن اهل الذّكر وروی ذلك عن ابی جعفر علیہ السلام ويريده انّ الله تعالیٰ سمّی النبیّ ذکر الرسرلا (مجمع البيان)

[2] پند شما (شاہ ولی اللہ)

[3] ای فيه شرفکم ان تمسّکتم به (مجمع البيان)

فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ⑱

''اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو تفریحی طور پر اگر ہم چاہتے دل بستگی کا سامان تو اُسے بناتے اپنے پاس سے، اگر ایسا کرنا چاہتے بلکہ ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں تو وہ اسے توڑتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ایک دم نیست و نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے وائے ہو اس سے جو تم باتیں کہتے ہو''۔

افعال الٰہی عبث نہیں، حق و باطل کے تصادم کا عام انجام:

دل بستگی کے سامان سے مراد بیوی بچے ہیں [1] اور اگر ایسا کرنا ہوتا تو اُسے اپنے پاس سے بناتے، یعنی فرشتوں اور حوروں سے ایسا سامان اپنے لئے مہیا کرتے۔ [2]

اس مناسبت سے آخری فقرہ کا مطلب شاہ عبدالقادر کی الفاظ میں یوں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ غیب سے ایک قدرت کاملہ کا نمونہ بھیجتا ہے جھوٹ کے مٹانے کو۔ اُن کالموں کو تم کہتے ہو ''خدا کا بیٹا''۔ (موضح القرآن)

''تمہارے لئے وائے ہو اُس سے جو تم باتیں کہتے ہو'' یعنی اللہ کی طرف زوجہ اور اولاد کی نسبت دیتے ہو۔ [3]

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ⑲ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ⑳

''اور اُس کے ہیں وہ سب آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں، رات اور دن کی تسبیح کرتے ہیں، سست نہیں ہوتے''۔

فرشتوں کے اوصاف:

یہ فرشتوں کے اوصاف [4] جن کی فطرت ایسی ہے کہ وہ لگاتار عبادت کرتے ہیں ۲۔ نہ ان کے جسم ایسے ہیں کہ ان میں تھکن پیدا ہو، نہ طبیعتیں ایسی ہیں کہ ایک حالت پر رہنے سے اُکتا جائیں اور تنوع کو دل چاہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ㉑ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ

---

[1] یعنی زن و فرزند (فتح الرحمن) کھلونا یعنی بیٹا (موضح القرآن)

[2] من عندنا من الحور العین والملائکۃ (جلالین)

[3] تصفون اللہ من اتّخاذ الاولاد (تبیان) من اتخاذ الصاحبۃ والولد (مجمع البیان)

[4] یعنی الملئکۃ (علی ابن ابراھیم) [2] دائمون علیہ (تبیان)

لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

''کیا انہوں نے زمین سے ایسے خدا بنائے ہیں کہ جو دوبارہ زندہ کرتے ہوں؟ اگر دونوں میں اللہ کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں تباہ و برباد ہو جاتے، تو پاک ہے اللہ جو عرش کا مالک ہے اُس سے، جو وہ بیان کرتے ہیں''۔

توحید کی مشہور دلیل اور ''برہان تمانع'':

''اگر اُن دونوں میں'' یعنی زمین اور آسمان میں ''کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں تباہ و برباد ہو جاتے''۔ اس سے متکلّمین نے نصی شرک پر برہان تمانع مرتّب کیا ہے اور غالباً اسی لئے جلالین نے دونوں جگہ لفسدتا کی تشریح میں لفظ تمانع صرف کی ہے''۔

خرجتا من نظامها المشاهد لوجود التمانع بينهم علىٰ وفق العادة عند تعدّ الحاكم من التمانع فى الشئ وعدم الاتفاق عليه۔

دونوں خارج ہو جاتے اپنے نظم و ترتیب سے جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اس لئے کہ ان خداؤں میں تمانع ہوتا جیسے کہ عموماً حاکموں کے کئی ہونے کی صورت میں ہوتا ہے کہ کسی بات میں ان کے درمیان تمانع ہوتا ہے اور اس پر وہ متفق نہیں ہوتے۔

اسی طرح شیخ الطائفہؒ نے بھی ایک دفعہ لفظ تمانع صرف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

لو صحّ الٰهان او اٰلهة لصحّ بينهما التّمانع فكان يؤدّى ذلك الىٰ انّ احدهما اذا اراد فعلا واراد الأخر ضدّه ان يضع مرادهما فيؤدّى الىٰ اجتماع الضدّين اولا يقع مرادهما فينتقض كونهما قادرين اويقع مراد احدهما فيؤدّى الىٰ نقض كون الأخر قادرا (تبيان)

اگر دو یا کئی خدا ہونے کا امکان ہوتا تو ان دونوں کے درمیان تمانع ایک دوسرے کے خلاف (ارادہ) بھی ممکن ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جب ایک نے ایک کام کا ارادہ کیا اور دوسرے نے اُس کے خلاف کا ارادہ کیا تو یا دونوں کا مقصد وقوع میں آئے تو نتیجہ یہ ہو کہ دو متضاد باتیں ایک ساتھ ہوں یا دونوں کا مطلب پورا نہ ہو تو دوسرا صاحبِ قدرت قرار نہیں پائے گا۔

علّامہ طبرسیؒ نے صاف لکھ دیا ہے کہ: هٰذا هو دليل التمانع الّذى نبى عليه المتكلّمون مسألة التّوحيد۔

یہ وہی دلیل تمانع ہے جس پر متکلّمین نے توحید کے مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

''جو کچھ وہ کرے، اُس کے متعلق اُس سے نہیں پوچھا جائے گا، بے شک ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی''۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے کہ وہ اس سے حاکمانہ طور پر باز پُرس کرے اور یہ جتنے ہیں جنہیں دنیا والے معبود قرار دے رہیں ہیں، اللہ کے بندے ہیں، اس لئے ان سے جواب دہی ہوگی، یہ اور بات ہے کہ جواب دہی کے بعد وہ بے گناہ قرار پائیں جیسے دوسری جگہ تفصیل سے جناب مسیح علیہ السلام سے سوال و جواب جو روز قیامت ہوگا، مذکور ہے۔

آیت کا ترجمہ بالکل صاف ہے چنانچہ شاہ رفیع الدین نے بھی لکھا ہے ”نہیں سوال کیا جاتا اُس چیز کہ کرتا ہے“ مگر ان کے والد بزرگوار جناب شاہ ولی اللہ نے معلوم نہیں کسی غوط میں یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ ”پرسیدہ نمی شود خدا از آنچہ صفت فی کنند“ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت آیت کے الفاظ بجائے عمّا یفعل کے عمّا یصفون اُن کے ذہن میں آئے۔ بلا شبہ ”یہ خطائے بزرگان“ کی بڑی اعلیٰ مثال ہے۔

بہر حال ”جو کچھ وہ کرتا ہے، اُس کے متعلق اس سے پوچھا نہیں جائے گا“۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کے افعال کا واقعاً بھی کوئی معیار نہیں ہے۔ وہ جو چاہے کرے، اُس کے لئے روا ہے جیسا کہ جمہور اہل سنّت کا جو عدل کے منکر ہیں، اُس کے بارے میں تصور ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ اس کی قدرت وقوت ہے، جس کی بنا پر اس سے کوئی دوسری طاقت سوال کرنے والی نہیں ہے اور یہ خود اُس کا علم وحکمت اور شانِ کمال ہے کہ سوا خیر کے کسی شر کا تصور اس کے افعال میں درست نہیں ہے۔

ایک مفہوم اس کا اور سمجھا گیا ہے کہ چونکہ اُس کے افعال سب عدل وحکمت پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا اُس سے پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور دوسرے چونکہ غلط باتیں بھی کرتے ہیں لہٰذا اُن سے مواخذہ کا موقع ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟[1] مگر ہمارے نزدیک پہلا ہی مفہوم زیادہ درست ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

”کیا اُنہوں نے اُسے چھوڑ کر بہت سے خدا بنائے ہیں؟ کہیے کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ اُن کی تعلیم ہے جو میرے ساتھ ہیں اور اُن کی تعلیم جو میرے پہلے تھے بلکہ ان میں اکثر اشخاص حق کو جانتے نہیں تو وہ بے اعتنائی اختیار کیے ہوئے ہیں، اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے کوئی پیغمبر مگر یہ کہ اُس کی طرف ہم نے وحی بھیجی کہ کوئی خدا سوا میرے نہیں تو میری عبادت کرو“۔

توحید الٰہی تمام پیغمبروں کا متفقہ پیغام:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”پہلے اُن معبودوں کا ذکر فرمایا جو برابر خدا کے کوئی سمجھے اگر دو حاکم ہوتے تو جہاں خراب ہوتا۔ اب اُن کا ذکر فرمایا جو خدا کے نائب ٹھہراتے ہیں اس پر مالک کی سند چاہیے، اُس کے بغیر کیونکہ نائب ہووے“۔ (موضح القرآن)

”میرے ساتھ والوں کی تعلیم“ یعنی قرآن جو میرے ساتھ والوں کو تعلیم دینے والی کتاب ہے اور ”میرے پہلے والوں کی تعلیم“ یعنی

---

[1] معنا انّ جمیع افعا له حکمة وصواب ولا یقال للحکیم لم فعلت الصواب و هم یُسالون لانّهم یفعلون الحقّ و الباطل (مجمع البیان)

توریت اور انجیل سب میں اللہ کی وحدت ہی کا اعلان ہے، شرک کی حمایت کوئی کتاب نہیں کرتی [1]، اور تمام پیغمبر یہی تعلیم دیتے رہے۔

یہ وہ چیز ہے جسے علمائے متکلمین ''اجماع انبیاء و مرسلین'' سے استدلال کی صورت سے پیش کرتے رہے ہیں۔ اس بنا پر کہ رسالت وجودِ خدا پر موقوف ہے لہٰذا اقوالِ مرسلین سے وجودِ خدا پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ اُس پر صرف عقلی دلائل ہی سے استدلال ہوسکتا ہے لیکن انبیاء کی سچائی معجزات سے ثابت ہونے کے بعد اُن کے اقوال سے توحید پر استدلال میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اس استدلال کو جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک کلام میں جو نہج البلاغہ کے اندر ہے بالکل عقلی لباس پہنا کر اس طرح پیش فرمایا ہے:

لو کان مع اللہ الہ لاتنا رسلہ ولر اینا اٰثار قدرتہ.

اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہوتا تو اس کے پیغمبر بھی ہمارے پاس آتے اور اس کی قدرت کے آثار بھی ہم دیکھتے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے اولاد بنائی ہے۔ پاک ہے اس کی ذات بلکہ وہ معزز بنے ہیں وہ اس پر کسی بات میں سبقت نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرنے والے ہیں۔ وہ جانتا ہے اُسے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کی کہ جسے وہ پسند کرے اور وہ اس کے ڈر سے سہمے ہوئے رہتے ہیں اور جو ان میں سے کہے کہ اسے چھوڑ کہ میں خدا ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے، اسی طرح سزا دیتے ہیں ظالموں کو''۔

معصومین علیہم السلام کی توصیف:

فرشتوں کو مشرکین اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اس لئے عموماً اسے فرشتوں ہی سے متعلق قرار دے دیا گیا ہے [2] اور اس فقرہ کو کہ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ (سورۂ انبیاء) ملائکہ کی صفت قرار دیا جاتا ہے مگر جب کہ اولاد قرار دیا جانا فرشتوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ جہاں فرشتوں کی نسبت مشرکین کے تصور کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے وہاں صراحۃً کہا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے بنات (بیٹیاں) قرار

[1] ذکر من معی ای امّتی وھو القراٰن وذکر من قبلی من الامم وھو التورٰتہ ولا انجیل وغیرھما من کتب اللہ لیس فی واحد منھا انّ مع اللہ الھاً ممّا قالوا (جلالین)

[2] ولدا من الملئکۃ (جلالین)

دیتے ہیں۔اولاد قرار دینے سے زیادہ تر یہودی عقیدہ عزیز کے متعلق اور عیسائیوں کا عقیدہ مسیح کے متعلق ذہن میں آتا ہے تو اس عباد مکرمون اور اس کے بعد کے اوصاف کو ان بندگان الٰہی یعنی انبیاء مرسلین پر بھی کیوں حاوی نہ سمجھا جائے؟ اس طرح وہ فقط ملائکہ نہیں بلکہ انبیاء کی بھی عصمت کی دلیل ہوگی جب کہ شفاعت جس کا بعد میں تذکرہ ہے، وہ بلاشبہ انبیاء سے متعلق ہے۔

بحیثیت واقعہ انہیں کسی ناپسند بات کے ارتکاب سے بری کہہ دینے کے بعد اب جو اصولوں کا اعلان ہے ''جو ان میں سے کہے کہ اسے چھوڑ کر میں خدا ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے''۔وہ اصول کی ہمہ گیری کو پوری قوت کے ساتھ ظاہر کرنے کے لئے بطور مفروضہ ہے جیسے خاتم الانبیاء ﷺ سے بظاہر مخاطب ہو کر اعلان کیا ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (زمر۔۶۵) اگر آپ شرک کیجئے تو ضرور آپ کے اعمال سب اکارت ہو جائیں گے''لہٰذا اس کے لئے پہلے کلام کو ملائکہ سے متعلق کرنے کے بعد مصداق کے تلاش کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سے مراد ابلیس ہے جو ملائکہ کی صفوں میں شامل تھا مگر اس نے اپنی عبادت کی طرف دعوت دی۔[ا]

چونکہ قرآن نے ملائکہ کی شان وہ بتلا دی ہے جس کا پہلے ذکر ہے تو ابلیس سے حقیقتاً اس کے ملائکہ میں سے ہونے کے مفروضہ پر ایسا کردار ظاہر ہی کیوں کر ہو سکتا تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ نہ ابلیس ملک تھا اور نہ یہاں کو کہا جا رہا ہے، وہ کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے بلکہ وہ جیسا کہ ہم نے کہا اور اس کی نظیر قرآن سے پیش کی، صرف بحیثیت مفروضہ ہے جس سے اصول کی ہمہ گیری پر زور دینا مقصود ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳۱ وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ښ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۳۲ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۳۳

''کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین سب ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان میں شگاف پیدا کیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے قرار دیا تو کیا یہ ایمان نہیں لائیں گے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ قرار دیے کہ وہ ان لوگوں کو لے کر ڈانواڈول نہ ہو اور ان کی درمیانی خلاؤں میں راستے بنائے۔شاید کہ وہ ہدایت پائیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ہر ایک ایک دائرہ میں تیر رہا ہے۔''

ہر ذی حیات کی خلقت یا بقاء پانی سے، آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کی طرف اشارہ:

''ہر زندہ چیز کو پانی سے قرار دیا''۔اس کا جو بالکل ظاہری مفہوم ہے، وہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ان کی خلقت نطفہ سے ہوئی اور نطفہ کو بھی

[ا] وھو ابلیس دعا الیٰ عبادۃ وامر بطاعتہ (جلالین)

خالق نے دوسرے مقامات پر مآء ہی سے تعبیر کیا ہے[1] اور یہ بھی کہ پانی اس کا سبب حیات ہے۔[2]

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور آپ کے پہلے بھی کسی آدمی کے لئے ہمیشہ کی زندگی ہم نے قرار نہیں دی۔ تو کیا اگر آپ دنیا سے اٹھ جائیں تو وہ ہمیشہ کی زندگی پا جائیں گے؟ ہر متنفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تم لوگوں کو برائی اور بھلائی کے ساتھ آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں اور ہماری ہی طرف تم پلٹو گے''۔

ہر متنفس کے لئے موت کا مزہ چکھنا ضروری ہے:

آیت کا پس منظر جلالین نے یہ لکھا ہے: قال الکفار ان محمدا یموت۔ کافروں نے کہا کہ محمدؐ عنقریب مرجائیں گے۔
شاہ عبدالقادر نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ: ''کافر کہتے تھے اس شخص تک ہے یہ دھرم، جہاں یہ مرا پھر کچھ نہیں''۔ (موضح القرآن)
دیکھا جائے تو دونوں باتیں ایک دوسرے کا تیمہ ہیں۔ جلالین کی تفسیر ''کافروں نے کہا یہ عنقریب مرجائیں گے'' یہ کوئی واقعہ کی اطلاع تھوڑی تھی۔ اس کہنے میں یہی تمنا مضمر ہے کہ بس یہ مرجائیں تو ان کا دین ختم ہوجائے۔ اس کو علّامہ طبرسیؒ نے یوں کہا ہے کہ:
قالوا نتربّص به ریب المنون (مجمع البیان) انہوں نے کہا ہمیں انتظار ہے ان کے لئے موت کی کارگزاری کا
خالق کریم نے مذکورہ بالا آیات میں اس کے جواب میں کئی باتیں کہی ہیں:
۱۔ یہ نئی بات کیا ہے جو انہی کے لئے انتظار ہے اس کے پہلے جتنے انبیاء آئے، سب ہی کو ایک دن موت سے دو چار ہونا پڑا۔
۲۔ اس پر کہ وہ خوش نصیب ہو رہے ہیں کہ یہ مرجائیں گے، کہا جا رہا ہے کہ ارے یہ مرجائیں گے تو کیا تم ہمیشہ کے لئے رہ جاؤ گے۔ اے دوست بر جنازہ دشمن چو بگذری شادی مکن کہ بر تو ہمیں ماجرا رود۔
۳۔ موت ہر متنفس کے لئے ہے جس کے ساتھ آزمائش اس کی ہے کہ اس دارِ دنیا میں کردار کیا رہتا ہے؟
ظاہر ہے کہ رسولؐ دنیا سے اٹھیں گے تو پوری زندگی قابل تعریف گزار کر۔ تم اپنی خبر لو کہ دنیا سے جاؤ گے تو کیا کرتوت چھوڑ کر جاؤ گے۔
۴۔ اس دنیا سے اٹھ کر سب کسی اور طرف تھوڑی جائیں گے۔ ہماری ہی طرف پلٹیں گے تو ہم اس دار دنیا والے کردار کے لحاظ ہی سے ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے لائیں گے تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ وہاں انجام کس کا کیا ہوتا ہے؟!

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

---

[1] المعنٰی انّ کلّ شیء صار حیّا فھو مجعول من المآء (تبیان) پیدا کردیم از آب (شاہ ولی اللہ)
[2] ای الماء سبب لحیوته (جلالین)

''اور جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ کا مذاق اڑاتے ہیں ''کیا یہی وہ ہے جو تمھارے خداوں کا ذکر کیا کرتا ہے''؟ اوران کا عالم یہ ہے کہ وہ خدائے رحمٰن کے ذکر سے منکر ہیں''۔

''خداوں کا ذکر کیا کرتا ہے'' یعنی ان کی برائی کرتا ہے اوران کی عبادت پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ [۱]

اس کا جواب ایک خاص انداز میں یوں گیا ہے کہ ان بتوں پر حرف گیری کو موردالزام قرار دیتے ہیں جن کا ان پر نہ کوئی احسان ہے اور نہ کوئی ویسا کارنامہ ہے اور یہ خود وہ ہیں جو اس خدا کا انکار کرتے ہیں جو حقیقتاً ان کا ولی نعمت ہے اوران کی پشت جس کے احسانات کے بار سے خمیدہ ہے۔ [۲]

ایک دوسرا پہلو اس جواب کا میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ان کے بتوں کا ذکر برائی کے ساتھ ہوتا ہے وہ ان کو ناگوار ہو تو محل تعجب نہیں۔لیکن رسولؐ تو جب مثبت پہلو اختیار کر کے خدائے رحمٰن کی حمد وثناء کرتے ہیں تو اس پر پھر بھی ان کو اعتراض ہے اور یہ اس کا انکار کرتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اظہار حق کسی صورت سے گوارا نہیں تو ان کی اس خوئے انکار واعتراض کا کہاں تک خیال کیا جائے؟

یہی حال ہے متعصب مخالفین مذہبِ حق اس وقت بھی کہ ان کے پیشواوں کو برا کہا جائے۔یہ انہیں ناگوار ہو تو پھر ایک بات ہے مگر ان سے تعرض کیے بغیر فضائل اہلِ بیت رسول علیہم السلام اور بالخصوص مناقب حضرت علی بن ابی طاب علیہ السلام بیان کیے جائیں تو وہ بھی انہیں ناگوار ہوتے ہیں۔اس کا آخر کیا علاج ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾

''آدمی کا خمیر ہوا ہے جلد بازی سے عنقریب میں اپنی نشانیاں تمہیں دکھلاوں گا تو تم جلدی سے کام نہ لو اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچّے ہو؟ کاش جانیں وہ جو کافر ہیں اُس وقت کا عالم جب وہ نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشت سے اور نہ اُن کی مدد ہوگی بلکہ وہ ساعت اُن پر اچانک آئے گی تو اُنہیں ششدر کردے گی تو وہ اُسے پلٹا نہیں سکیں گے اور نہ اُنہیں مہلت ملے گی''۔

''جلد بازی سے خمیر ہوا ہے'': اس کے معنی میں کافی اختلاف ہے، قرینِ قیاس یہی مفہوم ہے جلد بازی اُس کی طبیعت میں داخل ہے اور یہی بعد کے فقرہ سے مناسبت رکھتا ہے کہ میں عنقریب اپنی نشانیاں تمہیں دکھلاوں گا تو تم جلد بازی سے کام نہ لو''۔ [۳]

---

[۱] یادمی کنند یعنی باھانت (شاہ ولی اللہ) یعیبہا (جلالین)

[۲] انّھم نعیبون مجد الھیّۃ من لا نعمۃ لہ وھم یجحدون االٰھیۃ "من کلّ نعمۃ فھو منہ وھٰذا نہایۃ الجھل (تبیان)

[۳] قال قتادۃ معناہ خلق الانسان عجولا ......والّذی قالہ قتادۃ اقوی الوجوہ (تبیان)

”نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشت سے“، یعنی وہ چاروں طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہوگی۔ [۱]

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾

”اور مذاق اڑایا گیا بہت سے پیغمبروں کا جو آپ سے پہلے تھے تو آگے آیا ان کے جنہوں نے اُن سے تمسخر کیا تھا، وہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے“۔

یعنی عذاب الٰہی کی خبریں سن کر ہی وہ مذاق اڑاتے تھے، اب وہی عذاب اُن کے سامنے آگیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور اُس نے انہیں گھیر لیا۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

”کہیے کہ کون تمہاری حفاظت کرسکتا ہے رات اور دن میں اللہ سے؟ بلکہ وہ اپنے پروردگار کی یاد سے بے اعتنائی اختیار کرنے والے ہیں؟ یا کیا اُن کے خدا ایسے ہیں کہ ہمارے علاوہ وہ اُن کی حفاظت کرسکیں وہ تو خود اپنی مدد نہیں کرسکتے اور نہ ہماری طرف سے ان کیلئے ہمدم ہے۔ [۲]

بلکہ ہم نے انہیں اور ان کے باپ دادا کو مال ومنال سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہے یہاں تک کہ وہ لمبی عمروں تک جیا کیے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آرہے ہیں گھٹاتے ہوئے اس زمین کو اس کے اطراف وجوانب سے تو کیا وہ غالب آسکتے ہیں“؟

شروع میں جو ہے کہ ”کون تمہاری حفاظت کرسکتا ہے رات اور دن میں اللہ سے“؟ اس کے بظاہر یہی معنی ہوتے ہیں کہ اللہ کے عذاب سے تمہاری کون حفاظت کرسکتا ہے؟ [۳] لیکن ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ رات اور دن میں جو حادثے پیش آتے ہیں، ان سے تمہیں کون بچا سکتا ہے [۴] مگر اس صورت میں من اللہ کے معنی بدلا من اللہ کے ہوں گے یعنی اللہ کے بدلے میں دوسرا کون ہے جو تمہیں ان خطروں سے بچا سکے؟ بعد میں جو ہے

---

[۱] یعنی انّ النّار یحیط بھم من جمیع وجوھھم (تبیان) من جمیع جوانبھم (مجمع البیان)

[۲] معناہ لا یصحبھم صاحب بمنعھم منّا (تبیان)

[۳] ای من یحفظکم من باس الرّحمٰن وعذابہ (تبیان)

[۴] قیل من عوارض الاوقات (مجمع البیان)

کہ ''کیا اُن کے کچھ خدا ہیں جو ہمارے علاوہ ان کی حفاظت کریں''۔ یہ اس دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ چسپاں ہے، پھر یہ کہ ''نہ ہماری ہی طرف سے ان کا کوئی ہمدم ہے''یعنی ہم بذات خود بچاتے ہیں۔ ہماری طرف سے بھی کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے جو اُن کے ساتھ رہے اور ہر خطرہ سے بچائے۔

آخر میں جو ہے کہ ''ہم چلے آرہے ہیں گھٹاتے ہوئے زمین کو اس کے اطراف و جوانب سے''...... یہ مضمون دوسرے مقام پر بھی ہے اور وہاں بھی اور یہاں بھی عام مفسرین یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ ہم اسلامی فتوحات کے ذریعہ سے کفّار کے قبضہ والی زمینوں کو گھٹاتے چلے جاتے ہیں۔ [۱] مگر وہاں بھی ہم نے اس تفسیر سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں کئی قول درج کرتے ہوئے اسے سب سے آخر میں لکھا ہے لیکن پہلے ایک مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ حوادثِ ارضی وسماوی آیا کرتے ہیں جن سے زمین کے اکثر حصّے تباہ و برباد ہوجاتے ہیں، بعض احادیث میں اس کی تفسیر موت علماء سے ہوئی ہے مگر اس کا آیت کے قبل اور بعد والے الفاظ سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

''کہیے کہ میں تو تمہیں وحی الٰہی کی بنا پر عذاب سے ڈراتا ہوں اور بہرے لوگ پکار نہیں سنتے جب وہ ڈرائے جاتے ہیں اور اگر انہیں ایک دفعہ بھی ذرا سا تمہارے پروردگار کا عذاب چھو جائے تو وہ کہیں گے کہ وائے بر حال ما ہم بے شک ظالم تھے''۔

پہلے جملہ میں خطاب ہے۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ تم بہرے ہو، اس لئے نہیں سنتے مگر یہ انداز سخت کلامی کا ہوتا لہٰذا دوسرے جملہ کو بصیغۂ غائب عمومی طور پر لایا گیا ہے کہ جو بہرے ہوا کرتے ہیں، وہ پکارنے والے کی آواز کو نہیں سنا کرتے۔ اس کے بعد آخر تک صیغے غائب کے ہیں جیسے کہ کسی اور جماعت کا ذکر ہے حالانکہ مراد وہی مخاطب افراد ہیں جن سے آغاز کلام میں تخاطب تھا۔ یہ بھی ایک قسم ہے قرآن مجید کے اندازِ رواداری کی جس سے دنیا سبق حاصل کرسکتی ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہم قیامت کے دن ترازو قائم کردیں گے جو معیار عدالت ہوگی تو کسی متنفّس پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر ایک رائی کے دانہ بھر بھی ہوگا تو اسے ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے''۔

عموماً ''الموازین القسط'' کا ترجمہ ایسا ہوتا ہے جو اضافی ترکیب کو ظاہر کرتا ہے [۲] حالانکہ اس صورت میں عربی قواعد کے لحاظ سے

[۱] نقص ارضهم بالفتح على النبي ﷺ (جلالین)

[۲] درمیان نہم ترازوئے عدل (شاہ ولی اللہ) رکھیں گے ہم ترازو ویں عدل کی (شاہ رفیع الدین) انصاف کی میزانیں (مولانا مقبول احمد صاحب)

موازین پر الف لام نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ حالت میں اسے اضافت نہیں، بیان سمجھنا چاہیے جس سے نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ترازوئیں معیار عدالت ہی کی ایک تعبیر ہیں۔[1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٨﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٠﴾

”اور ضرور بالضرور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو عطا کیا حق اور باطل سے اختیار کا سامان روشنی اور نصیحت بنا کر پرہیز گاری کے لئے جو اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے خوف زدہ اور یہ ایک برکت والا نصیحت نامہ ہے جسے ہم نے اتارا ہے تو کیا تم اس کا انکار کیے جاؤ گے“؟

”یہ یعنی قرآن[2] ”برکت والا“ بایں معنی کہ وہ منسوخ ہونے والا نہیں لہٰذا اس کے فیوض و برکات لازوال ہیں۔[3]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٤﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿٥٥﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾

”اور ہم نے ابراہیم کو راہ راست پر چلنے کی سمجھ عطا کی پہلے ہی سے اور ہم ان پر مطلع تھے، جب انہوں نے اپنے باپ، اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی عبادت میں تم لگے ہوئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔ کہا تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ انہوں نے کہا تم ہماری طرف واقعی کوئی سچا پیغام لائے ہو یا تفریح کر رہے ہو؟ کہا نہیں بلکہ واقعی تمہارا پروردگار وہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے اُنہیں پیدا کیا ہے اور اس کی گواہی دینے والوں میں

[1] قال قتادة نضع العدل فی المجازاة بالحقّ (تبیان)

[2] ثم اخبر عن القراٰن فقال "ھٰذا ذکر مبارك" ای القراٰن (تبیان)

[3] ارادبه القراٰن لانّه ثابت نافع دائم نفعه الیٰ یوم القیٰمة (مجمع البیان)

سے ہوں اور بخدا میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک کاروائی کروں گا جب کہ تم پیٹھ پھرا کر گئے ہوئے ہوگے''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور اس کے پہلے اور بعد قوم سے گفتگو:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یہ علاج ہونا انہوں نے چپکے سے کہا، پھر جب وہ شہر سے باہر گئے میلے میں، تب تنہائی میں جا کر سب کو توڑا''، (موضح القرآن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری جملہ: تاللہ لاکیدنّ اصنامکم جس کا ترجمہ ہم نے کیا کہ ''بخدا میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک کاروائی کروں گا''۔ یہ سابق سلسلہ گفتگو میں انہوں نے زور سے نہیں بلکہ چپکے سے یا دل ہی میں کہا تھا جسے وہ سُن یا سمجھ نہیں سکتے تھے، یہ صورت واقعہ بالکل قرین قیاس ہے جسے متعلق علامہ طبرسیؒ نے قدیم مفسرین کا بھی قول نقل کیا ہے۔[1]

فَجَعَلَهُمۡ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيۡرًا لَّهُمۡ لَعَلَّهُمۡ اِلَيۡهِ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوۡا مَنۡ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوۡا سَمِعۡنَا فَتًى يَّذۡكُرُهُمۡ يُقَالُ لَهٗۤ اِبۡرٰهِيۡمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوۡا فَاۡتُوۡا بِهٖ عَلٰٓى اَعۡيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡهَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾

''تو انہوں نے اُن بتوں کو چورا کر دیا سوا اُن میں کے ایک بڑے کے، شاید وہ اُن کی طرف رجوع کریں۔ اُن لوگوں نے کہا کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟ وہ بلا شبہ ظالموں سے ہے، لوگوں نے کہا کہ ایک جوان کو ہم نے سنا ہے کہ وہ اُن کی نسبت بات کیا کرتا ہے جس کا نام ابراہیمؑ ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ اچھا اُسے لوگوں کی نظروں کے سامنے لاؤ، شاید کہ وہ گواہی دیں''۔

ایک خیال ہے یہ ہے اور وہ ترتیب کلام میں قرب لفظی کی وجہ سے ذہن میں آتا ہے کہ الیہ یرجعون کے معنی یہ ہوں کہ وہ اس بڑے بت کی طرف رجوع کریں یعنی وہ اپنی حماقت سے یہ دیکھ کر کہ وہ ''چشم دید گواہ'' کے طور پر کھڑا ہے، اُس سے مجرم کا پتہ لگانے میں رجوع کریں اور وہ بول سکتا نہیں تو انہیں شرمندگی ہوگی اور اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہیں قائل کرنے کا موقع ملے گا کہ جو بول تک نہیں سکتے، خدا کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ مگر میرے خیال میں وہ احمق سہی، پھر اتنے احمق نہیں تھے کہ یہ نہ جانتے کہ وہ بت بول نہیں سکتے۔ اس لئے قرینہ عقلی کی بنا پر میری نظر میں اس کو قوّت ہے کہ یہ ضمیر خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہے کہ وہ ان کی طرف رجوع کریں تو پھر یہ کہیں کہ اس بڑے بت سے پوچھ لو اور وہ ان کے جواب میں کہیں کہ یہ بول نہیں سکتے تو یہ نفئِ الوھیّت پر اُس سے استدلال کریں جیسا کہ بعد میں ہوا۔[2]

قَالُوۡۤا ءَاَنۡتَ فَعَلۡتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلۡ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيۡرُهُمۡ هٰذَا

---

[1] قیل انّما قال ذٰلك فی سرّ من قومه......عن قتادۃ و مجاهد (مجمع البیان)

[2] لعلّهم یرجعون الی ابراهیم فیسألونه عن حال الاصنام فینبئهم علیٰ جهلهم (مجمع البیان)

فَسۡـَٔلُوۡهُمۡ اِنۡ كَانُوۡا يَنۡطِقُوۡنَ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوۡۤا اِلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّكُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوۡا عَلٰى رُءُوۡسِهِمۡ‌ۚ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا هٰٓؤُلَاۤءِ يَنۡطِقُوۡنَ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴿۶۷﴾

''اُن لوگوں نے کہا کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ اے ابراہیمؑ! کہا بلکہ یہ اُن کے اس بڑے بُت نے کیا ہے تو اُن سے خود پوچھ لو اگر وہ بات کرتے ہوں۔ یہ سُن کر انہوں نے اپنے دل میں غور کیا۔ کہا یقیناً تم خود ہی حد سے آگے بڑھے ہو۔ انہوں نے سر جھکا کر کہا تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسے کی پوجا کرتے ہو جو نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچائے اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ افسوس ہے تم پر اور اُس پر جس کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لوگے''؟

بُت شکنی کے کام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ''ان میں کے بڑے نے کیا ہے'' اسے اہل سنت کی بعض احادیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان کا (معاذ اللہ) ایک جھوٹ قرار دیا گیا ہے مگر قطع نظر کرتے ہوئے اُس دلیل عقلی قطعی سے جو عصمت انبیاء پر قائم ہے، آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی حدیث بھی بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلام قطعاً جھوٹ نہیں تھا، اس لئے کہ اُنہوں نے اس بات کو شرط کے ساتھ مشروط کر دیا تھا کہ اگر یہ بات کرتے ہوں۔ جب یہ بات مسلم ہوگئی کہ وہ بات نہیں کر سکتے یعنی کوئی کام نہیں کر سکتے تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ کام بھی ان کا کیا ہوا نہیں ہوسکتا۔[ا] مگر اس سے پرستش کرنے والوں کی آنکھوں کو کھل جانا چاہیے کہ جب یہ کسی گفتار و کردار پر قادر نہیں ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ ''انہیں خدا سمجھنا درست نہیں ہے۔

اس کے لئے علمی و فنّی زبان میں میری نظر میں یہ پہلو ہے کہ صدق و کذب کا سوال خبر میں ہوتا ہے جس سے مقصود حکایت واقع ہو لیکن مقام مناظرہ میں مخالف سے کوئی بات منوانے کے لئے جو بات کہی جائے اُس سے مقصود حکایت واقع ہوتی ہی نہیں لہٰذا وہ ایک قسم انشاء ہے اور حقیقت یہ ہے کہ علمائے نحو وغیرہ نے جو اقسام انشاء درج کیے ہیں، وہ کسی حصر عقلی پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ استقراری طور پر انہوں نے چند اقسام کا ذکر کیا ہے جن کے علاوہ بہت سے اقسام ہو سکتے ہیں اور ہیں۔

''اپنے دل میں غور کیا'' اس کو ہم اپنے محاورہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''انہوں نے اپنے گریبان میں منہ ڈالا'' اور پھر جو ''کہا'' ہے اُس کے معنی ہم زبان سے کہنے کے نہیں سمجھتے بلکہ دل میں کہنے کے سمجھتے ہیں ور سر جھکا کر پھر جو ''کہا'' ہے وہ زبان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہا ''تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کرتے ہیں''۔

[ا] قال الصّادق علیہ السلام: واللہ مافعلہ کبیرھم وما کذب ابراھیم علیہ السلام فقیل و کیف ذٰلک قال انّما قال فعلہ کبیرھم ھو ان نطق وانّہ لم ینطق فلم یفعل (علی بن ابراھیم)

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾

''انہوں نے کہا کہ اسے آگ میں جلا دو اور اگر تمہیں کرنا ہے تو اپنے خداؤں کی مدد کرو ہم نے کہا اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر سلامتی رہے اور اُنہوں نے ان کے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہم نے انہی کو گھاٹا اٹھانے والا کر دیا اور اُنہیں اور لوط کو ہم نے چھٹکارا دے کر پہنچایا اُس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکت عطا کی ہے تمام لوگوں کے لیے''۔

خلیل خدا کا آگ میں پھینکا جانا اور آگ کا سرد ہو جانا:

یعنی شام کے ملک میں پہنچا دیا جہاں اللہ نے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کی ہیں۔ [1]

عام طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کا ذمہ دار نمرود کو قرار دیا جاتا ہے مگر قرآن مجید نے نمرود کا تذکرہ، وہ بھی نام کے ساتھ نہیں، ایک دعویدار الوہیت بادشاہ کے وصف کے ساتھ، بس ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایک بحث اور مکالمہ کی شکل میں کیا ہے لیکن اس آگ میں جلانے کا فیصلہ کر دیا، یوں کہنا چاہیے کہ وہ نام نہاد جمہور کا ایک پنچایتی فیصلہ تھا جو داعیٔ حق کے خلاف کیا گیا تھا۔

''ہم نے کہا: اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر سلامتی رہے''۔ یہ کہنا الفاظ کا زبان پر جاری کرنا نہیں بلکہ ارادہ تکونیہ کی ایک لفظی تعبیر ہے جسے دوسری جنہوں پر قول ''کُن'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ ''ارادۂ الٰہی سے بلاتوقف وتاخیر'' ایسا ہو گیا۔ [2]

''سلامتی رہے ابراہیم علیہ السلام کے لیے'' یعنی برودت نقطۂ اعتدال پر ہو جو اپنی شدّت سے ابراہیم علیہ السلام کے لئے ضرررساں نہ ہو۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾

''اور ہم نے انہیں اسحاق جیسی اولاد عطا کی اور مزید برآں یعقوب۔ اور ان سب کو نیکوکار بنایا''۔

''مزید براں'' بایں معنی کہ دعا ان کی سارہ کے بطن سے فقط اپنے بیٹے کے لئے تھی مگر خالق نے اس کی قبولیت میں ان کی آیندہ نسل کے سامانِ بقاء کا اضافہ کر دیا کہ اسحاق علیہ السلام ہی پر اُن کی ذریّت ختم نہ ہو بلکہ پھر اسحاق علیہ السلام کے یہاں یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے اور سلسلہ نسل کا آگے بڑھا۔ [3]

جناب ابن عباس وغیرہ نے بھی اس کا یہی مفہوم قرار دیا ہے۔ [4]

---

[1] بکثرۃ الانہار والاشجار وھی الشام (جلالین)

[2] لم یکن یکن ھناك امر علی الحقیقۃ والمعنی انّہ فعل ذٰلك کما قال: کونوا قردۃً خاسئین ای صیرھم کذٰلك من غیر ان امرھم بذٰلك (تبیان) المراد انّا جعلنا النّار بردا علیہ وسلامۃ لا یصیبہ من اذاھا شئ (مجمع البیان)

[3] نافلۃ ای زیادۃ علیٰ مادعا اللہ الیہ (تبیان) ق

[4] قال ابن عباس وقتادۃ نافلۃ راجع الیٰ یعقوب فانّہ زادہ من غیر دعاء فھو نافلۃ (مجمع البیان)

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾

''اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے ہیں اور ان کی جانب وحی بھیجی نیک کاموں کے کرنے اور نماز ادا کرنے اور کوٰۃ دینے کی اور وہ صرف ہماری عبادت کرتے تھے''۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿٧٤﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾

''اور لوط علیہ السلام کو ہم نے حکمت اور علم عطا اور اُنہیں چھٹکارا دیا اُس بستی سے جو گندے کام کرتی تھی، بلاشبہ وہ بڑے بڑے، بدکار لوگ تھے اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا۔ بلاشبہ وہ نیکوکاروں میں سے تھے''۔

جناب لوط علیہ السلام کو کیوں کر چھٹکارا اور اُس پر قوم پر عذاب کس نازل ہوا؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ہے۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٧٧﴾

''اور نوح کو جب پکارا انہوں نے اس سے پہلے تو ہم نے اُن کی دعا پر لبّیک کہتے ہوئے اُنہیں اور اُن کے ماننے والوں کو بڑے کرب واذیّت سے چھٹکارا دیا اور ان کو فتح عنایت کی اُس قوم پر جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ بلاشبہ وہ بہت برے لوگ تھے تو ان سب کو ہم نے ڈبو دیا''۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿٨٠﴾

''اور داوٗد اور سلیمان جب کہ وہ دونوں فیصلہ کر رہے تھے کھیت کے بارے میں، جب لوگوں کی بھیڑیں اُس پر راتی راتا گئیں اور ہم اُن کے فیصلہ کے دیکھنے والے تھے تو ہم نے اُسے سلیمان کو سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا اور داوٗد کے ساتھ پہاڑوں سے ہم نے تسبیح پڑھوائی اور طائروں سے اور ہم اس کو کرنے والے

تھے اور ہم نے اُنہیں لکھائی کاریگری لباس کی تمہارے لئے جو تمہیں تمہاری جنگ کے صدموں سے بچائے تو کیا تم شکر گزار ہو گے''؟

زراعت سے متعلق جناب داؤد و سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ:

قرآن کو صرف قرآن سمجھنے کا ادّعاء کرنے والے کیا اس واقعہ کی گم شدہ کڑیوں کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام نے کیا فیصلہ کیا اور سلیمان علیہ السلام کا کیا فیصلہ تھا جسے کہا گیا ہے کہ ہم نے انہیں سکھایا اور کیا بغیر یہ معلوم ہوئے انہیں کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی ساخت ایسی رکھی گئی ہے کہ دنیا معلمین قرآن سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، چنانچہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُس زراعت کے عوض میں وہ بھیڑیں کے مالک زراعت کو دوبارہ درست کرنے کے ذمہ دار ہوں اور جب تک وہ زراعت اپنی اصلی حالت پر آئے، اس زراعت کے مالک کو یہ حق ہو کہ وہ اُن بھیڑوں کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جب وہ زراعت اصلی حالت پر آ جائے تو وہ بھیڑوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دے یہی فیصلہ تھا جسے خالق کریم نے صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

یہ بعض تفاسیر میں روایت ہے مگر اس سے ذہن میں ایک خلش یہ پیدا ہوتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی خدا نے فیصلہ غلط کس طرح کیا؟ جب کہ قرآن میں یہیں پر بعد میں جناب داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کے لئے آیا ہے: **وکلّا اٰتینا حکماً و علماً** (ان میں سے) ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا''۔ مگر تفسیر علی ابن ابراہیم قمیؒ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو حدیث ہے، اس میں ہے کہ سب لوگ فیصلہ کے لئے جناب داؤد علیہ السلام کے پاس آئے تو آپ نے خود فیصلہ کرنے کے بجائے، فریقین کو سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیج دیا اور انہوں نے وہ فیصلہ کیا اور اسی کو حضرت داؤد علیہ السلام نے نافذ کر دیا۔ اس سے مقصود اس کا اظہار تھا کہ جناب داؤد علیہ السلام کے بعد اُن کے صحیح جانشین جناب سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اس طرح باپ بیٹے میں کوئی اختلاف لازم نہیں آتا۔

اس کی نظیر ہمارے یہاں بعض روایات میں ہے کہ کبھی جناب امیر علیہ السلام سے کسی نے بخیال خود کوئی بڑا مشکل سوال کیا تو حضرت نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ تم اس کا جواب دو۔ جناب داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے اس واقعہ کی نوعیت یہی تھی۔

جناب داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی:

جناب داؤد علیہ السلام کے زرہ بنانے کا ذکر جس انداز میں ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں اس وقت تک زرہ ایجاد ہی نہیں ہوئی تھی اور دشمنوں کی تلواروں سے بچنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سب سے پہلے قدرت کی طرف سے جناب داؤد علیہ السلام کو اس صنعت کا علم دیا گیا جس کے بعد نیاز رہیں بنانے لگی۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿٨١﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٨٢﴾

”اور سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں ہم نے تیز وتند ہوا کو کیا کہ وہ ان کے حکم سے چلتی تھی اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکت قرار دی تھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے اور جنّات میں کچھ وہ تھے جو اُن کے لئے (دریاؤں میں) غوطہ زنی کرتے تھے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے اور ہم اُن کے نگہبان تھے“۔

جناب سلیمان علیہ السلام کا دوش ہوا پر پرواز کرنا:

معجزاتِ انبیاء کو خلافِ فطرت سے کہہ کر ان کا انکار کرنے والے تو معلوم نہیں ان آیات کے کیا کیا معنی کہتے ہوں گے مگر ان آیات قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی قدرت تھے جو جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے وقوع میں آئے تھے۔ ”ہوا اُن کے قبضہ میں دی گئی تھی اور اُن کے حکم سے چلتی تھی، اس کی تفصیل بھی دوسری جگہ قرآن میں موجود ہے کہ وہ صبح کو ایک مہینے کی راہ تک تخت سلیمان کو لے کر جاتی تھی اور شام کو ایک مہینے کی راہ تک، اور جنّات اُن کے قبضہ میں دیے گئے تھے، اس کے بھی مزید تفصیلات دوسری جگہ موجود ہیں، اس لئے قرآن پر ایمان رکھنے کے ساتھ ان واقعات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٨٣﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿٨٤﴾

”اور ایوب علیہ السلام کو جب انہوں نے اپنے پروردگار کو صدا دی کہ مجھے بڑی اذیت ہوگئی ہے اور تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا تو ہے، تو ہم اُن کی دعا قبول کی اور جو اذیت انہیں تھی، اُسے دور کیا اور انہیں اُن کی جو اولاد تھی، وہ عطا کی اور اُن کے ساتھ اتنے ہی اور، مہربانی کی بنا پر اپنی جانب سے اور انتباہ کے طور پر عبادت گزاروں کے لیے“۔

جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور ان کا صبر:

جناب ایوب علیہ السلام کی دعا ایک انتہائی لطیف پیرایہ کہ حامل ہے کہ بندہ بس اپنی تکلیف بیان کرتا ہے اور خالق کے عمومی لطف و کرم کا اظہار کرتا ہے اس کے علاوہ لفظوں میں اظہار مطلب کچھ بھی نہیں کرتا[1] جسے میر انیس اعلی اللہ مقامہ نے یوں ادا کیا ہے:

کریم! جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے
فقیر ہوں، پر نہیں عادت سوال مجھے

یہی انداز دوسری جگہ قرآن میں جناب موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ہے کہ: رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ. (قصص۔ ۲۴) چونکہ تیرا فیض و کرم میرے شامل حال رہا ہے بہر حال میں اس وقت ضرورت مند ہوں۔

[1] ھو من لطیف الکنایات فی طلب الحاجة (مجمع البیان)

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور اسماعیل علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام اور ذوالکفل علیہ السلام کو۔ یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے اور اُنہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، بلاشبہ وہ نیکوکاروں میں تھے''۔

ذوالکفل کے متعلق شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ایوب علیہ السلام کے بیٹے تھے، ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے'' (موضح القرآن)

ذوالکفل کی وجہ تسمیہ میں جلالین نے لکھا ہے:

سمّی ذاالکفل لانّه تکفل بصیام جمیع نهاره و قیام جمیع لیله وان یقصی بین النّاس وما یغضب فوفّی بذٰلك وقیل لهم یکن نبیّا۔

ان کا نام ذوالکفل اس لئے ہوا کہ وہ کفیل یعنی ذمہّ دار ہوئے کہ تمام دنوں کو روزہ رکھیں گے اور راتیں نماز میں گزاریں گے اور یہ کہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں گے اور کبھی انہیں غصّہ نہیں آئے گا تو انہوں نے اسے پورا کیا اور کہا گیا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔

مگر جناب شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:

معنی وصفه بالکفل انّه ذوالضّعف ای ضعف ثواب غیر ممّن فی زمانه لشرف عمله۔

اُن کے لقب میں کفل کی لفظ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونا پانے والے ہیں یعنی اپنے زمانہ کے تمام لوگوں کے ثواب کا دونا اپنے عمل کی بلندی کی وجہ سے۔

کفل کا یہ مفہوم قرار دینے میں شاید قرآن مجید کی یہ آیت سامنے ہے کہ:

يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ۔ (حدید ۲۸)۔

وہ اُسے اپنی رحمت کے دو نے حصّے عطا کرے گا۔

مگر دونے کے معنی تو یہاں کفلین کے تثنیہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کفل کے معنی تو دونے کے نہ ہوئے علامہ طبرسیؒ نے ان کی شخصیّت کے بارے میں اور زیادہ اقوال نقل کر دیئے ہیں جن میں سے معصوم علیہ السلام کی طرف کسی کی نسبت نہیں ہے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

''اور مچھلی والے کو جب وہ غصّہ میں بھرے ہوئے گئے تو وہ سمجھے کہ ہم اُن پر سختی نہ کریں گے تو اُن تاریکیوں میں

اُنہوں نے آواز دی کہ کوئی خدا نہیں سوا تیرے۔ پاک ہے تیری ذات بلاشبہ میں ظالموں میں سے تھا تو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور انہیں اُس رنج وغم سے چھٹکارا دیا اور اس طرح ایمان والوں کو ہم چھٹکارا دیتے ہیں"۔

حضرت یونس علیہ السلام کی شکم ماہی کے اندر تسبیح:

"مچھلی والے" سے مراد جناب یونس علیہ السلام ہیں [1] جن کو مچھلی نے نگلا تھا جس کا ذکر خود قرآن مجید میں دوسری جگہ موجود ہے۔ غصّہ میں بھرے ہوئے گئے تو کیا ہوا جس کے بعد انہوں نے یہ دعا کی؟ یہ درمیان کی کڑی یہاں صراحۃً درج نہیں ہے، صرف یونس علیہ السلام کو ذوالنّون "مچھلی والے" کہنے سے اس کی طرف اشارہ ہوگیا اور یہ وہ ہے کہ مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ اس سے وہ تاریکیاں پیدا ہوئیں جن میں گھبرا کر انہوں نے دعا کی۔ ایک تو رات، اور پھر دریا کی موجیں اور پھر شکم ماہی۔ [2]

وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾

"اور زکریّا کو جب اُنہوں نے صدا دی اپنے پروردگار کو پروردگارا! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو بہترین ورثہ دار ہے تو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور انہیں یحییٰ ایسا فرزند عطا کیا اور ان کی بیوی کو ان کی خاطر ٹھیک کر دیا، یہ لوگ نیکیوں کی طرف لپکتے تھے اور ہمیں امید وبیم دونوں حالتوں میں پکارتے تھے اور وہ ہمارے لئے جھکنے والے تھے"۔

جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت:

"اکیلا نہ چھوڑنا، یعنی بے اولاد [3] "اُن کی بیوی کو ٹھیک کر دیا، اس کی تفصیل قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے ملتی ہے کہ وہ بانجھ تھیں۔ خالق نے اس نقص کو دور کر دیا اور اُن میں اولاد پیدا ہونے کی صلاحیّت ہوگئی اور پھر عمر بھی اُن کی زیادہ ہوچکی تھی، اس لئے اصلحنا کے معنی بعض لوگوں نے یہ لئے ہیں کہ اُن کا دورِ شباب واپس آ گیا اور بعض نے نہ معلوم کیوں اس درستی کو اخلاق کی درستی قرار دیا ہے۔ [4]

وَالَّتِىْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾

---

[1] هو يونس (علی ابن ابراهيم) النون الحوت وصاحبها يونس بن متی (تبيان)

[2] ظلمة اللّيل و ظلمة البحر وظلمة بطن الحوت (جلالين) اظهر فی اقوال المفسّرين (تبيان)

[3] ای وحيدا بلا ارزقنی ولدا (تبيان)

[4] بان كانت عقيمة فجزّلنا ها ولودا عن قتادة وقيل كانت حرمة فرددنا عليها شبابها عن ابی مسلم وقيل كانت سيّئة الخلق فجعلناها حسنة الخلق (مجمع البيان)

''اوراس خاتون کوجس نے اپنے مرد کے تصرف سے بچایا تو ہم نے اُس میں اپنی روح کا ایک حصّہ پھونک دیا اور اُسے اور اُس کے بیٹے کوتمام جہانوں کے لئے قدرت کی ایک نشانی قرار دیا''۔

''اپنی روح'' میں اضافت ویسی ہی ہے جیسی خلقت آدم علیہ السلام کے اعلان کے وقت ملائکہ سے کہا گیا تھا: فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ''جب میں اس کو تیار کرلوں اوراس میں اپنی روح کا ایک حصّہ پھونک دوں'' (حجر۔۲۹) اس نسبت میں شرف وفضلیت کے اظہار کا پہلوضرور ہے اورجیسی ''من روحی'' میں اضافت آدم علیہ السلام کے لئے ہے، وہی من روحنا کی لفظ میں اضافت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے یہاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام چونکہ سلسلۂ ظہور انبیاء میں مرکز انتخاب الٰہی ہونے میں نمبرا تھے لہٰذا انہیں صفت انتخاب کے پہلے پہل ظہور میں آنے سے لقب صفی اللہ ملا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب آخر میں اس ''روحنا'' کے لفظ کی بنا پر روح اللہ ہوگیا مگر لفظ کے اختصاص کی وجہ سے صفت کا اشتراک ختم نہیں ہوتا جیسے معنی کے لحاظ سے صفی خدا ہر نبی ہے، ویسے ہر رسول کی روح اس مرتبہ فضلیت کی ہے کہ وہ ''روح اللہ'' قرار پاسکتا تھا۔ جب کہ من روحی اور من روحنا کی اضافت جناب آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان مشترک ہے اور دونوں میں من موجود ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ روح اس معیار کے تمام بندگان الٰہی میں پائی جاتی ہے تو اس سے عیسائیوں کا الوہیت عیسیٰ علیہ السلام پر استدلال بلاوجہ ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾

''بے شک یہ تمہاری ملّت ہے، ایک ملّت۔ اور میں تمہارا پروردگار ہوں، تو میری عبادت کرو اوراُن سب نے اپنے معاملات کوجدا جدا کر رکھا ہے (بہرحال) سب ہماری ہی طرف پلٹنے والے ہیں''۔

''امت''، جس کا ترجمہ ہم نے ''ملت'' کے ساتھ کیا ہے، اس کے معنی بعض مفسرین نے دین کے لئے ہیں۔[1]

اس طرح اس کا مطلب یہ ہوتا کہ صحیح دین خلق خدا کا ایک ہے اور افتراق واختلاف بعد والوں ذہنی جدّت طرازیوں سے پیدا ہوا ہے جنہیں اصطلاح قرآنی میں اھواء کہا جاتا ہے اور معیار حق نہیں ہوسکتے، (ولو اتبع الحقّ اھوآء ھم لفسدت السّمٰوٰت الارض) (مومنون۔۷۱)

علامہ طبرسیؒ نے قدیم مفسرین کے حوالہ سے اُس کی یہ تفسیر پیش کرتے ہوئے اس کی تشریح بہت خوب فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

انّ ھٰذا دینکم دین واحد عن ابن عباس ومجاھد والحسن واصل الامّۃ الجماعۃ الّتی علیٰ مقصد واحد فجعلت الشریعۃ امۃ واحدۃ لاجتماعھم بھا علیٰ مقصد واحد (مجمع البیان)

یعنی تمہارا دین ایک اکیلا دین ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس، مجاہد اور حسن سے منقول ہے اور اصل میں امّت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کا ہدف نگاہ ایک ہو تو قانون الٰہی ایک امّت اس معنی میں ہے کہ اُس سے پوری جماعت ایک ہدف نگاہ پر متفق ہوجاتی ہے۔

---

[1] ھٰذہ ای ملّۃ الاسلام امّتکم (جلالین)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

''تو جو شخص نیک کام کرے درآں حالیکہ وہ صاحب ایمان ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی اور ہم اس کے لکھ لینے والے ہیں''۔

یہاں بھی مثل دوسرے مقامات کے حسن عمل کے صلہ کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، اس کے بعد یہ تصور کہ:

''ہوگی نجات اس کی عمل جس کے نیک ہوں کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو'' غلط ہے۔[1]

''ہم اس کے لکھنے والے ہیں'' یعنی بعد میں وہ خود چاہے بھول جائے لیکن ہمارے یہاں اُس کا نیک عمل بہرحال محفوظ ہے اور اُس کا صلہ ملنا ضروری ہے۔

''ہم'' کہہ کر اپنی طرف نسبت لکھنے کی ویسی ہی ہے، جیسے قبض روح کی نسبت اپنی طرف دی ہے جب کہ یہ دوسری جگہ صاف اُسے فعل ملائکہ اور خاص طور پر ملک الموت کا کام قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ کاتبان اعمال کا ذکر ہے جو فرشتے ہیں مگر چونکہ اُن کا لکھنا بحکم الٰہی ہے، اس لئے اُس کی نسبت خالق نے اپنی جانب دی ہے۔[2]

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾

''اور جس بستی کو ہم نے تہس نہس کر دیا اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ پھر واپس نہ آئے یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیے گئے اور وہ ہر بلندی سے امنڈ پڑیں گے اور سچّا وعدہ قریب آ جائے گا تو ایک دم کافروں کی نگاہیں پتھرا جائیں گی: وائے برحال ما! ہم اس سے بے خبری میں رہے بلکہ ہم بڑے ظلم کے مرتکب تھے''۔

یاجوج اور ماجوج کا ذکر:

حرام کے معنی سب ہی جانتے ہیں کہ وہ حلال کے مقابل ہے یعنی جو جائز نہ ہو۔ اب یہ کس بات کو کہا جا رہا ہے کہ حرام ہے؟ انّھم لا یرجعون ''کہ واپس نہ ہوں'' یعنی واپس نہ ہونا حرام ہے تو واپس آنا لازم ہے۔

ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ یہ آیت ''رجعت'' کے وقوع کا پتہ دیتی ہے[3] مگر جو رجعت کے قائل نہیں، وہ کیا کریں؟ تو کوئی صاحب

---

[1] انّما شرط الایمان لانّ ھذہ الاشیآء لو فعلھا الا کافر لم ینتفع بھا (تبیان)

[2] ای نامر ملائکۃ ان یکتبو اذلك (مجمع البیان)

[3] لا زائدۃ---ای ممتنع رجوعھم الی الدّنیا (جلالین) محال است---آں کہ باز گردند یعنی بدنیا (شاہ ولی اللہ)

"لا" کو غائب کرتے ہیں یعنی "لا یرجعون" کا ترجمہ کرتے ہیں' وہ جو رجعت کا ہونا چاہیے کہ "اس دنیا میں ناممکن ہے کہ وہ واپس آئیں"[1] اور کوئی صاحب حرام کے معنی واجب کے قرار دیتے ہیں یعنی لازم ہے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔

ترجموں میں یہ زمین آسمان کا فرق خود ظاہر کرتا ہے کہ نقطۂ حقیقت ان کی نظر سے دور ہے اور اصل دروازوں سے ہٹ کر آدمی کو قرآن فہمی میں یہ ٹھوکریں کھانا ہی چاہئیں مگر تعجب علاّمہ طبرسیؒ سے ہے کہ انہوں نے وہی اقوال جو اکثریت کے یہاں ہیں، قدیم مفسرین کے حوالہ سے درج کر دینے پر اکتفا فرمائی ہے۔ جن میں سے کوئی الفاظ آیت پر منطبق نہیں ہے اور خود اپنے یہاں جو تفسیر موجود ہے اور وہ بالکل الفاظ قرآنی کے مطابق ہے' اسے انہوں نے بطور نقلِ قول بھی درج نہیں کیا ہے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۹۸

"بلاشبہ تم اور وہ چیزیں جن کی تم عبادت کرتے ہو، اللہ کو چھوڑ کر، دوزخ کا ایندھن ہیں تمہیں وہاں پہنچنا ہے"۔

"جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو" اس سے مراد بت ہیں کہ جو بے جان چیزیں ہیں، انہیں دوزخ میں ڈالنا، ان کو سزا دینا نہیں ہے بلکہ ان کے عبادت گزاروں کو تکلیف پہنچانا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے و قو دھا الناس الحجارۃ اس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر"۔

لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۹۹ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۱۰۰

"اگر خدا ہوتے تو وہ اس (دوزخ) میں نہ جاتے اور سب ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی اس میں چیخ پکار ہوگی اور وہ اس میں سنیں گے نہیں"۔

"وہ اس (دوزخ) میں نہ جاتے" اس میں دو احتمال ہیں جو دونوں بحسب واقعہ درست ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ جو ان کے معبود ہیں، وہ بھی دوزخ میں پھونک دیے جائیں گے تو "وہ" کی ضمیر انہی (معبودوں) کی طرف راجع ہے کہ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو جہنم میں کیوں کہ جھونکے جا سکتے تھے؟[2] دوسرے یہ کہ خود کافروں کی طرف ضمیر راجع ہو کہ اگر وہ اصنام خدا ہوتے تو ان کی عبادت کرنے والوں کا یہ انجام کیوں ہوتا کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں۔

"سنیں گے نہیں" اس محاورہ کے معنی میں ہے کہ انکی چیخ و پکار سے کان پڑے آواز سنائی نہ دیتی ہوگی[3] اور بعض نے کہا کہ آگ کے شعلوں کے زور و شور سے انہیں کچھ سنائی نہ دیتا ہوگا[4] ان کے علاوہ مزید دو معنی بیان کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ وہ سنیں گے نہیں یعنی کوئی ایسی چیز جو

---

[1] لازم ہے اوپر اُس بستی کے کہ وہ نہیں پھرتے (شاہ رفیع الدین)

[2] یحتمل ان یکون ارادما وردت الاصنام جھنم (تبیان)

[3] یعنی اپنے چلانے کے شور سے (موضح القرآن)

[4] لا یسمعون شیا لشدۃ غلیا نہا (جلالین)

دل خوش کن اور کارآمد ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ آگ کے صندوقوں میں بند ہوں گے کہ ان تک کوئی اِدھر اُدھر کی آواز جاتی ہی نہ ہوگی۔ [۱]

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ ۙ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۖ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿١٠٣﴾

''بلاشبہ وہ جن کیلئے ہماری طرف سے بھلائی پہلے مقرر ہو چکی ہے، یہ اس سے دور رہیں گے، وہ اس کی آواز نہیں سنیں گے اور وہ اس میں کہ جسے انکا جی چاہتا ہے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، انہیں وہ سب سے بڑی گھبراہٹ کوئی رنج نہ پہنچائے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے۔ یہ تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا''۔

چونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا: اور کوئی تم میں ایسا نہیں جس کا گزر دوزخ پر نہ ہو۔ (مریم۔۷۱)

اس لئے یہاں دور رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اِدھر سے گزر کر جب آگے بڑھ جائیں گے تو پھر ہمیشہ کے لئے اہلِ جنت اس دوزخ سے دور رہیں گے [۲]۔ مگر ہماری قدیم تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت اس آیت کے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقبول بارگاہِ الٰہی طبقہ ایسا ہے جو اِدھر سے گزرے گا بھی نہیں۔ [۳]

اس تفسیر میں الفاظ اگرچہ ایسے ہیں کہ یہ آیت اس آیت کو منسوخ کر دیتی ہے مگر چوں کہ نسخ احکام شرعیہ میں ہوتا ہے۔ احوال واہوال قیامت کے متعلق جو خبریں ہیں ان میں نسخ کا لفظ ایک تعبیر ہو سکتی ہے اسی امر کی یہ افراد اس حکم سے خارج ہیں اور اس کا سمجھنا یوں زیادہ آسان ہے کہ اس آیت (إِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا) میں جو کچھ عموم ہے، وہ کُم کے مخاطب میں ہے کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو دوزخ کی طرف نہ جائے۔ لیکن یہ آیت بتلاتی ہے کہ ایک طبقہ جس کی طرف رحمت الٰہی نے سبقت کی ہے اور وہ وہی ہو سکتے ہیں جو خود السّابقون والسّابقون اور السّابقون الی الخیرات کے مصداق ہیں، وہ اس ''کُمْ''، یعنی ''تم'' کی مخاطب جماعت سے ازاوّل خارج ہیں لہٰذا اس آیت کے مضمون کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب ترتیب قرآن چونکہ مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آیات گزشتہ سلسلۂ کلام سے مربوط ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ آیات اُس سے الگ ہوں اور ''جن کے لئے بھلائی لکھی جا چکی ہے'' اس سے وہی خاص درجہ والے اہل ایمان مراد ہوں جو معصوم ہیں بغیر اس کے کہ اس کی نظر کسی سوال اور اس کے جواب پر ہو لیکن جب ان کا تعلق گزشتہ آیات سے مانا جائے تو یہ پریشان نزول قرین قیاس ہے کہ چونکہ گزشتہ آیات میں آیا تھا کہ جن جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی تھی، وہ سب ہی دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو اس سے یہ

---

[۱] ای لا یسمعون ما یسرّ ھم ولا ما ینفعون بہ---وقیل یجعلون فی توابیت من النار فلا یسمعون شیئا (مجمع البیان)

[۲] یعنی ایک بار گزر کر پھر ہمیشہ دور رہیں گے (موضح القرآن)

[۳] ناسخة لقوله: وان منکم الا واردھا (علی بن ابراھیم)

بلاشبہ پیدا کیا گیا کہ پھر جناب مسیح علیہ السلام اور جناب عزیز علیہ السلام وغیرہ بھی اس کے مستوجب ہیں کہ دوزخ میں ڈالے جائیں، تو اس تصوّر کے دفعیہ کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں۔[1]

پھر بھی جو مفہوم آیت ہے، وہ ان اشخاص سے مخصوص نہیں ہو جائے گا بلکہ جو اس پایہ کے یا ان سے برتر، جو ہر عصمت میں ان کے ساتھ مشترک افراد ہوں، سب ہی اس میں داخل ہوں گے۔

يَوۡمَ نَطۡوِى السَّمَآءَ كَطَـىِّ السِّجِلِّ لِلۡكُتُبِ‌ؕ كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ‌ؕ وَعۡدًا عَلَيۡنَا‌ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ‏ ﴿۱۰۴﴾

''جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح کاغذ خطوط کے لئے لپیٹا جاتا ہے، جس طرح ہم نے پہلے پہل مخلوق کو پیدا کیا تھا۔ اب اسے ہم پلٹائیں گے بھی۔ یہ وعدہ ہے ہمارے ذمہ یقیناً ہم ایسا کر کے رہیں گے''۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ سجل فرشتہ کا نام ہے اور کتب سے مراد نامہ ہائے عمل ہیں[2] اب ترجمہ یہ ہوگا کہ ''جیسے سجل نامہ ہائے عمل کو لپیٹتا ہے'' ہماری قدیم تفسیر بھی جو غالباً معصوم علیہ السلام سے وارد ہے، اس کے مطابق ہے۔[3]

جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ سجل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتب کا نام ہے اور یہ معنی ہیں کہ جیسے سجل خطوط کو لپیٹتے ہیں[4] لیکن وہ تفسیر جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ سجل وہ کاغذ ہے جو لفافہ کی طرح خطوط پر لپیٹا جاتا ہے، قدیم مفسرین میں سے زیادہ کی طرف نسبت رکھتی ہے۔[5]

وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِى الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّكۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوۡنَ‏ ﴿۱۰۵﴾

''اور بے شک ہم نے توریت کے بعد زبور میں بھی یہ لکھ دیا ہے کہ زمین کے ورثہ دار میرے نیک بندے ہوں گے''۔

انجام کار میں نیکوکاروں کا مکمل اقتدار:

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے جس کے رو سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کے معنی اس مقام پر توریت کے ہیں، اکثر مفسرین کے قول کے مطابق ہے

---

[1] نزل لمّا قال ابن الزّبعری عبد عزیز و المسیح و الملائکۃ فھم فی النّار علیٰ مقتضیٰ ما تقدم (جلالین)

[2] السجل اسم ملك للکتب صحیفة ابن اٰدم عند موته (جلالین)

[3] قال السجل اسم ملك الّذی یطوی الکتب (علی بن ابراھیم)

[4] فی روایة اخریٰ السجل کاتب کان لرسول الله ﷺ (تبیان)

[5] السجل صحیفة فیھا الکتب عن ابن عباس و مجاھد و قتادۃ والکلبی (مجمع البیان)

مگر علّامہ طبرسیؒ نے اس کے قبل دو قول اور نقل کیے ہیں: ایک یہ کہ زبور کے معنی تمام انبیاء کی کتابیں ہیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے، اسے بعض متداول تفاسیر اہل سنت میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔[1]

دوسرے یہ کہ ذکر توتوریت ہی ہے اور زبور سے مراد وہ سب کتابیں ہیں جو توریت کے بعد نازل ہوئیں پھر آخر میں ایک عجیب قول یہ نقل کیا ہے کہ ذکر سے مراد قرآن ہے اور بعد کے معنی قبل کے ہیں یعنی تمام کتابیں جو قرآن سے پہلے تھیں، ان میں سب میں یہ بات درج ہے لیکن یہ تمام اقوال خلاف ظاہر ہیں، ظاہری مفہوم وہی ہے جو پہلے لکھا گیا ہے۔

اب وہ بات کیا ہے جو ان سب کتابوں میں درج ہے؟

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: یعنی در آخر زمان پیغمبری مبعوث شود وامت او برزمین غالب شود (فتح الرحمٰن)

مطلب یہ ہے کہ آخری زمانہ میں ایک پیغمبر بھیجا جائے گا اور اس کی امّت تمام روئے زمین پر غلبہ حاصل کرلے گی۔

مگر ''ورثہ دار'' کا لفظ جس غلبہ کا پتہ دیتی ہے، وہ سب سے آخری مختتم غلبہ ہے جو پھر مغلوبیّت سے تبدیل نہ ہو اور شاہ صاحب کے پیش نظر جو غلبے ہیں، وہ سب مغلوبیت سے تبدیل نہ ہو اور شاہ صاحب کے پیش نظر جو غلبے ہیں، وہ سب مغلوبیت سے تبدیل ہو گئے لہٰذا انہیں ہمارے ساتھ مل کر اس ''وارث ارض'' کا انتظار کرنا چاہیے جس کا غلبہ مختتم حیثیت رکھتا ہو اور جس کے بعد کوئی دوسری جماعت روئے زمین پر غالب نہ آسکے۔ وہ مہدی آخرالزمان علیہ السلام کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا[2] امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث بھی نتیجتاً اس کے مطابق ہے۔[3]

بعض مفسرین اہل سنت نے شاید اس نتیجہ سے بچنے کے لئے ایک دوراز فہم تفسیر کردی ہے کہ ارض سے مراد سرزمین جنّت ہے اور صالحون سے مراد تمام نیکوکار لوگ ہیں۔[4]

اِنَّ فِیۡ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوۡمٍ عٰبِدِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ؕ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾

''بلا شبہ اس میں ایک پیغام ہے ان کے لئے جو عبودیت خالق کا احساس رکھتے ہوں اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر رحمت بنا کر تمام جہانوں کے لئے''۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحمۃ اللعالمین ہونا:

قرآن کے الفاظ صاف اس رحمت کی ہمہ گیری کو ظاہر کررہے ہیں اور اُس میں کسی قید کا پتہ نہیں چلتا بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کی آواز ہے جو خود ربّ العالمین ہے اور وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض کو اتنا ہی وسیع بتا رہا ہے۔

اب بعض مفسرین اُس کی وسعت کو اپنی کوتاہ کے حدود میں مقید کردیں[5] تو اس کی ذمہ داری نہ خالق پر ہے۔ نہ اُس پر جو

---

[1] الزبور بمعنی الکتاب ای کتب اللہ المنزلۃ من بعد الذّکر بمعنی ام الکتاب الّذی عنداللہ (جلالین)

[2] قال: القائم علیہ السلام اصحابہ (علی ابن ابراھیم)

[3] عن ابی جعفر علیہ السلام انّ ذٰلک وعد للمؤمنین بانّھم یرثون جمیع الارض (تبیان)

[4] الارض ارض الجنّۃ...... عام فی کلّ صالح (جلالین)

[5] العالمین الانس والجنّ امؤمنین بك (جلالین)

رحمۃ للعالمینؐ بن کر آیا تھا حالانکہ صدراوّں کے مفسرین میں جناب ابن عباسؓ نے اس کو بلاتفریق مذہب وملّت سب کے لئے ہمہ گیر بتایا تھا۔[1]

قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُكُمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ ؕ وَاِنۡ اَدۡرِىۡۤ اَقَرِيۡبٌ اَمۡ بَعِيۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾

''کہہ دیجئے کہ میرے پاس یہی وحی آتی رہی ہے کہ تم سب کا خدا بس ایک خدا ہے، تو کیا تم اس کی بارگاہ میں سر جھکاتے ہو؟ اس کے بعد اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے تم کو برابر سے باخبر کردیا اور مجھے نہیں معلوم کہ جلد یا بدیر (بہرحال) وقوع میں آئے گا وہ جس سے ڈرایا جاتا ہے''۔

''تم کو برابر سے باخبر کردیا ہے'' اس کی تشریح جناب شیخ الطائفہؒ نے بالکل درست فرمائی ہے:

تتساو دن فی العلم بہ لم اظہر بعضکم علیٰ شئ کتمتہ عن غیرہ

تم اس کے علم میں بالکل برابر ہو۔ میں نے یہ نہیں کیا ہے کہ کسی ایک کو کوئی ایسی بات بتائی ہو جسے دوسرے سے چھپایا ہے۔

مگر موصوف نے اس سے نتیجہ ایک عجب وغریب نکالا ہے:

ھو دلیل علیٰ بطلان قول اصحاب الرّموز وان للقرآن بواطن خصّ بالعلم بھا اقوام (تبیان)

یہ رموز واشارات والے لوگوں کے قول کے غلط ہونے کی دلیل ہے اور اس کی رد ہے کہ قرآن کے اندر کچھ اندرونی مطالب ہیں جن کا علم خاص اشخاص کو دیا گیا ہے۔

ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، یہ بات اور ہے کہ باطنی جماعت نے رموز واشارات کے دائرہ کو غیر معقول حد تک وسیع کیا ہے مگر بنیادی طور پر یہ خیال کہ علم قرآن میں سب برابر ہیں، درست نہیں ہے۔ نہ قرآن کی اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ یہاں تو مخاطب حقیقتاً منکرین توحید ہیں اور پیغام توحید کے متعلق کہا جارہا ہے کہ میں نے تم سب کو یہ پیغام یکساں طور پر پہنچایا ہے اور جس حد تک کہ اتمام حجّت کے لئے ضروری ہے، میری تبلیغ تم سب کے لئے برابر سے ہوئی ہے۔ نہ یہ کہ حقائق ومعارف قرآنی آپ نے سب کو یکساں طور پر بتائے تھے اور جتنا بتایا ہو، اُسے سب یکساں طور پر سمجھے بھی ہوں، ورنہ راسخون فی العلم کے گروہ کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی اور اس آیت کے کوئی معنی نہ ہوتے کہ

بَلۡ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ

بلکہ وہ کھلی ہوئی آیات ہیں اُن اشخاص کے سینوں میں جنہیں علم عطا ہوا ہے۔ (عنکبوت۔ ۴۹)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کوئی خاص طبقہ ہے جن کے سینوں میں علم قرآن کا ذخیرہ ہے، ہر کس وناکس اُس سے بہرہ ور نہیں ہے۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث معصومین علیہم السلام نے قرآن مجید میں باطنی اسرار اور تہ در تہ رموز واشارات کا پتہ دیا ہے جس کے بعد اس کا مطلق طور پر انکار مشکل ہو گیا ہے۔

---

[1] رحمۃ للبرّ والفاجر والمؤمن والکافر (مجمع البیان)

علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کی تشریح ایسی کی ہے جس کے بعد اس کا تعلق علم سے کچھ رہتا ہی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

اٰذنتکم ای اعلمتکم بالحرب علیٰ سوٰی ایذانا علیٰ سواء اعلامہ نستوی نحن و انتم فی علمه (مجمع البیان)
میں نے تم کو برابر سے آگاہ کر دیا یعنی جنگ کا اعلان صاف الفاظ میں کر دیا ہے جسے ہمارے آدمی بھی خوب سمجھ گئے اور تم بھی۔

اگر چہ موصوف کے پیش نظر جناب شیخ الطائفہؒ کا ارشاد ہے۔ چنانچہ بعد میں اُس کا خلاصہ بطور قول ضعیف درج کیا ہے مگر اس کا کوئی انتقادی جائزہ نہیں لیا ہے جیسا بحمدہٖ باوجود اختصار کے سیر حاصل طور پر ہم نے جائزہ لیا ہے۔

اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنۡ اَدۡرِىۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۱۱۱﴾

”بلا شبہ وہ جانتا ہے اسے بھی کہ جو با آواز بات ہو اور جانتا ہے اُسے بھی کہ جو تم کو چھپاتے ہو اور مجھے نہیں معلوم ممکن ہے وہ آزمائش ہو تمہارے لئے اور عارضی فائدہ ہو ایک وقت تک کے لیے“۔

”مجھے نہیں معلوم“ یعنی ظاہری اسباب سے انسان نہیں جانتا[1] جیسے ہمارے محاورہ میں آتا ہے۔

”نجانے“ اور ”کیا معلوم“ وغیرہ، چاہے کہنے والا کسی غیر معمولی ذریعہ سے جانتا بھی ہو کہ ایسا ہی ہے۔

قٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

”کہیے کہ پروردگار تو فیصلہ کر دے حق کے ساتھ۔ اور ہمارا پروردگار رسب کو فیض پہنچانے والا وہ ہے جس سے مدد طلب کی جائے اس پر جو تم کہتے ہو“۔

قرآن مجید میں متداول اس آیت کے شروع میں قُل ہی ہے جس کا ہم نے ترجمہ کیا ”کہیے“ اور ترجمہ کا عام اصول یہ ہے کہ وہ متداول لفظوں کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے جلیل القدر مفسرین نے تفسیر میں بھی اس کی پابندی کی ہے[2] مگر بعض مترجمین نے یہاں ترجمہ قال کے لفظ کا کیا ہے[3] جو بعض قاریوں کی قرأت بتائی جاتی ہے[4] کہ انہوں نے پڑھا ہے: قٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ الخ اس میں دو تبدیلیاں ہیں قُل کے بجائے قال اور ربِّ (بغیر یا) کے بجائے: ربّی (ی کے ساتھ) مگر ہم اسے بہتر سمجھے سے قاصر ہیں۔

”مدد طلب کی جائے اس پر جو تم کہتے ہو“۔ یعنی جن غلط عقائد کا تم ادعا کرتے ہو[5] یا میری ایذا رسانی کے جو منصوبے بناتے ہو۔

---

[1] وان ادری ای وما ادری لعلّه کنایة عن غیره (مجمع البیان)
[2] قل یا محمد (تبیان) ای فرّض امورك یا محمد الی الله (مجمع البیان)
[3] پیغامبر گفت (شاہ ولی اللہ) کہا پیغمبر نے (شاہ رفیع الدّین)
[4] وفی قراءت قال (جلالین)
[5] من کذّبکم علی الله فی قولکم: اتّخذ ولدا و علیٰ فی قولکم ساحر و علی القراٰن فی قولکم شعر (جلالین)

سُوْرَةُ الْحَجِّ

اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے[1] لیکن اکثر نسخہ ہائے قرآن میں اس ''سورہ'' کی پیشانی پر ''مدنیۃ'' لکھا ہوا ہے۔ آیات کی تعداد ۷۸ ہے۔

حج کا ذکر پہلے بھی کئی دفعہ آچکا، اس سورہ میں بھی ہے مگر نام یہ اسی سورہ کا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خاص مضامین جو اس سورہ میں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ حج کے خاص مضامین:

۱............قیامت کا انتہائی ہولناک زلزلہ۔

۲............انسانی تخلیق اور زندگی کے مختلف بدلتے ہوئے ادوار کے تصّورات وتغیّرات سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی۔

۳............اختلافِ عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں جو اس کی دلیل ہے کہ عقیدوں کا اختلاف نجات پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۴............حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندائے حج اور قیامت تک اس کا اثر۔

۵............شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم جو اس کی دلیل ہے کہ تعظیم غیر اللہ کو مطلق طور پر شرک سمجھنا غلط ہے۔

۶............دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت۔

۷............اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر۔

۸............پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی۔

۹............مکھی کی مثال دے کر قدرتِ الٰہی کے سامنے انسان کی عاجزی کا ثبوت۔

۱۰............دین میں عسر وحرج کی نفی۔

۱۱............''مسلم'' نام کی ابتداء............وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

---

[1] مکیۃ عن ابن عباس و عطاالّا ٰایات و قال الحسن ھی مدنیۃ غیر اٰیات نزلت فی السّفر و قال بعضھم غیر ستّ اٰیات و قال بعضھم غیر اربع اٰیات (مجمع البیان)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

''اے انسانو! اپنے پروردگار کی ناراضی سے بچو۔ بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے جس دن تم اُسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی بھول جائے گی اُسے کہ جسے وہ دودھ پلاتی ہے اور ہر حاملہ کا حمل ساقط ہوجائے گا اور تم لوگوں کو دیکھو گے مدہوش نشہ ہیں، حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہیں مگر اللہ کا عذاب بہت سخت ہے''۔

قیامت کا زلزلہ

''قیامت کا زلزلہ'' اس کے معنی اُس تلاطم اور تہلکے کے بھی ہو سکتے ہیں، جو قیامت میں ہوگا اور اس صورت میں یہ چیزیں جو بعد میں ہے کہ ہر دودھ پلانے والی بھول جائے گی اُسے جسے وہ دودھ پلاتی ہے اور ہر حاملہ کا حمل ساقط ہوجائے گا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اس دن نفسا نفسی کا عالم ہوگا اور اُس کی شدّت ایسی ہوگی جس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی دودھ پلانے والی ہو تو اُس بچّہ کو بھول جائے جیسے وہ دودھ پلاتی اور حاملہ کا حمل ساقط ہوجائے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اُس دن ایسی عورتیں ہوں گے جو دودھ پلاتی ہیں اور ایسی عورتیں جنہیں حمل ہے۔[1]

لیکن بہت سے مفسرین نے قیامت کا زلزلہ کا مطلب یہ لیا ہے کہ قیامت کے پہلے ایک زلزلہ ایسا آئے گا۔[2] اس صورت میں زلزلہ کے نتائج جو بیان ہوئے ہیں انہیں بطور واقعہ سمجھنا چاہیے کہ ''دودھ پلانے والی اپنے بچّہ کو بھول جائے گی اور حاملہ عورت کا حمل ساقط ہوجائے گا اور لوگ عذاب کی شدّت اور اس کے اثر سے مدہوش نظر آتے ہوں گے''۔ علامہ طبرسیؒ نے دونوں نقل کردیے ہیں، کسی کو ترجیح نہیں دی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ③ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ④

''اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں بے جانے بوجھے بحث کرتا ہے اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے جس کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ جو اُس کا ساتھ دے، وہ اُسے گمراہ کر کے چھوڑے گا اور اُسے آتش دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا''۔

---

[1] هٰذا تهويل ليوم القيمة وتعظيم لما يكون فيه من الشدّة علیٰ وجه لو كان هناك مرضعة لشغلت عن الذى ترضعه ولو كان هناك حامل لاسقطت من هول ذٰلك اليوم وان لم يكن هناك حامل ولا مرضعة (تبيان)

[2] اى الحركة الشديدة للارض الّتى يكون بعدها طلوع الشمس من مغربها الّذى و هو من اشراط السّاعة (جلالين) زلزله كه نزديك قيامت باشد (شاه ولى الله)

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ کتب علیہ والا جملہ شیطان مرید کی ہے جو ایک تفسیر ہے [1] دوسری تفسیر کے مطابق یہ اس شخص کو کہا گیا ہے جو بلا وجہ اللہ کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ ''اُس کے لئے یہ بات طے شدہ ہے۔'' یہ دوسرا قول ہے [2] جو بعید نہیں ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٦ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝٧

اے انسانوں! اگر تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے میں شک ہو تو (اس پر غور کرو کہ) ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے جسے صورت دی گئی ہے اور ایسے سے بھی جسے صورت نہ دی گئی ہوتا کہ تمہارے لئے ظاہر کریں اور ماؤں کے پیٹ میں جو چاہتے ہیں ہم رکھتے ہیں، ایک مقررہ مدت تک۔ پھر تمہیں بچہ کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر نشوونما دیتے ہیں کہ تم اپنی پوری قوت کی منزل تک پہنچو اور کوئی تم میں سے وہ ہے جسے اٹھا لیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے پہنچ جاتا ہے انتہائی عمر کی منزلوں تک، یہاں تک کہ علم و دانش کے بعد پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ جانتا بوجھتا نہیں اور تم دیکھو گے زمین کو خشک تو جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہا اٹھتی ہے اور نشوونما پیدا کرتی ہے اور ہر قسم کے خوشنما نباتات اگاتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ بس اللہ ایک برقرار، نہ بدلنے والی ذات ہے اور وہ بلا شبہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور یقیناً اللہ انہیں جو قبروں میں ہیں زندہ کرے گا''۔

ادوارِ انسانی کی تبدیلیوں سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی:

---

[1] فقفلی علی الشیطان (جلالین)

[2] قیل معناہ کتب علی المجادل بالباطل (مجمع البیان)

پہلے جو کہا گیا ہے کہ ''مٹی سے پیدا کیا'' یہ پوری نوع کے آغاز کا ذکر ہے یعنی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کے بعد والے ''پھر'' سے وہ نظام ہے جو ان کی اولاد کی خلقت میں جاری ہے۔

''لنبین لکم'' ''تا کہ تمہارے لئے ظاہر کریں''۔ یعنی مبداء خلقت میں مٹی سے پیدا کرنے کے بعد پھر یہ تدریجی نظام تخلیق جو اولاد آدم میں جاری ہے اور جو اب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اس نظام کے قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ تم پر اللہ کی قدرت نمایاں ہو[1] اور معلوم ہو کہ وہ جس طرح چاہے پیدا کر سکتا ہے لہٰذا قیادت میں دوبارہ پیدا کرنے کے امکان میں بھی تمہیں کوئی شک وشبہ پیدا نہ ہو۔[2]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ⑧ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ⑨ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ⑩

''اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں بحث کرتا ہے بغیر کسی علم اور بغیر کسی رہنمائی اور بغیر کسی روشن کتاب کے موڑے ہوئے اپنے شانے کو تا کہ اللہ کی راہ سے بھٹکائے۔ اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور اسے قیامت کے دن ہم آگ کا مزہ چکھائیں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھ کر چکے ہیں اور یقیناً اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے''۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪

''اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کنارے پر کھڑا کرتا ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی بھلائی ہوتی ہے تو وہ اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش سامنے آتی ہے تو اپنا منہ اٹھائے ہوئے پلٹ جاتا ہے۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں کے گھاٹے میں ہے۔ یہ کھلا ہوا خسارہ ہے''۔

''عبادت کنارے پر کھڑا کرتا ہے'' اس کی تشریح دوسرے جملہ میں موجود ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یعنی دنیا کی نیکی پاوے تو بندگی پر قائم رہے اور تکلیف پاوے تو چھوڑ دے۔ ادھر دنیا گئی ادھر دین گیا۔ کنارے پر کھڑا ہے یعنی ابھی نہ اس طرف ہے نہ اس طرف ہے جیسا کہ کوئی مکان کے کنارے پر کھڑا ہو، جب چاہے نکل جاوے'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

---

[1] لنبدلکم علیٰ مقدورنا بتصریفہ فی ضروب الخلق (تبیان)

[2] لنبین لکم کمال قدرتنا لتستدلوا بھا فی ابتداء الخلق علیٰ اعادتہ (جلالین)

علیٰ حرف ای شك فی عبادته مشبه بالحال علیٰ حرف جبل فی عدم ثباته۔
علیٰ حرف کے معنی یہ ہیں کہ اپنی عبادت میں شک کی حالت پر ہے، اس شک کو تشبیہ دی گئی ہے پہاڑ کے کنارے سے ڈانوڈول اور بے ثبات ہونے ہیں۔
جناب شیخ الطائفہؒ نے اس طرح فرمایا کہ:

ای فی النّاس من یوجه عبادته الی الله علیٰ ضعف فی العبادة کضعف القیام علیٰ حرف وذلك من اضطرابه فی استیفآء النّظر المئودی الی المعرفة فادنیٰ شبهة تعرض له ینقادلها ولا یعمل فی حلّها۔
یعنی لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو اپنی عبادت کو اللہ سے متعلق کرتا ہے مگر اس عبادت میں کمزوری ہوتی ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس غور فکر میں جو معرفت تک پہنچاتی ہے ڈانواڈول ہے تو ذرا بھی شک وشبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ شبہ کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس کے حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔
ہماری قدیم تفسیر کا اجمال اس پوری تفصیل پر حاوی ہے۔علی بن ابراہیم قمیؒ نے لکھا ہے اور بظاہر معصوم کی طرف نسبت ہے:
علیٰ حرف قال علیٰ شك: علیٰ حرف فرمایا (یعنی) شک کی حالت میں۔
اس صورت میں قرآن مجید کی بعد کی تفصیل اس مفہوم کی تشریح تکمیل ہوگی مگر علّامہ طبرسیؒ نے اسکے علاوہ حسن بصری کا یہ قول نقل کیا ہے:
الدّین حر فان احدهما اللّسان والثانی القلب فمن اعترف بلسانه ولم یساعده قلبه فهو علیٰ حرف.(مجمع البیان)
دین کے دو کنارے ہیں، ایک زبان اور دوسرے دل تو جو زبان سے اقرار کرے اور اُس کا دل اُس کا ساتھ نہ دے رہا ہو تو وہ ایک کنارہ پر ہے۔
اس صورت نے قرآن مجید کے بعد کے جملے اس حرف کے مفہوم کی تشریح قرار نہ پائیں گے بلکہ اس کے نتیجہ کو ظاہر کرنے کے والے ہوں گے کہ چونکہ اُس کا ایمان صرف زبانی ہے، دل اُس کا ہم آہنگ نہیں ہے، تو اس میں ثباتِ قدم بھی نہیں ہے۔ جب دنیا کے منافع نظر آتے ہیں، تو قدم جمائے رکھتا ہے۔اور ذرا سختی پیش آئی تو بس دین سے منحرف ہونے کی سوچنے لگتا ہے یا منحرف ہو ہی جاتا ہے۔

يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾
يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

”پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر اسے کہ جو اسے نہ نقصان پہنچاتا ہے اور نہ اسے کوئی نفع پہنچاتا ہے، یہی سخت گمراہی ہے، وہ پکارتا ہے ایسے کو جس سے نقصان کا امکان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔“ کیا برا ہے آقا اور کتنا برا ساتھی“
مَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ جس سے نقصان کا امکان اس کے فائدہ سے زیادہ ہے، صاف ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں مگر بعض مفسرین کو اقرب کے لفظ میں دشواری محسوس ہوئی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن اصنام کی پرستش میں کوئی فائدہ ہے مگر

وہ دور ہے اور ضرر جو ہے، وہ ان کی بہ نسبت نزدیک ہے۔اس تصور کے دفعیہ کے لئے انہوں نے کہا ہے کہ عرب میں یہ محاورہ ہے کہ جو چیز کوئی وجود نہ رکھتی ہو، اسے بعید کہتے ہیں تو اس بعید کے محاورہ کو سامنے رکھ کر قرآن مجید نے ضرر کے لئے قریب کی لفظ استعمال کی ہے۔مطلب یہ ہے کہ اس میں نفع بالکل نہیں ہے۔[1]

ہمیں نہ عرب کا یہ محاورہ معلوم ہے اور درصورتیکہ بعید میں اس قسم کا محاورہ ہو تو اس کے مقابلہ میں ضرر کو قریب کہنا پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا اور محاورات قیاسی چیز نہیں ہوتے کہ ان میں عقلی تقابل سے تصرف صحیح ہوا کرے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿١٤﴾

"بلاشبہ اللہ داخل کرتا ہے انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، یقیناً اللہ کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے"۔

اور چاہتا اسی کو ہے جو حکمت کاملہ کا تقاضا ہوتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿١٥﴾

"جو سمجھتا ہو کہ اللہ ہرگز دنیا اور آخرت میں ان کی مدد نہیں کریگا تو وہ کوئی رسی بلندی تک کھینچ کر لے جائے، پھر اسے کاٹ ڈالے۔اس کے بعد دیکھے کہ اس کی ترکیب اس کے غم وغصہ کو دور کرتی ہے؟"۔

میں نے جو ترجمہ کیا ہے کہ "ان کی مدد نہیں کرے گا" یہ اس بنیاد پر ہے کہ ضمیر لن ینصرہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف راجع ہے، جو ابن عباسؓ وغیرہ کا قول ہے۔[2] اس صورت میں بعد کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا گمان غلط ثابت ہوگا اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد ضرور کرے گا۔اس سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو کوئی چارہ کار نہیں سوا اس کے کہ یہ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جائے اور پھر وہاں سے گر کر جان دے دے۔آخری فقرہ کا مطلب تقریباً سب نے یہی لیا ہے مگر مجھے اس میں تامل ہے۔اس لئے کہ الفاظ قرآنی میں رسی لٹکانے اور اس کے کاٹنے کا ذکر ہے۔خود اس کے لٹکنے اور گر کر مرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور پھر بالکل آخری الفاظ کہ "اس کے بعد دیکھے کہ یہ ترکیب اس کے غم وغصہ کے سبب کو دور کرتی ہے"۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسی کا لٹکانا اپنی جان دینے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس اپنے غم وغصہ کے سبب کو دور کرنے کی کوئی ترکیب تھی۔اس لئے میرے ذہن میں اسکا مطلب یہ آتا ہے جو ہمارے اس محاورہ میں ادا ہوتا ہے کہ زمین آسمان کے قلابے ملا لے، اس کے بعد بھی وہ

---

[1] وان کان لا نفع عندہ ولکن العرب تقول لما لا یکون ھذا بعید ونفع الصنم بعید لا نہ لا یکون فلما کان نفعہ بعیدا قیل لضرہ انہ اقرب من نفعہ علی معنی انہ کاین (مجمع البیان)

[2] ای محمد نبیہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم (جلالین) فالھاء فی قولہ ینصرہ اللہ عائد الی النبی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم (تبیان) عن ابن عباس وقتادۃ والمعنی من کان یظن ان اللہ لن ینصر نبیہ محمدا ولا یعینہ علی عدوہ (مجمع البیان)

اللہ کی اس مدد کو نہیں روک سکتا جو اس کے غم وغصہ کی باعث ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر خود اس شخص کی طرف راجع ہے یعنی ''جو یہ گمان کرتا ہے کہ خدا اس کی مدد نہیں کرے گا''۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے بالکل مایوس ہوجائے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''دنیا کی تکلیف میں جو کوئی خدا سے ناامید ہوکر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزیں پوجے، جن کے ہاتھ نہیں برا بھلا وہ اپنے دل کے ٹھہرانے کو یہ صورت قیاس کرلے جیسے ایک شخص اونچی رسی سے لٹک رہا ہے۔ اگر چڑھ نہیں سکتا، توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے، جب رسی توڑے تو پھر کیا توقع۔ رسی کہا اللہ کی امید کو طرف آسمان کے یعنی اونچان کے''۔ (موضح القرآن)

میں پہلے قول کو زیادہ قرین قیاس سمجھتا ہوں، اس میں یہ الجھاؤ نہیں ہے جو آپ کو مذکورہ عبارت میں نظر آرہا ہے، پھر دینی حقیقت یہ ہے کہ کافر کو تو رحمت خدا سے مایوس ہونا ہی چاہئے تو اس کی اس بات پر مذمت کیوں ہوگی کہ وہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ اس کی دنیا وآخرت میں مدد نہیں کرے گا۔ اسے چونکہ وہ کافر ہے، گمان کیسا، یقین ہونا چاہئے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا۔ یہ اس کا گمان یا یقین بالکل صحیح ہے تو اس پر مذمت کیوں ہو؟

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾

''اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا ہے کھلی ہوئی نشانیوں کی صورت میں اور اس بنا پر کہ اللہ منزل مقصود تک پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے''۔

بے شک چونکہ وہ حکیم علی الاطلاق ہے، اس لئے بلا وجہ ترجیح سے کام نہیں لیتا کہ کسی کو مقصد تک بالخصوص پہنچا دے بلکہ یہ اس کا پہنچانا جو جبری طور پر نہیں ہے بلکہ توفیق خاص کی صورت سے ہوتا ہے، خود اس شخص کے حسن نیت، سچے ذوق وشوق اور راہ طلب میں امکان بھر قدم زنی سے ہوتا ہے (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) (عنکبوت ٦٩)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿١٧﴾

''بلاشبہ جو ایمان لائے ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابی اور عیسائی اور مشرکین، یقیناً ان سب کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا قیامت کے دن، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر حاضر وناظر ہے''۔

اختلافِ عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں:

''فیصلہ کرے گا'' یعنی اپنا فیصلہ نمایاں کردے گا ان کے آخری انجام کو سامنے لاکر۔[1] اب قابل توجہ ہے یہ پہلو کہ اگر نجات کا تعلق صرف اعمال سے ہوتا اور عقائد کا اس میں دخل نہ ہوتا تو ان عقائد کو جماعتی نشان بناکر ان گروہوں میں فیصلہ کا اعلان کیوں ہوتا کہ دنیا دیکھے کہ ان

---

[1] بادخال المؤمنین الجنّة وغیرھم النّار (جلالین)

میں کس کا کیا انجام ہوتا ہے۔[ا]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ ﴿۱۸﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے لئے سجدہ میں ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب مقرر ہو گیا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرے، اسے عزت دینے والا کوئی نہیں، بلاشبہ اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے''۔

کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود:

جہاں اختیار کا دخل نہیں بلکہ قوانین قدرت کی تکوینی وقہری اطاعت ہے، وہاں تفریق اور امتیاز کا گزر نہیں بلکہ وہاں سب ہی اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں، اگر انسان بھی دوسرے اشیائے کائنات کی طرح جو ہر اختیار سے عاری ہوتا تو یہاں بھی ''نافرمان'' کا وجود غیر ممکن ہوتا مگر وہ تو نظام حکمت الٰہی میں ''فاعل مختار'' بنایا گیا ہے، اس لئے اختیاری حدود میں یہاں یہ فرق ہو گیا کہ بہت سے تو سجدہ میں سرنگوں ہیں، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو نافرمان ہیں اور چونکہ یہ نافرمانی ان کے ''سوءاختیار'' کا نتیجہ ہے، اسی لئے اس کا انجام یہ ہے کہ ان پر عذاب مقرر ہے۔

اب یہاں ایک بحث طلب بات یہ آ گئی ہے کہ پہلے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں اور پہاڑ کے ذکر کے قبل ذی شعور مخلوقات کا بھی ذکر تھا کہ من فی السموت ومن فی الارض جو لوگ آسمانوں میں ہیں اور جو لوگ زمین میں ہیں''۔ اب آسمان پر تو خیر، فرشتے ہیں، ان کے بلا استثناء سربسجود ہونے میں کوئی شک نہیں مگر زمین پر کے لوگ کون ہیں؟ وہ تو انسان ہی ہیں جن میں اس کے بعد صراحت ہے کہ کچھ سجدہ کرتے ہیں کچھ نہیں۔ اس مشکل کے ذہن میں آنے کی وجہ سے جناب شیخ الطائفہ کو کہنا پڑا کہ:

وان کان ظاهرہ العموم فالمراد به الخصوص لانّا علمنا انّ کثیرا من الناس کافرون باللّٰہ تعالیٰ

بظاہر تو اس میں عموم ہے مگر مراد اس سے خاص گروہ ہے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے انسان اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

مگر نظر غائر رہنمائی یہ کرتی ہے کہ من فی الارض میں انسان کا ذکر ہے، شمس وقمر ونجوم وغیرہ کے ساتھ جہاں سجدہ کی نوعیت فطری اطاعت کی ہے جو تکوینی طور سے انجام پاتی ہے، جس میں ارادہ واختیار کو دخل نہیں ہے، یہ پیدائش کے وقت مثل تمام کائنات کے ہر انسان بھی کرتا ہے۔ اس میں مومن و کافر کی تفریق نہیں ہے۔ وہ انسان بھی جو اس کا شدید منکر ہے، عین انکار کی حالت میں اپنی تمام جسمانی وروحانی طاقتوں کے ساتھ خالق کے قانون مشیئت کے مطابق چل رہا ہے جو اس طرح کا سربسجود ہونا ہے، جیسے کائنات کا ہر ذرہ سربسجود ہے اور بعد میں جو کثیر من الناس

[ا] یضطرّ الی العلم بصحة الصحیح حیث یبیضّ وجه المحق ویسودّ وجه االبطل (تبیان)

کہا گیا، وہاں ارادی و اختیاری اطاعت و عبادت مراد ہے۔ یہاں بہت سے وہ ہیں جو نافرمان ہیں اور عبادت کا فرض انجام نہیں دیتے۔[1] تو ان کے لئے کہا گیا ہے کہ "ان پر عذاب مقرر ہو گیا ہے"۔

اگر فاعل خیر و شر اللہ ہوتا، اس انسان کے اختیار کو دخل نہ ہوتا تو بر بنائے عدالت عذاب کی کوئی وجہ نہ تھی، اس سے ظاہر ہے کہ وہ ذلت جسے بعد میں کہا گیا ہے کہ "جسے اللہ ذلت دے، اس کا عزت دینے والا کوئی نہیں" ان کے اس استحقاق کی بنا پر ہے جو ان کے اختیاری کردار سے متعلق ہے اور اس لئے وہ مشیت بھی جسے کہا گیا ہے کہ اللہ جو چاہتا کرتا ہے، بلاوجہ نہیں ہے بلکہ یہ مشیت بر وجہ استحقاق بمقتضائے عدل ہے۔[2]

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾

"یہ دو فریق ہیں جو اپنے پروردگار کے بارے میں باہم دگر مقابل ہیں، تو جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے، ان کے سروں پر گرم پانی انڈیلا جائے گا جس سے ان کے پیٹ کے اندر کی تمام چیزیں اور کھالیں گل جائیں گی اور ان کے لئے لوہے گرز ہوں گے۔ جب چاہیں گے اس سے نکل کر رنج و صدمہ سے چھٹکارا پائیں تو پھر اس میں پلٹا دیئے جائیں گے اور چکھو عذاب جلنے کا"۔

"یہ دو فریق ہیں"...... فریق کے لئے قرآن مجید میں **خصم** کی لفظ ہے، یہ واحد کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور جمع کے لئے بھی۔[3] چونکہ لفظ یہ واحد ہے اس لئے دو فریق کے لئے تثنیہ کی لفظ استعمال ہوئی ہے۔ **خصمان** مگر چونکہ درحقیقت وہ دو شخص نہیں ہیں بلکہ دو گروہ ہیں جن میں کثیر افراد ہیں، اس لئے بعد میں فعل جمع لایا گیا ہے: **اختصموا** جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے "باہم دگر مقابل ہیں" اور ایک جگہ تو قرآن میں یہ لفظ بطور واحد لا کر فعل جمع لایا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے۔ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ. (یعنی) کیا ان فریقوں کی خبر آپ تک پہنچی ہے، جب وہ ان کے پاس عبادت گاہ میں داخل ہوئے۔ (سورۂ ص۔ ۲۱)

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوْٓا

---

[1] ایک سجدہ ہے کہ سب اس میں شامل ہیں، آسمان و زمین جو کوئی ہے، وہ یہ کہ اللہ کی قدرت میں بے بس ہیں اور ایک سجدہ ہر ایک کا جدا۔ وہ یہ کہ اس کو جس کام کا بنایا اس کام میں لگے۔ یہ بہت آدمی کرتے ہیں، اور بہت نہیں کرتے، اور خلق سارے کرتے ہیں (موضح القرآن)

[2] یکرم من یشاء اذا استحق ذالك (تبیان)

[3] یستوی فیه الواحد والجمع والذّکر والانثی (مجمع البیان)

اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَهُدُوٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

''بلاشبہ اللہ داخل کرے گا انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں اُنہیں پہننے کو ملیں گے کنگن سونے کے اور موتی اور ان کے کپڑے وہاں ریشم کے ہوں گے اور ان کی ہدایت ہوئی پاک و پاکیزہ گفتگو کی طرف اور اُن کی ہدایت ہوئی اُس کے راستے کی طرف جو حمد وثناء کا حق دار ہے''۔

''ان کے کپڑے وہاں ریشم کے ہوں گے''۔ اس مقام پر شاہ ولی اللہ نے عجیب حاشیہ دیا ہے، ''یعنی در دنیا'' (فتح الرحمٰن) حالانکہ اس کے پہلے جو ذکر ہے وہ جنّت کے لباس کا ہے۔ دنیا کا نہیں اور پھر دنیا میں تو ریشم کا لباس مردوں کے لئے حرام ہی قرار دیا گیا ہے جیسا کہ جلالین نے بھی لباسھم فیھا حریر کی تشریح میں لکھا ہے:

ھو المحرم لبسه علی الرجال فی الدّنیا: وہی جس کا پہننا مردوں پر دنیا میں حرام ہے۔

اور اس سے غالباً اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے جس پر صاف الفاظ میں جناب شیخ الطائفہؒ نے روشنی ڈالی ہے چونکہ دنیا میں وہ حکم الٰہی کے دباؤ سے ریشم پہننے سے محروم رہے تھے تو خالق نے جنت میں جہاں تکلیف کا کوئی تصور نہیں اور وہ دارالجزاء ہے، ریشمی لباس عطا فرمانے کا اعلان کیا اور قرآن کے وعدہ پر ایمان رکھنے والوں کے لئے اس اطمینان دہانی کے ذریعہ سے چند روزہ دنیا میں (اس لباس) سے پرہیز کو طبیعت پر آسان بنا دیا[1] پھر شاہ صاحب یہ کیا فرما رہے ہیں کہ اہلِ جنت کا لباس دنیا میں ریشم ہوگا، مجھے شبہ ہوتا ہے بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ ''در دونیا'' کاتب کی غلطی ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہوگا ''یعنی از دیبا'' اور اس طرح اُن کا مقصد اس آیت کے مضمون اور دوسری جگہ جو ارشاد ہوا ہے: من استبرق اس میں مطابقت ظاہر کرنا ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾

''بلاشبہ وہ جو کافر ہیں اور روکتے ہیں اللہ کے راستے اور اُس مسجد حرام سے جسے ہم نے تمام لوگوں کے لئے قرار دیا ہے، برابر ہیں اُس میں مجاور وہاں کے اور باہر سے آنے والے اور جو اُس میں ظلم وتعدّی کے ساتھ غلط روی کرنا چاہے ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے''۔

کعبہ پر سب کا برابر سے حق:

---

[1] حرّم اللہ علی الرّجال لبس الحریر فی الدّنیا و شرّقھم الیہ فی الاٰخرۃ (تبیان)

”برابر ہیں اس میں مجاور وہاں کے اور باہر سے آنے والے“ یعنی وہاں ملکی اور غیر ملکی کا سوال نہیں ہے[1] کعبہ پر سب کا حق ہے اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ حجاز کا جو بھی فرمان روا ہو، اُسے اپنے کو وہاں کی عبادت گاہوں کا تمام مسلمانان عالم کی طرف سے امین سمجھنا چاہیے لہٰذا وہاں کی عبادت گاہوں پر اُسے اپنے کسی خاص مسلک یا فقہ کے مسلّط کرنے کا بھی حق نہیں ہے، جب کہ وہاں تمام اسلامی دنیا کے افراد کا برابر حق ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ
وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ
ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ
اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا
الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا
بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

”اور جب ہم نے معیّن کیا ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ کو کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو پاک رکھنا طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو تو وہ آئیں گے تمہاری آواز پر پیادہ پا اور ہر لاغر سواری پر کہ آئیں گی (وہ سواریاں) ہر دور و دراز راستے سے تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لئے حاضر ہوں اور اللہ کے نام کا ورد کریں مقرّرہ دنوں میں، اس پر کہ اُس نے انہیں چوپایوں سے روزی عطا کی تو کھاؤ اُن سے اور محتاج و غریبوں کو بھی کھلاؤ، پھر وہ اپنے جسم کی کثافت دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اُس قدیم گھر کا طواف کریں“۔

سب سے پہلے ندائے حج اور اس کی تاثیر کے لئے اللہ کی ضمانت:

یہ ”ندائے حج“ گویا ”صدا بصحرا“ کے طور پر بلند کرائی گئی تھی جب کہ مکّہ کے گرد و پیش آبادی نہ تھی مگر خالق نے اُسی وقت اس کی اثر انگیزی کی ضمانت کر لی تھی کہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ صدا بصحرا نہ ہوگی بلکہ دائمی اثر کی مالک ہوگی، اس آواز پر سعید روحیں لبیک کہیں گی، اُسی دور میں نہیں بلکہ قیامت تک اس آواز پر آنے والے آئیں گے۔

”لاغر سواریوں پر“ کیا مطلب؟ یعنی تیز رفتار سواریوں پر چونکہ اس زمانہ میں مرکب از قسم شتر وغیرہ ہوتے تھے اور وہ جتنے دبلے ہوتے تھے، اتنی رفتار ان کی تیز ہوتی تھی، اس لئے بطور کنایہ تیز رفتاری کے اظہار کے لئے ضامر یعنی لاغر کی لفظ لائی گئی ہے۔

اب دورِ زمانہ کے لحاظ سے جس طرح ”دور دراز“ کے مفہوم میں وسعت ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ موجودہ دور میں وہ کرہ کے

[1] العاکف المقیم فیه والباد الّذی نیتابه من غیر اهله (مجمع البیان) سواء بینهم النزول والدخول الحرم (علی بن ابراهیم)

دوسرے رخ یعنی امریکہ کو اپنے دائرہ میں لیتا ہے اور کسی مستقبل کے وقت میں جب دوسرے سیّاروں پر قانون اسلام کے ماننے والے بسنے لگیں تو اس دور دراز والی پیشین گوئی کا دامن انہیں بھی اپنے اندر لے لے گا اور علی کل ضامر میں جو تیز رفتاری مضمر ہے، اس کے حدود بڑھتے ہوئے موٹروں تک آئے اور پھر ہوائی جہازوں تک پہنچے اور اس سے بھی تیز رفتار مثلاً راکٹ پر سفیر ہونے لگے تو وہ بھی اس لفظ کے حدود میں داخل ہوگا۔

''بیت عتیق'' کے ایک لغوی معنی تو یہی ہیں جیسے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''قدیم گھر'' لیکن ایک روایت میں ہے کہ عتیق کی لفظ عتق سے ہے جس کے معنی آزاد کرنے کے ہیں، چونکہ طوفانِ نوح میں غرق ہونے سے یہ جگہ محفوظ اور عذاب الٰہی سے آزاد رہی، اس لئے اس کا نام ''البیت العتیق'' ہوا[1] اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کافروں کے تسلّط سے آزاد رہا اور یہ بھی کہ اُسے تباہ کرنے کی کوششوں کو ناکام کر کے بچاتا رہا۔ ان اقوال کو علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں درج فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝٣٠ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝٣١

''یہ بات ہے، اور جو اللہ کی حرمتوں کی عزّت کرے تو اُس کے لئے اُس کے پروردگار کے نزدیک وہ بہتر ہے اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں سوا اُس کے کہ جو تم سے بیان کیے جاتے رہتے ہیں تو بتوں کی ناپاکی سے پرہیز کرو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، اللہ کے دینِ حنیفی کو اختیار کرتے ہوئے، اُس کے ساتھ شرک نہ کرنے والے ہو کر اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ گویا آسمان سے گرا تو اُسے اچک لیں پرندے یا ہوائیں اُسے کسی دور دراز جگہ پر پھینک دیں''۔

اللہ کی حرمتوں کی عزت:

''اللہ کی حرمتوں کی عزت'' اس کے معنی عموماً یہ کہے گئے ہیں کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے ان کے ترک کا پابند رہے[2] لیکن جب غور کیا جاتا ہے تو اس آیت میں جو حرفات کی لفظ ہے، وہ اس کے بعد والی آیت میں شعاء کی لفظ سے معنی میں متحد ہے چنانچہ بعض اکابر اہل سنّت نے حرمات اللہ کا ترجمہ ہی شعائر اللہ کے ساتھ کیا ہے[3] اور حقیقت میں لغت کے لحاظ سے بھی حرام اور محترم دونوں کا مادّہ ایک ہی ہے بلکہ جتنی الفاظ اس قسم کی ہیں، اُن کے ساتھ کوئی شرعی حکمِ حرمت وابستہ ہے جیسے بیت حرام اور مسجد حرا، اُس میں محترم ہونے کے لحاظ سے بھی حرمت ہے اور

[1] انما سمّی عتیقا لانّه اعتق من الغرق (علی بن ابراھیم)
[2] بان یترك ما حرّم الله (تبیان)
[3] ہر کہ تعظیم کند شعائر خدا را (شاہ ولی اللہ)

پھر اُس میں شکار حلال ہے۔ اشھر حُرُم جس کے ذیل میں ہم کہتے ہیں ''محرم الحرام'' کیا معنی؟ کہ اُس میں جدال وقتال حرام ہے۔ عورتوں میں محرم اور نامحرم، محرم کون؟ جن سے نکاح حرام ہے، اس طرح حُرُمات اللہ میں قانون الٰہی کی حرمت بھی داخل ہے جس کے تحت میں محرّمات یعنی منہیّات سے بچنے کی پابندی ہے اور وہ محترم چیزیں جن کی اہانت حرام ہے، انھی کو بعد کی آیت میں ''شعائر اللہ'' کہا گیا ہے۔

قول الزّور کا ترجمہ ''جھوٹی بات'' لغت کے لحاظ سے ہے لیکن ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ قول الزّور سے گانا مراد ہے [1] اور بتوں کی ناپاکی کے ساتھ اس کا جوڑ اس لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ شاید وہ پوجا گانے بجانے کی صورت سے کرتے تھے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر قسم کی زبان و دہن کی بے راہ روی جو خالق کو ناپسند ہے، اس سے مراد ہو اس طرح اُس کا ایک عام مفہوم ہوجائے جس میں جھوٹ اور گانا دونوں داخل ہیں۔ [2]

پھر جھوٹ میں خاص اہمیت عدالت میں جھوٹی گواہی کی ہے اور اس کا بُت پرستی کے ساتھ جوڑ گناہ کی اہمیت دکھانے کے لئے ہے جیسے کہ ایک مقام پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کو توحید الٰہی کے ساتھ مقرون کیا گیا ہے اور سورۂ نساء کی پہلی آیت میں رشتوں کے لحاظ کو تقوائے الٰہی کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے متعلق حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد وارد ہوا ہے۔ [3]

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝٣٢

''یہ ہے حقیقت حال اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم وتکریم کرے تو وہ عظمت الٰہی سے دلوں کے تاثر لازمی نتیجہ ہے''۔

شعائرِ الٰہیہ کی تعظیم کا حکم:

شعائر یعنی وہ علامتیں جن سے ذہن خدا کی طرف متوجہ ہو، جس طرح ''علامت'' کی لفظ علم سے ہے کہ وہ علم کا ذریعہ ہوتی ہے اسی طرح شعائر کی لفظ شعور سے ہے جو علم وادراک ہی کے ہم معنی ہے۔

''دلوں کے تاثر کا لازمی نتیجہ ہے'' یا ''دلوں کے تاثر ایک جزء ہے''۔ یہ دونوں ہی مفہوم من سے پیدا ہوسکتے ہیں [4] اور اصل عملی پرہیزگاری کو اس وقت تک نہ اعتبار ہے، نہ اُس میں استحکام جب تک اس کے پس پشت دلوں کا احساس نہ ہو، اس لئے بھی تقویٰ کا بڑا تعلق دل ہی کے ساتھ ہے جو اصطلاح قرآنی میں مرکز شعور کا نام ہے، نہ کہ وہ دل جس کا ''ناگہانی موت'' میں انگریزی نام لے کر کہا جاتا ہے کہ فیل ہوگیا۔ شعائر اللہ کی تعظیم کا قرآنی حکم اُس تصور کی عمارت کا مسمار کرنے والا ہے جو دینی تقدّس کے مرکزوں کی تعظیم اور خصوصیت سے بوسہ لینے کے وقت ایک حلقہ سے ''شرک، شرک'' کی آوازیں بلند کراتا ہے۔

---

[1] قول الزّور الغناء (علی بن ابراھیم)

[2] روی اصحابنا انّہ یدخل فیہ الغناء وسائر الاقوال المنھیۃ بغیر حق (تبیان)

[3] روی ایمن بن حزیم عن رسول اللہ انّہ قام خطیبا فقال: ایھا الناس عدلت شھادۃ الزور بالشرک باللہ ثم قرأ۔ فاجتنبوا الرّجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور۔ یرید انّہ قد جمع فی الاٰیۃ بین عبادۃ الوثن و شھادۃ الزّور (مجمع البیان)

[4] اضافۃ التقویٰ الی القلوب لانّ خفیفۃ التقویٰ تقوی القلوب (مجمع البیان)

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٣٣﴾

''تمہارے لئے ان میں فائدے ہیں ایک مقرّرمدت تک، پھران کی جگہ اسی قدیم گھر کی طرف ہے''۔

حیواناتِ قربانی مجملہ شعائراللہ:

چونکہ شعائر اللہ کے ایک فردکی خصوصیّت کے ساتھ اسی سورہ میں نام لیا گیا ہے اور وہ قربانی کے جانور ہیں تو بظاہر اس آیت کا مضمون اُنہی سے متعلق ہے یعنی قربانی کے جانوروں کے احترام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ذبح ہونے سے پہلے انہیں اچھوتا سمجھ لیا جائے کہ ان سے فائدہ اٹھانا بار برداری یا دودھ سے غذا وغیرہ کی شکل میں جائز نہ ہو بلکہ ذبح یا نحر ہونے کے وقت تک ان سے فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔[1]

البیت العتیق یعنی خانۂ کعبہ جس کی تشریح پہلے ہوچکی ہے اور یہاں مقصود اُس سے خاص خانۂ کعبہ نہیں بلکہ اس کے حدود ہیں جسے بظاہر الیٰ کی لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے جس سے ترجمہ ہوا ''قدیم گھر کی طرف'' کیوں کہ بعض صورتوں میں قربانی خاص کعبہ کے پاس یعنی مکّہ ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں منیٰ ہیں جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے۔[2]

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۭ فَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۭ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿٣٤﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٥﴾

''اور ہرقوم کے لئے ہم نے ایک عبادت کا طریقہ مقرّر کیا ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لیں چوپایوں پر جو اللہ نے ان کی روزی کے لئے مقرّر کیے ہیں تو تمہارا خدا بس ایک خدا ہے لہٰذا اُسی کی بارگاہ میں سر جھکاؤ اور خوش خبری دو ان لو لگانے والوں کو کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں اُن مصائب پر جو انہیں درپیش ہوں اور جو نماز ادا کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں عطا کیا ہے، اُس میں سے خیرات کرتے ہیں''۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَاۗىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ڰ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَاۗفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾

---

[1] منافعها کرکوب ظهرها وشرب البانها اذا احتاج اليها وهوا المودی عن ابی جعفر (تبیان) الیٰ اجل مسمیٰ وقت نحرها (جلالین)

[2] قال اصحابنا ان کان الهدی للحج فمحله منّی وان کان للعمرة المفردة فمحلّه مکّة قبالة اعکعبة (مجمع البیان)

''اور قربانی کے اونٹ، اُنہیں ہم نے تمہارے لئے اللہ کے شعائر میں سے قرار دیا ہے، تمہارے لئے اُن میں بھلائی ہے تو اللہ کا نام لو اُن کو لائن لگا کر کھڑے کرنے کی حالت میں تو جب وہ کروٹ کے بل زمین پر گر جائیں تو کھاؤ اُن میں سے اور ہر قسم کے محتاجوں کو، جو دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور جو دست سوال دراز کرتے ہیں کھلاؤ، اسی طرح ہم نے انہیں تمہارے قبضہ میں دیا ہے، شاید کہ تم شکر گزار ثابت ہو''۔

''کھاؤ'' اور ''کھلاؤ'' یہ دونوں کوئی حاکمانہ فرمان نہیں ہیں کہ کھانا اور کھلانا بھی احکام حج میں سے ہوا۔ اصل واجب تو قربانی کا مصرف کیا ہو؟ اس کے لئے یہ بطور اجازت کہا گیا ہے یعنی تم خود بھی کھا سکتے ہو اور دوسروں کو کھلا بھی سکتے ہو اور اس اجازت کی صراحۃً ضرورت اس لئے ہوئی کہ زمانۂ جاہلیت میں قربانی کے کھانے کو حرام سمجھا جاتا تھا۔[1]

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

''ان کے گوشت اور خون ہرگز اللہ کو نہیں پائیں گے مگر تمہاری پرہیزگاری اسے پالے گی۔ اس طرح ہم نے تمہارے قبضہ میں انہیں دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی کو محسوس کرو، اس بات پر کہ اُس نے تمہیں صحیح راستہ دکھایا اور خوش خبری دو نیک اعمال والوں کو''۔

اصل چیز قربانی کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اصل خوشنودیِ خدا کی فکر:

''ان کے گوشت اور خون ہرگز اللہ کو نہیں پائیں گے، یعنی اسے رسم وعادت کے طور پر انجام دینے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ حکم الٰہی کی تعمیل اور رضائے الٰہی کی تحصیل مقصود ہونا چاہیے۔

یہ حکم اس نذر ونیاز کے کھانے پر بھی حاوی ہے جو مقرّبین الٰہی کی طرف نسبت دے کر تیار کیا جاتا ہے اور دسترخوان پر چنا جاتا ہے، اس میں بھی ان ظاہری رسموں کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے، نہ کھانے کی نوعیت کو بلکہ اصل چیز خلوص اور اُن ہستیوں کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے جس کا لازمی نتیجہ ان کی پیروی کا احساس ہونا چاہیے۔ وہاں بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو تمہاری ان میٹھی پوریوں سے ذائقہ اندوز ہونا نہیں ہے اور سیّدہ سلام اللہ علیہا کو تمہاری اس صحنک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عباسؑ کو اس حاضری کی خواہش نہیں ہے بلکہ اصل چیز ان ہستیوں کے ساتھ دلی تعلّق کا احساس ہے جو انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کرسکتا ہے مگر جس طرح اس قرآنی اعلان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ قربانیاں بے کار ہیں اور بند کردینے کے قابل ہیں اسی طرح کسی مصلح کا اس کہنے سے کہ یہ نذر ونیاز کا کھانا معصومینؑ تک نہیں پہنچتا، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس نذر ونیاز کا مخالف ہے اور اس سب کو بند کردینے کا حامی ہے، بلکہ اُس قرآنی آواز کا مطلب ہوگا کہ ان قربانیوں کے ساتھ تقویٰ کا جوہر ہونا چاہئے۔ اُسی طرح نذر ونیاز کے لئے یہ کہنے کا مطلب ہوگا کہ ان نذروں اور نیازوں کے ساتھ اُن ہستیوں کی عظمت کا احساس اور اُن کے

---

[1] هٰذا اذن وليس بامر لانّ اهل الجاهلية كانوا يحرّ مونها على نفوسهم (مجمع البيان)

حقوق کا تصور ہونا چاہیے جن کے نام پر یہ نذر کی جاتی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾

''بلاشبہ اللہ دفاع کرتا ہے اُن کی طرف سے جو ایمان لائیں، بلاشبہ اللہ کسی خیانت کرنے والے ناشکرے کو دوست نہیں رکھتا''۔

یاد رکھنا چاہیے کہ خداوند کریم نے اپنی طرف کے حکم جہاد کو دفاع کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جہاد کے معنی جارحانہ جنگ کے نہیں ہیں۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٤١﴾

''اجازت دی جاتی ہے اُنہیں جن سے جنگ کی جارہی ہے اس بنا پر کہ اُن پر ظلم ہوا ہے، اور بلاشبہ اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے، وہ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر کسی جرم وخطا کے سوا اس کے کہ اُن کا قول یہ تھا کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع کرنا، بعض کو بعض کے ساتھ تو گرا دیئے جاتے راہبوں کے ٹھکانے اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت کدے اور مسجدیں جن میں اللہ کے نام کا بہت ورد ہوتا ہے اور یقیناً اللہ مدد کرے گا اُس کی جو اس کی مدد کرے، بلاشبہ اللہ طاقت والا ہے، غالب آنے والا، وہ جنہیں ہم اگر اقتدار عطا کریں زمین میں تو وہ نماز کی پابندی کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیک باتوں کی ہدایت کریں گے اور بُرے کاموں سے روکیں گے اللہ کے ہاتھو ں میں تمام باتوں کا انجام ہے''۔

دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت:

یہ آیت اسلام کے قانون جہاد اور اس کے شرائط میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اس کے قبل کی آیت میں جہاد کو دفاع کے نام سے تعبیر کر کے جس طرف ضمنی اشارہ تھا کہ ابتدائے جنگ دوسری طرف سے ہے، اُسے اس آیت میں صاف طریقہ پر ظاہر کیا گیا ہے ان لفظوں میں کہ اُذن للّذین یقاتلون یہاں یقاتلون مجہول کا صیغہ ہے، اگر یقاتلون ہوتا (''ت'' کے کسرہ کے ساتھ) تو وہ معرف کا صیغہ ہوتا، اُس صورت

میں یہ معنی ہوتے کہ اُنہیں اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی جارہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ جنگ کی ابتداء کرنے والے دوسرے ہیں۔ پھر اگر یہ ہوتا کہ انہیں حکم دیا جاتا ہے تو یہ سمجھنے کی گنجائش تھی کہ ان شرائط کے نہ ہونے کی صورت میں بھی جنگ جائز ہے، ہاں واجب نہیں ہے، مگر اُذن کی لفظ جس سے یہ ارشاد شروع ہوتا ہے بتلاتی ہے کہ بغیر اس کے جنگ جائز ہی نہیں ہے کیوں کہ اذن کے مقابلہ میں ممانعت ہوتی ہے، صرف عدم حکم نہیں مطلب یہ ہے کہ اب تک جنگ ممنوع تھی۔ باوجود یکہ مظالم کا سلسلہ جاری تھا جو بأنھم کی لفظ سے ظاہر ہے کہ پھر بھی ابتداء جنگ کی اُدھر سے نہ تھی لہٰذا جنگ کی اجازت نہ ملی تھی۔ اب چونکہ ابتداء جنگ کی اُدھر سے ہوگئی تو اب جنگ کی اجازت ہو رہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلسلۂ آیات جہاد کی سب سے پہلی آیت ہے۔ اب جتنی آیات قرآن میں قتال کے متعلق ہیں، وہ سب دورانِ سلسلۂ جنگ سے متعلق ہیں۔ آغاز جنگ سے اُن میں کوئی بھی آیت متعلق نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوۡدُ ﴿۴۲﴾ وَقَوۡمُ اِبۡرٰهِيۡمَ وَقَوۡمُ لُوۡطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصۡحٰبُ مَدۡيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوۡسٰى فَاَمۡلَيۡتُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ ۚ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ﴿۴۴﴾

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو اُن کے پہلے جھٹلایا ہے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور لوط علیہ السلام کی قوم اور مدین کے باشندوں نے اور موسیٰ کو جھٹلا گیا تو میں نے کافروں کو مہلت دی اور پھر اُن کو گرفت میں لے لیا تو کیسی میری سزا تھی''۔

منجملہ اور طریقوں کے جو قرآن میں اپنے پیغمبر ﷺ کی تسلی کے لئے اختیار کیے گئے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ جو متعدد آیات قرآنی میں مختلف مقامات پر ہے، یعنی یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ اس کے پہلے برابر ہر پیغمبر کو جھٹلایا گیا تو جو ہمیشہ ہوتا رہا، وہی آپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔[۱]

ہر جگہ تہذیب کی نسبت اُس پیغمبر کی قوم کی طرف دی گئی ہے مگر موسیٰ کے یہاں تکذیب کی نسبت قوم کی طرف نہیں ہوئی بلکہ صیغۂ مجہول کے ساتھ تکذیب کے وقوع کا ذکر کیا، اس لئے کہ موسیٰ کی قوم والے تو بنی اسرائیل تھے، اُنہوں نے بعد میں پریشان بہت کیا جس کے تذکرے قرآن مجید میں جابجا ہیں مگر شروع میں جناب موسیٰ علیہ السلام پر ایمان انہوں نے ہی اختیار کیا، تکذیب کرنے والے فرعون اور اُس کی قوم والے تھے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم والے۔[۲]

فَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا وَبِئۡرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصۡرٍ مَّشِيۡدٍ ﴿۴۵﴾

[۱] قال لنبیّه مسلّیا له تکذیب قومه له وقلّة قبولهم منه (تبیان)
[۲] ثم قیل و قوم موسیٰ لانّ قومه بنی اسرائیل و کانو امنو به وانّما کذّب به قوم فرعون (تبیان)

”تو کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے نیست و نابود کر دیا اس عالم میں کہ وہ ظالم تھے، اب وہ گری ہوئی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنویں ہیں جو بے کار پڑے ہیں اور مضبوط محلّات“۔

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا ۚ فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۴۶﴾ وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ وَ لَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ ؕ وَ اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۴۷﴾

”کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں ہے کہ اُن کے لئے ایسے دل و دماغ ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا کان جن سے وہ سنتے کیوں کہ اصل اندھا پن آنکھوں کا نہیں ہے مگر اندھا پن تو دلوں کا ہے جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں اور وہ آپ سے عذاب کی جلدی کرتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا اور بلاشبہ ایک دن تو آپ کے پروردگار کے یہاں کا تم لوگوں کے شمار کیے ہوئے برسوں کے برابر ہے“۔

اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر:

جلدی اسے ہوتی ہے جسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ ہو، خالق کو جلدی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے تو سب کام حکمت کے مطابق ہوتے ہیں، لوگوں کی خواہشوں یا ان کے طعن و تشنیع سے متاثر ہو کر نہیں ہوتے، جو اُس کا وعدہ ہے، وہ پورا ہو کر رہے گا، چاہے کتنی ہی مدت گزر جائے، بہرحال اُس کے پورے ہونے کا یقین رکھنا چاہیے۔

اگر اسے پیش نظر رکھا جائے تو ظہور مہدی آخر الزمان علیہ السلام کے طول مدت پر کوئی وحشت و پریشانی پیدا ہو سکتی۔

تمہاری طویل سے طویل مدت اس کے حساب سے مختصر ہی ہے، اسے یوں کہا گیا ہے کہ ”ایک دن پروردگار“ کے یہاں کا اس کے شمار کئے ہوئے ہزار برس کے برابر ہے“۔

شاہ ولی اللہ نے اسے کچھ اور طرح سمجھا ہے، وہ کہتے ہیں:

”یعنی اگر خواہد کا ہزار سال دریک روز تمام کند،س امہال بسبب عجز نیست بلکه بنا بر مصالحی که جزا و کسی نمی داند“ (فتح الرحمٰن)

یہاں ان کے فرزند شاہ عبدالقادر نے بھی ان کا تتبع کیا ہے وہ لکھتے ہیں: ”یعنی ہزار برس کا کام ایک دن میں کر سکتا ہے“ (موضح القرآن)

اس کے برخلاف بعض مفسرین نے اُس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آخرت کا ایک دن عذاب کا دنیا کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔[1]

---

[1] ان یوما عند ربّك من ایّام الآخرة من العذاب کالف سنة ممّا تعدّون فی الدنیا. (جلالین)

بہرصورت جہاں تک بیان قرآنی کے اندر سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ایک دن اور ہزار سال صرف قلت وطول مدّت کی تعبیر ہیں۔ اس میں ایک اور ہزار یا دن اور سال کو بنیادی مقصدیت حاصل نہیں ہے، اس لئے بعض مذاہب باطلہ اور بالخصوص بہائی اور قادیانی جماعت نے ان اعداد و شمار پر جو عمارتیں کھڑی کی ہیں، وہ کسی مستحکم بنیاد پر مبنی نہیں ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿٤٨﴾

''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں میں نے مہلت دی اس عالم میں کہ وہ ظلم وستم کی مرتکب تھیں پھر میں نے ان کو گرفت میں لے لیا اور آخر میں رجوع تو میری ہی طرف ہوتا ہے''۔

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٤٩﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٥٠﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٥١﴾

''کہیے کہ اے لوگو! میں تو بس تمہارے لئے کھلا ہوا تنبیہ کرنے والا ہوں تو جو ایمان لائیں اور نیک اعمال بجالائیں، اُن کے لئے بخشش ہے اور عزّت کے ساتھ روزی اور جو ہمارے آیات کے مقابلہ میں عاجز کرنے کی کوشش کریں تو یہ دوزخ والے لوگ ہیں''۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٥٢﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿٥٣﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٤﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی مگر یہ کہ جب اس نے توقعات باندھے تو شیطان نے اس کی توقع (کے پورے ہونے) میں دراندازی کی تو اللہ ختم کر دیتا ہے اُسے کہ جو شیطان دراندازی کرتا ہے، پھر مضبوط کرتا ہے اپنی نشانیوں کو اور اللہ جاننے والا ہے، ہر کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے والا تاکہ وہ اُسے کہ جو شیطان دراندازی کرتا ہے قرار دے آزمائش کا ذریعہ، اُن کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں

اور بلاشبہ ظالم لوگ بڑی سخت تفرقہ اندازی میں ہیں اور تا کہ وہ جنہیں علم عطا ہوا ہے جائیں کہ وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو وہ اُس پر ایمان لائیں تو اس کے لئے ان کے دل کے خشوع وخضوع سے جھک جائیں اور بلاشبہ اللہ انہیں کہ جو ایمان لائیں سیدھے راستے تک پہنچانے والا ہے"۔

پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی:

جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، اس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی پہلو ایسا ہے جو شانِ رسالت کے خلاف ہو مگر جمہور اہل سنّت نے اس کی شان نزول جو تحریر کی ہے، اس میں شان رسالت پر بڑا حرف آتا ہے اور اس کے لئے ترجموں میں بھی بڑا اخلفشار نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

چوں آرزوئی بخاطر...... افگند شیطان چیزی رادر آرزوی پس دورمی کند خدا آنچه شیطان انداخته ست باز محکم می کند خدا آیات خودرا۔

جب کوئی آرزو دل میں کرتا ہے تو شیطان ڈال دیتا ہے کوئی چیز اُس کی آرزو میں تو دور کر دیتا ہے خدا اُسے جو شیطان نے ڈالا ہے پھر مضبوط کر دیتا ہے اپنی آیات کو۔

"جس وقت آرزو کرتا تھا، ڈال دیتا تھا شیطان بیچ آرزوؤں کی کہ پس موقوف کر دیتا ہے اللہ جو ڈالتا ہے شیطان"۔

شاہ ولی اللہ نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے:

مثلا آں حضرت ﷺ بخواب دید ناکه ہجرت کرده اندبزمینی که نخل بسیار دارو پس و وہم۔ بجانب یمامۂ در ہجرت رفت و در نفس الا مر مدینه بود و مثلاً آں حضرت ﷺ بخواب دید نه که بمکه آمده اندو حلق وقصر می کنند پس وہم آمد که درہماں سال ایں معنی واقع شود ودرنفس الا مر بعد از سالہای چند متحقق شدودر امثال ایں صورت امتحاں مخلصاں دو منافقان درمیان می آید (فتح الرحمٰن)

مثلاً حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ ایک ایسی زمین کی طرف ہجرت فرمائی ہے جہاں کھجور کے درخت بہت ہیں تو حضرت ﷺ کو یمامہ کی طرف ہجرت کا تصور ہوا اور واقع میں وہ زمین مدینہ تھی اور مثلاً حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ مکہ میں آئے ہیں اور حلق وتقصیر فرما رہے ہیں تو خیال ہوا کہ یہ اسی سال ہوگا اور درحقیقت وہ چند سال کے بعد وقوع میں آیا اور ایسی صورت میں نرے کھرے مسلمانوں اور منافقوں کا امتحان ہو جاتا ہے۔

اس کا تتبع ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "نبی ﷺ کو ایک حکم اللہ سے آتا ہے، اس میں ہرگز تفاوت نہیں ہے اور ایک اپنے دل کا خیال اس میں در آئے، کبھی خیال ٹھیک پڑا، کبھی نہ پڑا، جیسے حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ سے مکہ میں گئے، عمرہ کیا، خیال میں آیا کہ اب کی لڑائی میں۔ اُس میں نہ ہوا، پھر اللہ جتا دیتا ہے"۔ (موضح القرآن)

ان دونوں بزرگوں کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ جو خواب پیغمبر خدا ﷺ دیکھتے تھے، اس کے ساتھ جو خیال یا تصور آپ کو ہوتا تھا اسے قرآن میں تمنّیٰ کی لفظ سے ادا کیا ہے۔ اس صورت میں القی الشیطان فی امنیّۃ کا مطلب ہوگا کہ وہ خیال وتصور معاذ اللہ شیطان کا پیدا

کیا ہوا ہوتا تھا یا پھر یہ مطلب لیا جائے کہ اُس خواب ہی کو اللہ نے تمنّیٰ کی لفظ سے یاد کیا ہے تو یہ نتیجہ ہوگا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب ان کی آرزوؤں کی پیداوار ہوتے تھے اور پھر اُس خواب کی تعبیر جو آپ کے ذہن میں آتی تھی وہ نعوذ باللہ شیطان کی کارفرمائی سے ہوتی تھی مگر جو حقیقت ایمانی ہمارے ذہن میں ہے، وہ یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سمجھ میں نہ آئے مگر شاہ صاحبان کا تصور یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا خواب کا مطلب سمجھنے میں غلطی کر جاتے تھے مثلاً ہجرت کے لئے آپ نے یہ خیال تھا کہ وہ یمامہ کی طرف ہوگی اور مکہ میں داخلہ کے لئے سمجھا تھا کہ اُسی سال ہوگا مگر اس صورت میں قرآن کے بعد والے ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ اللہ شیطان کی دراندازی کو ختم کر دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مستحکم کر دیتا ہے اور جب کہ بخیال شاہ صاحب قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ وہ غلط تصور شیطان کی طرف سے تھا تو پھر خالق اسے کیوں کہہ رہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف مومنوں کا امتحان تھا اور پھر یہ ارشاد کیوں کر درست ہے کہ انّه الحق من ربّك" وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک حق بات تھی" جب کہ ان کے نزدیک وہ تصور اللہ کی طرف سے تھا ہی نہیں بلکہ وہ معاذ اللہ شیطان کی دسیسہ کاری کا نتیجہ تھا۔ غرض شاہ صاحبان باوجود یکہ اپنی تشریح میں اُس عام غلط روایت سے جو اس آیت کی تفسیر میں کہیں سے آ گئی ہے جس کا ذکر ابھی آئے گا، بچے ہیں، پھر بھی موصوفین کی تشریح حقیقت کے مطابق نہیں ہے اور شان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موافق بھی نہیں ہے۔

لیجئے! اب جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، حضرتین جلالین صاحبان کی زبان سے آیت کی تشریح اُس شانِ نزول کے ساتھ سن لیجئے، جس سے شاہ صاحبان نے اپنی گزشتہ تشریح میں بچنے کی کوشش کی تھی وہ لکھتے ہیں:

اذا تمنّیٰ قرأ القی الشیطان فی امنّیه قرء ته مالیس من القراٰن ممّا یرضاہ المرسل الیھم (نعوذ باللہ من ذٰلك)

"جب وہ (نبی اور رسول) تمنا کرتا ہے کتاب الٰہی پڑھتا ہے"

شیطان اُس کی تمنا میں یعنی پڑھنے میں ڈال دیتا ہے ایسی چیز جو اس کتاب کا جزء نہیں ہے جس سے وہ لوگ جن کی طرف وہ رسول بھیجا گیا ہے خوش ہو جائیں۔

اب سنیے بطور واقعہ اس کی نظیر ان علمائے اہل سنّت کی زبان سے:

وقد قرأ النبیّ ﷺ فی سورۃ النجم بمجلس من قریش بعد "افریتم اللّات و العزّیٰ و منوۃ الثّلاثة الاخریٰ بالقاء الشیطان علیٰ لسانه ﷺ من غیر علمه ﷺ تلك الفرانیق العلیٰ وانّ شفاعتن لترتجی ففرحوا بذٰلك ثمّ اخبرہ جبریل بما القاہ الشیطان علیٰ لسانه من ذٰلك فحزن فسلّی بھٰذہ الاٰیة لیطمئنّ۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ نجم میں قریش کے ایک مجمع کے اندر اس آیت کے بعد کہ کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزّیٰ اور ان کے علاوہ تیسرے منات کو شیطان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر جاری کر دینے سے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں یہ الفاظ پڑھ دے کر بڑے خوبصورت بلند مرتبہ مجسمے ہیں اور یقیناً ان کی شفاعت کی اُمید ہے تو اس سے وہ پورا مجمع مشرکین کا بڑا خوش ہوا پھر جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو بتایا کہ شیطان نے آپ کی زبان پر کیا الفاظ جاری کر دیئے تو آپ کو بہت رنج ہوا، اس پر آپ کو تسلّی دینے کے لئے یہ آیت اتری کہ آپ کو اطمینان ہو۔

ہمارے مفسرین اسے قطعاً باطل سمجھتے ہیں، قدیم ترین تفسیر میں جو زیادہ تر معصومین علیہم السلام کے احادیث پر مبنی ہے، اسے اہل سنّت کی

روایت قرار دیا ہے۔[1]

امّا الاحادیث المرویة فی ھٰذا الباب فھی مطعونة و مضعفة عند اصحاب الحدیث وقد تضمّنت ما ینزّہ الرّسل منه (مجمع البیان)

اس سلسلہ میں جن حدیثوں کی روایت ہوئی ہے وہ سب علمائے حدیث کے نزدیک مجروح ہیں اور اُنہیں ضعیف قرار دیا گیا ہے اور اُن کا مضمون ایسا ہے جس سے اللہ کے پیغمبر بری ہوتے ہیں۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾

''اور ہمیشہ رہیں گے وہ جو کافر ہیں شک و شبہ میں اُس سے یہاں تک کہ آئے ان پر قیامت اچانک یا آئے ان پر عذاب اُس دن کا جو بڑا سخت ہوگا''۔

''اس دن'' سے مراد بعض مفسرین کے خیال میں جنگ بدر والا دن ہے اور بعض نے اُسے قیامت سے متعلق قرار دیا ہے۔[2]

بعد والی آیت اگر مقام تنزیل میں اسی سے متصل ہے تو وہ دوسرے خیال کو تقویت پہنچاتی ہے بہر حال اس طرح کی جتنی آیات ہیں، وہ سب عمومیت کے ساتھ تمام کافروں سے متعلق نہیں ہیں، یا وہ کچھ خاص افراد تھے یا اس قسم کے کفّار جن کا کفر ارادی اور عنادی تھا جس کی تشریح بعض دوسرے مقامات پر اس تفسیر میں ہو چکی ہے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

''سلطنت اُس صرف اللہ کی ہوگی، وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا تو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے وہ آرام والے بہشتوں میں ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو اُن کے لئے ایک بڑا عذاب ہے، ذلیل کرنے والا''۔

پہلی آیت میں ''وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا'' اب وہ فیصلہ کیا ہوگا؟ وہ یہ جو اس آیت کے ذیل میں اور پھر دوسری آیت میں ہے[3] اس فیصلہ میں بھی دیکھ لیجئے کہ بہشت کو تنہا ایمان سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ نیک اعمال سے وابستہ کیا ہے اور عذاب کو بس کفر اور تکذیب آیات سے وابستہ کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس صورت میں اعمال زیر بحث ہی نہیں ہیں یعنی چاہے بظاہر نیک اعمال کتنے ہی ہوں لیکن کفر کی

---

[1] انّ العامة رووا انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہٖ کان فی الصّلوٰة فقرا سورة النّجم (علی بن ابراھیم)

[2] ھو یوم بدر الاخیر فیه للکفّار کالریح العقیم التی لا تاتی بخیر او ھو یوم القیٰمة لالیل له (جلالین)

[3] یفصل بین المومنین و الکافرین ثم بین حکمه (مجمع البیان)

صورت میں فیصلہ وہی ہے جو بیان ہوا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

''اور جنہوں نے ہجرت کی اللہ کی راہ میں، پھر قتل ہوگئے یا مر گئے تو ضرور اللہ انہیں عطا کرے گا اچھی روزی اور یقیناً اللہ بہترین روزی عطا کرنے والا ہے۔ وہ ضرور اُنہیں داخل کرے گا ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے اور بلا شبہ اللہ جاننے والا ہے، بڑا برداشت کرنے والا''

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

''یہ بات ہے[1] اور جو سزا دے ویسی ہی جیسی اُسے سزا ملی ہے، پھر اُس کے خلاف زیادتی سے کام لیا جائے تو بلا شبہ اللہ اس کی مدد کرے گا، یقیناً اللہ معاف کرنے والا ہے، بڑا بخشنے والا''۔

پہلے جو ہوا تھا، وہ حقیقتاً سزا نہیں تھا بلکہ ابتدائی ظلم تھا لیکن عرب کا محاورہ اس طرح ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر ''مشاکلۃ'' سے کام لیتے ہیں یعنی جس لفظ سے ایک طرف کے عمل کا ذکر کرتے ہیں، اُسی لفظ سے اس کے مقابل والے ردّ عمل کا ذکر کر دیتے ہیں جیسے: کماتدین تدان جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''جیسا کرنا ویسا بھرنا''[2]

اس کی نظیریں قرآن مجید میں بھی بکثرت ہیں اُسی طریقہ پر یہاں بھی ادھر کا عمل چونکہ بطور عقاب یعنی سزا ہے تو اُدھر کے کام کا ذکر بلفظ ''عقاب'' کیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اُدھر سے جو تشدّد بطور ظلم ہوا ہے، اُس کے عوض میں ادھر سے جو تشدّد بطور سزا ہو، اور جو حق ہے، اب اس کے مقابل میں اگر پھر اُدھر سے ظلم و زیادتی ہوگی تو خدا اُسی اسلامی جماعت کا ساتھ دے گا جس پر ابتداءً ظلم ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ آخری جملہ کہ ''اللہ معاف کرنے والا ہے'' کہ وہ ''بدلہ لینا'' بھی ایک ''ترک اولیٰ'' کی حیثیت ضرور رکھتا ہے یعنی بہتر یہی تھا کہ بدلہ نہ لیا جائے مگر چونکہ یہ بدلا انسانی فطرت کا ایک عام تقاضا اور اپنے حق کا مطالبہ ہے، جسے بطور قانون روکنا بھی عدل کے خلاف ہے، اس لئے خالق اُسے جائز قرار دیتا ہے اور بلندی نفس کے خلاف پہلو کو اُس کے نظر انداز کرتا ہے۔ اس محل پر عفو و مغفرت کے معنی یہی ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

---

[1] الامر ذٰلك الّذی قصصنا علیك (جلالین)

[2] کفو الھم، الجزاء بالجزاء والاوّل لیس بجزآء وانّما ھو لازدواج الکلام (تبیان)

بَصِيْرٌ ﴿٦١﴾

"یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے اور بلاشبہ اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا"۔

سابق آیت کے تعلق سے کہ ایک وقت اُس فریق نے اسے تکلیفیں پہنچائی تھیں، اب یہ فریق اس کا بدلہ لے رہا ہے اور اب اس کے خلاف وہ تشدد سے کام لیں تو اللہ اس فریق کی مدد کرے گا جو پہلے مظلوم تھا۔ اس کے بعد یہ الفاظ کہ "یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے" بالکل اسی محاورہ کے مطابق ہیں کہ "دنیا میں ہوتا یہی ہے کبھی کے دن بڑا اور کبھی کی راتیں"...... اگر وہ پہلے طاقتور تھے اور یہ بے بس"، اسی لئے انہوں نے ان کو ستایا تو یہ صورت حال نالۂ وفریاد کا سننے والا ہے اور اُن کی حالت کو دیکھنے والا۔[1]

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾

"یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ بس قرار حقیقت ہے اور جس کی وہ اُس کے سوا دُہائی دیتے ہیں، وہ سب حقیقت ہے اور بلاشبہ اللہ ہی ہے جو بلند و بزرگ ہے"۔

گزشتہ سلسلہ ہی کی اس آیت کو بھی ایک کڑی سمجھا جائے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ جب ان کا مددگار ہے تو آخر میں اُن کی فتح ہونا لازمی ہی ہے اس لئے کہ اللہ ایک لازوال حقیقت ہے اور دوسرے فریق کی پشت پر جو معبودانِ باطل ہیں، وہ خود ہی مٹنے والے ہیں اور اللہ ہے جو بلند و بزرگ ہے۔ اس لئے آخر میں کامیابی بہرحال اہل حق کی ہے اور گردشِ لیل ونہار سے نظام دنیا کے عبوری مراحل میں وقتاً فوقتاً اہل حق کو اگر شکستیں ہوتی بھی ہیں تو آخر میں ازروئے قرآن یہی ماننا پڑے گا کہ اہل حق کی مکمل فتح ہوگی اور وہی روزِ منتظر ہے جس کے لئے امامِ منتظر کا تصور اسلامی مسلّمات کا لازمی نتیجہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٦٤﴾

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی تو زمین سرسبز وشاداب ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ اللہ لطف وکرم والا ہے، خبر رکھنے والا، اُس کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ ہی وہ بے نیاز ہے جو تعریف کا حق دار ہے"۔

[1] سميع لدعآء المؤمنين بصير بهم (مجمع البيان)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٥﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے قابو میں دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے اور کشتیوں کو جو سمندر میں چلتی ہیں اُس کے حکم سے اور وہ روکے ہوئے ہے آسمان کو اس سے کہ وہ گرے زمین پر مگر اُس کے حکم سے، بلاشبہ اللہ لوگوں کے ساتھ شفیق ہے، بڑا مہربان''۔

اب چاہے اس وقت کے سائنسی مسلّمات کے ماتحت کوئی اسی بات کی کہ ''وہ روکے ہوئے ہے آسمان کو اس سے کہ وہ گرے زمین پر'' ان الفاظ سے تعبیر کرے کہ وہ اس کشش کے نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں جس سے اجرام سماویہ اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔ وہ چاہے تو اس کشش کے توازن کو ختم کردے اور اجرام سماویہ اس زمین سے ٹکرا جائیں۔ اسی طرح کی تعبیر یا تشریح مفاد قرآنی کے خلاف نہ ہوگی، جب تک کہ اصل مقصد قائم رہے کہ پورا نظام اللہ کے ارادہ سے قائم ہے، جب وہ چاہے اس پورے نظام کو باطل کردے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۫ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾

''اور وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا کی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندگی دے گا، یقیناً آدمی بڑا ناشکرا ہے''۔

اس زندگی و موت کی ادل بدل کے بعد آدمی کو ''ناشکرا'' کہنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ پورا نظام اللہ کی طرف نعمت اور رحمت ہے اور یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ موت انسان کے لئے کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایک نعمتِ خداوندی ہے، اُس طرح جیسے اس کے پہلے اور بعد کی زندگی اُس کی نعمت ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ درمیان میں پہلی زندگی کے بعد ایک وقفۂ سکون ہے منزل حیاتِ ابد تک بڑھنے کے لیے۔

ہمارا ترجمہ ''بڑا ناشکرا'' اس پر مبنی ہے کہ کفور کی لفظ کفرانِ نعمت سے ہے مگر ہوسکتا ہے یہ کفر سے ہو، تب ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ بڑا کافر ہے کہ اللہ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی موت کے بعد زندگی کو غیر ممکن سمجھتا ہے یا سرے ہی سے خدا کا منکر ہے۔[1]

مگر ہماری نظر میں پہلے ہی پہلو کو ترجیح ہے کیوں کہ گزشتہ منزلوں میں سے حیات اوّل اور پھر موت، یہ تو خیر مشاہدہ میں ہے لیکن دوسری حیات مشاہدہ میں کب ہے اور اُسے کافر کب مانتا ہے جو یہ کہا جائے کہ اس سب کا مشاہدہ کرتے ہوئے کیوں انکار کرتا ہے؟ اسے تو وہی مانے گا جو اصطلاحی حیثیت سے مومن ہو، وہ پھر کفران نعمت والے ہی معنی سے کفور ہوگا جس کے معنی وہی ''بڑے ناشکرے'' کے ہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى

---

[1] الکفور ای جحود فانّه مع هٰذه الادلّة الدّالة علی الخلق یجحد الخالق (مجمع البیان)

رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

''ہر قوم کے لئے ہم نے ایک طریقہ عبادت قرار دیا جسے وہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اس لئے اُنہیں آپ سے جھگڑا نہ کرنا چاہیے اور آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاتے رہے بلاشبہ آپ صحیح رہنمائی کے جادہ پر دہ ہیں اور اگر وہ آپ سے خوامخواہ بحث کریں تو کہیے کہ اللہ تمہارے کرتوت سے خوب واقف ہے۔ اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اُس میں کہ جس میں تم باہم اختلاف کرتے رہتے تھے''۔

مختلف طریقے عبادت کے اللہ کی طرف سے آتے رہے نہ کہ مختلف معبود:

اس آیت کے ذیل میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھا چاہیے کہ اس میں طریقۂ عبادت کا ذکر ہے، معبود باطل کا نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق اُن جماعتوں سے نہیں ہے جو اجرام پرستی، اصنام پرستی، آتش پرستی وغیرہ کسی بھی قسم کی غیر اللہ پرستی میں مصروف ہیں، اُن کے لئے قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ ان کی یہ عبادتیں ہماری طرف کی قرار دی ہوئی ہیں بلکہ یہ اُنہی مذہبی جماعتوں کا تذکرہ ہوسکتا ہے جو اپنا معبود اللہ ہی کو قرار دیتی ہیں مگر طریق عبادت میں مسلمانوں سے اختلاف رکھتی ہیں۔

قطع نظر عقیدۂ تثلیث وغیرہ کے جو توحید کے منافی ہے مگر وہ اُسے کھینچ تان کر توحید کے تحت میں لاتے ہیں، تعین معبود میں اُن کو مسلمانوں سے اختلاف نہیں ہے مگر طریقۂ عبادت ان کا مسلمانوں سے مختلف ہے۔ آیت کا تعلق انہی جماعتوں کے ساتھ ہے۔ وہ مسلمانوں سے اختلاف نہیں ہے مگر طریقۂ عبادت اختیار کیا ہے اور اس پر وہ مسلمانوں سے بحث وجدال کرتے تھے۔ ان سے کہا جارہا ہے کہ آخر اس بات پر پیغمبر اسلام ﷺ سے جھگڑا کرنے کیا معقولیت ہے؟ تم نے جو طریقہ اختیار کیا تھا، وہ دل بخواہ تو نہ تھا خالق ہی نے مقرر کیا تھا۔ اب اگر اُسی خالق نے اپنی طرف سے ایک پیغمبر بھیج کر طریقۂ عبادت کو بدل دیا ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں تمہیں کیا عذر ہے اور کس بنا پر تم ان سے برسر پیکار ہوتے ہو۔[1]

اس سے وہ افراد کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو یہ تبلیغ کرنے لگے ہیں کہ نجات کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں بلکہ ہر فرقہ کے صاحب کردار لوگ نجات کے مستحق ہیں یا یہ کہ مذاہب کا اختلاف صرف راستوں کا ہے۔ منزل سب کی ایک ہے جو سیاست کے تقاضوں سے آج کل کا ایک بڑا چلتا ہوا نعرہ بن گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاہب سب حق ہیں، اس لئے کہ اگر قرآن کو یہ کہنا ہوتا تو وہ اس اعلان کے بعد کہ سب طریقے ہمارے ہی مقرر کردہ ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ سے کہتا کہ آپ دوسروں سے نہ الجھئے اور ان سے منازعات نہ کیجئے۔

مگر وہ ایسا نہیں کہتا بلکہ ان جماعتوں کو کہتا ہے کہ وہ آپ سے ظاہر ہے کہ اُسے اُن مذاہب کو حق ثابت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ وہ اہل مذاہب جو ایک ''نئی بات سمجھ کر اسلام کے پیش کردہ طریقۂ عبادت کی مخالفت کررہے ہیں، اُن کی تنبیہ مقصود ہے کہ جیسے وہ طریقۂ عبادت تھیں اس

[1] درایں آیہ اشارہ است کہ اختلاف شرائع بسبب اختلاف عصور است و ہمہ شرائع حقند ودرزمان خود معمول بہ است پس نزاع درحقیقت آں نبایدکرد۔ (فتح الرحمن)

رسول ﷺ کی زبان سے اللہ نے بتایا تھا، اسی طرح اب اُس نے اس پیغمبر ﷺ کی زبانی اس طریقہ کی تعلیم دی ہے تو اب یہی طریقہ واجب العمل ہوگا جو بعد میں بتایا گیا ہے، نہ کہ وہ پہلا طریقہ جو کہ منسوخ ہوگیا اور اسی لئے اس کے بعد رسول ﷺ کو یہ فرمایا ہے کہ آپ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیتے رہے اگر وہ باہر ہوتی کہ ہر مذہب والوں کے لئے ان کا طریقہ حق ہے تو پھر اُن کو دوسرے طریقہ کی طرف دعوت دینے کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے اور پھر اس کے بعد یہ کہ ''یقیناً آپ سیدھے ہدایت کے جادہ پر ہیں''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنے والے گمراہ ہیں اور گمراہوں کا منزل تک نہ پہنچنا ظاہر ہے۔

اس کے بعد پھر آخری فقرہ ملاحظہ ہو۔ اگر سب حق پر ہوتے تو روز قیامت فیصلہ کا سوال ہی کیا تھا، سب کو سیدھے جنّت میں پہنچ جانا چاہیے۔ یہ ارشاد کہ روز قیامت تمہارے درمیان فیصلہ ہوگا، اس کی دلیل کافی ہے کہ اس اختلاف میں کوئی نجات پانے والا ہے اور باقی نجات سے محروم رہنے والے ہیں یہی وہ فیصلہ عدل الٰہی ہے جس کے لئے قیامت کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ جانتا ہے اُسے کہ جو آسمان اور زمین میں ہے یقیناً یہ سب ایک نوشتہ میں محفوظ ہے، بلا شبہ یہ اللہ پر آسان بات ہے''۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾

''اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اُس کی جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ اُس کے متعلق انہیں کوئی علم ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے''۔

اس کے قبل اُن جماعتوں کا ذکر تھا جن کا معبود اللہ ہے مگر طریقۂ عبادت دوسرا ہے اور اب یہ وہ ہیں جنہوں نے معبود ہی غلط تراش لیا ہے جس کی کوئی بنیاد ہی نہیں، من جانب اللہ نہیں ہے اور اسی کو یوں کہا گیا ہے کہ اللہ نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ پھر ان کے لئے سندِ حقّانیت بھلا کیا ہوسکتی ہے؟

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾

''اور جب اُن کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں، درآنحالیکہ وہ بالکل صاف ہیں تو تم اُن لوگوں کے چہروں

میں جو کافر ہیں ناگواری محسوس کروگے۔قریب ہوگا کہ وہ حملہ کر بیٹھیں۔اُن پر جو ہماری آیات کو پڑھ کر سناتے ہیں کہیے کہ کیا میں اس سے زیادہ بری خبر تمہیں سناؤں! وہ آتشِ دوزخ ہے جس کا اعلان کیا ہے اللہ نے اُن کے لئے جو کافر ہیں اور کیا بری ہے وہ منزل"۔

یہ تبلیغ جو رسول کرتے ہیں،حقیقت میں تو کوئی بری بات ہے ہی نہیں مگر کافر اسے برا سمجھتے اور ناگوار محسوس کرتے ہیں تو اُن کے مزعومہ کی بنا پر کہا جا رہا ہے کہ اس سے زیادہ بری خبر میں تمہیں سناتا ہوں،اور وہ ابدی آگ ہے جو تمہارے اس انکار کا نتیجہ ہے۔

يَآأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

"اے انسانو! سمجھانے کو بطور مثال ایک بات کہی جاتی ہے،اسے دھیان سے سنو،یہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے ہو،ہرگز ایک مکھی کو پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب اس کے لئے اکٹھا ہو جائیں اور اگر مکھّی کو پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب اس کے لئے اکٹھا ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے ،طالب ومطلوب دونوں ہی کمزور"۔

مکھی کی مثال سے انسان کی عاجزی کا ثبوت:

ان آیات میں خداوند قدوس نے معبودان باطل کی کمزوریوں کا ایک مثال کے ذریعہ اظہار کیا کہ تو ایسے ہیں کہ جو ایک مکھی کے پیدا کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔

"طالب ومطلوب" سے مراد وہ مکھّی اور یہ معبودان باطل بھی ہو سکتے ہیں[۱] اور وہ معبودان باطل اور یہ ان کے پجاری بھی۔[۲]

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

"اُنہوں نے نہیں سمجھا اللہ کی اُس شان کو جو اُس کے شایان ہے،بلاشبہ اللہ طاقت ور ہے،غالب آنے والا"۔

یہ اللہ کی شان سے تغافل ہی تو ہے کہ اُس طاقتور،غالب ذات کو چھوڑ کر اُن کی دہائی دیتے ہیں جو ایک مکھّی تک کے مقابلہ میں بے حس ثابت ہوں جیسا کہ اس کے قبل کی آیت میں تذکرہ ہوا ہے[۳] اور اسی لئے اُن اصنام کی عاجزی کے تذکرہ کے بعد اس آیت کا اختتامی جملہ یہ ہے کہ

---

[۱] انّ الطالب الصّنم والمطلوب الذّباب (مجمع البیان)

[۲] الطالب العبد والمطلوب المعبود (جلالین) یعنی عابد و معبود (فتح الرحمن)

[۳] اذا شرکوا به مالم یمتنع من الذّباب ولا ینتصف منه (جلالین)

انّ اللہ لقوی عزیز ''اللہ طاقتور ہے، غالب آنے والا'' یعنی اُسے کوئی بے بس نہیں بنا سکتا۔[1]

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﮔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﮕ

''اللہ منتخب کرتا ہے فرشتوں میں سے بھی اُنہیں کہ جن کو وہ بھیجے اور آدمیوں میں سے بھی، بلاشبہ اللہ سننے والا ہے دیکھنے والا جانتا ہے اُسے جو اُن کے سامنے ہے اور اُسے جو اُن کے پیچھے ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات کو رجوع ہوتا ہے''۔

انبیاء کا انتخاب نوع انسان سے نہ کسی دوسری نوع سے:

فرشتوں میں سے جنہیں بھیجتا ہے، وہ اُس کی وحی پہنچانے والے ہوتے ہیں، انبیاء ومرسلین کی طرف اور انسانوں میں سے جنہیں بھیجتا ہے، وہ انبیاء ومرسلین ہیں جو افرادِ انسانی کی ہدایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔

''اصطفاء'' یعنی انتخاب اور چننے کی لفظ ایک ساتھ دو حقیقتوں کی مظہر ہے۔

ایک یہ کہ صفات کی بلندیاں اُس فرد میں کہ جسے وہ منتخب کرے بنفسِ خود اُس کے وجود کے ساتھ ساتھ موجود ہوتی ہیں، انہی صفات کی بنا پر وہ رسول بنایا جاتا ہے۔ انتخاب کا لازمی تقاضا یہی ہے بلکہ اس کے معنی ہی ہیں اس ایک کا چھانٹنا جو اس منصب کے لائق ہے[2] ایسا نہیں ہے کہ ''دل بخواہ'' کسی ایک کو اس نے رسول بنا لیا اور اب رسالت ملنے کی وجہ سے وہ عصمت وغیرہ سے متصف ہو گیا۔

دوسرے یہ کہ ماہیّت وحقیقت میں رسول ایک ایسی نوع کی فرد ہوتا ہے جس کے بہت سے افراد ہیں۔ اس لئے ان افراد میں انتخاب کا مفہوم متحقق ہوتا ہے اور رسالت وامامت وغیرہ اصلِ خلقت کے بعد ایک منصب ہے جس سے بر بنائے اوصاف جعل متعلق ہوتا ہے یہی ''اصطفاء'' کی لفظ کا تقاضا ہے اور یہی حضرت ابراہم علیہ السلام سے ارشادِ الٰہی: انّی جاعلك للنّاس اماما اور پھر اُن کے سوال ومن ذرّیّتی اور خالق کے جواب:

لاینال عهدی الظّالمین کا تقاضا ہے کہ نہ یہ انبیاء ومرسلین یا ائمہ کی کوئی الگ نوع ہے جو مبدأ خلقت سے نوعِ انسان سے امتیاز رکھتی ہے کیوں کہ اس صورت میں بھی اصطفاء وانتخاب کا مفہوم متحقق نہیں ہوتا اور نہ خلقتِ اولیٰ کے بعد پھر جعلِ امام اور عطائے نبوّت وغیرہ کے الفاظ جو قرآن مجید میں صاف درج ہیں، ان کا کوئی مفہوم باقی رہتا ہے۔

پھر اسی آیت سے اُس نوعِ مشترک کا تعیّن بھی ہو جاتا ہے جیسے کہ پہلا اصطفاء جن کے درمیان ہے، ان میں مشترک حقیقت ملکیہ ہے، اس لئے ارشاد ہوا: منّ النّاس جسے دوسرے مقام پر اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (سورۂ فصلت۔ ۶) کے الفاظ سے بھی ظاہر کیا ہے۔

---

[1] قادر لایقدر۔ احد علیٰ مغالبته (مجمع البیان)

[2] سورۂ کهف۔ ۱۱۰

اب اس نوعِ مشترک میں جو پہلے من الملائکۃ اور پھر من النّاس سے ظاہر کی گئی ہے، اصطفاء بعض اشخاص کا جو ہوتا ہے، وہ یقیناً شخصیات فردیہ کی بنا پر ہے، نہ کہ انفصال نوعی کی بنا پر۔ اس لئے بشر مثلکم کے ساتھ جو یوحی الیّ کی لفظ ہے، وہ ''فصلِ مقسّم'' کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ امتیاز فردی کو نمایاں کرتی ہے۔

آخری فقرہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ فرشتے اور پیغمبر بھی باوجود یکہ خاص امتیاز رکھتے ہیں، پھر بھی اللہ کے مقابلہ میں بے بس اور اُس کی نگرانی اور احتساب کے قیود میں مقیّد ہیں تو مشرکین کے ان معبودوں کا کیا ذکر کہ جو کسی خاص امتیاز و خصوصیّت کے حامل ہیں ہی نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ۩ ۝٧٧ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي
الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ
وَفِيْ ھٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ
فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى
وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝٧٨

''اے ایمان لانے والو! رکوع و سجود کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نیک اعمال بجالاؤ، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرلو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اُس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تم کو امتیاز بخشا ہے اور دین میں تمہارے لئے کوئی دشواری قرار نہیں دی ہے، وہ تمہارے مورث اعلیٰ ابراہیم کا دین ہے۔ انہوں نے ہی تمہارا نام ''مُسلم'' رکھا ہے پہلے سے اور اس میں بھی تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو تو نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ رہو، وہ تمہارا حاکم ہے تو کتنا اچھا حاکم ہے اور کتنا اچھا مددگار''۔

دین میں عسر و حرج کی نفی اور ''مسلم'' نام کی ابتداء:

هو سمّٰا کم المسلمین کی ضمیر باعتبار قرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع معلوم ہوتی ہے اور وہ اس واقعہ کے مطابق ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس کے پہلے آچکا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام خانۂ کعبہ کی بنیادیں اونچی کررہے تھے تو اُن کی عرض تھی بارگاہ الٰہی میں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (بقرہ:۱۲۸)

پروردگار! ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے اور ہمارے اولاد میں سے بھی ایک گروہ قرار دے جو تیرے لئے مسلم ہو۔

جس کی تفسیر پہلے بھی لکھی جا چکی ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے مگر بعض مترجمین و مفسرّ ین اس ضمیر کو اللہ کی طرف راجع کرتے

ہیں[۱] اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے''۔ یہ دونوں احتمال تقریباً برابر کے ہیں اور دونوں واقعیت کے مطابق ہیں اور یہ دونوں قول قرون اولیٰ سے پائے جاتے ہیں[۲] مگر لفظی قرب جو اس ضمیر کو ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حاصل ہے، میرے نزدیک پہلے احتمال کو ترجیح دینے کے لئے کافی ہے۔

اس کے بعد جو ہے من قبل ''پہلے سے'' تو پہلی صورت میں اس سے اشارہ ہوگا اسی واقعہ بنائے کعبہ کی طرف اور دوسری صورت میں ''پہلے'' کے معنی ہوں گے، ان آسمانی کتابوں میں جو گزشتہ انبیاء پر نازل ہوئیں[۳] پھر وفی ھٰذا ''اور اس میں'' اسے قریبی طور پر اسی نام کے معاملہ سے متعلق ہونا چاہیے یعنی یہ پہلے سے بھی نام تھا اور اس مذہب یا اس کتاب (قرآن) میں بھی تمہارا نام ''مسلم'' ہے[۴] مگر اسے بعض لوگ سابق میں جو حکم تھا: جاھدوا فی اللہ اُس سے متعلق قرار دیتے ہیں اور ہذا سے اشارہ قرآن ہی کی طرف لیتے ہیں یعنی اللہ کے بارے میں جہاد کرو اور اس قرآن کے بارے میں۔[۵]

یہاں خداوندی عالم کے لئے جو ھو مولٰکم کی لفظ ہے، اُس کے معنی بلا تکلّف حاکم اور مختار کے لئے جاتے ہیں[۶] مگر یہی لوگ جب حدیث غدیر میں من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ پر بحث کرنے لگتے ہیں تو سرے سے منکر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولیٰ کے معنٰی یعنی حاکم کے ہیں ہی نہیں۔

---

[۱] ھو ای اللہ (جلالین) خدا نام نہاد شمار مسلمانان (شاہ ولی اللہ)

[۲] قایل ابن عباس و مجاھد انّ سما کم المسلمین فھو کنایۃ عن اللہ وقال ابن زید ھو کنایۃ عن ابراھیم (تبیان)

[۳] یعنی در کتب سابقہ (فتح الرحمن)

[۴] اور بیچ اس کتاب کے بھی نام رکھا گیا مسلمان (شاہ رفیع الدین)

[۵] و در قرآن نیز جہاد کنید (شاہ ولی اللہ)

[۶] متولّی امورکم (جلالین) اوست خداوند شما پس نیکو خداوند است (شاہ ولی اللہ)

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ

مکّیہ----۱۱۸----آیات

چونکہ آغاز اس سورہ کا ''المؤمنون'' یعنی اہل ایمان کے ذکر سے ہے، اس لئے اس کا یہ نام ہوا اور اس سلسلہ میں جماعت مومنین کے اوصاف بلند کا اتنا جامع اور بسیط سلسلہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے سورہ میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص خاص مضامین میں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ مومن کے خاص خاص موضوعات:

۱............مراتب تخلیق انسان

۲............خلقت انسان پر خالق کا ایک خاص انداز سے اپنی تعریف کرنا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بہترین شاہکار قدرت ہے۔

۳............طوفانِ نوح اور کشتی کا تذکرہ اُن تفصیلات کے ساتھ جن میں سے بعض پہلے نہیں آئے تھے۔

۴............حق انسانی آراء وخواہشات کا تابع نہیں ہوسکتا۔

۵............آیات توحید میں ''برہان تمانع'' کی زیادہ واضح تقریر۔

۶............برائی کے مقابلہ میں اچھائی کی تعلیم جو مناسب موقع پر ''مقاومتِ مجہول'' کا ماخذ ہوسکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ
اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ
حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الْوٰرِثُوْنَ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١١﴾

''ضرور بالضرور دین کی بھلائی حاصل کی اُن ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں رجوع قلب رکھتے ہیں، جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں، جو ادائے زکوۃ کا فرض انجام دینے والے ہیں، جو اپنے پوشیدہ اعضاء کی حفاظت کرنے والے ہیں سوا اپنی بیویوں کے یا جواُن کی مملکت میں کنیزیں ہیں [1] کہ اس پر وہ قابل ملامت نہیں ہیں مگر جو اس کے آگے جانا چاہیں تو یہ لوگ تجاوز کرنے والے قرار پائیں گے اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا لحاظ رکھتے ہیں، جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں، یہی وہ حق دار ہیں جو بہشت کے ورثہ دار ہوں گے، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے''؟

نجات کے حق دار اور اہل ایمان کے اوصاف:

قرآن مجید میں ہر جگہ فلاح و نجات کو ایمان اور عمل صالح دونوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔

یہاں سرنامہ اوصاف مومنوں کو قرار دے کر اعمال صالحہ کی اجمال کو تفصیل کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا ہے اس جامعیت کے ساتھ کہ اُس میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق النّاس بھی آجائیں اور اوامر کے ساتھ نواہی کی پابندی کا بھی تذکرہ ہو جائے چنانچہ صلوٰۃ حق اللہ کی نمائندہ ہے تو زکوۃ اور امانت داری اور غرباء پروری کے اوصاف حق العباد کی نمائندگی کر رہے ہیں، اسی طرح ادھر یہ سب از قبیل اوامر ہیں اور اُدھر اپنے پوشیدہ اعضاء کی حفاظت کا ذکر زنا کاری وغیرہ ایسے منہیات سے پرہیز کا ترجمان ہے۔

اس میں حفاظت اعضائے نہانی کا عام حکم دے کر بیویوں اور کنیزوں کا استثناء دونوں قسم کے جنسی جرائم کے حرام ہونے کا اظہار ہے یعنی زنا کاری اور لواطہ بلکہ بعید نہیں ہے کہ جلق وغیرہ کے غیر فطری حرکات بھی اس میں میں داخل ہوں [2] اور یہاں تو صراحۃً مردوں ہی کے طبقہ کا ذکر ہے مگر دوسری جگہ قرآن میں **والحافظین فروجھم** کے ساتھ: **والحافظات** کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے ایک جدید مسئلہ کے حکم کا استنباط بھی آسان ہے جو سائنس کی بدولت پیدا ہوا ہے یعنی ٹیوب کے ذریعہ سے کسی شخص کا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ از روئے قرآن حرام ہی قرار پائے گا، اس لئے کہ عموم: **والحافظات** سے استثناء صرف ان کے ازواج کا ہے، اور کسی کا نہیں، باقی ہر ایک سے ان کو حفظ فرج واجب ہے خواہ ذریعہ کوئی انسانی حصہ جسم نہ ہو بلکہ بے جان آلہ ہو۔ یہ سب صورتیں ناجائز ہیں۔

ہاں اگر شوہر کسی زخم وغیرہ کی وجہ سے مادۂ تولید بصورت متعارف پہنچانے سے قاصر ہو اور اس شوہر کا یہ مادّہ ٹیوب وغیرہ کے ذریعہ سے داخل کیا جائے تو بعید نہیں ہے کہ وہ **الاّ علیٰ ازواجھم** کے استثناء میں داخل ہو اور اسے جائز سمجھا جائے۔

ہاں ازواج کا لفظ عام ہے، اس میں دائمی عقد جو نکاح کہلاتا ہے اور عارضی جو متعہ ہے، دونوں داخل ہیں۔

قرآن مجید کے ارشاد: **اوماملکت ایمانھم** کے بعض نئی روشنی والے اور دنیا کے عام رجحانات کے دباؤ سے مرعوب مسلمان جو کنیزوں

---

[1] المراد به الاماء لان الذکور من الممالیك لاخلاف فی وجوب حفظ الفرج منهم (تبیان)

[2] کالاستمناء بیده (جلالین)

کے ساتھ تعلقات ازدواجی قائم کرنے کے جواز سے انکار کرتے ہیں اُن کے انکار کی کوئی حقیقت نہیں ہے جب کہ قرآن صاف ازواجھم کے ساتھ ساتھ برابر ماملکت ایمانھم یعنی مملوکہ کنیزوں کا ذکر کررہا ہے جس سے ظاہر ہے حلیّت تصرف کے دو مستقل سبب ہیں۔

ایک زوجیّت اور دوسرے ملوکیّت لہٰذا یہ سمجھنا چاہیے کہ کنیزوں کے ساتھ عقد کرکے اُن کی رضا سے تصرف کیا جائے گا، ازروئے قرآن درست نہیں ہے۔

''اللّغو'' جس کا ترجمہ ہم نے ''بیہودہ باتوں'' کے ساتھ کیا ہے، اس کی تفسیر ہمارے یہاں غناء یعنی گانے کے ساتھ ہوئی ہے[1] مگر یہ ایک روایت ہے۔ دوسری روایات اور وہ بھی معصوم علیہ السلام سے ہیں، یہ ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کی سخت کلامی اور دشنام طرازی کے مقابلہ میں چشم پوشی سے کام لے۔[2]

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور ہم نے انسان کو پیدا کیا نچوڑ سے مٹی کے، پھر اُسے قرار دیا نطفہ کی صورت میں ایک پُرسکون جگہ پر، پھر نطفہ کو منجمد خون کی شکل میں لائے، پھر اُس منجمد خون کو گوشت کے ایک لوتھڑے کی صورت عطا کی، پھر اُس گوشت کے لوتھڑے کو کچھ ہڈیوں کی صورت دی، پھر اُن ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنایا، پھر اُسے ایک دوسری مخلوق بنادیا۔ تو بڑا برکت والا ہے وہ جو خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے، پھر تم اسکے بعد مرجاؤ گے اور اس کے بعد پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے''۔

خلق انسانی پر خالق کی نوازش:

سلسلۂ تخلیق کے بیان میں تخلیق فرد ونوع کے منازل کو سمودیا گیا ہے یعنی سب سے پہلے جو کہا گیا ہے کہ نچوڑ سے مٹی کے پیدا کیا، وہ آغاز نوع بشر کا ذکر ہے جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق ہے[3] اور پھر نطفه، علقه، مضغه، عظام اور لحم کی منازل سے گزرتا ہوا خلقاء اخر پر ختم ہونے والا سلسلۂ نسل آدم کی ہر ہر فرد سے متعلق ہے۔[4]

---

[1] یعنی الغناء والملاھی (علی بن ابراھیم)

[2] عن ابی عبداللہ علیہ السلام انّ یتقول الرّجل علیك بالباطل اویاتیك بمالیس فیك فتعرض عنه الله (مجمع البیان)

[3] خلقنا الانسان اٰدم (جلالین)

[4] ثمّ جعلنا الانسان وھو من ولد من نسل اٰدم (تبیان)

احسن الخالقین کا لفظ جس کے معنی ہیں "خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر" اس کا پتہ دیتا ہے کہ خلق کرنے کی صفت کسی نہ کسی درجہ تک اللہ کے سوا دوسروں کے لئے بھی ثابت ہے [۱] جس کے شواہد قرآن مجید میں اور بھی موجود ہیں۔ اس طرح یہ تصور کہ انسان کو کسی درجہ میں بھی، یہاں تک کہ خود اپنے افعال کا خالق ماننا بھی شرک کی حیثیت رکھتا ہے، از روئے قرآن غلط ثابت ہوتا ہے۔

تخلیق انسان کے تذکرہ کے بعد، اُس کو اپنے کو احسن الخالقین کہنا، اس کی دلیل ہے کہ انسان اشرف المخلوقات یعنی اس کی تمام خلقت میں سب سے بہتر ہے اور ایسا نقش اکمل ہے جس پر نقّاش ازل کو ناز ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نمونہ وہی کامل افراد ہیں جو واقعی ہر حیثیت سے خالق کا بلند ترین شاہکار ثابت ہوتے ہیں۔ اُنہیں اس نوع کے افراد کا ملہ سمجھنا وہ نقطۂ حقیقت ہے۔ جو از روئے قرآن درست ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

"اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے پیدا کیے ہیں اور ہم خلقت سے بے خبر نہیں رہا کیے"۔

یہاں قرآن مجید میں سات آسمانوں کو سات راستوں سے تعبیر کیا ہے [۲] یہ اور بات ہے کہ اُس وقت تک یہ راستے فرشتوں ہی کے لئے ہوں [۳] مگر جب قرآن نے جو انسانوں کے لئے اترا ہے، ہم انسانوں کو یہ راستے بتلائے ہیں تو اسے قیامت تک ظرف ارتقاء میں کسی دور کے سالکوں کے لئے وہ نوردی کا محرّک کیوں نہ سمجھا جائے اور اگر خالق اُس رہبر کو جو اس قرآن کا حامل ہے، اُسی دور میں عملی طور سے ان راستوں کا سالک بنا بھی دے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾

"اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی ایک معین مقدار میں تو اُسے ہم نے زمین میں ٹھہرایا اور بلا شُبہ ہم اُس کو لے جانے پر بھی قادر ہیں تو ہم نے اُس سے پیدا کیے تمہارے لئے باغ کھجوروں اور انگوروں کے جس سے تمہیں بہت پھل ملتے ہیں اور اُس میں سے تم غذا حاصل کرتے ہو اور وہ درخت جو نکلتا ہے طور سینآء سے جو اُگاتا ہے سامان تیل کا اور کھانے والوں کے لئے ایک خاص قسم کی غذا"۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین میں دریاؤں وغیرہ کی صورت میں جو پانی ہے، یہ اصل میں ابر سے برسا ہوا ہے جسے آسمان سے

---

[۱] فیہ دلالہ علی انّ الانسان قد یخلق علی الحقیقۃ لانّہ لولم یوصف بخالق الّا اللہ لما کان لقولہ "احسن الخالق" معنی (تبیان)

[۲] السّمٰوٰت (علی ابن ابراھیم)

[۳] طرائق ای سمٰوت جمع طریقۃ لانّھا طرق الملائکۃ (جلالین) قال الجبائی۔ لانّھا طرق الملئکۃ (تبیان)

اتارنے کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔[۱]

علم فقہ کی بعض ادنیٰ کتابوں میں بھی اس تصور کا وجود ملتا ہے کہ روئے زمین کے تمام پانی کی اصل آب باراں ہے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢١﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾

''اور بلاشبہ تمہارے لئے چوپایوں میں سرمایۂ بصیرت ہے، ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں اُس سے جو اُن کے اندر ہے اور تمہارے لئے ان میں بہت فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو''۔

''جو کچھ ان کے اندر ہے، اس سے مراد مسلماً دودھ ہے[۲] اور اس لئے اگر چہ بطن کے عام معنی پیٹ کے ہوتے ہیں اور اسی لئے عام مترجم یہاں بھی ترجمہ یہی کرتے ہیں کہ ''جو اُن کے پیٹوں میں ہے[۳] مگر چونکہ ہماری اُردو کے محاورہ میں دودھ کو پیٹ کے اندر نہیں کہا جاتا، اس لئے ہم نے ترجمہ میں ''پیٹ'' کا لفظ نہیں لکھا، اصل لغت کے اعتبار سے بطن باطن کے معنی میں ہے جو ظاہر کے مقابل ہے اس لئے اس لفظ سے صرف ''اندر'' کے معنی کا سمجھنا بالکل درست ہے۔

یہی غلطی ہے جو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ایک ارشاد کے ذیل میں راوی کے ایک فقرہ کے ترجمہ میں ہوئی ہے کہ:

''انّ ھٰھنا لعلما جمّاو اشارۃ الیٰ بطنہ''

ترجمہ کیا جاتا ہے ''یہاں علم کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور اشارہ کیا اپنے شکم کی طرف'' .... یہاں بقرینۂ مقام عربی میں جو بطن کا لفظ ہے، اس کے معنی ''شکم'' قرار دینا درست نہیں ہیں بلکہ ''سینہ کے اندر'' کہنا جو ہمارا محاورہ ہے اور سینہ کی طرف اشارہ کیا جائے تو بھی عربی میں بطن کا لفظ کا استعمال درست ہوگا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٢٥﴾

''اور بے شک ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو اُن کی اپنی قوم کی طرف تو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت

---

[۱] یعنی الانہار والعیون والآبار (علی بن ابراھیم)

[۲] ارادانا جعلنا مافی ضروعھا من اللّبن سقیالکم (مجمع البیان)

[۳] ازآنچہ درشکم (ایشان) است (شاہ ولی اللہ) پیچ پیٹوں ان کے ہے (شاہ رفیع الدین)

کرو اللہ کی نہیں ہے کوئی خدا سوا اُس کے ۔ کیوں تم نجات کی فکر نہیں کرتے تو اُس جماعت نے ان کی قوم میں سے جو کافر تھی کہا کہ یہ نہیں ہے مگر تمہارا ہی ایسا آدمی جو چاہتا ہے تم پر بڑائی حاصل کرے اور اگر اللہ ایسا ہی چاہتا تو وہ فرشتے اتارتا ہم نے ایسی بات نہیں سنی اپنے پہلے باپ داداؤں میں ۔ یہ نہیں ہے مگر ایک شخص جس میں کچھ دیوانگی ہے ۔ تو ایک مقررہ مدّت تک کے انجام کا انتظام کرو"۔

کافروں کے حلق سے یہ کسی طرح نہیں اترتا تھا کہ جو ہماری ہی طرح انسان ہیں، وہ اللہ کے رسول ہو جائیں ۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ کو رسول بنانا ہوتا تو کسی فرشتہ کو اتارتا مگر اس کے جواب میں قرآن شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو کسی نبی یا رسول نے یہ نہیں کہا کہ ہمیں انسان نہ سمجھو، ہم حقیقت میں فرشتے ہی ہیں یا اس سے بڑھ کر کوئی الگ قسم کی مخلوق ہیں ۔ یہ صرف ہمارا ظاہری لباس ہے جو تم سے ملتا جلتا ہے، اس صورت میں کافروں کی زبان بند ہو جاتی مگر یہ جواب مقصد خالق کے خلاف اور حقیقت کے لحاظ سے غلط تھا ۔ اس لئے یہ کبھی نہیں کہا گیا ۔ اس سے اُن مسلمین یا مومنین کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو تلے ہوئے ہیں یہ ثابت کرنے پر کہ انبیاء اور ائمہ نوع انسان میں داخل نہیں بلکہ ایک الگ قسم کی مخلوق ہوتے ہیں جو انسان سے ذاتاً الگ ہے ۔ یہ تصور قرآن کے بالکل خلاف ہے ۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٢٦﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٨﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿٣٠﴾

"اُنہوں نے کہا اے میرے پروردگار! میری مدد فرما کہ اُنہوں نے مجھے جھٹلایا تو ہم نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ تم کشتی بناؤ، ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق تو جب ہمارا حکم نافذ ہوا اور تندور سے پانی اُبلے تو سوار کر دو اس میں ہر قسم کے دو جوڑے اور اپنے گھر والوں کو سوا اُن میں سے ایسے اشخاص کے جن کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بات طے ہو چکی ہے اور جو ظالم ہیں، اُن کے بارے میں تم مجھ سے کوئی گفتگو نہ کرنا وہ یقینی غرق ہو کر رہیں گے، تو جب تم اور تمہارے ساتھ والے کشتی پر سوار ہو جائیں تو کہنا کہ شکر اللہ کا جس نے ہم کو ظالم قوم سے نجات دی اور کہنا کہ پروردگار! مجھے اتارنا برکت والی جگہ پر اور تو اتارنے والوں میں سب سے بہتر ہے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اور بلاشبہ ہم آزمائش کیا کرتے ہیں"۔

کشتیٔ نوح علیہ السلام:

''میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا'' ''تو ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ کشتی بناؤ'' اس میں مدد فرمانے کی التجاء کے ساتھ یہ جزٔ کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا اور پھر اس پر فائے تفریع کے ساتھ مرتب کر کے کشتی بنانے کا حکم کچھ یہ پتہ دیتا ہے کہ مدد سے اُن کی مراد یہی تھی کہ اس قوم پر عذاب نازل کیا جائے، مگر دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ ہم نے وحی بھیجی کہ بس جتنے ایمان لا چکے ان سے زیادہ ایمان نہیں لائیں گے، تو اب کشتی بناؤ اُس سے سمجھ میں آتا ہے کہ پہلے جو انہوں نے اپنی قوم کی تکذیب کی بنا پر مدد کی درخواست کی تھی، اس کا مطلب اس طرح کا تھا کہ انہیں توفیق خیر عطا فرما کہ یہ اس تکذیب سے باز آجائیں۔ پھر کچھ افراد کے ایمان لانے کے بعد اللہ نے یہ اطلاع دی کہ جن میں صلاحیت قبول حق کی تھی اور جن کے ضمیر میں کچھ زندگی تھی، وہ ایمان لے آئے، اب اس کے بعد امید نہ رکھو کہ کوئی ایمان لائے گا، لہٰذا اب ان مومنین کی نجات کے سامان کے لئے کشتی بناؤ اور باقی افراد جو مستحق عذاب ہیں، وہ غرق ہوں گے، ان میں سے کسی کے لئے کوئی سفارش نہ کرنا۔

''وہ اشخاص جن کے لئے پہلے سے بات طے ہوئی ہے'' یعنی فیصلۂ قدرت ہے کہ وہ عذاب سے نہیں بچیں گے، یہ زوجہ تھی جناب نوح علیہ السلام کی اور ایک لڑکا اور اس طرح عملی طور پر اس اصول کا اعلان ہو گیا کہ ذاتی اوصاف ایمان و کفر اور طاعت و معصیت کے مقابلہ میں نہ نسب کا اعتبار ہے، نہ سبب کا۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُ
وا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا
مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا
وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِىَ اِلَّا
حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى
عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

''پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور نسل پیدا کی تو ان میں ایک پیغمبر انہی میں سے بھیجا کہ عبادت کرو اللہ کی، تمہارا کوئی خدا نہیں سوا اس کے تو کیوں تم نجات کی فکر نہیں کرتے اور اس کی قوم کے بڑے بڑے آدمیوں نے جو کافر تھے اور جنہوں نے آخرت میں حضوری کو جھٹلایا تھا اور جنہیں ہم نے عیش و عشرت کا سامان دیا تھا، کہا کہ نہیں ہے یہ

مگر تمہارا ہی ایسا ایک آدمی جو کھاتا ہے انہی کھانوں میں سے جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے اسی قسم میں سے جو تم پیتے ہو اور اگر تم کہنا مانو گے اپنے ہی ایسے ایک آدمی کا تو بلا شبہ تم گھاٹے میں رہو گے۔ کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور خاک اور بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں ہو جاؤ گے تو پھر تم برآمد کئے جاؤ گے؟ حاشا وکلاّ، یہ دور ہے یہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، کچھ نہیں ہے سوا اس دنیوی زندگی کے۔ یہیں مرنا ہے اور جینا اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے کچھ نہیں ہیں۔ وہ نہیں ہے مگر ایک شخص جو اللہ کے سر جھوٹی باتیں منڈھتا ہے اور ہم اس پر یمان لانے والے نہیں ہیں''۔

دیکھتے چلے جایئے! پیغمبروں کا پیغام بھی ہر دور میں ایک ہی رہتا ہے اور کافروں کے اعتراضات اور نکتہ چینیاں بھی ہمیشہ یکساں ہی رہی ہیں، چاہے وہ عہد جاہلیت کے کافر ہوں یا اس علم اور سائنس کی ترقی والے دور کے۔ خواہ زمانہ وحشت کے ہوں یا دور تہذیب کے۔ خواہ عصر ظلمت کے ہوں یا اس ہنگام برق ونور کے۔ شیوۂ کافری ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، چاہے ظاہری انداز اس کا کچھ بدلتا رہا ہو۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

''اس نے کہا اے میرے پروردگار! میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا، ارشاد ہوا کہ ذرا ہی میں وہ وقت آئے گا کہ انہیں پشیمان ہونا پڑے، تو لے لیا انہیں سخت آواز نے حق بجانب طور پر تو کر دیا ہم نے انہیں بھوسا، تو لعنت ہو اس ظالم گروہ پر''۔

اس مقام پر قرآن مجید نے اس قوم اور اس کے رسول کا نام نہیں لیا ہے مگر جو عذاب ان پر نازل ہوا یعنی صیحہ جس کا ترجمہ ہو ''سخت آواز'' وہ چونکہ دوسری جگہ قرآن میں قوم ثمود کے لئے مذکورہ ہے، اس لئے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اس قوم سے مراد ثمود اور اس پیغمبر سے مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں۔[1] حالانکہ یہ ممکن ہے کہ صیحہ کسی اور قوم کے لئے بھی ہلاکت کا سبب ہوا ہو اور یہاں ثمود نہیں بلکہ وہ دوسری قوم مراد ہو جس کا نام نہیں لیا گیا۔ بعض لوگوں نے اس سے کہ قوم نوح کے بعد بلا فاصلہ اس قوم کا ذکر ہے کہ ان کے بعد دوسری قوم پیدا کی، اس سے مراد قوم عاد کو لیا ہے اور وہ نبی جن کا ذکر ہے، جناب ہودؑ ہیں کیوں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو نبی مبعوث ہوئے، وہ جناب ہود علیہ السلام ہی تھے۔[2] علامہ طبرسیؒ نے اس کو بطور مختار لکھا ہے اور پہلے کو بطور قول ضعیف درج کیا ہے۔[3] مگر مجھے اس کے قبول کرنے سے یہ چیز سد راہ ہے کہ قوم عاد کی ہلاکت کا سبب خود قرآن مجید میں ہے کہ وہ ''ریح صرصر'' یعنی تیز آندھی تھی ''صیحہ'' کا ذکر قوم ثمود ہی کے یہاں ہے تو یا وہ مراد ہوں اور یا جیسا ہم نے امکان ظاہر کیا کوئی دوسری قوم جس کی ہلاکت بھی صیحہ سے ہوئی ہے اور یہ تصور کہ جناب نوح علیہ السلام کے بعد بلا فاصلہ جناب ہود علیہ السلام ہی مبعوث ہوئے تھے، بظاہر کسی نص قطعی پر مبنی نہیں ہے۔

[1] یعنی قوم حضرت صالح کو (شاہ رفیع الدین) معلوم ہوا کہ یہ قصّہ ہے ثمود کا کہ چنگھاڑ سے وہی مرے ہیں (موضح القرآن)

[2] قیل ہود لانہ المرسل بعد نوح علیہ السلام (تبیان)

[3] یعنی عادا قوم ہود لانہ المبعوث بعد نوح علیہ السلام وقیل یعنی ثمود لانہم اھلکوا بالصیحۃ عن الجبائی (مجمع البیان)

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ
فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

''پھر ہم نے پیدا کیں ان کے بعد دوسری قومیں، نہ کوئی قوم اپنی مقررہ عمر سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے رہتی ہے، پھر ہم نے اپنے پیغمبر بھیجے لگا تار۔ جب کسی قوم کے پاس اس کا پیغمبر آیا انہوں نے اس کا انکار کیا تو ہم نے یکے بعد دیگرے ان کا خاتمہ کیا اور ہم نے انہیں قصہ پارینہ بنا دیا تو لعنت ہو ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے''۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ
وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا
وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

''پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنے معجزات اور کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے بڑے بڑے آدمیوں کی طرف تو انہوں نے غرور سے کام لیا اور وہ بڑے گھمنڈ والے لوگ تھے تو انہوں نے کہا۔ کیا ہم ایمان لائیں اپنے ہی ایسے دو آدمیوں پر حالانکہ ان دونوں کی قوم والے خود ہماری پوجا کرتے ہیں تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تو وہ لوگ ہلاک کئے جانے والوں میں شامل ہو گئے اور بے شک موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب عطا کی۔ شاید کہ وہ لوگ ہدایت قبول کریں''۔

''خود ہماری پوجا کرتے ہیں'' لفظی معنی یہی ہیں اور جب کہ فرعون خدائی کا دعویدار تھا تو بربنائے واقعہ یہ بعید بھی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل اس کی مورتی کی پوجا کرتے ہوں جیسا کہ ایک قول ہے اور ہو سکتا ہے کہ انتہائی فرماں برداری کو بطور مبالغہ پوجا کرنے سے تعبیر کیا گیا ہو۔ [۱]
وہ یعنی قوم فرعون تو ہلاک ہوگئی۔ اب یہ جنہیں کہا گیا ہے کہ ''شاید وہ ہدایت قبول کریں'' قوم موسیٰ وہارون یعنی بنی اسرائیل ہیں۔ [۲]

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾ يٰۤاَيُّهَا
الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَاِنَّ

[۱] ای مطیعون طاعة العبد لمولاه قال الحسن کان بنو اسراءیل یعبدون فرعون (مجمع البیان)
[۲] ای قومه بنی اسرائیل (جلالین)

هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾

''اورہم نے مریم سلام اللہ علیہا کے بیٹے اوران کی ماں کوایک قدرت کی نشانی بنایا اوران دونوں کو پناہ دی ایک ٹیلے کی طرف جوسکون وآرام اورمیٹھے پانی والا تھا،اے پیغمبرو! کھاؤ اچھی غذائیں اورنیک کام کرو اور بلاشبہ میں تمہارے اعمال کا جاننے والا ہوں اور یہ تمہاری قوم ہے ایک قوم اورمیں تمہارا پروردگار ہوں۔تو میرے غضب سے بچو''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اورجناب مریم سلام اللہ علیہا قدرت خدا کی ایک نشانی:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوران کی ماں کو''ایک قدرت کی نشانی'' کہا۔نہ کہ''دوقدرت کی نشانیاں''اس لئے کہ جو پہلو ہے اعجاز کا،وہ دونوں میں الگ الگ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہے بغیرمرد کے اولاد کا ہونا جس سے وہ ماں بھی نشانی قدرت ہوئی اور یہ بیٹا بھی۔[۱] چنانچہ دوسری جگہ الٹ کر بھی یونہی کہا ہے کہ ہم نے مریم سلام اللہ علیہا اوران کے بیٹے کوایک نشانی قرار دیا تمام جہانوں کے لئے۔[۲]

ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ہستیوں میں دو پہلوقدرت الٰہی کے ظہور کے تھے،عیسیٰؑ میں یہ کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اورجناب مریم سلام اللہ علیہا میں یہ کہ وہ بغیرکسی مرد کے ماں بنیں۔لہٰذا جناب مریم سلام اللہ علیہا ذاتاً قدرت کی خاص نشانی نہ سہی مگر اس بیٹے کی ماں ہونے کے لحاظ سے وہ بھی مستقل قدرت کی نشانی ہیں،اس لئے قرآن مجید میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اورمریم سلام اللہ علیہا دونوں قدرت کی نشانیاں تھے بلکہ ایک جگہ عیسیٰ علیہ السلام اوران کی ماں کہا اورایک جگہ مریم سلام اللہ علیہا اوران کا بیٹا کہا۔اس طرح ان میں سے ہرایک اس رشتہ کے لحاظ سے جودوسرے کے ساتھ رکھتا تھا،آیت الٰہی ہے۔لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام اوران کی ماں ایک آیت تھے،اس کا مطلب یہی ہے کہ ہرایک ان میں کا آیت الٰہی تھا اوراس طرح دونوں کوملا کر یہ کہنا کہ دونوں ایک آیت تھے،مطلب اس کا وہی ہوتا ہے کہ یہ دونوں خدا کی آیات تھے،ایک آیت اوردوآیات کہنے میں مفہوم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔[۳]

فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾

''تووہ اپنے مذہب کے لحاظ سے مختلف کتابوں (کی طرف نسبتوں) میں بٹ گئے،ہرگروہ کے لوگ اس سے جوان کے پاس ہے،خوش ہیں تو چھوڑ دیجئے ان کوان کی غفلت کے عالم میں ایک خاص وقت تک''۔

''وہ''یعنی جنہیں ایک قوم اورایک ملت ہونا چاہئے تھا،بٹ گئے بہت سے فرقوں میں کہ کوئی توریت کو مانتا ہے،انجیل کونہیں اورکوئی ان

---

[۱] لم یقل اٰیتین لانّ الاٰیۃ فیھما واحدۃ ولادۃ من غیر فحل (جلالین)

[۲] ھٰذا مثل قولہ: وجعلناھا وابنھا اٰیۃ للعالمین (مجمع البیان)

[۳] الاٰیۃ ھٰھنا فی عیسٰی انّہ ولد من غیر فعل ونطق فی المھد وفی امّۃ انّھا حملتہ من غیر ذکر و برّ أھا کلامہ فی المھد من الفاحشتہ.(تبیان)

دونوں کو مانتا ہے، قرآن کو نہیں"۔

عام قرأت جس کے مطابق تمام قرآنی نسخوں میں اعراب لگے ہوئے ہیں... زُبُراً... کا لفظ ہے جس کے لحاظ سے وہ ترجمہ ہوتا ہے جو ہم نے کیا ہے اور وہ اکثر تفاسیر کے مطابق ہے۔[1] مگر تعجب ہے کہ کچھ مفسرین ومترجمین نے ایک شاذ قرأت جو زُبُراً ہے، اس کے اعتبار سے ترجمہ کر دیا ہے اور وہی تشریح کی ہے۔[2] جو نہ ہونا چاہئے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٦﴾

"کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کرتے ہیں، تو ان کے لئے تیزی کے ساتھ بھلائیوں کا سامان کرتے ہیں؟ بلکہ انہیں شعور نہیں ہے"۔

یعنی یہ مال واولاد کی فراوانی ان کے لئے استحقاق عذاب میں اضافہ کا باعث ہے جس پر اگر انہیں شعور ہو تو فکر مند ہونا چاہئے نہ کہ مطمئن۔[3]

ایک حدیث قدسی میں جو بطریق ائمہ اہل بیت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوئی ہے، اس آیت کے تحت میں اہل ایمان کے لئے انتباہ کیا گیا ہے کہ انہیں تکالیف ومصائب سے گھبرانا نہیں چاہئے کہ وہ بارگاہ الٰہی میں مزید قرب کا سبب ہو سکتے ہیں اور دنیا کے راحت وآرام اور اموال کی فراوانی سے خوش نہیں ہونا چاہئے کہ یہ چیزیں بارگاہ الٰہی سے دوری کا باعث ہو سکتی ہے۔[4]

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا

---

[1] زُبُراً ای کتبا وهو جمع زبور عن الحسن وقتادة و مجاهد (مجمع البیان) المعنی تفرّقوا کتبا دانوا بها و کفروا بما سواها لیهود دانوا بالتوراة و کفروا بالانجیل والقرآن و النصارٰی دانوا بالانجیل و کفروا بالقرآن (تبیان)

[2] زُبَرا حال من فاعل تقطع اوا حزابا متخالفین کالیهود والنصریٰ وغیرهما (جلالین) متفرق ساختند امتان کار خود را درمیان خویش پاره پاره (شاه ولی الله) کاٹ لیا انہوں نے کام اپنا درمیان اپنے ٹکڑے ٹکڑے (شاه رفیع الدین) من قرأ زبرا بفتح الباء وهو ابن عامر فمعناها جماعات لانه جمع زبرة (تبیان)

[3] لایشعرون ان ذٰلك استدراج لهم (جلالین) یعنی نعمت نیست بلکه استدراج است (فتح الرحمن)

[4] السکونی عن ابی عبدالله علیه السلام عن ابیه عن اٰبائه قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم ان الله تعالیٰ یقول: یحزن عبدی المؤمن اذا قترن علیه شیئا من الدنیا وذٰلك اقرب لدمنی ویفرح اذا بسطت له الدنیا وذٰلك ابعد لی عنی ثم تلا هٰذه الاٰیة۔ ثم قال: ان ذٰلك فتنة لهم (مجمع البیان)

وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ

وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿٦١﴾

”بلاشبہ وہ جو اپنے پروردگار کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو دیتے ہیں جو دینا ہوتا ہے اس عالم میں کہ ان کے دل ترسان ولرزاں ہوتے ہیں اس سے کہ انہیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ یہ لوگ نیکیوں میں تیزی کرتے ہیں اوران کے انجام دینے کے لئے آگے آگے رہتے ہیں“۔

ظاہر میں تصور ہوتا ہے کہ تیزی کرنے میں بھی سبقت مضمر ہے۔[1] تو دوسرے جملہ وھم لھا سابقون کا کیا مفاد ہے، مگر غور کیا جائے تو تیزی کرنے میں سبقت کی کوشش ہے اور وھم لھا سابقون میں اس کے نتیجہ کا اظہار ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ایک یہ بھی پہلو ہے کہ تیزی کرنا بجائے خود عمل کی نوعیت ہے اور سابقون دوسروں کے مقابلہ میں ان کا آگے رہنا ہے، ایک تفسیر یہ ہے کہ تیزی عمل میں ہے اور اس کے نتیجہ میں جو سبقت ہے وہ جنت کی طرف ہے۔[2]

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

”اور ہم کسی متنفس کو احکام نہیں دیتے مگر اس کے مقدور بھر اور ہمارے پاس ایک نوشتہ ہے جو حق ہی بات کہتا ہے اوران پر ظلم نہیں ہوتا“۔

یعنی اللہ ہر ایک کی طاقت کے پیمانہ سے واقف بھی ہے اور جس حد تک وہ مجبور ہے، اس پر مواخذہ ظلم ہے جس سے وہ بمقتضائے عدل بری بھی ہے لہٰذا ناممکن ہے کہ مقدور سے زیادہ کسی پر پابندی عائد کرے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں وہ عقل و ذہن کا تصور بھی داخل ہے جو جسمانی طور پر یا فقدانِ ذرائع واسباب سے ہو جس کی وجہ سے اس کے دماغ میں یا تو معارف حقہ کے سمجھنے کی صلاحیت بالکل ہی نہیں ہے یا کسی نہ کا کسی حد تک کم ہے لہٰذا خواہ وہ ظاہری طور پر منکرین میں داخل ہو یا عمر بھر شک وشبہ میں گرفتار رہے ہے، ہم چاہے اپنے قانون شرع کے تقاضوں کے مطابق اسے زمرۂ کفّار میں داخل کریں اور وہی سلوک کریں جو اس طبقہ کے ساتھ ہونا چاہیے لیکن اصل میں یہ خدا ہی جانے کہ کون واقعہ زیادہ مستحق سزائے خروی ہے اور کون کم مستحق ہے اور کون بالکل ہی مستحق سزا نہیں ہے، بہر حال اللہ کے پیمانۂ عدل کے تمام گمراہ جماعتوں کے افراد میں بھی مجازاۃ کے اعتبار سے فرق ہونا لازمی ہے۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِىْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ قف

---

[1] يجتهدون فى السبق اليها رغبة اليها (تبيان)

[2] هم من اجل تلك الخيرات سابقون الى الجنّة (تبيان)

إِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

''بلکہ اُن کے دل اس سے بے خبری کے عالم میں ہیں اور اس کے علاوہ اُن کے دوسرے کرتوت ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان کے دولت مندوں کو ہم عذاب کی گرفت میں لیتے ہیں تو وہ ایک دم چیخ اٹھتے ہیں، اب آج چیخو چلّاؤ نہیں، تمہیں ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ ارے میری آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم پچھلے پیروں پلٹ جاتے تھے غرور سے کام لیتے ہوئے قصّوں کہانیوں میں لگ کر چھوڑ دیتے تھے''۔

تَهْجُرُوْن کا ترجمہ ''چھوڑ دیتے تھے'' ایک تفسیر کے مطابق ہے، دوسری تفسیر کے اعتبار سے ترجمہ ہوتا ''بیہودہ بکواس کرتے ہو'' [1]

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿٧٠﴾

''کیا اُنہوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا اُن کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو اُن کے پہلے والے باپ داداؤں کے پاس نہیں آئی تھی؟ یا انہوں نے اپنے پیغمبر کو پہچانا نہیں ہے اس لئے وہ انکار کرتے ہیں؟ یا وہ کہتے ہیں کہ اس میں دیوانگی ہے؟ بلکہ وہ تو حق لے کر آیا ہے اور ان میں کے زیادہ تر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں''۔

یہ تردّد و تردید کا انداز اس حقیقت کے اظہار کے لئے ہے کہ یہ کلام ایسا دلائل حقانیت کا حامل ہے کہ کسی صاحب عقل کو اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے اور اس کے خلاف جتنے وجوہ انکار ہو سکتے ہیں، وہ سب بے جا اور غلط ہیں۔

''انہوں نے غور نہیں کیا تو کیوں''؟ وہ نئی چیز ہے؟ تو ایسا بھی نہیں۔ وہ اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانتے ہیں؟ یہ بھی غلط ہے۔ وہ چالیس سال ان کے درمیان زندگی گزار چکا۔ وہ دیوانہ ہے؟ ایسا بھی نہیں۔ اس نے تو انسان کو درس آگہی دے کر عقل کو جوہر عطا کیا ہے، آخر میں ان سب باتوں کے غلط ہونے کو ہدایتِ عقل کے حوالے کر کے اصلیت بتادی کہ یہ کتاب چونکہ حق پر مشتمل ہے اور ان میں اکثر حق کے دشمن ہیں، اس لئے وہ جان بوجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧١﴾

''اور اگر حق ان کی نفسانی خواہشوں اور ذاتی خیالات کا تابع ہو جائے تو آسمان اور زمین جو اُن کے اندر ہیں سب

---

[1] تهجرون الحق بالاعراض عنه و تُهجرون ای تفحشون فی المنطق (مجمع البیان)

تباہ و برباد ہوجائیں بلکہ ہم نے ان کے سامنے اُن کی نصیحت کا سبق پیش کیا ہے مگر وہ اپنے سبق سے روگردانی کرتے ہیں''۔

حق انسانی آراء اور خواہشات کا تابع نہیں ہوسکتا:

غور کیا جائے تو انسانی خواہشوں سے دنیا میں فساد تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس فساد کی لپیٹ میں آسمان بھی آجائے، یہ سمجھ میں نہیں آتا، لیکن جب ہم قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اھوآء کے لفظ کا استعمال دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے طبع زاد خیالات جو عقائد باطلہ کی شکل میں ہیں انہیں بھی قرآن مجید نے اھوآء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اسی لئے ہم نے اھوآء کے لفظ کے ترجمہ میں دو الفاظ صرف کئے ہیں ''نفسانی خواہشوں اور ذاتی خیالات''۔

اب اس میں جب تمام عقائد باطلہ آگئے جن کے ساتھ توحید اور عدل کسی کی کوئی حقیقت نہیں رہتی اور قرآن میں دوسری جگہ تعدد آلہہ کے لئے موجود ہے: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا[1] (انبیاء۔۲۲) اگر خدائے حقیقی کے علاوہ اور خدا ہوتے تو زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہوجاتا اور اس کے بعد حق کے تابع اھوآء ہونے کے بعد زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہوجانا بالکل عقل و منطق کے مطابق ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾

''اچھا! کیا آپ ان سے معاوضہ کے طلب گار ہیں؟ تو آپ کے پروردگار کی طرف کا معاوضہ زیادہ بہتر ہے اور وہ روزی عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور یقیناً آپ اُن کو سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں اور بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُس راستے سے منحرف ہیں''۔

''جیسے خالق عالم کو قرآن میں دوسری جگہ احسن الخالقین ''خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے'' اور یقیناً آپ اُن کو سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں اور بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُس راستے سے منحرف ہیں''۔

جیسے خالق عالم کو قرآن میں دوسری جگہ احسن الخالقین ''خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر'' کہا گیا ہے، ویسے ہی اس روزی رساں کو یہاں خیر الرّٰزقین ''روزی دینے والوں میں سب سے بہتر'' کہا گیا ہے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ اللہ کی دی ہوئی طاقت اور اس کے پیدا کیے ہوئے رزق سے کسی دوسرے کو خالق اور رازق کہنا یا سمجھنا بھی شرک نہیں ہے۔[2]

---

[1] سورۂ انبیاء۔۲۲

[2] فی ھذا دلالة علی ان فی العباد من یرزق غیرہ باذن اللہ (مجمع البیان)

"وہ اس راستے سے منحرف ہیں"، یعنی باطل ہیں، اس لئے کہ حق دو مختلف سمتوں میں نہیں ہوسکتا۔[1]

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٥﴾

"اور اگر ہم اپنی رحمت اُن کے شامل حال کرتے اور جس مصیبت میں وہ ہیں اُس کو دور کردیتے تو وہ اور زیادہ اپنی سرکشی میں اندھادھند سرگرم ہوتے"۔

کہا گیا ہے کہ جب رسول خدا ﷺ مبعوث ہو چکے تو مکّہ میں شدید قحط پڑا۔ اس وقت ابوسفیان وغیرہ نے رسول ﷺ کے پاس آ کے کہا کہ آپ تو اپنا خالق کائنات سے تعلق بتاتے ہیں تو پھر اس مصیبت کو ہم سے دور کیوں نہیں کراتے؟ اس پر آیت اتری۔

مطلب یہ ہے کہ مصیبت پڑنے پر تو عموماً خدا یاد آتا ہے مگر یہ ایسے ہیں کہ مصیبت پڑنے پر بھی اللہ سے لَو نہیں لگاتے بلکہ سرکشی پر قائم رہتے ہیں تو اگر مصیبت دور ہوجائے، تب تو اُن کے سرکشی میں اور اضافہ ہوجائے گا مگر یہ شان نزول کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتی، جب کہ یہ شان نزول ثابت نہیں ہے تو یہ عام خدا فراموش بندوں کا کردار ہوسکتا ہے اور ایک خیال یہ ہے کہ وہ آخرت سے متعلق ہے کہ وہاں انسان آرزو کرے گا کہ میں پھر دنیا میں واپس ہوں تو نیک اعمال کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آخرت کا عذاب ان سے ہٹ جائے اور وہ دنیا میں واپس ہوں تو پھر بھی وہ صحیح راستے کو اختیار نہیں کریں گے۔[2]

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾

"اور ہم نے اُنہیں سزا میں گرفتار کیا ہے، پھر بھی اُنہوں نے اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی نہ کی اور نہ وہ تضرّع وزاری سے کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ جب ہم سخت عذاب والا دروازہ کھول دیں گے تو اُنہیں ایک دم ناامید ہوجانا پڑے گا"۔

یعنی ابھی تو یہ عذاب استیصال نہیں ہے، صرف بیدار کرنے کے لئے ایک جھنجھوڑی ہے مگر اس پر ان کی آنکھ نہ کھلی تو پھر وہ عذاب آجائے گا جس کے بعد کوئی امید نجات ہو ہی نہیں سکتی۔[3]

وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٨﴾ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٨٠﴾

---

[1] لانّ طریق الاستقامة واحد وما نحالفه فکثیر (رازی)

[2] کما قال: ولو ردّوا لعادوا لما نہوا عنه (تبیان)

[3] الابلاس الیاس من کلّ خیر (رازی)

''اور وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے کان، نگاہیں اور دل پیدا کیے، تم بہت کم شکر گزار ہوتے ہو اور وہ وہ ہے جس نے تمہیں اطراف زمین میں پھیلا دیا اور اُس کی طرف تم سمت کر جاؤ گے اور وہ وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اور شب و روز کی آمد و رفت اُسی کی کارگزاری ہے تو پھر تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے''؟

ذرأکم کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''پھیلا دیا'' یہ اس لفظ کے ایک معنی کے لحاظ سے ہے [1] لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ ذرأ کے معنی خَلَق کے ہیں یعنی تم کو زمین میں پیدا کیا ہے [2] مگر میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ ذرأ کے معنی خَلَقَ کے ہوتے ہیں تو اس صورت میں من الارض ہوتا کہ اُس نے زمین میں تمہیں پھیلا دیا۔

اختلاف کا ترجمہ ''آمد و رفت'' بھی ایک معنی کے لحاظ سے ہے۔ [3]

دوسری تشریح یہ ہے کہ اس اختلاف کا وہی مفہوم جس کے لحاظ سے عام طور پر ہماری زبان میں اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے یعنی ایک دوسرے کے خلاف ہونا، بعض ترجمے اس کی طرف ناظر معلوم ہوتے ہیں۔ [4]

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾

''بلکہ اُنہوں نے کہی ایسی بات جیسی پہلے والوں نے کہی، اُنہوں نے کہا کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور متفرق ہڈیوں کی شکل میں ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ ہم سے بھی یہ وعدہ ہوا ہے اور ہمارے باپ داداؤں سے بھی اس سے پہلے، یہ نہیں ہیں مگر پہلے والوں کی من گڑھت باتیں''۔

''اُنہوں نے کہی ویسی ہی بات'' یعنی اس دور کے کافروں کے پاس کوئی بنیادا اعتراض اور کوئی نئی دلیل دعوت رسول کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہی باتیں ہیں جو ہر دور میں انبیاء کی دعوت کے خلاف کہی گئیں اور یہ اس کی دلیل ہے کہ تمام انبیاء کا پیغام ایک ہی رہا ہے:

اُن کا یہ کہنا کہ ہم سے یہ وعدہ ہوا ہے اور ہمارے باپ داداؤں سے یہ بھی اس کی دلیل ہے اور پہلے والوں کی سی باتیں کہنا بھی اس کا ثبوت ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾

---

[1] قال ابو مسلم: یحتمل بسطکم فیہا ذرّیّۃ بعضکم من بعض حتیٰ کثرتم (رازی)

[2] خلقکم واوجد کم (تبیان)

[3] کما یقال اذا اتی الرّجل الدار مرّۃ بعد مرّۃ ھو یختلف فی ھٰذہ آرار (تبیان)

[4] اس کے سبب سے رات اور دن کا ادلنا بدلنا ہے (مقبول ترجمہ)

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٨﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿٨٩﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٩٠﴾

''کہیے کہ کس کی ہے زمین اور جو اُس میں رہتے ہیں، اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی، پھر اس کے بعد بھی کیا تم نصیحت نہ مانو گے؟ کہیے کہ کون پروردگار ہے، ساتوں آسمانوں کا اور پروردگار ہے اُس بڑے تخت سلطنت کا؟ وہ کہیں کہ پھر بھی کیا تم پرہیزگار نہ بنو گے؟ کہیے کہ کس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز اقتدار اور وہ پناہ دینے والا ہے اور اُس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دی جاسکتی، اگر تم جانو؟ وہ کہیں گے اللہ کے ہاتھ میں، کہیے کہ پھر بھی تم طلسم باطل میں گرفتار رہو گے؟ بلکہ ہم حق ان کے سامنے لے آئیں ہیں اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں''۔

وحدانیّتِ رب کی دلیل جن مقدّمات پر مبنی ہے یعنی ان آثار قدرت کا مشاہدہ اور اُن کا اللہ کے ساتھ مخصوص ہونا، وہ سب مشرکین کے لئے بھی مسلم ہیں یعنی آثارِ قدرت کو وہ اپنے اصنام سے وابستہ کرنے کا کوئی تو ہم بھی نہیں رکھتے اور یقینی طور پر سمجھتے ہیں کہ کائنات میں کارگزاری صرف اللہ کی ہے مگر جب نتیجہ کی منزل آتی ہے تو وہ بھٹک جاتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر معبود دوسروں کو بنا لیتے اور اُن کی پرستش کرنے لگتے ہیں، اس فکر وعمل کے تضاد کو قرآن مجید نے یہاں ان الفاظ میں اور بعض دوسرے مقامات پر انہی سے ملتے جلتے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے اور ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

چونکہ اس کے پہلے حشر ونشر کے بارے میں اُن کے متعجّبانہ سوال کا جو درحقیقت انکار کی حیثیت رکھتا تھا ذکر ہے، اس لئے علامہ طبرسی علیہ الرحمۃ نے اسے اُسی حشر ونشر پر ان کے سوال کا جواب قرار دیا ہے کہ جو ان سب باتوں پر قادر ہے، وہ مردوں کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہے [1] لیکن چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہوئی ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ آیات مقام تنزیل میں بھی قبل والی آیات کے بعد ہی اتری ہیں تاکہ اُن سے یہ نتیجہ برآمد کیا جائے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٩١﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٩٢﴾

''اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا ہے اور نہ اُس کے ساتھ کوئی خدا ہے، اس وقت تو ہر خدا اپنے مخلوقات کو اپنی طرف جاتا اور اُن میں ایک کا دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا، پاک ہے خدا اُس سے جو وہ اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان دیکھے اور دیکھے سب کا جاننے والا تو وہ بالاتر ہے اُس سے جو یہ شرک کرتے ہیں''۔

---

[1] من قدر عليه قدر علىٰ احيآء الموتىٰ لانّه ليس ذٰلك باعظم منه (مجمع البيان)۔

اثباتِ توحید میں برہانِ تمانع کی زیادہ واضح تقریر:

علم کلام میں جو''برہان تمانع'' کہا جاتا ہے جسے بہت آسان لفظوں میں بچوں کو سمجھانے کی یوں کوشش کی جاتی ہے کہ''اگر کئی خدا ہوتے تو اُن میں آپس میں جھگڑا ہوتا۔ایک خدا کچھ کہتا تو دوسرا خدا کچھ کہتا تو کوئی چیز پیدا نہ ہوسکتی۔اس''برہان'' کا اصل ماخذ قرآن مجید کی یہ آیت قرار دی جاتی ہے کہ:

لو کان فیھما اٰلھة الّا اللہ لفسدتا۔(انبیاء۔۲۲)

اگر ان دونوں (زمین وآسمان) میں ایک اللہ کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں درہم برہم ہوجاتے۔

مگر میرے خیال میں اُس سے زیادہ صاف یہ مضمون اس آیت میں ہے، وہاں پھر الگ سے یہ سوچنے سمجھنے کی بات رہ جاتی ہے کہ کئی خداؤں کے ہونے سے وہ دونوں (زمین وآسمان) درہم برہم کیوں ہوجاتے؟ مگر یہاں یہ وجہ صاف خود الفاظ قرآنی میں بتائی جارہی ہے کہ''ہر خدا اپنی مخلوقات کو اپنی طرف لے جاتا، یعنی اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا اور ہر ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا''یعنی اپنے ہی قائم کردہ نظام کو کامیاب بنانا چاہتا تو کائنات کا پورا نظام جو اس وقت ایک واحد کی شکل میں نظر آرہا ہے، افراتفری کی نذر ہوجاتا۔کائنات کے اندر باوجود اُس کی کثرت کے نظام کی وحدت کا ہونا منتظم کے واحد ہونے کے قطعی دلیل ہے۔

اس کی کافی تشریح ہماری قدیم تفسیر میں جو زیادہ تر اقوال معصومین علیہم السلام پر مبنی ہے یعنی تفسیر علی بن ابراہیم میں جسے تفسیر قمی بھی کہتے ہیں، موجود ہے اور علامہ طبرسیؒ نے بھی فلسفی انداز میں اُس کی وضاحت کی ہے اور اُسے مثل اُس دوسری آیت کے برہان تمانع کا ماخذ قرار دیا ہے۔[1]

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿٩٥﴾

''کہیے کہ اے میرے پروردگار! اگر میری آنکھوں سے مجھے دکھلا دے وہ موقع جس سے انہیں ڈرایا جارہا ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے ظالم جماعت میں شامل نہ کرنا اور بلاشبہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جو انہیں اطلاع دے رہے ہیں، اُسے آپ ہی کی آنکھوں کے سامنے لے آئیں''۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے یہ دعا کرانا اُس عذاب کی ہولناکی کا اظہار ہے کہ وہ جنہیں اُس عذاب کی خبر دی جارہی ہے، وہ ڈریں یا نہ ڈریں لیکن وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حقیقت میں بے گناہ ہے، اُس عذاب سے ڈر رہا ہے اور اپنے بچے رہنے کی دعا کرتا ہے[2] حالانکہ یہ یقینی ہے کہ وہ عذاب جب بھی آئے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔[3]

پھر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس مکان کا اظہار کہ اگر میرے سامنے یہ عذاب آجائے اور خالق کی طرف سے اپنی قدرت کا اظہار کہ

---

[1] ھو مثل قولہ: لو کان فیھما اٰلھة الّا اللہ لفسدتا (مجمع البیان)

[2] ای لا تجعلنی فی جملة من یشملھم العذاب لظلمھم (تبیان)

[3] فی ھذہ دلالة علیٰ جواز ان یدعو الانسان ما یعلم ان اللہ یفعلہ لا محالة...وذٰلک الاظھار الرّغبة الی اللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

ہاں ہوتو سکتا ہے کہ ہم آپ کے سامنے ہی اُسے لے آئیں، ان کو جواصل میں مستحق عذاب ہیں ایک تنبیہ ہے کہ اس عذاب کو دور نہیں سمجھنا چاہیے لیکن جو بات اللہ کی قدرت میں ہو وہ ضروری نہیں کہ وقوع میں بھی آجائے، اس لئے دوسری جگہ خود پیغمبر ﷺ سے خالق کریم نے یہ ضمانت کر لی ہے کہ:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (انفال۔۳۳)

اللہ ایسا نہیں ہے کہ انہیں عذاب کرے درانحالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔

یعنی وہ تو قدرت کا اظہار تھا کہ وہ چاہے تو عذاب آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی نازل کر دے مگر اللہ آپ کو اطمینان دلائے دیتا ہے کہ ایسا ہونے والا نہیں ہے کہ آپ کی موجودگی میں اُن پر عذاب آجائے۔

یہ بھی ایک بڑی وہ خصوصیت ہے جو ہمارے پیغمبر ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے عملی نتیجہ کے طور پر خالق کی طرف سے آپ کو حاصل ہے، اُمم سابقہ میں برابر اُن انبیاء کی آنکھوں کے سامنے اُن کی امتوں پر عذاب آتا رہا مگر ہمارے رسول ﷺ کا وجود تمام کفار کے لئے نزول عذاب سے مانع ہو گیا اور اب بھی عذاب نہیں آرہا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ ان کا ایسا نائب خلق میں موجود ہے جس کی بدولت یہ نظام قائم و برقرار ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

"برائی کو ختم کیجئے ایسے طرزِ عمل سے جو بہتر سے بہتر ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو جو وہ کہتے ہیں اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے شیطانوں کے وسوسوں سے اور پناہ مانگتا ہوں تجھ سے اے میرے پروردگار! اس سے کہ وہ میرے قریب آئیں"۔

برائی کے مقابلہ میں بھلائی کرنے کی تعلیم:

پہلی آیت صحیح حدود میں "مفاومت مجہول" اور مخالفین اسلام کے مقابل میں بمناسبت حکمت و مصلحت "رواداری" کی تعلیم ہے، جیسا کہ جناب شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:

اذا ذکرو المنکر من القول ...... الشرک ...... ذکرت الحجة فی مقابلته و ذکرت الموعظة الّتی تصرف عنه الیٰ ضدّة من الحق علیٰ وجه اللطّف و الدّعاء الیه والحث علیه (تبیان)

جب وہ بری باتیں شرک آمیز کہیں تو آپ اُن کے مقابلہ میں دلیل بیان کریں اور اس طرح کا وعظ و نصیحت پیش کریں جو انہیں اُس سے پلٹا سکے اُس کے مخالف پہلو کی طرف جو حق ہے رواداری کے ساتھ اور دعوت دینے کے طور پر اور ترغیب و تحریص کی صورت میں اس کے ساتھ یہ ارشاد کہ "ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ تو تبلیغ حق کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر نرمی ہی برتیے، اُن کی سخت کلامی یا دشنام طرازی یا باطل پروری سے ہم خوب واقف ہیں اور وقت آنے پر ہم اُس کی سزا دیں گے۔[۱]

[۱] نحن اعلم بما یستخفّون به من الجزاء فی الوقت الّذی یصلح الاخذ بالعقوبة (تبیان)

بعد کی دو آیات اگر مقام تنزیل میں بھی پہلی آیت سے متصل ہیں تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جذبہ انتظام پیدا کرنا اور سخت کلامی کے جواب میں جوش دلانا کہ تم اُس سے زیادہ سخت کلامی سے کام لو، یہ سب شیطان کی تحریکیں ہوتی ہیں، اُس سے پناہ مانگنا چاہیے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾

''یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی ایک کے سر پر موت آ کھڑی ہو تو وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے پلٹا دو، شاید میں اب نیک اعمال کروں اُس میں کہ جو میں چھوڑ آیا ہوں، ہرگز نہیں۔ یہ ایک لفظ ہے جو وہ بس کہہ رہا ہے اور اُن کے آگے اب برزخ کا زمانہ ہے اُس دن تک کہ جب وہ جزا وسزا کے لئے اٹھائے جائیں گے''۔

''یہ ایک لفظ ہے جسے وہ کہہ رہا ہے'' یعنی اس سے کوئی فائدہ نہیں یا اس کی کوئی اہلیت نہیں[1] اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ کافر کا قول ہے: رب ارجعون اس میں خطاب پروردگار سے ہے اور پھر جمع کا صیغہ ''تم لوگ مجھے پلٹا دو''۔ اس کے لئے بعض ہندوستانی مذاق کے اہل قلم نے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ جمع بطور تعظیم ہے[2] مگر یہ ہماری اُردو میں ہوتا کہ تعظیماً ''تم'' اور ''آپ'' کہیں مثلاً دام ظلّك کے بجائے کسی بزرگ کو دام ظلّکم کہیں، جدید عربی میں بھی کسی حد تک اس کا رواج ہو چلا ہے مگر عربی قدیم میں جو قرآن کی زبان ہے، ایسا نہیں ہوتا ہے انبیائے کرام کے تخاطب بارگاہ الٰہی میں قرآن میں موجود ہیں، ہر جگہ واحد کا صیغہ ہے مثلاً رب اغفرلی، ھب لی، اٰتنا وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی بھی ہے: ربّ زدنی علما... والحقنی بالصّالحین۔ حالانکہ خالق کی عظمت کے تقاضے انبیاء سے زیادہ کس کے پیش نظر ہوں گے؟ اس لئے اس اختلاف اسلوب کا ایک لطیف پہلو بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ کافر نے گھبرا کر خدا کو پکارا: رب جیسے ہم کہیں ''اے اللہ'' اور پھر ملائکہ سے خطاب کر کے کہا: ارجعون ''مجھے واپس کر دو دنیا کی طرف''[3]

اس آیت کے مضمون سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے جو احادیث سے بھی ثابت ہے کہ موت کے ساتھ ہی انسان کو اپنے اچھے اور برے انجام کا پتہ چل جاتا ہے۔[4]

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَاۗءَلُوْنَ ﴿١٠١﴾

''تو جب صور پھونکا جائے گا تو اُن کے درمیان کوئی خونی رشتے نہیں ہوں گے اُس دن اور نہ آپس میں اُن میں پوچھ گچھ ہوگی''۔

یعنی کوئی کسی کا خبر گیر نہ ہوگا، نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ ''نہ اُن میں آپس میں کچھ پوچھ ہوگی''۔ یہ اُس آیت کے خلاف نہیں ہے کہ:

---

[1] کلام یقوله ولا فائدة فی ذلك وقیل معناه یقولها بلسانه ولیس لها حقیقة (مجمع البیان)

[2] ربّ ارجعون، اس میں واؤ جمع کا نہیں ہے بلکہ تعظیم کا ہے (مولانا مقبول احمد صاحب)

[3] استغاثو اولا بالله ثمّ رجعوا الی مسئلة الملائکة (مجمع البیان)

[4] فی الاٰیة دلالة علیٰ انّ احدا لا یموت حتّیٰ یعرف اضطرار منزلة عندالله وانّه من اهل الثواب او العقاب (تبیان)

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ(صافات۔۲۷) (طور۔۲۵)

اورایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوگا آپس میں پوچھ گچھ کرتا ہوا۔

اس لئے کہ دونوں دومختلف وقتوں کے تذکرے ہیں،صور کی قیامت خیز آواز ایک دم آئے گی تو لوگ دہشت زدہ، ششدر اور حیران ایسے ہوں گے کہ کوئی دوسرے سے پوچھ گچھ نہیں کرسکے گا، پھر جب اپنے آپے میں آئیں گے اور اب ایک طویل المیعاد دور سے گزر رہے ہوں گے جو آخری انجام کے سامنے آنے تک ہے تو اب ایک دوسرے سے گفتگو بھی ہوگی اور سوال وجواب بھی جس کا متعدد موقعوں پر قرآن مجید میں ذکر ہے۔[1]

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝۱۰۲ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ
فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ۝۱۰۳ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ
وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ۝۱۰۴ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝۱۰۵
قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ۝۱۰۶ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا
فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۝۱۰۷ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۝۱۰۸ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ
عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ۝۱۰۹
فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ۝۱۱۰ اِنِّيْ
جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۝۱۱۱

”تو جس کے نیک کاموں کا پلہ بھاری ہوگا تو یہ لوگ ہر طرح کی بہتری حاصل کرنے والے ہوں گے اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا تو یہ وہ ہیں جنھوں نے اپنے کو گھاٹے میں مبتلا کیا ہے، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، آگ ان کے چہروں کو جھلسا رہی ہوگی اور ان کی شکلیں اس میں بگڑ گئی ہونگی کیا ایسا نہیں ہے کہ میری آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو تم انہیں جھٹلاتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری کم بختی غالب آگئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو یہاں سے نکال دے، پھر اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم سراسر ظالم ہوں گے، ارشاد ہوا کہ اب چپکے اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے کوئی بات نہ کرو، بلاشبہ میرے بندوں میں سے جو کچھ کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے تو تو ہمیں بخش دے اور رحمت ہمارے شامل حال فرما۔ اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے، اس پر تم ان کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں تک کہ اُنہوں نے تمھیں میری یاد دلانا چھوڑ دی اور تم ان پر ہنستے تھے، بے شک میں نے اب آج اُن کو صلہ عطا کیا ہے اُن کی صبر و برداشت کا یقیناً وہی

[1] المقیامة احوال ومواطن......وھٰذا معنی قول ابن عباس لما سئل عن الآیتین فقال: ھٰذا تارات یوم القیامة (مجمع البیان)

کامیاب ہیں"۔

انسو کم ذکری کا ایک مفہوم وہی ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ "انہوں نے تمہیں میری یاد دلانا چھوڑ دی" اور ایک یہ مفہوم ہے کہ ان کو بنانے اور مذاق اُڑانے کی دُھن نے تمہیں میری یاد سے بالکل غافل کردیا۔[1]

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

"اس نے کہا کہ تم لوگ زمین میں کتنے برس رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا دو دن کے کچھ حصہ میں رہے تو جو گننے والے ہوں ان سے پوچھ لے۔ ارشاد ہوا کہ نہیں رہے تم مگر بہت کم اگر تم جانتے۔ تو کیا تم سمجھے تھے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے"؟

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ دور کائنات میں وقفۂ حیات عنصری انسان کا کتنا مختصر ہے، پھر بھی وہ اسے اہمیت دیتا ہے اور آخرت کے دورِ حیات ابدی کی فکر نہیں کرتا۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

"تو بلند ہے اللہ جو حقیقی سلطنت کا مالک ہے، کوئی خدا نہیں سوا اس کے، وہ جو بزرگ مرتبہ عرش کا مالک ہے اور جو اللہ کے سوا کسی خدا کی دہائی دے جس کے لئے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو اُس کا حساب کتاب بس اُس کے پروردگار کے یہاں ہوگا، بلاشبہ کفر اختیار کرنے والے دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! بخش دے اور رحم فرما اور تو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے"۔

اس سورہ کے آغاز و انجام میں مناسبت قابل لحاظ ہے کہ آغاز سورہ کا تھا قد افلح المؤمنون سے اور انتہا تقریباً ہو رہی ہے لایفلح الکافرون پر اس طرح مثبت اور منفی دونوں پہلو سامنے لاکر گویا موضوع کلام کو مکمل کیا گیا لیکن حسن اختتام کے لئے آخر میں پھر اہل ایمان کو دعائے مغفرت و رحمت کی تلقین کے لئے ایک آیت کا اضافہ کردیا گیا ہے۔

---

[1] معناه لتشاغلكم بالسخرية نسيتم ذكرى (تبیان)

سُوْرَةُ النُّوْرِ

مدنیہ...... ٦٤......آیات

چونکہ بعض احادیث میں خواتین کو سورۂ نور کی خاص طور پر تعلیم دینے کا حکم ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورہ شروع سے اسی نام سے موسوم ہے، اگر چہ وہ آیت جسے آیۂ نور کہتے ہیں: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ... الخ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے درمیان میں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حیثیت اس سورہ میں اسی آیت کو دی گئی ہے جس کی بناء پر اس سورہ کا نام "سورۂ نور" ہو گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین اس سورہ میں حسب ذیل ہیں۔

سورۂ نور کے خاص خاص مضامین:

۱............جنسی گناہ (زنا) کی حد شرعی

۲............تہمت زنا عائد کرنے والے کی حد شرعی۔

۳............ثبوت کے لئے چار گواہان عادل کی شہادت عینی کی ضرورت ورنہ تہمت عائد کرنے والے پر حد شرعی جاری ہوگی۔

۴............لعان یعنی شوہر کی طرف سے اپنی زوجہ پر الزام زنا لگانے کی صورت میں شرعی قانون۔

۵............ازواج رسول ﷺ میں سے ایک پر اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمّت۔

٦............ایسی غلط خبر سُن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی شدید مذمّت۔

۷............گھروں میں بلا اجازت داخلہ کی ممانعت۔

۸............سلام کا حکم

۹............اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت۔

۱۰............خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت

۱۱............نکاح کی ترغیب

۱۲............غلام وکنیز کے مکاتبہ کا حکم

۱۳............عبادت الٰہی کے لحاظ کے ساتھ تجارت کا حکم

۱۴............کافروں کے اعمال کا بے کار ہونا۔

۱۵............ہر ذی روح کی خلقت پانی سے۔

۱٦............صاحب ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ۔

۱۷............گھر کے خاص افراد یہاں تک کے بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ۔

۱۸............ضعیف العمر خواتین کے برقع، چھوڑنے کی اجازت کے باوجود پردہ داری کی ضرورت۔

۱۹............صاحبان ایمان کی شان۔

۲۰............رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے امتیازی طور پر تعظیم واحترام کا حکم............وغیرہ وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ①

''یہ ایک سورہ ہے جسے ہم اُتار رہے ہیں اور ان احکام کو نافذ کر رہے ہیں اور ہم اس میں کھلی ہوئی آیات اتار رہے ہیں کہ شاید تم نصیحت قبول کرو''۔

آیات کے ایک مجموعہ کے لئے ''سورۃ'' اور سورہ کے اجزاء کے لئے ''آیات'' کی اصطلاح جو مسلمانوں میں ہے، اس کا سب سے زیادہ واضح ماخذ اس سورہ کا آغاز ہوسکتا ہے اس لئے عموماً ترجمہ انزلنا اور فرضنا اور پھر انزلنا کا جو سب ماضی کے صیغے ہیں، لوگ زمانۂ گزشتہ ہی کے ساتھ کرتے ہیں[1] مگر ہم نے حال کے ساتھ کیا ہے، اس لئے کہ ہمارے خیال میں یہ ویسا ہے جیسے عقود میں نکاح کے انکحت اور قبلت اور خرید وفروخت کے لئے بعت اور اشتریت سب ماضی کے صیغے ہوتے ہیں مگر مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ اسی وقت ان الفاظ سے یہ نکاح یا بیع واقع کیا جارہا ہے یہی حیثیت ان الفاظ سے اس تنزیل اور فرض کے عمل کا آغاز ہورہا ہے جس کا اعلان کیا جارہا ہے بے شک جہاں تک میری نظر ہے مفسرین نے اس پہلو سے تعرض نہیں کیا ہے۔

اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ②

''زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تمہیں اُن پر اللہ کی اطاعت میں ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان دونوں کی سزا کے موقع پر مومنین میں سے ایک جماعت کو موجود ہونا چاہیے''۔

جنسی گناہ (زنا) کی حدِ شرعی:

یہ ''زنائے غیر محصنہ'' یعنی غیر شوہر دار عورت اور غیر صاحب زوجہ مرد کی سزا ہے۔ یہ مجرم کی سزا ہے اصلاح خلق کے لئے ضروری ہے، اس میں جذبات کو دخل دینا درست نہیں ہے، ''رحم دلی'' جو فرائض میں سدّ راہ ہو اچھی چیز نہیں ہے۔

---

[1] یہ ایک سورہ جس کو ہم نے نازل کیا، جس کو ہم نے فرض گردانا، اس میں کھلے کھلے اصول نازل کیے (مقبول ترجمہ)

بے شک وہ منظر بڑا دردناک ہوتا ہے جب ایک شخص پر کوڑے پڑ رہے ہوں، ایک جاندار جسم تکلیف سے مضطرب ہو ہو کر بے تاب ہو رہا ہے، تلوار سے گردن اُڑا دیا جانا شاید آسان ہے، نسبت اس طریقہ قتل کے جو اس تدریجی عذاب کے ساتھ ہے اور اس سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اسلام نے اس جنسی ظلم کو جو عزت ناموس پر ڈاکہ ڈال کر ہوتا ہے، قتلِ نفس سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

اب کوئی یہاں رحم دلی کا مظاہرہ کرے کہ یہ تڑپ ایک آدمی کی ہم سے دیکھی نہیں جا سکتی لہٰذا ہم اس سزا کو ختم کرا دیں، یا کم از کم اس موقع سے ٹل جائیں، اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں تو رحمٰن ورحیم خالق اس رحم وکرم کو پسند نہیں کرتا اور اس کے برخلاف ارشاد ہو رہا ہے کہ تمہیں اس موقع پر موجود ہونا چاہیے،

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ③

''زنا کار مرد نہیں نکاح کرے گا سوا زنا کار یا مشرک عورت کے اور زنا کار عورت نہیں نکاح کرے گا اس سے سوا زنا کار یا مشرک کے اور ایمان والوں پر یہ چیز حرام قرار دی گئی ہے''۔

ایک قول تو تفسیر میں موجود ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے[1] اس صورت میں فقہ کے احکام پر اُس کے منطبق ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ورنہ اس آیت کی روشنی میں اگر علمائے اسلام کے فقہی نظریات پر غور کیا جائے تو سخت دشواری محسوس ہوگی، اس لئے کہ زانی اور زانیہ جن کی سزا بیان ہوئی ہے، غیر مسلم جماعت میں کے تو ہیں نہیں، ہیں تو وہ مسلمانوں ہی میں سے اور اس جرم کے بعد وہ بس فاسق ہی ہوں گے۔ کافر تو ہو نہیں جائیں گے اور ظاہر ہے کہ کسی مسلمان مرد سے مشترک عورت کا یا مسلمان عورت سے مشرک مرد کا نکاح نہیں ہو سکتا، پھر یہ کیوں کر کہا جا رہا ہے کہ زانی کا نکاح زانیہ یا مشرکہ سے ہوگا اور زانیہ سے بس زانی یا مشرک نکاح کرے گا؟

ثبوتِ زنا کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت، عدم ثبوت پر الزام لگانے والوں پر حد شرعی کا اجراء:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ④ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤

''اور وہ جو پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر اس پر چار گواہ پیش کریں تو نہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور اُن کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور یہ لوگ فاسق ہیں، سوا اُن کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو بلا شبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

[1] قال سعيد بن المسيّب كان ذٰلك حكم كلّ زان وزانية ثمّ نسخ (تبيان)

ایک خیال یہ ہے کہ یہاں سے وہ سلسلۂ آیات کا ہے جو بروایت مشہور امّ المومنین عائشہ کی پاک دامانی کے خلاف الزام لگائے جانے پر نازل ہوا، حالانکہ موجود ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد بلا فاصلہ ایسے احکام درج ہیں جن کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، بہرصورت اگر یہیں سے وہ سلسلہ مانا جائے، تب بھی شانِ نزول کی تخصیص کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ جو احکام شرعیہ اس ذیل میں بیان ہوئے ہیں، وہ خاص محل سے متعلق ہو جائیں بلکہ اُن احکام کی نوعیت عام قوانین الٰہیہ کی ہوتی ہے جو زمان و مکان کے قیود سے بری ہوتے ہیں۔[1]

کوڑوں میں ایک قول یہ ہے کہ وہ ننگی پیٹھ پر لگیں گے لیکن ہمارے یہاں کی میں یہ ہے کہ وہ کپڑوں کے اوپر سے لگیں۔[2]

آخر میں جو استثناء ہے اس کا ظاہر یہی ہے کہ وہ صدقِ دل سے توبہ کر لیں تو اب وہ فاسق بھی نہیں کہلائیں گے اور اُن کی گواہی بھی قابل قبول ہو جائے گی یہی بہت سے فقہائے جمہور کے علاوہ ہمارے آئمہ طاہرین علیہم السلام کا بھی ارشاد ہے۔[3]

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٦ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٧ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٨ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٩

"اور جو اپنی بیویوں پر زنا کاری کا الزام لگائیں اور اُن کے پاس خود اُن کے سوا کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے کسی ایک گواہی معتبر یوں ہوگی کہ وہ اللہ کی قسم چار دفعہ کھا کر کہے وہ یقیناً سچوں میں ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہ اللہ کی لعنت اُس پر اگر وہ جھوٹا ہو اور عورت سے حد شرعی ختم کر دے گی یہ صورت کہ وہ چار دفعہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ (مرد) یقیناً جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہ اللہ کا غضب ہو اس (عورت) پر اگر وہ (مرد) سچوں میں سے ہو"۔

لعان کی صورت اور اُس کی ترکیب:

یہ وہی چیز ہے جسے فقہ ''لِعَان'' کہتے ہیں، اس کے قرآن مجید سے جتنے احکام معلوم ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:

(ا) مرد محکمۂ عدالت شرعی میں استغاثہ دائر کرتا ہے کہ اس کی عورت زنا کی مرتکب ہوئی ہے اس پر اس سے گواہ طلب کیے جائیں گے،

---

[1] قال سعيد بن جبير هٰذه الأية نزلت فی عائشة وقال الضحاك فی نسآء المؤمنين وهوا الاولیٰ لانّه اعم فائدة وان كان يجوز ان يكون سبب نزولها فی عائشة فلا تقصر الاية علیٰ سببها (تبيان)

[2] عليه ثيابه وهو قول ابی جعفر علیہ السلام (تبيان)

[3] قول ابی جعفر و علیہ السلام وابی عبدالله (مجمع البيان)

وہی چار جو جرم زنا کے ثبوت کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ کہے کہ میں خود شاہد عینی ہوں اور گواہ میرے پاس نہیں ہیں تو اس سے کہا جائے گا کہ تم اس طرح قسم کھاؤ جس کا ذکر قرآن مجید میں بالتفصیل موجود ہے۔

(۲) اگر عورت اس قسم کے بعد خاموش رہے اور کوئی اپنی صفائی پیش نہ کر سکے تو جرم ثابت ہو جائے گا اور حد شرعی جاری ہوگی۔

(۳) لیکن اگر عورت ارتکاب جرم سے انکار کرے تو پھر اُس سے اس طرح قسم لی جائے جو صراحۃً متن قرآن میں درج ہے اب اُس پر حد شرعی جاری نہ ہو سکے گی مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ قرآن سے ظاہر نہیں ہوتا، جو فقہ کا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ اب وہ عورت اس مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی، ان دونوں میں افتراق ہو جائے گا اور لعان کے وقت سے عدّہ کے دن گزار کر پھر وہ دوسرے جس مرد سے چاہے عقد کر سکے گی۔[۱]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰

”اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ کا لطف و کرم اور اس کی مہربانی اور یہ کہ اللہ ہے توبہ قبول کرنے والا صحیح کام کرنے والا“۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اسے سننے والے کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، مختصر سمجھ لیجئے کہ بس غضب ہو جاتا تم ہلاکت ابدی میں گرفتار ہو جاتے، دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ۔[۲]

پھر یہ لطف و کرم گزشتہ احکام سے بھی متعلق ہو سکتا ہے کہ زنا کاری کا حرام قرار دینا اور اس پر اتنی سخت سزا مقرر کرنا اور پھر اُس کا غلط الزام لگانے پر بھی ایسی ہی شدید سزا کا اعلان، یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے جو نہ ہوتا تو تمام جامعہ بشری جنسی بے راہ روی کی اس تباہی و ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا جس کا مشاہدہ آج بھی اپنی آنکھوں سے ان قوموں میں کیا جا سکتا ہے جہاں یہ احکام نہیں ہیں۔[۳]

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۱

”بلا شبہ وہ لوگ جنہوں نے بدکاری کی جھوٹی تہمت لگائی، وہ تم ہی میں سے ایک جماعت ہے، اسے تم لوگ اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے، ہر آدمی کے لئے ان میں سے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کیا اور جو اُس کے بڑے حصّہ کا ذمہ دار ہے اُن میں سے، اس کے لئے بہت بڑی سزا ہے“۔

---

[۱] لا تحلّ له ابدا و كان عليها العدّة من وقت لعانها (مجمع البيان)

[۲] لولا فضل الله عليكم و رحمة لفضحكم بما تر كبون من الفاحشة و اما جلكم بالعقوبة و اهلكتم و ما يجرى مجراه (تبيان)

[۳] جواب لولا محذوف و تقديره لولا فضل الله عليكم بالنّهى عليكم بالنّهى عن الزنا و الفواحش و اقامة الاحدود لتهالك لناس ولفد النسل و انقطع الانساب (مجمع البيان)

واقعہ ''افک'' اور اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمّت:

یہاں سے سلسلہ شروع ہوتا ہے ان آیات کا جو امہات المومنین یعنی ازدواج رسول ﷺ میں سے کسی خاتون کی پاک دامانی کے خلاف تہمت لگائے جانے کے واقعہ سے متعلق ہے۔

جمہور کی روایت یہ ہے کہ وہ خاتون جناب عائشہؓ تھیں اور یہ آیات انہی کی نسبت واقعہ افک سے متعلق ہیں مگر ایک شیعہ تفسیر جس کی تائید میں معصوم علیہ السلام سے روایت بھی ہے یہ ہے کہ ان آیات کا تعلق جناب ماریہؓ قبطیہ سے ہے اور الزام لگانے والی شخصیت جناب عائشہؓ کی تھی [1] پھر بھی زیادہ تر شیعہ مفسرین اس بارے میں جمہور ہی کے ہم آواز ہیں اور اس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی میں جناب عائشہؓ رفع حاجت کے لئے اونٹ سے اتری تھیں، وہاں اُن کے گلے کا ہار گر گیا جس کی تلاش میں ذرا دیر لگی، قافلہ والوں کو اس کی خبر نہ تھی، قافلہ روانہ ہو گیا، اب جو وہ ہار لے کر واپس آئیں تو قافلہ جا چکا تھا، اتفاق سے صفوانؓ بن معطل سلمی ایک صحابی بھی پیچھے رہ گئے تھے، انہوں نے جناب عائشہؓ کو حیران و پریشان دیکھا تو انہیں اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور جب کہ قافلہ دوپہر کے آرام کے لئے ایک منزل پر ٹھہرا تھا، وہ جناب معظّمہ کو لے کر وہاں پہنچ گئے، یہ قصّہ محدث زہری نے خود جناب عائشہؓ کی زبانی بیان کیا ہے جسے جناب شیخ الطائفہؒ نے بھی تبیان میں درج کیا ہے اور اس سب کو علامہ طبرسیؒ نے بھی مجمع البیان میں دہرایا ہے۔

اس روئداد کی بنا پر منافقین نے تہمت کا پہاڑ کھڑا کر دیا مگر یہ منافقین فقط عبداللہ بن ابی وغیرہ تھوڑی تھے، ان میں ایسے صحابہ بھی تھے جو جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے جیسے مسطح بن اثاثہ اور ان میں جناب حسان بن ثابت بھی ہیں۔ یہ سب افراد وہ ہیں جنہیں قرآن مجید۔ عذاب عظیم کا مستوجب بتا رہا ہے۔

اب یہ دو روایتیں موجود ضرور ہیں مگر انصاف کا فیصلہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بہت بڑا جرم ہے جسے متنبہ کیا جا رہا ہے اور یہ اسی مشہور روایت پر منطبق ہے نہ کہ کسی گھریلو واقعہ پر جس میں ایک بیوی نے دوسری بیوی پر الزام لگایا ہو۔

اس لئے اس محل پر ہم تفسیر قمی کی روایت کو جسے انہوں نے تمام فرقۂ شیعوں کی طرف منسوب کیا ہے اور حدیث معصوم علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے قبول کرنے سے قاصر ہیں۔

لَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡهُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِهِمۡ خَيۡرًا ۙ وَّقَالُوۡا هٰذَاۤ اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۲﴾

''کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم لوگوں نے اسے سنا تو باایمان مرد اور باایمان عورتیں اپنوں کی نسبت اچھا ہی گمان رکھتے اور کہتے کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے''۔

---

[1] ان العامة رووا انّها نزلت فی عائشه ......واما الخاصة فانّهم رو وا انّها نزلت فی مارية لقبطية وما رمتهابه عائشه (علی بن ابراهیم)

ایسی خبر کوسُن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی سرزنش:

یہ حکم کسی شخصی خصوصیت کا حامل نہیں ہے بلکہ ایک عام اصول ہے یعنی عوام کا رجحان تو یہ ہے کہ چاہے نیکی کے کتنے ہی مشاہدے کسی سے ہو چکے ہوں مگر ایک بدکاری کی خبر اگر اڑتی ہوئی کسی کے متعلق سُنی تو بس اس کے چرچے کرنے لگے، ایسے وثوق کے انداز میں جیسے کہ وہ مشاہدہ ہے قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کسی کی نیکی پر اپنے اعتماد کو مضبوط رکھنا چاہیے اور اُس اعتماد کی بنا پر ایسی خبروں کو جھٹلانا چاہیے جو اُس کی نیکی کو مجروح بناتی ہیں۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾

''کیوں نہیں لائے وہ اس پر چار گواہ اب جب گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں''۔

گواہوں کے نہ لانے پر جو جھوٹے ہونے کا اعلان ہے، وہ کسی واقعیت کا اظہار نہیں ہے اور عنداللہ کے معنی علم الٰہی کے نہیں ہے، وہ اس لئے کہ گواہ کا نہ لاسکنا اس دعوے کے واقعی غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتا اور علم الٰہی کسی گواہی سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ حکماً جھوٹا ہونا ہے اور عنداللہ کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی کے لحاظ سے وہ جھوٹے ہیں یعنی جو جھوٹے الزام لگانے کی سزا ہے، اُس کے یہ مستحق ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

''اور اگر اللہ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا اور اُس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو جس بارے میں تم نے چرچا کیا، اُس میں تم پر عذاب آجاتا جب کہ تم اُس حکایت کو اپنی زبانوں پر لا رہے تھے اور اپنے منہ سے کہہ رہے تھے وہ بات جس کا تمہیں خود علم نہیں ہے اور تم اُسے بڑی معمولی چیز سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی''۔

یعنی عام لوگ غیبت کو تفریح طبع کے طور پر معمولی کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اس طرح افواہی الزاموں کا ایک دوسرے سے چرچے کرنے کو وقت گزاری کا دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اس وقت ایک ''گناہ کبیرہ'' کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں جو شاید زنا سے کم نہ ہو۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ

اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑱

''اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اسے سنا تو کہتے کہ ہمیں زیبا نہیں کہ یہ بات زبان سے نکالیں حاشا وکلّا یہ بہت بڑا ابہتان ہے۔ اللہ تمہیں سمجھاتا ہے کہ اب دوبارہ کبھی ایسی بات نہ کرنا تم با ایمان ہو، اور اللہ تمہارے لئے اپنی باتیں صاف صاف پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑲

''بلاشبہ وہ جو چاہتے ہیں کہ بدکاری کی مسلمانوں کی جماعت میں اشاعت ہو، اُن کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم جانتے نہیں ہو''۔

''بدکاری کی اشاعت کے یہ معنی ہو تو سکتے ہیں کہ یہ کام عوام میں پھیل جائے یعنی کثرت سے لوگ اس کا ارتکاب کرنے لگیں جیسا کہ بعض مترجمین نے یہی ترجمہ کیا ہے[1] مگر بقرینۂ مقام اس کے معنی اس چرچے اور ذکر کی اشاعت کے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ حدیث بھی اس کی مؤید ہے[2] اور ہمارے معتبر مفسرین نے یہی تشریح کی ہے۔[3]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ⑳

''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل و کرم تم پر اور اُس کی رحمت اور یہ کہ اللہ بڑا شفیق ہے، مہربان''! یعنی تم خود سمجھ لو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو نتیجہ کیا ہوتا یعنی عذاب آجاتا یا نہیں؟

میں تو اسے سوالیہ انداز میں پڑھ کر لفظاً اس کے لئے جزا کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا مگر نحویین کو ترکیب بنانے کے لئے جزا کو محذوف ماننا پڑتا ہے اس لئے مترجمین کو بھی اکثر اس کا تتبع کرنا پڑا ہے، وہ بریکٹ میں لکھ کر سہی[4] اور مفسرین بھی کہہ دیتے ہیں کہ جزاء محذوف ہے۔[5]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

---

[1] ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی باتیں رائج ہوں (مولوی مقبول احمد صاحب)

[2] عن هشام عن ابی عبدالله قال من قال فی مؤمن ما رایت عیناه وما سمعت اذفاه کان من الذین قال الله فیهم: انّ الذین یحبون ان تشیع الفاحشه الخ (علی بن ابراهیم)

[3] ان تشیع الفاحشة ان یفشو ویظهر والزّنا والقبائح فی النّاس اٰمنوا بانّ یسبوها الیهم ویقذفوهم بها (مجمع البیان)

[4] اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو وہ تم پر جلد عذاب نازل کرتا) مقبول ترجمہ

[5] لعاجلکم بالعقوبة......وجواب لولا محذوف لدلالة الکلام علیه (جمع البیان)

مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۱

''اے ایمان لانے والو! قدم بقدم نہ چلو اور جو شیطان کے قدم بقدم چلے گا تو وہ بلا شبہ شرم ناک کام اور برائی کے لئے کہتا ہے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل وکرم تم پر اور اُس کی رحمت تو تم میں سے ایک بھی کبھی پاک وصاف نہ رہتا مگر اللہ جسے چاہتا ہے، اس کے نفس کو پاک رکھتا ہے اور اللہ سننے والا، بڑا جاننے والا''۔

دوسروں کی بدگوئی میں ایک جذبہ اپنے حسنِ عمل کے پندار کا نمایاں ہوتا ہے۔ اس آیت میں اُسے ختم کیا جا رہا ہے یعنی راہ نیک پر استقامت میں اکثر شرائط ومقتضیات معصیت کے فقدان اور موانع کے سدّ راہ ہونے کا بھی دخل ہوتا ہے جو خالق کی طرف سے ایک توفیق ہوتی ہے، لہٰذا انسان کو اس پر نازاں نہ ہونا چاہیے کہ ہم اس معصیت سے بری ہیں، کیا معلوم کہ اسے بھی خراب ماحول ملتا اور توفیقِ رب شامل نہ ہوتی تو یہ بھی کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کرتا اس لئے کہ کسی دوسرے کو مبتلائے گناہ دیکھ کر اسے اچھالنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ خود اسے مناسب انداز میں نصیحت کرنا چاہیے اور خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ توفیق خیر اُس کے شامل حال فرمائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نیکی اور بدی دونوں صرف خدا کی جانب سے ہیں اور انسان کی قوت ارادی کچھ ہے ہی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو امر بالمعروف اور نہی المنکر کا نظام ہی نہ ہوتا اور برے کو اُس کی برائی پر تنبیہ بھی درست نہ ہوتی اور سزا بھی حق بجانب نہ پڑتی۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۠ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۲

''اور قسم نہیں کھانا چاہیے[1] تم میں سے اُنہیں جن کو اللہ نے مال و دولت کی فراوانی اور گنجائش عطا کی ہے اس بارے میں کہ وہ دیں صاحبان قرابت اور عزیزوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

اہل سنت کی مشہور روایت کے مطابق گذشتہ آیات کی شان نزول کے تناسب سے اس آیات کا تعلق ایک ایسے شخص سے لیا گیا ہے جس نے جناب عائشہؓ پر تہمت لگانے اور اس کا چرچا کرنے میں حصّہ لیا تھا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ اس شخص کی کفالت کرتے تھے اس واقعہ کے بعد انہوں نے عہد کر لیا کہ اب میں اس شخص کے ساتھ کوئی سلوک نہ کروں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور متنبہ کیا گیا کہ کسی غلطی پر بھی مستطیع افراد کو یہ نہیں چاہیے کہ غربا کے ساتھ حسن سلوک ترک کر دیں۔

علامہ طبرسیؒ نے ان صاحب کا نام مسطح لکھا ہے جو اہل بدر میں سے تھے اور اسی ذیل میں قدیم معتزلی عالم جبائی کا تبصرہ درج کیا ہے کہ

[1] لایتلاء القسم (تبیان) نہ قسم کھا بیٹھیں (تاج العلماء)

اس سے ثابت ہوتا کہ بدر والے صحابہ بھی گناہوں سے بری نہ تھے۔[1]

ہمارے یہاں کی ایک قدیم تفسیر ایسا ظاہر کرتی ہے کہ یہ آیت مستقل حیثیت رکھتی ہے گزشتہ واقعہ سے مرتبط نہیں ہے اور اس میں صاحبان قرابت سے مراد وہی قرابت داران رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہیں آیت خمس میں ذوی القربیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔[2]

جناب شیخ الطائفہؒ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ ایک عام حکم ہے مال دار لوگ کسی وجہ سے خفا ہو کر غرباء پر حسن سلوک ترک کرنے کی قسم نہ کھالیا کریں۔[3]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

”وہ جو تہمت لگاتے ہیں پاک دامن، بے خبر، باایمان خواتین کو، ان پر لعنت ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے، جس دن ان کے خلاف گواہی دیں گی خود ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان تمام کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے، اس دن اللہ ان کی پوری پوری جزاء سزا انہیں پہنچائے گا اور انہیں معلوم ہوگا کہ اللہ ہی وہ حق ہے جو روشن و نمایاں ہے“۔

اس قرآنی لعنت والی آیت کو پڑھتے وقت یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ افراد جن پر لعنت ہو رہی ہے، صحابہ ہی کی معزز جماعت میں ہیں اور معمولی صحابی نہیں بلکہ ان میں سے بعض مہاجرین ہیں اور بعض اہل بدر، اس کے بعد بھی قرآن نہ صرف یہ کہ لعنت کر رہا ہے بلکہ صراحۃً روز قیامت کے عذاب کی اطلاع بھی دے رہا ہے۔ اگر اہل بدر کا مغفور ہونا کوئی قطعی فیصلہ ہوتا تو اس عذاب کی اطلاع کے کوئی معنی نہ تھے۔

اس نتیجہ سے بچنے کی بس ایک ترکیب ہے اور وہ یہ کہ ان بعد والی آیات کو قصہ افک سے متعلق نہ لیا جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ علیحدہ آیات ہیں جو عمومی طور پر تہمت زنا عائد کرنے والوں سے متعلق ہیں، جیسا کہ ہمارے علماء میں امین الاسلام طبرسیؒ کا رجحان معلوم ہوتا ہے[4] اور

---

[1] قال الجبائی فی قصّة مسطح دلالة علیٰ انّه قد یجوز ان یقع المعاصی ممن شهد بدرا (مجمع البیان)

[2] هم قرابة رسول الله ﷺ (علی بن ابراهیم)

[3] قال قوم هذا نهی عام لجمیع اولی الفضل والسّعة ان یحلفوا الّا یؤتوا اولی القربیٰ والمساکین و الفقراء وهو اولیٰ واتمّ فائدة (تبیان)

[4] بدأ سبحانه فبیّن حکم القاذف اوّلا واوجب علیه الحدّ وردّ شهادته ثم عقبه بحدیث الافك للتصاله به ثم ذکر صنفا اٰخر من القذفة وهم المنافقون بقوله: انّ الّذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الّذین اٰمنوا وبین مأ لهم من الغضب واللعنة ثم غم الجمیع بالوعید فی قوله: ان الّذین یرمون المحصنات الغافلات (مجمع البیان)

مجھے بھی اس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے مگر اس صورت میں پھر اس میں ان افراد کے لئے جن کی نسبت تہمت لگائی جاتی ہے جو مدحیہ الفاظ ہیں المحصنٰت الغافلات المؤمنات ان سب کو بھی اس واقعہ سے متعلق افراد پر منطبق کرنا درست نہ ہوگا۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾

''ناپاک باتیں ناپاک لوگوں کے لئے ہوتی ہیں اور ناپاک آدمی ناپاک باتوں کے لئے اور صاف ستھری باتیں صاف ستھرے آدمیوں کے لئے ہوتی ہیں اور صاف ستھرے آدمی صاف ستھری باتوں کے لئے یہ لوگ بری ہوتے ہیں اس سے جو وہ لوگ کہتے ہیں، اُن کے لئے بخشش ہے اور عزّت دار روزی''۔

عربی زبان میں خصائل وعادات اور اوصاف کے لئے مؤنث ضمیریں اور موصوف اشخاص کے لئے مذکر ضمیریں استعمال ہوتی ہیں جیسا کہ متنبی شاعر نے بھی کہا ہے:

انّ الکرائم کفّوھا الکرمأ: شریفانہ اوصاف کے لئے شریف لوگ ہی ہوتے ہیں''۔

اس بنا پر بہت سے مفسرین اہل سنّت نے بھی اس آیت میں خبیثات اور طیّبات کے معنی بری اور اچھی باتیں اور خبیثین اور طیبین کے معنی برے اور اچھے آدمیوں کے لئے ہیں اور اس طرح مطلب آیت کا یہ ہوتا ہے کہ یہ بدگوئی اور اتہام اور پاک دامن افراد کی نسبت بدکاری کی حکایات کو شہرت دینا خبیث ہی افراد کا شیوہ ہوسکتا ہے، اچھے آدمی اس قسم کی حرکتوں سے بری ہوتے ہیں لیکن بعض اہل سنت نے ان مؤنث اور مذکر لفظوں سے فائدہ اٹھا کر اس کے معنی یہ قرار دیے ہیں کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، اس طرح انہوں نے بلا استثناء تمام ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضلیت کا ایک پہلو پیدا کیا ہے۔

چونکہ اس کا ظاہری مفہوم قطعی طور پر واقعیت کے خلاف ہے جس کی مثال تمام مسلمانوں میں متفق علیہ اور بنصِ قرآن ثابت شدہ زوجۂ نوح علیہ السلام اور زوجۂ لوط علیہ السلام اور دوسری طرف آسیہؑ زوجۂ فرعون کی شکل میں موجود ہے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض ازواج کو شیعہ مدوح نہیں سمجھتے اس لئے علمائے شیعہ کو اس کا جواب دینے کی ضرورت پڑی ہے چنانچہ جناب تاج العلماءؒ نے اس آیت سے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے: ''یعنی شایان یہی ہے اگرچہ اتفاق سے کبھی ایسا نہ ہو جیسے فرعون کو آسیہؑ ملی یا حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی ان کی بیویاں اور عائشہ اور حفصہ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گلے منڈھی گئیں''۔

ہمارے نزدیک اوّل تو جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے مؤنث اور مذکر کے الفاظ سے عورت اور مرد کا سمجھنا ہی ضروری نہیں ہے، پھر اگر ایسا ہو

بھی جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے اس کی روایت، ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف بھی منسوب بتائی ہے[1] تو جس طرح کا الزام یہاں محل بحث ہے یعنی جنسی جرم کا ارتکاب، اس سے ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک ہونے پر جب علمائے شیعہ بھی متفق ہیں کیوں کہ اس طرح کے جرمِ ناموس سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزّت پر حرف آتا ہے تو پھر اضافی طور پر اس پاکیزگی کے قبول کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ لیکن اس سے زندگی کے تمام شعبوں اور ایمان اور عمل کے تمام پہلوؤں میں ان کی بلندی و رفعت کسی کے نزدیک بھی ثابت نہیں ہے، ورنہ تمام مسلمانوں کو بلا استثناء ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معصوم ماننا چاہیے جس کا میرے علم میں کوئی بھی قائل نہیں ہے لہٰذا کلی پاکیزگی جس سے یہ آیت آیۂ تطہیر بن جائے اہل سنت کے نزدیک بھی ثابت نہیں اور جزئی پاکیزگی یعنی ایک خاص جرم سے برأت شیعوں کو بھی تسلیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾

’’اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کر لو اور سلام نہ کر لو اس کے رہنے والوں کو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو، تو اگر اُن میں کسی آدمی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو اُن میں جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ تمہارے اخلاق کی درستی کا زیادہ ثبوت ہوگا اور اللہ اُن کاموں کو جو تم کرتے ہو جاننے والا ہے‘‘۔

گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت اور اسلام کا حکم:

ان آیت میں اہل خانہ کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخلہ کو منع کیا ہے اور اسے اخلاق کے منافی قرار دیا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

’’تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ تم داخل ہوا ایسے مکانات میں جن میں کوئی بود و باش نہیں رکھتا ہو جس میں تمہارے فائدہ کا کوئی سامان ہے اور اللہ جانتا ہے اُسے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو‘‘۔ ’’غیر مسکونۃ‘‘ کی تشریحات مختلف ہوئی ہیں جیسے سفر کے راستوں میں مسافروں کے لئے سرائیں ہوتی ہیں یا ایسے کھنڈر میں جن میں ایسا انسان رفع حاجت کے لئے جانا چاہتے ہیں یا تجارتی مراکز جن میں لوگوں کی خریداری کے لئے سامان ہوتا ہے

[1] هو المروى عن ابى جعفر و ابى عبدالله عليهما السّلام (مجمع البيان)

لیکن بہتر یہ ہے کہ الفاظ قرآنی کے عموم کا جو تقاضا ہے، اسے باقی رکھا جائے اور ان تمام چیزوں کو اس میں داخل سمجھا جائے۔

چونکہ اجازت لینے کا حکم اس خطرہ سے ہے کہ وہاں کوئی نامحرم ہو جس کی ہمارے بے دھڑک چلے جانے سے بے پردگی ہوتی ہو۔ ان مقامات پر یہ خطرہ نہیں ہے لہٰذا اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔[1]

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِہِمۡ وَ یَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَہُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَزۡکٰی لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾

''ایمان لائے ہوئے مردوں سے کہیے کہ وہ ذرا بند رکھیں اپنی آنکھیں اور بچائے رہیں اپنے اعضائے پوشیدہ۔ یہ اُن کے اخلاق کی درستی کا زیادہ ثبوت ہے، یقیناً اللہ باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں''۔

اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت:

''ذرا بند رکھیں'' یعنی نامحرم اشخاص یا نہ دیکھنے کے لائق اعضاء یا فحش مناظر سے نگاہ الگ رکھیں[2] ورنہ آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے عطا ہوئی ہیں، بند رکھنے کے لئے نہیں۔

اعضائے پوشیدہ کے بچائے رکھنے کا مفہوم دوسرے مقامات پر تو زنا کاری سے پرہیز ہے مگر یہاں حدیث معصوم علیہ السلام بتاتی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اعضاء کو نگاہ خلق سے بچانا لازم ہے جس سے ستر عورتین کا وجوب مستفاد ہوتا ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لئے اسلام کا ایک ضروری حکم ہے[3] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم عام لیا جائے جس میں دونوں باتیں داخل ہو جائیں، حرام کاری سے بچنا بھی اور ان اعضاء کو نگاہ اغیار سے بچانا بھی۔[4]

وَقُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ یَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِہِنَّ وَیَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَہُنَّ وَلَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَلۡیَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِہِنَّ عَلٰی جُیُوۡبِہِنَّ ۪ وَلَا یُبۡدِیۡنَ

---

[1] قال قوم هی جمیع ذٰلك حملوه علیٰ عمومه لانّ الاستئذان انّما جاء لئلّا یهجم علیٰ مالا یجوز من العورة وهوا الاقوٰی لانّه اعمّ فائدة (تبیان) الاولیٰ حمله علی الجمیع (مجمع البیان)

[2] عن عورات انسآء وما یحرم النّظر الیه (تبیان)

[3] عن ابی بصیر عن ابی عبدالله قال کلّ ایة فی القراٰن فی ذکر الفروج فهو من الزّنا الّا هٰذه الاٰیة فانّها من النظر ولا یحل لرجل مؤمن ان ینظر الیٰ فرج اخیه ولا یحلّ للمرأة ان ینظر الیٰ فرج اختها (علی بن ابراهیم)

[4] عن الحرام و عن ابدائها حیث ترٰی (تبیان)

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

''اور ایمان والی عورتوں سے کہیے کہ اپنی نگاہوں کو ذرا بند رکھیں اور اپنے پوشیدہ اعضائے کی حفاظت کریں اور اپنے بناؤ سنوار کو ظاہر نہ کریں سوا اُس کے جو اوپر سے نمایاں ہو اور چاہیے کہ اپنی اوڑھنیوں کو لٹکا کر گریبان پر ڈال لیں اور اپنے بناؤ سنوار کو ظاہر نہ کریں کسی پر سوا اپنے شوہروں یا اپنے باپ داداؤں یا اپنے شوہروں کے باپ داداؤں یا اپنی اولاد............ یا اپنے شوہروں کی اولاد یا اپنے (نسبی) بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں یا اپنے اُن غلاموں اور اُن نوکر چاکر مردوں کے جن میں جنسی خواہش باقی نہیں رہی ہے یا ان بچوں کے جو عورتوں کے پوشیدہ خصوصیات سے واقف نہیں ہیں، اور اپنے پیر نہ ماریں کہ جو بناؤ سنوار وہ چھپائے ہوئے ہیں، معلوم ہو اور تم سب اے اہل ایمان! اللہ سے لو لگاؤ، شاید تم دین و دنیا کی بہتری حاصل کرو''۔

خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت:

قبل کی آیت میں جو مردوں سے متعلق تھی اور اس آیت میں جو عورتوں سے متعلق ہے، دو حکم مشترک ہیں: ایک غضّ بصر یعنی آنکھوں کو ذرا بند رکھنا جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مردوں کو غیر عورت پر نظر کرنا ناجائز ہے، اسی طرح عورت کو غیر مرد پر بالکل یکساں صورت ہے مگر افسوس ہے کہ پردہ دار خواتین بھی جو اب دنیا میں بڑی اقلیت کی شکل میں ہیں، انہیں بھی پہلے حکم کا احساس ہے کہ غیر مرد کی نظر ہم پر نہ پڑے اور غیر مرد اگر عورت کو دیکھے تو وہ قابل اعتراض ہے لیکن وہ خود غیر مردوں پر نظر کریں اسے وہ اپنے لئے قابل اعتراض بات نہیں سمجھتیں یہ تفریق از روئے قرآن بالکل غلط ہے۔

دوسرے حفظ فروج یعنی جنسی گناہ سے پرہیز یا نظر اجانب سے محفوظ رکھنا یا دونوں باتیں، اس میں بھی مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح مردوں کے لئے ایک دوسرے کے سامنے بالکل برہنہ ہونا یا دوسرے کو برہنہ دیکھنا اسلام میں ممنوع ہے، اسی طرح عورت کے لئے یہ حکم ہے۔

اس میں استثنائی صورت وہی حالت اضطرار کی ہے اور اضطرار کے نتیجہ میں جو حکم ہو، وہ مقدار ضرورت پر منحصر ہوتا ہے لہٰذا ناگزیر علاج یا

بچہ کی ولادت کے موقع پر استثناء ہوگا تو صرف اس لیڈی ڈاکٹر قابلہ کا جو معالج ہے۔ ان حالتوں میں وسعت کی کوئی گنجائش شرعاً نہیں ہے مگر غالباً خواتین کے طبقہ میں اس پر بھی عمل پورے طور پر نہیں ہے۔

قرآن مجید کا حکم جو ''حفظ فروج'' کی لفظوں کے ساتھ ہے، اس جدید طریقہ کو بھی حرام قرار دیتا ہے جو ٹیوب سے کسی معلوم یا لامعلوم مرد کے نطفہ کے داخل کرنے کا ہے، اس طریقہ سے بھی شوہر کے سوا کسی شخص کا نطفہ داخل کرنا جائز نہیں ہے۔

ان دونوں مرد اور عورت میں مشترک پابندیوں کے علاوہ مزید حکم عورتوں کے لئے پردہ کا ہے جس میں مکاتب فقہیہ کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتنا ہی استثناء کیا جائے مگر وہ اُس بے پردگی کے ساتھ ہرگز نہیں دے سکتا جو تہذیب جدید کے نتیجہ میں دنیا کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔

اس آیت میں جو حکم پردہ ہے اس کے حدود پر مکمل بحث کے لئے ہماری کتاب ''اثبات پردہ'' دیکھنے کی ضرورت ہے۔

''پیر نہ ماریں'' اس کے ایک معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ زمین پر پیر زور سے رکھنے کی ممانعت ہے جس سے پازیب وغیرہ کی جھنکار دوسروں کے کان تک جاتی ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد ایک پیر کا دوسرے پیر پر مار کے چلنا ہے جس سے خاص طور پر جھنکار پیدا ہو۔[1]

ایک تصور یہ بھی گوش زد ہوا ہے کہ اس سے مقصود ناچ کی ممانعت ہے کیوں کہ اُس کا پیروں کے زمین پر مارنے سے تعلق ہے مگر اس صورت میں آخری فقرہ کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ناچ تو بذات خود ممنوع ہے، اُس کی ممانعت اس بنا پر نہیں ہے کہ پیروں کے زیور کی جھنکار باہر جائے گی، یہ کہنا کہ لیعلم ما یخفین من زینتھن ''کہ جو بناؤ سنگار وہ چھپائے ہوئے ہیں، معلوم ہو'' بتلاتا ہے کہ وہ پیروں کا زمین پر مارنا یا ایک پیر کا دوسرے سے ٹکرانا بذات خود ممنوع نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ممانعت ہو رہی ہے کہ چھپے ہوئے زیور کی آواز دوسروں کے کانوں تک نہ جائے اور اسے ضمنی طور پر لازماً یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ خود خلخال (پازیب یا چھاگل) پر نظر نامحرموں کی نہ پڑنا چاہیے[2] اور اس سے دل چاہے تو یہ نتیجہ نکالئے کہ پھر خود پیروں کا اور جسم کے دیگر حصّوں کا نامحرموں کی نگاہوں کا مرکز بننا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟!

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

''اور شادی کرو بے شوہر عورتوں اور نیک چلن اشخاص کی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں سے۔ اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل وکرم سے انہیں مالدار بنا دے گا اور اللہ گنجائش والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

نکاح کی ترغیب:

ہماری زبان میں جتنے الفاظ ہیں جیسے ''کنواری'' اور ''بن بیاہی'' یا ''غیر شادی شدہ'' وہ اُس وسعت کے حامی نہیں ہیں جو عربی

---

[1] لا تضرب احدی رجلیها بالاخری لیقرع الخلخال بالخلخال (علی بن ابراهیم)

[2] معناه لا تضرب امرأة برجلها لیعلم صوت الخلخال فی رجلها کما کان یفعلها نساء اهل الجاهلیة وذٰلك یدلّ علی انّ اظهار الخلخال لا یجوز (تبیان)

میں ''ایامیٰ'' کی لفظ کو حاصل ہے، اس میں کنواری لڑکیاں بھی داخل ہیں اور بیوہ عورتیں بھی۔ اردو محاورہ کی اس تنگی کی وجہ سے ہمیں ترجمہ میں ایک ''محاورہ سے خارج'' لفظ ''بے شوہر'' کا استعمال کرنا پڑا تا کہ اس کی وسعت ''عقد بیوگان'' کے حکم کو ظاہر کر سکے۔[1]

اس وسعت کے پیش نظر آیت کا مفاد یہ ہوگیا کہ صنف اناث میں کسی فرد کو بلا شوہر نہیں رہنا چاہیے۔ اب جو چیز ہمارے عمومی تصورات میں نکاح سے سدّ راہ ہوتی ہے وہ لڑکی کے عقد میں خود اس کا بے روزگار رہونا۔ قرآن کہتا ہے کہ اسے بالکل نہیں سوچنا چاہیے بلکہ اسے خدا پر چھوڑ نا چاہیے، وہ اس وقت اگر محتاج ہیں تو اللہ اپنے فضل وکرم سے اُنہیں غنی کر دے گا مگر کیا کیا جائے کہ ہم آج اُس توکّل کے جوہر سے محروم ہیں۔ اس لئے قرآن کی اس تنبیہ کے باوجود ان اسباب ظاہری کو ضرور دیکھتے ہیں جس سے شاید کوئی مستثنیٰ نہ ہو لیکن حدیث میں وارد ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ بد گمانی اور اس پر بے اعتمادی ہے[2] **نعوذ باللہ من ذٰلک**۔

وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا‌ ‌ۖ وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ‌ ؕ وَلَا تُكۡرِهُوۡا فَتَيٰتِكُمۡ عَلَى الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ ؕ وَمَنۡ يُّكۡرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِكۡرَاهِهِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۳۳

''اور ضبط نفس سے کام لینا چاہیے اُنہیں جن کے لئے شادی کا موقع نہ ہو، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل وکرم سے انہیں وسعت عطا فرمائے اور جو تمہارے مملوکہ غلاموں کنیزوں میں بالمعاوضہ آزادی کا معاہدہ چاہیں یا اُن کے ساتھ معاوضہ لے کر آزاد کرنے کا معاہدہ کر لو، اگر جانو اُن میں کسی طرح کی بھلائی اور اُنہیں ہیں کچھ عطا کر و اللہ کی طرف کے مال سے جو اس نے تمہیں دیا ہے اور اپنی جو کنیزوں کو اگر وہ اپنے کو محفوظ رکھنا چاہتی ہیں، بدکاری پر مجبور نہ کرو، صرف اس لئے کہ تم کچھ دنیوی زندگی کا سامان حاصل کرو اور جو کوئی زبردستی کرے گا اُن پر تو اللہ اُن کے مجبور کیے جانے کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

غلام وکنیز کے مکاتبہ کا حکم:

اس آیت میں ایک ساتھ کئی احکام کا ذکر ہے:

پہلے یہ کہ اگر کسی شخص کے لئے ایسا امکان نہیں ہے کہ وہ شادی کرے تو اسے ضبط نفس سے کام لینے کی ضرورت ہے اور ایسا نہ ہونا چاہیے

[1] "جمع ایم"، وهی المرأة التی لازوج لها سواء کانت بکرا او ثیّبا (تبیان)

[2] قال ابو عبدالله من ترائ التزويج مخافة العلية اسأء الظنّ بربه يقول سبحانه: ان يكونو افقرآء يغنهم الله من فضله (مجمع البيان)

کہ اپنی خواہش نفس کی تسلّی کیلئے حرام ذرائع اختیار کرے۔

ضبط نفس اور حرام کاری سے پرہیز ہی وہ ''عفت'' ہے جس کے لئے خالق کا مطالبہ ہے۔

دوسرے مکاتبہ کا حکم جو اس دور کے لئے تھا جب غلام اور کنیز ہوا کرتے تھے، اس کے احکام کی تفصیل کتب فقیہہ میں مذکور ہے۔

تیسرا حکم، اس دور حالات کے لحاظ سے اس کا پس منظر یہ تھا کہ بعض اشخاص اپنی کنیزوں سے طوائف کا پیشہ کراتے تھے تا کہ ان کی کمائی سے خود فائدہ اٹھائیں۔ انہیں منع کیا گیا ہے کہ یہ تمہارا عمل ناروا ہے۔

اب کنیزیں نہیں ہیں تو ایسے اشخاص ہو سکتے ہیں جو اپنے زیر اثر یا زیر پرورش لڑکیوں سے یہ ناروا کام کرائیں، وہ آیت کے اس حکم میں داخل ہیں۔

اس حکم کے ذیل میں تفسیری لحاظ سے تشریح طلب یہ فقرہ ہے کہ ''اگر وہ محفوظ رہنا چاہتی ہیں''۔ اس سے ایسا تو ہم ہو سکتا ہے کہ یہ اس ممانعت میں شرط ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مفہوم شرط کی بحث میں واضح کیا گیا ہے، یہ شرط اشتراط کی غرض سے نہیں ہے بلکہ ایک تو ان مالکوں یا سرپرستوں کے طرز عمل کی شرمناک قوت کے ساتھ اظہار مقصود ہے کہ وہ ناقص العقل ہونے کے باوجود پارسائی اختیار کرنا چاہتی ہیں تو کتنے غضب کی بات ہے کہ تم انہیں اس کے خلاف مجبور کرو اور پھر یہ کہ وہ خود اپنے کو محفوظ نہیں رکھنا چاہتیں تو مجبور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب وہ خود ان کی طرف متوجہ ہیں، بے شک یہ مالک اعانت جرم کے مرتکب ہیں، اس لئے یہ بھی گنہ گار ہیں۔

اب بعض احادیث رہنمایان دین میں ہے کہ:

انّ لکلّ عضو من ابن اٰدم حظّا من الزنا فزنا العین النظر الی الحرام۔

زنا کاری میں آدمی کے اعضائے جسم میں سے ہر ایک کا ایک حصّہ ہے تو آنکھ کی زنا کاری (نامحرم پر) نگاہ ہے۔

اس حدیث معصوم علیہ السلام کے لئے اس حکم کے بعد کہ وہ اوپر کا لباس برقع وغیرہ اتار سکتی ہیں، ارشاد ہوا ہے کہ: وان یستعففن خیرلھنّ ''وہ عفت و پارسائی اختیار کریں تو ان کے لئے بہتر ہے، یعنی ایسی ضعیف العمر عورتیں بھی مکمل پردہ اپنا قائم رکھیں تو بہتر ہے، اس کو کہا گیا ہے کہ وہ ''عفت و پارسائی اختیار کریں'' اس سے ظاہر ہے کہ بے پردگی عفت و پاک دامانی کے خلاف ہے تو زیر تحریر آیت میں جو ارشاد ہوتا ہے کہ وہ محفوظ رہنا چاہتی ہیں تو کتنی شرمناک بات ہے کہ تم انہیں خلاف عفت عمل پر آمادہ کرو، اس کے احاطہ میں میرے نزدیک وہ مرد بھی آتے ہیں جو اپنی عورتوں کو ترقی پسندی کی خاطر پردہ سے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''اللہ ان کے مجبور کئے جانے کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان'' اس بخشش اور مہربانی کا تعلق ان بے چاریوں سے ہے جنہیں مجبور کیا گیا ہے، نہ کہ ان ظالموں کے ساتھ جو مجبور کرنے والے ہیں۔

وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ۝۳۴

اور بے شک ہم نے تم لوگوں کی جانب کھلی ہوئی نشانیاں بھیجی ہیں اور مثالیں ان لوگوں کی جو تمہارے پہلے گزر گئے

اورنصیحت پرہیز گاروں کے لئے‘‘۔

’’مثال ان لوگوں کی‘‘یعنی پہلے کی امتوں پر کس کس طرح ان کی بداعمالیوں سے عذاب نازل ہوا تا کہ تمہیں ان مثالوں سے سبق ملے اورتم ان بداعمالیوں سے پرہیز کرو۔[۱]

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَ لَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳۵﴾

’’اللہ آسمان اورزمین کا اجالا ہے،اس کی روشنی کی مثال اس گلوب کی سی ہے جس میں چراغ ہو،وہ چراغ ایک شیشہ کی چمنی کے اندر ہو،وہ شیشہ ایسا ہوجیسے چمکتا ہوا تارا،وہ روشن ہوتا ہوا ایک بابرکت درخت زیتون سے جو نہ مشرق کی طرف کا ہےاورنہ مغرب کی طرف کا کہ کچھ دورنہیں اس کا تیل آپ ہی آپ بھڑک اٹھے،چاہے اس سے آگ چھوبھی نہ جائے روشنی بالائے روشنی،اللہ اپنی روشنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کی چاہتا ہےاوروہ مثالیں پیش کرتا ہےلوگوں کے لئےاوراللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے‘‘۔

آیۂ نور:

چونکہ اجالے کا کام چیزوں کوسامنے لانا ہے اور خالق وہ ہے جس نے کتم عدم سے کائنات کو عالم شہود میں جلوہ گر کیا،اس لئے اس کی ذات حقیقت نور کی مصداق اتم واکمل ہے۔پھر یہ کہ نوررہنمائی کا کام کرتا ہےاوررہنمائے حقیقی اللہ ہے اس لئے بھی وہ نوراکمل ہے۔[۲] ورنہ جسے ہم عرف عام میں ’’نور‘‘ کہتے ہیں یہ تومخلوق اوراس کی بعض مخلوقات کا اثر ہے۔

اب اس کے بعد جو’’اس کا نور‘‘ کہاہے تواس سے مراداس کی طرف کی ہدایت اورتمیز حق وباطل ہے جونور کا حاصل ہوتا ہے۔اب خواہ یہ تمیز اس کی طرف کی کتاب سے ہو یااس کی طرف کے رہنما کے ذریعہ سے جونور بنا کر بھیجا گیا ہے،اوراس لئے اس کی تفسیر قرآن سے بھی ہوئی ہے اورذات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اوراس فیض ربانی سے بھی جومومن کے دل کو چراغ ہدایت سے روشن کرتا ہے۔

اب اس کے بعد عربی ادب کے اسلوب کے موافق اس نور کی کمال ضیاباری کے لئے جس چراغ سے تشبیہہ دی گئی ہے،اس میں اس دور کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔

---

[۱] غفور للمکرھات لاللمکرہ لان الوزر علیہ رحیم بھنّ (مجمع البیان)

[۲] قیل فی معناہ قرلھن احدھما ان اللہ ھادی اھل السّمٰوٰت والارض...والثانی انہ منور السموات والارض (تبیان)

آج کل کے دور والوں کو یہی مضمون سمجھا یا جائے تو اس زمانہ میں جتنا زیادہ سے زیادہ اہتمام روشنی کے تیز کرنے کا سائنس کے ذرائع سے ہوسکتا ہے، وہ سب اس مطلب کے اظہار کا ذریعہ ہوگا۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۪ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

''ان گھروں میں جن کے لئے اللہ نے طے کر دیا ہے کہ وہ بلند کئے جائیں اور ان میں اللہ کو یاد کیا جائے، اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ان میں صبح و شام وہ افراد جنہیں کوئی بیوپار اور کوئی بیچ کھوچ کرنے کا مشغلہ اللہ کو یاد کرنے اور نماز کو قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے غافل نہیں بناتا، وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جس میں دل اور نگاہیں الٹ پلٹ ہوجائیں گی تاکہ اللہ انہیں معاوضہ دے بہترین اعمال کا جو انہوں نے کئے اور انہیں اور زیادہ عطا کرے اپنے فضل و کرم سے اور اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے بے سان گمان کے''۔

عبادت الٰہی کے اوقات کا لحاظ رکھنے کے ساتھ تجارت کی تعریف:

یہ جو تعریف کی گئی ہے کہ وہ افراد جنہیں کوئی بیوپار اور کوئی بیچ کھوچ کا مشغلہ اللہ کو یاد کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے غافل نہیں بناتا، اس سے خود صحیح عقل یہ نتیجہ نکال سکتی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تجارت وغیرہ کسب معاش کے کام انجام نہیں دیتے بلکہ ان کاموں کی انجام دہی کے ساتھ وہ حقوق اللہ اور حقوق الناس دونوں میں سے کسی کو فراموش نہیں کرتے، یہی اس کا مفہوم اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر میں بتایا گیا ہے۔[1]

اب یہ گھر کون ہے؟ اس کی تفسیر خانۂ خدا یعنی مسجدوں سے بھی ہوئی ہے اور یہ بھی کہا وہ انبیاء کے گھر ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی نے حضرت علی و فاطمہ علیہما السلام کے گھر کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ گھر بھی ان گھروں میں سے ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نعم من افاضلها ''ہاں، ان میں کے امتیازی فضیلت رکھنے والے گھروں میں سے ہے (مجمع البیان)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا

[1] روی عن ابی جعفرؑ وابی عبداللهؑ انه قال: مدح قرما اذا دخل وقت الصّلوٰة ترکوا تجارتهم و بیعهم واشتغلو بالصّلوٰة.(تبیان)

جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰٮهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۙ﴿۳۹﴾

''اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان کے اعمال مثل سراب کے ہیں ایک ریگستانی میدان میں جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس گیا تو اسے کچھ نہ پایا اور اللہ کو اس کے پاس پایا تو اس نے اس کا پورا پورا حساب لے لیا اور اللہ بڑا تیز حساب لینے والا ہے''۔

کافروں کے اعمال خیر و خیرات کا بے کار ہونا:

یہ اعمال جن کی مثال سراب سے دی جا رہی ہے، برے اعمال تو ہو نہیں سکتے، اس لئے کہ برے اعمال میں کوئی چمک دمک ہے ہی نہیں جس سے پیاسا پانی سمجھے، یہ بظاہر اعمال خیر ہی ہو سکتے ہیں جن پر جزاء کی امید کی جاسکتی ہے اور اس لئے وہ پانی کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں اور پیاس بجھانے کی امید دلاتے ہیں۔[1] مگر قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ وہ مثل سراب کے ثابت ہوں گے جس کے پاس پیاسا دوڑ کر جاتا ہے تو سوا التہاب میں اضافہ کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اعمال خیر کے سودمند ثابت ہونے کے لئے اسلام و ایمان ضروری شرط ہے، اس کے بعد یہ خیال کتنا غلط ہے جو اس دور میں کافی پھیل رہا ہے کہ اصل چیز اعمال ہیں، اگر اعمال اچھے تو انسان بہتر سے بہتر جزاء کا استحقاق رکھتا ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب و ملت سے متعلق ہو یا لا مذہب ہو۔ یہ خیال از روئے قرآن کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ يَّغۡشٰٮهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾

''یا مثل اندھیروں کے گہرے سمندر کے جس پر لہر پر لہر آ کر چھا رہی ہو جس کے اوپر سے بادل ہوا اندھیرے ایک کے اوپر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھنے کا امکان بہت کم ہے اور جس کے لئے اللہ روشنی قرار نہ دے، اس کے لئے کوئی روشنی نہیں ہے''۔

اس طرف نور علیٰ نور روشنی بالائے روشنی اور اس طرف ظلمات بعضها فوق بعض ''تاریکیاں ہیں، ایک کے اوپر ایک'' اب عقل صحیح کا فیصلہ کیا ہے؟ کدھر جانا چاہئے؟

جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھنے کا امکان بہت کم ہے، یہ اس معنی میں ہے جیسے ہمارے یہاں محاورہ ہے کہ ''ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا''۔

---

[1] یعنی التی یعتقدون الھا طاعات و قربات (تبیان) یعملون و یعتقدون الھا طاعات (مجمع البیان)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٤١﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿٤٢﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے صف باندھے ہوئے ہر ایک جانتا ہے اپنی نماز اور تسبیح کو اور اللہ جاننے والا ہے اس کا جو وہ کرتے ہیں اور اللہ کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے''۔

آسمان اور زمین میں سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، یعنی ہر عیب و نقص سے اس کے بری ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔[1]

كل قد علم صلاته و تسبيحه اس میں علم جو فعل ماضی ہے، اس میں جو ضمیر پوشیدہ ہے، اس کا مرجع ایک تفسیر کے لحاظ سے اللہ ہے۔[2] اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ''ان میں سے ہر ایک وہ یعنی اللہ جانتا ہے اس کی نماز اور تسبیح کو'' مگر بعد میں موجود ہے، والله عليهم بما يفعلون، ''اللہ جانتا ہے اسے جو وہ کرتے ہیں'' پھر ایک ہی مطلب کے دو جملوں کے لانے سے فائدہ کیا حاصل ہوگا؟ اس لئے ہمارے نزدیک دوسرے قول کو ترجیح ہے کہ علم کی ضمیر کل کی طرف راجع ہے جو اس فعل ماضی سے پہلے بلا فاصلہ مذکور ہے۔ اب معنی وہی ہوتے ہیں جو ہم نے ترجمہ میں لکھے ہیں کہ ہر ایک جانتا ہے اپنی نماز اور تسبیح کو یعنی ہر ایک کا جو طریقہ تسبیح کا ہونا چاہئے، وہ اس سے خوب واقف ہے۔

اس کے ضمن میں بہت سے زعم خودی میں مبتلا انسانوں پر تعریض بھی ہے کہ بہت سے ''اشرف المخلوقات'' کی نوع میں داخل افراد اس احساس و شعور سے خود اختیاری طور پر محروم ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ کائنات کی دوسری چیزوں کا واقف ہونا فطرت الٰہی کے نتیجہ میں از خود ہے لیکن انسان کے ''اشرف الخلوقات'' ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اُس جوہر کو جو دوسری کائنات کی چیزوں میں بجز فطرت ہے، ارادی و اختیاری طور پر حاصل کرے۔

یہ مفہوم بھی قدیم تفاسیر میں درج ہے، یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اسے قول ضعیف کے طور پر درج کیا ہے۔[3] مگر مجھے وہی درست معلوم ہوتا ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے پہلے قول کو قوت دیتے ہوئے اس کی توجیہ فرمائی ہے کہ اشیائے کائنات کی تسبیح کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے جلال و کمال کا ثبوت ہے، اور ہر شے کس کس حیثیت سے اس کے جلال و کمال کو ظاہر کر رہی ہے، اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔[4] مگر اس توجیہ سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ اشیاء کی دلالت ذات الٰہی کے جلال و کمال پر تو وہی ہے جس کو عقلائے زمانہ سمجھ سکتے ہیں، تب ہی دلالت کا مفہوم محقق

---

[1] خدا ہی کی پاکیزگی ظاہر کرتے ہیں۔ (تاج العلماء)

[2] معناه ان جميع ذلك قد علم الله تعالىٰ صلاته (تبيان)

[3] قيل كل قد علم صلاته اى صلوٰة نفسه (تبيان)

[4] هو اجود لانّ الاشيآء كلّها لا يعلم كيفيته دلالتها على الله وانما يعلم الله تعالىٰ ذلك (مجمع البيان)

ہوگا، ورنہ خود اللہ تعالیٰ کو اپنے جلال وکمال کو سمجھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت تھوڑی ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزۡجِیۡ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیۡنَہٗ ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ رُکَامًا فَتَرَی الۡوَدۡقَ یَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِہٖ ۚ وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِیۡہَا مِنۡۢ بَرَدٍ فَیُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَصۡرِفُہٗ عَنۡ مَّنۡ یَّشَآءُ ؕ یَکَادُ سَنَا بَرۡقِہٖ یَذۡہَبُ بِالۡاَبۡصَارِ ﴿۴۳﴾ یُقَلِّبُ اللّٰہُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ ﴿۴۴﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ حرکت میں لاتا ہے بادل کو، پھر اس کے اجزاء کو جمع کرتا ہے پھر اسے تہہ بتہہ بناتا ہے، تو تم دیکھو گے بڑے بڑے بوندوں کو کہ وہ نکلتے ہیں اس کے اندر سے اور اتارتا ہے پہاڑوں کی بلندی سے ابر جس میں اولے ہوتے ہیں تو گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے اور ہٹائے رکھتا ہے انہیں جس سے چاہتا ہے، نزدیک ہے کہ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کی طاقت ختم کردے اور رات اور دن کو پلٹے کھلاتا ہے، بلاشبہ اس میں آنکھ کھولنے کا سامان ہے نگاہ والوں کے لئے“۔

یہ صاف صاف مطالعۂ کائنات کی دعوت ہے جس کا ترقی یافتہ نام ”سائنس“ ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ان چیزوں کا علم حاصل کرنا بھی اللہ کو مطلوب ہے تاکہ ان سے ذہن ان کے خالق کی طرف متوجہ ہو۔[1]

وَ اللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ ۚ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی بَطۡنِہٖ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی رِجۡلَیۡنِ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰۤی اَرۡبَعٍ ؕ یَخۡلُقُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴۵﴾

”اور اللہ نے پیدا کیا ہر نقل وحرکت کرنے والے جاندار کو ایک خاص شان کے پانی سے تو ان میں کوئی وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور کوئی دو پیروں پر چلتا ہے اور کوئی چار پر، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے“۔

ہر جاندار کی خلقت پانی سے:

دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے:

وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ : اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے قرار دیا ہے (انبیاء۔۳۰)

اس کے معنی عموماً یہ سمجھے گئے ہیں کہ آغاز تخلیق پانی سے ہوا ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بقاء ہر ذی حیات کی پانی سے وابستہ ہے۔ عام

[1] فی الآیۃ دلالۃ علیٰ وجوب النظر وفساد التقلید (تبیان)

طور پر اس آیت کو بھی جو یہاں ہے اسی مفہوم میں لیا گیا ہے مگر وہاں الماۤء کا لفظ بطور جنس وارد ہوا ہے۔ وہ مفہوم قرین قیاس ہے اور یہاں ماۤء بطور نکرہ ہے جس کے معنی ایک پانی کے ہیں لہٰذا بعض مفسرین کو تاویل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اس طرح کہ یہاں ماۤء کا لفظ جمع کے معنی میں ہے، کہ پانیوں سے۔ [۱]

مگر ابھی مطلب حل نہیں ہوتا، اس لئے کہ جنس کے لحاظ سے پانی بہت سے نہیں ہوتے، وہ ایک ہی جنس ہوتی ہے لہٰذا مفرد لفظ ہی ہونا چاہئے مگر الف لام (ال) کے ساتھ جیسے دوسرے مقام پر الماۤء ہے مگر یہاں الماۤء نہیں ہے ماۤءٍ ہے، اس لئے یہاں میرے نزدیک زیادہ ترجیح دوسرے قول کو ہے جسے بطور قول ضعیف درج کیا گیا ہے کہ یہاں پانی سے مراد نطفہ ہے جو ظاہر ہے کہ ہر ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔ [۲] جسے دوسرے مقامات پر ماۤء مھین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں پانی سے مراد وہ پانی نہیں ہے جو پیا جاتا ہے اور جو بقائے حیات کا سبب ہے یا جس سے سائنس کی رو سے ابتدائی تخلیق ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے ہماری اختیار کردہ تفسیر ہی کو اختیار کیا ہے اس لئے پہلے ماۤء کی تفسیر نطفہ سے کی ہے، پھر اس دوسرے مفہوم کو بطور قول ضعیف درج کیا ہے۔ [۳]

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۴۶

”بلاشبہ ہم نے اتاریں پردہ کشائی کرنے والی آیات اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدے راستے پر چلنے کی توفیق دیتا ہے“۔

اگر مُبَیَّنَات (یائے مشدد کے فتحہ کے ساتھ) ہوتا تو معنی ہوتے کھلی ہوئی واضح نشانیاں“ جیسا کہ بعض تفاسیر میں اس کے معنی دیئے ہیں۔ [۴] مگر متداول قرأت جس کے مطابق عام طور پر اعراب لگائے گئے ہیں مُبَیِّنَات (ی کے کسرہ کے ساتھ ہے) جو اسم فاعل ہے تو ہم نے ”پردہ کشائی کرنے والی“ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی وہ آیات جو حقیقتوں کو نمایاں کرنے والی ہیں۔ [۵]

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۴۷ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۴۸ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۴۹ اَفِيْ

---

[۱] من ماۤء ای من میاہ (علی بن ابراهیم)

[۲] قیل من ماۤء ای من نطفة ذکرہ الحسن وجعل قوله" کل داۤبة خاصا فی من خلق من نطفة (تبیان)

[۳] قیل عنیٰ به الماۤء لان اصل الخلق من الماۤء (مجمع البیان)

[۴] ای دلالات واضحات بینات (مجمع البیان)

[۵] تظهر بها المعانی ... حتی تعلم مفصلة (تبیان)

قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّحِيۡفَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَرَسُوۡلُهٗ‌ ؕ بَلۡ اُولٰۤـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝٥٠

''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور پیغمبر پر اور ہم نے اطاعت کی، پھر اس کے بعد ایک جتھا ان میں کا روگردانی اختیار کرتا ہے اور یہ لوگ ایمان والے ثابت نہیں ہوتے اور جب انہیں اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے تو ایک دم یہ نظر آتا ہے کہ ان میں کی ایک جماعت روگردانی اختیار کرتی ہے اور اگر حق میں ان کا فائدہ ہو تو آئیں گے اس کی طرف سر جھکائے ہوئے۔ کیا ان کے دلوں میں کوئی بیماری ہے یا وہ شک میں مبتلا ہو گئے ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ زیادتی کرے گا یا اس کے پیغمبر؟ (ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ خود زیادتی کرنے والے ہیں''۔

ایمان کے خلوص کی علامت یہ ہے کہ وہ بے لوث ہو لیکن جب اس میں خودغرضی نمایاں ہوئی تو یہ اس کی دلیل ہوگی کہ ایمان دل میں جاگزیں نہیں ہے۔

یہ جو منافقین کا کردار بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو حکم بنانے پر اسی وقت راضی ہوتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ فیصلہ ان کے موافق ہوگا ورنہ وہ رسول ﷺ کے فیصلہ سے انحراف کر جاتے ہیں، کیا یہی حالت اکثر مدعیان ایمان کی اس وقت بھی نظر نہیں آتی؟

عالم دین یعنی وہ مجتہد جسے وہ نائب امام کہتے ہیں، ادھر اس کا فتویٰ ان کے مفاد کے خلاف ہوا اور بس تقلید چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے، یہاں تک کہ استخارہ جسے وہ خدا کا حکم سمجھتے ہیں، اگر ان کی مرضی کے مطابق ہوا تو مانا اور اگر ان کی خواہش کے خلاف ہوا تو دوسرے عالم کے پاس جا کر استخارہ دکھلانے کے لئے تیار ہو گئے، کیا یہ استخارہ پر اعتقاد کا ثبوت ہے؟ اور اگر وہ استخارہ کو واقعی اللہ کا حکم مانتے ہیں تو کیا یہ خود اللہ کے ساتھ مذاق نہیں ہے۔ نعوذ من ذلك

اس تذکرہ کے آغاز میں یہ بات بس اب قابل تشریح ہے کہ اذا دعوا الی اللہ ورسولہ میں دو کا تذکرہ ہے کہ ''جب انہیں خدا اور رسول کی طرف دعوت دی جاتی ہے مگر پھر واحد کا صیغہ آجاتا ہے، کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے۔ یہاں تثنیہ نہیں کیا گیا کہ ''وہ دونوں ان کے درمیان تصفیہ کردیں'' یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ لفظاً اگرچہ وہ دو ہیں مگر مقام فیصلہ میں وہ ایک ہیں، یعنی جو رسول ﷺ کا فیصلہ ہے وہی حقیقت میں اللہ کا فیصلہ ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ‌ ۚ

جس نے پیغمبر کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی (نساء۔۸۰)

تو مقام فیصلہ میں اللہ رسول ﷺ سے الگ نہیں ہے۔[1]

---

[1] انما افرد قوله: ليحكم بعد قوله: الى الله ورسوله لانه حكم واحد يوقعه النبى ﷺ بامر الله (تبيان)

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ط وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾

''ایمان والوں کی جب انہیں اللہ اوراس کے پیغمبر کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردیں، بس یہ بات ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ دین و دنیا کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے اور اس سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے، تو یہی لوگ کامیاب ہیں''۔

یہ ان منافقین کے مقابل کا کردار ہے جو مومنین کے وصف میں پیش کیا جارہا ہے اور یہی کردار ان کے صحت ایمان اور خلوص کی علامت ہے۔

وَأَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ط قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ج طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ط إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾

''اور وہ اپنی ممکن طاقت بھر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں گے تو وہ ضرور نکلیں گے، کہیے کہ قسمیں نہ کھاؤ، یہ تو فرماں برداری کا عام تقاضا ہی ہے۔ بلاشبہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے واقف ہے''۔

میں نے جو ترجمہ کیا ہے، وہی الفاظ قرآنی سے میری سمجھ میں آتا ہے لیکن دوسرے مفسرین نے اس کے دو معنی اس سے الگ کہے ہیں۔
ایک یہ کہ خالق نے اُن کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ اطاعت کا زبانی اقرار تو پہلے ہی جب تم نے اظہار ایمان کیا تو اُس وقت ہو چکا ہے مگر کہاں تک وہ حقیقت کے مطابق ہے، اُسے اللہ جانتا ہے۔
دوسرے یہ کہ قسمیں کھانے سے کیا فائدہ؟ تم عملی طور پر اطاعت اور اچھی گفتگو کرو تو وہ قسمیں کھا کھا کر اس کے اقرار کرنے سے بہتر ہے اسے جناب شیخ الطائفہ نے بطور قول دوم نقل کیا ہے۔[1]
حالانکہ جس میں طاعة وقول مّعروف کے الفاظ ہیں، وہ دوسری آیت ہے، اس کی تفسیر کو یہاں درج کرنا میرے خیال میں تو مسامحہ ہی ہے لطف یہ ہے کہ علامہ طبرسیؒ نے مسامحہ میں بھی جناب شیخ کا اتباع کیا ہے۔[2]

---

[1] قيل فى معناه قولان: احدهما هذه طاعة معروفة منكم يعنى بالقول دون الاعتقاد والثانى طاعة وقول معروف امثل من هذا القسم (تبيان)
[2] قيل معناه ليكن منكم طاعة والقول المعروف (مجمع البيان)

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ اطاعت تو اللہ کو پسند ہے ہی، اس کے اظہار کی ضرورت کیا ہے۔[1]

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٥٤﴾

''کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اس پیغمبر کی اطاعت کرو، اب اگر تم روگردانی کرو تو اُس کے اوپر تو وہ ہے جو اُس پر بار ڈالا گیا ہے اور تمہارے اوپر وہ ہے جو تم پر بار ڈالا گیا ہے اور اگر تم اُس کی اطاعت کرو تو سیدھا راستہ حاصل کرو گے اور پیغمبر کے ذمہ نہیں ہے مگر صاف طور پر پہنچا دینا''۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٥٥﴾

''اللہ کا وعدہ ہے تم میں اُن افراد سے جو باایمان ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں کہ وہ اُنہیں روئے زمین پر خلیفہ قرار دے گا جس طرح اُنہیں خلیفہ بنایا تھا جو اُن کے پہلے تھے اور ضرور اقتدار عطا کرے گا ان کے سوا اُس دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ضرور اقتدار عطا کرے گا ان کے اُس دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ضرور بدل دے گا اُنہیں اُن کے ہراس کے بعد امن واطمینان، وہ میری عبادت کریں گے اس طرح کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو اسکے بعد کفر اختیار کرے تو یہی فاسق لوگ ہوں گے''۔

صاحبِ ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ:

ظاہر ہے کہ یہ خطاب کافروں سے نہیں، مسلمانوں سے ہے لیکن جو وعدہ کیا جارہا ہے، وہ اُن سب سے نہیں بلکہ اُن میں خاص افراد سے ہے، ان خاص افراد کو جو وصف بیان کیا جارہا ہے کہ وہاں باایمان ہیں اور نیک اعمال والے ہیں تو یہ وہ عام ایمان اور عمل صالح نہیں ہوسکتا جس کا ہر مسلمان کو حامل ہونا چاہیے بلکہ وہ خاص مرتبہ ایمان حقیقی اور حقیقی عمل صالح کا ہے جو خاص افراد ہی میں ہوا کرتا ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے اس آیت کے ذیل میں کافی بسیط بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے استخلاف کے معنی اُس خلیفہ بنانے کے ہیں ہی نہیں جو اسلامی اُمّت کے سربراہ کے مفہوم میں لیا جاتا ہے بلکہ گزشتہ اقوام کے بجائے اب اس قوم کو بااقتدار بنانا ہے جس کی نظیریں قرآن مجید میں بکثرت ہیں مثلاً:

---

[1] تابع داری پسند ہے (تاج العلماء)

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ [1]

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ [2]

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ [3]

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً [4]

ان تمام آیات میں اس لفظ کے معنی ایک کے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں تو یہی یہاں بھی مراد ہے۔اس صورت میں یہ وعدہ زمانہ رسول ﷺ ہی میں پورا ہوگیا جب کہ جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کا غلبہ ہوگیا۔لہٰذا اسے فتوحات سے متعلق کرنا درست نہیں ورنہ ماننا پڑے گا کہ ابھی تک وہ وعدہ پورا نہیں ہوا کیوں کہ معمورۂ ارض کا زیادہ تر حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں ہے۔اس صورت میں اہل بیت علیہم السلام کے اس ارشاد کو قبول کرنا چاہیے کہ یہ وعدہ زمانہ امام مہدی علیہ السلام سے متعلق ہے جب کہ اسلام کو تمام بسیط ارض پر غلبہ حاصل ہوگا۔[5]

تفسیر کے ذیل میں اتنا بیان کافی ہے، ورنہ اصل میں تو اس آیت پر پوری بحث علم کلام کی کتابوں میں بحث امامت کے ذیل میں ہوتی ہے۔[6]

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿56﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿57﴾

”اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر کی اطاعت کرو، شاید تم پر رحمت کا نزول ہو“۔

”نہیں جو کافر ہیں، ہرگز نہ سمجھو قابو سے باہر ہوجانے والے اطراف زمین میں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا بری جگہ وہ ہے“۔

”قابو سے باہر ہوجانے والے“ یعنی میرے عذاب سے بچ کر نکل جانے والے، ایسا ہرگز نہیں نہ سمجھو، حقیقت یہ ہے کہ وہ دنیا میں کہیں جا کر میری گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے۔[7]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا

---

[1] فاطر۔۳۹

[2] اعراف۔۱۲۹

[3] انعام۔۱۳۳

[4] فرقان۔۶۲

[5] فانّ التمکین فی الارض علی الاطلاق لم یحصل فھو منتظر انّ اللہ عزّوجل لا یخلف وعدہ (مجمع البیان)

[6] قد استرفینا ما یتعلق بالآیۃ فی کتاب الامامۃ فلا نطول بذکرہ ھھنا (تبیان)

[7] ای لا یفوقون (جلالین)

الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾

''اے ایمان لانے والو! اُن غلاموں کو جوتمہاری ملکیت میں ہوں اوراُن بچوں کوبھی تم میں سے جوحد بلوغ تک نہیں پہنچے، لازم ہے کہ تین وقتوں میں تمہارے پاس اجازت لے کر آئیں: نماز صبح کے پہلے تک اوراُس وقت جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اورعشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لئے پردہ داری کے ہیں۔ان اوقات کے علاوہ تم پر اوراُن پر کوئی سختی نہیں ہے۔تمہیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف چکر لگانا ہی ہیں، اس طرح اللہ تمہارے لئے آیات کو صاف صاف پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

گھر کے خاص افراد یہاں تک کہ بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ:

عام حکم پردہ کے بعد جو اغیار اور بالغ نامحرموں سے ہے،اب خاص الخاص گھر کے دوسرے آدمیوں، یہاں تک کہ نابالغ بچوں تک سے بھی اتنے پردہ کی تاکید کی جارہی ہے کہ انہیں بھی اُن حالات میں جب تم لباس شب خوابی میں ہوتے ہو،تمہارے پاس آزادی کے ساتھ نہیں آنا چاہیے بلکہ ہماری قدیم تفسیر سے، جو زیادہ تر اقوال معصومین علیہم السلام پر مبنی ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محرم عورتیں ماں بہن تک اس حکم میں داخل ہیں۔[1]

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

''اور جب لڑکے تم میں کے بالغ ہو جائیں تو انہیں اُسی طرح اجازت لینا چاہیے جیسے اُن کے پہلے دوسرے لوگ لیا کیے ہیں، اس طرح اللہ اپنی آیات کو تمہارے لئے واضح طور پر پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

یعنی نابالغ لڑکوں کو تو بس اُن تین وقتوں میں اجازت لینے کی ضرورت ہے مگر اب جب وہ بالغ ہو گئے تو اب وہ دوسرے نامحرم مردوں کی طرح ہو گئے، اب کسی وقت بھی بغیر اجازت اُنہیں اندر آنا درست نہیں کیوں کہ اب اُن سے عورتوں کو ویسا ہی پردہ کرنا چاہیے جیسا تمام اجنبی مردوں سے لازم ہے۔

---

[1] انّ اللہ نھٰی ان یدخل احد فی ھٰذہ الثلٰثۃ الاوقات علیٰ احد لا اب ولا اخت ولا امّ ولا خادم الا باذن (علی بن ابراھیم)

بہرحال ہوائے زمانہ کے خلاف جو مطلق پردہ کی مخالف ہے، مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(۱) صرف غیر ممیز بچوں سے کسی حال میں پردہ نہیں ہے۔

(۲) وہ بچے جو ابھی حد بلوغ تک نہیں پہنچے ہیں مگر طفل ممیز کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن سے خاص حالات میں جب کہ انسان عریاں نہیں تو نیم عریاں ہوتا ہے، پردہ لازم ہے، لیکن دوسرے حالات میں جب تک وہ طفل یعنی نابالغ ہیں، پردہ واجب نہیں ہے۔

(۳) وہ بچے جو اب بالغ ہو گئے ہیں، ان سے پورے طور پر پردہ لازم ہے اور چونکہ لڑکے کا بلوغ شرعی ۱۵ برس میں اور لڑکی کا نو برس میں ہو جاتا ہے لہٰذا پندرہ برس کے لڑکے سے پردہ ویسا ہی لازم ہے جیسا کہ کسی بھی نامحرم مرد سے لازم ہوتا ہے اور نو ۹ برس کی لڑکی پر اُسی طرح پردہ واجب ہے جس طرح کسی بھی عورت پر نامحرم مردوں سے پردہ واجب ہوتا ہے لہٰذا ۱۵ برس کے لڑکے اور ۹ برس کی لڑکی کا جن دونوں کو عرف عام میں بچہ ہی سمجھا جاتا ہے، آپس میں کھیلنا اور ساتھ رہنا، اُسی طرح شرعاً حرام ہے۔ جس طرح کسی بھی غیر مرد اور غیر عورت کا آپس میں بغیر پردہ کے میل جول ناجائز ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۶۰

''اور وہ ازکار افتادہ عورتیں جو تعلقات ازدواجی کا کوئی تصور نہیں رکھتیں، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر کے کپڑے اتار کر رکھ دیں درانحالیکہ آرائش کر کے ادھر اُدھر نہ پھیریں اور اگر پارسائی سے کام لیں تو ان کے لئے بہتر ہے اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

ضعیف العمر عورتوں کے لئے برقع چھوڑنے کی اجازت کے باوجود پردہ داری کی تاکید:

''ازکار افتادہ'' کے معنی؟ یعنی ضعیف العمری کی وجہ سے جن کے یہاں اور جن کی طرف میلاناتِ جنسی کا کوئی تصور ہی نہیں رہا ہے۔[1]

یہ اوپر کے کپڑے مثلاً برقع یا چادر اتار کر سامنے آئیں تو ناجائز نہیں مگر پھر شرط یہ ہے کہ ''آرائش کر کے ادھر اُدھر پھریں نہیں اور پھر بغیر اس کے بھی فضیلت اسی میں ہے وہ اُس طرح بھی سامنے نہ آئیں۔

''اگر پارسائی سے کام لیں'' .... یہ پارسائی بقرینہ سابق کیا ہے؟ یہی کہ برقع وغیرہ کے اوپر کے کپڑے بھی نہ اتاریں، معلوم ہوا کہ یہ اوپر کے لباس کا اُترنا ایسی ضعیف العمر عورتوں کے لئے بھی پارسائی کے خلاف چیز ہے، چہ جائیکہ جوان جہاں عورتیں تقریباً نیم برہنہ عالم میں ماری ماری پھرا کریں اور پھر ''پارسا'' کی پارسا بنی رہیں۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا

---

[1] هن المسنّات من النسآء اللاتی قعدن عن التزویج لانّه لا یرغب فی تزویجهن (مجمع البیان)

عَلٰۤى اَنۡفُسِكُمۡ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا مِنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اٰبَآٮِٕكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اُمَّهٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اِخۡوَانِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَخَوٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَعۡمَامِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ عَمّٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَخۡوَالِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ خٰلٰتِكُمۡ اَوۡ مَا مَلَكۡتُمۡ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوۡ صَدِيۡقِكُمۡ‌ؕ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا جَمِيۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا‌ؕ فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُيُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ تَحِيَّةً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً‌ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿61﴾

”اندھے پر کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور نہ خود تم اس بات میں کہ کھا ؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جس گھر کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہیں یا اپنے دوست کے یہاں سے۔نہیں ہے تم پر کوئی گناہ کہ تم کھاؤ اکٹھا یا الگ الگ تو جب کچھ گھروں میں داخل ہوتو اپنے آدمیوں کو سلام کرو۔ہدیہ ہے کہ اللہ کی طرف کا مبارک، پاکیزہ۔اس طرح اللہ آیات تمہارے لئے واضح طور پیش کرتا ہے شاید تم عقل سے کام لو“۔

بعض مفسرین نے پہلے جملہ کو جس میں معذورین کا ذکر ہے، الگ کر دیا ہے۔اب یہ بات مجمل رہے گی کہ اندھے وغیرہ میں کس بات میں گناہ نہیں کہ تم ان کے گھروں سے کھاؤ۔

بعض نے قبل کے اجمال کو جہاد وغیرہ سے متعلق کیا ہے[1] اس صورت میں یہ بعد کے ذکر سے بالکل ہی غیر متعلق ہوگا۔

بعض نے یہ مطلب قرار پایا ہے کہ ان معذورین کے ساتھ کھانے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔یہ نہ سوچو کہ وہ معذور ہونے کی وجہ سے کم کھائیں گے اور ہم زیادہ کھالیں گے مگر وہاں تو یہ ہے کہ اُن معذورین پر کوئی گناہ نہیں۔دوسروں کا ذکر کہاں ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں۔

ایک تصور یہ ہے کہ یہ پورا سلسلۂ کلام ایک ڈال ہے یعنی ان معذورین پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے گھروں سے اپنی ضرورت بھر کھائیں[2] اور تم میں سے دوسرے لوگوں کیلئے بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان گھروں سے جن کا ذکر بعد کو ہوا ہے کھائیں۔

سردست اصل الفاظ قرآن سے یہ آخری مفہوم ہی زیادہ قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے خصوصاً جب کہ اس کی نسبت ہمیں معصومین علیہم السلام کی طرف بھی مل رہی ہے اگر چہ اس نسبت کی نقل میں یہ فروگزاشت معلوم ہوتی ہے کہ بعد والے گھروں کی تخصیص ان معذورین کیلئے بھی کر دی گئی ہے

[1] جہاد و جماعت وغیرہ کا (حواشی تاج العلماء)

[2] الّذی روی عن اهل البیتؑ انہ لا باس بالا كلّ لهٔولاء من بيوت من ذكر هم الله بغير اذنهم قد حاجتهم من غير اسراف (تبيان)

اس کے معنی یہ ہیں کہ معذور اور غیر معذور سب کا ایک حکم ہے تو خصوصیت سے قبل میں ان معذورین کے خاص طور پر ذکر کی ضرورت کیا تھی؟
مجھے معذورین اور غیر میں الفاظ قرآنی سے یہ فرق محسوس ہوتا ہے کہ معذورین کیلئے سب ہی گھروں سے بقدر ضرورت کھانے یعنی اپنی جائز ضرورت پوری کرنے کا حق ہے اور دوسروں کیلئے خاص اُن گھروں سے جو بعد میں بیان ہوئے ہیں۔
یہ اور بات ہے کہ فقہی حیثیت سے مسلمہ اصول وقواعد کی بناء پر اُن معذور اشخاص کے دوسروں کے گھروں سے کھانے کو بھی ہم شرائط کے ساتھ مشروط کریں اور دوسروں کو جو اپنے عزیزوں یہاں تک کہ دوستوں کے گھروں سے کھانے کی اجازت دی گئی ہے، اُس پر بھی کچھ شرائط عائد کریں جن کی تحقیق کا یہ محل نہیں ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٢﴾

”ایمان والے بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہوں اور جب اس (پیغمبر) کے ساتھ کسی مشترک معاملہ پر غور میں مصروف ہوں تو جائیں نہیں جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں، یقیناً وہ جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں تو جب وہ آپ سے اپنی کچھ ضروریات کی وجہ سے اجازت مانگیں تو ان میں سے جسے چاہیے اجازت دے دیجیے اور ان کیلئے اللہ سے بخشش کی دعا کیجیے، بلا شبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان“۔

صاحبانِ ایمان کی شان:

”مشترکہ معاملہ“ سے مقصود یہ ہے کہ کوئی ایسا معاملہ جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں یا اپنے اپنے خدمات کو اس مہم کے لئے پیش کریں[1]
بعض صحابہ اس موقع پر اثنائے گفتگو میں یا مشورہ کے درمیان چپکے سے کھسک جاتے تھے، خالق نے اس بدتمیزی پر ٹوکا ہے اور انہیں ہدایت کی ہے کہ وہ آدابِ مجلس اور احترام رسول ﷺ کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی ضرورت سے جانا بھی چاہیں تو رسول ﷺ سے اجازت حاصل کریں، پھر جائیں۔
”جسے چاہیے اجازت دیجیے کے ساتھ یہ کہنا کہ ”اُن کیلئے بخشش کی دعا کیجیے“ یہ پتہ دیتا ہے کہ یہ اجازت لے کر جانا بھی ایک نامناسب اور خلاف ادب بات ہے کہ اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اس ضرورت کو جس کے لئے جا رہے ہیں، اُس مقصد سے جس کے لئے وہ جمع کیے

---

[1] ھو الّذی یقتضی الاجتماع علیه والتّعاون فیه (تبیان)

گئے ہیں، زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

''نہ بناؤ پیغمبر کے پکارنے کو اپنے درمیان اُس طرح جیسے تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے۔اللہ جانتا ہے تم میں کے ان لوگوں کو جو پناہ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں تو ڈرنا چاہیے انہیں جو اُس حکم سے انحراف کرتے ہیں اس بات سے کہ پہنچے انہیں کوئی آزمائش یا پہنچے انہیں دردناک عذاب''۔

رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے لئے امتیازی طور پر تعظیم واحترام کا حکم:

یعنی پیغمبر کو نام یا نسب کے ساتھ عام آدمیوں کی طرح نہ پکاریں بلکہ آپ کے منصب اور القاب کو سرنامۂ خطاب قرار دے کر آپ کی تعظیم وتکریم کے تقاضا کو پورا کریں۔[1]

یہ تعظیم واجلال کی صاف دعوت ہے جسے ایک طبقہ معیارِ توحید کے منافی قرار دیتا ہے۔

''ان لوگوں کو جو پناہ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں'' یعنی رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے خطبہ سے گھبرا کر ایک دوسرے کی پشت کے پیچھے چھپتے ہوئے مسجد سے نکل جاتے تھے[2] اس پر خالق کریم نے تنبیہ کی ہے اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

''معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ جانتا ہے اُسے جس پر تم ہو اور جس دن وہ اس کی طرف پلٹیں گے تو وہ بتائے گا انہیں جو کچھ وہ کرتے رہے تھے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

''جانتا ہے اسے جس پر تم ہو'' یعنی ایمان دل سے ہے یا نمائشی؟ اور پھر نیک اعمالی اور بداعمالی کے اعتبار سے جو تمہارا عالم ہے[3] اس سب سے اللہ خوب واقف ہے۔

---

[1] یقول لا تقولو ایا محمّد ولا یا ابا القاسم لکن قولو ایا نبی اللہ ویا رسول اللہ (علی بن ابراھیم)

[2] کان ینقل علیهم طول خطبة النبی ﷺ یوم الجمعة فیلو ذون ببعض اصحابه فخرجون من المسجد فی استتار من غیر استیذان وفیه معنی التهدید بالمجازاة (مجمع البیان)

[3] ما انتم علیه من الخیرات والمعاصی ومن الایمان والنّفاق لا یخفی علیه شیء من احوالکم (مجمع البیان)

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ

مکیّہ......۷۷......آیات

اس سورہ کی پہلی ہی آیت میں لفظ فرقان وارد ہے' اس مناسبت سے اس سورہ کا نام الفرقان ہوا حالانکہ یہ لفظ اور سوروں میں بھی وارد ہوا ہے لیکن اس کی نظیریں پہلے آ چکی ہیں کہ وہ ذکر ہے متعدد سوروں میں مگر نام اس کی مناسبت سے ایک ہی سورہ کا ہوا۔ مضامین اس سورہ میں حسب ذیل ہیں۔

سورۂ فرقان کے خاص خاص مضامین:

۱-----تعلیمات پیغمبر خدا اور قرآن مجید کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں۔

۲-----آتش دوزخ کے کیفیات کا تفصیلی بیان۔

۳-----تمام پیغمبروں کا بشر اور بشری ضروریات کا پابند ہونا۔

۴-----پیغمبر کی بارگاہ الٰہی میں شکایت کہ آپ کی اُمت نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا۔

۵-----قرآن مجید کے بتدریج اُتارے جانے کی حکمت۔

۶-----بداعمال انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا۔

۷-----پانی کے ذریعۂ طہارت ہونے کا بیان۔

۸-----میٹھے اور کھاری پانی کے سنگم میں قدرت الٰہی کا ظہور۔

۹-----اللہ کے بندوں کی شان............وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ① الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ○

''اپنے کمال ذات کے ساتھ قائم و برقرار ہے وہ جس نے قرآن اتارا اپنے بندہ پر تا کہ وہ تمام جہانوں کے لئے

تنبیہہ کرنے والا ہو، جس کے لئے بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اس نے کوئی اولاد یقیناً نہیں کی اور نہ اُس کا سلطنت میں کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا تو اس کا پورے طور پر پیمانہ مقرر کیا''۔

تبارک کے لفظ کا ترجمہ ان الفاظ میں بہت آسان تھا کہ ''بابرکت ہے وہ ذات'' مگر اردو میں برکت کا لفظ اُس مفہوم کو ادا نہیں کرتا جو عربی میں اس لفظ کے تحت میں موجود ہے۔

بس ایک محل استعمال اس لفظ کا اردو میں ہے جو اس کے اصل معنی سے قریب ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کھانے یا۔ پیسے میں بڑی برکت ہے، اس میں دوام وقرار کا پہلو نمایاں ہے، جو اس کے عربی میں معنی جو ہیں ان کے مطابق ہے۔[1]

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝٣

''اور انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے خدا بنائے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں اور نہ وہ اپنے لئے کسی نقصان پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ فائدہ پر اور نہ موت پر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زندگی پر اور نہ دوبارہ زندہ اٹھانے پر''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝٤ۚ وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝٥ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٦

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہیں سوا ایک جھوٹ کے جسے اس نے گھڑا ہے اور اُس پر کچھ دوسرے لوگوں نے اُس کی مدد کی ہے، اس طرح انہوں نے ظلم اور غلط بیانی کا ارتکاب کیا ہے اور انہوں نے کہا یہ پرانی داستانیں ہیں جنہیں اس نے لکھ لیا ہے تو وہ اسے لکھوائی جاتی ہیں صبح وشام، کہیے کہ اُسے اتارا ہے اُس نے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے، بلاشبہ وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

تعلیماتِ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں:

چونکہ اُن کی غلط اندیشیوں کا منشا یہ تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر وہ معلومات آتے تھے جو اُن کے نزدیک قوم عرب میں سے کسی کو نہیں

[1] تقدّس و جلّ بمالم یزل علیه من الصّفات ولا ینال کذٰلك (تبیان) ثبّت و قام فیمالم یزل ولا یزال عن جماعة من المفسرین (مجمع البیان)

ہو سکتے اور پھر کچھ باتیں ایسی تھیں جوان کہنے والوں کے حدود وعلم سے باہر تھیں اس لئے اُن باتوں کو جوان کے علم میں نہ تھیں، وہ آپ کی طبع زاد یا ''دروغ'' کہتے تھے اور جواُن کے علم میں تھیں مگراُن کے نزدیک آپ کواُن کا علم ہونا چاہیے، ان کے لئے کبھی یہ کہتے تھے کہ کچھ اور لوگ بتاتے ہیں اور کبھی یہ کہ پُرانے نوشتے کچھ لوگوں کے ہاتھ آگئے ہیں اور وہ لوگ آپ کے پاس آکر اُنہیں بول بول کرلکھوادیا کرتے ہیں، اس اُن کے ذہنی پس منظر کے مقابلہ میں خالق نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ ان کے ذاتی معلومات بے شک نہیں ہیں مگر جو عالم الغیب خالق ہے، وہ اُن پر بذریعۂ وحی نازل کرتا ہے، اس لئے اُن میں وہ باتیں بھی ہیں جو تمہیں معلوم ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے نزدیک اُن کا علم نہ ہونا چاہیے اور وہ باتیں بھی ہیں جو تمہارے حدودِ علم میں نہیں، اس لئے اُنہیں اُن کا طبع زاد اور دروغ قرار دیتے ہو لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے۔ نہ یہ اُن کے ذہن کی اختراع ہے اور نہ کسی آدمی یا آدمیوں کو بتائی ہوئی ہیں اور نہ پرانے نوشتوں سے حاصل کردہ ہیں، یہ تمہارے تصوّرات سب بے بصیرتی اور خام خیالی کا نتیجہ ہیں۔

شروع میں آیت کے مضمون سے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ سب کہنے والے کھلے ہوئے کفار ومشرکین ہونگے مگر آیت کا اختتامی جملہ: کان اللہ غفورا رّحیما: ''بلاشبہ وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان'' میرے ذہن میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ ظاہری مسلمان ہیں جو اصطلاحاً منافق کہلاتے ہیں، اُنہی کی باہمی سرگوشیوں کی پردہ کشائی کی گئی ہے کیوں کہ انہیں کے لئے کم از کم دنیا میں اس کی عفو ومغفرت ایسی کارفرما ہے کہ وہ اُنہیں نہ سزادیتا ہے اور نہ اُنہیں نام بنام ان کے راز افشا کر کے رسوا کرتا ہے۔ [1]

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۸ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۹

''اور اُنہوں نے کہا یہ پیغمبر عجیب ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اتارا گیا کہ وہ اُس کے ساتھ ساتھ ڈرانے والا ہوتا یا اُس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا یا اُس کے لئے گھنا باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا اور ظالموں نے کہا کہ تم پیروی نہیں کرتے مگر ایک آدمی کی جو کسی آسیب میں گرفتار ہے، دیکھیے کیسی کیسی باتیں آپ کے لئے انہوں نے کہیں تو وہ گمراہ ہوئے ایسے کہ قدرت نہیں رکھتے اب راستے پر''۔

یعنی یہ اُن کا بدل بدل کر باتیں کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آپ کے خلاف کیا معقول بات کہیں جو قابل قبول ہو، اُنہیں اپنی مخالفت کے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا۔ [2]

---

[1] کان غفورا معناہ الّذی یعلم السّر فی السّمٰوٰت والارض لا یعاجلھم بالعقوبۃ بل یستر علیھم (تبیان)

[2] قیل معناہ لا یستطیعون سبیلا الی ابطال امرک (تبیان)

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾

''قائم و برقرار ہے وہ ذات جو اگر چاہے تو آپ کیلئے اُس سے بہتر قرار دیدے، وہ بہشت جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں اور وہ آپ کے لئے عالی شان محلّات قرار دے''

یعنی حکمت الٰہی اس کی متقاضی نہیں ہے کہ اُس کے پیغمبر کچھ غیر معمولی عیش و آرام اور اقتدار ظاہری کی زندگی گزاریں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ محنت و مشقّت کرتے ہوئے نظر آئیں اور سختیاں بھی جھیلیں۔

مطلب یہ ہے کہ جسے وہ نقص قرار دے رہے ہیں کہ یہ کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں نقل و حرکت کرتا ہے یہی اللہ کے نزدیک اُن کا جوہر ہے کہ اس طرح وہ دنیا کے لئے مثال بنتے ہیں ورنہ قدرت الٰہی میں تو یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کہ وہ اُنہیں ایسی بلند معیار کی عیش و آرام والی زندگی دیتا۔ جس پر دنیا عش عش کرتی۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾

''بلکہ اُنھوں نے قیامت کو جھٹلایا اور ہم نے اُس کے لئے جو قیامت کو جھٹلائے تیار رکھا ہے دوزخ کی آگ کو، جب وہ اُنہیں دیکھے گی دور سے بھی تو وہ سنیں گے اُس کے غیظ و غضب کی آواز اور شدید چنگھاڑ اور جب وہ ڈالے جائیں گے اس کی کسی تنگ جگہ میں لوہے میں جکڑے ہوئے تو اُس وقت وہ ہائے واویلا کریں گے، آج ایک دفعہ واویلا نہ کرو بلکہ بہت دفعہ ہائے واویلا کرو۔''

اگر یہ آیت ترتیب تنزیل میں بھی قبل کی آیات سے متّصل ہے تو اُس کا ربط یہ ہے کہ اصل میں یہ چیز نہیں ہے کہ رسول کا بازاروں میں پھرنا اور آب و طعام کا محتاج ہونا ہی اُن کے لئے ایمان میں سدّ راہ ہو، بلکہ اصل تو یہ ہے کہ اس دنیا کی مادّی زندگی کے آگے وہ کسی دور حیات کے قائل نہیں ہیں اس واسطے طرح طرح کی باتیں کر کے ایمان سے گریز کر رہے ہیں۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾

''کہئے کہ کیا یہ اچھا ہے یا وہ زندگی جاوید والا بہشت جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ ہے وہ ان کے اعمال کا صلہ اور

آخری ٹھکانا ہے، ان کے لئے وہاں وہ ہے جو وہ چاہیں ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے یہ تمہارے پروردگار کے ذمہ ایک وعدہ ہے جس کا مطالبہ کیا جائے''۔

''یہ'' یعنی عذاب جہنم جس کے شدائد کا ذکر پہلے ہوا ہے۔[1] کیا یہ اچھا ہے یا پرہیز گاروں کا انجام بخیر جو بہشت کی نعمتوں کی صورت میں ہوگا؟ خود تمہاری عقل کیا کہتی ہے؟ کسے تمہیں اختیار کرنا چاہئے؟

وعدا مسئولا...... کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ یہ سوال بمعنی طلب ہے علامہ طبرسیؒ نے کئی قول نقل کئے ہیں، سب اسی محور پر گردش کرتے ہیں۔[2]

بعض لوگوں نے اسے سوال بمعنی استفسار سے لیا ہے کہ اس کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔[3] مگر میرے خیال میں اس صورت میں مسئولا عنه ہونا چاہئے نہ کہ خالی مسئولا جو کہ قرآن میں ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًاۢ بُوْرًا ﴿١٨﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿١٩﴾

''اور جس دن وہ حشر میں ان سب کو لائے گا اور انہیں جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے تھے تو وہ کہے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا وہ خود راستے سے بھٹک گئے؟ تو وہ کہیں گے کہ پاک ہے تیری ذات، ہمارے لئے یہ زیبا نہیں تھا کہ ہم تجھے چھوڑ کر کوئی اولیاء موالی بنائیں مگر تو نے انہیں اور ان کے باپ داداؤں کو خوب مال ودولت دیا یہاں تک کہ وہ یاد دہانیوں کو بھول گئے اور وہ تباہ ہونے والے لوگ تھے۔ اس طرح انہوں نے جھٹلا دیا تمہیں اس میں جو تم کہتے ہو تو تم نہ ہٹانے پر قدرت رکھتے ہو اور نہ مدد پر اور جو تم میں سے ظلم کا مرتکب ہو، اسے ہم بڑا عذاب چکھائیں گے''۔

''جن کی اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے عبادت کی تھی'' ان کا جو جواب قرآن نے بیان کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے ہی اشخاص ہیں

---

[1] بمعنی ما ذکره من السّعیر واوصافه (تبیان)

[2] قال ابن عباس معناه انّ الله سبحانه وعد لهم الجزاء فسألوه الوفاء وقیل معناه انّ الملائکة سألوا الله تعالیٰ ذٰلك لهم وقیل انّهم سألوا الله تعالیٰ فی الدّنیا الجنّة بالدّعا فاجابهم فی الاٰخرة الیٰ ما سألوه (مجمع البیان)

[3] یہ وعدہ اس سے پوچھ گچھ کے قابل ہوگا (تاج العلماء)

جوخود اپنی عبادت کرنے والوں کے دعاوی باطلہ اور غالیانہ عقائد و اقوال سے راضی نہ تھے اور اس لئے اس کی تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جناب عزیر علیہ السلام وغیرہ معصومین علیہم السلام کے نام لئے گئے ہیں۔[1] مگر حقیقت یہ ہے کہ بے جان معبود بھی یعنی بت اگر شعور کے مالک ہوں۔ تو وہ بھی اپنے عبادت گزاروں سے راضی نہ ہوں اور خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ روز قیامت ان میں بھی شعور ماضی و حال پیدا کر دے اور ان سے یہ سوال و جواب ہو جیسا کہ دوسرا قول ہے۔

مگر وہ خود قرآن مجید کی ان دوسری آیات کے ساتھ سازگار نہیں ہے جن میں بتوں کا بھی اپنے عبادت گزاروں کے ساتھ دوزخ میں جھونکا جانا مذکور ہے، اس لئے میں پہلے ہی قول کو درست سمجھتا ہوں۔[2]

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے پیغمبروں کو مگر یہ کہ وہ بھی کھانا کھاتے تھے، اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تم میں سے ایک کو دوسرے کے لئے ذریعہ آزمائش بنایا ہے، کیا تم لوگ صبر و برداشت سے کام لو گے؟ اور آپ کا پروردگار خوب دیکھنے والا ہے“۔

یہ ان کی اس بات کا جواب ہے جو چند آیات کے پہلے آچکی ہے، کہ یہ پیغمبر عجیب ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔[3] کہا جا رہا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، جتنے انبیاء پہلے آئے ہیں، وہ سب ایسے ہی تھے۔

”ایک دوسرے کے لئے ذریعہ آزمائش“ یعنی یہی تو تمہارا امتحان ہے کہ اپنے ایسے انسانوں کے سامنے ان کے کمالات اور معجزات سے ان کے نمائندہ خالق معلوم ہونے کے بعد تم سر جھکاتے ہو یا نہیں اور ان کا بھی امتحان ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے عصمت کے اس نقطہ پر کس طرح باقی رہتے ہیں جو ان کے شایان شان ہے۔ اس طرح تمہارے اور ان کے دونوں کے صبر کا امتحان ہے۔

ان جنہوں نے بشر کہہ کے رسول ماننے سے انکار کیا، وہ بھی اس امتحان میں ناکام ہوئے اور جو آج رسول یا امام مانتے ہوئے ان کی بشریت سے انکار کر رہے ہیں یا بشر کے آگے کوئی نوع تجویز کرتے ہیں، وہ بھی اس امتحان میں ناکام ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

---

[1] قال مجاهد یعنی عیسٰی وعزیر (تبیان)

[2] قیل یعنی الاصنام عن عکرمة والضحاك (مجمع البیان)

[3] هو جواب لقولهم: مالهذا الرّسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق (تبیان)

''اور وہ جنہیں ہم سے ملنے کی کوئی توقع نہیں، کہتے ہیں کہ کیوں نہ ہم پر فرشتے اتارے گئے یا ہم اپنے پروردگار کو آنکھوں سے دیکھتے؟ انہوں نے اپنے دل میں گھمنڈ کیا اور بڑی سرکشی سے کام لیا''۔

یہ ان کا کہنا ہے کہ ''ہم پر'' فرشتے کیوں نہ اترے یا اپنے پروردگار کو ہم نے اپنی آنکھوں سے کیوں نہ دیکھا'' اس کے اندر یہ جذبہ کارفرما ہے کہ ایک اپنے ایسے آدمی کے سامنے سر جھکانا ہماری شان کے خلاف ہے یہی ذہنی پس منظر ہے جس کی پردہ کشائی قرآن نے استکبرو فی انفسھم کہہ کر کی ہے یعنی یہ کہنا تکبر اور اپنے اُوپر گھمنڈ کے باعث سے ہے جس کا نتیجہ ''خواری'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾

''جس دن فرشتوں کو آنکھوں سے دیکھیں گے، اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی اور وہ کہیں گے ارے یہ تو مکمل محرومی رہی اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے اعمال کی طرف جو انہوں نے کئے ہیں تو کر دیں گے انہیں بالکل بے حقیقت، اس دن بہشت والے اچھے ہوں گے قرارگاہ کے لحاظ سے اور بہتر ہوں گے جائے استراحت کے اعتبار سے''۔

فرشتوں کا عام لوگوں کے سامنے آنا قیامت سے وابستہ:

یہ قیامت کے دن کا حوالہ ہے ان کے یہاں جیسا کہ اس کے قبل کی آیت میں گزرا، دو باتیں تھیں، ایک یہ کہ فرشتے ہم پر اتریں اور دوسرے ہم خود اپنے پروردگار کو آنکھوں سے دیکھیں۔ اگر قیامت کے ہنگامہ میں پروردگار کے دیدار کا تصور صحیح ہوتا تو خالق اپنے جواب میں قیامت کے دن کی کیفیت میں اس کا ذکر کرتا مگر قیامت کے دن بھی جس چیز کو ثابت کیا گیا ہے وہ فرشتوں کا آنکھوں سے دیکھنا ہے جو کہ ممکن ہے لیکن اللہ کا آنکھوں سے دیکھنا، وہ تو جس طرح اس دنیا میں ناممکن ہے، ویسے ہی قیامت میں بھی لہٰذا اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

اب یہ فرشتوں کا دیکھنا بھی جس کے وہ آرزومند تھے، قیامت میں وقوع میں تو آئے گا مگر وہ ان پر بہت مہنگا پڑے گا کیوں کہ اس دن ان کی بداعمالیوں کی سزا تو ملے ہی گی، جو دنیا میں اچھی قسم کے کام کئے ہوں گے، انہیں بھی اس دن وہ اپنے کفر کی وجہ سے دیکھیں گے کہ اکارت گئے اور جو محنت ان کے سلسلہ میں کار خیر سمجھ کو انہوں نے کی تھی، وہ برباد ہوگئی۔

وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ''وہ کہیں گے، کون کہیں گے؟ اس میں اختلاف ہے، ایک تفسیر یہ ہے کہ وہ کافر یہ کہیں گے اس کے لحاظ سے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ارے! یہ تو مکمل محرومی ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ فرشتے کہیں گے اور مطلب یہ ہے کہ آج کسی قسم کی خوشی یا سکون و آرام کی چیز تم پر حرام ہے۔[1]

---

[1] یقولون حجرا محجورا ای حراما محرّما قال قتادۃ والضّحاک ھو من قول الملئکۃ یقولون حراما محرّما علیکم البشرٰی (تبیان)

کافروں ہی کا قول قرار دیتے ہوئے بھی ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ حجرا محجورا ایک محاورہ ہے کہ جب کوئی جان لینے آئے تو امان مانگنے کے لئے یہ الفاظ کہتے ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری جان کا لینا تم پر حرام ہے۔[1]

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۣ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾

''اور جس دن بادل کے ساتھ ساتھ آسمان شق ہو جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے جیسا اتارا جانا چاہئے، اس دن اقتدار کل حقیقی معنی میں سب خدائے رحمٰن سے مخصوص ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا''۔

دنیا کے بادشاہوں کی جو سلطنت کہلاتی ہے، وہ تو نام کی ہے اور وہ نام بھی اس دنیا تک ہے۔ اصل اقتدار خالق کائنات کا یہاں بھی ہے مگر وہ مجاز کے تہ در تہ پردوں کی وجہ سے بہت سی دھندلی نظر والوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ قیامت کے دن وہ بالکل بے حجاب طور پر سب کے سامنے ہوگا اور تب سب کو پتہ چلے گا کہ حقیقی سلطنت کس کی ہے۔[2]

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾

''اور جس دن ظالم آدمی اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتا ہوگا، کہے گا کاش میں پیغمبر سے رسم وراہ رکھتا، کاش میں فلاں شخص کی بات نہ مانتا، اس نے مجھے نصیحت قبول کرنے سے بھٹکایا بعد اس کے وہ مجھ تک پہنچی، اور شیطان انسان کو بڑا بے سہارا چھوڑ دینے والے''۔

وہ فلاں شخص جو قیامت تک گمراہی کا ذمہ دار ہے:

آخر والی آیت کے آخری جز سے تو ذہن کہتا ہے کہ قبل والی آیت میں ''فلاں شخص'' سے مراد شیطان ہی ہے، لیکن اس لفظ کے ابہام میں ایسا انسان بھی مراد ہوسکتا ہے جو شیطان ہی کی طرح گمراہ کرے اور وقت آنے پر اس کا کردار بھی وہی ہوگا جو شیطان کا بتایا گیا ہے کہ وہ انسان کو بے سہارا چھوڑ دیا کرتا ہے۔[3]

غور کرنے پر اس پہلے سے مزید تقویت اسی کو ہوتی ہے کہ جب بعد میں صاف شیطان کا نام موجود ہے تو قبل میں فلان کی لفظ کے ساتھ ابہام رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس ابہام سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے ہر دور میں کوئی بھی ایسا شخص مراد ہے جس نے کسی کو بھی حق کے قبول کرنے سے

---

[1] کانوا یقولون فی الدّنیا اذا لقوا من یخافون عنہ القتل حجرا محجورا دماؤنا عن مجاھد (مجمع البیان)
[2] ای الملك الّذی ھو الملك حقّا ملك الرحمٰن یوم القیامۃ (تبیان)
[3] یتناول کلّ خلیل مضلّ عن الدّین (مجمع البیان)

روکا ہوا اور اپنی باتوں سے اسے گمراہ کیا ہو جس میں سب سے مقدم وہ ہوگا جس نے شروع ہی میں کوئی جملہ ایسا کہہ دیا ہو یا کوئی کاروائی ایسی کر دی ہو جو قیامت تک کے ایک بڑے طبقہ کی گمراہی کا سبب بن جائے تو یہ فلاں شخص اس کا مستحق ہوگا کہ قیامت تک ہر گمراہ ہونے والا فلاں کی جگہ اس کا نام لے۔

وَقَالَ الرَّسُوۡلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِى اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا ﴿۳۰﴾

''اور پیغمبر کہیں گے اے میرے پروردگار! میری امت نے اس قرآن کو بالکل ترک کر دیا تھا''۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ الٰہی میں شکایت:

یہ پیغمبر جو اپنی امت کا شکوہ کر رہا ہے، کسی اور دور کا پیغمبر نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔[1] جو القرآن کی لفظ سے ظاہر ہے اور یہ امت جس کا شکوہ ہے، وہ غیر مسلم نہیں ہیں جنہوں نے قرآن کو کلام ربانی مانا ہی نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو اسے اپنی کتاب مانتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے یہ ان کا شکوہ وہ کر رہا ہے جسے گناہگاروں کی سفارش کے منصب پر مامور کیا گیا ہے۔

کسی شاعر نے آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ستم ڈھانے والوں کے لئے جو کہا تھا:

ویل لمن خصماؤہ شفعاؤہ.

غضب ہے ان کے لئے کہ جو ان کی سفارش کرنے والے ہیں، وہی ان کے خلاف فریق ہیں۔

یہ کیا یہاں پر منطق نہیں ہے......؟

یاد رہے کہ شکوہ اور سفارش، دو متضاد چیزیں ہیں، اس لئے یہ وہی بدنصیب گناہگار ہو سکتے ہیں جو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہوں اور اس صورت میں وہ ظالمین بھی جن کا اس کے قبل ذکر تھا کہ وہ اپنی بوٹیاں کاٹ رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کاش میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک راستہ رکھتا ہوتا۔ مسلمان ہی ہیں ''مخلص مسلمان'' اور اب وہ فلاں بھی جس کے دوست بنائے جانے پر وہ ہاتھ مل رہے ہیں، کہیں دور پر نہیں ہوگا۔ آس پاس ہی ہوگا جس کی پیروی نے انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نصوص و ہدایات پر عمل کرنے سے باز رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ نص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں اجماع اور شوریٰ وغیرہ کا ڈھونگ رچایا۔

یہی وہ ہے جو الفاظ آیت سے ہمارے ذہن میں آتا ہے مگر عام مفسرین اس پورے سلسلہ کو مکہ کے مشرکین سے متعلق قرار دیتے ہیں جو قرآن کو سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اور سمجھنے کا کیا ذکر سننے ہی کے لئے تیار نہ تھے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ‌ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيۡرًا ﴿۳۱﴾

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے ایک دشمن قرار دیا گنہ گاروں میں سے اور کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت

---

[1] قال الرّسول محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (جلالین)

رہنما و مددگار"۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے ہر ایک نبی کا اپنے جبر وقہر سے کسی کو دشمن بنایا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے لوگ ہوا کئے ہیں جنہیں ان کے کردار کی وجہ سے اللہ دشمنان خدا و رسول ﷺ میں محسوب کرتا رہا۔[1]

ہمارے یہاں تفسیر میں اس کے متعلق جتنے اقوال ہیں سب کا ہر پھر کر مطلب یہی ہوتا ہے۔

بے شک علامہ طبرسیؒ نے ایک دوسرا پہلو پیدا کیا ہے، جو بحسب واقعہ بھی درست ہے، اور الفاظ قرآنی سے بعید بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ خالق نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور انہیں مامور فرمایا ایسی باتوں کے کہنے پر جو ان لوگوں کی افتاد طبع کے خلاف اور ان کے ذہن پر بار تھیں جیسے ان کے غلط عادات وافعال پر اعتراض اور ان کے معبودوں کی مذمت جس سے وہ لوگ ان رسولوں کے دشمن ہو گئے تو چونکہ ان کی دشمنی کا باعث جو باتیں تھی وہ اللہ کے حکم سے تھیں، اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے ہر رسول کا بہت لوگوں کو دشمن بنا دیا۔[2]

ہم نے اس آیت کو گزشتہ آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا تو وہ گزشتہ آیات کے اس مضمون کے ساتھ جسے ہم نے ترجیح دی ہے، چسپاں نظر آتی ہے، خصوصاً آخر کے فقرے کی وجہ سے کہ کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت رہنما و مددگار" کیوں کہ نبی کی دشمنی اور خالق کی رہنمائی میں بظاہر کوئی ربط نظر نہیں تھا لیکن جب سابق میں جو فلاں تھا اس کے کردار میں جو قرآن نے بتایا ہے، یہ دیکھتے ہیں کہ لقد اضلنی عن الذکر 'اس نے بھٹکا یا نصیحت قبول کرنے سے" تو اب اس کے اضلال کے ساتھ اللہ کا ہادی یعنی رہنما ہونا بالکل مرتبط ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دشمن بھی رسول ﷺ کا وہی فلان ہے کہ جو رسول ﷺ کا نصب العین ہے قیامت تک کے لئے خلق خدا کی ہدایت کا سامان کرنا (لن تضلو بعدی) اور یہ فلان جو آپ کا اور آپ کے اس مقصد کا دشمن ہے رسول ﷺ کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور اس طرح خلق خدا کی گمراہی کا سامان کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت رہنما و مددگار" یعنی لاکھ یہ گمراہی کا سامان کرے، پھر بھی توفیق الٰہی اور ہدایت ربانی سے ایک گروہ راہ ہدایت پر قائم و برقرار رہے گا، چاہے وہ اقلیت میں ہو تو تاریخ ہدایت کی سنت مستمرہ یہ رہی ہے کہ حق کے جادہ پر قائم رہنے والے کم ہوتے ہیں، جو قرآن کی کثیر التعداد آیات سے ظاہر ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر پورا قرآن اکٹھا کیوں نہیں اتارا گیا (ہاں) اسی طرح مقصد یہ ہے کہ ہم اس سے آپ کے دل میں ثبات واستقلال پیدا کریں اور (اسی لئے) ہم نے اسے پوری طرح ٹھہر ٹھہر کر سنایا ہے"۔

قرآن مجید کے بتدریج اتارے جانے کی حکمت:

---

[1] المعنی انّ اللہ حکم بانّہ علیٰ ھٰذہ الصّفۃ ......وقیل جعلنا ببیا ننا انّھم اعداؤھم کما یقال اجعلہ لصّا او خٓئنا وقیل معناہ امرنا ان یسمّو ھم اعدآء (تبیان)

[2] وکانت ھٰذہ اسباب داعیۃ الی العداوۃ فاذا امرہ بھا فقد جعلھم عدوّالہ (مجمع البیان)

نکتہ چینی کے لئے تو کوئی بہانہ چاہئے چنانچہ ایک بات منکرین قرآن نے یہ کہہ دی کہ آخر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں اتر رہا ہے؟ ایک دم پوری کتاب کیوں نہیں آ گئی، خالق نے پہلے خود رسول ﷺ کے لئے اس کی مصلحت بیان کی ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف حالات میں جو آپ کو مشکلات پیش آتی ہیں، ان میں یہ ہر ہر وقت پر وحی کا اترنا اور قرآن مجید کی آیات کا آنا آپؐ کے لئے نفسانی طور پر بڑی ڈھارس کا باعث ہوتا ہے اور آپ کے لئے مشکلات کے مقابلہ میں بڑا سہارا رہتا ہے۔[1] چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب چند روز وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی تھی تو رسول پریشان ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی یہ پریشانی اضطراب کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَ اَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا ﴿۳۳﴾

''اور وہ آپ کے سامنے کوئی خاص بات نہیں لاتے، مگر یہ کہ ہم حقیقت پیش کر دیتے ہیں اور زیادہ تشریح کی صورت میں''

مخالفین کے مقابلہ میں دوسری مصلحت یکجائی طور پر ایک کتاب کی صورت میں قرآن نہ اترنے کی یہ ہے کہ حسب موقع جیسی بات یہ کہیں فوراً اس کا جواب دے دیا جائے اور سننے والوں کے ذہن کو بلند سے بلند مطالب حقہ سے بہرمند کیا جائے۔[2]

اَلَّذِیۡنَ یُحۡشَرُوۡنَ عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ اِلٰی جَہَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۳۴﴾

''وہ جو دوزخ کی طرف منہ کے بل روانہ کیے جائیں گے، یہ بدترین عمل کے لحاظ سے اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں راستے کے اعتبار سے۔''

یحشرون علیٰ وجوھھم کا عموماً مطلب یہی کہا گیا ہے، وہ منہ کے بل محشور ہوں گے[3] اور اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ منہ کے بل کھینچے جا رہے ہوں گے اور ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ منہ کے بل چل رہے ہوں گے، یہ حدیث صحاح اہل سنّت میں وارد ہوئی ہے جسے ہمارے علماء نے بھی نقل کیا ہے[4] قرآن مجید میں بھی ایک دوسری جگہ صراحۃً ہے کہ

یَوۡمَ یُسۡحَبُوۡنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ ؕ ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ

جس دن وہ آگ میں چہروں کے بل کھینچے جا رہے ہوں گے، چکھو اس آگ کا مزہ۔ (سورۂ قمر۔۴۸)

---

[1] ای لیقویٰ بہ قلبك وتزداد بصیرۃ وذٰلك انّہ اذا کان یأتیہ الوحی متجدّدا فی کلّ حادثۃ وکلّ امر کان ذٰلك اقویٰ لقلبہ وازید فی بصیرتہ (مجمع البیان)

[2] ای لم ینزّل القراٰن جملۃ واحدۃ لانّھم لا یاتونك بشیٔ یریدون بہ ابطال امرك الّا جئناك بالحق الّذی یبطلہ واحسن تفسیرا ممّا یاتونك بہ واجود معانی (تبیان)

[3] افتاد و بدروی خویش (شاہ ولی اللہ)

[4] فی الحدیث: انّ الّذی امشاھم علیٰ اقدامھم قادر علیٰ ان یمشیھم علیٰ وجوھھم (تبیان) اوراده لبخاری فی الصحیح (مجمع البیان)

مگر وہاں دوزخ میں کھینچے جانے کا ذکر ہے اور یہاں موقف حشر کی طرف جانے کا جس کیلئے ایک مقام پر قرآن مجید میں ہے:

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ: (قمر۔۷) پکارنے والے کی آواز کی طرف سر جھکائے۔

اور ایک جگہ ہے:

نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ: (سجدہ۔۱۲) اپنے سر جھکائے ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف مقامات پر مختلف موقعوں کی تصویریں ہیں کیوں کہ دور قیامت کے احوال واہوال کا سلسلہ طولانی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿٣٥﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿٣٦﴾

”اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عنایت کی اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ہارون کو وزیر بنایا، اس کے بعد کہا کہ تم دونوں بھائی اس جماعت کی طرف جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اس کے بعد ہم نے ان لوگوں کو تہس نہس کر دیا۔“

ظاہر ہے کہ درمیان کی کڑیاں سلسلۂ بیان میں چھوڑ دی گئی ہیں، اس لئے کہ وہ قرآن ہی میں مختلف موقعوں پر بیان ہوتی رہی ہیں یعنی وہ اس حکم کے بعد جو اُن کے پاس گئے اور اپنی رسالت کا اظہار کیا تو اُس جماعت کو جھٹلایا اور ان کا مقابلہ کیا جس کے ذیل میں ساحروں کا پورا واقعہ ہے اور جناب موسیٰ کا مصر سے نکلنا اور فرعون کا اپنی قوم والوں کے ساتھ ان کا تعاقب کرنا اور سامنے دریا کا آنا اور جناب موسیٰ علیہ السلام کے لئے بحکم الٰہی عصا کی ضرب سے دریا کا شگافتہ ہونا اور موسیٰ کا مع بنی اسرائیل کے اُس پار جانا اور فرعون اور اُس کے تمام قوم کا اس دریا میں ڈوب جانا، بس یہ آخری انجام وہ ہے جسے یہاں قرآن نے یوں کہا ہے کہ ہم نے ان کو پورے طور پر تہس نہس کر دیا۔[1]

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٣٧﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿٣٨﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿٣٩﴾

”اور نوح کی قوم والے، جب اُنہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور اُنہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی قرار دیا اور ہم نے ظالموں کے لئے دردناک عذاب تیار رکھا ہے اور عاد اور ثمود اور رس والے اور ان کے بیچ میں بہت سی نسلیں اور ہر ایک کے لئے ہم نے مثالیں پیش کیں اور پھر ہم نے ہر ایک کو پوری طرح تہس نہس کر دیا۔“

”نوح علیہ السلام کی قوم نے براہ راست تو نوح علیہ السلام کی تکذیب کی مگر چونکہ پیغام تمام پیغمبروں کا بنیادی طور پر ایک ہوتا ہے، اس لئے ایک

---

[1] فی الکلام حذف ای فذھبا الیھم فلم یقبلوا منھما وجحدوا نبوتھما فدمّرناھم (مجمع البیان)

کے ساتھ تمام پیغمبروں کی تکذیب ہوتی ہے۔[1]

رس کے معنی کنویں کے ہیں[2] اس کنویں کا واقعہ کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کو اُس کنویں میں ڈال دیا[3] دوسری روایت یہ ہے کہ وہ لوگ اُس کنویں کے اردگرد بیٹھے تھے کہ وہ زمین دھنس گئی اور وہ سب مع مکانات کے زیرزمین چلے گئے[4] تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اُس کنویں کے پاس کی بستی میں رہتے تھے۔ اُن کا پتہ دینے کے لئے کنویں کا نام لیا گیا ہے۔[5]

مثالیں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ امتوں پر جس جس طرح عذاب نازل ہوا، اُس کے تذکرے دوسری قوموں کے سامنے پیش کیے گئے تاکہ وہ اس سے سبق لیں اور سمجھیں کہ ہم نے اس طرح کفر کیا اور بداعمالیاں اختیار کیں تو ہم بھی عذاب میں گرفتار ہوں گے[6] پھر جب اُنہوں نے اس سے اثر نہیں لیا تو آخر ایسا عذاب آیا کہ وہ تہس نہس ہو گئے۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِىْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾

”اور یہ گئے ہیں اُس بستی میں جس پر بری طرح کا مینھ برسایا گیا تھا، تو کیا وہ اسے آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی حشر و نشر ہوگا۔“

فریقین کی تفسیریں متفق ہیں کہ بستی سے مراد قوم لوط کی سرزمین ہے جس پر پتھروں کی بارش کا عذاب نازل ہوا تھا۔[7]

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

”اور جب وہ آپ کو دیکھیں گے تو بس آپ کا مذاق اڑائیں گے“ کیا یہ وہ ہے جسے اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ وہ تو قریب تھا کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے بھٹکا ہی دے۔“ اگر ہم اُن پر استقلال کے ساتھ جمے نہ رہتے، اور اُنہیں معلوم ہوگا جب عذاب آنکھوں سے دیکھیں گے کہ کون راستے سے زیادہ بھٹکا ہوا ہے۔“

---

[1] لانّ الانبیآء یصدق بعضھم بعضا ..... فمن کذّب بواحد منھم فقد کذّب بھم جمیعھم (تبیان)

[2] رہنے والے کنویں کے (شاہ رفیع الدّین)

[3] کہتے ہیں کہ ایک امّت نے اپنے رسول کو کنویں میں بند کر دیا پھر ان پر عذاب آیا، تب وہ رسول خلاص ہوا (موضح القرآن)

[4] اسم ئبرو نبیّھم شعیب وقیل غیرو کانوا اقعودا حولھا فانھارت بھم ومنازلھم (جلالین)

[5] رہنے والے کنویں کے (شاہ رفیع الدّین)

[6] ای کلا بیّنّا لھم انّ العذاب نازل بھم ان لم یؤمنوا عن مقاتل (مجمع البیان)

[7] ھی سدوم قریۃ قوم لوط (علی بن ابراھیم) ھی عظمیٰ قویٰ قوم لوط (جلالین) قریۃ قوم لوط امطروا بالحجارۃ (مجمع البیان)۔

ان کا رسول ﷺ کی ہدایت کو یہ کہنا کہ وہ ہمیں گمراہ کر دیتا، بالکل ویسی ہی دھاندلی ہے جو ''خرد کو جنون اور جنوں کو خرد'' کہنے یا سمجھنے میں ہوا کی ہے، چونکہ ایسوں کو قائل معقول کرنا عموماً بے سود ہوتا ہے، اس لئے خالق نے اُن کی بات کے مقابلہ میں صرف مستقبل کا حوالہ دیا ہے کہ جب عذاب سامنے آئے گا، تب سمجھیں گے کہ کون بھٹکا ہوا تھا؟ وہ جو ایمان اختیار کرتے ہیں یا یہ جو ایمان سے منحرف ہیں۔ [1]

اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ۙ﴿۴۳﴾ اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا ﴿۴۴﴾

''کیا آپ نے دیکھا ہے اُسے کہ جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنائے رکھا؟ تو کیا آپ اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ یا آپ کیا ایسا سمجھتے ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں ہیں یہ مگر مثل چوپایوں کے بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں۔''

پست کردار انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا:

چوپایوں کے مثل کردار میں ہیں جیسے اُن کے افعال صرف خواہشات اور جذبات کی بنا پر ہوتے ہیں، امتیاز حق و باطل سے بحث نہیں ہوتی، ویسے ہی یہ لوگ صرف جذبات کی رو میں بہتے اور خواہشات کے جھگڑوں میں اڑتے ہیں، امتیاز حق و باطل سے اُنہیں تو کوئی مطلب نہیں تو ان میں چوپایوں میں فرق ہی کیا ہوا؟ اور ''چوپایوں سے بدتر ہیں'' اس لئے کہ وہ جانور عقل و شعور رکھتے ہیں نہیں اور یہ کمبخت عقل و شعور کی طاقتیں رکھتے ہوئے ان سے کام نہیں لیتے پھر یہ کہ جانور بھی ان غذاؤں سے جو ان کے لئے مضر ہیں، طبعی طور پر پرہیز کرتے ہیں اور یہ جان بوجھ کر وہ باتیں کرتے ہیں جو اُن کے لئے ہلاکت دنیا و دین کی باعث ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَيۡهِ دَلِيۡلًا ۙ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا قَبۡضًا يَّسِيۡرًا ﴿۴۶﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا اپنے پروردگار کو کہ اُس نے کیوں کر سائے کو پھیلا یا اور اگر وہ چاہتا تو تھما ہوا کر دیتا، پھر ہم نے سورج کو اُس کا رہنما قرار دیا۔ پھر اسے اپنی طرف سمیٹا تھوڑا تھوڑا کر کے۔''

اُس کے مضمون کو عام سمجھنے کے ساتھ پھر بھی بعض حضرات ایسے مفرد تخاطب کا روئے خطاب رسول ﷺ ہی کی طرف لیتے ہیں [2] جو ہمارے نزدیک بلا وجہ ہے جس پر مختلف مقامات پر اسی تفسیر میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

---

[1] ای من اخطاء طریقا عن الھدیٰ اھم ام المؤمنون (مجمع البیان)

[2] یقول اللہ تعالیٰ لنبیّہ محمّد ﷺ متوجہ الی جمیع المکلفین الم تر یا محمّد ﷺ (تبیان)

سورج کو اُس کا رہ نما قرار دیا یعنی سایہ سورج کے اِدھر اُدھر ہونے سے گھٹتا بڑھتا ہے[1] اب خواہ یہ ادھر اُدھر ہونا خود سورج ہی کی گردش ہو جواب سے پہلے کا تصور تھا یا زمین کی گردش سے ہو جواب کا مسلّم الثبوت تصور ہے۔

''اگر وہ چاہتا تو اسے تھما ہوا کر دیتا'' یعنی وہ سایہ ایک حال پر رہتا، گھٹتا بڑھتا نہیں، یہ بھی ان میں سے کسی ایک تصور سے وابستہ نہیں ہے، بہر حال وہ چاہتا تو اس شے کو جس کی حرکت سے سایہ گھٹتا بڑھتا ہے، ساکن کر دیتا اور چونکہ سایہ کا گھٹتا بڑھتا رہنا اس کی حرکت سے ہے تو جب وہ شے ساکن ہو جاتی تو یہ ایک حال پر ٹھہر جاتا، نہ گھٹتا، نہ بڑھتا۔[2]

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿٤٧﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے تمھارے لئے رات کی پوشش بنائی اور نیند کو آرام اور دن کو چہل پہل بنایا''۔

اس سے ظاہر ہے کہ بعض والیان ملک اور رؤسا کا یہ دستور جو ہم نے دیکھا ہے اور ان کے پہلے شاید سلاطین روزگار کا ہو گا کہ وہ رات کو جاگتے اور دن کو سوتے تھے، یا کوئی اب ایسا کرے وہ اصولِ فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً طَهُوْرًا ﴿٤٨﴾ لِّنُحْيِۦ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿٤٩﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا خوش خبری دیتا ہوا اس کی رحمت کے آگے آگے اور ہم نے آسمان سے پانی جو پاک اور پاک کرنے والا ہے تاکہ اس سے زندہ کریں مردہ زمین کو اور اسے پلائیں مخلوقات میں سے چوپایوں اور بکثرت آدمیوں کو''۔

پانی کا ذریعہ طہارت ہونا:

پانی کے لئے طہور کا لفظ قرآن میں آیا ہے اور زمین کے لئے حدیث کے لئے حدیث میں آئی ہے اس طرح کہ ارشاد حضرت رسالت ؐ ہے:

جعلت لی الارض مسجدا و طھورا:

میرے لئے زمین محل سجدہ اور طہور بنائی گئی۔

یہ طہور کا لفظ طہارت سے مبالغہ کے ساتھ ہے جس کے لفظی معنی تو زیادہ پاک کے ہوئے لیکن شیعہ سنّی دونوں فریقوں کے یہاں اس

---

[1] الظّلة يتبع الدّليل الّذى هو الشمس كما يتبع السا ئر فى المفا دة الدّليل (تبيان) يعنى بهرحال صفت كه آفتاب تقاضا مى كندمى رود (فتح القرآن)

[2] قادر علیٰ تسكين الشمس حتىٰ يبقى الظّل ممدودا (مجمع البيان)

کے معنی مُطَهِّرِیَّت کا جزء داخل ہے جس کی بنا پر طھور کے معنی ہوں گے بجائے خود طاہر ہونے کے ساتھ دوسری چیزوں کو طاہر کرنے والا۔[۱]
یہ مفہوم اس لفظ سے کس طرح نکلتا ہے؟ یہ بحث شرح لمعہ سے لے کر جواہر الکلام تک فقہ کی استدلالی کتابوں میں کافی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾

اور ہم نے اسے ان کے درمیان طرح طرح سے پیش کیا ہے تا کہ وہ نصیحت قبول کریں، پھر زیادہ تر لوگوں نے نا شکرے پن کے سوا (کسی دوسرے راستے کے اختیار کرنے سے) انکار کیا"۔

پہلی ہی نظر میں اس کا کوئی تعلق قبل کی آیت سے ہمارے ذہن میں نہیں آیا بلکہ صرفناہ کی ضمیر کا مرجع بلا غور وخوض ہمارے ذہن نے اس ہدایت یا تعلیم وتلقین اور نصیحت کو قبول کیا اور اس لئے ہم نے صرفناہ کا ترجمہ "طرح طرح سے پیش کیا" کے الفاظ میں کر دیا اور کچھ مترجمین ومفسرین اس سے متفق ملے[۲] مگر اس کے برخلاف ایک تشریح اس آیت کی اسے قبل والے مضمون سے متعلق کرتے ہوئے اسطرح ہوئی ہے کہ صرفناہ کی ضمیر پانی کی طرف راجع ہے۔ اب معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس (پانی) کو ان کے درمیان مختلف صورتوں سے گردش دی۔[۳] مگر اکثر ناشکرے پن سے کام لیتے ہیں کہ بارش کو ستاروں وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں اور ہماری قدرت کی کارفرمائی کے منکر ہیں[۴] مگر یہ تشریح ہمارے ذہن سے چسپاں نہیں ہوتی خصوصاً بعد کی آیات کو دیکھتے ہوئے لہٰذا ہم نے ترجمہ اس تفسیر کا تتبع نہیں کیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو ہر گاؤں میں ایک عذاب الٰہی کی اطلاع دینے والا بھیجتے تو آپ کافروں کا کہنا نہ مانیے اور اس کے ذریعہ سے اُن کے مقابلہ میں بہت بڑا جہاد کرتے رہیے"۔

ابھی تک انہیں ایک رسول کے آنے پر اتنا تعجب ہے، یہ تو اب حکمت الٰہی متقاضی ہوئی کہ اس رسول ﷺ کو تمام دنیا کے لئے اکیلا رسول بنا کر بھیجا جائے ورنہ اس کے پہلے تو ایک ایک وقت میں کئی کئی نبی ہوا ہی کیے تھے، اگر خدا چاہتا تو اب بھی ایسا ہی کرتا۔ اس میں حیرت و استعجاب کی کیا بات ہے۔

دوسرا رخ اس آیت کے مفہوم میں یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ رسول ﷺ خدا پر ایک طرح سے اپنے خصوصی فضل وکرم کا اظہار ہے کہ ہم چاہتے تو ان کاموں کے لئے جو آپ کے ذمے میں بہت سے انبیاء بھیجتے اور کام تقسیم ہو جاتا مگر ہم نے آپ کو اُن تمام فرائض کا حامل بنایا ہے تا کہ

---

[۱] طھورا ای طاھرا مطھّرا مزیلا للاحداث النجاسات مع طھارتہ فی نفسہ (تبیان) مطھّرا (جلالین) پاک کرنے والا (شاہ رفیع الدین)
[۲] گوناگوں بیان کردیم پند (شاہ ولی اللہ) طرح طرح سے بیان کیا ہم نے اُس کو (شاہ رفیع الدین)
[۳] قیل معناہ قسمناہ بینھم یعطی المطر (تبیان) صرّفناہ ای المطر (مجمع البیان)
[۴] جحود النّعمۃ حیث قالوا امطرنا بنوء کذار (جلالین)

آپ کا درجہ اجر وثواب میں بڑھے۔[۱]

یہ معنی کچھ ہمارے دل کو لگتے نہیں ہیں۔ پہلا مطلب زیادہ ذہن نشین ہے۔

جاھدھم بہ ''اس قرآن کے ذریعہ سے جہاد کرتے رہیے'' اس سے ظاہر ہے کہ یہ جہاد تلوار سے نہیں ہے بلکہ دلائل حق کو پیش کر کے باطل عقائد کو رد کرنے کا جہاد ہے جو علما کا کام ہوتا ہے۔[۲]

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

''اور وہ ہے جس نے دریاؤں کو اکٹھا کیا ہے۔ یہ شیریں وخوش گوار ہے اور یہ نمکین کھاری ہے اور اُن دونوں کے درمیان اس نے درمیانی پردہ اور مستقل رکاوٹ قائم کی ہے۔''

میٹھے اور کھارے پانی کے سنگم میں قدرتِ الٰہی کا ظہور:

یہ قدرت الٰہی کی کارفرمائی ہے ہر آدمی اس وقت بھی دیکھ سکتا ہے ہر اُس جگہ جہاں کسی ندی کا سمندر کے ساتھ اس طرح اتّصال ہو کہ دونوں برابر برابر جاری ہوں جیسے وہ مقام جسے عراق کے راستے میں زائرین دیکھتے ہیں خلیج فارس سے دریائے دجلہ کے اتصال کا کہ وہاں کھاری اور میٹھا پانی دونوں کاندھے سے کاندھا ملائے رواں ہیں اور نہ وہ کھاری اس میٹھے میں مخلوط ہو کر اس کی شیرینی میں خلل ڈالتا ہے۔ نہ یہ میٹھا اُس کھاری میں مل کر اُس کے کھاری پن میں کمی کرتا ہے۔ یہی قدرتی رکاوٹ ہے جسے قرآن نے ''برزخ'' اور حجرا مجورا'' سے تعبیر کیا ہے جو کوئی جسمانی رکاوٹ نہیں بلکہ صرف قانون خداوندی کی رکاوٹ ہے۔[۳]

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾

''اور وہ وہ جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا تو اسے خونی اور سسرالی رشتے کا مرکز بنایا اور تمہارا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔''

نسبتی رشتہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ بھی تقاضائے فطرت:

یہاں ابتدائے آفرینش سے انسان کو نسب یعنی خونی رشتے اور صِھر یعنی سسرالی رشتے کا مرکز بنانا اس پر انتباہ ہے کہ رہبانیت یعنی ازدواجی رشتوں سے آزادی کی تعلیم فطرت کے تقاضوں کے خلاف ہے اور اسی لئے دین فطرت کے رہنما نے اعلان فرمایا کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام اور نیز یہ کہ:

---

[۱] یعنی نبی کا آنا تعجب نہیں، اللہ چاہے نبیوں کی بہتات کر دے، ہر بستی میں ایک نبی ہو (موضح القرآن)

[۲] فی ھذا دلالۃ علی انّ من اجلّ الجھاد واعظمہ منزلۃ عند اللہ سبحانہ جھاد المتکلّمین فی حلّ شبیہ المبطلین (مجمع البیان)

[۳] حجرا محجورا ای حراما محرّما ان یفسد الملح العذاب (مجمع البیان)

النکاح من سنّتی فمن رغب عن سنّتی فلیس منّی۔
شادی بیاہ میرے آئین کا جز ہے تو جو میرے آئین سے روگردانی کرے، وہ مجھ سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ط وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾

''اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی جو اُنہیں نہ نفع پہنچاتی ہے اور نہ اُنہیں نقصان پہنچاتی ہے اور کافر اپنے پروردگار کے خلاف پشت پناہی کرنے والا ہے۔''

کس کی پشت پناہی؟ بلا تکلّف جو ذہن میں آتا ہے، وہ یہ کہ ایک کافر دوسرے کافر کی پشت پناہی کرتا ہے، اس طرح وہ اللہ کے مقابلہ میں جتھ بندی کرتے ہیں لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ کافر شیطان کا پشت پناہ بنتا ہے۔[1]

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا۔''

اس حصّہ کا مقصود وہی ہے جو ماعلی الرسول الّا البلاغ (نہیں پیغمبر پر مگر تبلیغ کر دینا) کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام زبردستی لوگوں کو راہ راست پر لانا نہیں ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

''کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر جو چاہے کہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ بنائے۔''

اجرِ رسالت جو طلب ہو اللہ کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے:

ہر نبی نے مطلق طور پر اجر کی نفی کی ہے۔ کہیں کوئی ''اگر'' ''مگر'' نہیں ہے لیکن ہمارے رسول ﷺ کی طرف سے نفی اجر میں یہاں بھی ایک ''مگر'' کی لفظ لگی ہوئی ہے، اسے ملایئے قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (سورۂ شوریٰ۔ ۲۳) کے ساتھ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر ذوی القربی کی محبّت'، تو نتیجہ نکلے گا کہ وہ 'ذوی القربیٰ'' جن کی محبّت اجر رسالت ہے اللہ کی طرف پہنچنے کا راستہ اور اُس کی جانب سے خلق خدا کے لئے وسیلہ ہیں اور اب تیسری آیت میں جو صراحۃً ''سوال اجر'' کا اثباتی انداز میں اقرار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (سبا۔ ۴۷) میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے، وہ تو تمہارے ہی لئے ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اجر جس کی تمام انبیائے نے نفی کی ہے وہ وہ ہے جس کا فائدہ اجر طلب کرنے والے یعنی پیغمبر کی طرف راجع ہو۔ یہی وجہ ہے جو بلندی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے، اس قسم کا کوئی اجر ہمارے رسول ﷺ نے بھی طلب نہیں فرمایا، انہوں نے حکم خدا سے جو

---

[1] معینا للشیطان بطاعتہ (جلالین) قال الحسن و مجاھد وابن زید: یظایر الشیطان علی معصّھۃ اللہ (تبیان)۔

چیز بطور اجر طلب فرمائی، وہ وہ ہے جو خود ان کے مقصد رسالت کا جزء ہے یعنی خلق خدا کی ہدایت اور اُن کے لئے سامان نجات کی فراہمی اور وہ ''ذوی القربیٰ کی محبت'' انہی مفادوں کی حامل ہے، اس لئے اس اجر کا سوال پیغمبر ﷺ کے عمل کی بے غرضی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡحَيِّ الَّذِىۡ لَا يَمُوۡتُ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِهٖ‌ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرَا ۛۚ ۝٥٨ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ ۛۚ اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا ۝٥٩

''اور بھروسا کیجئے اُس زندہ پر جو کبھی مرنے والا نہیں اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے اور اپنے بندوں کے گناہوں سے اُس سے زیادہ باخبر کون ہوگا؟ وہ جس نے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان میں جو کچھ ہے سب کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر جلوہ گر ہوا، وہی رحمٰن ہے اس کے متعلّق کسی باخبر آدمی سے دریافت تو کرو۔''

کوئی کسی پر بھروسا کرے تو اندیشہ یہ ہوگا کہ ایک وقت میں ہوسکتا ہے یہ مدد کرنے والا دنیا سے اٹھ جائے تو پھر کون مدد کرے گا؟ مگر اللہ کا بندہ جو اللہ پر بھروسا کرتا ہے، اُسے اندیشہ کبھی نہیں اس لئے کہ جس پر اُس کو بھروسا ہے، اس کی حیات لازوال ہے جس پر موت کی دسترس نہیں۔

كَفٰى بِهٖ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًا کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ ''کافی ہے وہ اپنے بندوں کے گناہوں پر بحیثیت باخبر کے، مگر اس مفہوم کے لئے اُردو زبان میں ہمارے خیال میں وہی الفاظ ہیں جن کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے یعنی ''اُس سے زیادہ باخبر کون ہوگا''؟

اس کے بعد چونکہ مشرکین عرب رحمٰن کے لفظ سے وحشت کرتے تھے اور اس بنا پر قرآن میں طرح طرح سے رحمٰن کے لفظ سے ان کی وحشت دور کی گئی ہے چنانچہ ایک طرف ہر سورہ کے ساتھ بسم اللہ کی آیت اتاری جس میں اللہ کا وصف ''رحمٰن'' قرار دے کر رحیم کے ساتھ توصیف کی تاکہ انہیں محسوس ہو کہ رحمٰن وہی اللہ ہے اور اس کے مفہوم میں (ہمہ گیری کے وصف کے اضافہ کے ساتھ سہی) وہی ''رحمت'' ہے جو رحیم کے وصف میں ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے لہٰذا اس کو یہاں بتایا جارہا ہے کہ رحمٰن کوئی اور نہیں ہے، وہی ہے جو خالق کائنات ہے اور اسی کا پس منظر وہ ہے جسے صاف طور پر اس کے بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ ۛ اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا وَزَادَهُمۡ نُفُوۡرًا ۝٦٠

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا جس چیز کو تم کہو ہم سجدہ کرنے لگیں اور اس سے اُن کی وحشت میں اضافہ ہوتا ہے۔''

یہی اُن کی جہالت اور یوں کہا جائے کہ لکیر کا فقیر ہونا ہے جس میں اکثر عوام مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ لفظوں کے استعمال میں بھی ''تقلید آباء'' سے ہٹنا نہیں چاہتے، وہ تھی جس کے لئے قرآن نے اپنی ایک مہم یہ بنالی کہ وہ اللہ کے ساتھ ساتھ لفظ ''الرحمٰن'' سے بھی انہیں مانوس بنائے اور ان

کی اس وحشت کو بہر صورت دور کرے۔ یہ چیز اس آیت میں اور اس کے پہلے اور اس کے بعد کی آیات میں برابر کار فرما ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾

''قائم ودائم ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اُن میں روشن چراغ اور چمکتا ہوا چاند قرار دیا''۔

''روشن چراغ'' سے مراد آفتاب ہے جس کے لئے دوسری جگہ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ (سورۂ نباء۔ ۱۳) اور تیسری جگہ صاف طور پر جَعَلْنَا الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ کہا گیا ہے۔ (سورۂ نوح)

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا اس کے لئے جو نصیحت قبول کرے یا شکر گزار ہونا چاہے''۔

دوسری جگہ اس نعمت کی صاف لفظوں میں تشریح کی ہے کہ اگر دن ہی دن ہوتا تو تم کیسے بے چین ہوتے اور اگر رات ہی رات ہوتی تو کیسے پریشان ہوتے۔ اُس کی بڑی نعمت ہے کہ نہ رات ہی یکساں طور پر قائم رہتی ہے اور نہ دن ہی برقرار۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ
قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ
مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ
ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ
حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ لَهُ
الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا
صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ
تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا
عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا

قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا
وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ (قدم رکھ کر) چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے تخاطب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی دعا دیتے ہیں اور جو پروردگار کے لئے رات گزارتے ہیں سجدہ اور قیام میں اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! دور رکھ ہم سے دوزخ کے عذاب کو یقیناً اُس کا عذاب وہ ہے جس پیچھا چھڑانا مشکل ہے وہ بہت برا ٹھکانا اور جگہ ہے اور وہ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ شاہ خرچی زیادہ کرتے ہیں اور نہ کنجوس اور وہ اس کے بیچ میں اعتدال کے درجہ پر ہوتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور خدا کی دہائی نہیں دیتے اور اُس نفس کی جس کی اللہ نے حرمت قرار دی ہے ناحق جان نہیں لیتے اور زنا کاری نہیں کرتے اور جو ایسا کرے گا، وہ بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا، اُسے روز قیامت دونادوں سزا دی جائے گی اور اُس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذلیل بنا کر رکھا جائے گا، سوا اُس کے کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اور یہ وہ ہیں جن کی غلطیوں کو اللہ بدل دیتا ہے نیکیوں کے ساتھ اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان اور جو توبہ کرے گا اور نیک اعمال کرے گا تو وہ پورے طور پر اللہ سے لو لگائے گا اور وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب لغو باتوں کی طرف گزر ہوتا ہے تو اپنے شان و وقار کو لئے ہوئے (دامن بچائے) گزر جاتے ہیں اور وہ کہ جب اُنہیں ان کے پروردگار کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ بہروں اور اندھیروں کی طرح منہ کے بل گر نہیں پڑتے اور وہ جو کہتے ہیں کہ پروردگارا ہمیں عطا کرنا ہماری بیویوں اور بچوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیش رو بنا۔ یہ وہ ہیں جنہیں ان کے صبر و تحمل کے صلہ میں بہشت میں اونچا درجہ ملے گا اور وہاں اُن سے سلام اور آداب و احترام کے ساتھ پیش آیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، بہت اچھا ہے وہ مقام اور ٹھکانا رہنے کا''۔

اللہ کے بندوں کی شان:

ذرا اس طویل سلسلۂ اوصاف کا محل ورود دیکھیے جس میں زندگی کے تمام شعبوں میں مثالی کردار کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، یہ سب رحمٰن کے تعارف میں ہے جس سے مشرکین عرب وحشت محسوس کرتے تھے، پہلے رحمٰن کا تعارف اُس کی قدرت کے کرشموں کے ذریعہ کیا گیا کہ وہی تو وہ ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے۔ وہی تو وہ ہے جس نے رات اور دن کا نظام قائم کیا اور اب اُس کا وہ تعارف ہے جو اُس کے بندوں کا مثالی کردار دکھلا کر کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! رحمٰن وہ ہے جس کے بندے اس شان کے ہوتے ہیں۔

بس یہی ہم سے اس دور میں اور ہر دور کے مسلمانوں سے اُس دور میں اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ اس شان کے حامل ہوں کہ اُنہیں دکھا کر اُن کے معبود حق کا تعارف کیا جا سکے کہ دیکھو اُس خدائے واحد کہ دیکھو! خاتم الانبیاء کے ماننے والے اس شان کے ہوتے ہیں اور اگر یہ معیار برحق ہے اور جب قرآن نے اُسے پیش کیا ہے تو اس کے برحق ہونے میں شبہہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟ تو پھر اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں اور اپنے

کو شیعہ علی علیہ السلام بلکہ امامیہ اثنا عشریہ میں محسوب ہونے والوں پر ذمہ داری زیادہ ہے کہ وہ اپنا کردار ایسا پیش کریں کہ خود مسلمانوں کو بھی دکھایا جا سکے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے علی علیہ السلام کی رہبری قبول کرنے والے اور بارہ ۱۲ معصوم رہبروں کی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پیروی کرنے والے اس شان کے ہوتے ہیں۔ کیا ہم اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ افسوس اور ہزار افسوس۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝

''کہیے کہ میرا پروردگار تمہاری پرواہ نہیں کرتا اگر تم دعا نہ مانگو، اب تم نے جھٹلایا ہے تو اس کے نتائج تمہیں بھگتنا ہوں گے''۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی اگر تمہاری اس کی بارگاہ میں دعا، التجا نہ ہو تو اس کی خصوصی رحمتیں اکثر متوجہ نہیں ہوتیں، چہ جائیکہ تم تو انکار و تکذیب سے کام لے رہے ہو، اب تو تمہیں عذاب کے سوا کوئی اور توقع رکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

یہ ہمارا ترجمہ اور تشریح ایک تفسیر کے مطابق ہے[1] مگر علامہ طبرسیؒ نے اس کے بجائے دوسرے کئی معنی نقل کیے ہیں:

ایک یہ کہ اسے تمہیں حق کی طرف دعوت دینا نہ ہوتا تو تمہیں کوئی اس کا حق نہ تھا کہ اسے تمہاری پرواہ ہو۔ اس طرح دعاء کی اضافت مفعول کی طرف ہوگی۔

دوسرے یہ کہ اگر تم اللہ کو خدا نہ کہو یعنی اس کی خدائی نہ ہو تو وہ تمہاری کوئی پرواہ نہ کرے گا۔

تیسرے یہ کہ اگر تمہارا بتوں کی دہائی دینا نہ ہوتا یعنی تم مشرک نہ ہوتے تو اسے تمہاری کوئی پرواہ نہ ہوتی یعنی وہ تمہیں مبتلائے عذاب کرنے کا ارادہ نہ کرتا۔ ایک اور چوتھے ۴ معنی بلخی صاحب کی طرف منسوب ہیں کہ اگر تم لوگ باہم ایک دوسرے کو شرک اور گمراہی کی طرف دعوت نہ دو تو اللہ کو تم سے کیا مطلب یعنی وہ تمہیں سزا کیوں دے؟ ہماری نظر میں یہ سب اقوال خلاف ظاہر ہیں اور جس مفہوم کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے، اس کی تائید میں معصوم علیہ السلام کا ارشاد بھی موجود ہے۔[2] لہٰذا قابل ترجیح وہی ہے۔

❊❊❊❊❊❊❊
❊❊❊❊❊
❊❊❊
❊

[1] لو کان دعاء و کم ایّاہ فی الشّدائد فیکشفھا (جلالین) اگر نباشدہ عبادت شما (شاہ ولی اللہ) اگر نہ ہوتی التجا تمہاری (شاہ رفیع الدین)

[2] روی العیاشی باسنادہ عن برید بن معویۃ العجلی قال قلت لابی جعفر علیہ السلام کثرۃ القراء افضل ام کثرۃ الدّعآء قال کثرۃ الدّعا افضل و ترا ھذا الأیۃ (مجمع البیان)